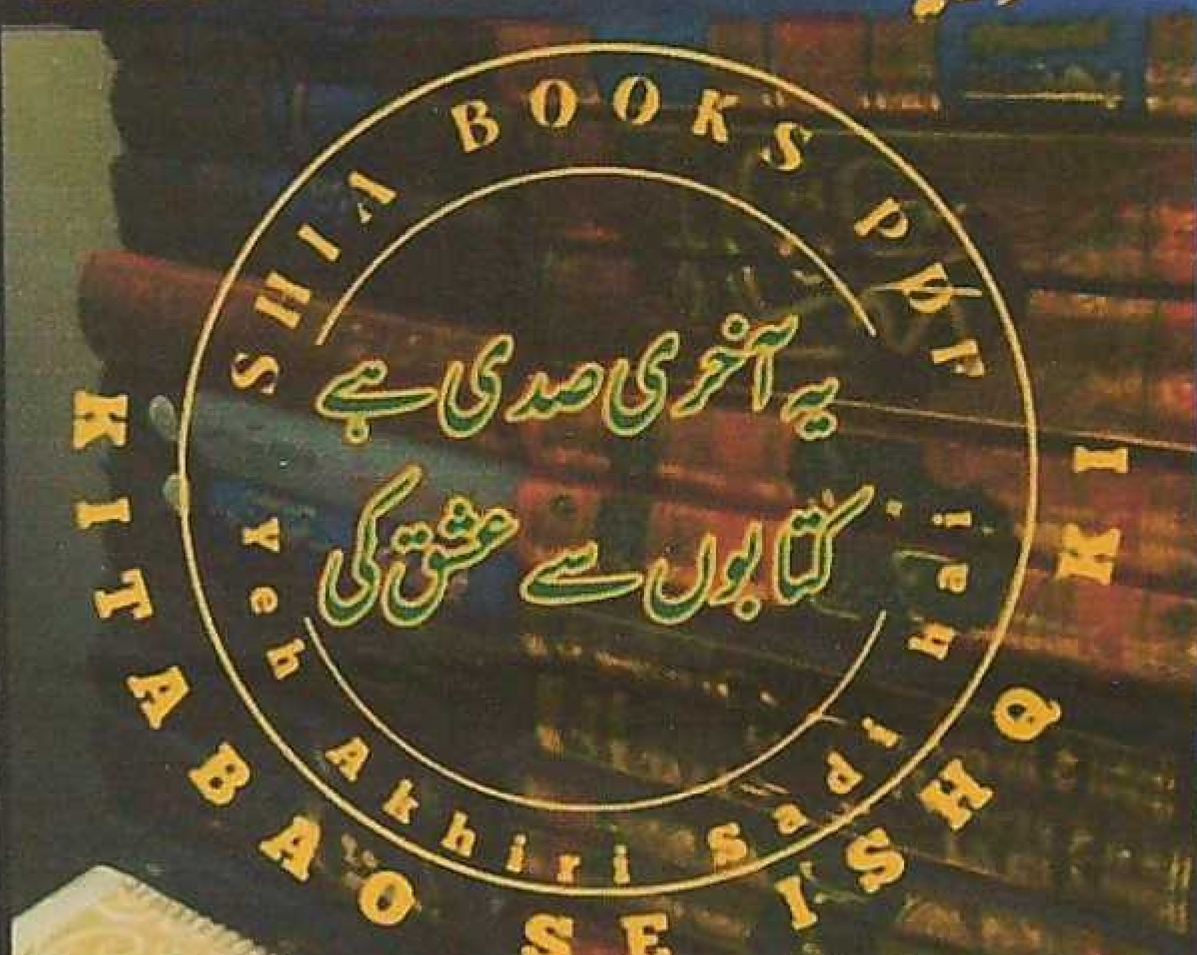
بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

Shia Books PDF منظر ایلیاء



MANZAR AELIYA
9391287881
HYDERABAD INDIA

ترجمہ

تفسیر مجمع البیان

جلد اول

لامین الاسلام

الفضل بن الحسن الطبرسی علیہ الرحمہ

(متوفی ۵۴۸ھ)

ترجمہ و تلخیص

پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا نقوی

(صدر شعبۂ شیعہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

زیر نگرانی

حجۃ الاسلام مولانا ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی اعلی اللہ مقامہ

تنظیم المکاتب

ہندوستان

ترجمہ

تفسیر مجمع البیان

جلد اول

امین الاسلام

الفضل بن الحسن الطبرسی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۵۴۸ھ)

ترجمہ و تلخیص

پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا نقوی

(صدر شعبۂ شیعہ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

زیر نگرانی

حجۃ الاسلام مولانا ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی اعلی اللہ مقامہ

تنظیم المکاتب
ہندوستان

ترجمہ
تفسیر مجمع البیان (جلد اول)

مفسر

امین الاسلام الفضل بن الحسن الطبرسیؒ

ترجمہ و تلخیص: پروفیسر ڈاکٹر سید حبیب رضا نقوی صاحب

زیر نگرانی: حجۃ الاسلام مولانا ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی اعلی اللہ مقامہ

زرافشان سرورق: مولانا سید علی مہذب خرد نقوی (مبلغ جامعہ امامیہ تنظیم المکاتب، لکھنو)

سنہ اشاعت: فروری ۲۰۲۲ عیسوی

قیمت: ₹700/-

ارائین آرٹ پرنٹرس
دہلی

برائے ترحیم

جناب اختر حسین مرحوم ــــ مرحومہ کنیز فاطمہ

جناب مختار بخت مرحوم ــــ مرحومہ شاہ جہاں بیگم

حسب فرمائش

عالیجناب امداد امام صاحب

(البنی، نیو یارک، امریکہ)

ناشر: تنظیم المکاتب، لکھنؤ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مطالب

سُوۡرَۃُ الۡفَاتِحَۃ

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

عرض تنظیم

پیغمبرؐ ہدایت نے بار بار یہ اعلان فرمایا تھا کہ صرف وہ گمراہ نہ ہوگا جو قرآن واہل بیتؑ دونوں سے وابستہ رہے گا۔ وابستگی کے لئے قرآن واہل بیتؑ کو پہچاننا اور ان کی بات کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کو پہچانے اور ان کو سمجھے بغیر وابستگی کی کوشش قربت کے بجائے دوریاں پیدا کرسکتی ہے اور ہدایت کے بجائے گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے ہر طالب ہدایت کو ایک طرف قرآن کی عظمت کی معرفت حاصل کرنے کے ساتھ اس کی باتوں کو سمجھنا لازمی ہے اور دوسری طرف اہل بیتؑ کی معرفت اور ان کے فضائل سے انس کے ساتھ ان کے پیغام کو پہچاننا ضروری ہے۔

ہمارے علماء نے انہیں دونوں ضرورتوں کے پیش نظر قرآن مجید کی تفاسیر ہر دور میں اور ہر نہج سے لکھی ہیں اور اہل بیتؑ کی سیرت کو مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ارشادات کو کتب احادیث میں جمع کرکے ان کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔

ان تفاسیر اور شروح کے لکھنے والوں نے بالعموم اپنے علم اور ذوق علمی کے ساتھ ساتھ زمانۂ تحریر کے حالات اور ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا ہے اسی لئے قرآن کے ایک ہوتے ہوئے اس کی متعدد انداز کی تفاسیر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کہیں روایتی انداز اختیار کیا گیا ہے تو کہیں عقلی، کہیں عرفان کو بنیاد بنایا گیا ہے تو کہیں فلسفہ کو، کہیں قرآن مجید کے ادبی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے تو کہیں تربیتی پہلوؤں پر۔ غرض کہ ہر مفسر نے اپنے ذوق، اپنے دور کی علمی تحقیقات اور زمانہ میں رائج ہنروں اور حالاتِ زمانہ سے متاثر ہوکر قرآن سے جو سمجھا وہ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیگر کتب کی طرح تفسیروں میں درج تمام باتیں درست نہیں قرار دی جاسکتیں اس لئے کہ تفسیر کلام خدا نہیں محدود علم والے بندۂ خاطی کا کلام ہے۔ اس لئے نہ کسی تفسیر کو بہت معتبر اور نہ کسی کو بہت غیر معتبر قرار دینا چاہئے۔ یہ

قاری کا کام ہے کہ عقل اور قرآن کی کسوٹی پر ہر اس بات کو پرکھے جسے پڑھے یا سنے۔

زیر نظر تفسیر 'مجمع البیان لعلوم القرآن' چھٹی صدی ہجری کے عظیم عالم، مفسر، متکلم اور فقیہ امین الاسلام جناب ابوعلی فضل بن حسن طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم علمی کاوش اور اسلامی علمی خزانہ کا گوہر نایاب ہے۔ بلا تفریق مذہب عالم اسلام کے اکثر مؤرخین اور تاریخ نگاروں نے مفسر عالی قدر کی عظمتوں کا اعتراف کیا ہے اور نیک الفاظ سے یاد کیا ہے۔ آپ کی اس تفسیر میں قرائت، اعراب، لغات، بیان مشکلات، معانی و بیان کے موارد کا ذکر ہے، آیات کے شان نزول اور اس میں وارد حدیثوں اور قصوں کی شرح و وضاحت شامل ہے جو ادبی تفسیر کا کامل نمونہ ہے۔ خاصہ اور عامہ کے اہل علم و نظر اس کے بے مثال ہونے کے قائل ہیں۔

امین الاسلام جناب ابوعلی فضل بن حسن طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تفسیر عربی زبان میں لکھی، جس کا فارسی میں برسوں پہلے ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو بولنے والے مومنین اس قیمتی قرآنی ذخیرہ سے محروم تھے لہٰذا اس ضرورت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یہ اہم علمی ذخیرہ اردو کے قالب میں بھی ڈھال دیا جائے تا کہ اہل ایمان کا اردو زبان معاشرہ بھی اس سے مستفیض ہو سکے۔

اللہ رحمت فرمائے برادر بزرگوار مولانا سید تلمیذ حسنین رضوی اعلی اللہ مقامہ پر جو برصغیر کے عالم تشیع کے مایہ ناز علماء میں تھے۔ آپ ہمارے لئے چلتی پھرتی لائبریری اور حوالوں کا سافٹ ویئر تھے۔ علوم اسلامی میں صلاحیت کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اللہ کی کتاب کے بعد دیوان ابوطالبؑ جیسی مشکل ترین کتب عربیہ کا بہترین ترجمہ کر چکے ہیں۔ کلمات کی باریکیوں اور ترکیب کی نزاکتوں کے ساتھ ادب اردو پر ترجمہ میں ان کی دقیق نگاہ رہتی تھی جہاں بڑے بڑے چوک جاتے ہیں، انھوں نے اصل عبارت کی پوری بات کو منتقل کرنے میں ترجمہ کی عبارت کو کبھی غامض نہیں ہونے دیا۔

مولانا نے مجمع البیان کا ترجمہ کر کے نشر کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اپنی بے حد مشغولیت کی وجہ سے یہ ذمہ داری مولانا پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا صاحب قبلہ چیئرمین شعبۂ دینیات شیعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حوالہ کی۔ موصوف نے تفسیر مجمع البیان کے اہم حصوں: اَللُّغَۃ (الفاظ و معانی)، شان نزول اور اَلْمَعْنیٰ (تفسیر) کا ترجمہ کیا۔ انہیں کے حکم سے ان کے ترجمہ کو جامعہ امامیہ کے اساتذہ مولانا فیروز علی بنارسی صاحب اور مولانا محمد عباس معروفی صاحب نے ایک بار پھر اصل کتاب سے ملایا تا کہ ممکنہ تسامحات کو دور کیا جا سکے اور آخر میں خود مولانا سید تلمیذ حسنین رضوی طاب ثراہ نے نظر ثانی فرما کر ترجمہ کو اعتبار عطا کر دیا۔

قابل ذکر ہے کہ بعد میں کتاب کے بقیہ نمایاں حصوں اَلْقِرَاءَة (قرائتوں کا اختلاف) اَلْحُجَّة (قرائتوں کے اختلاف کی دلیلیں) اور اَلْاِعْرَاب (کلمات اور جملوں کی نحوی تحلیل یعنی ترکیب) کا ترجمہ ان کی افادیت کے سبب مولانا مرحوم کے حکم پر فاضل عزیز مولانا فیروز علی بنارسی سلمہ نے کیا، جو جامعۂ امامیہ کے قابل فخر افاضل اساتید اور ادارے کے خدمت گذاروں میں ہیں۔ بغیر فکرِ نام ونمود وحصولِ زر خاموشی سے کام کرنا ان کا شیوہ ہے۔

مولانا مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں منظر عام پر آجائے لیکن افسوس کی اجل نے مہلت نہ دی اور دار فانی سے دار بقا کی جانب کوچ کر گئے۔ خداوند کریم ان پر رحمت نازل فرمائے اور قرآن و اہل بیت علیہم السلام کو ان کا شفیع قرار دے۔ آمین

انشاءاللہ یہ نایاب تفسیر علماء وافاضل اور مومنین سب کے کام آئے گی۔ مولانا سید تلمیذ حسنین اعلی اللہ مقامہ اور ان کے فرزند مولانا رضوان ارسلان صاحب حفظہ اللہ کی کرم فرمائی اور والد مرحوم کے چھوڑے ہوئے علمی کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا عزم مصمم ہے کہ ادارہ اسے شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ خادمان ومعاونین ادارہ کو اپنی دعاؤں میں مرحومین کو اپنی ترحیم میں شامل رکھنے کی گذارش ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ علماء، افاضل اور خدمت گذاران دین بالخصوص فقہاء ومراجع کو صحت کے ساتھ اتنی حیات دے کہ وہ اپنے زمانے کے ولی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ناصروں اور غلاموں میں شامل ہوسکیں۔

والسلام

سید صفی حیدر

سکریٹری تنظیم المکاتب لکھنؤ

۱۲رجنوری ۲۰۲۲ء

عرض مترجم

آج سے تقریباً پانچ برس قبل کی بات ہے جب جناب حجۃ الاسلام سید تلمیذ حسنین رضوی صاحب قبلہ (مقیم نیوجرسی امریکہ) نے شیخ طبرسی علیہ الرحمہ کی تفسیر مجمع البیان پر میری پی ایچ ڈی تھسس ملاحظہ کی تو مجھے حکم دیا کہ میں مجمع البیان کا اردو میں ترجمہ کردوں۔ چونکہ مجھے اس تحقیقی مقالہ کے لئے مذکورہ تفسیر مکمل دس جلدوں کا مطالعہ کرنا پڑھا تھا لہٰذا میرے سامنے اس کی افادیت واہمیت تھی۔ اس وقت مجھے اور حیرت ہوئی کہ جب میں نے شیخ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے متعلق شیعہ علماء کے علاوہ بزرگ اساطین علماء کے اقوال دیکھے۔ اگرچہ ایسے اقوال کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ہم یہاں پر فقط دو اقوال پر اکتفا کررہے ہیں:

۱۔ قاضی نوراللہ شوشتری (متوفی ۱۰۱۹ھ) مجالس المؤمنین میں فرماتے ہیں:

عمدۃ المفسرین امین الدین ثقۃ الاسلام ابوعلی الفضل بن الحسن بن الفضل الطبرسی نمایاں ترین مفسر قرآن ہیں۔ آپ کی تفسیر کبیر مجمع البیان اپنی جامعیت اور فضل وکمال میں بیان کافی اور دلیل وافی ہے۔ کتاب لمعہ دمشقیہ کی بحث رضاعت سے ظاہر وعیاں ہوتا ہے کہ آپ مجتہد بھی تھے۔ (کتاب ہدایۃ الاحباب، شیخ عباس قمیؒ، ص۱۹۶)

۲۔ جامع الازہر کے سابق شیخ الجامع جلیل القدر استاد شیخ محمد شلتوت تفسیر مجمع البیان کی بابت اس طرح تحریر فرماتے ہیں: بلاشبہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ یہ کتاب مجمع البیان کتب تفسیر کے درمیان منفرد و یکتا ہے اس لئے کہ یہ اپنی بحوث کی وسعت، اس کی گہرائی و گیرائی، اپنی ترتیب وتبویب اور تنسیق وتہذیب میں خصوصیت کی حامل ہے۔ یہ چیز کتب تفسیر کے لئے مشہور نہیں تھی، نہ ہی اس کے بعد مشہور ہوگی۔

شیخ مذکور جملہ تفاسیر پر تنقید کرنے کے بعد مزید تحریر کرتے ہیں:

یہ کتاب (مجمع البیان) ایسی پہلی کتاب ہے جو کتب تفسیر کی جامع اور آج تک کامل ترین ہے جس میں غزارت بحث اور درس کی عمیق بحوث جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز استقصا (تلاش وجستجو) میں زحمت شاقہ سے کام لیا گیا ہے۔ یہ منفرد نظم وترتیب جو کہ تقسیم وتنظیم وتفسیر کی خصوصی حفاظت ونگرانی پر مشتمل ہے اور غور طلب

امر یہ ہے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جس سے قرآن کریم کی خدمت مقصود ہے نہ کہ قرآن کے ذریعہ اہل لغت کی خدمت کرنا، نہ ہی قرآن کے ذریعہ فقہاء کی خدمت کرنا، نہ ہی سیبویہ (نحوی) کے ذریعہ قرآنی آیات کی تطبیق کرنا، نہ ہی عبد القاہر کی بلاغت کی طرز پر، نہ ہی یونان و روم کے فلسفہ کی طرز پر قرآنی (نظریات) پر حکم لگانا مقصود ہے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کتاب مجمع البیان کے مؤلف نے کافی حد تک اپنے علمی و فکری اخلاص کو اپنے مذہبی جذبات پر غالب رکھا ہے اگرچہ انھوں نے شیعہ نقطۂ نظر کو اہمیت دی ہے۔ ان اختلافی نظریات اور احکام جن میں وہ منفرد ہیں جس سے کبھی کبھی مذہبی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم انھیں ان جذبات میں حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہی انھیں اپنے مخالف پر اپنے نظریہ کا تھوپنے والا دیکھتے ہیں۔ اس کتاب کی شخصیت مختلف علوم میں بحث و تمحیص کرنے والی ہے۔ آپ کی بیشتر تصانیف ہیں جن کی تعداد دس ہے۔ جن میں سے بعض شیعہ مذہب کے موضوعات پر مشتمل ہیں اور بعض میں تفسیر قرآن کو خاص اہمیت دی گئی ہے جو آپ کی عظیم کوشش و ہمت کا شاہکار ہے۔ (مقدمہ مجمع البیان، ص ۲۰، نقل شدہ از مقدمہ جوامع الجامع)

چنانچہ سب سے پہلے مولانا موصوف نے تفسیر مجمع البیان کے مقدمہ کا ترجمہ کرنے کے لئے کہا جسے مکمل کر کے میں نے ان کے پاس امریکہ روانہ کر دیا جسے انھوں نے پسند کیا اور فرمایا کہ میں اس کا مکمل ترجمہ کر دوں۔ چنانچہ میں نے اللہ سے مدد اور معصومین علیہم السلام کی تائید کے بھروسہ پر ۱۹ر فروری ۲۰۱۹ء سے ترجمہ کا آغاز کیا اور ۱۷ر اپریل ۲۰۲۰ء تک انتہائی محنت و جانفشانی کے ساتھ سات جلدوں کا ترجمہ مکمل کر چکا ہوں جن میں سے دو جلدوں کی کتابت بھی علی گڑھ میں کی گئی ہے۔

جلد اول جو سر دست زیور طبع سے آراستہ ہونے والی ہے اس کی تصحیح اور حسب ضرورت جملہ سازی میں قبلہ و کعبہ نے نہایت ژرف نگاہی سے کام لیا ہے اور میری رہنمائی فرمائی ہے۔ اس لئے کہ عربی زبان و ادب میں لکھی گئی تفسیر کا ترجمہ نہایت دشوار تھا لیکن قبلہ و کعبہ کی ہمت افزائی سے یہ کام مکمل ہو گیا۔

اس تفسیر کی طباعت کی ذمہ داری حجۃ الاسلام جناب سید صفی حیدر صاحب قبلہ سنبھالی ہے۔ لہٰذا خود مولانا اور ادارہ قابل مبارکباد ہے۔

خداوند متعال سے دعا گو ہوں کہ وہ ادارہ اور معاونین ادارہ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ آمین ثم آمین

پروفیسر ڈاکٹر سید طیب رضا نقوی

صدر شعبۂ دینیات شیعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

تفسیر مجمع البیان

مولانا ڈاکٹر سید تلمیذ حسنین رضوی (نیوجرسی۔امریکہ)

تَفسِیر کے معنی ہیں وضاحت، کھول کر بیان کرنا۔تاویل، کشف وشرح کرنا، مُبہَم کو مُبرہَن کرنا۔سب سے پہلے مُفَسّر قرآن حضور سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ارشاد باری ہے: يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ یہاں پر حکمت سے مراد تفسیر وتوضیح قرآن ہے، تشریح قرآن ہے۔آپ کو قرآن کی تبیین اور تشریح کے لئے معلم بنا کر بھیجا گیا تھا۔آپ نے خود فرمایا ہے: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا "مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

سورۂ قیامت میں ارشاد رب العزت ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۔فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۔ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۔ "بلاشبہ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔جب ہم اسے پڑھوا رہے ہوں تو آپ اسی کے مطابق پڑھتے رہیں۔پھر اس کی تشریح بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے۔"

(سورۂ قیامت: آیات ۱۷ تا ۱۹)

سورۂ نحل میں ارشاد فرمایا: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِيْنَ "اور ہم نے آپ پر جو کتاب نازل کی ہے وہ ہر چیز کی وضاحت کرتی ہے۔یہ کتاب ہدایت، رحمت اور سر تسلیم کرنے والوں کے لئے بشارت ہے۔"

(سورۂ نحل: آیت ۸۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے تفسیر کی ذمہ داری سنبھالی۔علماء کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام المفسرین جناب ابن عباس نے امام کائنات حضرت علی علیہ السلام سے درخواست کی کہ قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق کچھ بیان فرمائیے۔آپ نے نماز مغربین کے بعد سورۂ حمد کی تفسیر بیان کرنا شروع کی۔سورۂ حمد کی پہلی آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تفسیر بیان کر رہے تھے کہ صبح ہوگئی۔مؤذن نے

اذان دی۔ آپ کھڑے ہو گئے۔ ابن عباس نے عرض کیا: ''مولا جذبہ طلب تشنہ رہ گیا!'' حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ''سنو ابن عباس! لَوْ شِئْتُ لَاَوْقَرْتُ سَبْعِیْنَ بَعِیْرًا مِّنْ تَفْسِیْرِ فَاتِحَۃِ الْکِتَابِ۔
(ینابیع المودۃ، ص ۶۵)

اگر میں چاہوں تو سورۂ فَاتِحَۃُ الْکِتَاب کی اتنی تفسیر بیان کروں کہ اسکی تحریر کو چالیس اونٹوں پر رکھ کر اٹھایا جائے!

حضرت علی علیہ السلام کے بعد امام حسن و امام حسین علیہما السلام کی تشریح و توضیح قرآن کا پتا چلتا ہے، لیکن اس ضمن میں اصل کام جو شروع ہوا وہ امامین ہمامین حضرت امام محمد باقر و حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام نے اپنے اپنے ادوار میں انجام دیا اور مُعضِلات قرآن اور متشابہات قرآن کی نہایت خوبصورت تفسیر و تاویل بیان فرمائی اور قرآن فہمی کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔

کسی امام سے منسوب باقاعدہ تفسیر جس کا ہمیں علم ہے، وہ تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام ہے۔ اس دور کا عراقی فلسفی جو کتاب 'تناقضات قرآن' تحریر کر رہا تھا اور فتنہ کا دروازہ کھول رہا تھا، امام عالی مقام نے جواب شافی کے ذریعہ اس کا سد باب کیا اور وہ کتاب مصنف نے خود نذر آتش کر دی۔ اس تفسیر کی صحت و درستی پر علمائے کرام کے دو گروہ ہیں۔ آخری دور کے آیۃ اللہ الخوئیؒ نے اس کو سنداً ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن متقدمین میں فحول علماء نے اس تفسیر کو احادیث کی دیگر کتب کے مانند قرار دیا ہے جس میں رطب و یابس دونوں ہیں شیخ صدوق محمد بن علی بابویہ قمی صاحب مَنْ لَّا یَحْضُرُہُ الْفَقِیْہ نے اس کی بہت سی روایات کو عین سند یا قدرے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ابو منصور طبرسی صاحب الاحتجاج نے اس کی اکثر روایات کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ نقل کنندگان میں قطب راوندی، ابن شہر آشوب صاحب المناقب، محقق شیخ کرکی، شہید ثانی، مجلسی اول اور مجلسی دوم صاحب بحار الانوار، حر عاملی اور فیض کاشانی ہیں جنھوں نے اپنی تفسیر صافی میں سورۂ بقرہ میں اس تفسیر کے کافی حوالے دیئے ہیں۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں ائمہ علیہم السلام اور ان کے ارشد تلامذہ اور اصحاب باوفا نے تفسیر کے سلسلے کو جاری و ساری رکھا جن میں سے کچھ کے اسمائے گرامی فہرست ابن ندیم میں موجود ہیں اور آخری دور میں بہت بڑے محقق ڈاکٹر عقیقی بخشائشی نے اپنی مشہور کتاب 'طبقاتِ مفسرانِ شیعہ' کے نام سے

نہایت وقیع کتاب تحریر کی ہے جس میں ہر صدی کے مفسر کا نہایت خوبصورت انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

شیعہ نقطۂ نظر کی حامل تفسیر کی پہلی کتاب جو زیور طبع سے آراستہ ہوئی وہ تفسیر قمی ہے۔ اس تفسیر کے مؤلف ابوالحسن علی بن ابراہیم بن ہاشم قمی تھے جو امام حسن عسکری علیہ السلام کے معاصر تھے اور ۳۰۴ھ ہجری تک زندہ رہے۔ یہ محمد بن یعقوب کلینی کے استاد تھے۔ تفسیرِ قمی امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام کے آثار جاودانی کو ابوالجارود کے ذریعہ نقل فرماتے ہیں اور اگر یہ تفسیری متن نہ ہوتا تو پھر کسی بھی منبع تک رسائی ممکن نہ ہوتی۔ چونکہ امامیہ کی جملہ تفاسیر نے اسی کے اثر اور خبر کو اپنی تفسیر میں سمو رکھا ہے۔

اس کے بعد جو اہم تفسیر ہمارے پاس مطبوعہ شکل میں موجود ہے، وہ تفسیر فرات ابن ابراہیم کوفی ہے جو قرن سوم کے اواخر اور قرن چہارم کے آغاز میں گزرے ہیں۔ اپنی اکثر روایات کو حسین بن سعید کوفی اہوازی سے نقل کرتے ہیں اور حسین امام رضا و امام جواد و امام ہادی علیہم السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ اس کے بعد جو تفسیر ہمارے پاس مطبوعہ شکل میں موجود ہے، وہ تفسیر عیاشی ہے جسے تالیف کیا ہے ابونصر محمد بن سعید عیاشی نے، جنکی وفات ۳۲۰ھ ہجری کے حدود میں ہوئی تھی۔ یہ بھی اواخر قرن سوم اور اوائل قرن چہارم کے مفسر ہیں۔ ان کی تالیفات کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ وہ صاحب کشی کے مشائخ واستاد حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں۔ علامہ طباطبائی صاحب المیزان ان کے بارے میں فرماتے ہیں: ''یہ بہترین چیز ہے جو تحریر کی گئی ہے۔''

یہ موثق ترین چیز ہے جو ہم نے اپنے سابقین سے حاصل کی ہے۔ یہ وہ ماثور تفسیر ہے جسے گیارہ صدیوں سے علماء نے قبول کیا ہے۔ ابونصر محمد ابن مسعود بن محمد عیاشی کوفی سمرقندی اعیان علمائے شیعہ میں سے ہیں اور حدیث وتفسیر کے نہایت اہم ستون ہیں۔ وہ پہلے مذہب اہلسنت سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں انھوں نے شیعیت اختیار کر لی تھی۔

پرانی وقدیم تفاسیر میں جو تفسیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے وہ تفسیر التبیان ہے۔ مؤلف بزرگوار ابوجعفر محمد بن حسن بن علی طوسی معروف بہ شیخ الطائفہ، اپنے دور میں علم فقہ، تفسیر، کلام، حدیث، رجال اور تراجم کے رکن تھے۔ وہ ۲۳ سال کی عمر میں خراسان سے عراق تشریف لے گئے اور شیخ مفید (متوفی ۴۱۳ھ) اور سید مرتضیٰ (متوفی ۴۳۶ھ) کی شاگردی اختیار کی اور اس زمانے کے دیگر صاحبان علم سے بھی فیض حاصل کیا اور بالآخر جامعہ اسلامی نجف اشرف کے سربراہ بن گئے۔

تفسیر تبیان شیعی دنیا کی پہلی جامع ترین تفسیر ہے جس میں تمام علوم قرآنی کے مباحث کو سمویا گیا

ہے۔ یہ دراصل تفسیر کا منبع اور سرچشمہ ہے جس کا فیض جاری وساری ہے۔ اس تفسیر میں زیادہ تر کلامی وادبی پہلو نمایاں ہیں۔ محقق طوسی علیہ الرحمہ مکرر ان افراد کے نام لیتے ہیں: طبری، زجاج، فراء، مفضل بن مسلم، ابوعلی جبائی، بلخی، ابن عباس، حسن، قتادہ، مجاہد، ابن جریح، عکرمہ وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور تفسیر جو نہایت اہم ہے، اس کا تذکرہ بہت ضروری ہے اور وہ تفسیر ابوالفتوح رازی ہے جو کئی بار نہایت اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مؤلف ابوالفتوح جمال الدین بن حسین بن علی بن محمد رازی خزاعی ہیں جو نافع بن بدیل بن ورقاء کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی تھے۔ ان کا تعلق قرن ششم سے ہے۔ غالباً ۵۵۶ھ میں ان کی وفات ہوئی تھی۔ یہ امام فخر الدین رازی کے ہم عصر تھے۔ ان کی تفسیر فارسی زبان میں ہے اور بیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا نام رَوْضُ الْجِنَان و رُوْحُ الْجَنَان ہے۔ مؤلف آغاز کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

جمعی از دوستان و بزرگان اماثل اهل علم اقتراح نموده اند که در این باب باین تالیف کردن چه اصحاب مارا تفسیری نیست پس واجب دیدم اجابت در خواست ایشان را.

"دوستوں اور بزرگوں کی ایک جماعت اور صاحبان علم نے اصرار کیا کہ اس باب یعنی تفسیر کے بارے میں میری تالیف ہونی چاہیے۔ لہٰذا میں نے انکی درخواست پر تفسیر رقم کی ہے۔"

ان کے اساتذہ میں قاضی ابومحمد عبدالرحمٰن بن احمد و ابوالوفا عبدالجبار بن عبداللہ بن علی مقری رازی شاگرد شیخ ابوجعفر طوسی تھے اور قاضی عماد الدین حسن بن محمد استر آبادی شاگرد سید مرتضیٰ علم الہدیٰ تھے۔ ان کے شاگردوں میں ابن شہر آشوب اور ابوالحسن منتجب الدین علی بن بابویہ ہیں۔ وہ اپنے استاد کے بارے میں فرماتے ہیں:

شیخ امام ابوالفتح حسین بن علی بن محمد خزاعی رازی، عالم، واعظ، مفسر ومتدین می باشد او تالیفی دارد که یکی از آنها تفسیری است که به نام روض الجنان و روح الجنان در بیست جلد.

وہ خود اس تفسیر کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

چون بیشتر مردم عربی نمی دانستند کتاب را بپارسی تالیف نموده ام این کتاب بیشتر جنبه وعظ و تنبیه دارد امّا در عین حال شامل توضیحات ادبی دقیق درباره صرف و نحو و لغت عرب و نیز تعلیماتی در استدلال و معانی و بیان و شعر و اصول فقه است.

''چونکہ بہت سے لوگ عربی نہیں جانتے، لہٰذا میں نے کتاب فارسی زبان میں تحریر کی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر وعظ کا پہلو اور تنبیہ ہے اور اسکے ساتھ ساتھ توضیح ادبی اور دربارۂ صرف ونحو اور لغت عربی نیز تعلیماتی استدلالی معانی و بیان اور شعر اور اصول فقہ ہے۔''

ابوالفتوح نے احادیث کو صرف شیعوں کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ احادیث اہلسنت سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ اختلافات کے مواقع پر شیعوں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ تفسیر شیخ طوسی کی تفسیر التبیان سے مشابہت رکھتی ہے۔

جو تفسیر زیر بیان ہے اور جو ہمارا مدعا اور مقصود ہے، اب ہم اس جانب اپنی توجہات کو منعطف ومبذول کرتے ہیں۔

آج سے تیس سال قبل مرزا مہدی نے پاکستان میں ایک میٹنگ کی تھی جس میں علامہ طالب جوہری، حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا رضی جعفر نقوی، پروفیسر محمد حسن رضوی اور میں (یعنی سید تلمیذ حسنین رضوی) موجود تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شیعوں کی اہم تفاسیر کا ترجمہ کیا جائے جن میں تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المیز ان نمایاں تھیں۔ نیز وہ تفسیر صافی کا بھی ترجمہ چاہتے تھے۔ المیز ان میرے ذمہ آئی تھی اور مجمع البیان کی ذمہ داری حضرت علامہ رضی جعفر نے قبول فرمائی تھی اور ہم دونوں نے کام شروع بھی کر دیا تھا۔ میں نے تفسیر المیز ان کی جلد اول کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا کہ اتنے میں مولانا سید حسن رضا غدیری نیو جرسی تشریف لائے اور فرمایا کہ ''میں نے نذر مانی ہے کہ میں تفسیر المیز ان کا ترجمہ کروں گا، تو آپ کی اجازت سے میں اس کے ترجمے کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔''

بہر حال میں نے اس ترجمے کا کام موقوف کر دیا اور مولانا رضی جعفر صاحب قبلہ کے ساتھ تفسیر مجمع البیان کا ترجمہ شروع کر دیا اور تفسیر سوۂ یونس کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا لیکن وہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ اس کے بعد میں نے علامہ سید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ کی تائید سے تفسیر صافی کا ترجمہ نیو جرسی میں قیام کے دوران شروع کیا جو بحمد للہ سات جلدوں میں مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے اور بحمد للہ اسے کافی شرف اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اللہ بھلا کرے ایک مرد مومن کا جو نیویارک کے کیپیٹل سٹی میں کافی عرصے سے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، جناب امداد امام صاحب۔ انھوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ مجمع البیان کا اردو میں ترجمہ کروانا چاہتے ہیں اور ایک رقم بھی اس کام کے لئے مختص کر دی۔ میں نے نظر دوڑائی کہ میں کسی سے اپنی نگرانی

میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں تو مسلم یونیورسٹی کے استاد پروفیسر ڈاکٹر طیب رضا پر نظر پڑی، جنھوں نے تفسیر مجمع البیان پر اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی تھی۔ کام ان کے ذمہ لگایا۔ قرآن کا ترجمہ میرا تھا اور یہ کام میری نگرانی میں انجام پا رہا ہے۔ الحمدللہ دس جلدوں میں سے سات جلدوں کا ترجمہ مکمل ہو گیا ہے اور بقایا تین جلدیں، جس کا آغاز سورۂ عنکبوت سے ہوتا ہے، آخر قرآن تک، میرے حصہ میں آیا ہے اور انشاء اللہ میں خود اسے انجام دوں گا۔

طباعت کی مشکلات کے سبب میں نے حضرت مولانا حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا صفی حیدر صاحب سکریٹری تنظیم المکاتب کی خصوصی توجہ پر یہ کام اب ان کے سپرد کر دیا ہے جو اپنی نگرانی میں، نوک پلک کی درستی، ترجمے کو خوبصورت بنانے، ترتیب وتزیین اور تصحیح کے تمام امور اپنے رفقائے کار جناب مولانا فیروز علی بنارسی صاحب اور مولانا محمد عباس معروفی صاحب سے انجام دلوا رہے ہیں اور امید ہے کہ پہلی جلد جو سورۂ بقرہ پر مشتمل ہے، وہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر جلد ہی منظر عام پر آ جائیگی۔

آج تک شیعی دنیا میں جتنی تفاسیر حیطۂ تحریر میں آئی ہیں، ان تمام تفاسیر میں تفسیر مجمع البیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس تفسیر کا مقام نہایت بلند ہے۔ یہ تفسیر عامۃ المسلمین میں بے حد مقبول اور پسندیدہ ہے۔ سب اس کی کاملیت، جامعیت اور انفرادیت کے قائل ہیں اور اس وقت سے لیکر آج تک کوئی مُفسّر اس تفسیر سے خود کو مستغنی نہیں پاتا بلکہ ہر مُفسّر نے تفسیر مجمع البیان کا حوالہ سپرد قلم کیا ہے۔ فیض کاشانی سے لیکر تفسیر المیز ان تک سب اسی تفسیر کے خوشہ چین ہیں۔

تفسیر مجمع البیان کے مؤلف امین الاسلام ابوعلی فضل بن حسن بن فضل طبرسی علیہ الرحمہ قرن ششم کے اعلام میں محسوب ہوتے ہیں۔ علامہ طبرسی کا تعلق ایک بزرگ علمی اور روحانی خاندان سے ہے۔ یہ تفرش کے باشندے تھے۔ اس کے بعد آپ نے خراسان کی جانب ہجرت فرمائی۔ دراصل طبرس اور تفرش ایک ہی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ آپ نے مشہد مقدس میں اقامت اختیار کی اور عمر کے آخری حصے میں عازم سبزوار ہوئے اور وہیں پر آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کا جنازہ مشہد مقدس لے جایا گیا، خیابان طبرسی جوان کے نام سے منسوب ہے اور وہیں پر ان کی قبر مبارک ہے۔

امین الاسلام طبرسی اپنے زمانے کے گوناگوں علوم سے بہرہ مند تھے جیسے فقہ، کلام، سیرت، تاریخ اور تفسیر، نحو، حساب، جبر اور مقابلہ وغیرہ۔ انھوں نے کل تین تفسیریں لکھیں۔ جن میں ایک تفسیر کا نام اَلْوَسِیْط

ہے جو جَوَامِعُ الْجَامِع کے نام سے مشہور ہے اور ایک تفسیر اَلْوَجِیْز ہے جس نام اَلْکَافِی عَنِ الْکَشَّاف ہے۔ اس کا سبب تالیف کشاف زمخشری کی تالیف ہے۔ اس کے مطالب انھیں پسند آئے تو اس طرز کی تفسیر لکھ ڈالی۔ آپ نے طویل بابرکت زندگی پائی اور قرن خامس وسادس میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر پائی۔ اور ان کی وفات حسرت آیات شب عیدالاضحیٰ ۵۴۸ھ ہجری کو ہوئی اور اس طرح علم کی یہ شمع بجھ گئی اور قیامت تک علم کی ضیاباریاں چھوڑ گئی۔

ان کی کتاب تفسیر مجمع البیان لعلوم القرآن کو جامع الازہر نے نہایت اہمیت کا حامل قرار دیا اور تقریب بین المذاہب کے سلسلے میں اس کا نام آیا۔ ۴/ ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۲۶/ جولائی ۱۹۵۲ء شیخ الجامع الازہر وکیل جامعۃ التقریب بین المذاہب الاسلامیہ عبدالمجید سلیم نے اپنے لیٹر پیڈ پر ایک بیان جاری فرمایا جس کا اقتباس پیش خدمت ہے:

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ کِتَابَ مَجْمَعِ الْبَیَانِ لِعُلُوْمِ الْقُرْاٰنِ الَّذِیْ اَلَّفَهُ الشَّیْخُ الْعَلَّامَۃُ ثِقَۃُ الْاِسْلَامِ اَبُوْ عَلِیِّ الْفَضْلُ بْنُ الْحَسَنِ بْنِ الْفَضْلِ الطَّبَرْسِیُّ مِنْ عُلَمَاءِ الْقَرْنِ السَّادِسِ الْهِجْرِیِّ هُوَ کِتَابٌ جَلِیْلُ الشَّأْنِ، غَزِیْرُ الْعِلْمِ، کَثِیْرُ الْفَوَائِدِ، حَسَنُ التَّقْرِیْبِ .لَا اَحْسَبُنِیْ مُبَالِغاً اِذَا قُلْتُ اِنَّهٗ فِیْ مُقَدَّمَۃِ کُتُبِ التَّفْسِیْرِ الَّتِیْ تُعَدُّ مَرَاجِعَ لِعُلُوْمِهٖ وَبُحُوْثِهٖ.

وَلَقَدْ قَرَأْتُ فِیْ هٰذَا الْکِتَابِ کَثِیْراً وَّرَجَعْتُ اِلَیْهِ فِیْ مَوَاطِنَ عِدَّۃٍ فَوَجَدْتُّهٗ حَلَّالَ مُعْضِلَاتٍ، کَشَّافَ مُبْهَمَاتٍ وَّوَجَدْتُ صَاحِبَهٗ رَحِمَهُ اللّٰهُ عَمِیْقَ التَّفْکُّرِ، عَظِیْمَ التَّدَبُّرِ، مُتَمَکِّناً مِّنْ عِلْمِهٖ، قَوِیّاً فِیْ اُسْلُوْبِهٖ وَتَعْبِیْرِهٖ شَدِیْدَ الْحِرْصِ عَلٰی اَنْ یُّجَلِّیَ لِلنَّاسِ کَثِیْراً مِّنَ الْمَسَائِلِ الَّتِیْ یُفِیْدُهُمْ عِلْمُهَا.

امابعد یہ کتاب مجمع البیان العلوم القرآن، جسے تالیف کیا ہے شیخ علامہ ثقۃ الاسلام ابوعلی الفضل بن الحسن بن الفضل طبرسی نے، جو قرن سادس ہجری کے علماء میں سے ہیں۔ یہ کتاب جلیل الشان، علم سے بھرپور، بے انتہا مفید، مختلف مذاہب کو بہترین اسلوب سے قریب کرنے والی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ یہ تفسیر مقدمہ ہے کتب تفسیر کا جو اپنے علوم وابحاث کے مراجع تصور کئے جاتے ہیں اور میں نے اس کتاب کا کافی مطالعہ کیا ہے اور مختلف مقامات میں اس کی جانب رجوع کیا ہے۔ تو میں نے اس کتاب کو مشکلات کا حل منصور کیا۔ مبہمات کی وضاحت کرنے والا پایا اور میں نے صاحب تفسیر رحمۃ اللہ علیہ کو ایک گہری نظر رکھنے والا، بہت بڑا مدبر مسندِ علم پر چیرہ دست اور جاگزیں پایا اسلوب اور تعبیر میں توانائیوں سے بھرپور اور

اس تگ ودو میں مصروف پایا کہ بیشتر مسائل جو ہمارے لئے سودمند ہیں انھیں ہم پر جلی بلکہ منجلی کردیں۔

مجمع البیان لعلوم القرآن جب مرکز البحوث والدراسات العلمیہ جو مجمع العالمی للتقریب بین المذاہب کے تابع ہے، اس کے اذن خاص سے ۱۴۱۷ھ ہجری مطابق ۱۹۹۶ء کو اس کتاب کی دوبارہ طباعت ہوئی تو اس میں 'تقدیم الکتاب' کے عنوان سے بقلم فضیلۃ الاستاذ الجلیل الشیخ محمود شلتوت وکیل جامع الازہر کا نہایت مبسوط مقالہ بصورت تقریظ شائع ہوا، جو مطبوعہ کتاب کے تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مقدمہ تحریر کرتے وقت یہ التزام واہتمام کیا کہ خود ابوالفضل طبرسی کے 'مقدمۃ الکتاب' سے ایک اقتباس، جو بیس سطروں پر مشتمل ہے، اس سے اپنے مقدمے کا آغاز کیا ہے۔

وَ شَمَّرْتُ عَنْ سَاقِ الْجِدِّ وَ بَذَلْتُ غَايَةَ الْجُهْدِ وَ اَسْهَرْتُ النَّاظِرَ وَ اَتْعَبْتُ الْخَاطِرَ وَ... وَ لِلنَّاسِكِ ذَخِيْرَةٌ وَلِلْمُتَكَلِّمِ حُجَّةٌ وَلِلْمُحَدِّثِ مَحَجَّةٌ وَلِلْفَقِيْهِ دَلَالَةٌ وَلِلْوَاعِظِ آيَةٌ الخ

اور میں عظیم جمع آوری پر متوجہ ہوگیا۔ میں نے بے انتہا کاوش وکوشش سے کام لیا اور میں نے خود کو بیدار رکھا اور دل کو مشقت کے سپرد کیا۔ مختلف النوع تفاسیر کو پیش نظر رکھا اور اللہ تبارک وتعالی سے توفیق اور آسانی کا طلبگار رہا۔ پھر میں نے اس کتاب کی تالیف کا آغاز کردیا جو تلخیص اور تنظیم میں بہتر ہے۔ اس میں جملہ علوم و فنون کو یکجا کردیا گیا ہے اور اس کے نصوص اور اصل عبارت پر مشتمل ہے جیسے قرائت کا علم، اعراب ولغات کا علم، اس کے غوامض (مبہم) امور کا علم، مشکلات کا علم، اس کے معانی ومطالب کا علم، اس کے نزول واخبار، قصص وآثار، اس کے حدود واحکام، اس کے حلال وحرام، باطل کنندہ کے مطاعن (طعن وتشنیع) پر گفتگو اور ان دلائل براہین کا تذکرہ۔ ہمارے اصحاب رضی اللہ عنہم نے بہت سے مقامات میں ان کی صحت کا اعتقاد رکھتے ہوئے اصول وفروع اور معقول ومسموع میں سے اعتدال اور اختصار کو ملحوظ خاطر کرتے ہوئے اُن سے استدلال کیا ہے۔ جو اختصار سے بالا ہے اور اکثار سے نیچے ہے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں دل اور قلوب علوم کثیرہ کا بوجھ سنبھالنے کے قابل نہیں اور قدر ومنزلت کے موقع پر ان کے فوائد کا اجراء کمزور پڑجاتا ہے۔ اس لئے کہ علماء کا صرف نام باقی رہا ہے اور علوم وفنون سے صرف عہد وپیمان رہ گیا ہے اور میں نے ہر سورہ کے آغاز میں اس کے مکی اور مدنی ہونے کا ذکر کیا ہے، پھر آیات کی تعداد میں اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ پھر اس کی تلاوت کی فضیلت بیان کی ہے، پھر اس آیت کے اختلاف قرأت کو پیش کیا ہے، پھر علتوں واسباب اور احتجاجات کو بیان کیا ہے، پھر عربیت ولغات کا تذکرہ کیا ہے، پھر اعراب ومشکلات کا ذکر کیا ہے، پھر اسباب نزولات کا بیان کیا ہے،

پھر معانی واحکام وتاویلات ہیں اور قصے اور جہات ہیں، پھر نظم آیات ہے؛ یہاں تک کہ میں نے اس کی عربیت میں ہر روشن نشانی کو جمع کر دیا ہے، اس کے اعراب میں واضح حجت کو بیان کیا ہے، معانی و مطالب میں ہر قول متین اور مشکلات میں ہر برہان مبین کو لیکر آیا ہوں اور وہ بحمد للہ ادب کے لئے عمدہ اور بہترین، نحوی کے لئے سرمایہ قاری کے لئے سامان بصیرت اور عابد کے لئے ذخیرہ اور متکلم کے لئے حجت اور محدث کے لئے ایک شاہراہ مستقیم اور فقیہ کے لئے رہنمائی اور واعظ کے لئے آلۂ کار ہو۔ (محمود شلتوت اس اقتباس کے بعد اپنی رائے دیتے ہیں)

ان وصف کنندہ عبارتوں سے، جو واضح کرنے والی ہیں پیش کیا ہے امام سعید امین الاسلام ابوعلی الفضل بن الحسن طبرسی نے، اپنی اس کتاب 'جلیل الشان' کو، جو تفسیر جامعہ کے درمیان تنہا بے نظیر کتاب ہے اور میں نے ان عبارتوں کو اس سے بہتر اس کے اوصاف کا بیان کنندہ نہیں پایا اور نہ ہی اس کے منہج کا اس سے عمدہ بیان دیکھا۔ تو میں نے ترجیح دی کہ اس کی جولان گاہ کو وسیع کردوں اور اسے قاری کے مطالعے کے لئے سب سے افضل رکھوں اور یہ اس صورت میں ممکن ہوا جب میں کتاب کے مطالعہ کے دوران ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا اور میں مطلع ہو گیا کہ بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں گزرنے والے کے قدم پھسل سکتے ہیں، افہام میں رکاوٹیں آسکتی ہیں اور قلم تنگنائے سے گزرسکتا ہے۔ تو میں نے ویسا ہی پایا جیسا کہ صاحب کتاب نے اس کی توصیف کی ہے اور میں نے جان لیا کہ جو کچھ تفسیر سے متعلق نہیں ہے، اسے بڑھایا نہیں ہے اور ضرورت جس کی متقاضی نہیں تھی، اس کا اعادہ نہیں کیا۔

اور میں یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ یہ کتاب کتب تفسیر کے مابین تنہا تانا بانا ہے؛ اس لئے کہ وسعت بحث، گہرائی اور تنوع کے ساتھ ساتھ اس کی ایک مخصوص ترتیب ہے۔ نظم ونسق اور تہذیب ہے۔ اس سے بیشتر جو کسی کتاب میں نظر نہیں آتی اور نہ ہی ہمیں اس کے بعد تحریر شدہ کتب میں یہ بات دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ لیکن ہماری زیر بحث کتاب پہلی کتاب ہے جو ہر لحاظ سے اکمل ہے۔ جو کتب جامعہ کی تفسیر سے مؤلف ہے۔ صاحب مجمع البیان نے اس میں مکمل بحث کی ہے۔ درس میں گہرائی ہے اور تفسیر سے متعلق ہر امر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب منظم اور منفرد انداز میں تقسیم اور تنظیم پر قائم ہے۔ یہ کتاب دراصل قرآن کریم کی خدمت ہے، نہ کہ قرآن کے لغویین کی خدمت، نہ ہی قرآن کے فقیہوں کی خدمت اور نہ ہی اس میں سیبویہ کے نہج پر آیات قرآنی کی تطبیق ہے، نہ عبدالقاہر کی بلاغت ہے، نہ یونان وروم کا فلسفہ ہے اور نہ ہی کسی

خاص مذہب سے وابستگی کا سامان ہے۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امام طبرسی بعض مواقع پر اپنے مذہب کی روایات سے گزر کر دوسرے مذاہب کی روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم بطور مثال اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کررہے ہیں:

اور کہا گیا ہے کہ 'صراط مستقیم' کے معنی میں کئی پہلو ہیں:

پہلا: یہ کہ اس سے مراد کتاب خدا ہے اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور ابن مسعود سے مروی ہے۔

دوسرا: اس سے مراد اسلام ہے اور یہ جابر اور ابن عباس سے مروی ہے۔

تیسرا: یہ کہ اس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کا دین ہے کہ بندوں سے اس کے علاوہ کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور یہ محمد بن حنفیہ سے مروی ہے۔

چوتھا: یہ کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وہ ائمہ علیہم السلام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائم مقام اور ان کے جانشین ہیں وہ مراد ہیں اور ہماری احادیث میں یہ روایت بیان کی گئی ہے۔

شیخ طبرسی نے سب سے بہتر بات یہ کی کہ آیت کا عموم پر محمول کیا تا کہ اس میں سب داخل ہو جائیں۔ اس لئے کہ 'صراط مستقیم' ہی وہ دین ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے صادر فرمایا ہے۔ جس میں توحید، عدل اور اللہ تعالیٰ نے جن کی اطاعت واجب قرار دی ہے، ان کی ولایت ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ آخری روایت جو ائمہ علیہم السلام کے بارے میں ہے، یہ مذہب شیعہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور یہی ان کی حدیث میں روایت کی گئی ہے۔ لیکن مؤلف کتاب (ابوالفضل طبرسی) اس کے باوجود اسے ترجیحی بنیاد پر آغاز میں نہیں لائے، بلکہ دوسری روایات پیش کرتے ہوئے اسے بھی پیش کر دیتے ہیں۔ پھر بھی اس آیت کا عموم پر محمول کرتے ہیں اور کس قدر عمدہ اور بہترین بات فرماتے ہیں! اور یہ کہ اس کی ولایت جس کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے! اور یہ کہ خواہ وہ شیعہ ہو یا سنی ہو، دونوں اس عبارت سے دور نہیں جائیں گے اور کنارہ کش نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ ہر مومن کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ موجود ہے جس کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے اور ان کے سرخیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور اولوالامر ہیں اور سب سے بڑا علمی تفوق یہ ہے کہ صاحب مجمع البیان نے اس فصل میں مسئلہ ولایت وامامت پر بحث نہیں کی؛ اس لئے کہ یہ موقع ومحل اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ لیکن مؤلف کا کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود

ایسی عبارت کا انتخاب کیا جس سے سب لوگ راضی ہو جائیں اور کوئی فکر اس سے جدا نہ ہو جائے اور انتشار کا شکار نہ ہو۔

اس مقام پر صاحب فضیلت استاد جلیل الشیخ محمود شلتوت وکیل جامع الازہر کا بیان اختتام پذیر ہوا۔

صاحب مجمع البیان لعلوم القرآن اپنے مقدمہ کتاب میں فرماتے ہیں:

''پھر تمام علوم میں اشرف اور سب سے اعلیٰ، سب سے زیادہ ظاہر و باہر، سب سے عمدہ، سب سے زیادہ صاحب جلالت، سب سے زیادہ افضل، سب سے زیادہ منفعت بخش اور سب سے زیادہ منزل کمال پر فائز علم قرآن ہے اس لئے کہ یہی تمام علوم کی اصل وحقیقت ہے۔ اسی سے تمامتر شاخیں پھوٹتی ہیں اور اسی بنیاد پر قوانین وقواعد کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں اور فرمایا ہے امیر المومنین اور سید الوصیین حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام نے کہ قرآن کا ظاہر نہایت عمدہ اور نفیس ہے اور اس کا باطن نہایت گہرا اور عمیق ہے۔ اس کے عجائبات فنا پذیر نہیں ہیں اور اس کے غرائبات ونوادرات کی کوئی انتہا نہیں۔ عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر تم علم کے خواہاں اور متلاشی ہو، تو پھر قرآن کی کاشت کرو؛ اس لئے کہ اس میں اولین وآخرین کا علم ہے اور سعید بن قتادہ نے اللہ تعالیٰ کے قول: وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (یعنی جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا) کے ذیل میں فرمایا کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ رجاء بن حیاۃ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے والد گرامی معاذ بن جبل کی خدمت اقدس میں حاضر تھے۔ انھوں نے میرے والد سے دریافت کیا یہ لڑکا کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا: یہ میرا فرزند رجاء ہے۔ تو معاذ نے دریافت کیا کہ کیا تم نے اسے علم قرآن سے آشنا کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ تو معاذ بن جبل نے میرے والد سے کہا کہ تم اپنے بیٹے کو قرآن کی تعلیم دو اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب بھی کوئی شخص اپنے بیٹے کو علم قرآن سے آشنا کرتا ہے، اسے روز قیامت بادشاہوں کا تاج پہنایا جاتا ہے اور ایسے حلے زیب تن کرائے جاتے ہیں کہ ایسے حلے کبھی اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھے ہوں گے۔ پھر رجاء کہتے ہیں کہ معاذ بن جبل نے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ مارا اور فرمایا اگر تم اس بات کی استطاعت رکھتے ہو کہ اپنے والد کو روز قیامت حلہ زیب تن کراؤ تو ایسا کر گزرو!''

اور ابن عباس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بھی قرآن کے بارے میں بغیر جانے بوجھے کچھ کہہ دیا، تو

پھر اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عوام وخواص کی روایات میں وارد ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک میں تمہارے درمیان چھوڑے جارہا ہوں۔ جب تک اس سے تمسک رکھو گے، کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اپنی عترت جو بصورت اہل بیت ہے اور یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس وارد ہوں۔''

ابوالفضل طبرسی صاحب مجمع البیان لعلوم القرآن اس کتاب کی داستان خود بیان فرماتے ہیں۔ ان کی زبانی سنئے:

''میں بھرپور شباب کے گہوارے میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ چڑھتی ہوئی جوانی تھی۔ زندگی تروتازہ اور بھرپور تھی۔ ٹہنی میں تروتازگی تھی۔ اہل وعیال میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ شوق مارے ڈال رہا تھا اور محبت ڈورے ڈال رہی تھی کہ کتاب تفسیر کی جمع آوری کروں۔ جو لطیف اسرار نحویہ سے منظم ہو اور جس میں لغت شریفہ کی جھلک ہو اور قرأت کی مکمل جہات سے جس کے فائدے دیرپا ہوں اور مکمل جہات سے حُجّج قاطعہ سے مرصع ہو۔ اس کتاب میں معانی ومفاہیم سے استنباط کئے ہوئے جامع ترین بیانات کو یکجا کردیا گیا ہو۔ جنھیں پوشیدہ مقامات سے منظر عام پر لایا گیا ہو اور ان کے علاوہ دیگر بھرپور علوم کی کارفرمائی ہو۔ جن پر نہ کسی قسم کا غلاف چڑھا ہو اور نہ ہی وہ پردے میں چھپا ہو۔ وہ اس طرح تمہارے سامنے زمانے کے واقعات کو مدنظر رکھ دے۔ پیش آنے والے واقعات کی رکاوٹوں اور موانع کو واضح کردے۔ غم وہم کی واردات کو آشکار کردے۔ حتمی قضا وقدر کے ہفوات (لغزشوں) سے بچالے اور یہ سلسلہ طویل تر ہوتا گیا۔ جبکہ میں عمر کے ساٹھویں سال میں داخل ہو گیا۔ میرے سر کے بال بڑھاپے کی دہلیز کو چھونے لگے اور میری صندوقچی عیب سے مملو ہو گئی۔ تو پھر اس عزیمت کی تکمیل کے لئے مجھے آمادہ کیا، شوق دلایا، جو کچھ نوازش اور عنایت مجھے نظر آئی، مولانا امیر سید اجل عالم صاحب نعمت جلال الدین، رکن الاسلام ملوک وسلاطین کے مخلص سید نقباء شرف، امرائے سادات کے تاج، فخر آل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابو منصور محمد بن یحییٰ ابن ہبۃ اللہ الحسینی، اللہ ان کے علو مرتبت کو دوام بخشے اور ان کے دشمنوں کو تنہا اور رسوا کرے۔ اس علم کے ذریعہ اور اس فن کی صحیح اور سچی معرفت حاصل کرنے کے لئے ان کے رغبت کو سچ ثابت کردے، ان کی ہمتوں کو حقائق کی تحصیل کے لئے کوتاہ تر کردے اور اس کے علم کی جلالتوں اور باریک بینیوں کو شامل کرلیا جائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے گذارش کی جاسکتی ہے کہ آپ کے بلند و رفیع الشان وجود سے اسلام اور مسلمانوں کی حمایت وحفاظت ہو اور صاحبان فضل اور افاضل پر ان کی سیادت کی

عطا و سخا جاری ہے اور علم اور علماء پر ان کی ہمائے سعادت کی مدد کا فیضان ہوتا رہے اور ان کا اقبال آسمان کی رفعتوں میں چمک دمک دکھلاتا رہے۔ بلند و بالا پہاڑ بھی جسکی رفعت کو نہ چھو سکیں اور بلند و بالا عمارت کو ایسی وقعت اور علوشان بخش دے کہ جس تک رسائی کی تمنا بھی نہ کی جائے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو خوشگوار، شاندار، قابل سکونت، مجد شرف کے سایے تلے رکھے اور ان کے فضل و شرف کا جلال زر و جواہرات سے آراستہ ہو اور ان پر بیش قیمت پردے پڑے ہوئے ہوں اور ان کی چمک جمال کو دوام ہو۔ بلند و بالا چوٹیوں کے منظر اعلیٰ پر اور ان کے سایے کا حسن و بہا ہر طرف پھیلا رہے تا کہ آرزوؤں، آشناؤں اور تمناؤں کی انتہائی منزل تک رسائی حاصل ہو سکے اور اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے پرچموں اور جھنڈوں کو بلند و بالا کیا جائے اور اپنی خواہشات پر بلا شرکت غیرے فائز المرام ہو جائے اور اس کی نیک بختی اور سعادت پر نشانیاں واضح اور آشکار ہوں اور ہر سو، ہر جگہ اُس کے مجد و شرف کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہے اور شمس عالم تاب بنفس نفیس اسے جلا بخشتا رہے۔"

ابوالفضل طبرسی علیہ الرحمہ نے سورتوں اور آیتوں کی تفسیر سے پہلے کچھ مقدمات بیان کئے ہیں جن کی معرفت علوم قرآنی کو سمجھنے میں مدو معاون ہیں جن میں سات فنون کو جمع کیا ہے:

پہلا فن آیات قرآنی کی تعداد اور ان کی معرفت کا فائدہ۔

دوسرا فن مشہور قاریوں کے اسمائے گرامی جن کا مختلف شہروں سے تعلق ہے اور ان کے رُوات۔

تیسرا فن ذکر، تفسیر، تاویل، معنی اور ایسے مختصر جملوں کی تحریر جن کی طرف کتاب میں پیش کئے جانے والے کلام کی تنظیم ہوتی ہے۔

چوتھا فن قرآن کریم کے اسماء اور ان کے مفاہیم۔

پانچواں فن علوم قرآنی سے متعلق ایسی چیزیں جن کی تشریح دشوار ہے اور اس کے بارے میں کلام کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا، جو ان کے مقامات سے مختص ہے اور اس بارے میں جو کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔

چھٹا فن کچھ وہ باتیں جو مشہور احادیث میں وارد ہوئی ہیں قرآن اور اہلِ قرآن کی فضیلت کے بارے میں۔

ساتواں فن اس بات کا تذکرہ کہ قاری کے لئے مستحب ہے کہ خوبصورت آہنگ میں قرآن کی تلاوت کرے اور قرأت قرآن کو مزین و آراستہ کر کے پڑھے۔

مقام شکر ہے کہ یہ مقدمہ، جو تفسیر مجمع البیان لعلوم القرآن کے سلسلہ میں حیطۂ تحریر میں پا گیا تھا، وہ

پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس سلسلہ میں میرے دونوں فرزندوں سید ندیم افتخار رضوی اور حجۃ الاسلام سید رضوان رضوی نے میری کافی مدد کی ہے۔ خداوند متعال ان کی توفیقات میں اضافہ کرے اور اس تفسیر کے لئے جن جن افراد نے کوششیں اور کاوشیں کی ہیں، وہ ان کے حسنات میں داخل کر دے۔ آمین یا رب العالمین!

مقدمة الكتاب

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی جلالت فکر کی پرواز سے بلند ہے، جس کی عزت ہمت و جرأت سے پرے اور جس کی صفت لوگوں کی مشابہت سے برتر ہے، اس کی حکمت نے فکر و شعور کو عاجز کر دیا ہے۔ جس کی عظمت وہم و گمان سے بلند ہے۔ وہ ایسا پروردگار ہے جس کے لئے ہر اس چیز میں جسے آنکھیں دیکھتی ہیں، زبانیں بیان کرتی ہیں، پاکیزہ عقلیں اسے درک کرتی ہیں، بیدار قلوب اسے پہچانتے ہیں، ان سب میں اس کی وحدانیت پر واضح نشانیاں اور اس کی ربوبیت پر گویا دلائل ہیں۔ وہ ایسا واحد ہے قدامت میں جس کا کوئی ثانی نہیں ہے اور عدم کے بعد چیزوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے چیزوں کو فکر کی جولانیوں کے بغیر پیدا کیا اور غالب طبیعت کے بغیر پیدا کرنے والا ہے۔ وہ ہر شئے پر اپنے غلبے اور اپنی قدرت سے ظاہر اور اپنے علم اور لطیف کاریگری کے ذریعہ ہر چیز میں جلوہ نما ہے۔ وہ ایسا اول ہے جس کے پہلے کوئی اول نہیں تھا اور ایسا آخر ہے جس کے بعد کوئی آخر نہیں۔ اس کو عطا کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں اور وہ جس سے اپنے دست عطا کو روک لے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی کا عالی مرتبت ہونا اس کے مقابل میں سود مند نہیں۔

میں اس کی پے در پے نعمتوں پر اور ظاہر و باطن احسانات پر اس کی تعریف کرتا ہوں۔ ایسی تعریف جو اس کے سخاوت کے چشمے جاری کر دے اور اس کے بچے ہوئے فضل و کرم کو بھی نازل کروا دے، ایسی تعریف جو دائمی ہو اور کبھی ختم ہونے والی نہ ہو۔ ایسی حمد جو اسی جیسی مزید حمد کی دعوت دے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ واحد، یکتا اور بے نیاز ہے اور نہ اس نے کسی کو جنم دیا ہے اور نہ اسے کسی نے جنم دیا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔

میں اپنے واضح بیان اور بہترین لہجے میں اس سے ملتجی ہوں کہ وہ اپنے نبی، اپنے صفی، اپنے حبیب اور لائق ستائش حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجے جو انبیاء و مرسلینؑ کے سردار ہیں، اولین و آخرین میں سب سے بہتر ہیں، اس کے پیغام کی پرزور تائید کرنے والے اور اس کی شریعت کو دوام عطا کرنے والے

ہیں، وہ شریعت جس ذریعہ گذشتہ ادیان کو منسوخ کر دیا گیا، قیامت تک ان کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور ان کی آل پر رحمت نازل کرے جو ان کی عترت اور ان کے سرچشمۂ ہدایت کی شاخ ہیں، اس کی حکمت کے امانتدار اور اس کی شریعت کے محافظ ہیں۔ وہ اسلام کے پرچم اور انسانوں کے امام ہیں ان پر درود و سلام اس وقت تک جب تک گردش لیل و نہار جاری اور سلسلۂ نور و ظلمت قائم ہے۔

اس کے بعد پھر تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے قرآن نازل کیا جو لوگوں کے لئے ہدایت اور جس میں ہدایت و فرقان کی واضح نشانیاں ہیں۔ ایسا نور ہے جس سے چراغ روشن ہوتے ہیں اور صبحیں منور ہوتی ہیں، جو ایسی دلیل ہے کہ جس کے براہین خاموش نہیں ہوں گے اور ایسا حق ہے جس کے مددگاروں کو تنہا نہیں چھوڑا جائے گا، جو مضبوط رسی ہے اور اس کی چوٹیاں محافظ پہاڑ ہیں جو سینوں کے لیے شفا ہے، جس کے بعد کسی شفا کی ضرورت نہیں اور دلوں کی دوا ہے جس کے مثل کوئی دوا نہیں ہے، ایسا امام ہے جس کی اقتدا کرنے والے اقتدا کرتے ہیں اور ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعہ طالبان ہدایت ہدایت پاتے ہیں۔ اللہ نے اسے اماموں کے دلوں کے لیے تازہ بہار قرار دیا ہے۔ یہ قرآن حکمتوں کا گلشن اور علوم وفنون کے چشمے بلکہ سمندر ہے۔ حق و حقیقت کی وادی اور عدل و صداقت کا گلستاں ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ باطل نہ جس کے سامنے سے آسکتا ہے نہ ہی پیچھے سے، یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔

امابعد! پس تعظیم کی نسبت سب سے زیادہ فضیلت کا حق دار اور بہ اعتبار تقدیم سب سے زیادہ قابل ذکر علم ہے جس کا کل شرف اس کے نظام کی بنیاد پر ہے جس کا کرم اس کے ملاک اور قوام کی نسبت ہے، جس کی سرداری فقط اسی کو نصیب ہے جو اس کا اہل ہے، سعادت اسی سے وابستہ ہے، اسی علم ہی کے ذریعہ انسان اپنی زندگی میں عروج و کمالات حاصل کرتا ہے اور مرنے کے بعد اجر عظیم اور ذکر جمیل کا حق دار ہوتا ہے۔ جب ہر دوست خیانت کر دیں تو علم ہی سچا دوست ہے، جب کوئی قابل اعتبار شفیق و مہربان نہ بچے تو علم ہی بھروسہ مند شفیق ہے اور علماء انبیاءؑ کے وارث، مسلمانوں کے سردار اور روز جزا کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح روایت مرفوعہ میں جسے معتبر اور موثق اسناد کے ذریعہ نقل کیا گیا ہے اور پیشوائے ہدایت و پناہگاہ عالم امام علی رضا علیہ السلام نے اپنے آباواجداد ایک سید نے دوسرے سید سے، ایک امام نے دوسرے امام سے یہاں تک کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا ہے:

"بے شک! علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے"

لہٰذا علم مخزن علم اور صاحبان علم سے حاصل کرو کیوں کہ اللہ کے لئے علم کا سیکھنا نیکی، اس کا طلب کرنا عبادت، اس کا مباحثہ کرنا تسبیح اور اس پر عمل کرنا جہاد ہے۔ ناواقف کاروں کو علم سکھانا صدقہ ہے اور جو علم حاصل کرنے کا اہل ہے اسے سکھانا اللہ کی قربت کا سبب ہے کیوں کہ علم ہی حلال وحرام سے آگاہ کرتا ہے اور جنت کے راستہ کی ہدایت کرتا ہے۔ علم وحشت میں مونس، تنہائی میں دوست، خلوت میں ہم کلام خوشی اور غم میں راہنما، دشمنوں کے مقابل اسلحہ اور دوستوں کے نزدیک زینت ہے۔ اللہ علم کے ذریعہ قوموں کو بلندی عطا کرتا ہے اور انھیں خیر کا راہنما قرار دیتا ہے کہ جن کے نقش قدم کی اقتدا اور کردار کی پیروی کی جاتی ہے اور ان کی رائے کو تسلیم کیا جاتا ہے، ملائکہ ان سے دوستی کے خواہشمند ہوتے ہیں اور انھیں اپنے پروں سے مس کرتے ہیں۔ اللہ ان کی نماز میں برکت عطا کرتا ہے۔ ہر خشک وتر یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور دریائی مخلوقات اور خشکی کے درندے بھی ان کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ علم جہالت کے مقابلہ میں دلوں کی حیات،، تاریکی میں آنکھوں کی روشنی اور کمزوری کے مقابلہ میں جسموں کی طاقت ہے۔ علم بندہ کو اخیار کے درجات، ابرار کی بزم اور دنیا و آخرت کی بلند منزلوں پر لے جاتا ہے، علمی مباحثہ روزہ کے برابر ہے اور درس وتدریس نماز شب کے مساوی ہے، علم ہی کے ذریعہ اللہ کی اطاعت اور عبادت کی جاتی ہے اور قرابتداروں سے تعلقات قائم کئے جاتے ہیں اور حلال وحرام کی معرفت ہوتی ہے۔ علم عمل کا امام اور عمل اس کا تابع ہے جو نیکوکاروں کو الہام کے ذریعہ عطا کیا جاتا ہے اور بدبختوں کو اس سے محروم کردیا جاتا ہے۔ مبارکبادی اور خوشخبری ایسے انسان کے لیے ہے جسے اللہ نے علم میں اس کے حصہ محروم نہیں کیا ہے۔

ایسی احادیث بہت زیادہ ہیں جس کے ذکر سے ہم اپنے اس مضمون کو طول نہیں دینا چاہتے۔

ہاں! تمام علوم میں اشرف واعلیٰ اور سب سے نمایاں اور سب سے باعزت اور سب سے باجلالت، سب سے بافضیلت اور سب سے مکمل اور نفع بخش علم، علم قرآن ہے کیوں کہ علم قرآن ہی تمام علوم کی اصل ہے اور ہر علم اس کی فرع ہے۔ علم قرآن ہی کے قوانین پر اعتبار بنیاد ہے جس پر تمام علوم کی بنا رکھی جاتی ہے۔ حضرت امیرالمومنین سید الوصیین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا:

"قرآن کا ظاہر خوشنما اور باطن گہرا ہے، اس کے عجائبات کو فنا نہیں اور اس کے غرائب ختم نہیں ہوں گے۔"

عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے:

"جب تم علم حاصل کرنے کا ارادہ کرو تو قرآن کو ترجیح دو کیوں کہ اس میں اوّلین و آخرین کا علم ہے"

سعید نے قتادہ سے اللہ کی اس آیۂ کریمہ کے بارے میں کہ "وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيراً۔ جسے حکمت دے دی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا ہے" روایت کی ہے کہ خیر کثیر سے مراد قرآن ہے۔

رجاء ابن حیات نے روایت کی ہے کہ ایک دن میں اور میرے والد معاذ بن جبل کے پاس موجود تھے تو معاذ نے میرے والد سے دریافت کیا یہ کون ہے؟ میرے والد نے فرمایا: یہ میرا فرزند رجاء ہے۔ معاذ نے فرمایا: کیا آپ نے اسے قرآن کی تعلیم دی ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ معاذ نے کہا: اسے قرآن کی تعلیم دیجئے کیوں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ کوئی مرد ایسا نہیں ہے جو اپنے فرزند کو قرآن کی تعلیم دے مگر یہ کہ اللہ قیامت کے دن اس کے والدین کے سر پر بادشاہوں کا تاج رکھا جائے گا اور انھیں ایسا لباس پہنایا جائے گا کہ لوگوں نے اس جیسا لباس دیکھا ہی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد معاذؓ نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر مارتے ہوئے کہا: اے میرے فرزند: اگر تم قیامت کے دن اپنے والدین کو بہترین پوشاک سے آراستہ کرنا چاہتے ہو تو علم قرآن حاصل کرو۔

ابن عباسؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرمایا ہے: جو قرآن کے بارے میں علم کے بغیر کچھ بھی کہے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فریقین کی صحیح السند روایت میں وارد ہوا ہے:

"میں تمھارے درمیان اللہ کی کتاب اور اپنے اہلبیت کو چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان سے متمسک رہو گے گمراہ نہیں ہو گے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر بھی میرے پاس ایک ساتھ آئیں گے۔

ہم نے ان احادیث کے سلسلۂ اسناد کو اختصار کی خاطر اور علمائے حدیث کے نزدیک مشہور ہونے کی بنا پر حذف کر دیا ہے۔ قدیم وجدید علماء نے علم تفسیر قرآن میں بہت غور وخوض کیا ہے اور اس کے پوشیدہ اور محفوظ معانی کو ظاہر کرنے میں بڑی کد وکاوش کی ہے۔ وہ اس سلسلہ میں بہت سی کتابوں میں قرآن کی موجوں کی گہرائیوں میں اترے ہیں اور اس کی دلیلوں کی وضاحت میں بال کی کھال اودھیڑی ہے اور معانی قرآن کے دروازوں کو کھولنے میں تحقیق اور اس کے مختلف شعبوں میں چھان بین کی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے علماء نے صرف مختصر کتابیں لکھی ہیں اور ان میں انھیں روایتوں کو نقل کیا ہے جو ان تک پہنچی ہیں اور انھوں نے معانی کو پھیلانے اور اسرار سے پردہ اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی، سوائے تفسیر تبیان کے جسے شیخ جلیل وسعید ابو جعفر

محمد بن حسن طوسی قدس اللہ روحہ تحریر فرمائی ہے۔

یہ وہ تفسیر ہے جس سے حق کی روشنی حاصل کی جاتی ہے اور حق کا نور چمکتا ہے اور برحق روایت کی ہے۔ یہ تفسیر معانی ومفاہیم کے رموز واسرار اور لغت کے وسیع الفاظ پر مشتمل ہے، جس میں انھوں نے توضیح کی بغیر تدوین پر اور تحقیق کے بغیر تزئین پر قناعت نہیں کی۔ یہ وہ راہنما ہے جس کے انوار سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور اس کے نقش قدم کی پیروی کی جاتی ہے۔ ہاں چند مقامات جہاں اعراب ونحو کا تذکرہ ہے اس میں کچھ اشتباہ ہوا ہے اور معنی کے درمیان صحیح اور غلط کی تمیز بیان نہیں کی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے مقامات پر الفاظ مرادی معنی کے بیان سے قاصر ہیں اور حسن ترتیب اور بہترین تہذیب میں خلل واقع کر دیا ہے اور انھیں وجوہات کی بنا پر وہ تفسیر سالم دلوں میں پسندیدہ مقام حاصل نہیں کر سکی اور پاکیزہ ذہنوں میں بلند مقام تک نہیں پہنچ سکی۔ جب میں عنفوان شباب میں تھا تو مجھے علم تفسیر پر ایک کتاب جمع کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا، ایسی تفسیر جو علم نحو ولغت کے لطیف رموز واسرار پر مشتمل ہو اور جو قرأتوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو وضاحت اور معانی ومفاہیم کے تمام جوامع اور رموز کو بیان کر رہی ہو۔ اس وقت سے لیکر آج تک جب کہ میری عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے اور میرے سر کے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔ ابو منصور محمد بن یحییٰ بن ھبۃ اللہ الحسینی کی عنایتوں نے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی دعوت دی، اللہ ان کے نام کو روشن کرے کیوں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے محافظ ہیں اور ان کا فضل وشرف علم وعلماء پر قائم رہے۔

اس سلسلہ میں تمام کوششیں قرآن کی نسبت بہت کم درجہ کی ہیں لہٰذا میں نے اللہ سے استخارہ کیا اس کے بعد اس عظیم ذخیرہ کی جمع آوری پر متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس سلسلہ میں نہایت کدوکاوش کی، راتوں کو بیدار رہا، دل کو بہت تھکایا، بہت زیادہ غور وفکر کیا، مختلف تفسیروں کو سامنے رکھا اور اللہ سے توفیق وآسانی کا طلبگار رہا۔ پھر میں نے اس کتاب کی تالیف کا آغاز کر دیا جو انتہائی تلخیص اور تنظیم وترتیب میں بہتر ہے۔ میں نے اس علم کے اقسام اور فنون کو جمع کیا، ساتھ ہی علم قرأت، علم اعراب (تحلیل نحوی)، علم لغت، گہرے معنی، آیات کے شان نزول، اس سلسلہ میں پائی جانے والی احادیث، قصص وآثار، حدود واحکام، حلال وحرام اور مخالفین کے کلام کو جمع کیا۔ میں نے ان تمام چیزوں میں اختصار کی رعایت کی ہے کیوں کہ ہمارا زمانہ ان کثیر علوم کے برداشت کی طاقت نہیں رکھتا۔ ہم نے ہر سورہ کے ابتداء میں اس کے مکی اور مدنی ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر آیات کے عدد اختلاف کا ذکر کیا ہے پھر تلاوت کی فضیلت بیان کی ہے، پھر ہر آیت کے سلسلہ میں قرأتوں کا

اختلاف اور اس کے اسباب وعلل کا تذکرہ کرتے ہوئے اعراب (ترکیب)، لغت اور مشکل معانی کا ذکر کیا ہے، پھر اسباب نزول کو بیان کرتے ہوئے معانی، احکام، تاویلات، قصص و جہات کی نشاندہی کی ہے، پھر آیات کے نظم پر بحث کی ہے۔ہم نے اعراب (ترکیب) کے سلسلہ میں ہر طرح کی روشن دلیل، معانی کے سلسلہ میں ہر قول متین، مشکلات کی بابت ہر واضح دلیل کو بیان کیا ہے۔الحمدللہ یہ ادیب کے لیے عمدہ، نحوی کے لئے سرمایہ، قاری کے لیے بصیرت، عابد کے لئے ذخیرہ، متکلم کے لیے حجت، محدث کے لئے واضح راستہ، فقیہ کے لیے راہنمائی اور واعظ کے لیے ذریعہ ہے۔

ہم نے اس کا نام "مجمع البیان لعلوم القرآن" رکھا ہے۔میں امید رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ یہ کتاب معرفت کے سمندروں کی سیر کرانے والی اور آفاق و اکناف عالم میں پرواز کرانے والی ہے۔ترتیب وتہذیب کی علامت ہے۔شریعت کے احکام اس کے معنی سے مربوط اور حقیقت کے بیانات اس کی آیات سے متعلق ہیں۔ہم نے اس کتاب کو اللہ ہی کی مدد سے شروع کیا اور اسی کے بھروسہ پر تمام کر رہا ہوں۔

میں اس سے ہدایت کا سوالی ہوں، یہ اس کی دی ہوئی توفیق ہے، اسی پر توکل اور اس کی جانب بازگشت ہے۔

سوروں اور آیات کی تفسیر سے پہلے ہم نے اس تفسیر کو چند مقدمات سے شروع کیا ہے جن کی معرفت ان تمام حضرات کے لیے لازم ہے جو قرآنی علوم میں غور وخوض کرتے رہتے ہیں، ہم نے اس مقدمہ کو سات فنون پر مشتمل کیا ہے۔

فن اول

قرآن کی آیات کی تعداد اور اس معرفت کے فائدے کے متعلق ہے:

جاننا چاہئے کہ اہل کوفہ کے عدد اسناد کے اعتبار سے صحیح ترین اور اعلیٰ ترین عدد ہیں۔اس لیے کہ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام سے لیے گئے ہیں، جس کی تائید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد روایت کر رہی ہے۔جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

فَاتِحَةُ الْكِتَاب میں سات آیات ہیں جس کی ایک آیت: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہے۔

اہل مدینہ کی تعداد قاری ابو جعفر یزید بن القعقاع اور شیبہ بن نصاح کی جانب منسوب ہے یہ دونوں

مدنی اول ہیں اور اسماعیل بن جعفر کی جانب منسوب ہیں جو آخری مدنی ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ مدنی اول حسن بن علی بن ابی طالب (علیہم السلام) وعبداللہ بن عمر اور آخری مدنی ابوجعفر وشیبہ و اسماعیل ہیں۔ اس میں پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اہل بصرہ کی تعداد عاصم بن ابوصباح الجحدری اور ایوب بن متوکل کی جانب منسوب ہے۔ ان دونوں میں سوائے ایک آیت کے کوئی اختلاف نہیں ہے جو سورہ ص میں: ''فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ'' ہے۔ اس کا شمار جحدری نے کیا ہے اور ایوب نے اسے ترک کر دیا ہے اور اہل مکہ کی تعداد مجاہد بن جبر اور اسماعیل مکی کی طرف منسوب ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کی تعداد کسی کی جانب منسوب نہیں ہے بلکہ ان کے مصاحف میں ہر آیت کی ابتداء میں تین نقطے پائے گئے اور اہل شام کی گنتی عبداللہ بن عامر کی جانب منسوب ہے۔

قرآنی آیات کی تعداد کا فائدہ یہ ہے کہ جب قاری انھیں اپنی انگشت پر شمار کرتا ہے تو اس کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا ہاتھ بھی قرآن میں قلب اور زبان کے ساتھ مصروف رہتا ہے۔ یہ تمام چیزیں روز قیامت اس کی شہادت دیں گی اور ان سے سوال کیا جائے گا۔ یہ عمل یاد رکھنے سے زیادہ قریب ہے اس لیے کہ قاری سہو ونسیان سے محفوظ و مامون نہیں رہتا۔ عبداللہ بن مسعود کے واسطہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم سے روایت ہے، آپ نے فرمایا:

تَعَاهَدُوا الْقُرْآنَ فَاِنَّهٗ وَحْشِيٌّ۔

قرآن کو برابر دہراتے رہو اس لئے کہ یہ جلدی ذہن سے نکل جانے والا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض خواتین سے ارشاد فرمایا: انگلیوں پر شمار کرو ان سے سوال اور گویا ہونے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

حمزہ بن حبیب جو قُرّاء سبعہ میں سے ایک ہیں انھوں نے بیان کیا ہے کہ گنتی قرآن کی میخیں ہیں۔

فن دوم

شہروں میں مشہور قاریوں کے اسماء اور ان کی روایات کے بارے میں:

مدنی: ابوجعفر یزید بن القعقاع مدنی جو (قرّاء) سبعہ میں سے نہیں ہیں، بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن عباسؓ اور ان کے غلام عبداللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ المخزومی سے قرأت سیکھی، ان دونوں

نے اُبَیّ بن کعب سے اور اُبَیّ بن کعب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کی۔ جن کی ایک روایت ہے اور نافع بن عبدالرحمن نے ابوجعفر سے قرأت سیکھی اور ان سے تعلیم قرآن حاصل کی۔ شیبہ بن نصاح نے عبدالرحمن بن ہرمز اعرج سے اور انھوں نے ابن عباس سے ان کی تین روایتیں ہیں ورش کی روایت جو عثمان بن سعید ہیں، قالون کی روایت اور وہ عیسٰی بن مینا ہیں اور اسماعیل بن جعفر کی روایت۔

مکی عبداللہ بن کثیر ہیں ان کے سوا کوئی نہیں، جنھوں نے مجاہد سے قرأت سیکھی اور مجاہد نے ابن عباس سے جن کی تین روایتیں ہیں: البزی کی روایت، ابن فلیح کی روایت اور ابوالحسن القواس کی روایت، جب اہل مکہ اور اہل مدینہ جمع ہوں گے تو انھیں حجازی کہا جائے گا۔

کوفیوں میں اول عاصم بن ابی النجود بہدلہ ہیں جنکی دو روایتیں ہیں: حفص بن سلمان البزاز کی روایت اور ابوبکر بن عیاش کی روایت۔ ابوبکر بن عیاش کی تین روایتیں ہیں: ابو یوسف الاعشی کی روایت، ابوصالح برجمی اور یحیٰی بن آدم کی روایت اور حفص کی چار روایتیں ہیں (۱) ابوشعیب القواس (۲) ہبیرۃ التمار (۳) عبید بن صباح اور (۴) عمرو بن صباح۔ حمزہ بن حبیب الزیات کی سات روایتیں ہیں: (۱) عجلی عبداللہ بن صالح کی روایت (۲) رجا بن عیسٰی (۳) حماد بن احمد کی روایت (۴) خلاد بن خالد کی روایت (۵) ابوعمر الدوری کی روایت (۶) محمد بن سعدان النحوی کی روایت (۷) خلف بن ہشام کی روایت پھر ابوالحسن علی بن حمزہ الکسائی ہیں جن کی چھ (۶) روایتیں ہیں (۱) قتیبہ بن مہران (۲) نصیر بن یوسف نحوی اور (۳) ابوالحارث (۴) ابوحمدون زاہد (۵) حمدون بن میمون الزجاج اور (۶) ابوعمر الدوری۔ پھر خلف بن ہشام البزاز ہیں جو قرائے سبعہ سے نہیں ہیں۔ انھیں اختیار ہے، عاصم جنھوں نے ابوعبدالرحمن السلمی سے قرأت سیکھی۔ انھوں نے علی بن ابی طالبؑ سے اسی طرح انھوں نے زر بن حبیش سے اور انھوں نے عبداللہ بن مسعود سے، حمزہ نے جعفر بن محمد الصادق سے اسی طرح اعمش سلیمان بن مہران نے اعمش کے سامنے، اعمش نے یحیٰی بن وثاب کے سامنے اور انھوں نے علقمہ و مسروق اور اسود بن یزید کے سامنے اور ان تینوں نے عبداللہ بن مسعود کے سامنے قرائت کی اور حمزہ نے حمران بن اعین کے سامنے، انھوں نے ابوالاسود الدؤلی سے۔ انھوں نے (فنون قرأت) علی بن ابی طالبؑ سے حاصل کیے۔ کسائی نے حمزہ سے اور حمزہ ابن ابی لیلیٰ اساتذہ سے ملاقات کی، ان سے قرأت حاصل کی اور ابان بن تغلب اور عیسٰی بن عمرو غیرہ سے قرأت حاصل کی۔ جہاں تک بصری کی بات ہے تو ابوعمرو بن العلا کی تین روایتیں ہیں: شجاع بن ابی نصیر کی روایت۔

عباس بن الفضل اور یزیدی یحیی ابن المبارک کی روایت ۔ یزیدی کی چھ روایتیں ہیں: ابوحمدون زاہد، ابوعمر الدوری، اوقیہ، ابونعیم غلام شجادہ وابوایوب الخیاط اور ابوشعیب السوسی اور بصرہ سے یعقوب بن اسحاق الحضرمی، ابوحاتم سہیل بن محمد السجستانی کی روایت آخر کے دونوں قاری سات قاریوں میں نہیں تھے۔ یعقوب کی تین روایتیں ہیں: (۱) روح، (۲) زید اور (۳) رویس کی روایتیں۔ جب اہل بصرہ اور اہل کوفہ کا یکجا ذکر ہو تو انھیں عراقی کہا جائے گا۔

شام سے عبداللہ بن عامل یحصبی کے سوا کوئی نہیں ہے جنھوں نے مغیرہ بن ابی شہاب المخزومی سے قرأت حاصل کی اور مغیرہ نے عثمان عفان سے اور ان کی دو روایتیں ہیں: (۱) ابن ذکوان کی روایت اور (۲) ہشام بن عمار کی روایت۔

علماء نے بیان کیا ہے کہ لوگوں نے ان افراد کی قرأت پر اتفاق کیا اور ان کی اقتدا کی ہے، اتفاق واقتدا کے دو سبب ہیں:

اول: ان حضرات نے قرأت قرآن میں شدید انہماک سے کام لیا ہے اپنے اس علم فراواں کے باعث جو ان سے پہلے تھے یا ان کے زمانہ میں موجود تھے ان کے علم سے استفادہ کیا ہے۔ جن علماء کی جانب (علم) قرأت کی نسبت دی جاتی ہے جن کی قرأت نادر سمجھی جاتی ہے اور ان کی قرأت پر فقہ وحدیث جیسے علوم غالب ہیں۔

دوم: ان حضرات کی قرأت اول قرآن سے آخر قرآن تک باعتبار سند حرف وسماع ایک ایک لفظ کے ساتھ موجود ہے ان کے اس فضائل اور وجوہ قرآن کے کثرت علم کے ساتھ جو کہ مشہور تھے۔ جب یہ بات واضح ہو چکی تو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب امامیہ کا ظاہر یہ ہے کہ انھوں نے قاریوں کے درمیان رائج قرأت پر اتفاق کیا ہے۔ مگر یہ کہ انھوں نے قاریوں کے درمیان رائج قرأت کو اختیار کیا ہے۔ قرأت مفردہ کو تسلیم نہیں کیا ہے اور مذہب امامیہ کے درمیان مشہور ہے:

اِنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ بِحَرْفٍ وَّاحِدٍ۔

(یعنی قرآن ایک حرف پر نازل ہوا) اور اہل سنت نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو روایت کی ہے: نَزَلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُف۔ (قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے) کُلُّهَا شَافٍ کَافٍ۔ کا تمام اس روایت میں تاویل کے اعتبار سے اختلاف کیا ہے، علماء کے ایک طبقہ نے لفظ اَحْرُف کو اس کے ظاہر

پر حمل کیا ہے پھر ظاہر کو دو صورتوں پر حمل کیا ہے:

اول: اس سے مراد سات لغات ہیں جس کا حلیت اور حرمت کے اعتبار سے حکم تبدیل نہ ہو مانند: هَلُمَّ و اقْبِلْ وَ تَعَالِ (اس لیے کہ یہ تینوں الفاظ بظاہر جداگانہ ہیں لیکن باعتبار حکم حقیقت میں ایک ہیں۔ تینوں میں نزدیک آنے کی دعوت دی گئی ہے) وہ آغاز اسلام میں جس طرح چاہیں قرأت کرنے میں آزاد تھے۔ پھر انھوں نے ایک (طریقہ) پر اجماع کیا جن کا اجماع حجت ہے اور یہ رکاوٹ بن گیا کہ انھوں نے جس سے اعراض کیا تھا۔

دوم: دوسرا طبقہ مانتا ہے کہ اس سے مراد قرأت کی سات وجہیں اور صورتیں ہیں:

(اول) جن میں سے ایک اعراب کلمہ کا اختلاف ہے جس سے کتابت میں اس کی شکل نہ بدلے، نہ ہی معنی میں تبدیلی واقع ہو جس طرح: فَيُضَاعِفُهُ کلمہ رفع اور نصب کے ساتھ۔

(دوم) اعراب میں اختلاف جس سے معنی میں تبدیلی واقع ہو لیکن اس کی شکل میں تغیر نہ ہو جیسے: إِذْ تَلَقَّوْنَهُ اور إِذْ تُلْقُوْنَهُ۔

(سوم) کلمہ کے حروف میں اختلاف نہ ہو کہ اعراب میں جس سے معنی میں تبدیلی ہو اور شکل میں تغیر نہ ہو جیسے كَيْفَ نُنْشِزُهَا ۔ وَنُنْشِرُهَا زاء اور راء کے ساتھ۔

(چہارم) کلمہ میں اختلاف جس سے اس کی شکل میں تبدیلی واقع ہو اور معنی متغیر نہ ہوں جیسے: إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً، إِلَّا زِقْيَةً۔

(پنجم) کلمہ میں اختلاف جس سے اس کی شکل بھی بدل جائے اور معنی بھی متغیر ہو جائیں جیسے: طَلْحٍ مَّنْضُودٍ وَطَلْعٍ۔

(ششم) تقدیم اور تاخیر کا اختلاف جس طرح: وَ جَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ وَ جَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ

(ہفتم) زیادتی اور کمی کا اختلاف جیسے: وَمَا عَمِلَتْ أَيْدِيهِمْ وَ مَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ۔

شیخ سعید ابو جعفر الطوسی (قدس اللہ روحہ) بیان فرماتے ہیں: یہ وجہ بہت موزوں اور مناسب ہے جس کی روایت ائمہ علیہم السلام سے کی گئی ہے۔ جس میں قاریوں نے اختلاف کیا ہے اس طرح قرأت جائز ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے اَحْرُف کو ان معانی اور احکام پر حمل کیا ہے جن پر قرآن کا نظم قائم ہے نہ کہ الفاظ

(قرآن) اس بابت ان کے اقوال مختلف ہیں کہ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ اس سے وعد، وعید، امر و نہی، جدل، قصص اور مثل مراد ہیں۔ ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ۔ (یعنی) امر و نہی، حلال و حرام، محکم و متشابہ اور امثال مراد ہیں۔

ابو قلابہ کے واسطہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ: اِنَّهٗ قَالَ: نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ (یعنی قرآن سات حروف پر نازل ہوا) اور وہ سات حرف یہ ہیں امر و نہی، ترغیب، ترہیب، جدل، قصص اور مثل۔ بعض علماء نے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مجمل و مفصل اور تاویل جس کی (حقیقت) خداوند عالم کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا، مراد لی ہے۔

فن سوم

تفسیر و تاویل اور معنی کے بیان میں:

ان چیزوں کا مختصر بیان کہ اس کتاب میں زیادہ تر باتیں انھیں کے بارے میں آئیں گی۔

معنی تفسیر: مشکل لفظ سے مراد و مقصود کا کشف کرنا تفسیر ہے۔

معنی تاویل: دو محتمل معانی سے کسی ایک کی جانب پلٹانا تاویل ہے۔ جو ظاہر معنی کے مطابق ہو۔

تفسیر، بیان (وضاحت) کو کہتے ہیں۔

ابو العباس مُبرد نے کہا ہے: تفسیر و تاویل کے ایک ہی معنی ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ تفسیر کے معنی چھپی ہوئی چیز سے پردہ ہٹانا ہے، تاویل کسی چیز کی انتہا اور اس کا انجام ہے جس کی جانب اس کا امر پلٹتا ہے۔ علماء کے بقول لفظ معنی کو: عَنَيْتُ فلاناً سے لیا گیا ہے یعنی میں نے اس کا قصد و ارادہ کیا۔ اس طرح ان کا یہ کہنا: عَنٰی بِهٖ كَذَا کے معنی ہوں گے، اس نے اس کلام سے فلاں چیز کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ لفظ معنی کو عُنِيْتُ سے مشتق ہے بهٰذا الأمر تكلّفته یعنی میں نے اس بات کو اپنے اوپر لے لیا۔

جان لیجیے صحیح خبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور آپؐ کے قائم مقام ائمہ علیہم السلام سے وارد ہوا ہے: اثر صحیح (صحیح روایت) اور نص صریح کے بغیر تفسیر قرآن جائز نہیں ہے۔ اسی طرح عامہ (اہلسنت) نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْيِهٖ فَاَصَابَ الْحَقَّ فَقَدْ اَخْطَأَ۔ جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی اگر اس نے حق کو پالیا اور حق تک پہنچ گیا تو پھر بھی اس نے خطا کی ہے۔

اہل سنت نے بیان کیا ہے تابعین کی ایک جماعت نے قرآن کی تفسیر بالرائ کے قول کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے جن میں سعید بن المسیب ،عبیدۃ السلمانی ، نافع ، سالم بن عبداللہ وغیرہ ہیں۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم نے استنباط کی دعوت دی ہے اور استنباط کے طریقے کو واضح کیا ہے اور ایسا کرنے والوں کی مدح کی ہے اور فرمایا ہے:

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ. (سورۂ نساء، آیت ۸۳) (اور یہ بات استنباط کرنے والوں کو معلوم ہے) قرآن میں غور وفکر کو چھوڑنے والوں اور اس میں تدبر و تفکر سے روگردانی کرنے والوں کی مذمت کی ہے۔ چنانچہ اس نے ارشاد فرمایا:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ أَقْفَالُهَا (سورۂ محمد، آیت ۲۴) (انھیں کیا ہو گیا ہے یہ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟) اور بیان فرمایا ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (سورۂ یوسف، آیت ۲)

(بے شک اسے ہم نے قرآن کی صورت میں عربی زبان میں نازل کیا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"جب تمھارے پاس میری نسبت سے کوئی حدیث پہنچے تو اسے قرآن پر پیش کرنا جو حدیث مطابق قرآن ہو اسے لے لینا اور جو مخالف قرآن ہو اسے دیوار پر دے مارنا" اسی طرح آپ نے واضح کر دیا کہ:

"قرآن ہی حجت ہے اور اسی پر ہر چیز کو پرکھا جائے گا" (یعنی قرآن کسوٹی ہے)

پس حدیث کو قرآن پر کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے معنی نہ سمجھے جا سکتے ہوں۔ یہ حدیث اور دیگر احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس روایت کا ظاہر متروک ہے پس اس حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر یہ صحیح ہو کہ اس کے شواہد الفاظ پر عمل نہ کرے اور حق تک پہنچ جائے۔ پس اس نے دلیل سے خطا کی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ الْقُرْآنَ ذَلُوْلٌ ذُوْ وُجُوْهٍ فَاحْمِلُوْهُ عَلٰى اَحْسَنِ الْوُجُوْهِ.

قرآن نرم ہے اور کئی معانی کا حامل ہے پس قرآن کو سب سے اچھے معنی پر حمل کرو۔

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے: تفسیر کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ وہ قسم جس کی ناواقفیت پر کسی کو معذور قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۲۔ وہ تفسیر جسے عرب اپنے کلام سے سمجھتے ہیں۔

۳۔ وہ تفسیر جسے علماء جانتے ہیں۔

۴۔ وہ تفسیر جسے بجز خداوند متعال کوئی نہیں جانتا۔

وہ تفسیر جس کی ناواقفیت پر کسی کو معذور قرار نہیں دیا ہے وہ قرآن کریم میں موجود شرعی احکام اور دلائل توحید ہیں۔ جو سب کے لیے ضروری و لازمی ہیں۔ وہ تفسیر جسے عرب لغت و زبان کے ذریعہ سمجھتے ہیں وہ لغوی حقائق اور ان کا موضوع کلام ہے اور جس تفسیر کو علماء سمجھتے ہیں وہ متشابہ کی تاویل اور احکام کے فروعات ہیں۔ وہ تفسیر جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں سمجھتا وہ غیب اور قیامت کے واقع ہونے (اور اس کے حالات و کیفیات) ہیں۔

(اس مقام پر شیخ طبرسی فرماتے ہیں) ہم کہتے ہیں: اعراب کا تعلق قرآن کے باجلالت اور عظیم علوم سے ہے ہر بیان (ارشاد) جس کا محتاج ہے جس کے سبب مغلق و سربستہ الفاظ واضح و آشکار کیے جاتے ہیں، مطالب کا استخراج کیا جاتا ہے اس لیے کہ اغراض 'الفاظ' کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں جو ان 'الفاظ' کے اغراض کی جانب لے جاتے ہیں اس سے بحث کرتے اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہیں، یہی کلام کا معیار ہیں جس کا نقصان اور رجحان ظاہر و نمایاں نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسے اعراب پر پیش نہ کیا جائے 'اعراب' ایسا معیار ہیں جس پر پیش کیے بغیر صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

أَعْرِبُوا الْقُرْآنَ وَالْتَمِسُوا غَرَائِبَهُ.

قرآن کو عربوں کی طرز (اعراب کے ساتھ) پر تلاوت کرو اور اس کے عجائبات کو تلاش کرو۔

اور جب کہ قرآن کا ظاہر اس کے معنی کے مطابق ہوتا ہے پس جو شخص عربی زبان اور اعراب سے واقفیت رکھتا ہے اس کے مطلب و مقصود سے واقف ہوجاتا ہے اور قطعی طور پر مراد الٰہی کو جان لیتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہوسکتا ہے جب لفظ مجمل نہ ہو کہ بیان کا محتاج ہو جس میں دو معنی اور اس سے بیشتر کا احتمال نہ پایا جاتا ہو جیسا کہ حسب ذیل آیات ہیں:

۱۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ

۲۔ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ

۳۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا

اورانھیں کے مانند دیگر آیات ہیں جو آیات مجمل اور غیر واضح ہیں جنکے ظاہر سے مراد و مقصود مفصل طور پر واضح نہیں ہوتا جیسا کہ ان آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ

۲۔ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ

ایسی آیات کے لیے وحی الٰہی کے ذریعہ ارشادات پیغمبرؐ کی ضرورت ہے جن میں خود نماز اور ان کی عدد رکعات اور زکوۃ کا نصاب بیان کیا گیا ہے۔ ایسی مثالیں بکثرت ہیں ان مسائل کا کسی نص (حکم صریح) کے بغیر شروع کرنا ممنوع ہے۔

ممکن ہے کہ ہم نے پہلے جس روایت کا ذکر کیا وہ اسی پر محمول ہو اس لیے کہ جس ''آیت'' میں بیشتر امور یا دو امر کا احتمال ہو تو تمام احتمالات کا مراد ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ اس پر دلیل قائم ہوگی کہ اس سے فقط ایک ہی صورت ممکن ہے۔ یہ صورت متشابہ ہے اس سے مراد اشتباہ کے باب سے ہے جو مراد و مقصود نہیں ہے اس کا حمل اس صورت پر کیا جائے گا جو دلیل کے موافق ہو۔ اس طرح کہنا ممکن ہے کہ اس سے یہ مراد ہے اگرچہ لفظ دو یا بیشتر معنی کے درمیان مشترک ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک مراد و مقصود ہو، اس پر جسارت کرتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قطعی اور یقینی طور پر اس سے یہی مراد ہے سوائے نبیؐ اور امامؑ کے ارشاد کے ذریعہ جو اس کی صداقت پر یقینی دلیل ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر ایک تفصیلاً مراد ہو اس کو یقینی اور قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا نہ ہی اس بابت کسی مفسر کی تقلید کی جائے گی مگر یہ کہ تاویل متفق علیہ ہو۔ اس طرح اجماع قائم ہونے کے سبب اس کا اتباع و پیروی واجب ہے۔ یہ چند جملے ہیں جنھیں ہم نے بطور خلاصہ بیان کیا ہے۔ ان کی جانب رجوع کیا جائے اعتماد کیا جائے، ان کے ذریعہ تفسیر کی (تمام) صورتیں ہیں جن میں نزول قرآن معانی و احکام سے متعلق علماء نے اختلاف کیا ہے۔

فن چہارم

قرآن کے مختلف نام اور ان کے معانی کا بیان:

اَلْقُرْآن کے اصل معنی اَلْقَرَأَة کے ہیں جو قَرَأْتُ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: میں نے تلاوت کی۔ یہ ابن عباسؓ کا قول ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے: لفظ قرآن، قَرَأْتُ الشَّیْءَ؛ کا مصدر ہے یعنی میں نے بعض کو بعض کے ساتھ جمع کیا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ قرآن کا نام قرآن مصدر پر رکھا گیا ہے جو در حقیقت مَقْرُوّ (جسے پڑھا جائے) کے معنی میں ہے۔ جس طرح مکتوب کو کتاب کہا جاتا ہے اور محسوب کو حساب۔

اس کے اسماء میں اَلْکِتَاب بھی ہے جس کے معنی جمع کے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے: کَتَبْتُ السّقا، میں نے مشکیزہ کو سی دیا۔ یعنی اکٹھا کر کے اس کے دہانے کو سی دیا۔

قرآن کے ناموں میں سے ایک نام اَلْفُرْقَان بھی ہے۔ اس لیے کہ یہ حق و باطل کے درمیان دلیلوں کے ذریعہ تفریق کرتا ہے جو حق کے صحیح ہونے اور باطل کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے فرقان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نجات و رستگاری عطا کرتا ہے جیسا کہ خود اس کا ارشاد ہے: وَیَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَاناً (سورۂ انفال، آیت ۲۹؛ وہ تمھارے اندر قوت تمیز پیدا کرے گا)

قرآن کا ایک نام ذکر ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. (سورۂ حجر، آیت ۹)

(بے شک ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں) اس میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

(۱) خداوند عالم نے قرآن میں اپنے بندوں کے لئے احکام و فرائض کو بیان کیا ہے۔

(۲) قرآن اس پر ایمان لانے والے اور تصدیق کرنے والے کے لیے شرف ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَإِنَّهُ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ (سورۂ زخرف، آیت ۴۴)

(اور بلا شبہ یہ کتاب آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ایک شرف ہے)

یہ چار اسماء ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور روایت میں وارد ہوئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"مجھے (پروردگار) نے تورات کے عوض سات طویل سورے عطا فرمائے اور انجیل کی جگہ اَلْمَثَانِی، زبور کے عوض مِئِیْن اور مُفَصَّل (چھوٹے چھوٹے سوروں) کے ذریعہ فضیلت عطا کی۔"

واثلہ بن اسقع کی روایت ہے: "مجھے انجیل کے عوض مئین، زبور کے عوض المثانی اور فاتحۃ الکتاب عطا کی گئی اور خواتیم البقرہ عطا کی گئی عرش کے نیچے سے جو کسی نبی کو مجھ سے قبل عطا نہیں کی گئی۔ میرے رب نے مجھے مفصل تحفہ میں دی ہے سبع طوال (سات طویل سورتیں) بقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، انعام، اعراف اور انفال کو توبہ کے ساتھ یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں لہٰذا دونوں کے درمیان: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کا فاصلہ قرار نہیں دیا گیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ساتواں (سورہ) سورۂ یونس ہے۔

اور لفظ طِوال طُولی کی جمع ہے جو اَطۡوَل کا مؤنث ہے اور ان سورتوں کو سُوَرُ الطِّوَال اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کی طویل ترین سورتیں ہیں۔

مثانی سات طویل سورتوں کے بعد میں آنے والا سورہ ہے جن میں پہلی سورۂ یونس اور آخری سورۂ نحل ہے اور انھیں مَثَانِی اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ طویل سورتوں کے بعد آتی ہیں تو طُوَل درحقیقت مَبَادِی یعنی آغاز ہیں اور مثانی اس سے متصل سورتیں ہیں۔ مثانی کا واحد مثنیٰ ہے جیسے معنی اور معانی۔ فراء نے کہا کہ اس کا واحد مُثناۃ ہے اور کہا گیا ہے کہ مثانی سے مراد قرآن مجید کی تمام سورتیں ہیں خواہ طِوال ہوں یا قِصَار اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول سے ظاہر ہے: كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (سورۂ زمر، آیت ۲۳) ایسی کتاب جس کی آیتیں ملتی جلتی ہیں اور دہرائی گئی ہیں اور یہ ابن عباس کا قول ہے۔ مثانی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے حدود، امثال اور فرائض کو دہرایا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ المثانی اس کے ارشاد میں وارد ہوا ہے:

وَلَقَدۡ آتَیۡنَاكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِي (سورۂ حجر، آیت ۸۷)

(بے شک ہم نے ہی آپ کو سات ایسی آیتیں دی ہیں جو مثانی ہیں) جو کہ سورۂ حمد کی آیات ہیں۔ اس کی روایت ہمارے ائمہ اہلبیت علیہم السلام سے وارد ہوئی ہے۔ اور یہی حسن بصری کا قول ہے۔ المئون ہر اس سورے کو کہتے ہیں جس میں سو آیات یا اس سے کچھ زائد یا اس سے کچھ کم آیات ہوں۔ یہ سات سورے ہیں جن میں پہلا سورہ بنی اسرائیل اور آخری المومنون ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مِئُون جو سات طوالانی سوروں سے متصل ہیں پھر مثانی ہیں، یہ مِئُون سے کم ہیں اور مفصل سے زیادہ ہیں اور مثانی کی وجہ تسمیہ ہے کہ مِئُون اس کے مبادی اور اساس ہیں اور مُفَصَّل حَوَامِیۡم کے بعد مختصر سورے ہیں جو آخر قرآن تک مندرج ہیں۔ مفصل کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے ذریعہ سورتوں کے درمیان کثرت سے فاصلہ ہے۔

فن پنجم

علوم قرآن کی کچھ چیزوں کے بارے میں جن کی تشریح کی کوشش کی گئی ہے اور کلام کو پھیلایا گیا ہے ان مقامات تک جو اس کے لیے مختص ہیں اور اس بارے میں جو کتابیں تالیف کی گئی ہیں:

اس علم سے متعلق قرآن کا معجزہ اور خارق العادۃ ہونا اور اس کے ذریعہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر دلیل کا قائم ہونا ہے۔ گفتگو قرآن کے اعجاز پر ہے، یا اس کی زبردست فصاحت و بلاغت پر ہے یا اس کے مخصوص نظم اور بدیع اسلوب کی وجہ سے ہے یا اس سبب سے ہے کہ خداوند عالم نے عربوں کو اس کا مقابلہ کرنے اور جواب لانے سے عاجز بنا دیا اور ان کے علم کو سلب کر لیا جس سے وہ اس جیسا کلام پیش کر سکتے جو اسی جیسی نظم اور فصاحت کا حامل ہو۔ اس کی نظم و فصاحت کے بارے میں (ان تمام بحثوں) کا موقع ومحل علم کلام کی کتابیں ہیں جنھیں متکلمین بزرگان دین نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے، بالخصوص سید الاجل مرتضیٰ علم الہدیٰ ابوالقاسم علی بن الحسین الموسوی (قدس اللہ روحہ) جنھوں نے اپنی کتاب اَلْمُوَضِّحُ فِي وَجْهِ اِعْجَازِ الْقُرْآن میں بیان کیا ہے۔ جہاں انھوں نے کلام کی فرعیں جس قدر ممکن ہو سکتی ہیں بیان کی ہیں اور اسے انتہائی مقام تک پہونچا تا ہے جس کی چمک دمک باقی رہے گی جس کے اثرات کو کوئی ختم نہیں کر سکتا وہ ہمیشہ چھائے رہیں گے۔

اور یہ بات بھی اس سے متعلق ہے کہ قرآن میں کمی اور زیادتی ہوئی ہے یا نہیں؟ یہ چیز لائق تشریح وتفسیر نہیں ہے۔ قرآن میں زیادتی کے بطلان پر اجماع ہے۔ البتہ اس میں کمی کے بارے میں ہمارے علماء کے ایک گروہ اور عامہ (اہلسنت) کے ایک گروہ نے روایت کی ہے کہ قرآن میں تغیر اور کمی واقع ہوئی ہے۔ درست یہ ہے کہ ہمارے علماء کا نظریہ اس کے برعکس ہے۔ اس بارے میں سید مرتضیٰ (قدس اللہ روحہ) کی تائید و کمک حاصل ہے جس پر انھوں نے مسائل طرابلسیات کے جواب میں نتیجہ خیز اور بھر پور گفتگو کی ہے اور متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم کی نقل صحت کا علم شہروں اور عظیم حوادث و واقعات کے علم کے مانند ہے۔ اس بابت مشہور کتب اور عربوں کے اشعار موجود ہیں جن کی نقل وحفاظت کے شدید اسباب و وجوہات پائے جاتے ہیں جو اپنی انتہاء کو پہونچے ہوئے ہیں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم نبوت کا معجزہ، علوم شرعیہ اور دینی احکام کا سرچشمہ ہے۔ مسلمان علماء نے اس کی حفاظت وحمایت میں بے پناہ کوششیں فرمائی ہیں یہاں تک کہ انھیں قرآن کی ہر چیز اس کے اعراب، قرأت اور حروف کے متعلق اختلاف کے بارے میں علم حاصل ہے۔ پس

اس طرح کی سچی حفاظت اور شدید تحفظ کے باعث اس میں کس طرح تبدیلی واقع ہو سکتی ہے؟ اسی طرح (سید مرتضیٰ) کہتے ہیں: تفسیر قرآن اور اس کی صحت نقل کا علم تصنیف شدہ کتب سیبویہ اور مزنی کی کتب کے مانند ہے جن کا بدیہی طور پر سب کو علم ہے۔ جنکی تفصیلات سے لوگ بخوبی واقف ہیں یہاں تک کہ سیبویہ کی کتاب میں داخل شدہ باب علم نحو کی بابت جانتے ہیں کہ اسے ملحق کیا گیا ہے جو کہ اصل کتاب سے متعلق نہیں ہے اور یہی صورت حال مزنی کی کتاب کی ہے۔ یہ چیز معلوم اور واضح ہے کہ نقل قرآن کی احتیاط وضبط (تحریر) اور اس کی حفاظت میں زیادہ صداقت سے کام لیا گیا ہے۔ سیبویہ اور شعراء کے دیوانوں کی ضبط تحریر کی بہ نسبت۔

اسی طرح سید مرتضیٰ فرماتے ہیں: قرآن کریم عہد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تالیف شدہ مجموعہ بن چکا تھا جس طرح کہ وہ آج موجود ہے۔ جس پر انھوں نے استدلال کرتے ہوئے فرمایا: زمانۂ پیغمبرؐ میں قرآن کی تلاوت وتدریس ہوتی تھی اور پورے قرآن کو حفظ کیا جاتا، یہاں تک کہ حضورؐ نے بعض صحابہ کو قرآن کو محفوظ کرنے کے لیے معین فرمایا تھا جو پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا جاتا اور آپؐ کے سامنے اس کی تلاوت کی جاتی تھی۔ اصحاب کی ایک جماعت جیسے عبداللہ بن مسعود وابیّ بن کعب وغیرہ نے حضورؐ کی خدمت میں متعدد مرتبہ ختم قرآن کیا۔ یہ تمام امور ذرا سا غور وفکر کرنے پر دلالت کر رہے ہیں کہ قرآن کریم مجموعی طور پر مکمل تھا۔ امامیہ اور حشویہ کے بعض علماء جنھوں نے اس امر کی مخالفت کی ہے جس کا ذکر ہم سابقاً کر چکے ہیں تو ان کی مخالفت قابل توجہ ہی نہیں ہے اس لیے کہ اس کے متعلق اختلاف اصحاب حدیث کے اس گروہ سے وابستہ ہے جنھوں نے ضعیف روایات نقل کی ہیں جن کی صحت کا انھیں گمان ہو گیا ہے روایات کی صحت اور قطعیت کا علم ہے ان سے رخ نہیں پھیرا جا سکتا۔

یہی کلام ونسخ وناسخ ومنسوخ اس کی تعریف اقسام نسخ، اس کے شرائط، بداء اور تخصیص کے متعلق ہے۔ کیا عبادت کو انجام دینے سے قبل نسخ عبادت جائز وممکن ہے؟ کیا سنت کے ذریعہ نسخ قرآن جائز ہے؟ جس کے سبب ناسخ کو ناسخ اور منسوخ کو منسوخ سمجھا جاتا ہے؟ اگرچہ ان جملہ امور کا قرآن سے متعلق ہونا معلوم ہے تو اس کا مقام علم اصول فقہ کی کتابیں ہیں۔ عنقریب تفسیر کے بارے میں گفتگو اس کے محل پر کی جائے گی۔ انشاءاللہ!

فن ششم

قرآن اور اہل قرآن کی فضیلت میں مشہور روایات کا بیان

انس ابن مالک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ شاد فرمایا: ''اہل قرآن

ہی اہل اللہ اور خاصان خدا ہیں۔''

(انس سے روایت ہے) حضورؐ نے ارشاد فرمایا: قرآن کی تلاوت سب سے برتر عبادت ہے۔ (یہ بھی انس سے روایت ہے) قرآن ایسی ثروت و دولت ہے جس کے علاوہ کوئی ثروت نہیں، اور جس کے بعد کوئی فقر نہیں۔

حماد بن سلمۃ نے ثابت کے واسطہ سے انس ابن مالک سے روایت کی ہے کہ انس کہتے ہیں: آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ''حاملین قرآن رحمت الٰہی سے مخصوص، کلام الٰہی کے معلم اور اللہ کے مقرب (بندے) ہیں، ان سے محبت کرنے والا اللہ کا محب ہے۔ ان سے دشمنی کرنے والا دشمن خدا ہے۔ قرآن سننے والے سے خدا بلائے دنیا کو دور کرتا ہے اور قاری قرآن سے آخرت کی مصیبتیں دور فرماتا ہے۔ اے حاملین قرآن اس کی کتاب (قرآن) کی توقیر و عظمت کے پیش نظر اللہ سے دوستی اور محبت کرو وہ تمھاری محبت میں اضافہ فرمائے گا اور تمھیں اپنے بندوں کا محبوب بنادے گا۔''

مکحول کے واسطہ سے ابوذرؓ کی روایت ہے کہ جناب ابوذرؓ کہتے ہیں: میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا: میں ڈرتا ہوں کہ قرآن سیکھنے کے بعد اس پر عمل نہ کرسکوں۔ حضورؐ نے فرمایا: جس دل میں قرآن ہوگا خدا اس پر عذاب نہیں فرمائے گا۔

عقبہ بن عامر جہنی سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: جس کے روبرو قرآن ہوگا اسے آتش جہنم مس نہیں کرے گی۔

عطا کے واسطہ سے سعید خدری سے روایت ہے، آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: حاملین قرآن روز قیامت اہل جنت کے عرفاء ہوں گے۔

امامؑ نے ارشاد فرمایا: حامل قرآن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اہل زمین کو اپنے سے زیادہ ثروت مند سمجھے اگرچہ وہ پوری دنیا کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔

عیسیٰ ابن قائد سے روایت ہے، مجھ سے روایت کی ہے (اس شخص نے) جس نے سعد بن عبادہ کو کہتے سنا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص بھی قرآن سیکھے پھر اسے فراموش کردے وہ خداوند عالم سے جذام کی حالت میں ملاقات کرے گا۔

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: میری امت کے بزرگ ترین اور صاحبان شرف حاملین قرآن اور اصحاب لیل (عابد شب زندہ دار) ہوں گے۔

عبداللہ بن مسعود کے واسطہ سے حضورؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: یہ قرآن اللہ کے آداب کا مرکز وخزانہ ہے، جس قدر ممکن ہو اس کے مرکز سے ادب حاصل کرو۔ یہ قرآن اللہ کی ریسمان، نور مبین اور نفع بخش شفا ہے جو اس سے وابستہ ہو وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پیروی کرنے والے کے لیے ذریعۂ نجات ہے، اس میں کسی طرح کا انحراف نہیں کہ اسے سیدھا کیا جائے، کسی قسم کی کجی نہیں ہے جسے دور کیا جائے، اس کے عجائبات ختم ہونے والے نہیں، اعتراضات کی کثرت سے کہنہ نہیں ہوتا، تم اس کی تلاوت کرتے رہنا، خدا اس کے ہر حرف کی تلاوت کے عوض دس نیکیاں عطا کرے گا۔ میں تم سے نہیں کہتا کہ الم کی دس نیکیاں ہیں بلکہ الف کی دس اور لام کی دس اور میم کی دس نیکیاں ہیں۔

حارث ابن اعور نے امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرتؑ نے ایک طولانی حدیث میں فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا: ''عنقریب فتنے برپا ہوں گے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ ان سے رارہ نجات کس طرح ممکن ہے؟ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا: کتاب خدا جس میں تم سے قبل کی خبریں ہیں اور تمہارے بعد کی خبریں ہیں اور تمہارے درمیان کا حکم ہے، وہ حق و باطل کے درمیان حد فاصل ہے، اس میں مزخرفات نہیں ہیں، اس میں خواہشات نفسانی کجی واقع نہیں کرسکتیں، اس سے علماء کو سیرابی نہیں ہوتی، اعتراضات کی کثرت سے وہ کہنہ نہیں ہوتا، اس کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے، وہ ایسی (معجزنما کتاب) ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ظالم وجابر کی وجہ سے اسے ترک کرے گا تو خدا اس کا خاتمہ کردے گا۔ جو اس کے سوا ہدایت کا طلبگار ہوگا، خدا اسے گمراہ کردے گا۔ (قرآن) اللہ کی رسی اور صراط مستقیم ہے جو اس پر عمل کرے گا اجر کا مستحق ہوگا، جو اس کے ذریعہ حکم کرے گا وہ عدل سے کام لے گا۔ جو اس کی جانب دعوت دے گا وہ صراط مستقیم کی دعوت دے گا۔''

عاصم بن ضمرہ نے حضرت علی علیہ السلام کے واسطہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی، کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے قرآن کی تلاوت کی اس سے مدد طلب کی اور اسے حفظ کرے گا تو خدا اسے داخل جنت فرمائے گا اور اس کے اہل خانہ میں سے دس لوگوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کرے گا کہ جن پر آتش جہنم واجب ہوچکی ہوگی۔''

عبداللہ بن عمر کے واسطہ سے روایت ہے، کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''صاحب قرآن سے کہا جائے گا قرآن پڑھو، بلند ہوتے جاؤ اور اسی طرح ترتیل کے ساتھ تلاوت کرو جس طرح تم دنیا میں کرتے تھے، تمھارا

درجہ آخری آیت کی تلاوت تک بلند ہوتی رہے گی۔''

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے قرآن کی تلاوت کی اور یہ سمجھے کہ کسی کو اس سے افضل چیز عطا کی گئی ہے اس نے خدا کی عطا کردہ عظیم چیز کو حقیر سمجھا اور جس چیز کو اللہ نے حقیر قرار دیا ہے اسے عظیم سمجھا ہے۔''

یہ بھی حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: جس نے قرآن کی تلاوت کی گویا اس نے نبوت کو باقاعدہ سمجھ لیا سوائے اس کے کہ اس پر وحی نہیں کی جائے گی۔

ابوسعید خدری نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ دنیا میں حاملین قرآن روز قیامت اہل جنت میں عُرفاء ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جو شخص اطاعت کے ساتھ اسلام میں داخل ہوا اور بظاہر تلاوت قرآن کی اسے ہر برس مسلمانوں کے بیت المال سے دوسو دینار دئے جائیں گے، اگر اسے دنیا میں دینار سے روک دیا گیا تو قیامت میں وہ سب کچھ بھرپور پائے گا جس کا وہ محتاج ہوگا۔

بہت سی روایتوں میں سے ہم نے چند کا انتخاب کیا ہے، سمندر سے چند قطرے منتخب کیے ہیں اور اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اقتصار سے کام لیا ہے۔

فن هفتم

قاری کے لیے مستحب امور، لفظ کے بخوبی ادا کرنے اور قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنے کے بیان میں:

براء بن عازب سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنی آوازوں کے ذریعہ قرآن کو زینت دو۔''

حذیفہ بن الیمان سے روایت ہے، کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: ''عربوں کی طرز اور لحن پر قرآن کی تلاوت کرو، خبردار! اہل فسق اور اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی طرز پر تلاوت نہ کرنا، عنقریب میرے بعد ایک قوم آئے گی جو قرآن کو غنا، کی طرز پر حلق میں گردش دے کر رہبانیت اور بین کی صورت میں تلاوت کرے گی جو ان کی حلق سے تجاوز نہیں کرے گی اور اور ان لوگوں کے دل جو ان کی تلاوت سن کر وجد میں آئیں گے، دیوانگی

کا شکار ہوں گے۔"

علقمہ بن قیس سے روایت ہے کہ میں خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا، عبداللہ بن مسعود نے میرے پاس پیغام بھیجا کہ میں ان کے سامنے تلاوت قرآن کروں، جب میں تلاوت سے فارغ ہوا تو انھوں نے کہا: مزید پڑھو میرے باپ تم پر فدا ہوں اس لیے کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: اچھی آواز زینت قرآن ہے۔

انس ابن مالک کے واسطہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے، آپ نے فرمایا: ہر چیز کا ایک زیور ہوتا ہے اور قرآن کا زیور اچھی آواز ہے۔

عبدالرحمن ابن سائب سے روایت ہے کہ میرے پاس سعد بن ابی وقاص آئے، میں نے انھیں سلام کیا، انھوں نے خوش آمدید کہتے ہوئے کہا: اے فرزند برادر! مجھے خبر ملی ہے کہ تم تلاوت قرآن خوش الحانی کے ساتھ کرتے ہو۔ میں نے کہا: ہاں الحمدللہ! انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے:

"قرآن حزن کے ساتھ نازل ہوا، جب تم اس کی تلاوت کرو تو گریہ کرو، اگر یہ نہ کر سکو تو اہل گریہ کی صورت بناؤ اور اسے اطمینان سے پڑھو اس لیے کہ جو اطمینان سے تلاوت نہیں کرے گا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔"

بعض حضرات نے تُغَنُّوا کی اِسۡتَغۡنُوا (بے نیازی) سے تاویل کی ہے۔ لیکن بیشتر علماء نے کہا ہے: تُغَنُّوا سے خوش الحانی اور باریک آواز کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

اب تفسیر سے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ خداوند عالم آسانیاں پیدا کرنے والا ہے۔ تمام امور میں اسی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لیے کافی ہے اور اسی کی جانب بازگشت ہے۔

سُورَةُ الفَاتِحَة

یہ سورہ مکی ہے جس میں سات آیات ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
بنام خدا مہربان وشفیق

ابن عباس وقتادہ سے روایت ہے کہ یہ سورہ مکی ہے۔ مجاہد سے مدنی ہونے کی روایت وارد ہوئی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ سورہ دو مرتبہ نازل ہوا، ایک مرتبہ مکہ اور ایک مرتبہ مدینہ میں۔

اس سورہ کے اسماء:

فَاتِحَةُ الْكِتَاب قرآن کے آغاز میں اس کی کتابت اور نماز میں اس کی قرأت کے واجب ہونے کے سبب اسے فَاتِحَةُ الْكِتَاب کہتے ہیں۔ کتاب وقرأت میں اس کی تلاوت کے سبب یہ فاتحہ ہے۔ چونکہ اس سورے میں حمد کا تذکرہ ہے (اس لیے) اسے اَلْحَمْد بھی کہتے ہیں۔ اُمُّ الْكِتَاب اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ سورہ قرآن کے تمام سوروں پر مقدم ہے۔ عرب ہر جامع امر اور مقدم امر کو جب اس کے توابع ہوں جس کی وہ پیروی کریں تو اسے اُمّ کہتے ہیں۔ اسی طرح اُمُّ الرَّأْس اس جلد (کھال) کو کہتے ہیں جس میں مغز ہوتا ہے۔ اُمُّ الْقُرٰی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مکہ کے نیچے سے زمین بچھائی گئی جس کے سبب تمام علاقہ کو اُمّ کہا جانے لگا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مکہ تمام شہروں اور ممالک میں سب سے زیادہ باشرف ہے، ان تمام پر مقدم ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ یہ اصل قرآن ہے، اُمّ اصل کو کہتے ہیں، اصل قرآن ہونے کا سبب یہ ہے کہ خداوند عالم نے تمام سوروں (کے مضامین) کو ایک سورہ میں یکجا کر دیا ہے، اس میں ربوبیت اور عبودیت کا بیان ہے۔ یہی قرآن کا مقصود اور مراد ہے۔

اَلسَّبْع کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں سات آیات ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اَلْمَثَانِي کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہر نماز چاہے واجبی ہو یا مستحبی اس سورہ کو دو مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ دو مرتبہ نازل ہونے کے سبب اسے اَلْمَثَانِي کہتے ہیں۔ یہ اس سورہ کے مشہور اسماء ہیں۔ اس کے اسماء میں اَلْوَافِيَة کا بھی ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ اس کا نصف نہیں پڑھا جا سکتا۔ اَلْكَافِيَة کی وجہ تسمیہ اس کے دیگر سوروں سے کفایت کرنے کے سبب ہے۔ جبکہ دیگر سورے اس سے کفایت نہیں کرتے، اس کی تائید میں عبادہ بن صامت کی روایت ہے، جسے انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اُمُّ الْقُرْآن (سورۃ الفاتحہ) اپنے سوا دوسرے سوروں کا بدل ہے جب کہ دوسرے سورے اس کا بدل نہیں ہو سکتے۔

اَلْاَسَاس ابن عباس سے روایت کی گئی ہے: ہر چیز کی بنیاد ہوتی ہے اور آپ نے اپنی گفتگو کے سلسلے کو بڑھاتے ہوئے فرمایا: قرآن کی اساس اَلْفَاتِحَة ہے اور فاتحہ کی اساس بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے۔

سورۂ حمد کو شِفَاء بھی کہتے ہیں چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے: فاتحۃ الکتاب ہر مرض کی دوا ہے۔ اَلصَّلَاة پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خداوند عالم نے فرمایا: صَلَاة کو میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا جن میں نصف میرے لیے اور نصف میرے بندے کے لیے، جب بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، خدا فرماتا ہے: میرے بندے نے میری حمد کی۔ جب وہ کہتا ہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، خدا فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب بندہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تمجید و بزرگی بیان کی۔ جب اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہتا ہے خدا فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان راز ہے اور میرے بندے نے جو مانگا ہے پس اسے عطا کروں گا۔ جب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے آخر تک کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے سوال کیا ہے۔ مسلم بن الحجاج نے الصحیح میں ان دس اسماء کا تذکرہ کیا ہے۔

سورۂ فاتحہ کی فضیلت:

شیخ ابوالحسین الخبازی المقری نے اپنی کتاب میں جو قرأت سے متعلق تحریر کی ہے اس میں بیان کیا ہے: ہم سے امام ابوبکر احمد بن ابراہیم اور شیخ عبداللہ بن محمد نے روایت کی ہے کہ ہم سے ابواسحاق ابراہیم ابن

شریک نے روایت کی، وہ کہتے ہیں ہم سے سلیمان المدائنی نے، انھوں نے ہارون ابن کثیر سے، انھوں نے زید ابن اسلم سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے ابوامامۃ سے، انھوں نے اُبی بن کعب سے، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مسلمان سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے تو خداوند عالم اسے ایک ثلث (ایک تہائی) قرآن پڑھنے اور ہر مومن ومومنہ پر صدقہ کرنے کا اجر عطا فرماتا ہے۔ اس حدیث کی بعینہ دوسری سند سے بھی روایت کی گئی ہے مگر اس میں اتنا اور اضافہ ہے: کَاَنَّمَا قَرَأَ الْقُرْآن، گویا اس نے مکمل قرآن کی تلاوت کی ہے۔

اس کے علاوہ راوی نے اُبی بن کعب سے روایت کی کہ وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں فَاتِحَۃُ الْکِتَاب کی تلاوت کی تو حضرتؐ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، خداوند عالم نے توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن میں ام الکتاب جیسی (کوئی چیز) نازل نہیں فرمائی۔ جو سبع المثانی ہے، جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان تقسیم شدہ ہے، بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے گا۔

محمد بن مسعود العیاشی کی کتاب (تفسیر عیاشی) میں ان کی سند سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جابر ابن عبداللہ الانصاری سے فرمایا: اے جابر! کیا میں تمھیں سب سے برتر سورہ کی تعلیم دوں کہ جسے خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے؟ جابر نے عرض کیا: ہاں تعلیم فرمایئے (یا رسول اللہؐ!) میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں۔ محمد بن مسعود کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے جابرؓ کو اَلْحَمْد اُمُّ الْکِتَاب کی تعلیم فرمائی۔ پھر حضرتؐ نے فرمایا: اے جابر! کیا میں تمھیں اس کے بارے میں بتلاؤں؟ جابر نے عرض کی: ہاں! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں، آپؐ مجھے اس کی تعلیم دیجیے حضرتؐ نے ارشاد فرمایا: الحمد موت کے علاوہ ہر مرض کی دوا ہے۔

سلمہ بن محرز کے واسطہ سے جعفر بن محمد الصادق علیہما السلام سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: جسے الحمد شفا نہ دے سکے اسے کوئی چیز شفایاب نہیں کر سکتی۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: آنحضرتؐ نے فرمایا: خداوند عالم نے مجھ سے فرمایا: اے محمد! وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ۔ (یقیناً ہم نے آپ کو سبع مثانی (سات آیات دو مرتبہ دہرائی جانے والی) اور قرآن عظیم عطا کیا)

خداوند عالم نے فاتحۃ الکتاب کے ذریعہ صرف مجھ پر فضل واحسان فرمایا اور اسے قرآن کے ہم پلہ قرار

دیا۔ فَاتِحَةُ الْكِتَاب عرش کے موجود خزانوں میں سب سے برتر ہے۔خداوند عالم نے فاتحہ کے ذریعہ (مجھے) مخصوص فرمایا اور شرف عطا فرمایا اور بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مخصوص فرمایا اور اس شرف میں کسی بھی نبی کو شریک نہیں کیا سوائے سلیمان علیہ السلام کہ انھیں اس میں سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ عطا فرمایا۔کیا تم نہیں دیکھتے کہ خداوند عالم نے قصۂ بلقیس میں فرمایا ہے کہ جب بلقیس نے کہا: يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (سورۂ نمل، آیت ۲۹۔۳۰)

(اے سردارو! میری طرف ایک نامۂ محترم آیا ہے۔یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے اور اسے اللہ کے نام سے شروع کیا گیا ہے جو رحمٰن و رحیم ہے)

آگاہ ہو جاؤ جو شخص پیغمبرؐ اور آپؐ کی آلؑ سے محبت کا عقیدہ رکھتے ہوئے اور آپؐ کے امر کو تسلیم کرتے ہوئے اور سورہ کے ظاہر و باطن پر ایمان رکھتے ہوئے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرے گا خداوند عالم اسے ہر حرف کے عوض ایسی نیکی عطا فرمائے گا جو دنیا اور دنیا کے تمام احوال اور خیرات سے افضل ہوگی جو سورۂ حمد کی تلاوت کرنے والے کی تلاوت کو غور سے سنے گا اسے تلاوت کرنے والے کا ایک تہائی ثواب عطا کیا جائے گا۔تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ اس (کار) خیر کو کثرت سے بجالائے اس لیے کہ یہ غنیمت ہے، اس کا موقعہ نہ گذر جائے کہ تمھارے دلوں میں حسرت باقی رہ جائے گی۔

الاستعاذہ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کے پڑھنے پر سب نے اتفاق کیا ہے۔

ابن کثیر، عاصم اور ابوعمرو کہتے ہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔

نافع ابن عامر اور کسائی کہتے ہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

حمزہ کہتے ہیں: نَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔

ابوحاتم کہتے ہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔

الفاظ ومعانی

اِسْتِعَاذَۃ. یعنی اِسْتِجَارَۃ اس کے معنی ہیں ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں نہ کہ کسی غیر سے۔ عَوْذٌ و عِیَاذ کے معنی پناہ کے ہیں۔

شَیْطَان لغت میں ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ اس کا تعلق جن سے ہو، انسان سے ہو یا چوپائے سے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے: شَیَاطِیْنُ الْاِنْسِ وَالْجِنّ۔

لفظ شَیْطَان فَیْعَال کے وزن پر ہے اور شَطَنَتِ الدَّارُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ دور ہونے کے ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ فَعْلَان کے وزن پر ہے شَاطَ یشیط سے مشتق ہے جس کے معنیٰ باطل ہونے کے ہیں۔

پہلا نظریہ صحیح ہے اس لئے کہ شعر میں لفظ شَاطِن شَیْطَان کے معنیٰ میں آیا ہے۔

اَیُّمَا شَاطِنٌ عَصَاہُ عَکَاہُ
ثُمَّ یُلْقَی فِی السِّجْنِ وَ الْاَغْلَالِ

والرَّجِیْم، فَعِیْل ہے مفعول کے معنیٰ میں رجم سے مشتق جس کے معنی سنگسار کرنے کے ہیں۔

تفسیر:

خداوند عالم نے شیطان رجیم سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے کہ انسان شیطان کے وسوسہ سے محفوظ نہیں ہے۔ اَعُوْذُ کے معنی شیطان کے شر سے خدا کے حضور پناہ طلب کرنا ہے۔ شیطان جو کہ خیر سے دور ہے اور اس کے اخلاق ہر نوع کے اخلاق وعادات سے علاحدہ ہیں۔

الرَّجِیْم، آسمان سے نکالا ہوا ہے جسے شہاب ثاقب کے ذریعہ مارا گیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اَلْمَرْجُوْم بِاللَّعْنَۃ اسے لعنت کے ذریعہ رجم کیا گیا ہے۔ اِنَّ اللہ ھُوَ السَّمِیْعُ خدا سننے والا ہے تمام سنی جانے والی باتوں کا اَلْعَلِیْمُ جاننے والا ہے تمام معلومات کا۔

❀❀❀❀❀

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

بنام خدا مہربان وشفیق

ہمارے علماء نے اتفاق کیا ہے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سورہ حمد اور ہر سورہ کی آیت ہے؛ جس نے نماز میں اسے ترک کیا اس کی نماز باطل ہو جائے گی، چاہے واجبی نماز ہو یا مستحبی نماز۔ جہری نمازوں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھنا واجب اور اخفاتی نمازوں میں اسے بلند آواز سے پڑھنا مستحب ہے۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا فقہاء امت کے درمیان اس میں اختلاف ہے البتہ اس میں اختلاف نہیں ہے کہ یہ سورۂ نمل کی آیت ہے جس نے اسے مستقل آیت شمار کیا ہے، اس نے صِرَاطَ الَّذِیۡنَ سے آخر سورہ تک کو ایک آیت قرار دیا ہے، جس نے اسے مستقل آیت شمار نہیں کیا ہے اس نے صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ کو ایک آیت قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ بسم اللہ خیر و برکت کے لیے افتتاح ہے البتہ قراء میں حمزہ وخلف ویعقوب اور یزیدی نے سوروں کے درمیان تسمیہ (بسم اللہ) کے ذریعہ فصل کو ترک کیا ہے اور باقی لوگوں نے تسمیہ کے ذریعہ سوروں کے درمیان فصل قرار دیا ہے سوائے سورہ انفال اور توبہ کے۔

فضیلت بسم اللہ الرحمن الرحیم:

علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اسم اعظم الٰہی سے سیاہی چشم کے سفیدی چشم سے زیادہ نزدیک ہے۔ ابن عباس کے واسطہ سے حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے، آپ نے فرمایا: جب معلم بچہ سے کہتا ہے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کہو اور بچہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کہتا ہے تو خداوند عالم بچّہ کے لئے اور اس کے والدین اور اس کے استاد کے لیے آتش جہنم سے آزادی کا پروانہ لکھ دیتا ہے۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: جو چاہتا ہے کہ خداوند عالم اسے آگ کے بھڑکتے شعلوں سے نجات عطا کرے تو اسے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھنا چاہئے۔ اس میں انیس حروف ہیں تا کہ خداوند عالم ہر حرف کے عوض اسے آگ سے بچنے کے لئے سپر عطا کرے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: انھیں کیا ہو گیا، خدا انھیں مار ڈالے

انھوں نے کتاب خدا کی عظیم ترین آیت کو عمداً ترک کر دیا، جب اس کا اظہار کیا جاتا ہے تو اسے بدعت خیال کرتے ہیں، جو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہے۔

الفاظ و معانی

لفظ اِسۡم مشتق ہے سُمُو سے جس کے معنی بلندی کے ہیں، جس کی اصل سِمو واؤ کے ساتھ ہے، جمع اَسۡمَاء ہے مانند قِنۡو و اَقۡنَاء، حِنۡو و اَحۡنَاء، اس کی تصغیر سُمِی۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ وَسۡم و سِمَۃ سے مشتق ہے۔ قول اول زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ محذوف فاء الفعل کی جگہ واقع ہونے والا واؤ ہے مانند صِلَۃ و وَصۡل و عِدَۃ و وَعۡد اس پر ہمزۂ وصل داخل نہیں ہوگا۔ اس طرح اس کی تصغیر میں وُسَیۡم کہنا لازمی ہے، جس طرح وُعَیۡدَۃ و وُصَیۡلَۃ، عِدَۃ و صِلَۃ کی تصغیر میں کہا جاتا ہے جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے لفظ جلالہ ''اللّٰہ'' اسم ہے جس کا اطلاق خدا کے سوا کسی پر نہیں ہوسکتا۔ سیبویہ نے اس کی اصل میں دو قول بیان کیے ہیں:

(اول) اِلَاہ تھا فِعَال کے وزن پر ہمزہ حذف کر دیا گیا ہے جو فاء الفعل کی جگہ پر تھا اور اس کے عوض لازم الف ولام قرار دیا گیا۔ اس دلالت کے سبب کہ نحویوں نے قسم اور ندا میں لام تعریف پر اس ہمزہ کے داخل ہونے کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس کا قول ہے: اَفَاَللّٰہِ لَتَفۡعَلَنَّ وَ یَا اَللّٰہ اغۡفِرۡلِیۡ، اگر عوض کے علاوہ ہوتا تو وصل میں ہمزہ ثابت نہیں ہوتا جس طرح دوسرے اسماء میں ثابت نہیں ہے۔

دوسرا نظریہ کہ اس کی اصل لَاہ ہے اور اس کا وزن فَعَلٌ ہے جس سے الف ولام ملحق ہوا ہے۔

اس پر الف ولام اس کی بزرگی و تعظیم کے سبب داخل کیا گیا ہے، جس نے لام تعریف گمان کیا ہے اس نے اشتباہ کیا اس لیے کہ اسماء الٰہی معرفہ ہیں لاہ کا الف یاء سے بدل گیا پس اس کی اصل لَیۡہ ہے جیسا کہ ان کا کہنا: لَھِیۡ اَبُوۡكَ جو اسی معنیٰ میں ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ایسا وضع شدہ اسم ہے جو غیر مشتق ہے اس لیے کہ ہر لفظ کا مشتق ہونا لازمی نہیں ہے اس لیے کہ اگر یہ لازمی ہوگا تو تسلسل لازم آئے گا۔ یہ خلیل کا نظریہ ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ مشتق ہے، پھر اس کے اشتقاق میں چند نظریے پیش کئے ہیں:

(اول) یہ اَلۡاُلُوۡھِیَّۃ سے مشتق ہے جو عبادت اور بندگی کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی میری عبادت۔ ابن عباس نے اس طرح قرأت کی ہے: وَ یَذَرَكَ وَ اِلَاھَتَكَ یعنی تیری عبادت۔ اَلَہَ اللّٰہ فلانٌ اِلَاھَۃً ویسے ہی ہے جیسے: عَبَدَہٗ عِبَادَۃً ہے اس اعتبار سے اس کے معنی یہ ہوں گے اللہ یعنی وہ (ذات) جس کے

لیے عبادت ثابت ولازم ہے، اس لیے اس نام سے دوسرے کو یاد نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی کسی ایسی ہستی کو الہ کہا جا سکتا ہے جو لم یزل نہ ہو یعنی ہمیشہ رہنے والی نہ ہو۔

(دوم) وَلَہَ سے مشتق ہے، اور وہ تَحَیُّر کے معنی میں ہے۔ اَلِہَ یَاْلَہُ کہا جاتا ہے، جب تحیر کی حالت میں ہو ابو عمر سے روایت ہے ایسی صورت میں اللہ کے معنی یہ ہوں گے: وہ ذات جس کی عظمت کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں عقلیں متحیر ہو جائیں۔

(سوم) عربوں کے اس جملہ سے مشتق ہے: اَلَھتُ اِلیٰ فُلانٍ، یعنی میں نے اس کی طرف پناہ لی اس لئے کہ تمام مخلوقات اللہ کی جانب پناہ لیتی ہیں۔ مَاْلُوہ کو بھی اِلٰہ کہا گیا ہے، جیسا کہ جس کی امامت تسلیم کی جاتی ہے اسے امام کہتے ہیں۔

(چہارم) اَلَھتُ اِلَیہِ سے مشتق ہے یعنی میں نے اس کے ذریعہ آرام اور سکون حاصل کیا۔ یہ مبرد کا قول ہے اس معنی کی بنا پر مخلوقات اس کے ذکر سے سکون اور اطمینان حاصل کرتی ہیں۔

(پنجم) لَاہَ سے مشتق ہے یعنی حجاب و پردہ کرنا، اللہ یعنی وہ ذات جو اپنی کیفیت کے سبب اوہام سے حجاب کے اندر ہے اور دلائل اور علامات کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔

الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ: دو اسم ہیں جنھیں مبالغہ کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ یہ دونوں رَحمَۃ سے مشتق ہیں جو کہ نعمت کے معنیٰ میں ہے۔ البتہ رحمٰن ورحیم کے درمیان فرق یہ ہے کہ فَعْلَان (رحمٰن) مبالغہ میں فَعِیل (رحیم) سے زیادہ شدید ہوتا ہے یعنی رَحمٰن رَحِیم سے زیادہ شدید ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا: اَلرَّحمٰن صاحب رحمت ہے اور اَلرَّحِیم، ھُوَ الرَّاحِم (رحم کرنے والا ہے) تاکید کی غرض سے تکرار کی گئی ہے اور ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ دونوں اسم رقیق ہیں۔ ان میں سے ایک زیادہ رقیق ہے۔ الرحمٰن رقیق و نرم ہے الرحیم اپنے بندوں پر رزق و نعمت کے سبب عطوف و مہربان ہے۔ بندوں پر فضل کے بعد فضل کرتا ہے، نعمت کے بعد نعمت عطا کرتا ہے۔ رقت کے ذریعہ اس کی صفت بیان نہیں کی جاسکتی اور تغلب نے کہا ہے کہ الرحمن عربی لفظ نہیں ہے یہ بعض لغات میں ہے اللہ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: قَالُوْا وَمَا الرَّحمٰن۔ یہ کافروں کی طرف سے اس نام کا انکار ہے۔

تغلب کی یہ بات درست نہیں ہے اس لئے کہ یہ لفظ عربوں میں مشہور تھا اور ان کے اشعار بھی میں پایا جاتا ہے۔

ترکیب

باءحرف جر ہےاوراس کے حقیقی معنی الصاق (چسپاں کرنے) کے ہیں: حروف جارہ کومفعولیت کے معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ حروف جرافعال کواسماء سے ربط دیتے ہیں اورانہیں اسم پر واقع کرتے ہیں۔جب آپ مَرَرْتُ بِزَيْدٍ کہتے ہیں تو یہ باءمُرُوْر (گزرنے) کوزَيْد پر واقع کرتا ہے۔پس اس آیت میں باءلانے والافعل محذوف ہے جیسے:اِبْدَأُوْا بِسْمِ اللهِ... یاقُوْلُوْابِسْمِ اللهِ....

بِسْمِ اللهِ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ یہ مفعول بہ ہےاورنصب دینے والےفعل کوحذف کردیا گیا ہےاس لئے کہ صورت حال نے اس کے ذکر سے بے نیاز کردیا ہے۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ بِسْمِ اللهِ محلاً مرفوع ہےاس لئے کہ یہاں پر مبتدا،محذوف ہےاور یہ اس کی خبر ہےاوروہ اس طرح ہے:اِبْتِدَائِیْ بِسْمِ اللهِ---

اس قول کی بنا پر حرف باءخبر محذوف سے متعلق ہے کہ جارومجرورجس کا قائم مقام ہیں یعنی:اِبْتِدَائِیْ ثَابِتٌ بِسْمِ اللهِ۔ یااِبْتِدَائِیْ ثَبَتَ بِسْمِ اللهِ۔

پھراس خبرکوحذف کر کے ضمیرکوباءکی جگہ پہنچادیا گیا ہے۔یہ آپ کے اس جملہ کے مانند ہے:زَيْدٌ فِي الدَّارِ۔

باء"اِبْتِدَائِیْ" جوکہ پوشیدہ ہےاس سے متعلق نہیں ہوسکتا ہےاس لئے کہ وہ مصدر ہےاور جب اس سے متعلق ہوگاتوبِسْمِ اللهِاس کاصلہ بن جائے گااور پھر مبتدابغیر خبر کے رہ جائے گا۔

اگرکوئی یہ سوال کرے کہ حرف باءکوحرکت کیوں دی گئی ہے جبکہ مبنی کا قاعدہ یہ ہے کہ اسے ساکن ہونا چاہئے؟!

تواس کاجواب یہ ہے کہ باءکواس لئے حرکت دی گئی ہے کہ حرکت سے کلام کا آغاز کرناضروری ہےاور ساکن کے ذریعہ ابتداءممکن نہیں ہےاور باءکوکسرہ دیا گیا ہےتاکہ اس کی حرکت بھی اس چیز کی حرکت کی جنس سے ہوجووہ ایجادکرنے والا ہے(اوروہ اپنے بعدوالےکوزیردیناہے)

یہی بات کاف تشبیہ میں بھی ہے جیسے کَزَيْدٍ لیکن یہاں پرکاف کوزبردیا گیا ہےتواس کا جواب یہ ہے کہ کاف کاحرف جرہوناضروری نہیں ہے کبھی کبھی وہ اسم بھی ہوتا ہے جیسے:يَضْحَكْنَ عَنْ كَالْبَرَدِ.. پس

کاف کے درمیان اور دیگر حروف کے درمیان کہ جن کا حرف ہونا ان سے جدا نہیں ہوتا، فرق رکھا گیا ہے۔ یہ قول ابوعمرو جرمی اور ان کے ساتھیوں کا ہے۔ لیکن ابوعلی الحسن بن عبدالغفار الفارسی نے کہا ہے: اگر باء کو زبر یا پیش دیتے تو یہ بھی جائز اور درست تھا اس لئے کہ مقصد ابتدا تک رسائی حاصل کرنا ہے جس حرکت سے بھی رسائی حاصل ہوجائے صحیح ہے۔ بعض عرب اس باء کو فتحہ (زبر) دیتے ہیں اور یہ ضعیف تلفظ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ سے ہمزہ کو حذف کردیا گیا ہے اس لئے کہ یہ ہمزۂ وصل ہے جو بولنے میں گرجاتا ہے یہاں پر لکھنے میں بھی حذف کردیا گیا کثرت استعمال کی بنا پر اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایک معلوم جگہ پر واقع ہوا ہے اس میں اشتباہ کا اندیشہ نہیں ہے لیکن اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ وغیرہ میں حذف نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ کم استعمال ہوتا ہے۔

لفظ جلالہ اللّٰہِ کے لام میں تخفیف کی جائے گی جب اس سے پہلے پیش یا زبر ہو، اللہ کے ذکر کو عظمت دینے اور اس کی قدر و منزلت کی تعظیم کی خاطر اور یہ کہ لفظ جلالہ اللہ اور اَللّات کے درمیان فرق رہے۔ لفظ جلالہ اللہ اضافہ کی بنیاد پر مجرور ہے۔

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ دونوں مجرور ہیں اس لئے کہ لفظ جلالہ اللّٰہِ کی صفتیں ہیں۔

تفسیر:

بِسۡمِ اللّٰہِ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد استعانت کو شامل کرنا ہے لہذا بِسۡمِ اللّٰہِ کا مفہوم یہ ہے: اِسۡتَعِیۡنُوۡا یعنی مدد طلب کرو اللہ کے اسماء حسنیٰ کے ذریعہ اور بلند صفات کے ساتھ اس کی صفت بیان کرو۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ سے طلب امداد ہے اور اس کے حضور متوجہ ہونا ہے۔

ابوعبیدہ کا قول ہے اسم تو واسطہ ہے حالانکہ مراد اللہ ہے۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ بسم اللہ سے مراد ہے اللہ کا نام لیکر شروع کرتا ہوں۔ پس یہاں پر لفظ اسم مصدر کی جگہ ہے۔

تقدیر کلام اس طرح ہوگی: میری قرأت کی ابتدا اللہ کے نام سے ہے یا میری قرائت کی ابتداء اللہ کا نام لے کر ہے یا میں اللہ کا نام لے کر قرائت شروع کررہا ہوں۔ یہ قول حقیقت سے زیادہ نزدیک ہے اس لیے کہ ہمیں اپنے کاموں کو اللہ کا نام لے کر شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نہ کہ اس کی کبریائی اور عظمت کی خبر دے کر جیسا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم کھانا کھاتے وقت، پانی پیتے وقت اور جانور ذبح کرتے وقت بِسۡمِ اللّٰہِ

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اگر ذبح کرنے والا بِاللهِ کہے اور بِسْمِ اللهِ نہ کہے تو اسے جو حکم دیا گیا تھا، اس نے اس کی مخالفت کی ہے۔

اللہ اور اَلْاِلٰہ کے معنی اس ذات کے ہیں جو عبادت کا حقدار ہے اور وہ اس لئے عبادت کا حقدار ہے کہ وہ قدرت رکھتا ہے اجسام کو خلق کرنے پر اور انہیں زندہ کرنے پر اور انہیں انعام و اکرام سے نوازنے پر جس کی وجہ سے وہ عبادت کا مستحق ہے اور وہ پاک و پاکیزہ حیوانات اور جمادات کا معبود ہے اس لئے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کو نعمت عطا کرنے پر قادر ہے جس کے سبب وہ عبادت کا حقدار ہے۔ جس نے کہا: الالٰہ کے معنی مستحقِ عبادت ہونا ہیں تو، اس کا لازمہ ہے کہ وہ ازل میں اِلٰہ نہ رہا ہو اس لیے کہ اس نے انعام نہیں کیا تھا کہ مستحق عبادت ہو۔ یہ نظریہ غلط ہے۔

رحمٰن کو رحیم پر مقدم کیا گیا ہے۔ رحمٰن اسم علم کی منزل و مقام میں ہے اس اعتبار سے کہ کسی کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی بجز اللہ کے اس سبب سے اسے مقدم کیا گیا ہے رحیم کے برخلاف اس لیے رحیم اللہ اور غیر اللہ دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

ابوسعید الخذری نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم نے اس طرح فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَالرَّحِیْمُ رَحِیْمُ الْاٰخِرَۃِ۔ (الرحمٰن یعنی دنیا میں مہربان اور الرحیم یعنی آخرت میں رحم کرنے والا) بعض تابعین سے روایت ہے انھوں نے کہا: صفت الرحمن تمام مخلوقات کے لیے ہے (صفت) الرحیم مومنین سے مخصوص ہے۔ الرحمن کے عام ہونے کی وجہ جملہ مخلوقات مومنین و کافرین، نیک اور بد سے متعلق ہے اور اللہ کا انھیں خلق کرنا، وجود بخشنا، انھیں زندگی سے نوازنا اور انھیں رزق عطا کرنا ہے اور (صفت) رحیمیت کے مومنین سے مخصوص ہونے کی وجہ انھیں دنیاوی (امور) میں توفیق عطا کرنا اور آخرت میں جنت عطا کرنا اور محترم قرار دینا، گناہوں اور لغزشوں سے درگذر کرنا ہے۔ ان معانی کی امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان معانی کی تفسیر میں نے فرمایا: الرحمن اسم خاص ہے عام صفت کے ساتھ، الرحیم اسم عام ہے صفت خاص کے ساتھ۔

عکرمہ نے کہا: الرحمٰن ایک رحمت کے ساتھ ہے، الرحیم سو رحمت کے ساتھ ہے، یہ معنی پیغمبرؐ کے اس ارشاد سے اقتباس کیے گئے ہیں جس میں حضرتؐ نے فرمایا: خداوند عالم کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے اس نے زمین پر ایک نازل فرمائی ہے اور اسے اپنی مخلوقات پر تقسیم کر دیا ہے جس کے ذریعہ وہ باہم لطف و مہربانی سے پیش آتے ہیں، ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور ننانوے رحمتیں اپنی ذات کے لیے ذخیرہ کر رکھی ہیں؛ جن

کے ذریعہ قیامت میں وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا اور روایت کی گئی ہے کہ خداوند عالم اس رحمت کو بقیہ رحمت میں شامل کر کے مکمل فرمائے گا جن کے ذریعہ قیامت کے روز وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔

❁❁❁❁❁

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۲﴾
ثنائے کامل اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے

قرائت

اَلْحَمْدُ میں دال پر پیش ہونے اور لفظ جلالہ اللہ کے لام کے نیچے زیر ہونے پر سارے قراء کا اتفاق و اجماع ہے۔ شاذ و نادر قرائت میں دال اور لام کو زیر، یا دال کو زبر اور لام کو زیر یا دال اور لام کو پیش دیا گیا ہے۔ قراء کا لفظ رَبِّ کے مکسور ہونے پر اجماع ہے۔ زید بن علی سے روایت کی گئی ہے کہ رَبَّ کے باء پر زبر ہے اور اگر اس قول کو اس بات پر حمل کیا گیا ہے انھوں نے زبر ہونے کے جواز کو بیان کیا ہے، نہ یہ کہ زبر کے ساتھ قرائت ہو۔

الفاظ و معانی:

اَلْحَمْدُ، اَلْمَدْحُ اور اَلشُّكْرُ قریب المعنی ہیں۔ اَلْحَمْدُ اور اَلشُّكْرُ میں فرق یہ ہے کہ اَلْحَمْدُ ذم کے برعکس ہے۔ جس طرح اَلْمَدْحُ هَجْو کی ضد ہے، شُكْر، كُفْرَان کی ضد ہے۔ اَلْحَمْدُ کبھی غیر نعمت پر بھی ہوتی ہے لیکن اَلشُّكْرُ نعمت سے مخصوص ہے، رتبہ اَلْحَمْدُ کبھی کبھی شُكْر کے قائم مقام ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ شُكْرًا

لفظ شُكْرًا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اگر حمد شکر کے معنیٰ میں نہ ہوتا تو شُكْرًا کو نصب نہ دیا جاتا۔

پس جب اَلْحَمْدُ شکر کی جگہ استعمال ہو تو شکر تعظیم کے ساتھ اعتراف نعمت ہے، جو قلب کے ذریعہ ہوتا ہے اور وہی اصل ہے اور شکر زبان سے بھی ہوتا ہے، زبان کے ذریعہ اس لیے واجب ہے تاکہ انکار اور کفران کی تہمت سے بچا جا سکے، البتہ مدح وہ گفتگو اور کلام ہے جس سے ممدوح کی عظمت آشکار ہوتی ہے اس کا قصد

کرتے ہوئے۔

رَبّ اس کے متعدد معنی ہیں:

اول: سید و سردار جس کی اطاعت کی جائے۔

دوم: مالک، جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا:

اَرَبُّ غَنَمٍ اَمْ رَبُّ اِبِلٍ ترجمہ: تم بھیڑ کے مالک ہو یا اونٹ کے؟ اس نے عرض کیا: جو کچھ اللہ نے مجھے عطا کیا ہے وہ بہت زیادہ اور پاک و پاکیزہ ہے۔

سوم: اَلصَّاحِب ساتھی

چہارم: اَلْمُرَبِّب انعام کرنے والا

پنجم: اَلْمُصْلِح، (اصلاح اور درست کرنے والا) لفظ رب سے یہ تربیت سے مشتق ہے۔ رَبَّبْتُہٗ و رَبَبْتُہٗ ایک ہی معنیٰ میں ہیں۔ اس طرح بھی کہا جاتا ہے: فُلَانٌ یَرُبُّ صَنِیْعَتَہٗ، جب کسی کی پرورش کرتا ہے، اسے پروان چڑھاتا ہے، لفظ رب بغیر اضافت کے صرف اللہ کے لئے بولا جاتا ہے اور غیر اللہ کے لئے لفظ رب اضافت کے ساتھ بولا جاتا ہے جیسے: رَبُّ الدَّارِ، رَبُّ الضَّیْعَۃِ، یعنی گھر کا مالک جاگیر کا مالک۔

اَلْعَالَمُوْنَ: عَالَم کی جمع ہے، عَالَم ایسی جمع ہے جس کا اس کے لفظ سے واحد نہیں ہے۔ جیسے نَفَر، جَیْش وغیرہ اور یہ عَلَامَۃ سے مشتق ہے۔ اس کے صانع (خالق) ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ عِلْم سے اسم ہے، اس کا اطلاق اس شئے پر ہوتا ہے جس کا علم حاصل کیا جائے۔ لغت میں عالم سے مراد عقلاء کی جماعت ہے اس لیے وہ کہتے ہیں: جَاءَنِیْ عَالَمٌ مِّنَ النَّاسِ۔ میرے پاس لوگوں میں سے عالم آیا۔ اس طرح نہیں کہتے: جَاءَنِیْ عَالَمٌ مِّنَ الْبَقَرِ۔ میرے پاس گائے سے عالم آیا۔ عرف عام میں عالم سے مراد ساری مخلوقات ہیں اور یہ آیت کریمہ اس معنیٰ پر دلالت کر رہی ہے:

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا۔

(سورۂ شعراء، آیت ۲۳-۲۴)

(فرعون نے دریافت کیا کہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کیا ہے؟ موسیٰ نے کہا: آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین ہر چیز کا پروردگار ہے)

یہ بھی بیان گیا ہے کہ تمام اصناف میں سے ہر صنف کے لیے اسم اور نام ہے اور ہر صدی

کے اہل کو عالَم کہا جاتا ہے۔اس لیے جمع کا استعمال ہوا ہے چنانچہ ہر زمانہ کے عَالَم کو عَالَمُونَ کہا گیا۔ بیشتر مفسرین کا یہی قول ہے، جیسے ابن عباس، سعید بن جبیر، قتادہ وغیرہ۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عالم صاحبان عقل کی نوع ہے جن میں ملائکہ، جن اور جملہ انسان شامل ہیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد صرف جن اور انسان ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْراً۔ (سورۂ دخان، آیت ۲۵) (تا کہ وہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو) کہا گیا ہے کہ تمام انسان مراد ہیں ارشاد ہوتا ہے: اَتَاْتُوْنَ الذُّکْرَانَ مِنَ الْعَالَمِیْنَ۔ (سورۂ شعراء، ۱۶۵ آیت) (کیا تم جنسی تسکین کے لیے دنیا بھر کے مردوں کے پاس آتے ہو)

ترکیب:

اَلْحَمْدُ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اور ابتداء ایک معنوی عامل ہے جو ظاہر میں نہیں ہوتا ہے اور وہ اسم کا لفظی عوامل سے خالی ہونا ہے تا کہ خبر کی نسبت اس کی جانب دی جائے۔ اَلْحَمْدُ کی خبر دراصل جملہ ہے اور وہ جملہ فعل ہے جو مبتدا کی ضمیر کی جانب مسند ہے اور اس کو اس طرح فرض کیا جاتا ہے: اَلْحَمْدُ حَقَّ لِلّٰهِ یا اَلْحَمْدُ اسْتَقَرَّ لِلّٰهِ لیکن کبھی کہا کہ اس جملہ کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی ہے اس لئے کہ لِلّٰهِ اس جملہ پر دلالت کرتا ہے۔ پس خبر جملہ سے لِلّٰهِ کی جانب منتقل ہوگئی ہے اس لئے کہ وہ جملہ کا قائم مقام ہے۔ اس کو جملہ ظرفیہ کہتے ہیں۔ یہ اخفش اور ابوعلی فارسی کا قول ہے۔

لام کے حقیقی معنی تحقیق اور ملکیت کے ہیں۔

جس نے اَلْحَمْدَ کی دال کو فتحہ (زبر) دیا ہے تو وہ مصدر (مفعول مطلق، یا مفعول بہ ہونے) کی بنا پر ہے گویا اس طرح ہے: اَحْمَدُ الْحَمْدَ لِلّٰهِ (مفعول مطلق) یا اَجْعَلُ الْحَمْدَ لِلّٰهِ (مفعول بہ) ہے۔ لیکن اَلْحَمْدُ کا مرفوع ہونا زیادہ قوی اور پسندیدہ ہے اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اَلْحَمْدُ وَجَبَ لِلّٰهِ یا اِسْتَقَرَّ لِلّٰهِ حمد ثابت و مستقر ہے اللہ کے لئے۔

یہ تفسیر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ ساری مخلوقات کو شامل ہے جب اَلْحَمْدَ کو نصب (زبر) دیا جائے گا تو گویا اس طرح کہا جائے گا:

اَحْمَدُ الْحَمْدَ اس وقت صرف متکلم کی جانب سے تعریف ہوگی اسی لئے رفع کو اختیار کیا گیا ہے۔ جس

نے دال اور لام دونوں کو کسرہ دیا ہے اس نے دال کی حرکت کو لام کی حرکت کا تابع قرار دیا ہے اور جس نے ضمہ دیا ہے اس نے لام کی حرکت کو دال کی حرکت کا تابع قرار دیا ہے۔ یہ پہلے قول سے زیادہ آسان ہے اس لئے کہ اس نے مبنی کی حرکت کو معرب کی حرکت کا تابع قرار دیا ہے۔

پہلے قول کے قائل معرب کی حرکت کو مبنی تابع قرار دیا ہے اور تابع قرار دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں قاعدہ یہی ہے اور جس نے زیر دیا ہے اس نے پہلے کو دوسرے کا تابع قرار دیا ہے اور یہ قاعدہ کے برخلاف ہے۔ اکثر علماء نحو اسے ناپسند قرار دیتے ہیں؛ اس لئے معرب کی حرکت ثابت و لازمی نہیں ہے پس اس حرکت کی وجہ سے تابع قرار دینا جائز نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک کلمہ میں تابع قرار دینا ضعیف ہے جیسے حُلُمٌ تو دو کلموں میں تابع قرار دینا کیونکر ضعیف نہ ہوگا؟!

ابوالفتح بن جنی نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں دال کو زیر اور لام کو پیش دینے میں اس بات پر دلالت پائی جاتی ہے کہ مبتدا کا ربط خبر سے بہت مضبوط ہے اس لئے کہ اس نے ان دونوں میں ایک جزء کو دوسرے جزء میں موجود حرکت کا تابع مانتے ہوئے ایک کلمہ کے مانند قرار دیا ہے جیسے آپ کا کہنا: اَخُوكَ وَ اَبُوكَ۔

اس لام میں قاعدہ اس پر زبر ہونا ہے اسلئے کہ حرف واحد کا اعراب میں کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے۔ ہاں وہ جملہ میں مبتدا واقع ہو سکتا ہے اس لئے کہ ساکن کے ذریعہ ابتدا نہیں ہو سکتی ہے پس لام کے لئے زبر اختیار کیا گیا ہے اس لئے کہ زبر سب سے ہلکی حرکت ہے۔ جیسے آپ یہ کہیں: رَاَيْتُ زَيْدًا وَّ عَمْرًوا (میں نے زید اور عمرو کو دیکھا) تو لوگ سوال کریں کہ وَمَنْ عَمْرًوا؛ زبر کے ساتھ اسی طرح فاءمَنْ فَعَمْرًوا آمیں۔

البتہ علماء نے لام کو زیر دیا ہے اس لئے کہ انھوں نے چاہا کہ لام ملک اور لام تاکید کے درمیان فرق رہے۔ جب آپ یہ کہیں: اِنَّ الْمَالَ لِهٰذَا یعنی یہ مال اس آدمی کی ملکیت میں ہے اور اِنَّ الْمَالَ لَهٰذَا ' یعنی یہ مال وہی مال ہے۔ اور جب لام کو خبر پر داخل کریں گے تو اسے اس کی اصل کی جانب پلٹا دیں گے اور وہ زبر ہے اور 'لَكَ' اور 'لَهٗ' کہیں گے۔ اس لئے کہ یہاں پر اشتباہ ختم ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ضمیر مجروری ضمیر مرفوعی کے برخلاف ہوتی ہے۔ جب آپ کہیں گے: اِنَّ هٰذَا لَكَ وَاِنَّ هٰذَا لَاَنْتَ لیکن علماء نحو نے لام کو ضمیر متکلم کے ساتھ زیر دیا ہے۔ جیسے لِیْ' اس لئے کہ اس یاء سے پہلے زیر ہی ہوگا جیسے غُلَامِیْ وَ فَرَسِیْ۔ یہ سب سیبویہ اور محقق نحویوں کی ایک جماعت کا نظریہ ہے۔

جن حروف کے ذریعہ ابتدا ہوتی ہے اور وہ ایک حرف ہو اور وہ مکسور بھی ہو تو ایسا صرف اور صرف حرف

باء میں ہوتا ہے اور اس کے بارے میں بحث گذر چکی ہے۔ لیکن 'لِیَفْعَلَ' میں لام جزم تو اس کو اس لئے کسرہ دیا گیا ہے کہ لام جزم اور لام تاکید کے درمیان فرق ڈال دیا جائے۔ جیسے لَیَعْمَلُ، لَاَعْلَمُ' (وہ انجام دے رہا ہے اور میں جان رہا ہوں)

رَبِّ الْعَالَمِیْنَ:

لفظ رَبِّ صفت ہونے کی بنا پر مجرور ہے۔ ابوالحسن اخفش کے نزدیک صفت میں عامل اس کا صفت ہونا ہے اور یہی اسے رفع، نصب اور جر دیتا ہے اور وہ معنوی عامل ہے۔ جس طرح مبتدا کو ابتداء رفع دیتا ہے اور یہی مبتدا میں عمل کا مطلب ہے۔ اس بات پر دلیل پیش کی گئی ہے کہ صفت میں وہ عامل عمل نہیں کرتا ہے جو موصوف میں عمل کرتا ہے جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ کبھی کبھی صفات موصوف کے اعراب کے مخالف ہوتے ہیں جیسے: یَازَیْدُ الْعَاقِلُ اس لئے کہ منادیٰ مبنی ہے اور لفظ عاقل جو کہ اس کی صفت ہے وہ معرب ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ان توابع میں کچھ وہ ہیں کہ انھیں ان کا اعراب دیا جاتا ہے جن کی وہ تبعیت کرتے ہیں اور صحیح نہیں ہے کہ تابع میں وہ چیز عمل کرے جو موصوف میں عمل کر رہی ہے اور وہ اَجْمَعُ، جُمَعُ اور جَمْعَاء ہیں جو ان اسماء میں ہو تو وہ اس بات پر دلالت کرے گا کہ وہ چیز جو موصوف میں عمل کر رہی ہے وہ صفت میں عمل کرنے والے کے علاوہ ہے اسلئے کہ دونوں تابع ہونے میں جمع ہو جائیں گے۔

دیگر علماء نحو نے کہا: جو موصوف میں عمل کر رہا ہے وہی صفت میں بھی عمل کر رہا ہے۔

اور جس نے رَبَّ الْعَالَمِیْنَ میں رَبَّ کو زبر دیا ہے تو اس نے مدح وثنا کی بنا پر نصب دیا ہے۔ گویا جب اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا تو اس لفظ کے ذریعہ اس بات پر دلیل پیش کی کہ وہ اللہ کا ذکر کرنے والا ہے گویا اس نے کہا: اَذْکُرُ رَبَّ الْعَالَمِیْنَ (میں رب العالمین کو یاد کرتا ہوں)

اس بیان کی روشنی میں اگر غیر قرآن میں رَبُّ الْعَالَمِیْنَ پڑھا جائے بر بنائے مدح تو یہ بھی جائز ہے۔ اس وقت مقصود ھُوَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ہوگا۔

شاعر نے کہا:

لَا یَبْعُدَنَّ قَوْمِی الَّذِیْنَ ھُمُ — سُمُّ الْعُدَاۃِ وَ آفَۃُ الْجُزُرِ
اَلنَّازِلِیْنَ بِکُلِّ مُعْتَرَکٍ — وَ الطَّیِّبُوْنَ مَعَاقِدَ الْاَزُرِ

اَلنَّازِلُوْنَ، اَلنَّازِلِیْنَ اور اَلطَّیِّبُوْنَ اَلطَّیِّبِیْنَ دونوں منقول ہے اور سبب وہی ہے جو ہم نے

بیان کیا۔

اَلْعَالَمِیْنَ: اضافت کے سبب مجرور ہے یاء علامت جر، حرف اعراب اور علامت جمع ہے۔ نون مفرد میں حرکت کا عوض ہے۔ اس نون کو زبر دیا گیا ہے تاکہ اسے تثنیہ کے نون سے الگ کیا جائے۔ آپ کہتے ہیں: ھٰذانِ عَالِمَانِ پس آپ نون کو کسرہ دیتے ہیں دو ساکن ایک ساتھ جمع ہونے کی بنا پر کہا گیا ہے کے جمع کے نون کو زبر دیا جاتا ہے جب کہ اس کا حق زیر ہے اس لئے دیا گیا ہے کہ واؤ کے بعد زیر سنگین ہوتا ہے۔ جس طرح سَوْفَ کے فاء کو اور اَیْنَ کے نون کو زبر دیا جاتا ہے، انہیں زیر نہیں دیا جاتا ہے اس لئے کہ واؤ اور یاء کے بعد زیر سنگین ہوتا ہے۔

تفسیر:

آیت کے معنی یہ ہیں: اوصاف جمیلہ اور اچھی تعریفیں اس اللہ کے لیے خاص ہیں جو عبادت کا سزاوار ہے۔ نعمتوں کی اصل پر قادر انہیں بجالانے والا ہے، اس لیے کہ وہ خلق کا سرچشمہ ہے، ان کی تربیت کرتا اور پروان چڑھاتا ہے، ان کے حالات کی اصلاح فرماتا ہے۔

آیت میں اللہ کی نعمتوں پر اللہ کی شکر کے واجب ہونے پر دلالت ہے، ساتھ ہی اس میں بندوں کو یہ تعلیم دینا ہے کہ وہ کس طرح اللہ کی حمد کریں۔

❀❀❀❀❀

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۳﴾
جو بڑا مہربان نہایت شفیق ہے۔

اس آیت کی تفسیر گذر چکی ہے۔ مبالغہ کی غرض سے الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تکرار کی گئی ہے۔

علی بن عیسیٰ الرمانی نے بیان کیا ہے: ابتداء میں بندگی کا بیان ہے جس کے ذریعہ شکر نعمت تک رسائی ہوتی ہے، جس کے باعث وہ لائق عبادت ہے۔ اس مقام پر الحمد کا ذکر ہے جس کے ذریعہ اس ذکر تک پہونچا جاتا ہے جس پر نعمت کے ذریعہ اَلْحَمْد کا مستحق بنتا ہے، لہٰذا اس میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴﴾

جو روز جزا کا مالک ہے۔

قرائت:

عاصم، کسائی، خلف اور یعقوب حضرمی نے مٰلِكِ پڑھا ہے۔ الف کے ساتھ اور بقیہ قراء نے مَلِكِ پڑھا ہے بغیر الف، کے کسی نے بھی مٰلِكِ کے الف کو لکھا نہیں ہے اور سب نے کاف کو جر دیا ہے۔ شواذ میں اعمش سے مروی ہے کہ انھوں کاف کو نصب دیا ہے۔ ربیعہ بن نزار نے مزید ہلکا کر دیا ہے: مَلْكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی لام کو ساکن کر دیا۔

حجت

اس بارے میں اختلاف ہے کہ دو قرأتوں میں سے کون سی قرأت سب سے زیادہ قابل تعریف ہے۔ جس نے مَالِكِ کی پڑھا ہے اس نے کہا ہے کہ اس کی یہ صفت زیادہ قابل تعرف ہے اس لیے کہ کوئی مالک نہیں ہوسکتا کسی چیز کا مگر یہ کہ وہ اس کی ملکیت میں ہو، کبھی انسان کسی چیز کا مَلِک ہوتا ہے لیکن وہ چیز اس کی ملکیت نہیں ہوتی ہے جیسے مَلِكُ الْعَرَب، مَلِكُ الرُّوْم کہا جاتا ہے لیکن وہ اس کے مالک نہیں ہوتے۔ کبھی مالک میں وہ چیز داخل ہوتی ہے جس کا ملکیت میں داخل ہونا صحیح نہیں ہوتا۔ چنانچہ فلانی مَالِكُ الدَّرَاهِم کہا جاتا ہے، مَلِكُ الدَّرَاهِم نہیں کہا جاتا۔ پس مالک پڑھنا ملک پڑھنے سے زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے۔ اللہ ہر شے کا مالک ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی وصف یہ بیان کی ہے کہ وہ مالک الملک ہے جسے چاہے اقتدار عطا کر دیتا ہے۔ پس خدا کو مَالِكِ کہنا اس کو مَلِك کہنے سے زیادہ بلیغ اور رسا ہے۔

جس نے مَلِكِ کی پڑھا ہے تو اس کا یہ کہنا ہے: یہ صفت زیادہ قابل تعریف ہے (اس میں زیادہ مدح ہے) کیوں کہ یہ زیادہ تعظیم کی شمولیت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس قول کو ابوبکر محمد بن السری السراج نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے: مَلِكِ بہت سی اشیاء کا مالک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگوں کی ملکیت میں ان کا شریک ہوتا ہے اور ان پر حکومت کے سبب ہر مَلِک؛ مالِک ہوتا ہے اور لیکن مالک مَلِک نہیں ہوتا، ارشاد الٰہی ہے: مَالِكَ الْمُلْكِ، خداوند عالم ملوک دنیا اور جس چیز کے وہ مالک ہیں ان سب کا مالک ہے، جس کے معنی

ہیں کہ وہ مُلک دنیا کا مالک ہے۔اس دنیا میں جسے چاہتا ہے مُلک (اقتدار) عطا کرتا ہے۔

یَوۡمِ الدِّیۡنِ: (روز جزا) بجز اس کے کسی کا مُلک (اقتدار) نہیں ہے، وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ان کی ہر چیز کا مالک ہے۔کبھی اس کا استعمال لوگوں کے لیے بھی ہوتا ہے؛ کہا جاتا ہے فلاں (شخص) بادشاہوں کا بادشاہ اور امیروں کا امیر ہے۔جس سے یہ مراد ہے کہ اس کے سوا بھی بادشاہ اور امرا ہیں۔یہ آیت اللہ کی ثنا اور مدح میں نازل ہوئی ہے۔کیا آپ ملاحظہ نہیں کرتے کہ اس کا ارشاد ہے: رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، ربوبیت اور مِلک دونوں ایک جیسے ہیں۔ابوعلی الفارسی نے بیان کیا ہے جس نے مالِک پڑھا ہے وہ اس پر اس طرح گواہ لایا ہے کہ وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ، اس لیے کہ آپ کا یہ کہنا (اَلۡاَمۡرُ لَہٗ) یعنی امر اس کے لیے ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ امر کا مالک ہے۔جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ لام جر کے معنی اَلۡمِلۡکُ اور استحقاق کے ہیں۔اسی طرح اس کا یہ ارشاد ہے:

یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ۔ (سورۂ انفطار، آیت ۱۹)

(جس روز کوئی شخص کسی کے لیے کچھ بھی اختیار نہ رکھتا ہوگا)

اور جس نے مَلِک پڑھا ہے اس کا گواہ یہ ارشاد الٰہی ہے:

لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ۔ اس لیے کہ مُلۡك کا اسم فاعل مَلِك ہے۔

الفاظ و معانی

اَلۡمَلِكُ: ایسا قادر جس کی قدرت وسیع ہے، جس کے لیے سیاست (انتظامی امور) اور تدبیر ہے۔ وَ الۡمَالِكُ جو اپنے مال میں تصرف کی قدرت رکھتا ہے اور اس طرح تصرف کرتا ہو کہ اس میں کوئی ایک بھی شے رکاوٹ اور مانع نہیں بن سکتی ہے۔

الدِّیۡنِ: آیت میں دین جزا کے معنی میں ہے؛ شاعر نے اس طرح کہا ہے:

وَاعۡلَمۡ فَاِنَّكَ مَا تَدِیۡنُ تُدَانُ

(جان لو تم جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) یہ سعید بن جبیر اور قتادہ کا قول ہے۔

الدِّیۡن حساب کے معنی میں بھی بیان کیا گیا ہے؛ اس کی روایت امام باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

ابن عباس سے روایت کی گئی ہے اَلدِّیۡنِ سے اطاعت و بندگی مراد ہے۔

دین کے معنی عادت کے بھی ہیں۔

دین جزااور حساب پر بھی دلالت کرتا ہے؛ ارشاد الٰہی ہے: اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ.
(سورۂ غافر، آیت ۱۷)

آج کے دن ہر نفس کو اس کے کیے کی جزادی جائے گی۔

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (سورۂ جاثیہ، آیت ۲۸)

(تم نے جو عمل کیا ہے آج تمھیں اس کی جزا ملے گی)

دین کے معنی غلبہ اور بلند ہونے کے بھی۔

ترکیب:

مَالِكِ لفظ جلالہ اللہ کی صفت ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور جہاں منصوب آیا ہے تو اسی دلیل کی بنا پر منصوب لایا گیا ہے جو رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کے منصوب ہونے کی دلیل ہے۔

رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کو نداء کی بنا پر نصب بھی دے سکتے ہیں گویا آپ نے اس طرح کہا: لَكَ الْحَمْدُ يَارَبَّ الْعَالَمِيْنَ وَيَامَالِكَ يَوْمِ الدِّيْنِ۔

اور جس نے لام کو ساکن کر کے مَلْكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھا ہے اس کی اصل مَلِكَ تھی اس نے اسے مزید ہلکا کر دیا ہے جیسا کہ فَخِذ اور فَخْذ کہا جاتا ہے۔ اور جس نے مَلِكَ يَوْمَ الدِّيْنِ پڑھا ہے اس نے مَلِكَ کو فعل ماضی قرار دیا ہے يَوْمِ، مَلِكِ یا مَالِكِ کی اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ اس طرح لفظ الدِّيْنِ، يَوْمِ کے اس کی جانب مضاف ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور یہ اضافت اس عنوان سے ہے کہ (يَاسَارِقَ اللَّيْلَةِ اَهْلَ الدَّارِ) ظرف میں لفظ اللَّيْلَةِ میں وسعت دے دی گئی ہے اور اسے مفعول بہ کے عنوان سے نصب دیا گیا ہے پھر اسی عنوان سے اس کی جانب اضافت دی گئی۔ جیسا کہ شاعر سیبویہ نے شعر کہا:

وَ يَوْمَ شَهِدْنَاهُ سُلَيْمًا وَّ عَامِرًا　قَلِيْلٍ سِوَى الطَّعْنِ النِّهَالِ نَوَافِلُهْ

گویا اس نے یہ کہا کہ وہ مَلِكِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ (وہ اس دن کا مالک ہے اس دن اپنے ملک کو کسی کو عطا نہیں کرے گا جس طرح دنیا میں عطا کر رکھا تھا۔ لہٰذا اس دن اس کے علاوہ دوسرا ملک نہیں ہوگا اور جس نے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھا ہے اس نے دلالت اور قرینہ کی بنا پر کلام سے مفعول بہ کو حذف کر دیا ہے گویا اس

طرح: مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ الْأَحْكَامَ وَ الْقَضَاءَ لَا يَمْلِكُ ذٰلِكَ وَلَا يَلِيْهِ سِوَاهُ یعنی اس کے علاوہ کوئی دوسرا والی وحاکم نہیں ہوگا۔

خداوند عالم نے خاص طور سے يَوْمِ الدِّيْنِ میں اپنے مالک ہونے کو بیان فرمایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن صرف خداوند عالم تا چیزوں کا مالک ہوگا اور ساری مخلوقات اس بات کا اقرار کرنے اور اسے ماننے پر مجبور ہوں گی۔ لیکن دنیا میں ایسا نہیں ہے اس میں تو بادشاہ اور روساء بھی مالک وحاکم بن بیٹھتے ہیں۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ والی اضافت عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ جیسی اس لئے کہ یہاں پر لفظ اَلسَّاعَةِ حقیقۃً مفعول بہ ہے۔ وہ اَلسَّاعَةِ ہونے کی وجہ سے مفعول فیہ نہیں ہے اس لئے کہ جب ظرف کو اَلسَّاعَةِ کی بنا پر مفعول بنا دیا جائے تو اس میں ظرف کے معنی ہوں گے اور جب اَلسَّاعَةِ ظرف ہو جائے گا تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ ساعت میں جانے گا اور یہ خداوند عالم کے لئے ممکن نہیں ہے اس لئے کہ وہ تو ہر وقت جانتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اَلسَّاعَةِ کو جانتا ہے یعنی اسے پہچانتا ہے۔

تفسیر:

روز قیامت پر ایمان

جس طرح خداوند عالم نے رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فرما کر دنیا میں اپنے ملک واقتدار کو بیان فرمایا ہے اسی طرح مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ فرما کر آخرت میں اپنے اقتدار کا اعلان فرمایا ہے۔

يَوْمِ سے وقت مراد ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے ضیاء اور روشنی کا باقی رہنا مراد ہے یہاں تک کہ وہ قضاوت اور فیصلہ سے فارغ ہو اور ہر کوئی اپنے اپنے ٹھکانے (جنت یا جہنم) میں پہنچ جائے ہو جائے۔ ابو علی الجبائی نے بیان کیا ہے یہ یوم الدین سے مراد جزا کا دن ہے۔ محمد بن کعب نے بیان کیا ہے اس سے ایسا دن مراد ہے جس میں دین کے سوا کوئی چیز مفید نہیں ہوگی۔ روز قیامت کو مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے ذکر سے مخصوص کیا ہے اپنی شان کی تعظیم اور امر کی عظمت کی خاطر جس طرح رَبُّ الْعَرْشِ کہا ہے۔

یہ آیت اثبات معاد اس کی جانب ترغیب اور اس سے ڈرنے خوف پر دلالت کر رہی ہے اس لیے کہ مکلف جب ان امور کا تصور کرے گا تو اس کے اندر امید اور خوف پیدا ہونا لازمی ہے۔

❀❀❀❀❀❀

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴿۵﴾

ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔

الفاظ و معانی

لغت میں عبادت ذلت (یعنی عاجزی، انکساری اور فروتنی) کے معنی میں ہے۔ طَرِيقٌ مُعَبَّدٌ اس راستے کو کہا جاتا ہے جس پر زیادہ چلنے کی وجہ سے وہ ہموار ہو گیا ہو۔

عبد (بندہ) کو عبد اس کی انکساری اور اپنے مولا کی اطاعت و فرمانبرداری کی بنا پر کہا جاتا ہے اور استعانت کے معنی مدد طلب کرنے کے ہیں۔

ترکیب

ابواسحاق ابراہیم بن السری الزجاج نے کہا: إِيَّاكَ منصوب ہے اس لئے کہ فعل اس پر واقع ہوا ہے اور إِيَّاكَ میں "كَ" مجرور ہے اس لئے کہ "إِيَّا" اس کی جانب مضاف ہے۔ لفظِ إِيَّا ضمیر منصوب کے لئے اسم ہے فرق یہ ہے کہ وہ ایسا اسم ظاہر ہے جو ساری ضمیروں کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ جیسے آپ کا یہ کہنا کہ (إِيَّاكَ ضَرَبْتُ، إِيَّايَ حَدَّثْتَ، إِيَّاهُ ضَرَبْتُ) اگر آپ نے (إِيَّا زَيْدٍ حَدَّثْتُ) کہا تو یہ قبیح و خلاف قاعدہ ہے۔ اس لئے کہ إِيَّا ضمیر سے مخصوص ہے۔ خلیل نے عربوں سے نقل کیا ہے کہ جس میں انھوں نے إِيَّا کو اسم ظاہر کی جانب مضاف کیا ہے۔ إِذَا بَلَغَ الرَّجُلُ السِّتِّينَ فَإِيَّاهُ وَإِيَّا الشَّوَابِ۔ یہ زجاج کا قول تھا۔

شیخ ابوعلی الفارسی نے زجاج کی باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا ہے: اِیَّا اسم ظاہر نہیں ہے بلکہ ضمیر ہے اور اس کے ضمیر ہونے پر دلیل اس کا بدلنا اور حالت رفع و جر میں اس کا ثابت نہ رہنا ہے۔ جبکہ اسم ظاہر میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ اس کے آخر میں حرکتیں بدل بدل کر آتی ہیں اور حرکتوں کے ذریعہ اس پر حکم لگایا جاتا ہے بغیر اس کے کہ وہ خود بدلے۔ پس 'إِيَّا' کا ان چیزوں میں اسم ظاہر کا مخالف ہونا جن کو ہم نے بیان کیا دلالت کرتا ہے کہ وہ ضمیر ہے، اسم ظاہر نہیں ہے نیز کہا: سراج نے مبرد سے انھوں نے ابوالحسن اخفش سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا ہے: یہ ضمیر مفرد ہے جس طرح بقیہ ضمیروں کا آخر بدلتا رہتا ہے اسی طرح اس کا آخر بھی بدلتا رہتا ہے جن کے لئے ضمیر لائی جاتی ہے ان کی تعداد میں اختلاف کی وجہ سے۔ 'إِيَّاكَ' میں جو كَ ہے وہ صرف

خطاب پر دلالت کرتا ہے ضمیر کے لئے علامت ہونے سے خالی ہے پس اس 'کَ' کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہی حکم (اِیَّایَ اِیَّانَا اِیَّاہُ اور اِیَّاھَا) میں بھی جاری ہے کہ یہ سب حروف ہیں جو عربی سے ملحق ہوئے ہیں۔ اِیَّایَ میں یاء متکلم ہونے پر دلیل ہے۔ اِیَّاہُ میں ہاء غائب ہونے پر دلیل ہے۔ خود غائب پر دلیل نہیں ہے، اِیَّا کی تاکید حالت نصب میں لائی جاتی ہے جیسے: اِیَّاكَ نَفۡسَكَ رَاَیۡتُ۔ اِیَّاہُ نَفۡسَہٗ ضَرَبۡتُ، اِیَّاھُمۡ کُلَّھُمۡ عَنَیۡتُ۔ آپ اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے۔

ابوالحسن نے 'اِیَّاكَ وَ اِیَّا زَیۡدٍ' کو صحیح نہیں مانا ہے اور عرب سے جو روایت کی گئی ہے کہ: اِذَا بَلَغَ الرَّجُلُ السِّتِّیۡنَ فَاِیَّاہُ وَ اِیَّا الشَّوَابِ، کو اس کو بہت کم شمار کیا ہے اور اسے شاذ و نادر (خلاف قاعدہ) ہونے پر حمل کیا ہے اس لئے کہ اضافت کا مقصد تخصیص ہوتا ہے اور ضمیر تخصیص کی انتہا ہے۔ لہٰذا اسے مضاف کرنے کی کوئی وجہ و دلیل نہیں ہے۔

نَسۡتَعِیۡنُ کی اصل نَسۡتَعۡوِنُ ہے اس لئے کہ یہ مَعُوۡنَۃ اور عَوۡن سے مشتق ہے۔ واؤ کو یاء سے بدل دیا گیا ہے اس لئے کہ واؤ پر زبر سنگین ہے اس کے بعد زیر کو یا سے پہلے والے عین کو دے دیا گیا اور یاء ساکن رہ گیا۔ اس لئے کہ یہ اعلال ہے جو ایک دوسرے کا اتباع کرتا ہے جیسے اَعَانَ یُعِیۡنُ اور قَامَ یَقُوۡمُ، اس کی وضاحت میں پوری بحث ہے انشاء اللہ بعد میں کہیں تفصیل سے آئے گی۔

نَعۡبُدُ اور نَسۡتَعِیۡنُ مرفوع ہیں اس لئے کہ دونوں ایک ایسی جگہ واقع ہوئے ہیں کہ اسم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اگر آپ 'اَنَا عَابِدُكَ' اور اَنَا مُسۡتَعِیۡنُكَ کہتے تو یہ اسم فعل کی جگہ آجاتے پس معنیٰ رفع نے عمل کیا ہے۔ فعل مضارع کے ہونے کی دلیل اس کا اسم سے مشابہ ہونا ہے۔ حالانکہ فعل میں قاعدہ اس کا مبنی ہونا ہے اور فعل میں سے جو اسم کا مشابہ ہو جاتا ہے وہ معرب قرار دیا جاتا ہے۔ فعل مضارع وہ ہوتا ہے کہ جس کے شروع میں ان چار اضافی حروف ہمزہ، نون، تاء اور یاء میں سے کوئی ایک حرف ملحق ہو جاتا ہے۔

تفسیر

انسان بارگاہ الٰہی میں

اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ کہنا نَعۡبُدُكَ وَ نَسۡتَعِیۡنُكَ، کہنے سے زیادہ اختصاص و انحصار پر دلالت کرنے والا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں

کرتے، ہم تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں، تیرے سوا کسی سے مدد نہیں چاہتے۔

عبادت شکر کی ایک قسم ہے اور بلکہ شکر کا آخری درجہ ہے اسلئے کہ عبادت تعظیم کے بلندترین رتبہ کے ساتھ بلندترین خضوع کا نام ہے اور کوئی بھی اس درجہ خضوع اور تعظیم کا مستحق نہیں ہوسکتا مگر بنیادی نعمتوں کے باعث جو خلقت حیات، خلقت قدرت اور خلقت شہوت ہیں جن پر خدا کے سوا کوئی اور قادر نہیں ہے۔ خداوندعالم نے عبادت کو اپنے آپ سے مخصوص کیا ہے اور ہم میں سے کوئی کسی کی عبادت کا حقدار نہیں ہے؛ جس طرح ہم میں سے بعض بعض کے شکر کے حقدار ہوتے ہیں اور غیر خدا کی اطاعت صحیح ہے لیکن غیر اللہ کی عبادت صحیح نہیں ہے۔ قائل کا یہ کہنا کہ عبادت معبود کی اطاعت کا نام ہے یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ اطاعت کے معنیٰ فرمانبرداری کے ہیں لیکن اطاعت گذار عبادت گزار نہیں ہوتا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اولاد اپنے والد کے حکم کی اطاعت کرتا ہے وہ اس اطاعت کے ذریعہ اس کی عبادت نہیں کرتا۔ کفار بتوں کی پرستش کرتے ہیں؛ ان کی اطاعت نہیں کرتے، اس لیے کہ بتوں کی جانب سے حکم صادر ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی ہم تجھ سے توفیق طلب کرتے ہیں، تیری عبادت پر اور اپنے جملہ امور پر تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ فعل کی انجام دہی کے لیے جملہ اسباب کا جمع ہونا توفیق ہے۔ چنانچہ کسی غیر کی مدد کرنے والے کے لیے نہیں کہا جاتا: وَفَّقَهٗ (یعنی اس نے اسے توفیق عطا کی) اس لیے کہ وہ اس امر تک رسائی کے لئے ان تمام اسباب کو جمع کرنے پر قدرت نہیں رکھتا جن کی اسے ضرورت ہے۔

اِيَّاكَ کے تکرار کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ ایک ہی پر اکتفا کرتا تو وہم کرنے والے گمان کرسکتا تھا کہ وہ دونوں کو جمع کئے بغیر اللہ سے قربت حاصل نہیں کرسکتا اور وہ دونوں کے درمیان فاصلہ کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتا؛ جب وہ عظمت الٰہی میں غور و فکر کرتا ہے تو یہ عبادت ہے خواہ وہ اللہ سے مدد کا طلب گار نہ ہو اور دوسرا نقطہ یہ ہے کہ اِيَّاكَ کی تکرار کی تاکید کی لئے ہے، اس نظریہ پر اعتراض ہے اس لئے کہ تکرار اس وقت تاکید کے لئے ہوتی ہے جب اسے فعل ثانی پر حمل نہ کیا جائے حالانکہ آیت میں دوسرا اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پر حمل کیا گیا ہے اور اسی کا مفعول ہے پس کیونکر تاکید کے لئے ہوسکتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ کی عبادت اسکی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتی تو استعانت کو عبادت پر مقدم ہونا چاہئے تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ استعانت (طلب امداد) پر عبادت کو مقدم کیا گیا ہے نہ کہ اعانت پر جسے بغیر استعانت کے بھی انجام دیا جاسکتا ہے جب وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں تو تقدیم اور تاخیر میں اختلاف نہیں ہے۔ جیسا

کہ کہا جاتا ہے کہ تم نے میرا حق ادا کیا اس طرح مجھ پر احسان کیا اور تم نے مجھ پر احسان کیا کہ میرا حق ادا کر دیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ مدد کا مطالبہ نئی عبادت کے لئے ہے، نہ کہ اس عبادت کے لئے جو ان سے واقع ہو چکی ہے۔ مدد طلب کرنا اچھی چیز ہے۔ اگر چہ مدد کا فریضہ شرعی کے ساتھ ہونا ضروری ہے کہ وہ صرف خدا کی جانب متوجہ ہو جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ کبھی کبھی فریضہ کی ادائیگی میں لطف شامل نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی مدد ملتی ہے مگر یہ کہ پہلے بندہ دعا کرلے۔ جس نے اس آیت یہ استدلال کیا ہے قدرت تو فعل ساتھ ہے ہی، اگر قدرت پہلے سے ہے تو پھر مدد طلب کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی ہے تو ایسا کہنے والے نے غلطی کی ہے اس لیے کہ اعانت و مدد میں اللہ کے حضور رغبت کی دو صورتیں ہیں:

(اول) خداوند عالم سے دعا کرے اس کے الطاف و مہربانی کی اور اس چیز کی جو اس کے مقاصد میں قوت بخشے اور اس پر فعل کی انجام دہی کو آسان فرمادے جو اسے حاصل نہیں تھی اور اسے تعلیم عطا فرمائے کہ اس کی انجام دہی میں عظیم ثواب ہے جس سے اس کی نشاط اور رغبت میں اضافہ ہو۔

(دوم) مستقبل میں اس کی اطاعت پر باقی رہنے کی دعا کرے تا کہ اس کو برابر قدرت و طاقت حاصل ہوتی رہتی اس شخص کے نزدیک جو قدرت کی بقا کا قائل نہیں ہے اور جو اس کی بقا کا قائل ہے وہ کوئی ایسا عمل انجام نہ دے جو قدرت کا مخالف ہو اور اسے ختم کرنے والا ہو۔

(اِيَّاكَ نَعْبُدُ سے آخر سورہ) تک خبر سے خطاب کی جانب عدول یہ عربوں کا مشہور طریقہ کار ہے اور ان کے اشعار اس سے بھرے پڑے ہیں۔

کسائی کا قول ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح ہے: قُوْلُوْا اِيَّاكَ نَعْبُدُ یعنی اس طرح کہو ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں یا محمدؐ اس طرح کہئے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

وَلَوْ تَرٰى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ. (سورۂ سجدہ، آیت ۱۲)

(کاش آپ دیکھیں جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے اور یہ کہہ رہے ہوں گے اے ہمارے پروردگار ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا اور سن لیا تو ہمیں واپس بھیج دے تا کہ ہم نیک عمل کریں ہمیں اب یقین آگیا ہے)

یعنی وہ لوگ کہیں گے: رَبَّنَا اَبْصَرْنَا۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ. (ہر دروازے سے فرشتے ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے، اور کہیں گے سلام علیکم (تم پر سلامتی ہے) یہ تمھارے صبر کا صلہ ہے، آخرت کا گھر کتنا اچھا ہے!) (سورۂ رعد، آیت ۲۳-۲۴) یعنی يَقُوْلُوْنَ سَلَامٌ یعنی سلام کہتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۶﴾
توہمیں سیدھے راستے پر گامزن رکھ۔

قرائت:

حمزہ نے صاد اور راء کے اشمام کے ذریعہ پڑھا ہے سوائے عجلی کے، خلاد اور ابن سعدان کی روایت کے مطابق یہاں پر صرف دو مقام پر اشمام ہوا ہے۔ کسائی نے ابوحمدون کے واسطہ سے سین کے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے اور یعقوب نے رویس کے واسطہ سے سین کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

لفظ صِرَاط میں اصل سین ہے اس لئے کہ وہ سَرَط سے مشتق ہے 'مُسْتَرَطُ الطَّعَامِ' کھانے کے گزرنے کی جگہ۔ اسی سے عربوں کا یہ کہنا ہے کہ سَرَطْرَاط۔ اس کی اصل سَرِيْط ہے۔ جس نے سین کے ساتھ پڑھا ہے اس نے قاعدہ کی رعایت کی ہے اور جس نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے تو اس لئے کہ صاد اور طاء استعلاء اور اطباق میں قریب قریب ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ سِرَاط کی ادائیگی میں سین میں آواز نیچے لائی جائے اور پھر طاء میں اوپر لے جائی جائے جب عربوں نے صقب اور صویق میں سین کو قاف کے ساتھ پڑھا صاد سے بدل دیا تا کہ صاد کو قاف میں استعمال کریں حالانکہ قاف سین سے دور ہے اور طاء سین سے قریب ہے تو ان لوگوں کا طاء کے ساتھ سین کو صاد سے بدلنا زیادہ مناسب ہے اس لحاظ سے کہ صاد طاء سے زیادہ قریب ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ صاد اور طاء زبان کے کنارہ اور ثنایا کی جڑوں سے ادا ہونے والے حروف میں سے نہیں ہے اور طاء کا صاد میں ادغام بھی ہو جاتا ہے اور جس نے راء کے اشمام کے

ساتھ پڑھا ہے تو وہ سین اور طاء کے درمیان قربت ہے ایک ایسے حرف سے جو سین کے مخرج سے ادا ہوتا ہے اور وہ راء ہے قاعدہ کو باطل کئے بغیر۔

الفاظ و معانی

لغت میں ہدایت ارشاد اور کسی چیز کی رہنمائی کے معنیٰ میں ہے جو (شخص) لوگوں کے آگے آگے چلے اور انھیں راستہ بتائے اسے ہادی خریت یعنی ماہر رہنما کہتے ہیں۔ ہدایت توفیق کو بھی کہتے ہیں۔

اَلصِّرَاط واضح اور وسیع راستے کو کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ گذرنے والے کو آسانی اور سہولت فراہم کرتا ہے۔

اَلْمُسْتَقِیْم ایسے ہموار، درست اور سیدھے کو کہتے جس میں کسی طرح کی کجی نہ ہو۔

جریر نے کہا ہے:

اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ اِذَا اعْوَجَّ الْمَوَارِدُ مُسْتَقِیْمٌ

امیر المومنینؑ سیدھا راستہ ہیں جب سارے راستے ٹیڑھے ہوں۔

ترکیب:

اِهْدِنَا مبنی بر وقف (سکون) ہے۔ اس کا فاعل ضمیر مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ہمزہ مکسور ہے اس لئے کہ اسکے مضارع کا تیسرا حرف مکسور ہے۔ اِهْدِنَا میں 'نَا' منصوب ہے اس لئے کہ مفعول بہ ہے اور اَلصِّرَاط منصوب ہے اس لئے کہ مفعول دوم ہے۔

تفسیر

صراط مستقیم

اِهْدِنَا کی مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

(اول) ہمیں دین حق پر ثابت رکھ اس لیے کہ خداوند عالم نے تمام مخلوقات کو ہدایت فرمادی ہے مگر یہ کہ انسان اپنے فاسد خیالات و تصورات کے باعث گمراہ ہو جاتا ہے، پس بہتر ہے کہ وہ خدا سے اس کے دین پر

ثابت قدم رہنے اور اس پر باقی رہنے کا دعا کرے کہ اس کی ہدایت میں اضافہ فرمائے جو دین پر باقی رہنے کا ایک سبب ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى۔ (سورۂ محمد، آیت ۱۷)

(اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا ہے)

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے کہنے والا کسی کھانا کھا رہے انسان سے کہے کہ کھاؤ یعنی کھاتے رہو۔

(دوم) ہدایت ثواب ہے؛ ارشاد ہوتا ہے:

يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ۔ (سورۂ یونس، آیت ۹)

(ان کا رب انھیں ان کے ایمان کی وجہ سے نعمتوں سے بھرپور جنتوں کی راہ دکھائے گا)

ہمیں جنت کے راستے کی ہدایت فرما جو ہمارے لیے ثواب ہے؛ اور اس تفسیر کی تائید یہ آیت کر رہی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا۔

(سوم) ہمیں دین حق پر مستقبل میں رہنمائی فرماتا رہ، جس طرح تو ماضی میں ہماری راہنمائی فرماتا رہا ہے۔ جو چیز (پہلے سے) حاصل ہو اس کے لیے دعا کرنا صحیح ہے ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ اس ارشاد میں جناب ابراہیمؑ سے حکایت کی گئی ہے: وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ۔ (سورۂ شعراء، آیت ۸۷)

(اور جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کرنا) یہ اس لیے کہ دعا عبادت ہے اس میں اللہ کی جانب رجوع کا اظہار ہے، اگر کہا جائے کہ اس بارے میں دعا کے کیا معنی ہیں؟ حالانکہ خداوند عالم اسے انجام دے چکا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ دعا میں ہمارے دین کی مصلحت ہو، یہ اس طرح ہے جیسا کہ ہم عبادت کرتے ہیں کہ ہم خدا کی وحدانیت کی تسبیح و تمجید کرتے ہیں اور اس کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں اگرچہ ہم ان تمام چیزوں کا پہلے سے عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے خداوند عالم جانتا ہے کہ زیادہ تر چیزیں ہمارے لئے بہت زیادہ بہتر اور مناسب ہوسکتی ہیں جب ہم ان کے متعلق اس سے دعا کریں؛ اگر ہم دعا نہ کریں تو ان میں مصلحت نہیں ہوگی۔ حسن دعا میں یہ بھی ایک وجہ ہے، ممکن ہے اس سے ثواب کے لیے تکلیف کا استمرار مراد ہو اس لیے کہ اس کا دوام واجب و ضروری نہیں ہے بلکہ تفضّل محض ہے؛ اس دعا کے ذریعہ رغبت حاصل کرنا جائز ہے۔

صراط مستقیم کے چند معانی بیان کئے گئے ہیں:

اول: کتاب اللہ ہے جس کی روایت پیغمبرؐ و علیؑ اور ابن مسعود سے کی گئی ہے۔

دوم: اسلام ہے اس کی روایت جابر اور ابن عباس سے کی گئی ہے۔

سوم: دین اللہ مراد ہے کہ اس کے سوا بندوں سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ روایت محمد بن الحنفیہ سے نقل ہوئی ہے۔

چہارم: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپؐ کے قائم مقام ائمہ علیہم السلام ہیں، ہماری احادیث میں آیا ہے۔

بہتر ہے کہ آیت کو عموم پر حمل کیا جائے تاکہ اس میں یہ تمام صورتیں داخل ہو جائیں اس لیے کہ صراط مستقیم وہ دین ہے جس کے ذریعہ اللہ نے توحید، عدل اور جن ہستیوں کی ولایت فرض کی ہے ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

❁❁❁❁❁

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴿۷﴾
ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے، جن پر غضب نازل نہیں ہوا، اور جو گم راہ نہیں ہیں۔

قرائت:

حمزہ نے عَلَيْهُمْ کے ہاء کو ضمہ (پیش کے ساتھ) اور میم کو ساکن پڑھا ہے۔ اس طرح لَدَيْهُمْ اور إِلَيْهُمْ بھی۔

یعقوب نے تثنیہ اور جمع مذکر و مؤنث میں یاء ساکن کے بعد ہر ھاء کو (ضمہ) کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسے: عِنْدَهُمَا۔ فِيهُمَا، عَلَيْهُمَا۔ فِيهُمَا۔ عَلَيْهُنَّ، فِيهُنَّ، اور بقیہ قراء نے عَلَيْهِمْ اور اس کے مشابہ کلمات میں ہاء کسرہ (زیر کے ساتھ پڑھا ہے)

شواذ میں عَلَيْهُمُو پڑھا گیا ہے، یہ ابن ابی اسحاق اور عیسیٰ ثقفی کی قرائت عَلَيْهِمِي یہ حسن بصری، عمرو بن قائد کی قرائت ہے۔

عَلَيْهِمُ (ہاء مکسور اور میم پر ضمہ ہے واؤ کے بغیر) عَلَيْهُمُ (ہاء اور میم دونوں پر پیش واؤ کی آواز تک پہنچے بغیر) یہ دونوں قرائت اعرج سے مروی ہیں۔ یہ سات قرائتیں ہیں۔

پھر قراء نے میم میں اختلاف کیا ہے۔ اہل حجاز نے میم کو واؤ سے ملا دیا ہے چاہے اس سے پہلے ہاء مضموم ہو یا مکسور ہو، اور اس طرح کہا ہے: عَلَيْهُو، عَلىٰ قُلُوْبِهُمُو، عَلىٰ سَمْعُهُمُو، مِنْهُمُو، لَهُمُو۔ ہاں نافع نے اس سلسلہ میں اہل حجاز کی مخالفت کی ہے۔ بقیہ قراء نے میم کو ساکن پڑھا ہے۔ ہاں اگر میم سے حرف ساکن ملحق ہوجائے تو پھر یہاں پھر یہاں پر بھی قراء نے اختلاف کیا ہے۔ اہل حجاز، عاصم اور ابن عامر ہاء کو کسرہ دیتے ہیں اور میم کو ضمہ جیسے: عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ، مِنْ دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ۔

ابوعمرو ہاء اور میم دونوں کو کسرہ دیتے ہیں۔

حمزہ اور کسائی ہاء اور میم دونوں کو ضمہ دیتے ہیں۔ سارے اختلافات اس ہاء کے سلسلہ میں ہیں جس کے پہلے کسرہ یا یاء ساکن ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہاء کو صرف پیش ہی دیا جائے گا۔

عمر بن خطاب اور عمرو بن عبداللہ زبیری نے صِرَاطَ مَنْ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پڑھا ہے۔ اہل بیت علیہم السلام سے بھی یہ مروی ہے۔

شواذ میں 'غَيْرَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ' نصب (فتحہ) کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور عمر بن خطاب نے 'غَيْرَ الضَّالِّيْنَ' پڑھا ہے۔ اس کی روایت حضرت علی علیہ السلام سے بھی کی گئی ہے۔

حجت:

جن قراء نے عَلَيْهُمْ (ہاء کو ضمہ) کے ساتھ پڑھا ہے انھوں نے اسے اصل کی طرف پلٹایا ہے اس لئے کہ جب وہ متصل ہونے والے حروف سے جدا ہوگا تو پیش کے ساتھ ہی ہوگا۔ کہا گیا ہے 'هُمْ فَعَلُوْا' ہاء پر پیش ہے۔

سراج نے کہا ہے: یہ پرانی قرائت ہے اور قریش، اہل حجاز اور ان کے اردگرد یمن کے فصیح افراد کا تلفظ ہے۔

حمزہ نے ان تینوں حروف کو ضمہ سے مخصوص کیا ہے اس لئے کہ ہاء سے پہلے جو یاء ہے وہ الف تھا۔ جیسے: عَلَى الْقَوْمِ، لَدَى الْقَوْمِ اور اِلَى الْقَوْمِ۔ جب صاد سے پہلے الف ہو تو ہاء کو زبر دینا صحیح نہیں ہے۔

اور جن قراء نے عَلَيْهِمُو پڑھا ہے انھوں نے ہاء کو اس سے مشابہ حرف یعنی یاء کا تابع قرار دیا ہے اور جو چیز یاء اور الف سے مشابہ نہیں ہے اسے اس کی اصل پر چھوڑ دیا ہے اور وہ میم ہے۔

جن قراء نے عَلَيْهِمْ (ہاء کو مکسور، یاء، میم ساکن) پڑھا ہے تو انھوں نے اس لئے پڑھا ہے کہ وہ

اشتباہ سے امان میں رہیں اس لئے کہ 'ھُمَا' تثنیہ میں الف دو پر دلالت کرتا ہے اور واحد (ہ) میں میم نہیں ہوتا ہے۔ جب جمع میں ضروری ہے تو انھوں نے آسانی کی خاطر واؤ کو حذف کر کے میم کو ساکن کر دیا۔ اس لئے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے انھوں نے ہاء کو کسرہ دیا جبکہ اصل ضمہ ہے تو وہ اس سے پہلے یاء کی وجہ سے ہے۔

اور جن قراء نے 'عَلَیْہِمِی' پڑھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ہاء کو زیر دیا ہے اس لئے کہ اس سے پہلے یاء ساکن آیا ہے اور میم کو زیر دیا ہے اس لئے کہ ہاء کے کسرہ سے نکل کر میم کے ضمہ کی طرف جانا پسندیدہ نہیں ہے۔ پھر واؤ سے بدل گیا اس لئے کہ وہ ساکن تھا اور اس سے پہلے کسرہ تھا۔

اور جس نے ھاء کو کسرہ دیا، میم کو ضمہ دیا اور واو کو حذف کر دیا تو زیر کے بعد پیش کا احتمال دیا ہے اس لئے کہ ضمہ لازم نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ الف تثنیہ اسے فتحہ (یعنی زبر) دیتا ہے۔ یہاں واؤ کو حذف کر دیا ہے ضمہ کی سنگینی کے ساتھ واؤ کی سنگینی کو قربان کرتے ہوئے۔

جس نے عَلَیْہِمُ پڑھا ہے تو اس نے آسانی کی خاطر واؤ کو حذف کر دیا ہے اور اس سے پہلے (میم پر) پیش رکھ کر واؤ محذوف پر دلیل فراہم کی ہے اور جس نے میم کو اس وقت ضمہ دیا ہے جب وہ کسی ساکن سے متصل ہو اور ہاء کو کسرہ دیا ہے تو وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ جب ہمیں حرکت کی ضرورت پیش آتی تو حرف کو اس کی اصل کی طرف پلٹا دیا اور اسے پیش دے دیا اور ہاء کو مکسور چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ وہاں ضرورت پیش نہیں آئی کہ اسے اصل کی طرف پلٹایا جاتا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہاء یاء کا تابع ہے اس لئے کہ ہاء کو باء کا مشابہ قرار دیا گیا ہے اور میم کو یاء کا تابع قرار نہیں دیا گیا ہے اس لئے کہ یاء میم سے دور ہے۔

اور جس نے میم اور ہاء دونوں کو کسرہ دیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ میں نے کسرہ کے بعد ضمہ کے سنگین ہونے کے سبب کسرہ کو کسرہ کا تابع قرار دیا ہے۔

سیبویہ نے کہا: ہاء کو کسرہ دیا جائے گا جب اس سے پہلے یاء یا کسرہ ہو اس لئے کہ کسرہ خفیف اور ہلکا ہوتا ہے اور یہ حروف زیادہ میں سے ہے جس طرح یاء حروف زیادہ میں سے ہے۔ یہ یاء الف کی جگہ ہے اور یاء سے زیادہ مشابہ حرف ہے۔ جس طرح کئی مقامات پر آسانی کی خاطر الف میں امالہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض قراء نے اس ہاء کو کسرہ دے کر واؤ کو یاء سے بدل دیا ہے اس لئے کہ جب واؤ سے پہلے زیر ہو تو واؤ باقی نہیں رہتا ہے (یاء سے بدل جاتا ہے) جیسے آپ کا یہ کہنا کہ مَرَرْتُ بِہِیْ، مَرَرْتُ بِدَارِ ھِیْ۔

ترکیب:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی صفت ہے اور یہ اس کا بدل بھی ہوسکتا ہے۔
صفت اور بدل میں یہ فرق ہے کہ بدل میں عامل کی تکرار کو فرض کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس ارشاد الٰہی میں حرف جر کی تکرار اسی بات پر دلالت کر رہی ہے: قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ۔ (مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ) بدل ہے الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا "کا، اور دونوں میں لام آیا ہے۔ جبکہ صفت میں ایسا نہیں ہوتا ہے جس طرح اسم مَنْ' میں لام کی تکرار ہوئی ہے اسی طرح عامل رفع یا عامل نصب کی تکرار کو بھی فرض کیا گیا ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: اِهْدِنَا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اگر ایسا ہے تب بھی بدل اسے پہلے والے کی وضاحت کرنے سے خارج نہیں کرے گا جیسا کہ صفت بھی اسی کے مانند ہے (وضاحت کرنے میں) اسی لئے سیبویہ نے بِيَ الْمِسْكِيْنِ كَانَ الْاَمْرُ اور بِكَ الْمِسْكِيْنِ کہنے کو صحیح قرار نہیں دیا ہے۔ لیکن غائب میں اس کو صحیح مانا ہے۔ جیسے: مَرَرْتُ بِهِ الْمِسْكِيْنِ یعنی یہاں پر اَلْمِسْكِيْنِ، بِهٖ میں ھا کا بدل ہے حالانکہ متکلم اور مخاطب والی مثالوں میں اس کو صحیح نہیں کہا ہے۔
اَلَّذِيْنَ موصول اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس کا صلہ ہے۔ اس صلہ کے ذریعہ الَّذِيْنَ مکمل ہوگیا ہے اور اسم مفرد (یعنی الَّذِيْنَ) صِرَاطَ کے اس کی جانب اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ حالت رفع میں اَلَّذِيْنَ کو اَلَّذُوْنَ نہیں کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اسم غیر متمکن یعنی مبنی ہے شاذ و نادر اَلَّذُوْنَ بھی نقل کیا گیا ہے جس طرح حالت رفع میں اَلشَّيَاطُوْنَ کی بھی حکایت کی گئی ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں غَيْرِ کے مجرور ہونے کی تین وجہیں بیان کی گئی ہیں:
پہلی وجہ: عَلَيْهِمْ میں 'هُمْ' کا بدل ہے جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

عَلٰى حَالَةٍ لَوْ اَنَّ فِي الْقَوْمِ حَاتِماً　　عَلٰى جُوْدِهٖ لَضَنَّ بِالْمَاءِ حَاتِمِ

بہر حال قوم میں کوئی حاتم ہوتا تو وہ حاتم کی جود و سخا کا مقابلہ میں پانی تک میں بھی کنجوسی کرتا۔
اس شعر میں لفظ حَاتِم مجرور ہے اس لئے کہ وہ جُوْدِهٖ میں ضمیر ھاء کا بدل ہے۔

دوسری وجہ: الَّذِيْنَ کا بدل ہے۔
تیسری وجہ: الَّذِيْنَ کی صفت ہے اگرچہ غَيْرِ کی اصل یہ ہے کہ وہ نکرہ کی صفت واقع ہو جیسے: مَرَرْتُ

بِرَجُلٍ غَیْرِكَ ۔ گویا آپ نے اس طرح کہا ہے کہ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ آخَرَ یا مَرَرْتُ بِرَجُلٍ لَیْسَ بِكَ ۔

زجاج نے کہا: غَیْرِ کو الَّذِیْنَ کی صفت قرار دینا جائز ہے اس لئے کہ یہاں پر الَّذِیْنَ کا خاص طور سے قصد نہیں کیا گیا ہے گویا آپ کے اس جملہ کے مانند کہ: اِنِّیْ لَاَمُرُّ بِالرَّجُلِ مِثْلِكَ فَاُکْرِمُهٗ ۔

علی بن عیسٰی رمانی نے کہا: لفظ غَیْرِ، الَّذِیْنَ کی صفت واقع ہوسکتا ہے اس لئے کہ الَّذِیْنَ اپنے صلہ کے ساتھ اعلام (اسماء) کی طرح معرفت موقتہ نہیں ہے جیسے زَیْد، عَمرو وغیرہ۔

الَّذِیْنَ ان نکروں کے مانند ہے جو معرفہ بنادئے جاتے ہیں جیسے: اَلرَّجُل، اَلْفَرَس جب الَّذِیْنَ مانند نکرہ ہوگیا تو اس کی صفت بھی نکرہ ہوسکتی ہے۔ جس طرح یہ کہا جائے کہ: لَا اَجْلِسُ اِلَّا اِلَی الْعَالِمِ غَیْرِ الْجَاهِلِ۔

اگر الَّذِیْنَ اعلام کے مانند ہوگا تو پھر غیر کو اس کی صفت قرار دینا صحیح نہیں ہوگا جس طرح یہ مثال صحیح نہیں ہے کہ مَرَرْتُ بِزَیْدٍ غَیْرِ الظَّرِیْفِ کہ غَیْرِ کو زید کی صفت مان کر جر دیا جائے۔

ابوبکر السراج نے کہا: میرا نظریہ یہ ہے کہ غَیْرِ یہاں پر اپنے مضاف الیہ کی بنا پر معرفہ بن گیا ہے۔ اس لئے کہ معرفہ کی جانب مضاف ہونے والے کا حکم یہی ہے کہ وہ معرفہ ہوجاتا ہے۔ غَیْر اور مِثْل معرفہ کی جانب اضافت کے باوجود اپنے معنی کی وجہ سے نکرہ ہی رہتے ہیں اور یہ اس وقت ہوگا جب آپ یہ کہیں کہ رَاَیْتُ غَیْرَكَ پس ہر وہ شے جسے آپ مخاطب کے علاوہ دیکھیں وہ مخاطب کے علاوہ ہے اسی طرح جب آپ یہ کہیں کہ رَاَیْتُ مِثْلَكَ تو جو مخاطب کے مثل ہیں وہ بے شمار ہیں لیکن اگر کوئی چیز معرفہ ہوگی تو اسی کی ضد ایک ہی چیز ہوگی اور آپ نے معرفہ کو ثابت کرنے اور اس کی ضد کی نفی کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ سامع اس بات کو جانتا ہے تو آپ غَیْر کے ذریعہ اس کی صفت لاتے ہیں اور غَیْر کو اس کی ضد یعنی معرفہ کی جانب مضاف کرتے ہیں جیسے آپ کا یہ کہنا کہ: عَلَیْكَ بِالْحَرَکَةِ غَیْرِ السُّکُوْنِ پس غَیْرِ السُّکُوْنِ معرفہ ہے اور وہ حرکت ہے گویا آپ نے تاکیداً ’اَلْحَرَکَةِ‘ کی تکرار کی ہے۔

اس طرح یہ ارشاد الٰہی ہے: اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ،غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ ہے پس غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وہی لوگ ہیں کہ جن پر خدا نے نعمتیں نازل کی ہیں۔ جب لفظ غَیْرِ اس طرح صفت واقع ہوگا تو وہ معرفہ ہوگا۔ جیسے کوئی انسان معروف ہوجائے کہ وہ کسی چیز میں آپ کے مثل ہے تو اس کے بارے میں عربی زبان میں اس طرح کہا جائے گا: قَدْ جَاءَ مِثْلُكَ یہاں پر لفظ مثل معرفہ ہوگا جب: اَلْمَعْرُوْف

بِشَبِهِكَ کا ارادہ کیا جائے۔

اور جس نے غَيْرِ کو بدل قرار دیا ہے وہ اس طرح کی دلیل قائم کرنے سے بے نیاز ہے اس لئے کہ نکرہ معرفہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

لفظ غَيْرَ کے منصوب ہونے کے بارے میں تین وجہیں ہیں:

(۱) عَلَيْهِمْ میں هُمْ ضمیر کے لئے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور حال میں عامل اَنْعَمْتَ ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لَا مَغْضُوْباً عَلَيْهِمْ۔

(۲) استثناء منقطع کی بنا پر منصوب ہے اس لئے کہ مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ، مُنْعَم عَلَيْهِمْ کی جنس سے نہیں ہیں۔

(۳) لفظ اَعْنِيْ کی بنا پر منصوب ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: اَعْنِيْ غَيْرَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِيْنَ عَلَيْهِمْ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ضمیر کو عَلَيْهِمْ میں جمع لایا گیا ہے لہٰذا مَغْضُوْب کو جمع بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ ہر اس فعل کا حکم ہے جو حرف جر کے ذریعہ متعدی بنایا گیا ہے جیسے آپ یہ کہیں: رَاَيْتُ الْقَوْمَ غَيْرَ الْمَذْهُوْبِ بِهِمْ تو آپ بِهِمْ میں ضمیر مجرور کی بنا پر مَذْهُوْب کو جمع بنانے سے بے نیاز ہے۔

وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں لَا کے سلسلہ میں اہل بصرہ کا یہ کہنا ہے کہ لا زائدہ ہے نفی کی تاکید کے لئے اور اہل کوفہ کا کہنا ہے کہ لَا، غَيْر کے معنی میں ہے۔

اہل بصرہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ جب آپ یہ کہیں گے کہ مَا قَامَ زَيْدٌ وَّ عَمْرٌو تو احتمال پایا جاتا ہے کہ آپ نے یہ ارادہ کیا ہو کہ دونوں ایک ساتھ کھڑے نہیں ہوئے۔ بلکہ الگ الگ کھڑے ہوئے۔ لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ: مَا قَامَ زَيْدٌ وَّلَا عَمْرٌو تو گذشتہ احتمال کی گنجائش ہی نہیں رہ جائے گی۔

غَيْر میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اسی لئے علمائے نحو نے اس مثال کو صحیح قرار دیا ہے: اَنْتَ زَيْداً غَيْرُ ضَارِبٍ اس لئے کہ یہ آپ کے اس جملہ کے مانند ہے: اِنَّكَ اَنْتَ زَيْداً لَا ضَارِب؛ لیکن علمائے نحو اَنْتَ زَيْداً مِثْلَ ضَارِب کو جائز نہیں کہتے ہیں اس لئے کہ زَيْداً کا ضَارِب سے صلہ و ربط ہے اور صلہ زَيْد پر مقدم نہیں ہو سکتا ہے۔

علی بن عیسیٰ رمانی نے کہا: جس نے استثناء کی بنا پر غَيْرَ کو نصب دیا ہے اس نے لا کو صلہ قرار دیا ہے

جیسا کہ ابوعبیدہ نے کہا ہے:

فِی الْبِئْرِ حَوْرٍ سَرٰی وَمَا شَعَر

یعنی فِی بِئْرِ هَلَکَةٍ۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ کی اصل اس طرح ہے: غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَالضَّالِّیْنَ. جس طرح یہ فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ یعنی اَنْ تَسْجُدَ۔ (لا زائدہ ہے)

الفاظ و معانی و تفسیر:

اس آیت میں صراط مستقیم کا بیان ہے یعنی ایسا راستہ جن پر تو نے اپنی اطاعت کے سبب نعمت نازل کی؛ جن کا ذکر اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

(سورۂ نساء: آیت ٦٩)

(اور جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا اللہ نے جن لوگوں پر انعام واکرام کیا ہے یعنی انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین اور یہ کتنے اچھے رفیق ہیں (اگر کسی کو میسر آئیں)

نعمت کے لغوی معنی مبالغہ اور بڑھاوا کے ہیں (محاورہ) اس طرح ہے: دَقَقْتُ الدَّوَاءَ فَاَنْعَمْتُ دِقَّةً. میں نے دوا کو باریک کوٹا یعنی میں نے اس کے کوٹنے اور پیسنے میں نہایت دقت سے کام لیا۔ اگرچہ اس نعمت کا ذکر آیت میں نہیں ہے مگر اس پر دلالت کر رہا ہے ارشاد ہوا: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ جس کا مطلب ہم نے بیان کیا ہے؛ یہ راستہ نعمت والوں کا ہے پھر لفظ کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔

شیعہ واہل سنت تمام مفسرین کے نزدیک مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہودی مراد ہیں؛ جس پر یہ ارشاد الٰہی دلیل ہے: مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ۔ (سورۂ مائدہ، آیت ٦٠)

(جس پر خدا نے لعنت کی ہے، جس پر اس کا غضب نازل ہوا ہے جن میں سے کچھ کو بندر اور سور بنا دیا گیا)

یہ تمام یہودی ہیں (جن کا ذکر آیت میں ہے) جس پر یہ آیت دلالت کر رہی ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ۔

(سورۂ بقرہ، آیت ٦٥)

(تم اپنی قوم کے ان لوگوں کے بارے میں تو جانتے ہی ہو جنھوں نے سبت (شنبہ مچھلی کا شکار نہ کرنے) کا قانون توڑا تھا، تو ہم نے انھیں حکم دیا "تم ذلیل وخوار بندر بن جاؤ")

اَلضَّآلِّیْنَ (گمراہوں) سے مراد نصاریٰ ہیں؛ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَھْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۷۷)

(اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بہک گئے)

حسن بصری نے کہا ہے: خداوند عالم نے نصاریٰ کو گمراہ کہہ کر یہودیوں کو گمراہی سے بری قرار نہیں دیا۔ (اسی طرح) یہودیوں کو مغضوب علیہم کہہ کر نصاریٰ کو غضب سے بری قرار نہیں دیا، بلکہ دونوں گروہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ بھی ہیں اور اَلضَّآلُّوْنَ بھی ہیں سوائے البتہ خداوند عالم نے ہر فرقہ کو ایک علامت سے مخصوص قرار دیا ہے جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے سے پہچانے جاتے ہیں اور دونوں کے درمیان فرق ڈالا جاتا ہے۔ اگرچہ دونوں بیشتر صفات میں مشترک ہیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور اَلضَّآلِّیْنَ سے تمام کفار مراد ہیں۔ فائدہ کے اختلاف کے سبب دونوں صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ عبد القاہر الجرجانی نے دوسرا قول اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں: لفظ کا حق یہ ہے کہ وہ جنس سے خارج ہو۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہماری حالت مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ والی ہو جب کہ آپ کی مراد خاص قوم نہیں ہوتی لیکن آپ اسی وجہ سے وہی چاہتے ہیں جو اس دعا میں کہنا چاہتے ہیں جب آپ کہتے ہیں:

"پروردگارا مجھے ان لوگوں میں قرار دے جن پر تو نے اپنی نعمتیں نازل فرمائی ہیں، ان میں سے قرار نہ دے جن پر تو نے غضب ڈھایا ہے" اس مقام پر آپ کی مراد کوئی خاص قوم نہیں ہوتی جو اس صفت سے مخصوص ہے جس پر نزول نعمت ہوا ہے؛ یہ بات کلام کی معرفت رکھنے والے پر پوشیدہ نہیں ہے۔ جب عقلاء کہتے ہیں: (پروردگار) ہمیں ان افراد میں سے قرار دے جن پر تیری نعمتیں مسلسل نازل ہوتی رہتی ہیں تو اس سے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم پر نعمتوں کو قائم ودائم رکھ۔

اللہ کی جانب سے غضب کا مطلب ہے کہ اس کا ان پر ان کے لائق عذاب نازل کرنے کا ارادہ کرنا اور

ان سے بیزاری کرنا، غضب کے لغوی معنی سختی کے ہیں۔

اور اسی سے اَلْغَضْبَة ہے جس کے معنی سخت چٹان کے ہیں اور غَضُوْب موذی سانپ ہے۔

ضَلَال کے لغوی معنی ہلاکت کے ہیں اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ، یعنی اَهْلَكْنَا۔ (سورۂ سجدہ: آیت ۳۲)

(کیا جب ہم زمین پر ہلاک ہو جائیں گے) اور اسی سے ارشاد خداوندی ہے:

وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (سورۂ محمد، آیت ۸) یعنی اَهْلَكَهَا یعنی اللہ ان کے اعمال کو تباہ و برباد کر دیا۔ یعنی ہلاک کر ڈالا۔

دین میں ضلال سے مراد حق سے روگردانی کرنا ہے۔ ادب کی رعایت اور حسن لفظ کے پیش نظر اس طرح نہیں ارشاد ہوا:

اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الَّذِیْنَ غَضِبْتَ عَلَیْهِمْ۔

تفسیر عیاشی میں محمد بن مسلم کے واسطہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ راوی کہتا ہے: میں نے امام علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا: وَلَقَدْ آتَیْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ۔ (یقیناً ہم نے آپ کو سبع مثانی (سات آیات دو مرتبہ دہرائی جانے والی) اور قرآن عظیم عطا کیا) تو امامؑ نے ارشاد فرمایا: یہ فَاتِحَةُ الْكِتَاب ہے۔

اس میں کلام دہرایا گیا ہے (امامؑ نے فرمایا) اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے سورۂ فاتحہ کے ذریعہ احسان فرمایا ہے جو جنت کا ایک خزانہ ہے، جس میں: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے، وہ آیت ہے جس میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (سورۂ اسراء، آیت ۴۶)

(اور جب آپ قرآن میں صرف اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ نفرت سے منھ موڑ لیتے ہیں)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اہل جنت کی پکار جب وہ حسن ثواب پر شکر خدا کریں گے۔ مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ، جبرئیل نے کہا: جب بھی کوئی مسلمان یہ کہے گا تو خداوند عالم اور اہل آسمان اس کی تصدیق کریں گے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ عبادت میں اخلاص ہے۔ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ، یہ سب سے افضل جملہ ہے، جس کے ذریعہ بندگان خدا اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ۔

انبیاء (علیہم السلام) کا راستہ ہے جن پر خدا کی نعمت نازل ہوئی ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے یہودی مراد ہیں۔ وَلَا الضَّآلِّينَ سے نصاریٰ مراد ہیں۔

محمد حلبی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرت مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ قرأت فرماتے تھے۔

دوسری روایت میں الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ سے امیر المؤمنینؑ مراد ہیں۔

جمیل نے امام صادق علیہ السلام سے روایت کی حضرتؑ نے فرمایا: جب تم امام (جماعت) کے پیچھے ہو اور وہ سورۂ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہو تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کہو۔

فضل بن یسار نے امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: جب تم سورۂ فاتحہ کی قرأت کرو تو اس سے فراغت کے بعد کہو: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

نظم:

شیخ طبرسیؒ فرماتے ہیں: اس سورہ کے نظم کے متعلق ہم اس طرح کہتے ہیں: صاحب عقل وشعور مشاہدہ کے ذریعہ اللہ کی نعمت کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، جو اس کے نفس کے لیے منصف ترین گواہ اور صادق ترین راہنما ہے۔ اس کی الوہیت کا اعتراف کرتے ہوئے منعم کے نام سے بِسْمِ اللّٰهِ کے ذریعہ آغاز کرتا ہے، اس کے فضل ورحمت کے ذکر سے سکون واطمینان حاصل کرتا ہے، اس کے یکتا منعم ہونے کا اعتراف کرتا ہے، اس کے شکر وحمد میں مشغول ہو جاتا ہے تو کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

جب وہ دوسروں پر بھی خدا کی نعمتیں واضح طور پر دیکھتا ہے جن کے آثار کا مشاہدہ خود اپنے نفس وذات پر کرتا ہے تو جان لیتا ہے کہ خدا تمام مخلوقات کا پروردگار ہے اس وقت کہتا ہے: رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

جب پروردہ افراد پر اس کا فضل اور رزق پانے والوں پر اس کے رزق عام کا مشاہدہ کرتا ہے تو کہتا ہے: اَلرَّحْمٰنِ۔

جب بندہ لوگوں کے شکر واجب میں کوتاہی اور اس کی نہی پر عمل نہ کرنے، حکم کو انجام نہ دینے کے باوجود دیکھتا ہے کہ خداوند عالم اپنی بخشش کے ذریعہ ان سے درگذر فرما رہا ہے، ان کی نافرمانی کے باوجود ان سے دنیا میں مواخذہ نہیں کر رہا ہے اور کفران نعمت کے باوجود ان سے اپنی نعمتیں سلب نہیں کر رہا ہے تو کہتا ہے: اَلرَّحِيمِ۔

اور جب (بندہ) بندوں کے درمیان سرکشی ظلم وزیادتی دیکھتا ہے کہ جن میں ایک دوسرے کے ظلم سے محفوظ نہیں ہیں (تو دیکھتا ہے) کہ ان سب کے بعد ایک ایسا دن ہے جس میں ظالم سے مظلوم کا بدلہ لیا جائے گا تو کہتا ہے: مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ۔

جب اس جملہ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے تو یہ بھی جان لیتا ہے کہ اس کا خالق، رازق، رحیم، زندہ کرنے والا، موت دینے والا، پیدا کرنے والا اور پھر زندہ کرنے والا اور حی ہے جو کسی چیز سے مشابہ نہیں، ایسا پروردگار ہے جس کے سوا کوئی دوسرا لائق عبادت نہیں، جب موصوف اس صفت سے متصف ہو جاتا ہے تو اس کے مشاہدہ پر دلیل قائم ہو جاتی ہے (گویا وہ شاہد عینی بن جاتا ہے) پھر وہ غائب کے صیغہ سے حاضر کے صیغہ کی جانب پلٹتا ہے اور کہتا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔

یہ ایسا ہی ہے کہ جس طرح انسان (مَلِك) بادشاہ کی اس کے صفات کے ساتھ تعریف کرتا ہے، جب اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو صفت سے خطاب کی جانب پلٹتا ہے، جب خواہشات شبہات اور مختلف آراء و نظریات کو درپیش دیکھتا ہے اور خدا کے سوا کسی کو معین و مددگار نہیں پاتا تو اس سے تمام اسباب کے ساتھ اطاعت پر مدد مانگتا ہے اور اس طرح کہتا ہے: وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

جب اسے اس جملہ کی معرفت پیدا ہو جاتی ہے اور اس پر عیاں ہو جاتا ہے کہ اسے حق کی معرفت حاصل ہو چکی ہے اور وہ ہدایت کی راہ پر قائم ہے (پھر بھی وہ) لغزشوں سے محفوظ نہیں ہے تو خدا سے ثابت قدمی کی دعا کرتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔

یہ ایسا جملہ ہے جو معرفت احکام، شرائع اسلام کے قیام کی توفیق، ائمہ علیہم السلام کہ جن کی اطاعت اللہ نے واجب قرار دی ہے۔ کی اقتداو پیروی اور محرمات اور گناہوں سے پرہیز ان تمام باتوں کو شامل ہے، جب بندہ کو یہ علم حاصل ہو چکا ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو اس کی نعمت سے مخصوص اس کی مخلوقات پر برگزیدہ اور حجت ہیں (اس وقت) بندہ سوال کرتا ہے کہ وہ اسے ان سے ملحق کر دے اور ان کے راستے پر چلائے اسے حق کے معاندین ضَالّ و مُضِلّ (گمراہوں) کے حالات سے محفوظ رکھے جو اس کی رشد و ہدایت کی راہ سے اندھے ہیں اور جو اس کے سیدھے راستے کے مخالف ہیں جن پر خدا غضبناک ہوا ہے، ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے رسوا کن جگہ اور عذاب الیم مقرر کیا ہے کہیں سیدھے راستے سے بھٹک نہ جائے لہٰذا کہتا ہے: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

سُورَۃُ الْبَقَرَۃ

یہ سورہ مدنی ہے اور اس میں آیتوں کی تعداد ۲۸۶ ہے۔

پورا سورہ مدنی ہے بجز ایک آیت کے جو یہ ہے:

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ. ﴿۲۸۱﴾
(اس دن (کی رسوائی اور مصیبت) سے بچو جب کہ تم اللہ کی طرف واپس جاؤ گے، وہاں ہر شخص کو اس کی کارکردگی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا)

اس لیے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ میں نازل ہوئی تھی۔

سورۂ بقرہ کی فضیلت:

اُبَیّ بن کعب نے حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس نے اس سورہ کی تلاوت کی اس پر خدا کی رحمتیں اور برکتیں ہوں گی، اور اسے ایک سال تک خدا کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرنے والے جیسا اجر و ثواب عطا کیا جائے گا اس کا سکون اور اطمینان قلب ختم نہیں ہوگا۔ (اُبَیّ بن کعب کہتے ہیں) مجھ سے آنحضرتؐ نے فرمایا: مسلمانوں کو حکم دو کہ وہ سورۂ بقرہ سیکھیں، اس کی تعلیم میں برکت ہے۔ اس کا ترک کرنا حسرت و پشیمانی کا باعث ہے۔ اس پر بَطَلَة کو قدرت حاصل نہیں ہوگی (اُبَیّ بن کعب کہتے ہیں) اللہ کے رسولؐ! بَطَلَة سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اَلسَّحَرَة: یعنی جادوگر۔

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کی ایک بلندی ہوتی

ہے: قرآن کی بلندی سورۂ بقرہ ہے جس نے اپنے گھر میں دن کے وقت اس سورہ کی تلاوت کی تین روز تک اس کے گھر میں شیطان داخل نہیں ہوسکتا اور جس نے اپنے گھر میں رات کے وقت تلاوت کی تو تین راتوں تک شیطان اس کے گھر میں نہیں آئے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا: قرآن کا کون سا سورہ افضل ہے؟ فرمایا: البقرہ۔ عرض کیا گیا کہ بقرہ کی کون سی آیت افضل ہے؟ فرمایا: آیۃ الکرسی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جس نے سورۂ بقرہ اور سورہ آل عمران کی تلاوت کی روز قیامت وہ اس حالت میں آئے گا کہ یہ دونوں سورتیں ابر کی مانند اس کے سر پر سایہ فگن ہوں گی۔ یا دو حجاب کی مانند جن سے پردہ پوشی کی جاتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

الٓمّٓ: جن حروف تہجی سے سورے کا آغاز کیا گیا اس کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ کچھ کا نظریہ یہ ہے کہ یہ حروف متشابہات ہیں جن کا علم خود اللہ نے اپنے پاس رکھا ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی اس کی تاویل نہیں جانتا۔ ہمارے ائمہ علیہم السلام سے یہی مروی ہے۔ عامہ (برادران اہلسنت) نے امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا: ہر کتاب کا ایک منتخب حصہ ہوتا ہے اور اس کتاب کا انتخاب حروف تہجی ہیں۔

شعبی سے روایت ہے: اللہ کی ہر کتاب میں اس کا راز ہوتا ہے قرآن میں اس کا راز وہ تمام حروف تہجی ہیں جو سورتوں کے اوائل میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سورتوں کے اسماء اور ان کا آغاز ہے۔ کئی طرح سے دیگر علماء نے بھی مختلف تعبیریں بیان کی ہیں۔

۱۔ یہ سوروں کے نام اور ان کی کنجیاں ہیں۔ یہ حسن اور زید ابن اسلم سے مروی ہے۔

۲۔ اس سے مراد اللہ تعالٰی کے اسماء کی جانب رہنمائی ہے۔

اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: الٓمّٓ جس کے معنی ہیں۔ اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ میں اللہ سب سے زیادہ جانتا ہوں۔

المر: اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ وَ اَرٰی۔ میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا اور دیکھنے والا ہوں۔

المص: اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ وَ اُفَصِّلُ۔ میں اللہ سب سے زیادہ واقف کار اور مفصل بیان کرنے والا ہوں۔

کھیعص میں کاف سے کافی، ہاء سے ہادی، یاء سے حکیم، ع سے علیم اور ص سے صادق مراد ہے۔ یہ روایت ابن عباس کی ہے۔

اور انھیں سے روایت ہے کہ الم کا الف اللہ کے نام پر دلالت کر رہا ہے، لام جبرئیلؑ کے نام پر دلالت کر رہا ہے۔ م محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر دلالت کر رہا ہے۔

ابو اسحاق ثعلبی نے امام علی رضا علیہ السلام کی سند سے اپنی تفسیر میں اس طرح روایت کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: الف میں اللہ کے چھ صفات ہیں:

اَلْاِبْتِدَاء اللہ نے تمام مخلوقات کا آغاز فرمایا، الف سے حروف کی ابتدا اور آغاز ہوتا ہے۔

اَلْاِسْتِوَاء وہ عادل ہے ظالم نہیں۔ الف اپنی ذات میں مستقیم ہے۔

اَلْاِنْفِرَاد اللہ فرد (یعنی یکتا) ہے الف فرد ہے۔

اِتِّصَالُ الْخَلْقِ بِاللّٰہِ (یعنی مخلوقات کو اللہ سے متصل کرنے والا ہے) اللہ مخلوقات سے متصل نہیں ہوتا، جملہ مخلوقات اللہ کی محتاج ہے، اللہ ہر ایک سے بے نیاز ہے اسی طرح الف حروف سے متصل نہیں ہوتا جبکہ حروف اس سے متصل ہوتے ہیں اور وہ دوسروں سے جدا ہوتا ہے اسی طرح اللہ بھی اپنے تمام صفات کی وجہ سے اپنی مخلوقات سے جدا ہے اور اس کے معنی کو الفت سے بنایا گیا ہے جس طرح خداوند عالم مخلوقات سے الفت و محبت کا سبب ہے اسی طرح الف سے دوسرے حروف ملتے ہیں اور ان سے ملنے کا سبب ہے۔

۳۔ یہ اسمائے الٰہی منقطعہ ہیں اگر لوگ ان کو خوبصورت انداز میں جمع کرنے پر قادر ہوتے تو اسم اعظم الٰہی سے واقف ہو جائے آپ کہتے ہیں الر اور حم اور ن؛ اس طرح الرحمن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام حروف مقطعات ہیں ہم ان کے متصل کرنے اور جمع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یہ روایت سعید بن جبیر کی ہے۔

۴۔ اسمائے قرآن ہیں، یہ قتادہ کی روایت ہے۔

۵۔ یہ قسمیں ہیں جنکے ذریعہ خداوند عالم نے قسم کھائی ہے اور یہ اللہ کے اسماء ہیں۔ یہ ابن عباس اور عکرمہ کی روایت ہے۔

اخفش نے کہا ہے: خداوند عالم نے حروف معجمہ کے فضل و شرف کی وجہ سے ان حروف کے ذریعہ قسم کھائی ہے۔ یہ حروف مختلف زبانوں میں اس کے اسمائے حسنہ، صفات علیا اور تمام امتوں کے کلام کی جڑیں ہیں، اس کی نازل شدہ کتب کی بنیاد اور اساس ہیں جن کے ذریعہ ایک دوسرے سے متعارف ہوتے اور ذکر

الٰہی کرتے اور اس کی وحدانیت بیان کرتے ہیں، گویا کہ اس نے حروف کے ذریعہ قسم کھائی ہے۔ بلاشبہ قرآن اس کی کتاب اور اسی کا کلام ہے۔

۶۔ ان میں سے ہر حرف اسمائے الٰہی کی کنجی ہے۔ اس میں کوئی حرف ایسا نہیں ہے کہ وہ جس میں قوم کی مدت اور وقت کے ذریعہ ان میں موجود نہ ہو۔ یہ روایت ابوالعالیہ سے مروی ہے۔ اسی طرح ہماری روایات میں بھی وارد ہوا ہے۔

۷۔ ان حروف سے اس امت کی بقا کی مدت مراد ہے۔ مقاتل بن سلیمان سے روایت ہے، مقاتل نے کہا: اوائل سور میں موجود حروف کے مکررات کو حذف کرنے کے بعد سات سو چوالیس (۷۴۴) برس ہوتے ہیں۔ جو اس امت کے باقی رہنے کی مدت ہے۔

علی بن فضال مجاشعی نحوی کہتا ہے: ہم نے جب مقاتل کے ذکر کردہ حروف کا شمار کیا تو ان کی تعداد تین ہزار پینسٹھ (۳۰۶۵) پھر مکررات کو حذف کر دیا اس طرح چھ سو ترانویں (۶۹۳) باقی بچے۔ اس کی حکمت کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم کہتے ہیں ہم نے بھی اس کا حساب کیا تو اسی طرح پایا۔

روایت کی گئی ہے کہ یہودیوں نے جب الم سنا تو کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اقتدار وحکومت کی مدت مختصر ہے جو اکہتر (۷۱) برس ہوتی ہے، لیکن جب الر، المر، المص، **کھیعص** کا نزول ہوا تو ان پر اس معاملہ میں وسعت ہوگئی۔ یہ اہل تفسیر کے اقوال ہیں۔

۸۔ ان سے حروف معجمہ مراد ہیں۔ سوروں کے اوائل میں ذکر کرنے سے باقی کے ذکر کرنے سے مستغنی ہو گئے جو کہ مکمل اٹھائیس (۲۸) حروف ہیں۔

۹۔ یہ حروف کفار کو خاموش کرنے کے لیے ہیں۔ اس لیے کہ مشرکین باہم ایک دوسرے کو نصیحت ووصیت کرتے تھے کہ وہ اس قرآن کو نہ سنیں تا کہ اسے لغو و بیکار قرار دیں جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے:

لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (سورۂ فصلت، آیت ۲۶)

(اور کافروں نے یہ کہا کہ خبردار اس قرآن کو مت سنو اور جب سنایا جائے تو اس میں خلل پیدا کرو تا کہ تم غالب آجاؤ) چنانچہ وہ کبھی سیٹیاں بجاتے، کبھی تالی بجاتے اور کبھی شور مچاتے تھے تا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مغالطہ میں مبتلا کریں۔ لہٰذا اللہ نے ان حروف کو نازل فرمایا یہاں تک کہ جب وہ لوگ کوئی عجیب وغریب چیز سنتے تو اسے متوجہ ہو کر سنتے اور اس میں غور وفکر کرتے۔ اس طرح قرآن کو غلط ثابت کرنے سے غافل ہو جاتے

تھے چنانچہ قرآن ان کے کانوں میں پڑتا جو ان کے منافع کے حصول کا سبب ہوتا تھا۔

۱۰۔ اس سے مراد ہے یہ قرآن جس کا مقابلہ (جواب لانے) کرنے سے تم عاجز ہو وہ انھیں حروف کی جنس (اصل) سے ہے جن کا استعمال تم اپنی تقاریر اور کلام میں کرتے ہو۔ پس جب تم اسے سمجھ سکتے تو جان لو (آگاہ ہو جاؤ) یہ اللہ کی طرف سے ہے اس لیے کہ عادت اس پر جاری نہیں ہے کہ لوگ اس عظیم تفاوت (اختلاف) کی قدر میں فرق قرار دیں۔ ان مقامات پر حجت کو ظاہر کرنے کے لئے تکرار کی گئی ہے جس کی حکایت قطرب سے کی گئی ہے جسے ابو مسلم محمد بن بحر الاصفہانی نے اختیار کیا ہے۔

ان اقوال میں قول اول ہے جس کی روایت حسن سے کی گئی ہے کہ حروف مقطعات سورتوں کے نام اور ان کا آغاز ہے۔

ترکیب:

جہاں تک الٓمّٓ کے محل اعراب کی بات ہے تو الٓمّٓ کے سلسلہ میں مذکورہ بالا نظریات کے اختلاف کے پیش نظر اس کے محل اعراب کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔

حسن کے نظریہ کے مطابق الٓمّٓ کا محل اعراب رفع ہے مبتدأ محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: هٰذِهٖ الٓمّٓ۔

رمانی کے کہا ہے کہ الٓمّٓ مبتدا بھی ہو سکتا ہے اور ذٰلِكَ الْكِتَابُ اس کی خبر اور اس کی تقدیر یہ ہے: حُرُوْفُ الْمُعْجَمِ ذٰلِكَ الْكِتَابُ. (یہ حروف معجم ہی وہ کتاب ہیں) یہ نظریہ بعید نظر آتا ہے اس لئے کہ متبدا کا قانون یہ ہے کہ وہ معنی کے لحاظ سے خبر ہو اور الکتاب حروف معجم نہیں ہے۔

الٓمّٓ محلاً منصوب بھی ہو سکتا ہے فعل کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر کہ اس کی تقدیر اُتْلُ الٓمّٓ ہے۔

جس نے الٓمّٓ کو قسم مانا ہے اس کی نظر میں فعل کے پوشیدہ ہونے کہ بنا پر وہ منصوب ہے اس لئے کہ حرف قسم جب محذوف ہوتا ہے تو فعل مقسم بہ (جس چیز کے ذریعہ قسم کھائی گئی ہے) سے متصل ہو کر اسے نصب دیتا ہے۔ بِاللهِ کے معنیٰ ہیں: اُقْسِمُ بِاللهِ پھر اُقْسِمُ کو حذف کر دیا گیا اور بِاللهِ باقی رہ گیا۔ اگر باء کو حذف کر دیا گیا تو آپ اَللهَ لَاَفْعَلَنَّ کہیں گے۔

جن افراد نے ان حروف کو اختصار یا حروف مقطعہ مانا ہے ان کے نزدیک اس کا کوئی محل اعراب نہیں

ہے اس لئے کہ الٓمّٓ آپ کے اس جملہ زَيْدٌ قَائِمٌ کے مانند ہے کہ اس کا اعراب میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ جملہ کا محل اعراب اسی وقت ہوتا ہے جب وہ فرد کی جگہ واقع ہو جیسے یہ جملے: زَيْدٌ اَبُوْهُ قَائِمٌ و اِنَّ زَيْدًا اَبُوْهُ قَائِمٌ۔ اس لئے کہ آپ کا یہ کہنا کہ زَيْدٌ قَائِمٌ، اِنَّ زَيْدًا قَائِمٌ کے مقام پر ہے اور یہ حروف حکایت پر موقوف ہیں جیسا کہ حروف تہجی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ مبنی بر سکت ہوتے ہیں، جس طرح عدد مبنی بر سکت ہوتا ہے اور آپ عدد میں: وَاحِدْ، اِثْنَان، ثَلَاثَهْ، اَرْبَعَهْ کہتے ہیں۔ آپ اِثْنَان کے ہمزہ کو ہمزۂ قطع قرار دیتے ہیں حالانکہ اِثْنَان کا ہمزہ ہمزۂ وصل ہے اور ثَلَاثَه اور اَرْبَعَه میں ہاء کہتے ہیں اور اگر آپ سکت کو پوشیدہ رکھتے تو ثَلَاثَة کو تاء کے ساتھ ادا کرتے۔ اسی بات پر شاعر کا یہ شعر بھی دلالت کرتا ہے:

اَقْبَلْتُ مِنْ عِنْدِ زِيَادٍ كَالْخَرِف　　تَخُطُّ رِجْلَايَ بِخَطٍّ مُخْتَلِف

تَكْتُبَانِ فِي الطَّرِيْقِ لَامَ اَلِف

گویا شاعر نے اس طرح کہا ہے: لَامَ اَلِف۔ لیکن اس نے الف کے ہمزہ کی حرکت کو میم کو دے کر اسے مفتوح کر دیا ہے۔ جب آپ حروف تہجی یا اسمائے اعداد کے بارے میں خبر دیں گے تو انھیں اعراب دیں گے اس لئے کہ آپ نے ان کے بارے میں خبر دینے کے ذریعہ انھیں اسمائے متمکنہ (معربہ) میں داخل کیا ہے اور عمل کے ذریعہ انھیں اسمائے اصوات (آواز) کے دائرہ سے باہر نکال دیا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

كَمَا بَيَّنَتْ كَافٌ تَلُوْحُ وَمِيْمُهَا

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

اِذَا اجْتَمَعُوْا عَلَى اَلِفٍ وَّ بَاءٍ　　وَ وَاوٍ هَاجَ بَيْنَهُمْ جِدَالٌ

آپ کہتے ہیں: هَذَا كَافٌ حَسَنٌ و هَذِهِ كَافٌ حَسَنَةٌ۔ جس نے کاف کو مذکر قرار دیا ہے اس نے 'حرف' مانا ہے اور جس نے مؤنث قرار دیا ہے اس نے 'کلمة' مانا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾

یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، متقین کے لیے ہدایت ہے۔

قرائت:

ابن کثیر نے فِيْهِ هُدًى تلفظ میں ھاء کو یاء سے ملا دیا ہے اسی طرح ہر ھاء کنایہ ہے کہ جس سے پہلے یاء ساکنہ ہو۔ اگر ھاء سے پہلے یاء ساکنہ کے علاوہ کوئی دوسرا حرف ساکن ہو تو اس ھاء کو واؤ سے ملا دیا ہے فِيْهِيْ مُهَانًا میں حفص نے بھی ابن کثیر کی موافقت کی ہے اور قتیبہ نے فَمُلَاقِيْهِ اور سَاُصْلِيْهِ میں اس کی موافقت کی ہے بقیہ قراء اشباع نہیں کرتے ہیں اور جب ھاء سے پہلے متحرک حرف ہو تو اس کے اشباع پر سارے قراء کا اجماع ہے۔

حجت:

جان لیجئے کہ عربی زبان میں فیہ کے بارے میں چار صورتیں ہیں: فِيْهُوْ، فِيْهِيْ، فِيْهُ اور فِيْهِ، اصل فِيْهُوْ ہے جیسا کہ لَهُوْ مَالٌ کہا گیا ہے۔ جس نے فِيْهِ وغیرہ میں ھاء کو زیر دیا ہے باوجود یہ کہ قاعدہ پیش دینا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ھاء سے پہلے یاء یا زبر ہے۔ اور ھاء الف سے مشابہ ہے اس لئے کہ وہ حروف حلقی میں سے ہے اور چونکہ اس میں اخفا ہوتا ہے پس جس طرح ھاء الف کے مانند ہے اور امالہ میں یاء کے مانند ہے زیر یا یاء کی وجہ سے، اسی طرح انھوں نے ہاء کو کسرہ یا یاء کی وجہ سے کسرہ دے دیا ہے تا کہ دو آوازیں متجانس ہو جائیں۔

اور جن لوگوں نے اشباع کو ترک کیا ہے تو انھوں نے مشابہت کے اجتماع کو ناپسند کیا ہے اس لئے کہ ھاء حرف خفی ہے جب اسے دو ساکن حروف لین گھیر لیں گے تو گویا دو ساکن ایک ساتھ جمع ہو جائیں گے اس لئے کہ ہاء خفی ہے پس ان لوگوں نے فِيْهِيْ اور خُذُوْهُوْ جیسے کلمات میں ھاء کو مانع نہیں مانا ہے۔ اسی طرح رُدَّ جیسے کلمہ میں بھی ھاء کو مانع شمار نہیں کیا ہے ان لوگوں نے جنھوں نے ضمہ کو ضمہ کا تابع قرار دیا ہے جب فعل ضمیر مؤنث سے متصل ہو انھوں نے رُدَّهَا پڑھا ہے زبر کے ساتھ کچھ اور نہیں پڑھا ہے، ضمہ کو ضمہ کا تابع قرار نہیں دیا ہے اور دال کو گویا الف قرار دیا ہے۔

لیکن جس نے اشباع کیا ہے اور ھاء کے بعد یاء لایا ہے تو اس نے کہا ہے کہ ھاء اگرچہ حرف خفی ہے پھر بھی وہ ھاء کو لغت کے دوسرے حروف کے مانند ہونے سے خارج نہیں کرتا ہے کہ جن میں خفاء نہیں ہے جب ایسا ہے تو پھر ھاء کا دو ساکنوں کے درمیان مانع ہونا ان دیگر حروف کے مانند مانع ہونا ہے کہ جن میں خفاء نہیں ہے۔

الفاظ و معانی:

ذٰلِكَ لفظ ہے جس سے دور کا اشارہ کیا جاتا ہے اور ھٰذا کے ذریعہ قریب کا اشارہ کیا جاتا ہے۔ ذا اسم ہے کاف کو خطاب کے لیے اضافہ کیا گیا ہے جس کا کوئی اعراب نہیں ہے، لام کو تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے التقائے ساکنین کے سبب کسرہ دیا گیا جس سے 'ھا' ساقط ہو گیا لہذا کہتے ہیں: ذَاكَ ذَالِكَ لیکن ھٰذَاكَ اور ھٰذَالِكَ نہیں بولتے ہیں۔ جس طرح لفظ حساب محسوب کے معنیٰ میں ہے اسی طرح لفظ کتاب مصدر ہے جو مکتوب کے معنی میں ہے۔

ترکیب:

ذٰلِكَ چند اسباب کی بنا پر مرفوع ہو سکتا ہے:

۱۔ آپ اسے الٓمٓ کی خبر قرار دے سکتے ہیں جیسا کہ اس بارے میں قول گزر چکا ہے۔

۲۔ ذٰلِكَ مبتدا اور الْكِتَابُ اس کی خبر ہے۔

۳۔ ذٰلِكَ مبتدا اور الْكِتَابُ عطف بیان یا اس کی صفت یا اس کا بدل ہے اور جملہ لَا رَيْبَ فِيْهِ مقام خبر میں ہے۔

۴۔ ذٰلِكَ مبتدا اور اس کی خبر ھُدًى ہے اور لَا رَيْبَ فِيْهِ مقام حال میں ہے اور اس میں عامل معنیٰ اشارہ ہے۔

۵۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ اور ھُدًى دونوں خبر بعد از خبر ہیں جیسے آپ کا یہ کہنا: هٰذَا حُلْوٌ حَامِضٌ۔ یعنی اس میں دونوں مزے ہیں۔ نیز شاعر کا یہ شعر:

مَنْ يَكُ ذَا بَتٍّ فَهٰذَا بَتِّي　مُقَيِّظٌ مُصَيِّفٌ مُشَتِّي

۶۔ ذٰلِكَ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اس کی تقدیر ھٰذَا ذٰلِكَ الْكِتَابُ ہے۔

اگر آپ نے ذٰلِكَ کو اس قول پر حمل کیا یا اسے مبتدا مانا اور لَا رَيْبَ فِيهِ کو خبر؛ یا اس کو الٓمٓ کی خبر قرار دیا یا الْكِتَابُ کو اس کی خبر تو ان تمام صورتوں میں هُدًى بر بنائے حال منصوب ہوگا یعنی هَادِيًا لِّلْمُتَّقِينَ، اور اس میں عامل معنیٰ اشارہ واستقرار ہوگا کہ فِيهِ جس کے متعلق ہے۔

لَا رَيْبَ: سیبویہ نے کہا ہے کہ لَا اپنے بعد والے اسم میں عمل کر رہا ہے اور اسے بغیر تنوین کے نصب دے رہا ہے۔ حالانکہ سیبویہ کے علاوہ دیگر ماہرین علم نحو نے کہا ہے کہ لَا کو نکرہ شائعہ کے ساتھ مرکب قرار دینا اس میں حرف کے معنیٰ کو متضمن قرار دینے سے زیادہ تاکید پیدا کرنے والا ہے اس لئے کہ لَا کو اسم کا جزء قرار دیا گیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ اسے مجموعی طور پر اس کی جانب مضاف کرتے ہیں اور اس پر حرف جر داخل کرتے ہیں جیسے یہ کہنا کہ: جِئْتُكَ بِلَا مَالٍ وَلَا زَادٍ۔ جب یہ اس طرح ہو گیا تو اسے مبنی بر فتحہ قرار دے دیا گیا اور دونوں (لَا رَيْبَ) مبتدا ہونے کی بنا پر محلًا مرفوع ہیں اور اس کی خبر مبتدا کی خبر کے مقام میں ہے۔

اس قول کی بنا پر آپ فِيهِ کو خبر قرار دے سکتے ہیں اور صفت بھی کہ جس کی خبر پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے فِيهِ کو خبر قرار دیا تو وہ سیبویہ کے قول کے مطابق مقام رفع میں ہوگا اس لئے کہ مبتدا کی خبر مرفوع ہوتی ہے اور ابوالحسن اخفش کے قول کے مطابق بھی وہ مقام رفع میں ہے اور یہ مقام رفع خود ظرف (فِيهِ) کے لئے ہے، اس چیز کے لئے نہیں ہے جس سے فِيهِ متعلق ہوا ہے؛ اس لئے کہ اگر مذکورہ بالا حکم نہیں ہوگا تو پھر ظرف اپنے قاعدہ کی بنا پر منصوب ہوگا، جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ ضمیر ظرف میں آئی ہے۔

هُدًى مذکورہ بالا سبب یہ کہ وہ ذٰلِكَ کی خبر ہے کے علاوہ تین دیگر اسباب کی بنا پر بھی مرفوع ہو سکتا ہے:

۱- هُدًى مبتدا اور فِيهِ اس کی خبر ہے اس بات کو مانتے ہوئے کہ لَا رَيْبَ کی خبر پوشیدہ ہے، گویا اس طرح ہے: لَا رَيْبَ فِيهِ فِيهِ هُدًى۔ ایسی صورت میں لَا رَيْبَ پر وقف کیا جائے گا اور فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ سے آغاز کیا جائے گا اور اگر آپ چاہیں تو اس جملہ میں فِيهِ کو لَا رَيْبَ کی خبر مان لیں اور هُدًى کی خبر کو پوشیدہ مانیں گویا اس طرح: لَا رَيْبَ فِيهِ، هُدًى۔ ایسی صورت میں وقف لَا رَيْبَ فِيهِ پر ہوگا اور آغاز هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ سے ہوگا۔

۲- هُدًى الٓمٓ کی خبر ہے اس قول کے مطابق جس میں الٓمٓ کو سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

۳- هُدًى مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی هُوَ هُدًى۔

تفسیر:

کتاب کے معنی

اَلْکِتَاب سے قرآن مراد ہے۔ اخفش نے کہا ہے: ذٰلِكَ سے (یعنی وہ) هٰذا (یعنی یہ) مراد ہے اس لیے کہ کتاب موجود تھی۔

بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ آپؐ پر ایسی کتاب نازل فرمائے گا جسے پانی محو نہیں کر سکے گا نہ ہی اعتراضات کی کثرت اسے کہنہ بنا سکے گی، جب اس نے قرآن نازل کر دیا تو فرمایا: یہ قرآن وہی کتاب ہے جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا یہ فراء اور ابو علی الجبائی سے روایت ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کا میں نے آپ سے گذشتہ کتابوں میں وعدہ کیا تھا۔

یہ مبرد کا نظریہ ہے جس نے کہا ہے کہ کتاب سے تورات و انجیل مراد ہے تو اس کا یہ نظریہ غلط ہے اس لیے کہ اَلْکِتَاب کی صفت لَا رَیْبَ فِیْهِ اور ھدایت ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے اور یہ ہدایت ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ یہودیوں اور نصاریٰ کے پاس جو کتابیں موجود ہیں ان میں تحریف ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ (سورۂ نساء، آیت ۴۶)

(جو کلمات الٰہیہ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں)

لَا رَیْبَ فِیْهِ یعنی یہ بیان، ہدایت حق اور معجزہ ہے۔ اس طرح اس کی صفت لَا شَكَّ فِیْهِ کی وہ مستحق وحقدار ہے اور شک کرنے والوں کے شک کی نفی سے آگاہ کرنے کی کوئی جہت نہیں ہے، بیان کیا گیا ہے کہ اس مقام پر ایک چیز حذف ہے گویا کہ ارشاد ہوتا ہے اس میں شک کا کوئی سبب نہیں ہے اس لیے کہ کلام میں جو امور شک کا باعث ہوتے ہیں جیسے تلبیس (ملاوٹ) تعقید، تناقض، دلیل و برہان سے خالی دعوے ان تمام چیزوں کی کتاب الٰہی سے نفی کی گئی ہے۔

بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی نہی کے ہیں اگرچہ خبر کے الفاظ میں ہے۔ یعنی ریب اور شک میں مبتلا نہ ہو، جیسے کہ ارشاد خدا ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۷)

متقین سے مخصوص کیا ہے کہ قرآن ان کے لیے ہدایت ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ قرآن تمام لوگوں کے لیے سرمایۂ ہدایت ہے، لیکن متقین وہ ہیں جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہدایت پاتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَآ أَنتَ مُنذِرُ مَن يَخْشَىٰهَا ۔ (سورۂ نازعات، آیت ۴۵)

(بلاشبہ آپ ہر اس شخص کو ڈرانے والے ہیں جو اس کا خوف رکھتا ہے)

اگرچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر انسان کو ڈرانے والے ہیں۔ لیکن آپ کے ڈرانے سے وہی فائدہ اٹھاتا ہے جو جہنم کا خوف رکھتا ہے، حالانکہ ایسا کہیں نہیں آیا ہے کہ قرآن صرف متقین کے لیے ہدایت ہے اور غیر متقین کے لیے ہدایت نہیں ہے۔ دوسری آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ: هُدًى لِّلنَّاسِ قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔

فصل: تقویٰ اور متقین کے بارے میں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے اللہ کے اس ارشاد میں: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ۔ (سورۂ نحل: آیت ۹۰) (بے شک اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے) تقویٰ جمع کر دیا گیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے: متقی وہ شخص ہے کہ جو چیز اس پر حرام ہے اس سے پرہیز کرے اور جو اس پر واجب کی گئی ہے اس کو انجام دے۔

اور بیان کیا گیا ہے کہ متقی وہ ہے جو اپنے نیک اعمال کے ذریعہ اللہ کے عذاب سے بچتا ہے۔

عمر ابن خطاب نے کعب الاحبار سے تقوے کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا: کیا تم نے کبھی کانٹوں سے بھرا راستہ اختیار کیا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں! کعب نے کہا: اس وقت تم نے کیا کیا؟ تو انھوں نے کہا: میں چوکنا رہا اور میں نے دامن سمیٹ لیا۔ کعب نے کہا: اسی کا نام تقویٰ ہے۔ ایک شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے:

خَلِّ الذُّنُوبَ صَغِيرَهَا وَ كَبِيرَهَا فَهُوَ التُّقَىٰ
وَ اصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ أَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرَىٰ
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيرَةً إِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصَىٰ

گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ کا ترک کرنا ہی تقویٰ ہے۔ جس طرح کانٹوں بھری زمین پر چلنے والا پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے تم بھی یہی طریقہ اختیار کرو اور تم کسی بھی چھوٹی چیز کو حقیر نہ جانو اس لیے کہ بلند و بالا پہاڑ

سنگ ریزوں سے ہی بنتے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: متقین کو اس لیے متقین کہا گیا ہے وہ اس چیز کو ترک کر دیتے ہیں جس میں کوئی حرج نہیں ہوتا اس بات پر خوف کھاتے ہوئے کہ کہیں ایسی چیزیں نہ پڑ جائیں کہ جس میں حرج ہے۔

عمر ابن عبدالعزیز نے کہا ہے کہ متقی مُلجَم ہے (لگام زدہ) مُحرِم (احرام باندھنے والا) کے مانند ہے جو حرم میں ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے: تقویٰ یہ ہے کہ خدا تمھیں اس جگہ نہ دیکھے جہاں سے اس نے تمھیں روکا ہے اور جہاں کا تمھیں حاضر رہنے کا حکم دیا ہے وہاں تمھیں غیر حاضر نہ پائے۔

❀❀❀❀❀

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿۳﴾
جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے فراہم کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

قرائت:

ابو جعفر اور عاصم نے ابی بکر سے اعشیٰ کی روایت میں ہر ہمزۂ ساکنہ کو چھوڑ کر قرأت کی ہے جیسے: يُومِنُونَ، يُوتُونَ، يَاكُلُونَ، يُوتُونَ، بِئْسَ وغیرہ اور ان دونوں نے بہت سے متحرک ہمزہ کو بھی چھوڑ دیا ہے جیسے: يُوَدِّهٖ، يُوَاخِذُهُمْ، يُوَيِّدُ بِنَصْرِهٖ۔

ابو جعفر کے نظریہ میں تفصیل ہے کہ جس کا ذکر طولانی ہو جائے گا۔

ابو عمرو نے بھی ہر ہمزۂ ساکنہ کو ترک کیا ہے مگر یہ کہ ہمزہ کا سکون جزم کی علامت ہو جیسے: نُنْسِئْهَا، تَسُؤْكُمْ، يُهَيِّئْ لَكُمْ، مَن يَّشَاْ، وَ يُنَبِّئْهُمْ، اِقْرَأْ كِتَابَكَ وغیرہ انھوں نے ایسے موارد میں ہمزہ کو ترک نہیں کیا ہے۔

ابو عمرو سے ہی ہمزۂ ساکنہ میں بھی ہمزہ کو پڑھنے کی روایت کی گئی ہے۔

نافع نے ہر اس ہمزہ ساکنہ اور متحرکہ کو چھوڑ دیا ہے جو فاء الفعل ہو جیسے: يُومِنُونَ، لَا يُوَاخِذُكُمْ۔

کسائی اور حمزہ کی قرائت میں اختلاف ہے اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ ہے کہ جس کا ذکر طولانی ہو جائے گا۔ پس ہمزہ کی قرائت قانون کی بنا پر ہے اور ترک ہمزہ تخفیف اور آسانی کے لئے ہے۔

ترکیب:

اَلَّذِیۡنَ، اَلَّذِیۡ کی جمع ہے اور اَللَّائِیۡ، وَاللَّاتِیۡ، اَلَّتِیۡ کی جمع ہے۔ اَلَّذِیۡ کی تثنیہ حالت رفع میں اَلَّذَانِ اور اَلَّتِیۡ کی اَللَّتَانِ ہے اور حالت نصب وجر میں اَلَّذَیۡنِ وَ اللَّتَیۡنِ ہے یہ ان اسماء میں سے ہیں کہ جو صلہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتے ہیں۔ جیسے مَنۡ وَ مَا اور اَیُّ۔ ان کا صلہ صرف ایسے جملہ خبریہ واقع ہوتے ہیں کہ جن میں صدق وکذب کا احتمال دینا صحیح ہو اور ان جملوں میں ایک ایسی ضمیر کا ہونا ضروری ہے جو موصول کی طرف پلٹے جب موصولات صلہ کو لے لیں گے تو وہ اسم مفرد کی تاویل میں چلے جائیں گے۔ جیسے زید اور عمرو۔ اور ایک دوسرے جزء کے محتاج ہوں گے جس کے ذریعہ جملہ بن جائے۔ پس ارشاد الٰہی: اَلَّذِیۡنَ موصول ہے اور یُؤۡمِنُوۡنَ صلہ ہے یہ اَلَّذِیۡنَ محلا منصوب بھی ہو سکتا ہے اور مجرور و مرفوع بھی ہو سکتا ہے۔

منصوب مدح کی بنا پر ہوگا گویا اس طرح ہے: اَعۡنِی الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ۔ مجرور لِلۡمُتَّقِیۡنَ کی صفت ہونے کی بنا پر ہے اور مرفوع مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر ہے۔

یُؤۡمِنُوۡنَ یعنی یُصَدِّقُوۡنَ (تصدیق کرتے ہیں) یُؤۡمِنُوۡنَ میں واؤ محلا مرفوع ہے اس لئے وہ فاعلین کی ضمیر ہے اور نون علامت رفع ہے۔ یُفۡعِلُ (باب افعال سے فعل مضارع) دراصل یُأَفۡعِلُ تھا۔ لیکن ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ جب آپ اپنے بارے میں خبر دیں گے یعنی اس کا واحد متکلم کا صیغہ بنائیں گے تو اَنَا اُأَفۡعِلُ میں دو ہمزے جمع ہو کر سنگین ہو جائیں گے۔ لہٰذا دوسرے ہمزہ کو حذف کر کے اُفۡعِلُ کیا گیا پھر دوسرے صیغوں سے بھی ہمزہ کو حذف کر دیا گیا، نُفۡعِلُ، تُفۡعِلُ، یُفۡعِلُ ہو گیا۔ جس طرح سے باب یَعِدُ میں واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ وہ یاء اور کسرہ کے درمیان واقع ہوا تھا۔ حالانکہ اس کی اصل یَوۡعِدُ ہے پھر تَعِدُ، اَعِدُ اور نَعِدُ سے بھی واؤ کو حذف کر دیا گیا تاکہ پورا باب ایک روش پر جاری وساری ہے۔

بِالۡغَیۡبِ: اس میں اجمال ہے جس کی تفصیل کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ یعنی وہ ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جس کا کفار انکار کرتے ہیں۔ جیسے خدا کی وحدانیت، اس کا کتابوں کو نازل کرنا اور رسولوں کو بھیجنا۔ یہ سب غیب ہے اس قول کی بنا پر جار ومجرور یعنی

"بِالْغَيْبِ" محلاً منصوب ہے اس لئے کہ مفعول بہ ہے۔

بِالْغَيْبِ کی ایک دوسری ترکیب بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے ارادہ کیا ہو: يُؤْمِنُوْنَ اِذَا غَابُوْا عَنْكُمْ وَلَمْ يَكُوْنُوْا كَالْمُنَافِقِيْنَ ۔ جب تمھاری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں تب بھی ایمان رکھتے ہیں اور یہ لوگ منافقین کے مانند نہیں ہیں اس کے مانند ایک یہ آیت ہے: وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ۔ اس معنی کی روشنی میں بِالْغَيْبِ حال ہے یعنی يُؤْمِنُوْنَ غَائِبِيْنَ عَنْ مُرَاءَةِ النَّاسِ لَا يُرِيْدُوْنَ بِاِيْمَانِهِمْ تَصَنُّعاً لِاَحَدٍ وَلٰكِنْ يُخْلِصُوْنَهٗ لِلّٰهِ: ایمان رکھتے ہیں پر درحالیکہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں وہ اپنے ایمان کے ذریعہ کسی ایک کو بھی دکھاوے کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ ایمان کو اللہ کے لئے خالص رکھتے ہیں۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یعنی نماز کو اس کے شرائط و فرائض کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ: مِمَّا میں مَا حرف موصول، رَزَقْنَاهُمْ اس کا صلہ ہے۔ موصول اور صلہ مصدر کے معنی میں ہیں۔ گویا اس طرح ہے: مِنْ رِزْقِنَا اِيَّاهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

مَا اسم موصول ہے اور صلہ سے موصول کی طرف پلٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ گویا اس طرح ہے: وَمِنَ الَّذِيْ رَزَقْنَاهُمُوْهُ يُنْفِقُوْنَ۔ ایسی صورت میں مَا رَزَقْنَاكُمْ محلاً مجرور ہو جائے گا مِنْ کی وجہ سے ہے اور جار و مجرور محلاً منصوب ہوں گے اس لئے کہ وہ يُنْفِقُوْنَ کا مفعول ہے۔

تفسیر:

تقویٰ کے اثرات انسان کی روح وجسم پر

قرآن کی اس صفت کو بیان کرنے کے بعد کہ وہ متقین کے لیے ہدایت ہے؛ متقین کی تعریف بس اس طرح کی ہے: اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ یعنی ان تمام امور کی تصدیق کرتے ہیں جنھیں خدا نے واجب یا مستحب یا مباح قرار دیا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ قیامت، جنت اور جہنم کی تصدیق کرتے ہیں، یہ روایت حسن سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے: (جو چیز بھی اللہ کی طرف سے آئی ہے) اس کی تصدیق کرتے ہیں، یہ ابن عباس سے روایت ہے۔

کہا گیا ہے کہ جس چیز کا علم بندوں سے پوشیدہ ہے وہ اس کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔اس قول کو ابن مسعود اور اصحاب کی ایک جماعت سے نقل کیا گیا ہے۔

یہی قول اپنی عمومیت کے سبب اولیٰ اور بہتر ہے اور اس روایت میں داخل ہے جس کی روایت ہمارے علماء نے غیبت امام زمانہؑ اور آپؑ کے وقت ظہور کے بارے میں کی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ غیب سے مراد قرآن ہے، یہ روایت زر ابن حبیش سے منقول ہے۔

رمانی نے کہا ہے: غیب یعنی کسی چیز کا حواس سے پوشیدہ ہونا ہے خواہ قریب ہو یا دور مگر یہ کہ غائب کی صفت بعید پر کثرت سے بولی جاتی ہے، جو حواس کے ذریعہ ظاہر نہیں ہوتی۔

جبّی نے کہا ہے: غیب سے مراد وہ چیز ہے جو دلیلوں اور نشانیوں کے ذریعہ درک کی جائے جس کی معرفت ضروری ہو۔

معتزلہ نے بیان کیا ہے کہ ایمان اطاعت کرنے کا نام ہے۔ پھر انھوں نے اختلاف کیا کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو فرائض و نوافل دونوں کو شمار کرتے ہیں اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو فقط فرائض کو شمار کرتے ہیں اور تمام گناہان کبیرہ سے گریز کرنے کو شرط مانتے ہیں۔

خاصہ اور عامہ (اہل سنت اور اہل تشیع) کے واسطہ سے علی ابن موسیٰ رضا علیہما السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء و جوارح سے عمل کرنے کا نام ایمان ہے۔

اسی طرح دوسرے الفاظ میں روایت کی گئی ہے: بیان کردہ قول اور انجام دیے ہوئے عمل اور عقول کے ذریعہ حاصل شدہ عرفان اور اطاعت و اتباع رسول کا نام ایمان ہے۔

کہتے ہیں (صاحب تفسیر): اللہ کی معرفت اس کے رسولوں اور ہر وہ چیز جو اس کے پیغمبران لے کر آئے اس کی معرفت اصل ایمان ہے۔ ہر چیز کا جاننے والا اور اس کی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے، جس پر یہ آیت دلالت کر رہی ہے۔ خداوند عالم نے جب ایمان کا ذکر فرمایا تو اس کو غیب پر معلق (مشروط) کر دیا تا کہ وہ جان لے کہ جس چیز کے بارے میں خبر دی گئی ہے غیب سے اس کی معرفت پر تصدیق ہے۔

پھر خداوند عالم نے اسے تمام بدنی اور مالی اطاعت سے علیحدہ بیان کیا اور دونوں کو اس پر عطف کیا، ارشاد فرمایا: وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ۔ کوئی بھی چیز خود اپنے آپ پر عطف نہیں کی جاتی ہے بلکہ غیر پر عطف کی جاتی ہے۔ جو اس بات پر دلالت کر رہی ہے جب خداوند عالم نے ایمان کا ذکر

قلب کی اضافت کے ساتھ فرمایا، کہ: وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔ اور سب کا دل ایمان کی بدولت مطمئن تھا۔(سورہ نحل: آیت ۱۰۶) پھر ارشاد ہوا: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ خدا نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے(سورہ مجادلہ: آیت ۲۲)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْاِيْمَانُ سِرٌّ۔ ایمان پوشیدہ راز ہے اور اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: وَالْاِسْلَامُ عَلَانِيَةٌ اور اسلام علانیہ ہے۔

کبھی اقرار کو بھی ایمان کہتے ہیں جیسے کہ اسی کو تصدیق کہتے ہیں۔ مگر یہ کہ جب شک کے ذریعہ یا جہالت کے ذریعہ ناواقفیت سے ظاہر ہوگا تو لفظی ایمان ہوگا نہ کہ حقیقی۔ اسی طرح جوارح کے عمل کو بھی ایمان کہا جاتا ہے استعارہ کے طور پر جس طرح تصدیق کو کہا جاتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں انسان کے عمل نے اس کے قول کی تصدیق کی، ایسے قول میں کوئی خوبی نہیں ہے جب تک اس کی تصدیق عمل کے ذریعہ نہ ہو اور فعل حقیقی تصدیق نہیں ہوتی، اس پر تمام اہل لغت کا اتفاق ہے اور یہ اسم اس کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ امر خیر کی صحت اور اس کے قبول کرنے کی جانب مائل ہے کہ قلب کے ذریعہ معرفت اور تصدیق کا نام ایمان ہے جیسا کہ لغت کا تقاضا ہے لفظ کا اطلاق وہیں پر ہوتا ہے مگر زبان کے ذریعہ اقرار اور ارکان کے ذریعہ عمل مجازی اعتبار سے ہے اور اللہ کی توفیق کے ساتھ ہم ارشاد الٰہی وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ میں ان دو پہلوؤں کو بیان کر چکے ہیں جن کا تقاضا کرتی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہ نماز میں قیام سے مشتق ہے اسی لئے: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ. کہا جاتا ہے قیام کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ وہ نماز کا پہلا رکن اور طولانی حصہ ہے۔ شریعت میں نماز مخصوص افعال کا خاص شکل میں بجا لانے کا نام ہے۔ یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اسم لغت سے شرع میں منقول ہوا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ منقول نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے لغوی معنی میں تخصیص لگائی گئی ہے جس کا اطلاق مخصوص مقامات پر ذکر اور دعا پر ہوتا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ یعنی ہم نے جو کچھ انھیں عطا کیا ہے اور جن چیزوں کا انھیں مالک بنایا ہے اس میں سے اطاعت خدا میں صرف کرتے ہیں۔

ابن عباس سے حکایت کی گئی ہے کہ اس سے واجب زکوۃ مراد ہے۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ انسان کا اپنے اہل کے لیے نفقہ مراد ہے۔ اس لیے کہ آیت وجوب زکوۃ سے قبل نازل ہوئی ہے۔ ضحاک سے روایت ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنا مراد ہے۔

محمد بن مسلم کے واسطہ سے امام صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ اس کے معنی ہیں: وَ مِمَّا عَلَّمْنَاهُمْ يَبُثُّونَ (یعنی ہم نے انھیں جس چیز کی تعلیم دی ہے اسے عام کرتے ہیں)

اولیٰ یہ ہے کہ آیت کو اس کے عموم پر حمل کیا جائے حقیقت رزق یہ ہے کہ اس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو کسی کو اس سے روکنے کا حق نہیں ہے۔

آیت دلالت کر رہی ہے کہ حرام کو رزق نہیں کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ خداوند عالم نے رزق کے انفاق اور خرچ کرنے والے کی مدح کی ہے اور حرام کا انفاق کرنے والا متفقہ طور پر مدح کا مستحق نہیں ہے پس حرام رزق بھی نہیں ہوگا۔

شان نزول:

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے: یہ آیت صرف عرب کے مومنین کو شامل ہے جس پر بعد والی آیت دلالت کر رہی ہے: وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ یہ اہل کتاب مومنین کے بارے میں ہے جبکہ عربوں کے لیے قرآن سے قبل کوئی کتاب نہیں تھی یہ قول درست نہیں ہے اس لیے کہ پہلی آیت کے تمام مومنین کو شامل ہونے میں کوئی چیز مانع اور رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر چہ دوسری آیت انھیں کی قوم سے مخصوص ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان آیات سے ایک ہی قوم مراد ہو اور تمام صفات اسی کے بیان کیے گئے ہوں۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿٤﴾
اور ایمان رکھتے ہیں جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا جا چکا ہے اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

قرائت:

ورش کے علاوہ دیگر اہل حجاز اور اہل بصرہ کسی حرف کی وجہ سے کسی دوسرے حرف کو مد نہیں دیتے ہیں اور وہ یہ ہے ایک کلمہ میں ہو اور ہمزہ دوسرے کلمہ میں جیسے بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وغیرہ۔

لیکن اہل کوفہ، ابن عامر اور ورش نافع سے یہ لوگ اس کو کھینچتے ہیں۔ ورش تو ان سب میں سب سے زیادہ کھینچتے ہیں۔ پھر حمزہ، پھر اعشیٰ کی روایت بنا پر عاصم، بقیہ افراد بغیر زیادتی کے درمیانی طور پر کھینچتے ہیں: پس مد تحقیق (اس کا حق دینے) کی بنا پر ہے اور حذف کرنا تخفیف اور ہلکا بنانے کی بنا پر ہے۔ البتہ مد اور ہمزہ کے درمیان سکتہ کرنا، تو یہ حمزہ سے مروی ہے۔ عاصم اور کسائی نے حمزہ کی موافقت کی ہے۔ پھر ان دونوں نے آپس میں اختلاف کیا ہے۔

حمزہ ہمزہ سے پہلے بھی وقف کرتے ہیں اور بِالْآخِرَةِ کے لام پر ذرا سا سکتہ کرتے ہیں پھر ہمزہ سے شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح شَيْءٍ کی یاء پر سانس روک لیتے ہیں گویا وقف کرتے ہیں پھر ہمزہ سے شروع کرتے ہیں اور بقیہ قراء بغیر سکتہ کے قرائت کرتے ہیں۔

ترکیب

اِلَيْكَ، لَدَيْكَ اور عَلَيْكَ میں اصل اِلَاكَ، عَلَاكَ اور لَدَاكَ ہے یہاں الف کو ضمیر کے ساتھ یاء سے بدل دیا گیا ہے تاکہ اس الف کے درمیان جو کہ اسم معرب کے آخر میں ہوتا ہے اور اس الف کے درمیان جو مبنی کے آخر میں ہوتا ہے جس کے لئے اضافت لازمی ہے فرق ڈالا جا سکے۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ اِلیٰ، عَلیٰ اور لَدیٰ اضافت سے جدا نہیں ہوتے ہیں۔ انھیں سے كِلَا کو بھی مشابہ قرار دیا گیا ہے جب وہ ضمیر کی طرف مضاف ہو اس لئے کہ وہ بھی اضافت سے الگ نہیں ہوتا ہے اور اضافت کے بغیر تلفظ ہی نہیں ہوتا ہے۔

مَا موصول ہے اور اُنْزِلَ اس کا صلہ ہے۔ اُنْزِلَ میں ایک ضمیر ہے جو مَا کی طرف پلٹ رہی ہے۔ موصول اپنے صلہ کے ساتھ باء کی بنا پر مقامِ جر میں ہے اور جار و مجرور يُؤْمِنُوْنَ کا مفعول بہ ہونے کی بنا پر مقام نصب میں ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ، الَّذِيْنَ کا صلہ ہے۔ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ عطف کی بنا پر محلاً مجرور ہے اور اس کے عطف ہونے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) ایک موصوف دوسرے موصوف پر عطف ہے۔

(۲) سارے اوصاف ایک موصوف کے ہیں۔

تفسیر:

خداوند عالم نے متقین کے جملہ صفات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ''اور ایمان رکھتے ہیں جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا'' یعنی قرآن۔ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (اور جو آپ سے پہلے نازل کیا جاچکا ہے) یعنی گذشتہ کتب اور اس کا ارشاد بِالْاٰخِرَةِ یعنی دار آخرت اس لیے کہ آخرت صفت ہے جس کے لیے موصوف کا ہونا لازمی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ آخرت کی واپسی مراد ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ دنیا کے بعد ہے۔ دنیا کو دنیا اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مخلوق سے نزدیک ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کی پستی کے سبب اسے دنیا کہا گیا ہے۔

هُمْ يُوْقِنُوْنَ یعنی يَعْلَمُوْنَ، علم رکھتے ہیں۔ علم کو یقین کہا گیا ہے اس لئے کہ اس پر یقین ہوتا ہے اور اس سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ہر یقین علم ہے جب کہ ہر علم یقین نہیں ہوتا اس لیے کہ یقین وہ علم ہوتا ہے جو استدلال اور معلوم میں غور وفکر کے بعد حاصل ہوتا ہے یا دیکھنے والے کو اس میں کوئی اشکال نہیں ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ کی تعریف میں مُوقِن نہیں کہا جاتا اس لیے کہ تمام اشیاء اس کے نزدیک یکساں روشن اور واضح ہیں۔ آخرت پر یقین کرنے والوں میں مومنین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے اگرچہ غیب پر ایمان اس کو شامل ہے حالانکہ مشرکین اس سے انکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے عقیدہ کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا (سورۂ جاثیہ: آیت ۲۴)

(اور انھوں نے کہا: بس ہمارے لیے صرف یہی دنیاوی زندگی ہے یہیں جینا اور مرنا ہے)

اس طرح مومنین کے آخرت پر یقین کو خاص طور سے بیان کر کے ان کی مدح کی گئی ہے۔

❀❀❀❀❀

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾
ایسے ہی لوگ اپنے رب کی جانب سے ہدایت یافتہ ہیں اور وہی کامیاب ترین افراد ہیں۔

ترکیب:

اُولٰٓئِكَ، مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے اور اس کی خبر "عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ" ہے اُولٰٓئِكَ

اسم مبنی ہے اور کاف حرف خطاب ہے اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔اس کے ہمزہ کو دو ساکن کے ساتھ جمع ہونے کی بنا پر زیر دے دیا گیا ہے۔اسی طرح: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ بھی ہے ہاں هُمْ کے بارے میں دو صورتیں ہیں:

(۱) ضمیر فصل ہے جو مبتدا یا خبر کے درمیان اور ان کے درمیان جو اصل میں مبتدا اور خبر تھے تاکید کی خاطر داخل ہوتی ہے۔اس ضمیر فصل کا کوئی محل اعراب نہیں ہوتا ہے۔اہل کوفہ اسے عماد کہتے ہیں۔یہ ضمیر داخل ہوتی ہے تاکہ یہ بتادے کہ اس کے بعد والا اسم خبر ہے، صفت نہیں ہے ضمیر فصل اس وقت بھی داخل ہوتی ہے جب خبر معرفہ یا شبہ معرفہ ہو جیسے یہ ارشاد الٰہی کہ: تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا۔

(۲)۔ هُمْ مبتدا دوم ہے اور اَلْمُفْلِحُوْنَ اس کی خبر ہے اور جملہ "هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ کی خبر ہے۔

الفاظ و معانی

اُولٰٓئِكَ اسم مبہم ہے ہر اس حاضر کے لئے بولا جاتا ہے کہ اشارہ جس کی شناخت کراتا ہے۔
اور فَلْح کے لغوی معنی قَطع یعنی کاٹنے کے ہیں اور اسی سے فَلَّاح بنا ہے یعنی جو ہل چلا کر زمین کو شگافتہ کرنے والا۔

تفسیر

صاحبان تقویٰ ہی کامیاب ہیں

جب خداوند عالم گذشتہ صفات کے ذریعے متقین کی تعریف بیان کر چکا تو پھر اپنے نزدیک ان کے مقام و مرتبہ کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: اُولٰٓئِكَ گذشتہ تمام صفات سے متصف (افراد) کی جانب اشارہ ہے یعنی وہ تمام مومنین اپنے پروردگار کی ہدایت پر قائم ہیں یعنی اپنے رب کے دین پر۔کہا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی رہنمائی اور بیان پر قائم ہیں۔پروردگار کی جانب اس لیے نسبت دی گئی ہے کہ ہر خیر و ہدایت اللہ کی جانب سے ہے یا تو اس لئے کہ اس کا فعل ہے یا تو اس لئے کہ اس نے پیش کیا ہے اس کی جانب رہنمائی کر کے، دعوت دے کر اور اس کے انجام دینے پر ثواب دے کر۔لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ ایمان اللہ کی جانب سے ہدایت ہے، اگرچہ

ایمان بندہ کا فعل ہے۔(صاحبان ایمان کی) اہمیت کے پیش نظر اولئک کی تکرار کی اور فرمایا: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں اور جنت میں باقی رہنے والے ہیں۔

شان نزول:

مجاہد نے بیان کیا ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی چار آیتیں مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ان کے بعد کی دو آیتیں کافروں کے متعلق ہیں اس کے بعد کی تیرہ (۱۳) آیتیں منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔

❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾
جن لوگوں نے انکار کردیا (اے پیغمبر) ان کے لیے یکساں ہے خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ماننے والے نہیں ہیں۔

قرائت:

ءَاَنْذَرْتَهُمْ ۔ میں تین قرائتیں ہیں:

(۱) عاصم، حمزہ اور کسائی نے تحقیق کی صورت میں دو ہمزے کے ساتھ پڑھا ہے۔

(۲) اہل حجاز اور عمرو نے ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے کہ دوسرے ہمزہ کو لین سے بدل دیا ہے۔

(۳) بقیہ قراء نے بین بین پڑھا ہے اور یہی کسائی کی قرائت ہے جب تخفیف ہو ابوعمرو نے ابن کثیر سے طولانی مد دیا ہے۔ نافع سے مروی ہے کہ مد کے سلسلہ میں اختلاف ہے ابن عامر نے دو ہمزے کے درمیان، الف کے ساتھ قرائت کی ہے۔

عربی زبان میں مذکورہ بالا تین صورتوں کے علاوہ تین صورتیں اور بھی ہیں:

(۱) ءَاَنْذَرْتَهُمْ پہلے والے ہمزہ کو باقی رکھا جائے اور دوسرے میں تخفیف کردی جائے کہ اسے بین بین قرار دیا جائے۔

(۲) اس کو ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا جائے: اَنْذَرْتَهُمْ

(۳) عَلَيْهِمُ اَنْذَرْتَهُمْ پڑھا جائے کہ ہمزہ کی حرکت کو میم پر ڈال دیا جائے۔ جیسا کہ ''قَدْ اَفْلَحَ'' میں نافع سے روایت کی گئی ہے۔

حجت

دونوں ہمزوں کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ اصل اور قاعدہ کے مطابق ہے اس لئے کہ پہلا ہمزہ ہمزہ استفہام ہے اور دوسرا ہمزہ، ہمزۂ اَفْعَلَ (باب افعال کا ہمزہ) ہے۔

دو ہمزوں کے درمیان الف کو داخل کرنا، تو جس نے اس طرح قرائت کی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ دو ہمزوں کے درمیان فاصلہ ڈال دے اس لئے کہ مثلین کا جمع ہونا سنگین ہے جیسے ''اِضْرِبْنَانِّ'' کے دونوں کے درمیان فاصلہ ڈال دیا گیا ہے اس لئے کہ تین نون کا ایک ساتھ جمع ہونا سنگین ہے اسی سے ذوالرمہ کا یہ شعر ہے:

فَيَا ظَبْيَةَ الْوَعْسَاءِ بَيْنَ الْجُلَاجِلِ وَبَيْنَ النَّقَاءِ اٰنْتِ اَمْ اُمُّ سَالِمِ

جس نے دو ہمزوں کے درمیان فاصلہ ڈالا ہے اور دوسرے ہمزہ کو حرف لین۔ قرار دیا ہے تو اس کا مقصد اسے دو لحاظ سے تخفیف دینا ہے ایک فاصلہ کے ذریعہ، دوسرے لین قرار دے کر اس لئے کہ جب آپ اسے لین سے بدلیں گے تو ہمزہ کو ختم کر دیں گے اور لفظ اس طرح ہو جائے گا کہ گویا اس میں استفہام ہی نہیں ہے۔

پس مد میں استفہام پر دلالت میں تاکید ہے جس طرح ہمزہ کو باقی رکھنے میں ہے لیکن جس نے پہلے ہمزہ کو باقی رکھا اور دوسرے میں تخفیف کر دی الف کے ذریعہ فاصلہ دئے بغیر، تو یہ قیاسی ہے اس لئے کہ اس نے لین قرار دینے کو فصل کا عوض قرار دیا ہے۔

اور جس نے ایک ہی ہمزہ پر اکتفاء کیا ہے تو اس نے ہمزۂ استفہام کو گرا دیا ہے اور یہ ضعیف نظریہ ہے، عمر بن ابی ربیعہ کے شعر میں آیا ہے:

لَعَمْرُكَ مَا اَدْرِي وَاِنْ كُنْتُ دَارِيًا بِسَبْعٍ رَمَيْنَ الْجَمْرَ اَمْ بِثَمَانٍ

(دراصل أبسبع تھا کہ ضرورت شعری کی بنا پر ہمزہ کو حذف کر دیا)

جس نے ہمزہ کی حرکت کو میم پر ڈال دیا ہے تو اس نے پہلے ہمزہ کو لین قرار دیا ہے اور دوسرے ہمزہ کو باقی رکھا ہے۔ عرب جب ہمزہ متحرک کو لین سے بدلتے ہیں اور اس سے پہلے حرف ساکن ہوتا ہے تو ہمزہ کی حرکت کو ماقبل کو دے دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے مَنْ بُوكَ، مَنُ مُّكَ كَمِ بِلُكَ (مَنْ اَبُوكَ، مَنْ

أُمُّكَ وَ كَمْ إِبِلُكَ)

الفاظ ومعانی

كُفر شُكر کی ضد ہے۔ کفر کے معنی نعمت کا چھپانا اور پوشیدہ کرنا ہے۔ شکر اظہار نعمت ہے۔ جو کسی چیز کو چھپاتا ہے گویا وہ اس کا انکار کرتا ہے۔ لبید شاعر نے اس طرح کہا ہے:

فِي لَيْلَةٍ كَفَرَ النُّجُومَ غَمَامُهَا

یعنی شب میں ابر نے ستاروں کو پوشیدہ کر دیا۔

سَوَآءٌ مصدر ہے جسے فاعل کی جگہ پر لایا گیا ہے جو مُسْتَوِی کے معنی میں ہے۔ اِسْتَوَاء اعتدال کو کہتے ہیں اور سَوَآء کے معنی برابر کے ہیں۔

اِنْذَار ایسا اعلان جو ڈرانے کے ساتھ ہو۔ ہر ڈرانے والا مُعْلِمْ (آگاہ کرنے والا، جتلانے والا) ہے جبکہ ہر مُعْلِمْ ڈرانے والا نہیں ہوتا۔ اللہ کی ایک صفت منذر بھی ہے کہ وہ ڈرانے والا ہے چونکہ اللہ کو مُعْلِم کہنا جائز ہے۔ اسی طرح اس کو مُخَوِّف کہنا بھی جائز ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: يُخَوِّفُ اللهُ بِهِ عِبَادَهُ. پس جب خدا کو معلم اور مخوف کہنا صحیح ہے تو اس اسم کے دونوں معنی سے اس کی صفت بیان کرنا جائز ہے اس کے ذریعہ بھی اس کی صفت بیان کرنا جائز ہے جو ان دونوں معانی (اعلام اور تخویف) پر مشتمل ہو۔

ترکیب:

اِنَّ حرف تاکید ہے اور وہ اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے۔ اِنَّ رفع اور نصب دیتا ہے اس لئے کہ وہ فعل سے مشابہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فعل کے وزن پر ہے۔ وہ تاکید کے لئے ہے اور تاکید فعل کے معانی میں سے ہے اور اِنَّ فعل سے مشابہ ہے ضمیر متکلم کے متصل ہونے کی وجہ سے جیسے اِنَّنِیْ۔ وہ مبنی بر فتحہ ہے فعل ماضی کی طرح اِنَّ لازم قرار دیتا ہے کہ منصوب کو مرفوع پر مقدم کیا جائے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اِنَّ شباہت کی وجہ سے عمل کرتا ہے تو اسے اس فعل کے مانند قرار دیا گیا ہے جس کا مفعول اس کے فاعل پر مقدم کر دیا گیا ہو۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا محلاً منصوب ہے اس لئے کہ اِنَّ کا اسم ہے۔

كَفَرُوا۔ الَّذِينَ کا صلہ ہے۔

اِنَّ کی خبر کے سلسلہ میں دو صورتیں ہیں:

(۱) جملہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ خبر ہے اس بنا پر سواء مبتدا، مرفوع ہے اسی طرح اس کے بعد والا لفظ جس پر حرف استفہام داخل ہوا ہے مقام خبر میں ہے اور پورا جملہ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ اِنَّ کی خبر ہے اور لَا يُؤْمِنُونَ ضمیر منصوب کے لئے حال ہے جیسا کہ ان جملوں میں ہے: مَعَهُ صقرٌ صَائِدًا بِهِ. اور بَالِغَ الْكَعْبَةِ اور یہ بھی صحیح ہے کہ لَا يُؤْمِنُونَ، استیناف ہو۔

(۲) لَا يُؤْمِنُونَ اِنَّ کی خبر اور سَوَاءٌ، سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ اسم اور خبر کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ پس اس جملہ کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔ حالانکہ پہلی صورت میں اسے محلاً مرفوع قرار دیا گیا تھا۔

لیکن جب آپ اس کلام کو اس کے معنی کے لحاظ سے فرض کریں گے تو کہیں گے: سَوَآءٌ عَلَيْهِمُ الْاِنْذَارُ وَ تَرْكُهُ تو سَوَآءٌ مبتدا کی خبر قرار پائے گا اس لئے کہ اس کی تقدیر و تاویل یہ ہوگی: اَلْاِنْذَارُ وَ تَرْكُهُ مُسْتَوِيَانِ عَلَيْهِمْ اور ہم نے جو کہا کہ وہ مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر جیسا کہ تلاوت میں ہے تو اس لئے کیا ہے کہ وہ خبر نہیں ہوسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کلام میں وہ مخبر عنہ نہیں ہے اور جب مخبر عنہ نہیں ہے تو اس کا خبر ہونا باطل ہے اور جب خبر ہونا فاسد ہے تو مبتدا ہونا ثابت ہو جائے گا۔

نیز استفہام سے پہلے والا اور اسم کے بعد والا اسم استفہام کے دائرہ میں داخل نہیں ہے پس ایسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ سَوَآءٌ اس چیز کے بارے میں خبر دے جو استفہام میں ہے درحالیکہ وہ استفہام پر مقدم ہے اور آیت میں جو ہے وہ یہ ہے کہ مبتدا کی خبر خود مبتدا نہیں ہے اور نہ ہی اس میں اس چیز کا ذکر ہے جس کو ابوزید نے شعر میں کہا ہے:

فَإِنَّ حَرَامًا لَا أَرَى الدَّهْرَ بَاكِيًا عَلَى شَجْوَةٍ إِلَّا بَكَيْتُ عَلَى عَمْرو

ارشاد الٰہی: ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ ظاہراً سوال ہے لیکن اس کے معنی خبر کے ہیں اس ہمزہ کو الف تسویہ کہتے ہیں تسویہ (برابر) ہیں۔ حرف ہمزہ استفہام اور أَمْ ہیں۔ آپ کہتے ہیں: أَزَيْدٌ عِنْدَكَ أَمْ عَمْرٌو آپ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں سوال کرنا چاہتے ہیں۔ اس ہمزہ کی جگہ أَوْ رکھنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ أَوْ ہمزہ کا معادل نہیں ہے۔ اور معادلہ کی تفسیر یہ ہے کہ أَمْ ہمزہ کے ساتھ ایک مقام میں ہے۔ یعنی

جب آپ أَزَيْدٌ عِنْدَكَ أَمْ عَمْرٌو کہیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک آپ کے پاس ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جواب: زَيْدٌ یا عَمْرٌو کو معین کر کے دیا جائے گا لیکن جواب: أَزَيْدٌ أَوْ عَمْرٌو کے ساتھ نَعَمْ کے ذریعہ دیا جائے گا یا لَا کے ذریعہ۔

یہاں پر لفظ استفہام آیا ہے اگر چہ یہ خبر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ تسویہ ہے جو استفہام میں ہوتا ہے جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جب آپ کہتے ہیں کہ: سَوَآءٌ عَلَيَّ اَقُمْتُ اَمْ قَعَدْتُ تو آپ نے دونوں باتوں کو اپنے اوپر برابر اور مساوی قرار دیا ہے۔ جس طرح آپ استفہام کرتے ہیں کہ: أَقَامَ زَيْدٌ اَمْ قَعَدَ تو دونوں باتیں استفہام آپ کے نزدیک استفہام میں برابر ہیں اور آپ کو خصوصی طور پر کسی ایک کا بھی علم نہیں ہے جب تسویہ ان دونوں کو شامل ہو گیا تو اس خبر پر بھی لفظ استفہام جاری ہو گا اس لئے کہ ابہام میں یہ خبر بھی استفہام کے ساتھ شریک ہے پس ہر استفہام تسویہ ہوتا ہے اگر چہ ہر تسویہ استفہام نہیں ہوتا ہے۔

علمائے نحو نے کہا: سوآء کی نظیر آپ کے اس کلام میں بھی ہے: مَا اُبَالِيْ اَقْبَلْتَ اَمْ اَدْبَرْتَ. اس لئے کہ وہ اَيّ کی جگہ پر واقع ہوا ہے گویا آپ نے اس طرح کہا ہے: مَا اُبَالِيْ اَيُّ هٰذَيْنِ كَانَ مِنْكَ دوسری مثال۔ مَا اَدْرِيْ اَحْسَنْتَ اَمْ اَسَأْتَ. لَيْتَ شِعْرِيْ اَقَامَ اَمْ قَعَدَ۔

حسان نے کہا:

مَا اُبَالِيْ اَنَبَّ بِالْحُزْنِ تَيْسٌ   اَمْ لَحَانِيْ بِظَهْرِ غَيْبٍ لَئِيْمٍ

اور یہ کہ استفہام کی صورت میں بھی خبر ہوتا ہے اس کی مثال جریر کا یہ شعر ہے:

اَلَسْتُمْ خَيْرَ مَنْ رَكِبَ الْعَطَايَا   وَ اَنْدَى الْعَالَمِيْنَ بُطُوْنَ رَاحٍ

اگر یہ استفہام ہو تو مدح نہ ہو۔

ایک دوسرے شاعر کا شعر ہے:

سَوَاءٌ عَلَيْهِ اَيَّ حِيْنٍ اَتَيْتَهٗ   اَسَاعَةَ نَحْسٍ تُتَّقٰى اَمْ بِاَسْعَدٍ.

اس کے لئے برابر ہے کہ چاہئے جس وقت بھی اس کے پاس آؤ۔ کیا نحس گھڑی سے بچا جاتا ہے یا مبارک و مسعود گھڑی سے۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت ابوجہل اور اس کے گھر کے پانچ افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوہ بدر کے موقع پر قتل کر دیئے گئے تھے۔ یہ روایت ربیع بن انس سے منقول ہے۔ بلخی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے: ایک ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جس کے نمایاں افراد یہودیوں کے احبار (روحانی پیشوا) تھے جنھوں نے دشمنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیا تھا اور حسد کے باعث آپ کی نبوت کو پوشیدہ رکھا تھا۔ اس کی روایت ابن عباس سے نقل ہوئی ہے۔

بیان کیا گیا ہے: ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے دلوں پر اللہ نے ان کی گمراہی کے سبب مہر لگا دی تھی اور اللہ کو معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ روایت ابوعلی الجبائی سے منقول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ اصم کی روایت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام کفار کو شامل ہے جن کے متعلق خدا نے خبر دی ہے کہ یہ سب ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ قائل کے اس قول کے مطابق ہے جو یہ کہے کہ آج تمھارے تمام برادران نہیں آئیں گے تو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بعض آ جائیں۔

شیخ طوسی (قدس سرہ) نے اختیار کیا ہے کہ یہ اختصاص کے طور پر ہے اور دیگر اقوال کو بھی ممکن قرار دیا ہے۔ شیخ طوسیؒ کی یہ بات زیادہ واضح اور جلدی سمجھ میں آنے والی ہے۔

تفسیر:

ہٹ دھرم کفار

خداوند عالم نے مومنین کی حالت بیان کرنے کے بعد اسے کافروں کے ذکر سے ملا دیا ہے اور شریعت میں کفر سے مراد ان تمام چیزوں کا انکار ہے جن کی معرفت اللہ نے واجب قرار دی ہے مثلاً توحید، عدل، اللہ کے نبی کی معرفت اور وہ جو کچھ شریعت کے ارکان لے کر آئے ہیں۔ پس جس شخص نے ان میں سے کسی شئے کا انکار کیا وہ کافر ہو گیا۔

یہ آیت اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ مکلفین میں سے ایسے افراد بھی ہیں کہ جن کے لیے لطف نہیں

ہے؛ اگر ہوتا تو وہ اس کو انجام دیتا اور وہ ایمان لے آتے اور جب خبر دی گئی کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو معلوم ہوا کہ ان کے لیے لطف نہیں ہے اور یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر دلیل ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی خبر دی ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے اور اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ممکن ہے خداوند عالم عام خطاب کرے اس سے مراد خاص ہو اس قول کے مطابق جس میں کہا گیا ہے کہ ہم جانتے ہیں ان کافروں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے انذار (انجام سے ڈرانا) سے فائدہ حاصل کیا۔

سوال: اگر کوئی معترض یہ کہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور تم لوگوں کے نزدیک وہ ایمان لانے پر قدرت رکھتے تھے تو اس بنیاد پر تمہارے انکار کا سبب کیا ہے۔ اگر وہ قدرت رکھتے ہوں اللہ کے علم کو باطل قرار دینے پر کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے؟

جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے۔ جس طرح یہ لازم نہیں ہے کہ جب وہ ایمان لانے پر مامور تھے تو جو کچھ اللہ کے علم میں ہے اس کے ابطال (باطل کرنا) پر بھی مامور ہوں۔ جس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قادر ہے اس بات پر کہ اسی لمحے قیامت برپا کر دے کہ وہ قدرت رکھتا ہو اپنے علم کے بطلان پر کہ وہ اس لمحے قیامت برپا نہیں کرے گا۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ علم کسی شئے کو اسی طرح قبول کرتا ہے جیسی وہ ہے اور وہ اسے ویسے قرار دیتا ہے جیسی اسے ہونا چاہیے تو کسی شئے کے بعینہٖ علم کا حصول محال نہیں ہے اگر چہ دوسرا بھی مقدور ہے۔

❀❀❀❀❀

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ٝ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۷﴾
اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لیے بہت بڑی سزا مقرر ہے۔

قرائت:

تمام ونمایاں قرائت غِشَاوَةٌ ہے غین پر مکسور اور ہاء (ۃ) مرفوع۔

شواذ میں عاصم سے غَشَاوَةٌ (غین پر زبر کے ساتھ) مروی ہے۔

حسن نے غُشَاوَةٌ (غین پر پیش کے ساتھ) پڑھا ہے۔ بعض قراء نے غِشْوَةٌ بغیر الف کے پڑھا ہے۔

ابوعمرو اور کسائی نے "عَلٰی اَبْصَارِهِمْ" کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے تفخیم کے ساتھ، امالہ کے سلسلہ میں قراء کے کئی نظریے ہیں کہ ان کی شرح طولانی ہو جائے گی۔

حجت:

جس نے غِشَاوَةٌ کو مرفوع پڑھا ہے اس نے اسے خَتَمَ پر حمل نہیں کیا ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آیا ہے کہ "وَ خَتَمَ سَمْعَهٗ وَ قَلْبَهٗ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً" کو ختم پر حمل نہیں کیا جائے گا اور اس سے جدا رکھا جائے گا تو وہ مرفوع ہوگا یا تو ظرف خبر کی بنا پر ہے یا مبتدا ہونے کی بنا پر۔

اسی طرح وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ بھی ہے۔

سیبویہ کے نزدیک "غِشَاوَةٌ" اور "عَذَابٌ" مرفوع ہیں اس لئے کہ دونوں مبتدا ہیں گویا اس طرح فرمایا ہے کہ غِشَاوَةٌ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ وَ عَذَابٌ لَّهُمْ۔

اخفش کے نزدیک ظرف خبر کی بنا پر مرفوع ہے اس لئے کہ ظرف میں ایک فعل پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں دونوں کے اختلاف کا فائدہ انشاء اللہ تعالیٰ بعد میں ظاہر ہوگا۔

جس نے غِشَاوَةً (منصوب) پڑھا ہے تو اس نے یا تو خَتَمَ پر حمل کیا ہے گویا خدا نے یہ فرمایا ہے: وَ خَتَمَ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ بِغِشَاوَةٍ جب حرف جر کو حذف کر دیا گیا تو فعل اس سے وصل ہو گیا اور فعل نے اسے نصب دے دیا یہ ترکیب بہتر نہیں ہے۔ اس لئے حرف عطف اور معطوف بہ کے درمیان فاصلہ ہو گیا ہے۔ ایسا کرنا شعر میں جائز ہے۔

یا تو غِشَاوَةً کو فعل مضمر پر حمل کیا ہے گویا خدا نے اس طرح فرمایا ہے: "وَ جَعَلَ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةً" جیسا کہ شاعر نے کہا:

عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَ مَاءً بَارِدًا۔

میں نے انہیں گھاس کھلائی اور ٹھنڈا پانی (سَقَيْتُهٗ) پلایا۔

دوسرے شاعر نے کہا:

يَا لَيْتَ بَعْلَكِ قَدْ غَزَا　مُتَقَلِّدًا سَيْفًا وَّ رُمْحًا

یعنی حَامِلًا رُمحاً اے کاش! تمہارا شوہر جنگ کرتا تلوار کر کے اور نیزے اٹھا کر۔

یہ چیز بھی حالت اختیار میں نہیں پائی جاتی ہے۔

پس صحیح یہ ہے کہ رفع اولی ہے اور واؤ جملہ کو جملہ پر عطف کر رہا ہے۔

غشَاوَة میں تین طرح سے تلفظ کیا گیا ہے: غین پر زبر، پیش اور زیر۔

اسی طرح غشوَة میں بھی تین طرح سے تلفظ کیا گیا ہے: غین پر زبر، پیش اور زیر۔

الفاظ و معانی:

اَلْخَتم طَبْع کی مانند ہے یعنی مہر لگانا۔ طُبِعَ عَلَیْه یعنی اس پر مہر لگا دی اور عرب کا یہ کہنا: خِتَامُهٗ مِسْكٌ یعنی اس کا آخری حصہ مشک و عنبر کی طرح خوشبو سے رچا بسا ہے۔ اسی سے خُتِمَ الْكِتَابُ ہے یعنی کتاب سے فارغ ہونے کی آخری حالت ہے۔

اَلْغِشَاوَة کے معنی ہیں اَلْغِطَاء۔ پردہ اور جو بھی کسی شئے کو ڈھاپنے ہو۔ یہ فِعَالَة کے وزن پر آتا ہے جیسے عِمَامَة قِلَادَة عِصَابَة۔ اسی طرح صنعتوں کے اسماء ہیں جیسے خِيَاطَة (سلائی) قِصَارَة اور صِيَاغَة وغیرہ۔

اسی طرح جس شئے پر غلبہ حاصل ہو جائے وہ بھی فِعَالَة کے وزن پر آتا ہے جیسے اِمَارَة، خِلَافَة وغیرہ

اَلْفُؤَادُ قلب کی جگہ ہے اور صدر (سینہ) فواد کا مقام ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ (سورۂ ہود، آیت ۱۲۰)

اور فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (سورۂ انشراح، آیت ۱)

دونوں مقامات پر قلب مراد ہے۔ کبھی قلب سے اس کے مقام کو تعبیر کیا جاتا ہے۔

عَذَاب، درد و الم کے استمرار یعنی مسلسل ہونے کو کہتے ہیں۔

عَظِیْم کے معنی ہیں کبیر، بڑا۔ کہا جاتا ہے: هُوَ عَظِيْمُ الْجُثَّة۔ وہ بڑے جسم والا بڑا ہے اور هو عَظِيْمُ الشَّأْن وہ بڑی شان والا ہے۔ دوسرے مفہوم کی بنیاد پر اللہ کو عظیم کہا جاتا ہے اور اللہ کی عظمت اس کی کبریائی ہے۔

تفسیر:

خدا نے مہر لگا دی ہے

خَتَمَ کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں:

اول: ختم سے علامت مراد ہے۔ جب کافر اپنے کفر کی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ جان لیتا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائے گا تو اس کے قلب پر علامت لگا دیتا ہے۔ کہا گیا ہے: یہ ایک سیاہ نکتہ ہے جسے فرشتے دیکھتے ہیں جس سے وہ جان لیتے ہیں کہ وہ اس کے بعد ایمان نہیں لائے گا، وہ اس کی مذمت کرتے اور اس کے لیے بددعا کرتے ہیں۔ جس طرح خداوند عالم مومن کے قلب پر ایمان لکھ دیتا ہے، اس پر علامت لگا دیتا ہے جسے ملائکہ جان لیتے ہیں کہ یہ مومن ہے پس اس کی تعریف اور اس کے حق میں دعا کرتے ہیں، اس طرح کافر کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اس پر علامت لگا دی جاتی ہے جس سے فرشتے اس کے کفر کو جان لیتے ہیں۔ اسی طرح مومنین کے دلوں پر نشانی لگا دی جاتی ہے جس سے ملائکہ سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح (نامۂ اعمال) کے دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی تفسیر کی گئی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ نامۂ اعمال جس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ جنتی ہے اور بائیں ہاتھ والا جہنمی ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ۔

(بلکہ اللہ نے ان کی باطل پرستی کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے) (سورۂ نساء: آیت ۱۵۵)

اس میں دو احتمال ہیں:

(ایک) کفر کی سزا کے طور پر اس پر مہر لگا دی گئی ہے۔

(دو) کافروں کے کفر کی وجہ سے مہر لگا دی گئی ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: مٹی سے مہر لگا دی اور موم کے ذریعہ اسے سیل کر دیا۔

دوم: دلوں پر مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم اس پر گواہ ہے اور وہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ حق قبول نہیں کریں گے۔

سوم: اس سے یہ مراد ہے کہ خدا نے ان کی مذمت فرمائی ہے جو ان پر مُہر لگانے کے مانند ہے جن میں نہ تو ایمان داخل ہو گا نہ ہی ان سے کفر باہر نکلے گا جیسا کہ ارشاد ہے: صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ۔

یعنی کفران کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے گویا کہ ان پر مہر لگا دی گئی ہے اور وہ اس منزل کو پہنچ چکے ہیں نہ سمجھ پا رہے ہیں نہ دیکھ رہے ہیں نہ ہی سن رہے ہیں۔ یہ تفسیر اصم اور ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے۔

چہارم: اللہ تعالیٰ نے اس کی توصیف کی ہے کہ جس نے اس کلام سے اس کی مذمت کی ہے کہ اس کا دل نظر و استدلال سے تنگ ہو گیا ہے اس لئے کہ اسے کشادہ نہیں کیا۔ یہ آیت اس ارشاد الٰہی کے برعکس ہے جس میں آیا ہے کہ:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ (سورۂ زمر: آیت ۲۲)

(کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کے نور پر گامزن ہے (وہ سنگ دل کافر کی مانند ہو سکتا ہے؟)

یہ ارشاد کہ: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۸۸)

(اور وہ کہتے ہیں ہمارے دل پر غلاف چڑھا ہوا ہے)

نیز وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ۔ (سورۂ فصلت، آیت ۵)

(اور انھوں نے کہا ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے)

ان آیات سے تقویت حاصل ہوتی ہے کہ قلب پر مہر لگایا جانا کم فہمی کے باعث ہے۔ فرمایا: ''بلکہ خداوند عالم نے ان کے دل پر ان کے کفر کے باعث مہر لگا دی ہے ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم'' ارشاد ہوا: ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے بس یہ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ اس چیز کو اللہ کا یہ ارشاد بیان فرما رہا ہے:

قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ۔ (سورۂ انعام: آیت ۴۶)

((اے محمدؐ!) آپ ان کافروں سے پوچھئے کہ کبھی تم نے سوچا ہے اگر اللہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں چھین لے اور تمھارے دلوں پر مہر لگا دے تو خدا کے سوا کون ایسا معبود ہے جو تم کو یہ نعمتیں واپس کر دے، دیکھو ہم کس طرح اپنی نشانیاں بار بار ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ پھر بھی ان سے روگردانی کرتے ہیں)

مہر لگانے کا ذکر سماعت اور بصارت سے ہٹا کر قلب سے متعلق کیا گیا ہے جو اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ قلب پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اب اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا جس میں وہ اس کا محتاج ہے، اسی طرح سماعت اور بصارت سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا: ان میں تنگی پیدا ہو گئی ہے اس میں وہ وسعت نہیں

ہے جس میں نظر و استدلال کی ضرورت ہوتی ہے جو حق و باطل کے درمیان فرق کر سکے یہ اسی طرح ہے جیسا کہ کسی بزدل کے لیے کہا جاتا ہے: "اس کے پاس دل نہیں ہے" جب اس کی بزدلی میں مبالغہ کیا جاتا ہے اس لیے کہ شجاعت کا محل و مقام دل ہے۔

جس طرح بزدل کی صفت بیان کی گئی ہے کہ اس کے قلب نہیں ہے اسی طرح حجت قایم ہونے کے بعد کہا گیا کہ ان پر مہر لگا دی گئی ہے، ان کا دل تنگ ہو گیا ہے، ان کا دل غلاف کے اندر ہے۔ یہ شیخ ابو علی الفارسی کا کلام ہے خداوند عالم نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے (ان کے دلوں پر) مہر لگا دی۔

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ ان اعضا دل، کان اور آنکھ ہی کا کیوں خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے؟

جواب: بیان کیا گیا ہے کہ یہ علم کی راہیں ہیں: قلب علم کا مقام ہے، اسی طرح سماعت اور رویت (کان اور آنکھیں) حصول علم کا ذریعہ اور راستہ ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

انسانوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر، حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔

الفاظ و معانی:

ناس و بشر اور انس ایک جیسے ہیں جو کہ جاندار کی ایک جماعت ہے جو انسانی شکل و صورت کے ذریعہ تمیز پاتی ہے اس کی اصل انس سے اناس ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: نَاس، نُوس سے مشتق ہے جس کے معنی حرکت کے ہیں۔ جس کی تصغیر نُوَیس ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظہور سے لیا گیا ہے پس ناس و انسان اس کے ظہور اور آنکھوں کے دیکھنے کے سبب کہا گیا ہے اس طرح کہا جاتا ہے: آنَسْتُ بِبَصَرِيْ شَيْئاً میں نے اپنی آنکھ سے ایک چیز دیکھی۔ خداوند عالم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے: اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا۔ (سورۂ طٰہ، آیت ۱۰) (میں نے آگ دیکھی ہے) انسان واحد ہے، الناس اس کی جمع ہے جو اس کے لفظ سے نہیں ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ نِسۡیَان سے مشتق ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا۔
(سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۵) (جسے وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں عزم نہیں پایا)

لفظ انسان کی اصل اِنۡسِیَان ہے چنانچہ اس کی تحقیر و تصغیر میں اُنَیۡسِیَان کہا جاتا ہے اور اسے اسکی اصل کی طرف پلٹا دیا جاتا ہے۔

اَلۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (یعنی آخری دن) روز قیامت ہے۔ آخر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد اس کے علاوہ کوئی دن نہیں ہے حالانکہ اس کے بعد کوئی رات بھی نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ روز قیامت چونکہ دنیا کے ایام کے بعد ہے۔

ترکیب:

مَن یَّقُوۡلُ موصول وصلہ ہے اور مَن مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر یا ظرف (یعنی خبر) ہونے کی بنا پر۔ جیسا کہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ :

یہ جملہ ہے کہ جس کا تعلق یَقُوۡلُ سے ہے مَا حرف شبیہ لَیۡسَ ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ مبتدا و خبر پر داخل ہوتا ہے جس طرح لَیۡسَ ان دونوں پر داخل ہوتا ہے اس میں بھی حال کی نفی ہے جس طرح لیس میں ہے۔ پس مَا اہل حجاز کے قول کے مطابق عمل میں لَیۡسَ کے مانند ہے جیسا کہ قرآن میں بھی آیا ہے۔

هُمۡ مرفوع ہے اس لئے کہ مَا کا اسم ہے اور بِمُؤۡمِنِیۡنَ میں باء زائدہ ہے نفی کی تاکید کی خاطر آیا ہے وہ حرف جر ہے۔

مُؤۡمِنِیۡنَ حرف جر کی وجہ سے مجرور ہے۔

بِمُؤۡمِنِیۡنَ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ مَا کی خبر ہے۔ لفظ مَنۡ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر و مؤنث سب کے لئے آتا ہے اور اسی لئے معنی کے لحاظ سے جمع مذکر کی ضمیر اس کی جانب پلٹی ہے۔ جبکہ فرزدق کا شعر ہے:

تَعَالِ فَاِنۡ عَاهَدۡتَنِیۡ لَا تَخُوۡنُنِیۡ نَکُنۡ مِثۡلَ مَنۡ یَّا ذِئۡبُ یَصۡطَحِبَانِ

آؤ کہ اگر تم نے مجھ سے عہد و پیمان کیا کہ میرے ساتھ خیانت نہیں کرو گے تو اے بھیڑئے ہم تیرے دوست ساتھیوں کے مانند ہو جائیں گے۔

یہاں پر شاعر نے معنی کے لحاظ سے مَنۡ کی طرف پلٹنے والی ضمیر کو تثنیہ بنا دیا ہے۔

شانِ نزول:

یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو عبداللہ بن ابی بن سلول اور جد بن قیس، متعب بن قشیر اور ان کے احباب و اصدقاء ہیں جن میں سے بیشتر یہودی تھے۔

تفسیر:

دعوائے ایمان والے بے ایمان

اس آیت میں خداوند عالم نے منافقین کی حالت بیان فرمائی ہے، اللہ نے ان کی بابت مطلع فرمایا کہ وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کی تصدیق اور جو کچھ اللہ کے رسولؐ پر قیامت کے متعلق نازل ہوا ہے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ منافقین کلمۂ ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کا ارادہ مسلمانوں کے رازوں سے واقف ہو کر انھیں کفار کو بتانا ہوتا تھا یا وہ رسول کو ان سے نزدیک کرنا چاہتے تھے جس طرح پیغمبرؐ سے مسلمان نزدیک تھے۔ پھر خدا نے ان سے ایمان کی نفی فرمائی ارشاد ہوا: وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (یہ مومنین نہیں ہیں) آیت میں ان کی تکذیب کی گئی ہے جس میں انھوں نے اپنے ایمان اور روز قیامت کے اقرار و اعتقاد کی خبر دی تھی۔

وضاحت کی گئی ہے کہ جس چیز کو وہ اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں ان کے دلوں میں موجود (عقیدہ) کے خلاف ہے۔ یہ بات اس قول کے غلط اور فاسد ہونے پر دلیل ہے جو کہتا ہے ایمان محض قول کا نام ہے۔

❀❀❀❀❀

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾

وہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ دھوکے بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

قرائت:

نافع، ابن کثیر، ابوعمرو نے وَمَا يُخٰدِعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے وَمَا يَخْدَعُوْنَ پڑھا ہے

حجت:

جن لوگوں نے یَخۡدَعُوۡنَ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہاں پر فعل فاعل سے زیادہ سزاوار ہے جو زیادہ تر فاعلین کی جانب سے ہوتا ہے اور اس پر یہ دوسری آیت دلالت کرتی ہے: یُخَادِعُوۡنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمۡ۔

جن قراء نے یُخَادِعُوۡنَ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کے ذہن میں جو دھوکہ بازی آ رہی ہے اسے دوسروں کے ذہن میں ڈال دے جو اسے اس بات کی سزا دے گا اور اس کے دھوکا بدلہ دے گا۔ ایسی صورت میں فعل گویا دو آدمی کی طرف ہے پس لازم ہے کہ فاعل اس طرح کہے جیسے کمیت نے کہا ہے، حمار کو ذکر کیا ہے اور اس کے وارد ہونے کا ارادہ کیا ہے۔

تُذَكِّرُ مِنۡ أَنَّى وَمِنۡ أَيۡنَ شُرۡبُهٗ يُؤَامِرُ نُفۡسَيۡهِ كَذِى الۡهَجۡمَةِ الۡإِبِلِ

شاعر نے اس پانی میں اترنے یا نہ اترنے کو ورود قرار دیا ہے اور ان دونوں کے درمیان تمثیل دو نفس کے مانند ہے۔

الفاظ و معانی:

خَدۡع لغوی معنی پوشیدگی اور ابہام ہیں حق کے برخلاف۔

نفس کے تین اقسام ہیں: ۱۔ نفس روح کے معنی میں، ۲۔ نفس تاکید کے معنی میں (جس طرح آپ کہیں: جَاءَنِي زَيۡدٌ نَفۡسُهٗ۔ میرے پاس زید بنفس نفیس آیا)

۳۔ نفس بمعنی ذات۔ یہی اصل ہے، کہا گیا ہے نفس روح کے علاوہ ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ دو لفظ ہیں ایک معنی میں۔

يَشۡعُرُوۡنَ یعنی يَعۡلَمُوۡنَ شِعۡر کے لغوی معنی کسی چیز کے احساس کرنے کے ہیں اس میں غور و فکر کرنے کی وجہ سے۔

ترکیب:

یُخَادِعُوۡنَ: فعل، فاعل اور نون علامت رفع ہے۔ اور جملہ محلاً منصوب، حال ہے اور ذوالحال وہ ضمیر ہے جو آمَنَّا میں ہے اور مَنۡ کی جانب پلٹ رہی ہے۔

لفظِ جلالۃ اللہَ. یُخٰدِعُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، معطوف ہے۔ مَا نافیہ ہے،
اِلَّا مثبت ہے۔

اَنْفُسَهُمْ منصوب ہے اس لئے کہ یُخٰدِعُوْنَ دوم کا مفعول بہ ہے۔ مَا حرف نفی ہے۔

یَشْعُرُوْنَ: فعل، فاعل ہے اور جہاں کہیں بھی اِلَّا نفی کے بعد آئے تو وہ مثبت ہے اور نفی کو توڑ رہا ہے۔

تفسیر:

اپنے آپ کو دھوکا دینے والے

یُخٰدِعُوْنَ اللہَ یعنی فریبیوں جیسے عمل انجام دیتے ہیں اس لیے کہ خدا کی ذات کے لیے کہنا کہ اسے فریب دیتے ہیں درست نہیں ہے کہ وہ انھیں جانتا اور پہچانتا ہے۔ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ معنی بھی بیان کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے رسول کو فریب اور دھوکہ دیتے ہیں اس لیے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور رسول کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے، مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔ یہ اللہ کے اس ارشاد کی مانند ہے:

وَاِنْ یُّرِیْدُوْا اَنْ یُّخْدِعُوْكَ. (سورۂ انفال، آیت ۶۲)

مُفَاعَلَہ کبھی ایک کی جانب سے بھی واقع ہوتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: عَافَاہُ اللہُ۔ اللہ اسے شفا و عافیت عطا کرے۔ اسی طرح یُخٰدِعُوْنَ ہے جس کے معنی ہیں: اپنے دل میں موجود چیز کے علاوہ اظہار کرتے ہیں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ یعنی اپنی باتوں کے ذریعہ مومنین کو فریب دیتے ہیں۔ جب انھیں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں۔ جب کہ وہ مومنین میں سے نہیں ہیں یا جب ان کے ساتھ نشست و برخواست کرتے یا ان سے ملتے جلتے ہوتے ہیں تا کہ انھیں ان کے راز کی باتیں معلوم ہوں اور انھیں ان کے دشمنوں تک منتقل کر دیں۔

وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ یعنی اگر چہ یہ لوگ بظاہر مومنین کو دھوکہ دے رہے ہیں جب کہ یہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اس لیے کہ یہ لوگ اس چیز کا اظہار کرتے ہیں جو ان کی خواہش و تمنا ہے وہ پوری کی جا رہی ہے حالانکہ ان کے اس عمل کے ذریعہ ان پر عذاب شدید نازل ہو رہا ہے، اس طرح ان کے فریب کا وبال و عذاب انھیں کی جانب پلٹ رہا ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ. یعنی انھیں معلوم نہیں ہے کہ عذاب ان کی جانب پلٹ رہا ہے۔ وہ درحقیقت اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں جس طرح کوئی شخص کسی کو قتل کردے پھر خود اسے قتل کیا جائے تو اس کے لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فلاں شخص کے قاتل نے خود کو قتل کرلیا۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ. آیت کا یہ فقرہ اصحاب معارف کے قول کے بطلان پر دلالت کر رہا ہے اس لیے کہ اللہ نے ان کے نفاق سے باخبر کیا ہے یہ کہ وہ اس بات سے بے خبر ہیں۔

❁❁❁❁❁

فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾
ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ اللہ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے کیوں کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

قرائت:

ابن عامر اور حمزہ نے فَزَادَهُمُ اللّٰهُ میں زاء کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح شَآءَ اور جَآءَ کو بھی۔
اہل کوفہ نے يَكْذِبُوْنَ، یاء کو زبر کے ساتھ اور تشدید کے بغیر پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے يُكَذِّبُوْنَ پڑھا ہے۔

حجت:

جنھوں نے زَادَ کے الف میں امالہ کیا ہے ان کا مقصد امالہ کے ذریعہ یہ بتانا ہے کہ عین الفعل دراصل یاء ہے جس طرح انھوں نے اَعْيُن اور اَبْيَض کی جمع عَيْن اور بِيض میں ضمہ کو کسرہ سے بدلا ہے تاکہ یاء اپنی جگہ باقی رہے اور واؤ سے نہ بدلے۔

جن لوگوں نے يَكْذِبُوْنَ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ کلمہ کے قبل و بعد سے زیادہ مشابہ ہے اس لئے کہ ان کا یہ کہنا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے یہ ان کا جھوٹ ہے تو ان کے لئے ان کے جھوٹ کی وجہ سے عذاب الیم ہے۔

مَا اور اس کا صلہ: بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ مصدر کے معنی میں ہے اور بعد کی آیت میں کہ جب وہ اپنے شیاطین کے پاس جاتے ہیں تو ان کا یہ کہنا کہ اِنَّا مَعَکُمْ ہم تمہارے ساتھ ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دعوئے ایمان میں جھوٹے ہیں۔ جب یہ آیت قبل و بعد کی آیات سے زیادہ مشابہ ہے تو یُکَذِّبُوْنَ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل: وَلَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُلٌ، وَاِنْ کَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ، وَاِنْ یُّکَذِّبُوْكَ فَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ وغیرہ جیسی آیات ہیں۔

تکذیب میں کذب سے زیادہ شدت ہے اس لئے کہ ہر وہ شخص جو کسی صادق اور سچے آدمی کو جھٹلاتا ہے تو وہ جھوٹا ہے اور ہر جھوٹ بولنے والا مکذب نہیں ہوتا ہے۔ گویا خدا نے اس طرح فرمایا: وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِتَکْذِیْبِهِمْ۔

یُکَذِّبُوْنَ پر کَانَ داخل کیا ہے تا کہ اس بات کی جانب رہنمائی کرے کہ یہ کام ماضی میں انجام پا رہا تھا۔

الفاظ و معانی:

مَرَض جسم کی بیماری ہے جس کی نقیض (ضد) صحت ہے اور کذب صدق کی ضد ہے یعنی کسی شئے کے بارے میں ایسی خبریں دینا جو اس میں نہ ہو۔ کذب بات کی ایک قسم ہے جس کا تعلق نطق یعنی بولنے سے ہے۔

تفسیر:

بیمار دل

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اس آیت میں مرض سے مراد شک اور نفاق ہے؛ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دین میں شک کو مرض کہا گیا ہے اس لیے کہ مرض اعتدال سے خارج ہونے کا نام ہے۔ جسم کو جب تک کوئی پریشانی اور بیماری عارض نہیں ہوتی تو وہ صحیح و سالم رہتا ہے، اسی طرح قلب کو جب تک شک جیسی کوئی آفت و بیماری لاحق نہیں ہوتی درست اور صحیح رہتا ہے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ مرض کے اصل معنی فتور اور کمزوری کے ہیں۔ قلب کی بیماری اس کا حق کے تئیں کمزور ہونا ہے؛ جس طرح جسم کی بیماری اور مرض اعضاء کی کمزوری ہے۔ آیت کا مطلب ہے کہ ان کے دلوں کے اعتقاد میں جس کا وہ اللہ و رسول کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں مرض یعنی شک ہے۔ یہاں مضاف کو حذف

کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ اس کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں:

اول: جب اللہ نے آیات اور دلیلوں کے ذریعہ بیان میں اضافہ فرمایا تو ان کے شک میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا مگر یہ کہ جب یہ چیز اللہ کے فعل سے حاصل ہوئی ہے لہٰذا اس کی نسبت اسی کی جانب دی گئی۔ جیسا کہ جناب نوحؑ کے واقعہ میں اللہ کا ارشاد ہے:

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآئِيْۤ اِلَّا فِرَارًا۔ (سورۂ نوح: آیت ۶)

(میرے بلانے پر ان کے فرار میں اضافہ ہوتا چلا گیا)

جب جناب نوحؑ کے بلانے سے ان کے فرار میں اضافہ ہوا تو اس کی نسبت انھیں کی جانب دی گئی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۲۵)

(لیکن جن دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے تو ان کے سابقہ رجس نے ایک اور رجس کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ مرتے دم تک حالت کفر ہی میں مبتلا رہے)

آیات ان کے رجس میں اضافہ نہیں کرتیں ہیں بلکہ ان کے مرض کے باعث ان کے عذاب میں اضافہ ہوتا ہے۔

دوم: ابوعلی الجبائی نے بیان کیا ہے کہ اس سے منافقین کے دلوں کا غم مراد ہے۔ جب پیغمبرؐ مدینہ وارد ہوئے اور آپؐ کو اس میں اقتدار حاصل ہوا اور مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوا؛ جس قدر پیغمبرؐ کو قدرت اور قوت حاصل ہوتی گئی اللہ منافقین کے رنج وغم کو بڑھاتا گیا اللہ نے اسی طرح حضورؐ کی تائید ونصرت فرمائی۔

سوم: سُدی نے بیان کیا ہے: اللہ سے دشمنی و عداوت کے سبب ان کے مرض میں اضافہ ہو گیا۔ یہ (معنی) مضاف کے حذف ہونے کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (سورۂ زمر، آیت ۲۲)

(لہٰذا تباہی ہے ان کے لیے جن کے دل ذکر خدا کے لیے سخت ہو گئے ہیں)

یعنی ذکر خدا ترک کرنے کے باعث ان کے قلوب سخت ہو گئے ہیں۔

چہارم: ان کے دلوں میں حزن ہے قرآن مجید کے نازل ہونے کی وجہ سے جو ان کی فضیحتوں (رسوائیوں) اور ذلتوں کو بیان کر رہا ہے۔

اس سے مراد ان کے قلوب کا مغموم ومحزون ہونا ہے۔قرآن کے نازل ہونے کے بعد ان کے رسوا اور ذلیل ہونے سے اللہ نے ان کے مرض میں اضافہ کر دیا یعنی ان کی برائیوں کی وجہ سے ان کے انسانی خبائث اور بدباطنی کے اظہار میں اضافہ ہوگیا۔غم کو مرض کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے سینہ تنگ ہو جاتا ہے جس طرح مرض سے سینہ تنگ ہو جاتا ہے۔

پنجم: ابو مسلم اصفہانی نے بیان کیا ہے: یہ ان کے لیے بددعا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. (سورۂ توبہ، آیت ۱۲۷)

(پھر وہ وہاں سے کھسک گئے اللہ نے ان کے دلوں کو پلٹا دیا ہے کیوں کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں)

گویا یہ ان کے لیے بددعا ہے، اللہ نے انھیں یوں ہی (ان کے حال پر) چھوڑ دیا ہے۔ان کی توفیق میں اضافہ نہیں فرمائے گا، نہ ہی ان پر لطف ومہربانی کرے گا جس طرح اس نے مومنین پر مہربانی فرمائی ہے۔ یہ آیت منافقوں کے لیے ذلت ورسوائی ہے، یہ درحقیقت اللہ کی جانب سے ان کی رسوائی کی خبریں ہیں اگرچہ یہ ان کے لیے بددعا کے انداز میں ہیں۔ پھر ارشاد ہوا: وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے جو آتش جہنم کا عذاب ہے جسے وہ جھٹلاتے تھے یعنی اللہ ورسول کی تکذیب کرتے تھے، جس دین کو رسول لے کر آئے تھے یا اپنے اس قول کی تکذیب کرتے تھے:

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۰)

(ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر)

❁❁❁❁❁

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو وہ کہتے ہیں، ہم تو اصلاح کر رہے ہیں۔خبردار! یہی لوگ فسادی ہیں مگر انھیں شعور نہیں۔

قرائت:

کسائی نے قُیل، غُیض، سُیء، سُئیت، حُیل، سُیق، جُیء، ان سب کے پہلے حرف کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعقوب سے بھی اسی بات کی روایت کی گئی ہے۔

نافع نے صرف سُیءَ اور سُیئت میں کسائی اور یعقوب کی موافقت کی ہے۔

ابن عامر نے ان دونوں میں اور حُیل اور سُیق میں ان دونوں کی موافقت کی ہے اور بقیہ قراء نے سارے کلمات کے پہلے حرف کو زیر دیا ہے۔

حجت:

مذکورہ تمام کلمات میں تین لغات (تلفظ) ہیں: (۱) زیر (۲) پیش کو اشمام کے ساتھ (۳) واؤ کے ساتھ۔

قِیلَ زیر کے ساتھ اس لئے ہے کہ عین الفعل کی حرکت کو فاء کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ قِیلَ کی اصل قُوِلَ ہے پھر واؤ کو یاء سے بدل دیا گیا اس لئے واؤ ساکن اور اس سے پہلے زیر تھا اور یہ رائج قیاس و قاعدہ ہے ہر اس کلمہ میں جس کے عین الفعل میں اعلال ہوا ہو۔ اشمام تخفیف کے ساتھ اصل پر دلالت کی خاطر ہے۔

الفاظ و معانی:

اِفْسَاد کے معنی ہیں فساد برپا کرنا۔ ہر وہ صورت جو حالت استقامت میں تبدیلی پیدا کر دے اسے فساد کہتے ہیں۔ صلاح فساد کی ضد ہے۔

اَلْاَرْض حیوان (جاندار) کی قرارگاہ ہے، گھوڑے کے پاؤں کو آرْض کہا جاتا ہے۔ (اس لیے کہ گھوڑا اس پر کھڑا ہوتا اور قیام کرتا ہے)

ترکیب

لفظ اِذَا وقت کے لئے وضع ہوا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ وقت ظرف زمانی ہو اور اس میں شرط کے معنی ہیں۔ اِذَا میں اس کا جواب عمل کرتا ہے۔ اس آیت میں لفظ اِذَا محلاً منصوب ہے اس لئے کہ وہ ظرف (مفعول فیہ)

ہے۔علماء نحو نے کہا ہے: اس لئے کہ جواب ہے لہٰذا اس میں قِيْلَ لَهُمْ کا عمل کرنا جائز و صحیح نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اِذَا در حقیقت قِيْلَ کی جانب مضاف ہے اور مضاف الیہ مضاف میں عمل نہیں کرتا ہے۔

اسی طرح ارشاد الٰہی: وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا بھی ہے۔

لفظ اِذَا مبنی ہے اس لئے کہ اس میں فِي کے معنی پائے جاتے ہیں اور یہی معنی اس کے لئے لازم ہے۔

کبھی کبھی اِذَا ظرف مکانی بھی ہوتا ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: خَرَجْتُ فَاِذَا النَّاسُ وُقُوْفٌ؛ یعنی میں ایسی جگہ نکلا کہ جہاں لوگ کھڑے تھے۔

اس مثال میں وُقُوْفاً بھی کہہ سکتے ہیں حال کی بنا پر۔اس لئے کہ ظرف، مکان اور جثہ کی خبر واقع ہوسکتا ہے۔قِيْلَ مبنی بر فتح ہے اسی طرح ہر فعل ماضی مبنی بر فتح ہوتا ہے۔

لَا ،حرف نہی ہے وہ فعل میں جزم کا عمل کرتا ہے۔

تُفْسِدُوْا، لَا کی وجہ سے مجزوم ہے اور علامت جزم نون کا ساقط ہونا ہے۔واؤ ضمیر فاعل ہے۔

اِنَّمَا میں حرف مَا کافہ ہے کہ اس نے اِنَّ کو عمل کرنے سے روک دیا ہے پس مَا کے بعد والے کلمات اپنی اصل کی طرف پلٹ آئے کہ وہ مبتدا اور خبر بن گئے اور وہ ان لوگوں کا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کہنا ہے۔نَحْنُ مبتدا اور مُصْلِحُوْنَ اس کی خبر ہے اور جملہ: اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ، قَالُوْا کی وجہ سے محلاً منصوب ہے۔جیسے آپ کا یہ کہنا: قُلْتُ حَقّاً اَوْ بَاطِلاً (قُلْتُ فعل وفاعل حَقّاً مفعول بہ)

نَحْنُ مبنی ہے اس لئے کہ وہ حروف سے مشابہ ہے اور مبنی بر ضم ہے اس لئے کہ وہ رفع کی ضمیروں میں سے ہے اور ضمہ علامت رفع ہے۔کہ نَحْنُ ضمیر جمع ہے اور ضمہ واؤ کا ایک حصہ ہے اور واؤ ضَارِبُوْنَ وَ يَضْرِبُوْنَ میں علامت جمع ہے۔

ارشاد الٰہی: لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ؛ جملہ، محلاً مرفوع ہے جب یہ فرض کیا جائے کہ: قِيْلَ لَهُمْ شَيْءٌ، تو جملہ نائب فاعل ہوگا۔

اَلَا حرف تنبیہ وافتتاح کلام ہے ہر اس کلام پر داخل ہوتا ہے جو اپنے آپ پر کفایت کرلے جیسے اس کا یہ کہنا: اَلَا اِنَّهُمْ مِنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ. اَلَا کی اصل لَا ہے اس پر ہمزۂ استفہام داخل ہوگیا ہے اور جب جحد (نفی) پر ہمزۂ استفہام داخل ہوتا ہے تو اسے تقریر و تحقیق کے معنی میں کردیتا ہے جیسے یہ ارشاد الٰہی: اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى، اس لئے کہ جواب دینے والے کے لئے جائز نہیں ہے سوائے

یہ کہ بلٰی کے ذریعہ اقرار کرے۔

اِنَّهُمْ میں هُمْ محلاً منصوب ہے اِنَّ کی وجہ سے دوسرا هُمْ ممکن ہے کہ ضمیر فصل ہو جیسا کہ اس سے پہلے اس کی تفسیر بیان کی گئی اور ممکن ہے کہ مبتدا ہو۔ اَلْمُفْسِدُوْنَ اس کی خبر ہو اور پورا جملہ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ اِنَّ کی خبر ہو۔ دوسرے والے هُمْ کے میم کو ضمہ دینا التقائے ساکنین کی بنا پر ہے۔ کہ اسے اصل کی طرف پلٹا دیا ہے۔

شانِ نزول:

یہ آیت ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے بارے میں گذشتہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے فرمایا: اس صفت کے اہل (حامل افراد) بعد میں نہیں آئیں گے۔ پہلے قول کا نظم کلام مقتضی ہے اور یہ بھی ممکن ہے بعد میں آنے والوں کی شکل وصورت سے منافقین کی شکل وصورت مراد ہو۔ پس جناب سلمان کے قول کو اس بات پر حمل کیا جائے گا کہ ان منافقین کہ آیت جن کو شامل ہے کے خاتمہ کے بعد کا ارادہ کیا ہے۔

تفسیر:

اصلاح کے نام پر افساد

جب منافقین سے کہا جاتا ہے گناہوں کے انجام دینے اور لوگوں کو ایمان سے روک کر زمین پر فساد نہ کرو۔ اس کی روایت ابن عباس سے کی گئی ہے۔ یا کافروں کی مدد کر کے کہ اس میں اسلام کی توہین ہے جیسا کہ ابوعلی نے کہا ہے۔ یا قوم وملت میں تغییر اور کتاب میں تحریف کے ذریعہ (زمین پر فساد برپا نہ کرو) جیسا کہ ضحاک نے کہا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں: اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۔ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ اس میں دو احتمالات پائے جاتے ہیں:

اول: جسے وہ لوگ فساد کہتے ہیں، وہ تو ہمارے نزدیک صلاح، درستی اور موافقت ہے۔ یہ عمل ہم اس لیے کرتے ہیں تاکہ فریقین تسلیم کرلیں۔

دوم: انھوں نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نہ تو معصیت انجام دیتے ہیں نہ ہی کفار کی مدد کرتے ہیں نہ ہی قرآن میں تحریف کرنے والے ہیں یہی ان کا نفاق تھا جیسا کہ وہ کہتے ہیں اٰمَنَّا بِاللّٰهِ

حالانکہ ایمان نہیں لائے ہیں۔ پھر فرمایا:

اَلَآ اِنَّهُمْ. جان لو کہ یہ تمام منافقین جو فساد کو صلاح قرار دے رہے ہیں: هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ۔ (در حقیقت وہی فسادی ہے۔) یہ اللہ کی طرف سے منافقین کی تکذیب ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ. لیکن یہ لوگ نہیں جانتے جو کر رہے ہیں وہ فساد ہے نہ کہ صلاح۔ اگر یہ جان لیتے تو ان سے صلاح کی امید کی جاتی۔

یہ بھی کہا گیا ہے وہ نہیں جانتے کہ وہ عذاب کے حق دار بن رہے ہیں۔ یہ آیت فلسفیوں کے نظریہ کا بطلان ہے۔ اس کا ارشاد ہے: لَا يَعْلَمُوْنَ (وہ نہیں جانتے) کس بنا پر انہیں مکلف قرار دینا جائز ہے اگرچہ انھیں گمراہی پر ہونے کا شعور نہیں ہے اس لیے کہ ان کے پاس اس ذریعے سے علم رسانی کا راستہ موجود ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾
اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ تم اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہنے لگے کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ درحقیقت یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن یہ جانتے نہیں۔

قرائت:

السُّفَهَآءُ اِلَّا: اہل کوفہ اور ابن عامر نے دونوں ہمزہ کو باقی رکھا ہے اور ابو عمرو، اہل حجاز نے پہلے ہمزہ کو پڑھا ہے اور دوسرے کو حرف لین میں بدل دیا ہے۔ اسی طرح دو کلمہ کے دونوں مختلف ہمزے کو۔ ہم نے اس کی وجہ بیان کی جہاں ہم نے ایک ہی کلمہ ءَاَنْذَرْتَهُمْ میں دو ہمزوں کے جمع ہونے کا ذکر کیا تھا۔

الفاظ و معانی:

سُفَهَآء جمع ہے سَفِيْه کی، ضعیف الرای، نفع اور نقصان کے مواقع کی کم معلومات رکھنے والے کو سفیہ کہتے ہیں۔ اسی لیے خداوند عالم نے بچوں اور عورتوں کو سفہاء کہا ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا۔ (سورۂ نساء، آیت ۵)

(اور اپنا وہ مال جس پر تمھاری گزر اوقات موقوف ہے اسے نادان لوگوں کے حوالے نہ کردو)

قُطْرُبْ نے کہا ہے: نہایت جلد باز ظالم اور حق کے خلاف بولنے والے کو سفیہ کہتے ہیں۔ مؤرج نے کہا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کے خلاف بہت زیادہ جھوٹے اور بہتان اور افترا کرنے والے کو سفیہ کہتے ہیں۔

وَقَدْ جَآءَ فِي الْخَبَرِ اَنَّ شَارِبَ الْخَمْرِ سَفِيْهٌ۔ حدیث میں آیا ہے کہ شراب پینے والا سفیہ ہوتا ہے۔

ترکیب

ارشاد الٰہی کَمَآ اٰمَنَ میں کاف محلاً منصوب ہے اس لئے کہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔

مَا اپنے صلہ کے ساتھ مصدر کے معنی میں ہے یعنی آمِنُوا مِثْلَ اِيْمَانِ النَّاسِ ۔ پس موصوف کو حذف کردیا اور صفت کو اس کا قائم مقام بنادیا۔

اَنُؤْمِنُ میں ہمزہ انکار کے لئے ہے حالانکہ ہمزہ کی اصل استفہام ہے اس کے مانند یہ آیت ہے:

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ ۔کیا ہم اسے کھلائیں کہ اللہ چاہتا تو اسے کھلاتا۔

اِذَا. قَالُو اَنُؤْمِنُ کا ظرف (مفعول فیہ) ہے اور اس سلسلہ میں گفتگو گذر چکی ہے۔

تفسیر:

صاحبان ایمان کو بے وقوف سمجھنے والے

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب منافقین سے کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جس چیز کو آپ پر نازل کیا گیا اس کی تصدیق کرو جس طرح ان کے اصحاب نے تصدیق کی ہے، بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح عبداللہ بن سلام نے تصدیق کی اور جو یہودی اس کے ہمراہ ایمان لائے انھوں نے کہا: کیا ہم جاہلوں کی طرح تصدیق کریں؟: پھر خدا نے انھیں جھٹلایا یا ان پر حکم نافذ کیا کہ درحقیقت وہی جہلا ہیں، جاہل کو سفیہ کہا گیا ہے اس لیے کہ وہ (چیز) کو ضائع کرتا ہے جبکہ سمجھتا ہے کہ اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ منافق بھی ایسا ہی ہے جو اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتا ہے جبکہ وہ گمان کرتا ہے کہ اس کی اطاعت کر رہا ہے، درحقیقت اس کا انکار کر رہا ہوتا ہے، جبکہ خیال کرتا ہے وہ کہ اس پر ایمان رکھے ہوئے ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَكُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾

اور جب یہ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے اور جب علاحدگی میں اپنے شیطانی ٹولے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تو تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو ان لوگوں سے مذاق کر رہے تھے۔

قرائت:

بعض قراء نے مُسْتَهْزِءُوْنَ میں ہمزہ کو ترک کر دیا ہے۔

اور ارشاد الٰہی: خَلَوْا اِلٰی اہل حجاز کی قرائت میں خَلَوِلیٰ ہے کہ انھوں نے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے اور اس کی حرکت کو اس سے پہلے موجود واؤ کو دے دیا ہے۔ اسی طرح اس کے مثل کلمات کے ساتھ بھی یہی ہے۔

باقی قراء نے واؤ کو ساکن اور ہمزہ کو باقی رکھا ہے۔

حجت:

سیبویہ نے کہا: ہمزۂ مضمومہ کہ اس سے پہلے کسرہ ہو تو جب آپ ہمزہ میں تخفیف کریں گے تو اسے بین بین قرار دیں گے۔ اسی طرح ہمزۂ مکسورہ کہ اس سے پہلے حرف مضموم ہو جیسے: مَرَّ تَعُ اِبِلِكَ تو اسے بھی بین بین قرار دیں گے۔

اخفش نے کہا ہے کہ مُسْتَهْزِءُوْنَ کے ہمزہ کو یاء سے بدل دیا جائے گا اور یہ قلب صحیح بھی ہے اس کسرہ کی وجہ سے جو اس سے پہلے ہے اور آپ اسے بین بین قرار نہیں دیں گے اور نہ ہی ہمزہ کے مضموم ہونے کی بنا پر اسے واؤ سے بدلیں گے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز بن جائے گی کہ جس کی نظیر نہیں ہے کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ واؤ مضموم ہے اور اس سے پہلے کسرہ ہے۔ ایسی حالت میں ہمزہ کو واؤ سے بدلنا ان کے نزدیک نامنظور ہے۔

الفاظ و معانی:

لقاء حجاب کی ضد ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی سے روبرو ہو یا اس کے سامنے ہو تو کہتے ہیں

کہ اس نے اس سے ملاقات کی۔ لِقاء کے لغوی معنیٰ مقاربت ونزدیکی کے عنوان سے کسی چیز کے ساتھ جمع اور اکٹھا ہونا ہے۔ کبھی بھی اجتماع نزدیکی کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔ خَلَاءٌ مَلَاءٌ کی ضد ہے۔

ترکیب:

اِنَّا دراصل اِنَّنَا تھا کئی نون کے جمع ہونے کی وجہ سے ایک نون کو حذف کر دیا اور جو حذف ہوا ہے وہ اِنَّ کا دوسرا نون ہے اس لئے کہ وہی نون ہے جو اس طرح کی آیت میں حذف ہوا ہے: وَإِنْ كُلٌّ لَمَّا جَمِيعٌ اور اسی طرح آیت اِنَّنِی مَعَکُمَا میں قاعدہ کے مطابق آیا ہے۔ مَعَکُمْ میں قاعدہ کے مطابق آیا ہے۔

مَعَکُمْ میں مَعَ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے جیسے: اَنَا خَلْفَکُمْ یعنی اَنَا مُسْتَقِرٌّ مَّعَکُمْ۔

مَعَ عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور شاعر عین کو ساکن کر سکتا ہے:

وَرِيْشِيْ مِنْكُمْ وَهَوَايَ مَعْكُمْ وَإِنْ كَانَتْ زِيَارَتُكُمْ لِمَامًا.

تفسیر:

دو چہرے والے

جب منافقین مومنین کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں: اٰمَنَّا، ہم نے تصدیق کی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی چیز کی جس طرح تم نے تصدیق کی ہے۔ لیکن جب وَإِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ اپنے شیاطین کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ شیاطین سے مراد کافروں کے رؤساء اور امراء ہیں۔ یہ ابن عباس کی روایت ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ یہودی تھے جنھوں نے منافقین کو تکذیب کرنے کا حکم دیا تھا۔ امام باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ شیاطین سے مراد یہودیوں کے کاہنین ہیں۔ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ہم تمھارے ساتھ یعنی تمھارے دین پر ہیں، ہم تو اصحاب محمدؐ کے ساتھ استہزا (ہنسی مذاق) کر رہے تھے اور [illegible] کہہ کر ان سے تمسخر کر رہے تھے۔

❁❁❁❁❁

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۵﴾

اللہ ان کے مذاق کا جواب دے رہا ہے، اور ان کی رسی دراز کیے جا رہا ہے اور وہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹک رہے ہیں۔

الفاظ و معانی:

مَدّ کے لغوی معنی کسی چیز میں زیادتی اور اضافہ کے ہیں۔ مَدّ جذب ہے چونکہ یہ طول میں زیادتی کا سبب ہے اور مادہ ہر چیز جو دوسرے کے بڑھنے کا سبب بنے۔

طُغْيَان طَغَى الْمَاءُ سے مشتق ہے یعنی پانی سر سے اونچا ہوا۔ سرکشی، جب حد سے تجاوز کر جائے۔

طَاغِيَة۔ سرکش اور دشمن خدا کو کہتے ہیں۔ عَمَسَة کے معنی حیران و ششدر ہونے کے ہیں۔

ترکیب:

يَعْمَهُونَ جملہ حال ہے (لہذا محلا منصوب ہے)

تفسیر:

خدا نے انھیں ڈھیل دے رکھی ہے

اس آیت کی تفسیر و تاویل میں چند صورتیں بیان کی گئی ہیں:

اول: اللہ کے استہزا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ ان کے استہزا (ہنسی اڑانے، مذاق کرنے) کا بدلہ دے گا۔

عرب عمل کی جزا کو اسی عمل کا نام دے دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس طرح ہے:

وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۴۰) (اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے)

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهٖ۔ (سورۂ نحل: آیت ۱۲۶) (اور اگر تم بدلہ لینا چاہو تو اتنا ہی جتنی تم پر زیادتی ہوئی ہے) یہ اس لیے صحیح ہے کہ جزا کا حکم مساوات پر ہونا چاہیے۔

دوم: اللہ کے استہزا (مذاق) کا مطلب اللہ کا انھیں کفر پر باقی رکھنا، انھیں غلطی اور جہالت پر چھوڑ دینا ہے ان کے گمراہی پر ڈٹے رہنے کے باعث۔

سوم: استہزا کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم انھیں ہلاکت کی طرف رفتہ رفتہ لے جارہا ہے جسے وہ نہیں جانتے۔ابن عباس سے (استدراج) کے معنی کی روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: جب بھی منافقین کوئی غلطی یا خطا کرتے ہیں تو خدا انھیں نعمت عطا کردیتا ہے، اس فعل کو اس لیے استہزا کا نام دیا گیا ہے، بظاہر یہ نعمت ہے لیکن حقیقت میں انھیں ہلاکت اور عذاب کی طرف لے جانا ہے کہ وہ اپنے گزشتہ کفر کے باعث اس کے مستحق ہو چکے تھے۔

چہارم: اللہ کے ان سے استہزا (مذاق) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے وہی کچھ قرار دیا گیا ہے جسے وہ ظاہر کرتے ہیں اہل ایمان کے احکام جیسے وراثت، نکاح کرنا اور دفن کیا جانا وغیرہ۔ اگرچہ ان کے نفاق کے سبب آخرت میں ان کے لیے شدید عذاب مقرر کیا ہے گویا اللہ ان سے استہزا کرنے والا ہے کہ ان کے لیے بظاہر مومنین جیسے احکام قرار دیے ہیں پھر انھیں آخرت میں مومنین سے جدا کردیا جائے گا۔

پنجم: ابن عباس بیان کرتے ہیں: منافقین جس وقت آتش جہنم میں ہوں گے ان کے لیے جنت کا در کھول دیا جائے گا جب وہ آتش جہنم سے اس کی جانب تیزی سے دوڑ کر آئیں گے اور جیسے ہی وہاں پہونچیں گے ان پر دروازہ بند کردیا جائے گا اور دوسری جگہ کھول دیا جائے گا وہ تیزی سے دوڑ کر اس طرف جائیں گے اور جیسے ہی وہاں پہونچیں گے پھر سے دروازہ بند کردیا جائے گا۔ یہ دیکھ کر مومنین ان پر ہنسیں گے۔ اسی لیے اللہ نے ارشاد فرمایا ہے:

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ۔ (سورۂ مطففین: آیت ۳۴) (تو آج کے دن مومنین کفار کی ہنسی اڑائیں گے)

یہ تمام صورتیں جن کا ہم نے اس آیت میں ذکر کیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں بھی ویسے ہی تفسیر کرنا صحیح ہے۔

(۱) وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ (سورۂ انفال: آیت ۳۰) (وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کررہا تھا)

(۲) اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ (سورۂ نساء: آیت ۱۴۲) (منافقین خدا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ انھیں دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے)

ارشاد الٰہی: وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ (اوران کی رسی کو دراز کیے جارہا ہے اور وہ اپنی

سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹک رہے ہیں) اس کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

اول: اس سے مراد مہلت ہے تاکہ وہ ایمان لے آئیں اس کے باوجود وہ اپنی سرکشی اور اندھے پن پر ڈٹے رہے۔

دوم: اللہ یہ چاہتا ہے کہ انہیں ان کے فوائد اور اپنی عطا پر اسی طرح چھوڑ دے جنہیں اس نے بطور ثواب مومنین کو دیا ہے اور کافروں کو ان پر عذاب کے سبب ان نعمتوں سے محروم کر دیا ہے۔ جس طرح شرح صدر اور قلب کا منور کرنا یعنی اپنے کفر و گمراہی میں یَعْمَهُوْنَ. حیراں و سرگرداں ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے حق سے اعراض (روگردانی) کیا ہے تو وہ حیران ہوئے اور تردد میں مبتلا ہو گئے۔

❀❀❀❀❀

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالْهُدَىٰ ۖ فَمَا رَبِحَت تِّجَٰرَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾
یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی خرید لی ہے، نہ تو ان کی تجارت منفعت بخش ہے اور نہ ہی یہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

قرائت:

سارے قراء نے اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ میں واؤ کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور شواذ میں یحییٰ بن یعمر سے مروی ہے کہ انھوں نے لَوِ اسْتَطَعْنَا میں لَوْ کے واؤ سے تشبیہ دیتے ہوئے واؤ کو کسرہ دے دیا ہے۔

اور یحییٰ بن وثاب سے مروی ہے کہ انھوں نے لَوْ کے واؤ کو واؤ جمع سے تشبیہ دیتے ہوئے ضمہ دیا ہے۔

حجت:

اِشْتَرَوُا میں واؤ ساکن ہے۔ جب ہمزہ وصل ساقط ہو گیا تو واؤ ساکنہ لام معرفہ کے ساکن کے ساتھ جمع ہو گیا اور پس التقاء ساکنین ہو گیا۔ لہٰذا ان میں سے پہلے والے ساکن کو حرکت دے دی گئی اور واؤ کو ضمہ دینا زیادہ بہتر تھا تاکہ یہ واؤ ضمہ کی وجہ سے لَوْ اور اَوْ کے واؤ سے جدا ہو جائے۔ اس بات پر ان حضرات کا اتفاق و اجماع دلالت کرتا ہے کہ ان مقامات پر لَتُبْلَوُنَّ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ، و مُصْطَفَوُا اللهِ. پر ضمہ کے ذریعہ

حرکت دی گئی ہے تا کہ وہ واؤ جمع پر دلالت کرے۔ اور اس واؤ کے سلسلہ میں ان حضرات کی یہ تائید اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انھوں نے اس واؤ کو اَوِ یالَوِ میں موجود واؤ سے تشبیہ دی ہے لہٰذا انھوں نے اسے اَوِ یالَوِ کے واؤ سے تشبیہ دیتے ہوئے ضمہ دیا ہے جس طرح انھوں نے اَوْ کے واؤ کو اس واؤ سے تشبیہ دی ہے جو واؤ جمع ہے اسی طرح جمع کے واؤ کو اَوْ کے واؤ سے تشبیہ دی ہے اور اس میں کسرہ کو جائز قرار دیا ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ انھوں نے "لَوُ اسْتَطَعْنَا" کے واؤ کو ضمہ دینا جائز قرار دیا ہے واؤ جمع سے تشبیہ دیتے ہوئے۔ اسی کی مثل ان حضرات کا اَلضَّارِبُ الرَّجُلِ (الرَّجُلِ میں لام کو) جر دینے کی اجازت دینا ہے اسے اَلْحَسَنُ الْوَجْهِ سے تشبیہ دیتے ہوئے اور اَلْحَسَنُ الْوَجْهَ میں الوجہ کو نصب دینے کی اجازت ہے اَلضَّارِبُ الرَّجُلَ سے تشبیہ دیتے ہوئے۔

الفاظ و معانی:

اِشْتِرَاء کے حقیقی معنی تبدیل کرنے کے ہیں۔

رِبْح: رأس مال (اصل پونجی) پر بڑھت اور اضافہ کو کہتے ہیں اس طرح عرب کا محاورہ ہے: وَمَنْ نَجَا بِرَأْسِهٖ فَقَدْ رَبِحَ۔ (یعنی جو شخص اپنی پونجی بچالے گیا اس نے فائدہ حاصل کیا)

تجارت کے معنی بیع میں فائدہ حاصل کرنے کے ہے۔ ارشاد الٰہی: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ۔ انھوں نے اپنی تجارت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ عرب اس طرح کہتے ہیں: رَبِحَ بَيْعُكَ وَخَسِرَ بَيْعُكَ وَخَابَ بَيْعُكَ جس کا مطلب ہے: جب کسی کی بیع میں فائدہ یا اس میں اضافہ ہوتا ہے تو گویا اس میں ربح ہوتا ہے۔

ترکیب:

اُولٰٓئِكَ محلاً مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا اور اس کی خبر الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ہے۔

مَا حرف نفی ہے کَانَ کی صورت فعل کی صورت ہے اور دو طرح سے استعمال ہوتا ہے:

(۱) حدث پر دلالت نہیں کرتا ہے بلکہ صرف زمانہ پر دلالت کرتا ہے جیسے کَانَ زَيْدٌ عَالِماً (زید کھڑا تھا)

جب کَانَ اس طرح استعمال ہو تو اس کے لئے ایک خبر کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ جملہ فی نفسہ کافی نہیں ہے بس خبر کا اضافہ ہوتا ہے جو اسم کے بارے میں بیان کرتی ہے۔ کَانَ کا اسم و خبر در اصل مبتدا اور خبر ہوتے ہیں لہٰذا

لازم ہے کہ اس کی خبر اسم ہو یا اس میں اسم کا ذکر ہو جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں ہے۔

كَانُوْا میں واؤ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ كَانَ کا اسم ہے۔

مُهْتَدِيْنَ منصوب ہے اس لئے کہ كَانَ کی خبر ہے۔ مُهْتَدِيْنَ میں یاء علامت نصب، جمع اور حرف اعراب ہے۔ نون، واحد میں حرکت اور تنوین کا عوض ہے۔ مُهْتَدِيْنَ دراصل مُهْتَدِيِيْنَ تھا۔ پہلی یاء کو ساکن کر دیا گیا جو لام الفعل تھی اس لئے کہ یاء پر حرکت ثقیل ہے۔ پھر یاء کو التقائے ساکنین کی بنا پر حذف کر دیا گیا، نون کو فتحہ دے دیا گیا تا کہ نون جمع اور نون تثنیہ کے درمیان فرق رہے۔

(۲) كَانَ فعل حقیقی ہوتا ہے۔ زمان اور حدث دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ ''اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً'' یعنی مگر یہ کہ تجارت واقع ہو۔ جب عربی کان اس طرح استعمال کیا جائے تو وہ مستقل جملہ ہوگا، خبر کا محتاج نہ ہوگا۔

تفسیر:

ہدایت کے عوض گمراہی خریدی

آیت میں منافقین کے گذشتہ ذکر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى۔ (یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے)

ابن عباس نے فرمایا گویا انھوں نے ہدایت کو ترک کر دیا اور گمراہی کو اختیار کر لیا ہے؛ جس کے معنی ہیں: انھوں نے کفر کو ایمان سے بدل دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ بات کیوں کر کہی ہے، جبکہ منافقین کا نفاق ان کے ایمان سے مقدم نہیں ہے؟

جواب۔ ہم کہتے ہیں: اس بارے میں علماء نے مختلف وجوہات بیان کی ہیں:

۱۔ اِشْتَرٰى سے مراد اِسْتَحَبُّوا اور اِخْتَارُوا ہے اس لیے کہ ہر خریدار صاحب مال اور اپنے ہاتھوں میں موجود چیز پر اختیار رکھتا ہے، یہ قتادہ کا قول ہے۔

۲۔ منافقین کی ولادت فطرت پر ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ انھوں نے فطرت کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا گویا انھوں نے فطرت کو کفر سے تبدیل کر لیا۔

۳۔ انھوں نے ایمان سے سرکشی کرتے ہوئے جس پر وہ بعثت سے قبل تھے، کفر اختیار کرلیا۔ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت دیتے اور اس پر ایمان رکھتے تھے لیکن جب آپ کو مبعوث بر سالت کیا گیا تو انھوں نے کفر اختیار کیا۔ اس طرح انھوں نے کفر کو ایمان سے بدل دیا، یہ روایت کلبی اور مقاتل کی ہے۔

ارشاد الٰہی: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ، کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے کفر کو ایمان سے اور عذاب کو ثواب سے تبدیل کرنے میں نقصان اور خسارہ اٹھایا۔

ارشاد الٰہی: وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ، انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے مانند اپنی تجارت سے استفادہ نہیں کیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے ان سے رنج (فائدہ) اور ہدایت کی نفی فرمائی ہے، تاجر کبھی نقصان اٹھاتا ہے اور فائدہ حاصل نہیں کرتا جب کہ وہ ہدایت پر ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسے مقام کے لیے یہ کیسے ارشاد ہوا: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ، جہاں اس کا رأس المال (اصل پونجی) ختم ہوگئی ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ضلالت و گمراہی اور ہدایت کا ذکر کرنا گویا ارشاد ہوتا ہے انھوں نے فائدہ چاہا تھا لیکن انھیں فائدہ حاصل نہیں ہوسکا اور وہ ہلاک ہوگئے؛ جس کے معنی ہیں ان کی اصل پونجی ضائع و برباد ہوگئی۔

یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا ذکر تقابل کے عنوان سے ہو کہ جنھوں نے ہدایت کے عوض گمراہی خرید لی فائدہ نہیں اٹھایا جس طرح جنھوں نے گمراہی کے عوض ہدایت خرید کر فائدہ اٹھایا۔

❀❀❀❀❀

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿۱۷﴾

ان لوگوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی اور جب ہر طرف روشنی پھیل گئی تو اللہ نے ان کے نور کو سلب کرلیا اور انھیں گھٹاٹوپ اندھیروں میں چھوڑ دیا جہاں انھیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

الفاظ و معانی:

مَثَل، مِثْل، شَبَہ اور شِبْہ باہم مشابہ ہیں۔ مَثَل کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ جسے تمام معنی کے لیے علم

کے مانند قرار دیا جائے جس میں دوسرا پہلے کے مشابہ ہو۔

اِسۡتَوۡقَدَ کے معنی اَوۡقَدَ کے ہیں یعنی آگ جلائی، جیسے اِسۡتَجَابَ اَجَابَ کے معنی میں ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اِسۡتَوۡقَدَ یعنی طلب وقود کرنا۔ اور وَقود واؤ کے فتحہ کے ساتھ لکڑی کو کہتے ہیں

'النار' آگ ایسا جوہر جو روشن ہو اور جلانے والا ہو اور اس کی اصل 'اَلنُّوۡرُ' ہے۔ نَارَ اَنَارَ وَاِسۡتَنَارَ ان سب کا مفہوم ایک ہے۔

منارات یعنی علامات۔

کسی چیز کا ترک کرنا اس سے رکنا ہے، تَرۡك. كَفّ. اِمۡسَاك یہ تینوں مترادف ہیں یعنی چھوڑنا۔

ظُلُمَات. ظُلۡمَة کی جمع ہے اس کے حقیقی معنی حق کا کم ہونا ہے۔

اِبۡصَار کسی چیز کا آنکھ سے دیکھنا اور اِبۡصَار بِالۡقَلۡب یعنی دل سے دیکھنا بھی، اسی کے مشابہ ہے۔

ترکیب:

مَثَلُهُمۡ مبتدا اور كَمَثَلِ الَّذِيۡ خبر ہے، کاف زائدہ ہے گویا اس طرح تھا: مَثَلُهُمۡ مَثَلُ الَّذِيۡ اسۡتَوۡقَدَ نَارًا۔ اسی طرح یہ ارشاد الٰہی بھی ہے کہ لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ یعنی اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسۡتَوۡقَدَ نَارًا اور اس سے متصل چیزیں اَلَّذِيۡ کا صلہ ہیں اس میں سے موصول کی جانب پلٹنے والا اسۡتَوۡقَدَ کی ضمیر ہے۔ لَمَّا کسی دوسری چیز کے واقع ہونے کی وجہ سے کسی چیز کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے اور ظرف کے معنی میں ہے اور اس میں عامل اس کا جواب ہے۔ گویا اس طرح ہے: فَلَمَّا اَضَاءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ طُفِئَتۡ۔ یعنی بجھادی گئی جب اس نے اپنے اطراف کو روشن کر دیا۔

مَا حَوۡلَهٗ میں مَا اسم موصول ہے منصوب ہے اس لئے اَضَاءَتۡ یعنی روشن کرنا اس پر واقع ہوا ہے۔

حَوۡلَهٗ منصوب ہے ظرف کی بنا پر اور مَا کا صلہ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: هُمۡ حَوۡلَهٗ وَ حَوۡلَيۡهِ وَ حَوَالَهٗ وَحَوَالَيۡهِ۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ یعنی اَذۡهَبَ اللّٰهُ نُوۡرَهُمۡ ۔ جو فعل متعدی نہیں ہوتا لازم ہوتا ہے وہ حرف جر کے ذریعہ اور ہمزہ نقل (یعنی باب افعال میں) لے جا کر متعدی بنایا جاتا ہے۔

بِنُوۡرِهِمۡ میں باء ذَهَبَ سے متعلق ہے فِيۡ ظُلُمَاتٍ تَرَكَهُمۡ سے متعلق ہے۔

لَا يُبْصِرُوْنَ حال ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے اور اس میں عامل تَرَكَهُمْ ہے یعنی انھیں اندھا چھوڑ دیا۔

تفسیر:

منافقین کی پہلی مثال

مَثَلُهُمْ. ان منافقین کی مثال جنہوں نے ایمان کو ظاہر کیا اور کفر کو چھپایا۔

كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ، اس شخص کی مثال ہے جس نے آگ روشن کی یا اس کی طرح ہے جس نے تاریک رات میں آگ روشن کر کے روشنی چاہی اس سے روشن ہوا اور اس سے سردی کو دور کیا اس کے اطراف کو دیکھا اس سے خوف زدہ ہونے لگا جب آگ خاموش ہوگئی تو تاریکی میں خوف زدہ اور حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ یہی صورت حال منافقین کی ہے جب انھوں نے کلمۂ ایمان کا اظہار کیا، اس کے نور سے خود کو نورانی کیا، اس کی عزت کے باعث عزت حاصل کی، مسلمانوں سے شادیاں کیں، ان سے وراثت پائی لیکن مرنے کے بعد تاریکی اور خوف کی جانب پلٹ گئے اور عذاب میں ہی مبتلا رہے۔ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ. کے یہی معنی ہیں، ابن عباس قتادہ، ضحاک اور سُدی سے یہی مروی ہے۔

نظم کے اعتبار سے یوں ہونا چاہئے تھا: فلما اضاءت ما حوله اطفأالله ناره (پس جب ہر طرف روشنی پھیل گئی اللہ نے آگ کو بجھا دیا (خاموش کر دیا)) تاکہ لَمَّا کا جواب ہو سکے لیکن جب یہ آگ خاموش ہوگئی ان کے نور کے ختم ہونے کے سبب تو اِذْهَابُ نُوْرٍ اَطْفَأَ (خاموش) ہونے کا قائم مقام ہوگیا۔ لَمَّا کے جواب کو ایجاز و اختصار کے عنوان سے حذف کیا گیا ہے۔

اللہ کا ان کے نور کے لے جانے کے یہ معنی ہیں کہ خداوند عالم آخرت میں مومنین کے ساتھ جو انھیں نور عطا کرے گا وہ ان سے سلب کر لے گا۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے جس میں اس کے بارے میں خبر دی گئی ہے:

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا. (سورہ حدید، آیت ۱۳)

جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مومنین سے یہ کہتے نظر آئیں گے کہ ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں مگر ان سے کہا جائے گا تم پیچھے پلٹ جاؤ نور کہیں اور تلاش کرو۔

بیان کیا گیا ہے کہ منافقین کے نور ختم کرنے کی دیگر وجہیں بھی ہیں جیسا کہ مومنین کو ان کے کفر کے متعلق

مطلع کر دینا کہ اللہ سے کفر کے باعث ان سے نور اسلام ضائع ہو گیا۔

سعید بن جبیر، محمد بن کعب اور عطا نے بیان کیا ہے: یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد، آپؐ پر ایمان اور آپؐ کے سبب مشرکین عرب پر کامیابی کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب حضور تشریف لائے تو انھوں نے آپؐ کی رسالت سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل سے سلسلۂ نبوت منقطع ہونے کے بعد بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع شام سے یثرب آ گئے اور وہاں سے مدینہ تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی دیں اور یہ کہ آپؐ کی امت خیر امم ہے، بنی اسرائیل کا ایک شخص عبداللہ بن ہیبان پیغمبرؐ پر وحی نازل ہونے سے قبل اللہ کی اطاعت کرے اور تورات پر عمل کرنے اور حضورؐ پر ایمان لانے کی تاکید کرتا اور کہتا کہ جب محمدؐ ظہور کریں تو اختلاف نہ کرنا، ان کی نصرت کرنا اور میں ان کی زیارت کا خواہش مند ہوں، پھر حضورؐ کی آمد سے قبل اس کا انتقال ہو گیا۔ یہودیوں نے پہلے تو اس کی نصیحت کو قبول کر لیا، لیکن جب آنحضرتؐ مبعوث برسالت ہوئے تو انھوں نے آپؐ کا انکار کر دیا اس طرح اللہ نے ان سب کے لیے یہ مثال پیش کی ہے۔

سوال:

خداوند عالم نے کس طرح منافقین اور یہودیوں کی تشبیہ دی ہے جو کہ جماعت ہیں اس شخص سے جس نے آگ روشن کی تھی جو کہ واحد ہے؟

جواب:

اس کی متعدد وجوہات ہیں:

اول: الذی جمع کے معنی میں ہے جیسا کہ دوسری آیت میں کہا گیا ہے: وَ الَّذِی جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖ۔ (اور جو لوگ صداقت کا پیغام لے کر آئے اور جنھوں نے اس کی تصدیق کی)

دوم: کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْ سے نون حذف کر دیا گیا ہے۔

سوم: ایک جملہ حذف ہو گیا ہو گویا کہا جا رہا ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ اِتِّبَاعِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا'' (ان لوگوں کی مثال اس کے مانند ہے جس نے آگ بھڑکائی) پھر مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیا۔

چہارم: یہ بھی کہا گیا ہے کہ آگ بھڑکانے والے کی جنس مراد ہے۔ اَلَّذِیْ میں ابہام ہے بطور خاص کسی ایک کی تعریف مراد نہیں ہے۔ اس اعتبار سے لَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ کا جواب محذوف ہے۔ گویا کہا جا رہا ہے (آگ) بجھ گئی۔ ارشاد الٰہی: ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ میں هُمْ کی ضمیر منافقین کی طرف پلٹ رہی ہے۔

پنجم: کہا گیا ہے کہ اس حالت کی تشبیہ اس حالت سے دی گئی ہے کہ جس کی تقدیر اس طرح ہے: ان منافقین کی جہالت میں حالت آگ بھڑکانے والے کے مانند ہے، حالت کی حالت سے تشبیہ دینا صحیح ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: "ان لوگوں کی بے قوفی اور نادانی گدھے کی طرح ہے کہ اگر آپ اس طرح کہیں: "یہ گدھے کے مانند ہیں" تو صحیح نہیں ہے" اس ارشاد کے معنی ہیں: وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ. اللہ نے ان کے لیے نور قرار نہیں دیا جب کہ ترک کے معنی فعل سے روکنا ہے اور یہ اس کے لیے درست ہے کہ جب اس کا فعل حلول کرے اور خداوند عالم کی ذات اس سے منزہ و پاک ہے کہ اس کا فعل حلول کرے۔ پس اس کے معنی یہ ہوں گے کہ (اللہ) نے ان کے لیے نور قرار نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اس سے زائد اور شدید تاریکی میں ہو گئے جیسا کہ وہ (آگ) بھڑکانے سے قبل تھے۔ ارشاد: لَا يُبْصِرُوْنَ یعنی راستہ نہیں دیکھ پاتے۔

❀❀❀❀❀

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾
(یہ سب بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اب یہ پلٹ کر آنے والے نہیں)

الفاظ و معانی:

اَصَم جو بہرہ پیدا ہوا ہو اَبْكَمْ جو پیدائشی گونگا ہو۔ صُمٌّ کے لغوی معنی بندش کے ہیں اور صَمَمْ کان کا بند ہونا ہے جو کچھ بھی نہ سن سکے، صَمَّاء: کان کے اندر گوشت اکٹھا ہونے سے اس کا پر ہو جانا، صِمَّام وہ ہے جس سے شیشی کے منھ کو بند کیا جاتا ہے۔

بُكْمٌ کے لغوی معنی زبان کی بندش ہے اور وہ ایسا مرض ہے جو بات کرنے سے روک دیتا ہے۔

عمی یعنی آنکھ کا چلا جانا ہے اور عَمِيٌ فِي الْقَلْبِ دل میں اندھا پن ویسے ہی ہوتا ہے جیسے عَمِیٌ فِی الْعَیْنِ آنکھوں میں اندھا پن ہوتا ہے۔ یہ ایک آفت ہے جو فہم سے روک دیتی ہے۔

عَمَايَة کے معنی غَوَايَة کے ہیں یعنی گمراہی اور عَمَاءٌ اس گہرے بادل کو کہتے ہیں جو تہہ بہ تہہ ہوتا ہے

اور رَجُوْعٌ عَنِ الشَّیْءِ بھی ہوتا ہے اور اِلَی الشَّیْءِ بھی ہوتا ہے۔ رُجُوْعٌ عَنِ الشَّیْءِ یعنی اس شے کی جانب جانے کے بعد واپس لوٹنا اور رُجُوْعٌ اِلَی الشَّیْءِ یعنی اس شے کی طرف واپس آنا جب وہ جا چکی ہو۔

ترکیب:

صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔ یعنی هٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ قِصَّتُهُمْ هٰذِهٖ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ۔ (جن لوگوں کا قصہ یہ ہے وہ سب بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔)

تفسیر:

بہرے، گونگے، اندھے

قتادہ نے بیان کیا ہے: صُمٌّ" (بہرہ) حق نہیں سنتا، بُکْمٌ (گونگا) حق نہیں بولتا اور عُمْیٌ (حق بات نہیں دیکھتا) یہ تمام لوگ اپنی گمراہی سے نہیں پلٹتے ہیں۔ اللہ نے ان لوگوں کو بہروں سے تشبیہ دی ہے اس لئے کہ وہ خدا کی دلیلوں کو اچھی طرح غور سے نہیں سنتے۔ گویا وہ بہرے ہیں۔ چونکہ اللہ اور اس کے رسول کا اقرار نہیں کرتے ہیں گویا گونگے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ زمین و آسمان کے ملکوت میں نہیں دیکھتے گویا کہ اندھے ہیں چونکہ ان کے اعضا سے انھیں فائدہ نہیں حاصل ہو گویا یہ اعضاء ان کے لیے نہیں ہیں جو اس بات پر دلالت ہے کہ مہر لگانے کے معنی منافقین اور ایمان کے درمیان حائل ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے اس لیے کہ اللہ نے کفر کے ساتھ ان کے مانوس ہونے کو ان کے حواس کی دوستی کے ساتھ بہرے گونگے اور اندھے کی منزلت میں قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس کا یہ ارشاد ہے:

طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور انہیں گم راہی میں ڈال دیا، انہیں بہرا بنا دیا اور ان کی آنکھوں کو نابینا کر دیا اور ان کے دلوں کو کج کر دیا۔

یہ تمام وہ خبریں ہیں جو ان لوگوں کے ساتھ اللہ کے امتحان میں پیش آئی ہیں اور اللہ نے جو انھیں اطاعت اور ایمان کا حکم دیا (اس وقت پیش آئی ہیں) نہ یہ کہ اللہ نے ان کے ساتھ ایسا کیا ہے۔ اللہ نے انھیں ایمان سے نہیں روکا ہے، یہ اس طرح ہے جیسا کہ مثل میں کہا جاتا ہے: حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ۔ کسی چیز سے تمھاری محبت تمھیں اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔ قرآن میں اس طرح ہے:

وَ تَرٰاهُمْ يَنْظُرُونَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۹۸) آپ کو یہ نظر آئے گا کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن دراصل وہ نہیں دیکھتے۔

لَا يَرْجِعُوْنَ، اس ارشاد میں دو امر کا احتمال ہے:

۱۔ پہلا امر مذمت اور تاخیر سے متعلق ہے یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

۲۔ یہ لوگ اسلام کی طرف نہیں پلٹیں گے، یہ ابن مسعود کا قول ہے۔

❀❀❀❀❀

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہے جس میں تاریکی، گرج اور چمک (سب کچھ) ہے، یہ موت کے خوف سے کڑک کے مارے اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔

قرائت:

ظُلُمٰات اس کے لام پر ظ کے پیش کے اتباع کی خاطر پیش ہونے پر سارے قراء کا اجماع ہے۔ شواذ میں حسن اور ابی سماک سے لام کا ساکن ہونا اور بعض قراء سے لام پر زبر ہونا مروی ہے۔

ابو عمرو الْكَافِرِيْنَ کے کاف پر حالت نصب و جر میں امالہ کرتے ہیں۔ کسائی سے بھی یہی مروی ہے حالانکہ باقی قراء امالہ نہیں کرتے ہیں۔

حجت:

اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض قراء دو پیش کو ایک جگہ ہونا پسند نہیں کرتے ہیں۔ لہٰذا کبھی زبر کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور ظُلَمات کہتے ہیں اور کبھی کسرہ کی جانب پلٹ جاتے ہیں اور ظلمات پڑھتے ہیں۔ لغت میں تینوں کام اچھا ہے۔

اَلْکَافِرِیْنَ کے کاف میں امالہ کیا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ فاء مکسورہ کے بعد راء کو کسرہ دینا لازم ہے راء چونکہ اس میں تکریر ہوتی لہٰذا وہ دو حرف مکسورہ کا قائم مقام ہوتا ہے جب بھی کسروں کی تعداد زیادہ ہوگی امالہ کو غالب کرے گی اور اسے حسن و بہتر قرار دے گی۔

امالہ کے سلسلہ میں قراء کے کئی نظریات اور ان میں اختلافات ہیں ان سب کو اکٹھا کرنا کافی طولانی ہو جائے گا۔ ابوعلی الفارسی رحمہ اللہ نے ان کے احتجاجات میں سعی بلیغ کی اور حد پار کرڈالی۔ تحقیق کو بیان کیا اور دقیق طور پر بیان کیا جو بیان اس دور کے علماء میں سے بہت سوں کی فہم کی خبر دیتا ہے۔ لہٰذا امالہ کے ابواب اور ان کی دلائل بیان کرنا اور ان کی بحثوں میں گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنا تفسیر قرآن کے شایان شان نہیں ہے اسی طرح وہ فن قرائت سے بھی مربوط نہیں ہے جیسے ہمزہ، ادغام اور مد کے علوم ان چیزوں کے بارے میں کتابیں موجود ہیں ان کی جانب رجوع کیا جائے اور انھیں پر بھروسہ کیا جائے پس صحیح رائے یہی ہے کہ ہم ان کے بعض جوانب کی طرف اشارہ کردیں اور انشاء اللہ اس کتاب کی آنے والی بحثوں میں ان کے بعض صفات و خصوصیات کے بیان پر اکتفا کرلیں۔

الفاظ و معانی:

اَلصَّیِّب۔ بارش کو کہتے ہیں۔

وَ کُلُّ مَا عَلَاكَ وَ اَظَلَّكَ فَهُوَ سَمَآءٌ۔ جو بھی تم پر بلند ہو اور سایہ فگن ہو، وہ (آسمان) سماء ہے۔ اور سَمَآءُ الْبَیْت گھر کی چھت کو کہتے ہیں۔ وَ اَصَابَهُ سَمَآءٌ یعنی مطر۔ ان تک سماء پہنچ گیا یعنی بارش ہوگئی۔

اور صَوَاعِق صَاعِقَة کی جمع ہے بجلی جو بادلوں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے جس کے ساتھ آگ نازل ہوتی ہے جو جلا دیتی ہے اور صَاعِقَة عذاب کی چیخ ہے۔

حَذَرَ جس چیز کا خوف ہو، اس سے سلامتی طلب کرنے کا نام ہے۔ (چوکنا رہنا)

ترکیب

اَوْ یہاں پر اباحہ کے لئے آیا ہے جب آپ سے کہا جائے: جَالِسِ الْفُقَهَآءَ اَوِ الْمُحَدِّثِیْنَ (فقہاء کی ہمنشینی اختیار کرو یا محدثین کی) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں فریق اس قابل ہیں کہ ان کی ہمنشینی

اختیار کی جائے اگر آپ نے پہلے فریق کی ہمنشینی اختیار کی تب بھی آپ فرمانبردار ہیں اور اگر دوسرے فریق کی ہمنشینی اختیار کی تب بھی آپ مطیع ہیں اور آپ نے دونوں کی ہمنشینی اختیار کی تب بھی فرمانبردار ہیں۔ اسی طرح اگر آپ منافقین کی مثال آگ جلانے والے سے دیں تب بھی آپ صحیح ہیں اور اگر بارش میں گرفتار آدمی سے دیں تب بھی صحیح ہیں اور اگر آپ ان کی مثال دونوں سے دیں تب بھی آپ صحیح ہیں۔

آیت میں صَیِّب گویا اس طرح ہے کہ اَوْ کَاَصْحَابِ صَیِّبٍ مضاف (اصحاب) کو حذف کر کے مضاف الیہ و اس کی جگہ پر رکھ دیا ہے اس لئے کہ یہ فقرہ کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا پر عطف ہے اور صَیِّب عاقل نہیں ہے لہٰذا اسے عاقل پر عطف نہیں کر سکتے۔

یَجْعَلُوْنَ اَصْحَابِ الصَّیِّب کے لئے حال ہے۔

فِیْهِ ظُلُمٰتٌ محلاً مجرور ہے اس لئے کہ وہ صَیِّب کی صفت ہے فِیْهِ کی ضمیر متصل صَیِّب کی طرف پلٹ رہی ہے۔ یا السَّمَآءِ کی جانب، حَذَرَ الْمَوْتِ منصوب ہے وہ مفعول لہ ہے اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہیں: وہ موت کے ڈر سے ایسا کرتے ہیں۔

زجاج نے کہا: فعل نے اسے منصوب کر دیا ہے اس لئے کہ وہ تاویل مصدر میں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈالنا موت سے ان کے ڈر پر دلالت کرتا ہے۔

شیخ ابوعلی نے کہا: مفعول لہ صرف مصدر ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ دلالت کرتا ہے کہ یہ حدث اس چیز کی وجہ سے ہے اور حدث مصدر ہوتی ہے خود فعل کے الفاظ سے مصدر نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسرے فعل سے ہوتا ہے۔

تفسیر:

منافقین کی دوسری مثال

خداوند عالم نے ان منافقین کی ان کی جہالت اور شدت حیرت کی مثال اصحاب مطر (یعنی بارش میں مبتلا افراد سے دی ہے) مِّنَ السَّمَآءِ جو آسمان سے برس رہی ہو۔ فِیْهِ، اس بارش میں یا آسمان میں۔ آسمان سے بادل اور ابر مراد ہے جو کہ مذکر ہے۔

ظُلُمٰتٌ چونکہ ابر دن میں آفتاب کو اور رات میں ستاروں کو ڈھانپ لیتا ہے اس لہٰذا فضا تاریک ہو جاتی ہے۔

وَرَعۡدٌ (اور بجلی) بیان کیا گیا ہے کہ رعد فرشتہ کی آواز ہے جس کے ذریعہ وہ ابر کو چلاتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رعد ابر پر موکل فرشتہ ہے جو تسبیح کرتا ہے۔ یہ روایت ابن عباس اور مجاہد سے کی گئی ہے۔ یہی روایت ہمارے ائمہ اہلبیت علیہم السلام سے مروی ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رعد ایک ہوا ہے جو آسمان کے نیچے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ابو جلد نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رعد یہ (آواز) بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز ہے اور جس نے کہا ہے کہ رعد سے مراد فرشتہ ہے اس نے یہاں پر لفظ ''صوت'' (آواز) کو پوشیدہ مانا ہے گویا اس طرح کہا ہے: فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَصَوْتُ رَعْدٍ۔ (اس میں تاریکیاں اور رعد کی آواز ہے)۔

روایت کی گئی ہے کہ رعد ایسی آواز ہے (جس کے ذریعہ) چرواہا اپنی بھیڑوں کو ہنکاتا ہے۔

اللہ کا قول وَبَرۡقٌ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے کوڑے ہیں جو لوہے سے بنے ہوتے ہیں جس سے وہ بادلوں کو مارتے ہیں تو اس سے آگ نکلتی ہے۔ یہ علی علیہ السلام سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہ نورانی تازیانہ ہے جس سے فرشتہ ابر کو زجر و توبیخ (ڈانٹا ڈپٹتا) کرتا ہے۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ وہ فرشتے کا تازیانہ ہے۔ یہ مجاہد سے مروی ہے۔

اور صاعقہ تلوار سے جنگ و جدال کو کہتے ہیں اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ آگ ہے۔

آیت کی تشبیہ اور مثال کی تاویل میں متعدد اقوال ہیں:

اول: قرآن کی تشبیہ آسمان سے نازل ہونے والی بارش سے دی گئی ہے اور بارش میں موجود تاریکی کی قرآن میں موجود ابتلا اور آزمائش سے قرآن میں موجود زجر (توبیخ و نہی) کی بجلی سے اور جو کچھ اس میں بیان ہے قرآن میں موجود مستقبل میں پیش آنے والے وعید اور جلد پیش آنے والے جہاد کی مثال صواعق (بجلیوں) سے پیش کی ہے۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

دوم: دنیا میں موجود شدت و نرمی کی مثال بارش کے ذریعہ پیش کی ہے؛ جس میں نفع و نقصان دونوں موجود ہوتے ہیں۔ منافق بہت جلد پیش آنے والے ضرر و نقصان کو دور کرتا ہے اور تاخیر سے ملنے والا نفع نہیں چاہتا۔

سوم: اس سے سلام کی مثال پیش کی گئی ہے جس میں حیات و ہے جس طرح بارش میں ہے۔ ان کے

اسلام میں موجود پوشیدہ کفر کی مثال ظلمت و تاریکی سے دی ہے اور اسلام میں موجود جہاد، خوف اور قتل کی مثال بجلی سے دی گئی ہے جیسا کہ وہ اپنے دین میں موجود شک کے باعث وعید آخرت سے خوف زدہ ہوتے ہیں اور جو کچھ برق (بجلی) میں موجود ہے اسی طرح اسلام میں موجود ہے اسلام کے اظہار کرنے سے ان کے خون کا محفوظ ہونا، ان سے نکاح کرنا، احکام میراث کا نافذ کرنا ہے۔ جو کچھ صواعق (گرجنے والی بجلیوں) میں موجود ہے۔ اسی طرح اسلام میں موجود بہت جلد اور تاخیر سے ہونے والے عذاب کی مثال ہے۔ اس امر کی تائید وہ روایت کر رہی ہے جو حسن سے وارد ہوئی ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ منافق کے اسلام کی مثال آسمان سے نازل ہونے والی اس بارش سے دی گئی ہے جس میں تاریکی، گرج اور چمک (سب کچھ) ہے۔

چہارم: ابن مسعود اور صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کی ہے: مدینہ کے منافقین میں سے دو افراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت سے فرار کر کے نکلے، دونوں بارش کی زد میں آ گئے جس کا ذکر اللہ نے فرمایا ہے۔ بارش شدید گرج، چمک کے ساتھ تھی۔ جب بھی بجلی چمکتی دونوں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں رکھ لیتے اس خوف سے کہیں بجلی ان کے کانوں کے اندر داخل ہو کر انھیں مار نہ ڈالے، جب بجلی چمکتی تو چلنے لگتے، جب نہیں چمکتی اور دونوں کو کچھ نظر نہ آتا تو کھڑے ہو جاتے اور کہتے کاش صبح ہو جاتی تو ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچ کر بیعت کر لیتے۔ اس طرح صبح ہوئی دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ دونوں کے اسلام کی قدر کی گئی۔ اس طرح اللہ نے ان دونوں افراد کی شان بیان فرمائی ہے۔ مدینہ کے منافقین کے لیے جب وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اس لئے کہ آپ کی باتوں کو نہ سنیں اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے کہ ان کے متعلق تو کچھ نازل نہیں ہو رہا ہے جس طرح یہ دونوں لوگ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے، جب ان کے لیے روشنی ظاہر ہوتی چلنے لگتے یعنی جب ان کے اموال میں اضافہ ہوتا اور (مال) غنیمت حاصل ہوتا یا فتح حاصل ہوتی تو اس میں چلنے لگتے اور کہتے محمد کا دین سچا ہے اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی یعنی جب ان کے مال تلف ہو جاتے اور ان پر مصیبت پڑتی تو کہتے: یہ سب دین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس طرح اپنے سابقہ دین پر پلٹ جاتے جس طرح دونوں جب ان پر تاریکی چھا جاتی تو کھڑے ہو جاتے تھے۔

ارشاد الٰہی: وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (اور اللہ ان منکرین حق کو گھیرے میں لئے ہوتا ہے) اس میں چند بحثیں ہیں:

اول: اللہ ان کے بارے میں ان کی روش اور کیریکٹر سے واقف ہے، ان کی نیت اور ضمائر سے باخبر ہے۔ یہ اصم کا قول ہے۔

دوم: خداوند عالم ان لوگوں پر قادر ہے، اس کی قدرت سے باہر نکلنے کی ان میں قدرت و طاقت نہیں ہے۔

سوم: مجاہد سے روایت کی گئی ہے کہ اللہ انھیں قیامت میں جمع کرے گا۔ جب کوئی چیز نہ چھوٹنے پائے تو کہا جاتا ہے: اس طرح احاطہ کیا گیا۔ اسی طرح ہے: اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا. اس کے علم سے کوئی چیز نہیں بچ سکتی۔

چہارم: اللہ انھیں ہلاک کرنے والا ہے۔ اُحِیۡطَ بِفُلَانٍ، اس وقت بھی کہا جاتا ہے جب کسی کی ہلاکت نزدیک آجائے۔ اللہ نے فرمایا: وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِہٖ. (سورۂ کہف، آیت ۴۲) (آخرکار اس کے پھلوں کو آفت نے گھیر لیا) یعنی ان کی ہلاکت واقع ہوگئی جیسا کہ یہ قول ہے: اِلَّاۤ اَنۡ یُّحَاطَ بِکُمۡ. جس کے معنی ہیں: تم سب کو ہلاک کیا جائے گا۔

❀❀❀❀❀

یَکَادُ الۡبَرۡقُ یَخۡطَفُ اَبۡصَارَہُمۡ ؕ کُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَہُمۡ مَّشَوۡا فِیۡہِ ٭ۙ وَ اِذَاۤ اَظۡلَمَ عَلَیۡہِمۡ قَامُوۡا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَذَہَبَ بِسَمۡعِہِمۡ وَ اَبۡصَارِہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۰﴾

قریب ہے کہ بجلی ان کی بصارت کو اچک لے جائے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو یہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو رک جاتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کو بالکل ختم کر دیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلۡخَطۡفُ کے معنی اچک لینا ہیں۔ قَامُوۡا یعنی ٹھہر گئے، توقف کیا۔ مَشِیۡئَۃ کے معنی ارادہ کے ہیں۔
شَیۡءٍ یعنی وہ چیز جس کا جاننا صحیح ہو اور اس کے بارے میں خبر دی جا سکے۔ سیبویہ نے کہا ہے: شیء سب سے پہلا، سب سے عام اور سب مبہم نام ہے اس لئے یہ معدوم اور موجود دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ بیان کیا

گیا ہے یہ فقط موجود کے لیے بولا جاتا ہے۔ صحیح اول ہے۔ یہ محققین میں متکلمین کا نظریہ ہے جس کی تائید اللہ کا یہ ارشاد کر رہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) اس کے سوا ہر چیز محدث ہے اور ہر محدث کی دو حالتیں ہوتی ہیں: حالت عدم و حالت وجود۔ جب وجود ہوگا تو قادر کے لیے مقدور ہونے میں خارج ہوگا اس لیے یقینی طور پر معلوم ہے کہ موجود کو ایجاد کرنا درست نہیں ہے۔ اس طرح ہم نے جان لیا کہ بے شک وہ (اللہ) اس کے معدوم ہونے کی حالت میں قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس شئے کو عدم سے وجود میں لے آئے اور اکثر مسائل توحید اسی مسئلہ کے گرد چکر لگاتے ہیں۔

كَادَ افعال مقاربہ میں سے ہے، فاعل پر مکمل نہیں ہوتا، خبر کا محتاج ہوتا ہے جو فعل مضارع ہوتی ہے، لہٰذا يَكَادُ فعل ہے، الْبَرْقُ مرفوع ہے يَكَادُ کا اسم اور فاعل ہے، يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ محلاً منصوب يَكَادُ کی خبر ہے۔

كُلَّمَا کی اصل كُلَّ ہے مَا جزاء اس سے ملحق ہوگیا ہے ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس کا فاعل اَضَاءَ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جب ان کے اطراف میں روشنی ہوگئی تو چل پڑے۔

اَضَاءَ محلاً مجزوم ہے شرط کی بنا پر۔ مَشَوْا مقام جزاء میں ہے: اِذَآ اَظْلَمَ، اس جیسے جملہ کی ترکیب گذر چکی ہے۔

لَوْ حرف ہے جس کے معنی کسی دوسری شے کے محال ہونے کے سبب اس شے کے محال ہونے کے ہیں۔ جب فعل منفی لَوْ کے بعد واقع ہو تو وہ معنی میں مثبت ہو جائے گا اور جب فعل مثبت واقع ہو تو وہ معنی میں منفی ہو جائے گا: لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کی آنکھوں اور کانوں کا جانا منتفی ہے اس لئے کہ مشیت منتفی ہے۔

تفسیر:

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، (قریب ہے کہ بجلی ان کی بصارت کو اچک لے جائے) اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ قریب ہے کہ قرآن کریم میں موجود نورانی دلائل کے دینی امور پر غور و فکر کی شدت ان کے دلوں کو اچک لے جاتی ہے (كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ) جس طرح بجلی ان لوگوں کی بصارت کو اچک لے جاتی ہے۔ جب بھی ان کے لیے روشنی پیدا ہوتی ہے اس میں چلنے لگتے ہیں تا کہ روشنی میں راستہ پالیں۔ اسی طرح منافقین جب بھی انھیں خیر اور فائدہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو دوڑ کر آتے ہیں اور جب

مسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو اپنے کفر کے باعث حیران رہ جاتے ہیں اور ٹھہر جاتے جس طرح وہ لوگ تاریکی میں متحیر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لے آتے ہیں تو ایمان ان کے لیے نور بن جاتا ہے، جب مرجاتے ہیں تو اپنے عذاب کی تاریکی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ یہودی ہیں کہ جب جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی نصرت کی گئی تو کہنے لگے: اسی چیز کی بشارت حضرت موسیٰؑ کو دی گئی تھی۔ لیکن جب ان میں سے ایک مارا گیا تو وہ ٹھہر گئے اور شکوہ کرنے لگے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ، (اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کا بالکل ختم کر دیتا) سماعت اور بصارت کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ ان دونوں کا ذکر دونوں آیتوں میں آیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان دونوں (سماعت و بصارت) کو منافقین سے ان کے نفاق اور کفر کے باعث عذاب کی شکل میں ختم کر دیتا، یہی انھیں عذاب کے ذریعہ (وعید) دھمکی دی گئی ہے۔

پہلی آیت میں اللہ کا ارشاد: وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (اور اللہ کافروں کا گھراؤ کئے ہے) وراس کا ارشاد: بِسَمْعِهِمْ مصدر ہے جو جمع پر دلالت کر رہا ہے، یا واحد ہے جو جمع کے لیے قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اگر اللہ چاہتا تو ان کے کفر کو ظاہر کر دیتا اور ان کو ہلاک کر دیتا اس لیے کہ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔

قَدِيْرٌ، قَادِر کا مبالغہ ہے اور ارشاد خدا: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) عام ہے۔ وہ تمام اشیاء پر قادر ہے؛ اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) معدومات پر (یعنی جو چیزیں عدم میں ہیں) انہیں موجود کرنے پر قادر ہے (۲) موجودات کو فنا کرنے پر قدرت رکھتا ہے (۳) مقدور پر اور غیر مقدور چیزوں پر قادر ہے کہ اس کی تقدیر مقرر کر سکے اور اس سے روک سکے۔

کہا گیا ہے کہ یہ مقدورات سے مخصوص ہے نہ کہ غیر مقدور سے اس لیے کہ مقدور واحد اور قادر کے درمیان یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی چیز موجود بھی ہو اور معدوم بھی اور لفظ کل کا استعمال بھی غیر عموم پر ہوتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد ہے: تُدَمِّرُ كُلَّ شَىْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا۔ (سورۂ احقاف: آیت ۲۵) (جو اپنے رب کے حکم سے ہر شے کو تباہ کر ڈالے گی)

❀❀❀❀❀

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾

اے انسانو! تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلے والے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

الفاظ ومعانی:

خَلق کسی کام کو معین اندازہ کے مطابق انجام دینا ہے۔ خَلقُ السَّمَاوات یعنی آسمانوں کو اس اندازہ پر ایجاد کرنا جیسا کہ اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے بغیر کسی زیادتی اور نقصان کے۔

ترکیب:

یا حرف ندا ہے۔ اَیُّ اسم مبہم ہے جو بہت سی اجناس کے لئے بولا جاتا ہے اس لئے کہ یہ اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کی صفت لائی جاتی ہے اور اس کی صفت اسم جنس لائی جاتی ہے اس لئے کہ یہ صرف صفت کے ذریعہ مکمل ہوتا ہے اور وہ ایک ایسا لفظ ہے کہ جو اسی چیز پر دلالت کرتا ہے جس پر اَیُّ دلالت کرتا ہے اور یہ صفت اَیُّ کو خاص بناتی ہے اور اشارہ بھی تخصیص جنس کے ذریعہ واقع ہوتا ہے پھر وصف کے ذریعہ اسماء اجناس کی صفت لائی جاتی ہے جیسے: اَیُّهَا النَّاسُ میں لفظ اَلنَّاسُ ہے۔

پس اَیُّ منادی مفرد معرفہ مبنی ہے اس لئے کہ وہ حرف خطاب کاف کی جگہ واقع ہوا ہے۔ اَیُّ مبنی بر حرکت ہے حالانکہ مبنی میں قاعدہ ساکن ہونا ہے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ مبنی ہونے میں یہ اصل نہیں ہے بلکہ یہ عارضی طور پر مبنی ہوگیا ہے، اَیُّ کو پیش دیا گیا ہے اس لئے کہ اصل میں تنوین تھی جب مبنی ہونے کی بنا پر تنوین ساقط ہوگئی تو یہ قَبْلُ و بَعْدُ سے مشابہ ہوگیا ہے کہ جن کو غائب سے منقطع کردیا گیا ہو لہٰذا وہ مرفوع ہوگیا ہے اس میں اور بھی صورتیں بیان کی گئی ہیں جو ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

اَلنَّاسُ مرفوع ہے اس لئے کہ اَیُّ کی صفت ہے پس لفظ کی حرکت پر اس کا تابع ہے۔ یہاں پر اَلنَّاس کو نصب (زبر) دینا صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ اسماء منادیٰ جو کہ مفرد معرفہ ہوں ان کی صفت کو نصب دینا اور

رفع دینا دونوں جائز ہیں۔ (لیکن یہاں پر ایسا کرنا جائز نہیں ہے) کیونکہ یہاں پر جو صفت ہے وہ درحقیقت منادیٰ ہے اور اَیُّ اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور اس پر دلیل ھاء کا لازم ہونا ہے اور وہ حرف تنبیہ ہے۔ اَلنَّاسُ سے پہلے وہ بھی ہے اور علماء نے اسے حذف کرنے سے منع کیا ہے۔ پس یہ گویا اعلان ہے ندا کے دوبارہ آغاز کا اور اس لئے کہ اس سے پہلے والے منادیٰ پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ دیگر منادیٰ میں جائز ہوتا ہے۔

مازنی نے یَا اَیُّھَا الرَّجُلُ میں نصب کی اجازت دی ہے اور یہ غلط ہے اس دلیل کی بنا پر جسے ہم نے بیان کیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کلام عرب میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے ان سے اس بارے میں صرف رفع ہی مروی ہے۔

وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ خَلَقَکُمْ کے کُمْ پر عطف ہے اور وہ مفعول بہ ہے۔

مِنْ قَبْلِکُمْ، اَلَّذِیْنَ کا صلہ ہے۔

لَعَلَّ حرف ناصب ہے اور اِنَّ کے اخوات میں سے ہے ہم نے اس کے فعل سے مشابہت اور اس کے عمل رفع و نصب کو پہلے بیان کر دیا اسی طرح لَعَلَّ کا حکم اور فعل سے مشابہ ہونا زیادہ ظاہر ہے اس لئے کہ اس کے معنی ترجی کے ہیں۔

کُمْ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ لَعَلَّ کا اسم ہے اور تَتَّقُوْنَ جملہ ہے محلاً مرفوع، لَعَلَّ کی خبر ہے۔

تفسیر:

ایسے خدا کی عبادت کرو

یہ خطاب مومن اور کافر سب سے ہے سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو مکلف نہیں ہیں۔

ابن عباس اور حسن سے روایت ہے کہ قرآن میں جہاں بھی یَا اَیُّھَا النَّاسُ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور جہاں یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہے وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ، یعنی اپنے پروردگار کی عبادت کر کے سے اس کی نزدیکی حاصل کرو۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: یعنی توحید پرست بن جاؤ۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ، یعنی تمھیں وجود عطا کیا جب کہ تم موجود نہیں تھے اور تمھیں مخلوقات میں زمانہ کے اعتبار سے مقدم کیا۔ خداوند عالم نے لوگوں پر اور ان کے آباء و اجداد پر اپنی نعمتوں کو بیان فرمایا اس لیے کہ ان

لوگوں پر نعمت، ان کے آباء واجداد کی نعمت کے بغیر تمام نہیں ہو سکتی۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی تمھیں خلق کیا تا کہ اس سے ڈرو اور اس کی عبادت کرو جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (سورۂ ذاریات: آیت ۵۶) (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر محض اس لیے کہ وہ میری عبادت کرتے رہیں)

اس کے معنی ہیں کہ اس کی عبادت کرو تا کہ اس سے ڈرو۔

اسی طرح اس کے معنی یوں بھی بیان کیے گئے ہیں: تا کہ تم اپنے درمیان محرمات سے بچو اور جو چیز اللہ نے حرام کی ہے اس سے پرہیز کرو یہ بالکل اسی طرح ہے کہ کہنے والا کہتا ہے: اِقْبَلْ قَوْلِیْ لَعَلَّكَ تَرْشُدُ۔ میری بات مان لو شاید کہ ہدایت جاؤ۔ کلام میں لَعَلَّ موعظہ کی نرمی اور اس کو قلب سے نزدیک کرنے کے لیے داخل کیا گیا ہے، جس کو واضح کیا جا رہا ہے۔

سیبویہ نے بیان کیا ہے: لَعَلَّ کا لفظ مخاطبین کو امید دلانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۲۰)

تم دونوں اس سے نرم لہجے میں بات کرنا ہو سکتا ہے کہ وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔

اور اس سے موسیٰ اور ہارون پر ابہام کا ارادہ کیا گویا کہ اللہ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں اپنی امید اور اپنی طمع کے مطابق جاؤ اور اللہ تعالیٰ تمہارے پیچھے پیچھے موجود ہے (پشت پناہی کے لئے) اور وہ جانتا ہے کہ امر فرعون کس نہج پر آکر منتہی ہوگا۔ اور کہا گیا ہے کہ لفظ لَعَلَّ کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ عبد کو ہمیشہ آمِنَ (امان دینے والے) کے مقام پر نہ رکھا جائے جو اس کے عمل کی جانب رہنمائی کرے بلکہ ایک حالت کے بعد دوسری حالت تک وہ بڑھتا ہے تا کہ وہ جدوجہد کرتا رہے اور اس کو ترک کرنے سے حذر کرے یعنی ترک نہ کرے۔ اکثر لفظ لَعَلَّ وغیرہ شک کے معانی میں آتے ہیں۔ دار دنیا میں جن کا تعلق آخرت سے ہے اور جب تم آخرت کا تنہا تذکرہ کرو گے تو یقین آجائے گا اور کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے:

لَعَلَّكُمْ تُوْقَوْنَ النَّارَ فِیْ ظَنِّكُمْ وَرَجَائِكُمْ ہو سکتا ہے کہ تم جہنم سے بچ جاؤ اپنے گمان اور اپنی امیدوں کی بنا پر۔

اور اللہ نے لَعَلَّ کا تعلق اپنے بندوں سے رکھا نہ کہ خود اپنی طرف منسوب کیا اور یہ بات سیبویہ کے قول کے نزدیک ہے۔

❁❁❁❁❁

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾
جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی اور آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعہ تمھارے لیے پھلوں کا رزق مہیا کیا۔ جب تم یہ جانتے ہو تو پھر کسی اور کو اللہ کا مدمقابل قرار نہ دو۔

قرائت:

قراء کی ایک جماعت نے جَعَلَ لَکُمۡ میں ادغام کر کے جَعَلَّکُمۡ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے اظہار کیا ہے۔

حجت:

جن قراء نے ادغام کیا ہے ان کی دلیل ایک ہی جنس کے دو حروف کا جمع ہونا اور حرکات کی کثرت ہے۔
اور جن قراء نے اظہار کیا کہ قراء کی اکثریت اسی پر ہے انھوں نے کہا ہے کہ ایک جنس کے دو حرف الگ الگ کلمات میں ہیں۔

ادغام کے بارے میں قراء کے اختلاف اور ان کی دلیلوں کے سلسلہ میں بہت سی باتیں ہیں جو تفسیر قرآن کے علوم کی غرض سے خارج ہیں۔ جو شخص معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس بارے میں لکھی گئی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

الفاظ و معانی:

جَعَل، خَلَق، اِحۡدَاث؛ ایک ہی معنی میں ہیں۔

اَرۡض زمین کے معنی میں مشہور ہے۔ اَرۡض ہر چلنے والے کی ٹانگوں کو بھی کہتے ہیں اور الرعدۃ کپکپی کے معنی میں بھی ہے۔ ابن عباس کے کلام میں آیا ہے: أَزُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ اَمۡ بِیۡ اَرۡضٌ۔ کیا زمین میں

زلزلہ آیا یا میں کانپ رہا ہوں۔

فِرَاش، بِسَاط اور مِهَاد باہم مشابہ ہیں۔

ہر وہ چیز جو کسی چیز کے اوپر ہو یا بلند ہو وہ اپنے سے نیچے والی چیز کے لیے سَمَآء ہے۔ آسمان کو سماء اس کے زمین پر بلند ہونے کے سبب کہا گیا ہے۔

مَاء کی اصل مَوَہ ہے جس کی جمع اَمْوَاہ اور تصغیر مُوَیْہ ہے۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ یعنی بلندی سے نازل کیا۔

تفسیر:

اسی نے سب کچھ خلق کیا ہے

اس آیت کی تفسیر اپنے ماقبل سے متعلق ہے۔ اللہ نے انسانوں کو اپنی عبادت اور اپنی نعمتوں کے اعتراف کا حکم دیا ہے۔ پھر انھیں اپنی نعمتوں کے اقسام شمار کرائے تاکہ اپنی عبادت کے لازم ہونے پر استدلال کرے۔ عبادت خاص نعمت کے سبب واجب ہوتی ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا یعنی جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا تاکہ تم اس میں آباد ہو سکو اور اس کا استعمال کر سکو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ وہ دائمی طور پر ساکن نہ ہو۔

وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً اور آسمان کو بلند و بالا اور مضبوط چھت بنایا۔

وَّاَنْزَلَ اور نازل کیا مِنَ یعنی جانب سے السَّمَآءِ آسمان کی یعنی بادلوں میں سے مَآءً پانی کو۔ فَاَخْرَجَ بِهٖ یعنی پانی سے اُگایا مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ پھلوں میں سے تمہارے لئے رزق یعنی تمہیں عطا کیا، تمہاری ملکیت میں دیا اور تمہاری غذا بنایا۔

یہ بات اس چیز پر تنبیہ اور آگہی ہے وہی ذات وہ ہے جس نے انھیں پیدا کیا اسی نے ان کو رزق عطا کیا نہ کہ وہ (بت جنھیں) انھوں نے خدا کا شریک بنایا پھر اللہ نے انھیں شریک قرار دینے پر تنبیہ کی ہے باوجودیکہ وہ جانتے ہیں اس کی ذات وہی ہے جس کے بارے میں وہ انھیں باخبر کر چکا ہے۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (جب تم یہ بات جانتے ہو تو پھر اللہ کا مدمقابل قرار نہ دو)،

اس میں چند احتمالات ہیں:

۱۔ تم جانتے ہو وہ اصنام جن کی تم عبادت کرتے ہو تمھیں وہ نعمتیں عطا نہیں کر سکتے جنھیں ہم نے شمار کرایا ہے نہ ہی اس جیسی دیگر نعمتیں اور یہ کہ نہ وہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان۔

۲۔ تم عقل و شعور سے مالا مال ہو اور جو اس صفت کا حامل ہوتا ہے اس پر شرائط تکلیف پوری ہو جاتی ہیں۔ حجت تمام ہو جاتی ہیں، غور و فکر کرنے اور اس پر حق تک پہنچنے کی ممانعت اور انحراف کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔

۳۔ مجاہد وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ مراد اہل کتاب (توریت و انجیل والے) ہیں نہ کہ ان کے علاوہ یعنی تم اس بارے میں اپنی دونوں کتابوں میں جانتے ہو۔

سید مرتضیٰ قدس اللہ سرہ نے فرمایا ہے کہ ابو علی جبائی نے اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا اور دوسری آیت میں بِسَاطاً کے ذریعہ نجومیوں کے (زمین کے) کُرَوِی شکل ہونے کے نظریہ کے بطلان پر دلیل پیش کی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے کہا ہے: صرف اسی قدر دلالت نہیں کرتا چونکہ ہم پر (اللہ) کی یہ نعمت کفایت کرنے والی ہے کہ زمین مفروش (بچھی ہوئی اور مسطح ہو اور ایسا ہونا ضروری بھی نہیں ہے اور یہ چیز یقینی طور پر معلوم ہے کہ پوری زمین مسطح نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے استعمال کے مقامات میں اس صفت کے ساتھ اور نجومیوں کے درمیان زمین کے مسطح ہونے کا انکار بھی نہیں ہے جس پر تصرف کیا جاتا ہے (اس پر سکونت اختیار کی جاتی ہے) بلکہ ان کا کہنا ہے زمین کی پوری شکل کروی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾
اور جو کتاب ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے اگر اس بارے میں تم لوگوں کو کسی قسم کا شک ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے علاوہ جو بھی تمھارے مددگار ہیں انھیں بلا لو! اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

ترکیب

اِنْ حرف شرط ہے، فعل مضارع کو جزم دیتا ہے۔ فعل ماضی پر داخل ہوتا ہے تو اسے مستقبل کے معنی میں

کر دیتا ہے۔ شرط کے لئے جزا کا ہونا ضروری ہے۔ شرط و جزا دو جملے ہوتے ہیں جو آپس میں مربوط ہوتے ہیں جیسے اِنْ تَفْعَلْ اَفْعَلْ (اگر تم نے کیا تو ہم بھی کریں گے) آپ کا اِنْ تَفْعَلْ کہنا شرط ہے اور تَفْعَلْ اِنْ کی وجہ سے مجزوم ہے اور اَفْعَلْ کہنا جزاء ہے اور وہ شرط کی وجہ سے مجزوم ہے۔ صرف ان کی وجہ نہیں اور نہ ہی فعل کی وجہ ہے۔

اگر جزاء جملہ فعلیہ ہو تو وہ مجزوم ہے اور اگر جملہ اسمیہ ہو یعنی مبتدا و خبر سے ملکر بنا ہو تو جواب میں فاء کا ہونا ضروری ہے اور وہ جملہ محلاً مجزوم ہوگا۔ کُنْتُمْ محلاً مجزوم ہے اِنْ کی وجہ سے۔

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ. اُتُوْا مبنی بر وقف (سکون) ہے اس لئے کہ امر حاضر جمع مذکر کا صیغہ ہے، واو فاعل ہے فاء اور اس کا بعد محلاً مجزوم ہے اس لئے کہ جزاء ہے۔ فاء سے پہلے والا جملہ فاء کے بعد والے جملے میں عمل نہیں کرے گا:

مِنْ کی چار صورتیں ہیں:

(۱) کسی جگہ سے کسی کام کی ابتدا کے معنی میں ہوگا جیسے: خَرَجْتُ مِنَ الْبَصْرَةِ.

(۲) تبعیض کے معنی میں ہوگا جیسے: اَخَذْتُ مِنَ الطَّعَامِ قَفِيْزاً۔

(۳) تبیین کے معنی میں ہوگا جیسے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (رجس یعنی اوثان (بتوں) سے بچو)

مِنْ تبیین میں اپنے سے پہلے والے جملہ کو خاص بنا دیتا ہے۔ اسی طرح تبعیض میں بعد والے جملہ کو خاص بنا دیتا ہے۔

(۴) زائدہ ہوگا جیسے: مَا جَآءَنِيْ مِنْ رَجُلٍ

جب یہ باتیں جان گئے تو اب ارشاد الٰہی: مِنْ مِثْلِهٖ کے سلسلہ میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مِنْ تبعیض کے معنی میں ہے گویا اس طرح ہے: فَاْتُوْا بِبَعْضِ مَا هُوَ مِثْلٌ لَهٗ یعنی بعض ایسی چیز لے آؤ جو قرآن کے مثل ہو اور وہ سورہ ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ مِنْ صفت کی وضاحت کے لئے ہے۔

کہا گیا ہے کہ زائدہ ہے اس لئے کہ ایک دوسرے مقام پر بِسُوْرَةٍ مِثْلِهٖ کہا ہے یعنی اس قرآن کے مانند۔

ان تینوں قول میں مِثْلِهٖ میں ھاء کی ضمیر "مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا" میں مَا کی جانب پلٹ رہی ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ مِنۡ ابتداء غایت کے معنی میں ہے اور مِثۡلِهٖ کی ضمیر عَبۡدِنَا میں عَبۡدِ کی جانب پلٹ رہی ہے ایسی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے بندے جیسے آدمی سے ایک سورہ لے آؤ۔

پہلا قول زیادہ قوی ہے ان دلیلوں کی بنا پر جنھیں ہم بعد میں بیان کریں گے۔

تفسیر:

قرآن معجزۂ جاویدان

خداوند عالم نے توحید پر دلیل قائم کرنے کے بعد نبوت پر دلیل پیش کی ہے جس سے ان کا بہانہ ختم ہو جائے۔ ارشاد ہوا: وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ۔ اگر تمھیں شک ہے اس کتاب کی صداقت پر جو ہم نے اپنے بندے محمدؐ پر نازل کی ہے اور تمھارا یہ کہنا کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یا نہیں۔ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ۔ یعنی قرآن کے مثل یا اس قول کے مطابق جس میں کہا گیا ہے کہ مِثۡلِهٖ کی ضمیر عَبۡدِنَا کی طرف پلٹ رہی ہے۔ اس کے معنی ہوں گے: فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ بَشَرٍ اُمِّىٍّ مِّثۡلِهٖ۔ تو تم بھی اس بشر امی کی طرح سورہ لے کر آؤ۔ جو خط و کتابت سے بھی اچھی طرح واقف نہیں اور نہ ہی وہ کتابوں کے بارے میں جانتا ہے۔

پہلا قول صحیح ہے جس کی دلیل دوسرے سورہ میں ہے: فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ۔ (سورۂ طور: آیت ۳۴) اگر یہ اپنی بات میں سچے ہیں تو یہ بھی ایسا ہی کوئی کلام لے آئیں۔

قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰٓى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا ‏(سورۂ اسراء: آیت ۸۸) ((اے نبی!) آپؐ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو اس جیسا قرآن نہیں لا سکتے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں)

یعنی ایسا سورہ لے کر آؤ جو اعجاز، حسن نظم، شوکت الفاظ میں اس جیسا ہو جو ہم نے اپنے بندہ محمدؐ کو عطا کیا ہے۔ جو اس سے مخصوص ہے اور کتاب کو پڑھے بغیر گذشتہ اور آئندہ کا علم رکھتا ہو۔

وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ۔ ابن عباس نے بیان کیا ہے یعنی اپنے مددگار و انصار کو لے کر آؤ جو تمھاری تکذیب پر تمھاری مدد کر سکیں۔ ان کے اعوان و انصار کو شھداء اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مدد کے لیے ان کو دیکھتے ہیں۔ شہید مُشَاهِد کے معنی میں ہوتا ہے جیسے جلیس اور اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے

لیے شہادت دیتا ہے جو اس کے دعوے کو ثابت کرتا ہے کہ وہ اس کا گواہ ہے۔

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ خدا کے علاوہ یعنی جنھیں کو تم نے اللہ کے علاوہ مددگار بنایا ہے ان کو لے کر آؤ!

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اگر تم سچے ہو) اس بارے میں کہ یہ کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے بنائی ہوئی ہے۔

فراء نے کہا ہے کہ اپنے خداؤں کو بلاؤ۔

مجاہد اور ابن جریج کا کہنا ہے اس سے مراد وہ قوم ہے جو تمھارے لیے اس امر پر گواہی دے سکے جن کا قول قابل قبول ہو۔

ابن عباس کا قول زیادہ قوی ہے اس لیے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کتاب کا مثل پیش کرنے کے لیے اپنے مددگاروں سے نصرت طلب کرو اس لیے کہ دعا استعانت کے معنی میں بھی ہے۔

مجاہد کے قول کی کوئی دلیل نہیں ہے اس لیے کہ شاہدین یا تو مومنین ہوں گے یا کفار، مومنین کفار کے گواہ نہیں ہو سکتے، کفار ابطال حق اور احقاق باطل میں کوشاں ہوں گے، جب انھیں بلایا جائے گا تو ان کے شہداء کس فریق سے ہوں گے البتہ مناسب ہے کہ اس امر کو اللہ کے اس ارشاد کے مانند قرار دیا جائے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (سورۂ اسراء، آیت ۸۸) ((اے نبی!) آپ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو اس جیسا قرآن نہیں لا سکتے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں)

بعض مفسرین نے کہا ہے: یہ وجہ مناسب اور ممکن ہے اس لیے کہ عقلاء ایسی گواہی پیش کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے جس کے ذریعہ ان کے کلام میں رسوائی ہو، اس لیے کہ قرآن کا مثل نہیں ہو سکتا، اسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے مقابلہ کے لیے تیار کریں جس کا اصلاً کوئی مقابل ہی نہیں ہے۔ یہ آیت ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے جس کا چیلنج اللہ نے قرآن کے ذریعہ کیا ہے اور اس کے بعض حصے کے ذریعہ فرمایا ہے، استدلال کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے ایسی قوم جو صاحب عقل اور فصاحت میں بلند مقام رکھتی تھی اور بلاغت کے آخری درجہ پر فائز تھی سے خطاب فرمایا ہے، ان کی جانب انھیں کی جنس کلام کو نازل فرمایا اور انھیں کل یا بعض کا مثل لانے کا چیلنج کیا۔ اس کا ارشاد: قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (سورۂ ہود،

آیت ۱۳)((اے نبیؐ!) آپ فرمادیجیے کہ تم اس جیسی دس سورتیں گھڑ کر لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جسے چاہو اپنی مدد کے لیے بلالو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو)

ان کی عاجزی کو ان پر حجت اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی دلیل قرار دیا ہے باوجودیکہ وہ اہل حمیت وغیرت تھے۔ انھوں نے قرآن کے پیغام کو خاموش کرنے کے لیے اپنے اموال اور نفوس خرچ کیے لیکن قرآن کے کسی ایک سورہ کا جواب نہیں لاسکے، نہ ہی خطبہ کے ذریعہ وہ ایسا کر سکے جس سے ہمیں معلوم ہو جاتا کہ یہ معارضہ (مقابلہ) ان پر دشوار تھا جو اس امر پر دلیل ہے کہ قرآن معجزہ ہے اور حضورؐ کی نبوت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

❁❁❁❁❁

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾
اگر تم نے ایسا نہیں کیا اور ہرگز ایسا نہیں کرسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر بنیں گے۔ جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

ترکیب:

اِنْ حرف شرط ہے اور لَمْ ایک ایسا حرف ہے جو فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اسے ماضی منفی کے معنی میں کر دیتا ہے اور جزم دے دیتا ہے۔

تَفْعَلُوْا: فعل وفاعل ہے اور مجزوم ہے لَمْ کی وجہ سے اس میں علامت جزم نون کا ساقط ہونا ہے۔

لَمْ تَفْعَلُوْا: بھی محلا مجزوم ہے اِنْ کی وجہ سے۔

لَنْ حرف جو فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے اسے مستقبل سے مخصوص کر دیتا ہے، اسے منفی بنا دیتا ہے اور مضارع کو نصب دیتا ہے تَفْعَلُوْا میں علامت نصب نون کا ساقط ہونا ہے۔

سیبویہ نے لَنْ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ خلیل کا گمان ہے کہ لَنْ دراصل، لَا اَنْ ہے دونوں الف کو لام میں کثرت کی وجہ سے حذف کر دیا ہے جیسا کہ وَیْلُمِّہٖ کہا ہے اور اسے ایک حرف کے مانند قرار دیا ہے جس طرح ھَلَّا کو ایک حرف بنا دیا ہے حالانکہ وہ ھَلْ اور لَا تھا۔

سیبویہ نے کہا: یہ نظریہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو زَیۡدًا اَلَّنۡ اَضۡرِبَ جائز نہ ہوتا۔

میں کہتا ہوں: اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر لَنۡ کی اصل لَا اَنۡ ہوتی تو اَنۡ کا ما بعد اس کا صلہ ہوتا اور جو صلہ میں معمول ہے اسے موصول پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے تو پھر لازم ہوتا کہ لَنۡ اَضۡرِبَ زَیۡدًا میں زَیۡدًا کو لَنۡ کے اوپر مقدم کیا جائے۔ اسی طرح اسے ان پر بھی مقدم کرنا جائز نہ ہوتا۔ آپ یہ نہیں سکتے تھے کہ زَیۡدًا اَنۡ اَضۡرِبَ وَ زَیۡدًا اَلَّا اَنۡ اَضۡرِبَ حالانکہ ان مقامات پر علمائے نحو کے درمیان مقدم کرنے پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

لَنۡ تَفۡعَلُوۡا: اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے اس لئے کہ یہ جملہ معترضہ ہے جو شرط و جزا کے درمیان واقع ہوا ہے جیسے آپ کے اس کلام: زَیۡدٌ فَافۡهَمۡ مَا اَقُوۡلُ لَكَ عَالِمٌ میں جملہ معترضہ فَافۡهَمۡ مَا اَقُوۡلُ لَكَ، مبتدا و خبر (زَیۡدٌ عَالِمٌ) کے درمیان واقع ہوگیا ہے۔

وہ جملہ معترضہ جو مفرد کی جگہ پر واقع نہ ہو تو اس کا محل اعراب ہوتا ہے۔

تفسیر:

تمھارے بس میں نہیں ہے!

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا یعنی اگر تم اس جیسا سورہ نہ پیش کر سکے جس پر تم اور تمھارے شرکاء اور مددگار نے ایک دوسرے کی مدد کی، تمھاری عاجزی اور مجبوری تم پر واضح ہوگئی، اسی طرح تمام مخلوقات کی عاجزی بھی اور جب تمھیں معلوم ہوگیا کہ یہ میری طرف سے ہے تو اب اس کی تکذیب نہ کرو۔

وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا یعنی: تم اس کے سورے کا جواب کبھی بھی نہیں لا سکتے اس لیے کہ لَنۡ مستقبل میں ہمیشہ ہمیشہ کی نفی کرتا ہے۔ اس میں ہمارے پیغمبرؐ کی نبوت کے صحیح ہونے پر دلیل ہے اس لیے کہ قرآن مستقبل میں ان کے حالات کی پیشنگوئی کر رہا ہے کہ وہ اس کے مثل پیش نہیں کر سکے جو اس سے مافوق ہوتا ہے جس کے بارے میں خبر دی گئی تھی۔

فَاتَّقُوا النَّارَ اپنے جھٹلانے کے باعث جہنم واصل ہونے سے خوف کرو! اسی طرح اس کا ارشاد ممکن ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ جواب شرط ہو جہنم سے خوف کے لازم ہونے کے ساتھ اس حالت میں کس طرح تصرف ہو اس لیے کہ ان لوگوں کو خوف کا پابند نہیں بنایا جا سکتا تھا مگر تصدیق نبوت کے بعد اور نبوت کا علم حاصل نہیں ہو سکتا مگر معجزہ کے قیام کے بعد گویا ارشاد ہوا: فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا، اس طرح حجت قائم ہوگئی، اس

آگ سے بچنا واجب ہو گیا، ایسی آگ کہ وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔

حِجَارَةٌ حَجَرٌ (پتھر) کی جمع ہے، بیان کیا گیا ہے یہ کبریت (گندھک) کا پتھر ہے جب اسے گرم کیا جاتا ہے تو شدید گرم ہوتا ہے۔ ابن مسعود اور ابن عباس سے روایت ہے: انسان اور پتھر آتش جہنم کا ایندھن ہوں گے اس سے مراد پتھر سے تراشے ہوئے بت ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ (سورۂ انبیاء، آیت ۹۸) (بے شک تم اور جنھیں تم اللہ کے علاوہ پوجتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں)

بیان کیا گیا ہے کہ پتھر کا ذکر کرنا آگ کے شدید ہونے کی دلیل ہے جو انتہائی شدت کے عالم میں ہوتی۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اجسام آگ میں پتھروں کے باقی رہنے تک رہیں گے جن کے ذریعہ آگ جلائی جائے گی، اس بات کی تائید اللہ کا یہ ارشاد کر رہا ہے: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا۔ (سورۂ نساء، آیت ۵۶)

(جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کیا ہے ہم انھیں جہنم میں جھونک دیں گے جب ان کی کھالیں آگ کی تپش سے گل جائیں گی تو ہم اس کے علاوہ ان کے لیے دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں بے شک اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے) اس کے معنی میں بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں پر آتش جہنم میں گرم پتھر کے ذریعہ عذاب کیا جائے گا۔

ارشاد الٰہی: أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ۔ یعنی اسے کافروں کے واسطے خلق اور آمادہ کیا گیا ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اس لیے کہ دوزخیوں کی بیشتر تعداد کافروں کی ہوگی، اس لئے ان کی جانب نسبت دی گئی ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آگ کو خصوصیت کے ساتھ کافروں کے لیے مہیا کیا گیا ہے اگرچہ اسے فاسقوں کے لیے بھی مہیا کیا گیا ہے۔ اس سے مخصوص آگ مراد ہے جس میں ان کے سوا کوئی دوسرا داخل نہیں ہوگا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (سورۂ نساء، آیت ۱۴۵) (بے شک منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے)

یہ آیت اس قول کے بطلان پر دلالت کر رہی ہے جس میں غور و فکر اور عقلی دلیلوں پر نظر کرنے کو حرام کہا گیا ہے اس لیے کہ اللہ نے اس چیز کے ذریعہ کافروں پر حجت پیش کی جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ذریعہ انھیں پیغمبر کی نبوت کی تصدیق کا پابند بنایا گیا ہے اور ان کے لیے معین کر دیا ہے۔ قرآن اس کا

[illegible] کا ارشاد ہے کہ اگر یہ قرآن محمد کا کلام ہے تو اس کے مثل ایک ہی سورہ لے آؤ اگر یہ کسی بشر کا [illegible] تمھارے لیے اپنی فصاحت وبلاغت میں مہارت اور پیش رفت کے باعث قرآن کی مثل یا اس کے [illegible] ممکن ہوتا جب کہ تمھیں اس امر کی پر زور دعوت بھی دی گئی ہے۔ اب جبکہ تم اس کا مثل [illegible] تو اپنی عقلوں کے سبب جان لو کہ یہ اللہ کا کلام ہے، عقلی دلیل وحجت سے یہی مراد ہے جس پر [illegible] کے ذریعہ استدلال کیا گیا ہے: اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ، کہ آگ اس وقت موجود ہے اس لیے کہ آمادہ [illegible] ہو سکتی ہے۔ اسی طرح جنت ہے اس کا ارشاد ہے: اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ، اگرچہ ہم ان دونوں [illegible] رہے ہیں لیکن ملائکہ دونوں کو دیکھ رہے ہیں۔ یا تمام مکلفین اور اہل استدلال ہیں جو متقین کے [illegible] ثواب اور کافروں کے عذاب کے متعلق جانتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور (اے نبی!) آپ ان لوگوں کو خوش خبری سنا دیں جو (اس کتاب پر) ایمان لائے اور اعمال صالح بجا لائے کہ ان کے لیے بہشت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جب بھی انھیں وہاں کے پھلوں کو بطور رزق دیا جائے گا وہ کہہ اٹھیں گے یہ پھل تو ہم پہلے بھی کھاتے رہے ہیں۔ درحقیقت انھیں (دنیاوی پھلوں سے) ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے اور وہاں پر ان کے لیے پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ لوگ ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے۔

الفاظ ومعانی:

بَشَارَۃ کے معنی خبر دینا ہیں جس کے ذریعہ خبر سننے والے کو خوش کیا جاتا ہے جب وہ خبر ہر خبر سے پہلے ہو، [illegible] ہے کہ دوسری خبر و بشارت نہیں کہتے، کبھی عام خبر کو بھی بشارت کہتے ہیں ارشاد ہوتا ہے: وَبَشِّرْهُمْ

بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ. یہ مجازاً ہے۔ یہ بَشَرَۃ سے مشتق ہے یعنی جلد (کھال) کا ظاہری حصہ اس لیے کہ پہلی خبر سن کر کھال میں تغیر و تبدل واقع ہوجاتا ہے۔

جَنَّات جَنَّۃ کی جمع ہے یعنی باغ۔ اس جنت سے مراد وہ جنت ہے جس میں درخت اور پھل ہوں گے اور وہ روئے زمین پر باغ کے علاوہ ہے۔ لہٰذا ارشاد ہوا کہ: تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ. (اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی) واضح سی بات ہے کہ اس خبر سے نہروں کا پانی مراد ہے جو درختوں کے نیچے جاری ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر پانی زمین کے نیچے ہوگا تو اس میں چشموں کے لیے کوئی فائدہ نہیں ہوگا جیسا کہ مسروق سے روایت کی گئی ہے کہ جنت کی نہریں طویل گڑھے کے علاوہ دوسری جگہ جاری ہوں گے۔

جنۃ کی اصل جَنّ ہے جس کے معنی پوشیدہ اور چھپے ہوئے کے ہیں۔ جِنّ اسی سے مشتق ہے چونکہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ جُنُون کہتے ہیں چونکہ عقل پوشیدہ ہوجاتی ہے۔ جُنَّۃ (سپر) کو کہتے ہیں چونکہ جسم کو ڈھانپ لیتی ہے۔ جَنِیۡن اس بچے کو کہتے ہیں جو رحم مادر میں پوشیدہ رہتا ہے۔

مفضل نے بیان کیا ہے کہ جس باغ میں انگور کی بیلیں ہوں اسے فِرۡدَوۡس کہتے ہیں چاہے اس میں درخت ہوں یا نہ ہوں۔ جَنَّۃ اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کھجور کے درخت ہوں، چاہے کھجور کے درخت کے علاوہ دوسرے درخت ہوں یا نہ ہوں۔

اَزۡوَاج، زَوۡج کی جمع ہے۔ زوج مرد اور عورت دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، عورت کے لیے زَوۡجَۃ بھی بولا جاتا ہے۔ خُلُود یعنی دوام اور بقا۔

ترکیب

اَنَّ اپنے اسم و خبر کے ساتھ محلاً منصوب ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ مومنین کو بشارت دے دیجئے کہ ان کے لئے باغات ہیں۔ جب باء ساقط ہوگیا تو فعل اَنَّ تک پہنچ گیا اور اس کو نصب دے دیا۔ خلیل کے قول کے مطابق محلاً مجرور ہے باء ساقط ہوجائے تب بھی۔

جَنّٰتٍ منصوب ہے ان کا اسم ہے۔

لَهُمۡ جار و مجرور اَنَّ کی خبر ہے تاء جمع مونث کی تاء ہے حالت نصب و جر میں ایک ہی صورت میں رہتی ہے۔ جس طرح 'اَلزَّیۡدِیۡنِ' وغیرہ میں جمع مذکر کی یاء حالت نصب و جر میں ایک ہی صورت میں رہتی ہے۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جملہ حالت نصب میں ہے اس لئے کہ جَنّٰتٍ کی صفت ہے۔

كُلَّمَا: جب بھی کُلّ کو مَا جزاء سے ملا دیا جائے تو وہ حرف تکرار بن جائے گا اور بر بنائے ظرف منصوب ہوگا اور اس میں عامل رُزِقُوْا مِنْهَا ہے۔

مِنْ ثَمَرَةٍ میں مِنْ زائدہ ہے یعنی رُزِقُوْا مِنْهَا ثَمَرَةً۔

بعض نے کہا: مِنْ تبعیض کے معنی میں ہے اس لئے کہ وہ ہر وقت کچھ پھل پائیں گے۔ یہ مِنْ بیان جنت کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ رزق کو بیان کر رہا ہے کہ اس کی جنس کیا ہے۔

مِنْ قَبْلُ گویا اس طرح ہے کہ: مِنْ قَبْلِ هٰذَا الزَّمَانِ اَوْ هٰذَا الْوَقْتِ۔ یعنی اس زمانے یا اس وقت سے پہلے۔ پس یہاں سے لفظاً مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا ہے حالانکہ اضافت معنیٰ مراد ہے۔

قَبْلُ مبنی ہو گیا ہے اس لئے کہ وہ حرف سے مشابہ ہے اور یہ مبنی بر حرکت ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ وہ اصل میں معرب ہے اور اسے مبنی بر ضمہ ہونے سے مخصوص کیا گیا ہے حالانکہ اضافت کے وقت اس کا اعراب فتحہ اور کسرہ ہوتا تھا۔ جیسے مِنْ قبلِكَ اَوْ قبلَكَ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظرف ہے ایسی حرکت سے مبنی ہو گیا ہے کہ معرب ہونے کی حالت میں وہ حرکت اس پر داخل نہیں ہوتی تھی اور وہ ضمہ ہے۔ وہ محلاً منصوب ظرف کی بنا پر۔

مُتَشَابِهًا منصوب، حال ہے۔

اَزْوَاجٌ مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر یا ظرف (یعنی خبر) ہونے کی بنا پر۔

تفسیر:

بہشتی نعمتوں کی خصوصیات

خداوند عالم نے اس آیت میں وعدہ (بشارت) کو وعید (عذاب سے ڈرانا) کے ساتھ بیان فرمایا ہے تا کہ رغبت اور خوف دونوں حاصل ہوں۔

وَبَشِّرِ خوش خبری دے دیجئے، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ان لوگوں کو جنھوں نے تصدیق کی، وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اعمال صالحہ بجالائے، جو ان کے اور ان کے پروردگار کے درمیان ہے۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا ایسے باغات ہیں کہ جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے الْاَنْهٰرُ، نہریں

جاری ہوں گی۔ اصل میں نہر جاری نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں پانی جاری ہوتا ہے۔ مجازاً نہر کے لئے جاری ہونے کا استعمال ہوا ہے اس لیے کہ وہ پانی کے جاری ہونے کا مقام ہے۔

ارشاد: كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا۔ جب بھی انھیں ان باغات سے روزی دی جائے گی، باغات سے مراد اس کے درخت ہیں، اصل میں اس طرح ہے کہ جب بھی انھیں ان باغات کے درختوں سے رزق دیا جائے گا جنھیں خدا نے مومنین کے لئے مہیا کیا ہے۔ مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا۔ انھیں ان کے پھل عطا کیے جائیں گے کہ جن سے وہ کھائیں گے اس لیے کہ رزق سے مراد وہ چیز ہے جس سے فائدہ اٹھانا صحیح ہو اور اس سے کسی کو روکنے کا حق نہیں ہو۔

قَالُوا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ، تو وہ کہیں گے: یہ پھل تو ہم پہلے بھی کھاتے رہے ہیں۔

اس فقرہ میں چند وجہیں ہیں:

۱۔ جنت کے پھل جب درختوں سے چنے جائیں گے تو اس کی جگہ پر اسی جیسا پھل آجائے گا جو ان پر مشتبہ ہو جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو ہمیں پہلے کھلایا جا چکا ہے۔ یہ ابوعبیدہ اور یحییٰ بن کثیر کا قول ہے۔

۲۔ یعنی اس سے قبل ہمیں دنیا میں عطا کیا جا چکا ہے۔ یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود سے منقول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وہی پھل ہے کہ جس کا ہم سے دنیا میں وعدہ کیا گیا تھا۔

۳۔ جسے ہمیں جنت میں پہلے عطا کیا جا چکا ہے یعنی اسی کے مانند ہے جو ہمیں عطا کیا جا چکا ہے باوجودیکہ وہ جانتے ہیں یہ اس کے علاوہ ہے لیکن وہ اس کے ذائقہ، رنگ، بو اور پاکیزگی اور خوبصورتی میں اس سے تشبیہ دیں گے۔ یہ روایت حسن اور واصل سے مروی ہے۔

شیخ طوسیؒ فرماتے ہیں: قوی ترین قول ابن عباسؓ کا قول ہے؛ اس لیے کہ ارشاد الٰہی ہے: كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ، اس میں عمومیت ہے تخصیص نہیں ہے جو کچھ انھیں دیا گیا اس میں یہ بات پوشیدہ نہیں ہے مگر یہ کہ اشارہ ہے اس چیز کی جانب جو ان کا رزق دنیا میں گذر چکا ہے، اس کی تقدیر اس طرح ہوگی یہ اس کے مانند ہے جو ہمیں عطا کیا جا چکا تھا دنیا میں اور وہ معدوم ہو گیا، مضاف الیہ مضاف کا قائم مقام ہو گیا۔ یہ اسی طرح جیسے کوئی کہے: میں نے تمھارے لیے کھانا تیار کیا ہے اور وہ اس کی اچھائی بیان کرتے ہوئے کہے یہ کھانا تو میرے گھر میں ہے اس سے اس کا مقصد اس کی مثل اور اس کی جنس سے ہو۔

ارشاد: وَاُتُوْا بِهٖ یعنی ان کے لیے لایا جائے گا، اس کے معنی انھیں عطا کرنے کے نہیں ہیں۔

مُتَشَابِهًا میں چند وجہیں ہیں:

۱۔ وہ سب کے سب رنگت میں مشابہ ہیں، مزے میں مختلف ہیں۔ یہ روایت ابن عباس اور مجاہد سے ہے۔

۲۔ تمام کے تمام اپنی خوبصورتی اور خوبی میں مشابہ ہیں جس میں کسی طرح کی کوتاہی اور گھٹیا پن نہیں ہے۔ یہ روایت حسن وقتادہ کی ہے۔ اسی کو اخفش نے اختیار کیا ہے، اس نے کہا ہے: یہ ایسا ہے جیسے کوئی کہے: میرے پاس بلند مرتبہ اشیاء لائی گئیں، میں ان کے فضل میں مشتبہ ہو گیا میں نہیں جانتا کہ ان میں کس کو فضیلت دوں، تمام کی تمام میرے نزدیک برتر ہیں۔

۳۔ یہ دنیا کے پھلوں سے مشابہ ہیں مگر یہ کہ جنت کے پھل زیادہ پاک و پاکیزہ ہیں۔ یہ روایت عکرمہ سے ہے۔

۴۔ بعض بعض سے لذت اور جملہ صفات میں مشابہ ہیں۔ یہ روایت ابو مسلم سے ہے۔

۵۔ مشابہت، موافقت اور مطابقت کے اعتبار سے ہے۔ خادم اپنے مسکن (ٹھکانا) کی موافقت کرتا ہے اور مسکن بچھونے کے مناسب حال ہوتا ہے۔

ارشاد: وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ (اور ان کے وہاں پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی)، بیان کیا گیا ہے کہ یہ حوریں ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا کی عورتیں ہیں۔ حسن نے بیان کیا ہے یہ تمام عورتیں دنیا کی آلائش سے پاک و صاف ہوں گی۔

مُطَهَّرَةٌ بیان کیا گیا ہے کہ جسمانی، اخلاقی اور اعمال کے اعتبار سے پاک و پاکیزہ ہوں گی۔ انھیں حیض نہیں آئے گا، نہ بچہ پیدا کریں گی، نہ انھیں بول و براز ہوگا۔ ہر طرح کی آلائش اور گناہوں سے پاک ہوں گی۔ یہ قول مفسرین کی ایک جماعت کا ہے۔

وَهُمْ فِيهَا اور وہ سب کے سب اس میں یعنی جنت میں خَٰلِدُونَ، ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ انھیں باقی رکھے گا۔ یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوگا، نہ ہی اس کا اختتام ہوگا اس لیے کہ نعمت ہمیشہ باقی رہنے ہی سے مکمل ہوتی ہے جس طرح زوال اور فنا سے کم ہو جاتی ہے۔ خلود ابتدا کرنے کے وقت سے دوام کے معنی میں ہے لہٰذا اللہ کو خالد نہیں کہا جاتا ہے۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾

اللہ اس بات میں شرم محسوس نہیں کرتا کہ وہ مثال بیان کرے مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی اور چیز کی۔ جو لوگ صاحبان ایمان ہیں وہ جان لیتے ہیں کہ یہ سب ان کے پروردگار کی جانب سے برحق ہے اور جنھوں نے کفر اختیار کیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ: ''اللہ ان مثالوں کو کس مقصد کے لیے بیان کرتا ہے؟ وہ اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔'' حالانکہ گمراہی میں وہی مبتلا رہتے ہیں جو فاسق ہیں۔

قرائت:

یَسْتَحْیِیْ دو یاء کے ساتھ ہے۔ ابن کثیر سے یَسْتَحِیْ ایک یاء کے ساتھ مروی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے دو یاء کے جمع ہونے کو سنگین مان کر ایک یاء کو حذف کر دیا۔ یہ بنی تمیم کی لغت ہے۔

الفاظ و معانی:

اِسْتِحْیَاء حیاء سے ہے اس کی ضد قِحَۃ یعنی بے حیائی ہے۔

فِسق و فُسُوق امر الٰہی کا ترک کرنا ہے۔ فراء نے کہا ہے: فِسق اطاعت سے خارج ہو جانا ہے۔

ترکیب:

مَا بَعُوضَةً میں مَا منصوب ہے اس کی چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) مَا زائدہ ہے اور اس کے معنی تاکید کے ہیں جیسا کہ اس آیت میں ہے: »فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ۔ گویا اس طرح ہے کہ۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ بَعُوضَةً مَثَلًا أَوْ مَثَلًا بَعُوضَةً

ایسی صورت میں بَعُوْضَةً، یَضْرِبَ کا مفعول ثانی ہوگا۔

(۲) مَا نکرہ ہے کہ جس کی تفسیر بَعُوْضَةً کے ذریعہ کی گئی ہے جس طرح اس آیت میں مَا موصوفہ ہے: هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ۔ اس ترکیب کی بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہونا: لَا يَسْتَحْيِيْ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلاً شَيْئًا مِنَ الْاَشْيَآءِ بَعُوْضَةً. بَعُوْضَةً شَيْئًا کا بدل ہوگا۔ (اللہ اس بات سے شرم محسوس نہیں کرتا ہے کہ کسی چیز کی مچھر سے مثال دے)

(۳) جو بات فراء سے حکایت کی گئی ہے کہ مراد مَا بَيْنَ بَعُوْضَةٍ اِلٰى مَا فَوْقَهَا (جو چیز مچھر اور اس سے بڑھ کر ہے) ہے جیسا کہ ان مثالوں میں ہے: مُطِرْنَا مَا زُبَالَةَ اِلَى التَّغْلَبِيَّةِ وَ لَهٗ عِشْرُوْنَ مَا نَاقَةً فَجَمَلًا وَ هِيَ أَحْسَنُ النَّاسِ مَا قَرْنًا فَقَدَمًا۔ ہمارے اوپر بارش ہوئی زبالہ سے تغلبیہ کے درمیان۔ اس کے پاس بیس اونٹنی اور اونٹ کے درمیان ہے۔ وہ اپنی ہمجولیوں کے درمیان سب سے خوبصورت ہے۔ ان ساری مثالوں میں انھوں نے مَا سے مراد مَا بَيْنَ لیا ہے۔ اہل بصرہ نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے اس وجہ کے اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ ضَرَبَ یہاں پر جَعَلَ کے معنی میں ہے لہٰذا وہ دو مفعول کی جانب متعدی ہوسکتا ہے۔

اِنَّمَا مبتدا اور خبر پر داخل ہوتا ہے اور قرآن مجید میں جو چیز اس بات پر دلالت کر رہی ہے وہ یہ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ۔ مَثَلُ الْحَيٰوةِ مبتدا ہے اور كَمَآءٍ اس کی خبر ہے ایک دوسری آیت میں آیا ہے: وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ، اِضْرِبْ مبتدا اور خبر پر داخل ہوا ہے گویا آپ کے اس کلام کے مانند ہوگیا کہ ظَنَنْتُ زَيْدًا كَعَمْرٍو۔

ترکیب میں بَعُوْضَةً کو رفع بھی دے سکتے ہیں اگرچہ یہاں قرائت میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ رفع دینے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) مبتدا محذوف کی خبر مَا کے صلہ میں ہے گویا اس طرح فرمایا: اَلَّذِيْ هُوَ بَعُوْضَةٌ: یہ اس شخص کی قرائت کے مانند جس نے تَمَامًا عَلَى الَّذِيْ اَحْسَنَ میں اَحْسَنُ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ترکیب سیبویہ کے نزدیک ضعیف ہے۔ اَلَّذِيْ میں یہ اقویٰ ہے اس لئے کہ اَلَّذِيْ موصول ہے اور اَلَّذِيْ کے لئے اسماء کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں ہے۔

(۲) یا جواب کی بنا پر اسے رفع دے سکتے ہیں گویا کہ جب کہا گیا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ اَنْ

یَضْرِبَ مَثَلًا مَّا (اللہ اس بات سے شرم نہیں کرتا ہے کہ کوئی مثال دے) تو سوال کیا گیا کہ وہ کیا ہے؟
جواب آیا: بَعُوْضَۃٌ۔ جس طرح آپ یہ کہتے ہیں کہ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ زَیْدٌ یعنی ھُوَ زَیْدٌ۔
ایسی صورت میں مَا صفت اور صلہ سے خالی ہوگا۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ میں اَمَّا تشدید کے ساتھ پورے عرب کی زبان ہے اور بنی تمیم کے بہت سے لوگ اَیْمَا فُلَانٌ فَیَفْعَلُ کَذَا، ایک شاعر (اخطل) کا شعر ہے۔

مُبَتَّلَۃٌ ھَیْفَاءُ اَیْمَا وِشَاحُھَا فَیَجْرِیْ وَاَیْمَا الْحِجْلُ مِنْھَا فَلَا یَجْرِیْ

اَمَّا ایک ایسا کلمہ ہے جو دو یا کئی چیزوں کے درمیان آتا ہے اور ان کے درمیان گفتگو کی تفصیل بیان کرتا ہے؛ جیسے آپ کا یہ کہنا: اَمَّا زَیْدٌ فَمُحْسِنٌ وَّ اَمَّا عَمْرٌو فَمُسِیْئٌ: (البتہ زید، تو وہ نیکوکار ہے اور عمرو تو وہ خطا کار ہے) اس مثال میں زَیْدٌ مبتدا ہے اور مُحْسِنٌ اس کی خبر ہے اور اس میں شرط و جزا کے معنی پائے جاتے ہیں اور گویا اس طرح ہے: مَھْمَا یَکُنْ مِنْ شَیْءٍ فَزَیْدٌ مُحْسِنٌ۔ پھر اَمَّا کو شرط کی جگہ رکھ دیا گیا۔ پس یہ حاصل ہوا کہ اَمَّا فَزَیْدٌ مُحْسِنٌ۔ پھر فاء کو خبر دے دیا تا کہ لفظ کی اصلاح ہو جائے اس لئے کہ جو فاء تعقیب کے لئے اسے کلام کے آغاز میں لانا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس قول کی بنا پر اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں اَلَّذِیْنَ مبتدا ہے اور یَعْلَمُوْنَ اس کی خبر ہے اسی طرح اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا میں اَلَّذِیْنَ مبتدا ہے اور اس کی خبر یَقُوْلُوْنَ ہے۔

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا۔

مَا استفہامیہ ہے اور وہ اسم ہے محلا مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر اور ذَا اَلَّذِیْ کے معنی میں ہے اس کا صلہ اس کے بعد کے کلمات، میں اور وہ اِذَا بھی محلا مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر ہے۔ گویا اس طرح ہے: اَیُّ شَیْءٍ اَلَّذِیْ اَرَادَ اللّٰہُ۔ کون سی چیز ہے کہ جس کا ارادہ خدا نے کیا ہے؟ ایسی صورت میں جواب مرفوع ہوگا جیسے آپ کا یہ کہنا کہ اَلْبَیَانُ لِحَالِ مَنْ ضُرِبَ لَہُ الْمَثَلُ۔ شخص کے لئے مثال دی گئی ہے اس کی حالت کا بیان ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مَا اور ذَا ایک نام ہوں گویا اس طرح ہو کہ اَیَّ شَیْءٍ اَرَادَ اللّٰہُ۔ ایسی صورت میں منصوب ہوگا اس لئے کہ اَرَادَ کا مفعول بہ ہے۔ لہذا جواب منصوب ہوگا جیسے آپ کا یہ کہنا: اَلْبَیَانَ لِحَالِ مَنْ ضُرِبَ لَہُ الْمَثَلُ۔ پہلے نظریہ کی مثال یہ ارشاد الٰہی ہے: مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ قَالُوْآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ، اور دوسرے قول کی مثال یہ آیت ہے: مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ قَالُوْا خَیْرًا۔

مثلاً بعیان حال منصوب ہے کہا گیا کہ قطع کی بنا پر اور یہ بھی کہا گیا کہ تفسیر کی بنا پر منصوب ہے۔

•

شانِ نزول:

عبداللہ ابن مسعود اور ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: جب خداوند عالم نے منافقین کے لیے اس آیت سے قبل دو مثالیں پیش کیں: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ (آیت:۱۷) اور آیت: أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ (آیت:۱۹) تو منافقین کہنے لگے کہ اللہ کی ذات اس طرح کی مثالیں پیش کرنے سے بلندو بالا ہے۔ اس موقع پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

قتادہ اور حسن سے روایت کی گئی ہے کہ جب خداوند عالم نے مکھی اور مکڑی کی مثال پیش فرمائی تو مشرکین میں سے کچھ لوگوں نے باتیں بنانا شروع کر دیں اور اس طرح کی مثالوں کے ذکر کو معیوب جانا۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

کیا خدا بھی مثال دیتا ہے؟

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي (بے شک اللہ اس بات میں شرم محسوس نہیں کرتا) یعنی بے شک اللہ نہیں چھوڑتا، ترک نہیں کرتا۔ اور کہا گیا ہے کہ نہیں رُکتا۔ جب ہم میں سے کوئی کسی چیز سے حیا کرتا اور شرماتا ہے تو اسے ترک کر دیتا ہے اور اس سے رک جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم حقیر چیز کے بیان کرنے کو بھی نہیں چھوڑتا ان کے حقیر ہونے کے سبب، جب اس کی مثال پیش کرنے میں کوئی مصلحت دیکھتا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم اس چیز سے شرماتا ہے جو بذاتہ بری اور قبیح ہو جس کا انجام دینا فاعل کے لیے عیب اور بری بات ہو خداوند عالم نے باخبر کیا ہے کہ مثال پیش کرنا نہ قبیح ہے نہ ہی عیب ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ مثال پیش کرنے سے نہیں ڈرتا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (سورۂ احزاب، آیت ۳۷) (اور آپ کو لوگوں کا ڈر تھا حال آں کہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس

سے ڈریں) یعنی آپ لوگوں سے حیا کرتے ہیں اللہ اس امر کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔

یہاں استحیاء خشیت کے معنیٰ میں ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر خشیہ (خوف) استحیاء کے معنی میں ہے۔

استحیاء کے لغوی معنیٰ برائی میں مبتلا ہونے کے خوف سے کسی کام سے رک جانے، ٹھہر جانے کے ہیں۔علی ابن عیسیٰ نے کہا ہے: اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیر لوگوں کے لیے حقیر چیز کی مثال پیش کرنا عیب نہیں ہے کہ اس سے حیا اور شرم کی جائے۔

مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی اور چیز کی) یعنی جو اس سے عظیم و بلند ہو۔ یہ روایت قتادہ اور ابن جریج سے منقول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: جو اس سے چھوٹی ہونے اور قلت میں بلند چیز ہو یہاں پر مقصد چھوٹا ہونا ہے۔

ربیع ابن انس نے بیان کیا ہے: مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے زندہ رہتا ہے جب خون چوس کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے اسی طرح وہ قوم بھی ہے جس کے لیے یہ مثال پیش کی گئی ہے۔ جب وہ دنیا سے سیر ہو جاتے ہیں تو اس وقت اللہ انھیں مبتلا کر دیتا ہے، اٹھا لیتا ہے، پھر انھوں نے اس کی تلاوت کی: حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (سورۂ انعام، آیت ۴۴) (جو کچھ انھیں دیا گیا تھا جب وہ اس میں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا اور اس وقت وہ مایوس ہو کر رہ گئے)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے مچھر کی مثال اس لیے دی ہے کہ اس کے صغیر الجثہ ہونے کے باوجود اس میں وہ تمام چیزیں خلق فرمائی ہیں جو اس قدر بڑے ہاتھی میں خلق کی ہیں بلکہ ہاتھی کی نسبت مچھر میں دو عضو اضافی ہیں، اس طرح خداوند عالم نے مومنین کو اپنی لطیف خلقت اور عجیب و غریب صنعت اور کاری گری کی جانب متوجہ فرمایا ہے۔ کلام عرب میں حقیر چیز کے ذریعہ مثال پیش کرنے کو مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (پس جو لوگ صاحبان ایمان ہیں) یعنی جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کی تصدیق کی اور اسلام قبول کیا، فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (وہ جان لیتے ہیں کہ یہ سب ان کے پروردگار کی جانب سے برحق ہے) یعنی خداوند عالم نے اس جملہ کے ذریعہ تعریف کی کہ ان لوگوں نے غور و فکر کیا یہاں تک کہ انھوں نے جان لیا کہ یہ ان کے پروردگار کی جانب سے ہے۔ مثال ان کے حق میں دی ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا. (اور جنھوں نے کفر اختیار کیا ہے) یعنی اور جن لوگوں نے قرآن کا انکار کیا ہے۔ فَيَقُوْلُوْنَ تو وہ استدلال کے طریقے پر اعتراض اور حق سے انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں: مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا. اللہ کا اس مثال سے کیا مقصد وارادہ ہے؟

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا اس جملہ کی دو تفسیریں ہیں:

۱۔ فراء سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ حکایت ہے کہ جنھوں نے یہ کہا: اللہ کا اس مثال سے کیا ارادہ و مطلب ہے جس سے بیشتر گمراہ اور بہت سے ہدایت یافتہ ہوتے ہیں یعنی ایک قوم گمراہ ہوتی ہے اور ایک قوم ہدایت پاتی ہے پھر اللہ نے ارشاد فرمایا: وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ. اللہ نے وضاحت فرمادی کہ فاسق کے علاوہ کوئی گمراہ نہیں ہوتا یہ اچھی تفسیر وتاویل ہے۔

۲۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ اللہ کا ابتدائی کلام ہے اگر یہ تفسیر کی جائے تو يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا. کے معنی یہ ہوں گے کہ کفار قرآن کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ پس وہ قرآن کے سبب گمراہ ہوتے ہیں۔ جب گمراہی اس کے سبب حاصل ہوتی ہے تو اس کی جانب اضافت ونسبت دی جاتی ہے۔

يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (بہت سے لوگوں کی ہدایت کرتا ہے) جو قرآن پر ایمان لائے اور اس کی تصدیق کی اور کہا کہ یہ اپنے مقام ومرتبہ پر ہے جب ہدایت اس کے سبب حاصل ہوئی تو اس کی جانب اس کی نسبت دی گئی۔ اس طرح اضلال کے معنی امتحان کی شدت ہے جس کے پاس ضلال (گمراہی) ہوتی ہے اس لیے یہ مثال دی گئی ہے اس لیے کہ جب ابتلاء مشقت امتحان دینے والے پر شدید دشوار ہوجاتی ہے اس وقت وہ بھٹک جاتا ہے اسی لیے اسے اضلال کہا گیا ہے۔ جب امتحان سہل وآسان ہوتا ہے تو ہدایت پا جاتا ہے اس لیے اس کا نام ہدایت قرار دیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ خداوند عالم اس مثال کے ذریعہ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے جس کے ذریعہ بہت بڑی تعداد گمراہ ہوجاتے ہیں اور بہت سے لوگ ہدایت یافتہ ہوجاتے ہیں جیسا کہ اس آیت میں آیا: رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ (سورۂ ابراہیم، آیت ۳۶) (اے میرے رب! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے) (یعنی بتوں کے سبب) گمراہ ہوگئے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ اس شخص سے جس نے چاندی کے کھرے اور کھوٹے پن کو پرکھنے کے لیے اسے آگ پر رکھا ہو اور اس کا کھوٹا پن ظاہر ہوجائے تو کہا جائے کہ تم نے اپنی چاندی کو برباد کردیا جب کہ اس نے اسے برباد نہیں بنایا ہے بلکہ اس کا مقصد اس کی آزمائش کے ذریعہ اس کے کھوٹے پن کو ظاہر کرنا تھا۔

کبھی اضلال وگمراہ کرنا عذاب کے عنوان سے تخلیہ (ان کے حال پر چھوڑنے) کے معنی میں ہوتا ہے اور اس لطف ومہربانی کے ترک کردینے کے معنی میں ہوتا ہے جو مومنین پر ان کے ایمان کی جزا کے عوض کیا جاتا ہے جیسا کہ اپنی شمشیر کی اصلاح نہ کرنے والے سے کہا جائے: اَفسَدتَ سَیفَكَ یعنی تم نے اپنی شمشیر کو برباد کردیا کہ اس سے مراد ہے یہ کہ تم نے صیقل کے ذریعہ اس کی اصلاح نہیں کی۔ کبھی اضلال کے معنی ضلالت کی نسبت دینے کے ہوتے ہیں جس طرح کہا جاتا ہے: اَضَلَّهٗ یعنی اس کی جانب ضلالت کی نسبت دی یا اَکفَرَهٗ یعنی اس کی جانب کفر نسبت دی۔

کبھی ضلال ہلاک کرنے، عذاب اور برباد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ۔ (سورۂ قمر، آیت ۴۷-۴۸) (بے شک مجرمین عذاب اور بھڑکتی ہوئی آگ میں مبتلا ہیں۔ جس روز یہ منھ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا اب شعلوں کا مزہ چکھو)

یا اس کا یہ ارشاد: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ۔ (سورۂ سجدہ، آیت ۱۰) (اور انھوں نے کہا جب ہم زمین میں ہلاک ہوجائیں گے)

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ۔

(سورۂ محمد، آیت ۴،۵)

(اور جو اللہ کی راہ میں قتل کردیے گئے اللہ ان کے اعمال کو ہرگز رائیگاں نہ کرے گا) یعنی (ان کے اعمال) باطل نہیں ہوئے۔ وہ عنقریب ان کی ہدایت کرے گا۔

پس اس جملہ کے معنی اس طرح ہوں گے: خداوند عالم اس کا انکار کرنے والے بیشتر لوگوں کو ہلاک کرتا اور انھیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے، یعنی انھیں کفر کے سبب ثواب اور راہ جنت سے بھٹکا دیتا ہے، پس وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ایمان کے سبب بیشتر کو راہ جنت اور ثواب کی ہدایت فرماتا ہے۔ یہ روایت ابو علی جبائی سے مروی ہے جس پر اللہ کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (حالانکہ گم راہی میں وہی مبتلا رہتے ہیں جو فاسق ہیں) یہ بات اس صورت سے خالی نہیں کہ اس سے تکذیب پر عذاب مراد ہو جیسا کہ ہم نے کہا ہے۔ یا حیرت اور شک میں مبتلا ہونا مراد ہو۔

اگر حیرت مراد ہے تو بیان ہو چکا ہے کہ وہ فقط فاسق، متحیر اور شک کرنے والوں کے ساتھ ایسا کرتا ہے۔

اس صورت میں ضروری ہے کہ گذشتہ حیرت جس کے باعث وہ فاسق بنے ہیں وہ اس کا فعل نہ ہو مگر یہ کہ اس کے بنے سے حیرت ہو یہ اس بات کا سبب ہے کہ ایسی حیرت موجود ہو جس کی کوئی انتہاء نہ ہو۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ اس تفسیر کی بنا پر ممکن ہے کہ اللہ کا ان پر حکم کفر کے ذریعہ ان سے برأت، ان پر لعنت کرنا، ہلاک کرنا اور انھیں گمراہ کرنا ہوگا۔ جہاں کہیں بھی قرآن میں گمراہ کرنے کی نسبت اللہ کی جانب دی گئی ہے وہ انھیں کے معنی میں ہے جنھیں ہم نے بیان کیا۔ اللہ کی طرف اس طرح گمراہ کرنے کی نسبت دینا جائز نہیں جس طرح شیطان، فرعون اور سامری کی جانب نسبت دی ہے۔ اس کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا (سورۂ یس، آیت ۶۲) (اور اس (شیطان) نے تم میں سے بہت سی نسلوں کو گمراہ کر دیا تھا) یا اس کا ارشاد: وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى (سورۂ طٰہ، آیت ۷۹) (اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا تھا، کوئی ہدایت نہیں کی تھی) یا اس کا ارشاد: وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (سورۂ آیت طٰہ، آیت ۸۵) (سامری نے انھیں گمراہ کر دیا ہے) یہ تلبیس (فریب) تغلیظ (عداوت و دشمنی) اور شک میں مبتلا کرنے کے معنی میں ہے اور فساد اور گمراہی میں پڑ جانا ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ خدا کی جانب ظلم و جور کرنے کی نسبت دینے کی جانب لے جاتا ہے جو کہ مجبرہ کا نظریہ ہے، خدا کی ذات اس سے بلند و بالا ہے۔

ہدایت کی حقیقت:

ہم گمراہی کے اقسام اور اللہ کی جانب اس کی نسبت دینے کے جائز ہونے اور جائز نہ ہونے کے بیان کے بعد ہدایت کے اقسام بیان کر رہے ہیں۔ معلوم ہونا چاہئے قرآن کریم میں ہدایت کی متعدد اقسام ہیں:

معلوم ہونا چاہئے قرآن کریم میں ہدایت کے متعدد اقسام ہیں:

اول: رہنمائی اور ارشاد کہا جاتا ہے: هَدَاهُ الطَّرِيْقَ وَهَدَاهُ اِلَى الطَّرِيْقِ (اس کو راستہ دکھایا) ہدایت اس معنی میں تمام مکلفین کو شامل ہے۔ اللہ نے ہر مکلف کو حق کی جانب ہدایت فرمائی ہے یعنی اسے حق کا راستہ بتایا ہے اور انھیں اس تک پہنچنے کا مکلف قرار دیا ہے، اگر اس نے حق کی جانب راہنمائی نہ فرمائی ہوتی تو انھیں تکلیف مالایطاق کا مکلف قرار دیتا جو کہ خدا کے لیے قبیح ہے، اس پر اللہ کا یہ ارشاد دلیل ہے: وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (سورۂ نجم، آیت ۲۳) (حالانکہ ان کے رب کی جانب سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے) یا یہ ارشاد: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (سورۂ انسان، آیت ۳) (ہم نے

اسے راستہ دکھا دیا خواہ وہ شکر گزار ہو یا ناشکرا) اور یہ ارشاد: اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ (سورۂ بقرہ، ۱۸۵) (قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے)

اور یہ ارشاد: وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى۔ (سورۂ فصلت، ۱۷) (لیکن قوم ثمود کی ہم نے ہدایت کی تو انھوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابل میں زیادہ پسند کیا)

اور یہ ارشاد: وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (سورۂ شوریٰ، آیت ۴۲) (بے شک آپ سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں)

یا یہ ارشاد: وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ۔ (سورۂ بلد، آیت ۱۰) (اور ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے) یا اسی طرح کی دیگر آیات۔

دوم: اللہ تعالیٰ کا زیادہ لطف و کرم ہے جس کے باعث وہ ہدایت پر ثابت قدم ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے: وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ۔ (سورۂ محمد، آیت ۱۷) (اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا ہے اور وہ انھیں تقویٰ سے بہرہ مند کرتا ہے) یعنی ان کے سینوں کو کشادہ کر دیا اور انھیں ثابت قدم بنا دیا۔

سوم: ثواب دینا، اس کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۔ (سورۂ یونس، آیت ۹) (بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجا لائے ان کا رب انھیں ان کے ایمان کی وجہ سے نعمتوں سے بھرپور جنتوں کا ثواب عطا کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی)

یہ ارشاد کہ: وَالَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۞ سَیَهْدِیْهِمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ ۔ (سورۂ محمد، آیت ۴)

(اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے اللہ ان کے اعمال کو ہرگز رائیگاں نہ کرے گا۔ عنقریب ان کی رہنمائی کرے گا اور ان کے حالات سنوار دے گا)

شہادت کے بعد جو ہدایت ہے وہ یقینی طور پر ثواب دینا ہے اس لیے کہ موت کے بعد کوئی فریضہ نہیں رہ جاتا ہے۔

چہارم: ہدایت یافتہ ہونے کی تصدیق کرنا۔ اس کا ارشاد ہے: مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ۔ (سورۂ اسراء،

آیت ۹۷) (اللہ جس کی ہدایت کرے وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے)

آخر کی تینوں صورتیں مومنین سے مخصوص ہیں نہ کہ ان کے غیر سے اس لیے کہ خداوند عالم ہدایت کے مستحقین کو ہدایت تک پہنچاتا ہے جو مومنین ہیں اور ان کے ایمان واطاعت میں لطف کا اضافہ فرماتا ہے اور ان کے لیے ہدایت کا حکم فرماتا ہے۔

پنجم: انسان کو ہدایت یافتہ قرار دینا اس طرح کہ اس میں ہدایت خلق فرمائے جس طرح کسی چیز کے اندر حرکت پیدا کر کے اسے متحرک قرار دینا ہے خداوند عالم قلوب میں ضروری علوم قرار دیتا ہے۔ یہ اس کی جانب سے ہدایت ہے۔ یہ بھی پہلی صورت کی طرح تمام عقلا کے لیے عام ہے جس ہدایت کا اللہ نے بندوں کو [illegible] بندے کا اللہ اور اس کے انبیاء وغیرہ پر ایمان ہے یا بندوں کے اعمال ہیں کہ جن پر وہ مدح اور [illegible] قرار پاتے ہیں اگر چہ خداوند عالم نے ہدایت کی جانب راہنمائی وارشاد اور اس کی انجام دہی کی [illegible] پر انعام فرمایا۔ انھیں اس کا مکلف بنایا ہے اور انھیں اس کا حکم دیا ہے اس اعتبار سے یہ اس کی [illegible] احسان، فضل اور عنایت ہے۔ جس کے سبب اس کی ذات قابل صد شکر اور لائق حمد وستائش [illegible] قدرت اور لطف وکرم سے اسے نوازا ہے اور اس کے لیے سہولتیں اور آسانیاں پیدا کی ہیں۔

❀❀❀❀❀

[illegible] يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾
جو [illegible] سے مضبوط عہد کرنے کے بعد بھی اسے توڑ دیتے ہیں، اور اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹ دیتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں بس یہی لوگ خسارے میں ہیں۔

[illegible] و معانی:

[illegible] ابرام (جوڑنا) کی ضد ہے۔

[illegible] عقد اور پائدار معاہدہ اور اَلْعَهْدُ یعنی التقاء: دو چیزوں کو ملنا۔ عَهْدُ اللهِ یعنی اللہ کے [illegible] امر ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے: خلیفہ کا عہد فلاں کے لیے اس طرح ہے یعنی اس کا حکم۔ اسی

طرح اللہ کا یہ ارشاد ہے: اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ (سورہ یس، آیت ۳۶) (اے آدم کی اولاد کیا میں نے تم سے عہد و پیمان نہیں لیا تھا)

مِيۡثَاق جس کے ذریعہ توثیق (عہد و پیمان) واقع ہوتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے: فلان ثقة اس میں واحد، جمع، مذکر، مونث مساوی ہیں۔ کہا جاتا ہے: ثِقَاتٌ فِي الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ یعنی مردوں اور خواتین میں ثقہ افراد۔

قَطۡع دو چیزوں کے درمیان جدائی ڈالنا ہے۔ فَصۡل در حقیقت اجسام میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اعراض میں بھی استعمال کرنے میں اسے اجسام سے تشبیہ دیتے ہوئے: قَطۡعُ الۡحَبۡلِ وَ قَطۡعُ الۡكَلَامِ (یعنی رسی کا کاٹنا اور بات کاٹنا) کہا جاتا ہے۔

اَمۡر: حکم دینا۔ وَصۡل (ملانا) فَصۡل (فاصلہ) کی ضد ہے۔ یعنی کسی رکاوٹ کے بغیر دو چیزوں کو جمع کرنا ہے۔

خُسۡرَان نُقۡصان (گھاٹا) ہے ۔خِسَار ہلاکت ہے۔خَاسِرُون ہلاک ہونے والے۔ خُسۡران کے لغوی معنی سرمایہ کا برباد ہونا ہے۔ اور اَصۡلُ الۡخُسۡرَان یعنی ذهاب رأس المال مکمل سرمایہ کا چلا جانا ہے۔

ترکیب:

اَلَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ محلا منصوب ہے اس لئے کہ اَلۡفَاسِقِيۡنَ کی صفت ہے اُولٰٓئِكَ مبتدا اور اَلۡخَاسِرُوۡنَ اس کی صفت ہے۔ اور هُمۡ ضمیر فصل ہے اور یہ هُمۡ مبتدا بھی ہوسکتا ہے اور اَلۡخَاسِرُوۡنَ اس کی خبر اور پورا جملہ هُمُ الۡفَاسِقُوۡنَ، اُولٰٓئِكَ کی خبر ہے۔

مِنۡ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ میں مِنۡ زائد ہے۔ کہا گیا کہ مِنۡ کے معنی ابتدائے غایت کے ہیں۔ مِيۡثَاقِهٖ میں ھاء کی ضمیر اَلۡعَهۡد کی طرف پلٹ رہی ہے اور احتمال ہے کہ لفظ جلالہ اللہ کی طرف پلٹ رہی ہو۔

اَنۡ يُّوۡصَلَ کلمہ بِهٖ میں ھاء کا بدل ہے یعنی اللہ نے جس کا حکم دیا ہے جوڑے رکھنے کا اور یہ جملہ حرف جر باء کی بنا پر محلا مجرور ہے۔

تفسیر:

یہی لوگ گھاٹے میں ہیں

خداوند عالم نے آیت میں مذکور فاسقوں کی صفت بیان کی ہے: اَلَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں یعنی اسے منہدم کر دیتے ہیں، اسے پورا نہیں کرتے۔ عہد الٰہی میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ توحید، عدل، انبیاء کی تصدیق اور معجزات سے جو متعلق چیزیں رسولوں کے لیے پیش کی گئیں تھیں ان کی صداقت پر گواہ تھیں۔ ان کی عقلوں میں قرار دی گئی تھیں جن کی صحت کو دلائل کے ذریعہ واضح کیا گیا تھا۔

۲۔ اللہ کا حکم اس کی مخلوقات کی جانب اس کے رسولؐ کی زبان سے جس میں اس کی اطاعت کا حکم اور معصیت سے نہی کی گئی تھی۔ انھوں نے اس وصیت کو توڑ دیا، اس پر عمل نہیں کیا۔

۳۔ الذین سے اہل کتاب کے کفار مراد ہیں اور اللہ سے کیا ہوا عہد ہے جسے انھوں نے توڑا ہے۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ جس کا ان سے اتباع محمدؐ کا تورات میں (عہد و پیمان) لیا گیا تھا اور تصدیق کا عہد لیا گیا تھا اس چیز کا جسے وہ اپنے پروردگار کی جانب سے لائے تھے اس (عہد) کا توڑنا اس کی معرفت کے بعد اس سے انکار کرنا ہے اور ان چیزوں کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنا ہے جب کہ ان سے عہد و پیمان لیا جا چکا تھا کہ اسے وہ لوگوں کے لیے بیان کریں گے، اسے چھپائیں گے نہیں اور یہ کہ جب ان کے پاس ڈرانے والا آئے تو اس پر ایمان لائیں گے۔ جب ان کے پاس ڈرانے والا آیا تو ان کی کے بھاگنے اضافہ ہوگیا اور انھوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اسے مختصر پونجی کے عوض فروخت کر دیا۔ اس معنی کو طبری نے اختیار کیا ہے۔

۴۔ اس سے وہ عہد مراد ہے جو اس وقت لیا تھا جب انھیں صلب آدمؑ سے نکالا تھا جیسا کہ اس بارے میں واقعہ وارد ہوا ہے۔ یہ وجہ ضعیف ہے اس لیے کہ اس کا اپنے بندوں پر اس عہد کے ذریعہ احتجاج جائز نہیں جو انھیں نہ تو یاد ہی ہو نہ ہی اسے جانتے ہوں نہ ہی اس پر کوئی دلیل ہو۔

ارشاد الٰہی ہے: وَیَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ، (اور اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹ دیتے ہیں) یعنی پیغمبرؐ اور مومنین سے وابستہ رہنے کا حکم دیا گیا تھا جسے انھوں نے قطع کر دیا۔ یہ روایت حسن سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ قرابت اور صلۂ رحمی کا حکم دیا گیا تھا جسے انھوں نے قطع کر دیا، یہ قتادہ سے مروی ہے۔
بیان کیا گیا ہے کہ انھیں تمام انبیاء اور کتب پر ایمان کا حکم دیا گیا تھا جس میں انھوں نے تفریق کی اور اس ''عہد'' کو قطع کر دیا۔
بیان کیا گیا ہے کہ وہ قول کو عمل سے وابستہ کریں گے جس میں انھوں تفریق کر دی یعنی کہتے تھے لیکن عمل نہیں کرتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے اولیاء سے وابستہ رہتے ہوئے اس کے ہر امر سے وابستہ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اسی طرح اس کے دشمنوں سے برائت و قطع تعلق کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ قول زیادہ قوی ہے اس لیے کہ یہ عام ہے اور اس میں تمام صورتیں داخل ہیں۔
اس کا ارشاد: وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں) یعنی وہ لوگوں کو کفر کی جانب بلاتے ہیں جو زمین پر فساد ہے۔ کہا گیا ہے کہ انھیں (راہ ہدایت سے) خوف دلاتے اور قطع راہ کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان کا عہد کا توڑنا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہر وہ معصیت جس کا نقصان اس کے بجالانے والے کے علاوہ دوسروں تک پہونچے۔ بہتر یہ ہے اسے عموم پر حمل کیا جائے۔
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ انھوں نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ پس وہ اس طرح ہیں جس نے اپنے راس مال (اصل پونجی) کو فنا کر دیا۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔ اللہ نے جس نقصان کی نسبت غیر مسلمین کی جانب دی ہے اس سے کفر مراد ہے اور جس (نقصان) کی نسبت مسلمانوں کی جانب دی گئی ہے اس سے دنیا مراد ہے۔

❁❁❁❁❁❁

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ جب کہ تم بے جان تھے اللہ نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تمھیں موت سے ہمکنار کرے گا، پھر تمھیں زندگی عطا کرے گا اس کے بعد تم اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔

قرائت:

یعقوب نے تَرْجِعُوْنَ بالفتح پڑھا ہے اس دلیل پر کہ یہ فعل یعنی پلٹنا ان کا عمل ہے اور بقیہ قراء نے

نحس مجہول ہونے کی بنا پر تُرْجَعُوْنَ تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

ترکیب:

كَيْفَ حالت کے بارے میں سوال کے لئے ہے اور یہ حالت جواب میں واضح ہوتی ہے کہ جب کہا جاتا ہے کہ كَيْفَ رَأَيْتَ زَيْدًا؟ زید کو کس حالت میں دیکھا؟ تو جواب مَسْرُوْرًا یا مَهْمُوْمًا، وغیرہ آئے گا پس جواب اس کی حالت کے ذریعہ دیا ہے۔ كَيْفَ تمام حالات سے میل کھاتا ہے جس طرح كَمْ ہر عدد کے ساتھ، مَا ہر جنس کے ساتھ، اَيْنَ ہر مکان کے ساتھ اور مَنْ تمام عقلاء سے ہماہنگ ہوجاتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ آیت میں توبیخ ہے گویا اس طرح ہے کہ کیا
حجت اور دلیل سے تعلق رکھنے والے بھی کفر کر رہے ہو پس كَيْفَ جو کہ منصوب ہے وہ حال کی بنا پر ہے اور اس میں عامل تَكْفُرُوْنَ ہے کہا گیا ہے کہ زجاج نے کہا: كَيْفَ استفہام کے لئے ہے اور یہاں پر تعجب کے معنی میں ہے اور یہ تعجب خلق کے لئے ہے یا مومنین کے لئے یعنی وہ لوگ ان لوگوں پر تعجب کر رہے ہیں کہ وہ کیونکر کافر ہو رہے ہیں جبکہ خدا کی جانب سے ان پر حجت تمام ہوچکی ہے اس کے مانند یہ آیت ہے: أَوْ جَاءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ؛ یعنی ان کے دل بالتحقیق تنگ ہوگئے ہیں۔ یہ جملہ حال کے مقام میں ہے اور اس طرح کے جملوں میں قَدْ کو ظاہر کرنا یا پوشیدہ ماننا لازم ہے اس لئے کہ ماضی حال نہیں ہوسکتا اور قَدْ ماضی قریب کے لئے آتا ہے اور حال سے قریب کرنے کے لئے ہوتا ہے قَدْ کے داخل ہونے پر فعل ماضی حال واقع ہوسکتا ہے۔

تفسیر:

کیونکر اللہ کا انکار کر سکتے ہو؟!

کفار کے قیامت سے انکار کرنے، خدا کے رسولوں اور کتب سے انکار کرنے پر خداوند عالم نے ان کو عطا کی ہوئی نعمت پر احتجاج فرمایا: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟) جس کا کہنا ہے کہ یہ توبیخ اور سرزنش کے لیے ہے تو اس نے کہا ہے: اس کے معنی یہ ہیں کہ تم پر افسوس ہے تم کس طرح انکار کر رہے ہو؟ جس طرح یہ کہا جاتا ہے تم اس کی نعمت کا کیسے انکار کر سکتے ہو جس نے تم پر احسان کیا ہے اور جس کا یہ

کہنا ہے کیف تعجب کے لیے ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کی تقدیر یوں ہے کہ تم پر تعجب ہے تم اللہ کی وحدانیت پر ظاہری دلائل اور اس کی صداقت پر زبردست معجزات کے باوجود جو اس کے رسول کی صداقت سے مخصوص ہیں، اس کی اطاعت اور نعمتوں کے شکر پر روشن دلیلیں ہیں، تم کس طرح انکار کر سکتے ہو؟! پھر خداوند عالم نے ان پر اپنی بعض نعمتوں کا ذکر اس طرح کیا: وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ، تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا یعنی تمہاری حالت یہ تھی کہ تم مردہ تھے۔ اس میں چند وجہیں ہیں:

۱۔ اپنے آباء و اجداد کی صلب میں نطفہ کی شکل تھے پس اللہ نے انھیں زندگی عطا کی پھر انھیں موت دے گا جو کہ ناگزیر ہے پھر موت کے بعد زندہ کرے گا یہ دو زندگیاں ہیں اور دو موتیں ہیں۔ یہ روایت قتادہ سے ہے۔

۲۔ تم کچھ بھی نہ تھے اس نے تمھیں پیدا کیا پھر تمھیں موت دے گا پھر تمھیں روز قیامت زندہ کرے گا۔ یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود سے ہے۔

۳۔ تم مردہ تھے قابل ذکر نہ تھے تمھیں اس نے ظاہر کر کے زندگی عطا کی پھر تمھیں تمہاری مدت پوری ہونے پر موت دے گا پھر تمھیں قیامت میں زندہ کرے گا۔ عرب ہر غیر معروف شخص کو مردہ کہتے ہیں اور ہر مشہور شخص کو زندہ۔

۴۔ تم اپنے آباء و اجداد کی صلب میں اور اپنی ماؤں کے شکم میں نطفہ تھے۔ نطفہ مردہ ہوتا ہے اللہ نے انھیں دار دنیا میں زندہ نکالا۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ (پھر تمھیں موت سے ہمکنار کرے گا) ثُمَّ يُحْيِيكُمْ (پھر تمھیں زندگی عطا کرے گا) یعنی قبر میں زندہ کرے گا تا کہ سوال کرے ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اس کے بعد تمھیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا۔

اللہ کی طرف بازگشت کو محشر کہتے ہے۔ اس لیے کہ رجوع اس طرح ہوگی کہ اس دن خدا کے علاوہ کسی کا حکم نہیں چلے گا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ قوم کے تمام امور کی بازگشت حاکم کی طرف ہوتی ہے۔ اس سے مراد ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں ہے اس سے مراد اس کی مخصوص نظر ہے نہ کہ غیر کی۔

اللہ نے حیات کے ذکر کا آغاز تمام نعمتوں کے قبل زندگی جیسی نعمت کا ذکر کیا ہے۔ جو اس نے بندہ کو عطا فرمائی ہے۔ اس لیے کہ سب سے پہلی نعمت اس کا زندہ خلق کرنا ہے تا کہ وہ استفادہ کرے اور زندگی ہی کے سبب انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ موت کو نعمتوں میں شمار کیا ہے جیسا کہ ظاہراً اس کے ذریعہ نعمتیں

منقطع ہوتی ہیں اس لیے کہ موت کے سبب تکلیف منقطع ہوجاتی ہے جس کے بعد مکلف دائمی ثواب حاصل کر لیتا ہے لہذا موت کو نعمت کہا گیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ موت کا ذکر حجت تمام کرنے کے لیے کیا گیا ہے نعمت کے سبب نہیں۔ آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ خداوند عالم اپنے بندوں سے کفر نہیں چاہتا نہ ہی ان کو کفر پر خلق کیا ہے۔ اگر وہ بندوں سے کفر چاہتا یا ان کے درمیان کفر کو خلق کرتا تو پھر کفر کی نسبت بندوں کی طرف دینا یہ کہہ کر کہ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ جائز نہ ہوتا اور اسی طرح ان سے کیونکر کہنا بھی صحیح نہ ہوتا۔ جس طرح جائز نہیں ہے کہ وہ ان سے کہے کس طرح یا کیوں تم طویل القامت یا کوتاہ قد تھے یا اس طرح کی کوئی اور بات، اس لیے کہ یہ ان میں خود اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔

❀❀❀❀❀

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾
وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کی ہیں پھر اس نے آسمان کی جانب توجہ کی تو انھیں سات آسمانوں کی شکل میں استوار کیا اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

الفاظ و معانی:

خَلْق کے لغوی معنی تقدیر کے ہیں یعنی مقدر کرنا۔

جَمع کے معنی ضَمّ اور ملانے کے ہیں اور جمع کی ضد فَرْق (جدائی) ہے۔ جمعہ کا نام جمعہ اس لئے رکھا گیا کہ اس دن لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔

اِسْتوا کے معنی اعتدال و استقامت کے ہیں۔ اس کی ضد اِعْوَجاج (کجی اور ٹیڑھا پن ہے)

عَلِیْم بمعنی عالم ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے کہ جب مبالغہ کا ارادہ کرتے ہیں تو فَعِیْل کے وزن پر لاتے ہیں جیسے علیم و رحیم۔

تفسیر:

سب کچھ اللہ نے خلق کیا ہے

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب مشرکین نے دوبارہ زندہ کیے جانے کو محال سمجھا تو خداوند عالم نے زمین و آسمان کی خلقت کا تعارف کرایا تا کہ اس طرح ان کے دوبارہ زندہ کیے جانے پر اپنی قدرت کو دلیل قرار دے۔

ارشاد ہوا: هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ ۔ وہ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے یعنی تمہاری وجہ سے پیدا کیا۔ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا زمین پر جو کچھ ہے۔ یعنی زمین اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جتنی نعمتیں ہیں ان سب کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ دینی نعمتوں کے ذریعہ تم اس کی معرفت پر استدلال کرتے ہو لیکن دنیاوی نعمتوں کے دنیا میں ہی طرح طرح کے فائدے حاصل کرو گے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ (پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ) اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: آسمانوں کا ارادہ کیا تا کہ انھیں استواء فرمائے جس طرح قائل کہے امیر شام کے امر کی تدبیر کر رہا تھا، پھر اس نے اہل حجاز کا رخ کیا (اس کی جانب توجہ کی) یعنی اس کی تدبیر اور فعل ان کی جانب تبدیل ہوئے۔

دوم: اپنے قہر و غلبہ کے سبب آسمان پر مسلط ہوا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰى یعنی اپنے امر سے تمکن حاصل کیا اور اس نے اپنی عقل کے ذریعہ اپنی خواہش پر غلبہ حاصل کر لیا یعنی اس نے توجہ کی آسمان کی جانب اس کی ملکیت میں منفرد ہونے میں اسے زمین کے مانند اپنی مخلوق کی ملکیت قرار نہیں دیا۔

سوم: پھر اس کا امر متوجہ ہوا اور آسمان کی جانب بلند ہوا اس لیے کہ اس کے اوامر اور فیصلے آسمان سے زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ یہ ابن عباس سے منقول ہے۔

چہارم: ثعلب احمد بن یحییٰ سے روایت کی گئی ہے کہ اللہ کی صفت میں استوا کے معنی کے متعلق سوال کیا گیا انھوں نے کہا: اِسْتِوَاء، اِقْبَالٌ عَلٰى شَيْءٍ، استوا یعنی کسی چیز کی جانب بڑھنا۔

اس کا ارشاد ہے: فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، (تو انھیں سات آسمانوں کی شکل میں استوار کیا) دو چیزوں یا کئی چیزوں کو برابر سے قرار دینا تسویہ ہے۔

فَسَوّٰىهُنَّ میں هُنَّ کی ضمیر اَلسَّمَآء کی جانب پلٹ رہی ہے، السماء اسم جنس ہے جو قلیل اور کثیر دونوں پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ عربوں کا محاورہ ہے: اَهْلَكَ النَّاسَ الدِّيْنَارُ وَ الدَّرَاهِمُ، لوگوں کو

دینار اور دراہم نے ہلاک کر دیا۔ بیان کیا گیا ہے: سَمَاء سَمَاوَةٌ اور سَمَاة کی جمع ہے اسی لیے کبھی مونث استعمال ہوتا ہے کبھی مذکر۔

علی ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے: سَمٰوات اَفلَاك کے علاوہ ہیں اس لیے کہ افلاک حرکت اور گردش کرتے ہیں اور سموات حرکت نہیں کرتے نہ ہی گردش کرتے ہیں۔ اس کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُمۡسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ۔ (سورۂ فاطر، آیت ۴۱) (یقیناً وہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائے)

یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ اس کا یہ فرمانا: اَنۡ تَزُوۡلَا کے معنی ہیں اس سے نہیں ہٹتے جس پر وہ گردش کرتے ہیں اگر وہ ان کو نہ روکتا تو اس سے ہٹ جاتے۔

پہلے زمین بنائی یا آسمان

سوال: ارشاد الٰہی: ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ، سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین کو آسمان سے قبل خلق کیا گیا اس لیے کہ ثُمَّ کو بعد اور تاخیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کا ارشاد دوسرے سورہ میں اس طرح ہے: وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا. (اور اس کے بعد اس نے زمین کا فرش بچھایا) جو اس کے خلاف ہے دونوں کو کس طرح جمع کیا جائے؟

جواب: اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم نے زمین کو آسمان سے پہلے خلق فرمایا مگر اس کو بچھایا نہیں تھا جب آسمان کو خلق کیا (اس وقت) زمین کو بچھایا۔ دحوالارض کے معنی بچھانے اور پھیلانے کے ہیں۔ حسن و عمرو بن عبید سے روایت ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان آیات میں ثُمَّ اور بَعۡدَ اوقات میں ترتیب کے معنی میں نہ ہو بلکہ نعمت کی تعداد اور اس پر تنبیہ اور یاددہانی کے معنی میں ہو جیسا کہ کوئی کہنے والا اپنے ساتھی سے کہتا ہے:

میں نے تمھیں عطا کیا پھر تمھارا مقام و مرتبہ بلند کیا۔ اس کے بعد میں نے یہ کیا اور تمھارے ساتھ یہ کیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمٌ (اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے) خدا نے علیم کہا ہے، قدیر نہیں کہا ہے جب اس نے اپنی صفت و تعریف قدرت اور بلندی کے ذریعہ فرمائی ہے تو اسے علم سے متصل کیا علم اور قدرت کے ذریعہ ہی صحیح فعل مستحکم اور مضبوط طریقہ سے واقع ہوتا ہے۔ اس طرح اس نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ وہ عالم ہے جو اس کے حال اور جس پر نعمت عطا کی گئی ہے کی جانب پلٹتا ہے۔ اس طرح اس کی نعمت ثابت

ہوجاتی ہے۔آیت میں آسمان وزمین کے بنانے والے کے قادر و عالم ہونے پر دلالت ہے یہ کہ خداوند عالم فعل کو غرض کے سبب انجام دیتا ہے نیز یہ کہ خدا کی کفار پر بھی نعمت ہے جس کا ان پر شکر واجب ہے۔اسی طرح آیت دلالت کر رہی ہے کہ اشیاء میں اصل ان کا مباح اور جائز ہونا ہے اس نے بیان فرمایا ہے کہ زمین میں جو کچھ بھی خلق کیا گیا ہے بندوں کے فائدہ کے لیے ہے۔پھر ان میں سے ہر ایک کے لیے حصہ قرار دیا گیا پس ان میں سے تصرف کے اعتبار سے منفرد اور جداگانہ ہونے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔

❀❀❀❀❀

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾

(اے رسول!) اس وقت کو یاد کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔انھوں نے عرض کی کیا تو اسے زمین میں خلیفہ مقرر کرے گا جو وہاں پر فساد برپا کرے گا۔اور خوں ریزی کرے گا۔حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کر رہے ہیں۔تو ارشاد فرمایا کہ میں جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

الفاظ و معانی:

قَوْل کلام عرب میں حکایت کے لیے وضع کیا گیا ہے، جس طرح آپ کہیں: قَالَ زَيْدٌ: خَرَجَ عَمْرٌو (زید نے کہا: عمرو نکلا)

رَبّ: سید کے معنی میں ہے، جیسے رَبُّ الدَّارِ یا رَبُّ الْفَرَسِ (گھر کا مالک یا گھوڑے کا مالک)

(کہا جاتا ہے کہ رَبّ الف اور لام کے ساتھ یعنی اَلرَّبّ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں بولا جاتا)

مَلَائِكَة مَلَك کی جمع ہے اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔بیشتر علماء کا نظریہ ہے کہ اُلُوكَة سے مشتق ہے اور یہ رسالت (پیغامبری) کے معنیٰ میں ہے۔

اگرچہ مَلَك کے لغوی معنیٰ رسالت (پیغامبری) کے ہیں لیکن یہ ان کی غالب صفت ہوگئی ہے جو پیغمبروں کی صفت ہے اور بشر نہیں ہیں جیسا کہ لفظ سے سَمَاء اگرچہ اس کے معنیٰ بلندی ہیں لیکن عام طور پر

مشہور آسمانوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ تمام ملائکہ اللہ کے پیغامبر نہیں ہیں اس کا یہ ارشاد اس بات پر دلالت کر رہا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (سورۂ حج، آیت ۷۵) (اللہ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے کچھ پیغام رساں چن لیتا ہے بے شک اللہ سمیع و بصیر ہے) اگر تمام کے تمام ملائکہ پیغامبر ہوتے تو سب کے سب منتخب ہوتے اس اعتبار سے ملک اسم جنس ہے۔ لہٰذا اس کے لغوی معنیٰ رسالت کے نہیں ہیں۔

جَعْل، خَلْق، فِعْل، اِحْدَاث مترادف ہیں مگر فرق یہ ہے کہ جَعْل کسی چیز سے متعلق ہوتا ہے لیکن ایجاد کے عنوان سے نہیں، فعل اور احداث کے برخلاف۔ جعل کے حقیقی معنیٰ کسی چیز میں تغیر کرنا ہے جس پر وہ تھی۔ فعل کے حقیقی معنیٰ احداث و ایجاد کے ہیں۔

خَلِيْفَة اور اِمَام استعمال میں ایک جیسے ہیں مگر دونوں کے درمیان فرق ہے۔ خلیفہ کسی کام میں کسی کو قائم مقام بنانا اس (شخص) کا جو اس سے قبل ہو اور اِمَام تقدم سے ماخوذ ہے جو مقدم ہوتا ہے جس کی اقتدا و اطاعت واجب ہوتی ہے اس چیز میں جس میں وہ مقدم ہوتا ہے۔

تَسْبِيْح اللہ کی پاکیزگی بیان کرنا ہے ہر برائی اور اس چیز سے جو اس کے شایان شان نہیں ہیں۔ تنزیہ و تعظیم کے حقدار کو سُبُّوح کہتے ہیں۔ تطہیر کے حقدار کو قُدُّوس کہتے ہیں۔ تقدیس کے معنیٰ تطہیر کے ہیں اور اس کی ضد تنجیس ہے۔

ترکیب:

ابو عبیدہ نے کہا: اِذْ یہاں پر زائدہ ہے اور زجاج وغیرہ نے اس کے اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے کہا [illegible] صحیح معنی دے رہا ہو تو اسے بے کار قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اِذْ کے معنی وقت کے [illegible] نے انسان وغیرہ کی خلقت کا ذکر کیا تو گویا فرمایا کہ تمہاری خلقت کا آغاز اس وقت [illegible] نے ملائکہ سے کہا تھا۔۔۔

[illegible] نے کہا: گویا اس طرح فرمایا کہ: اُذْكُرْ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ۔ اس وقت کو یاد کیجیے [illegible] نے ملائکہ سے کہا۔ اگر یہاں پر فعل (اُذْكُرْ) کو پوشیدہ مانا جائے تو ایسی صورت میں اِذْ

محلاً منصوب ہوگا اور واؤ جملہ کو جملہ پر عطف کرنے والا ہوگا۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً جملہ محلاً منصوب ہے۔

کہا جاتا ہے: أَتَجْعَلُ فِيهَا... وَنُقَدِّسُ لَكَ محلاً منصوب ہے قَالُوا کی وجہ سے وَنَحْنُ میں واؤ حالیہ ہے، اسے واؤ قطع، واؤ استیناف، واؤ ابتداء اور واؤ إِذْ بھی کہتے ہیں۔ سیبویہ اس طرح مثال دیتے تھے اسی کے مانند وہ واؤ بھی ہے جو اس آیت میں آیا ہے: يَغْشَى طَائِفَةً مِّنكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ، یعنی إِذْ طَائِفَةٌ اسی طرح یہاں پر بھی إِذْ نَحْنُ نُسَبِّحُ ہے۔

یہاں پر حال (نَحْنُ نُسَبِّحُ) میں عامل أَتَجْعَلُ ہے گویا اس طرح فرمایا: أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا، وَهٰذِهِ حَالُنَا۔

بِحَمْدِكَ میں حرف باء نُسَبِّحُ کے متعلق ہے اور لَكَ میں لام کا متعلق نُقَدِّسُ ہے۔

مَا موصولہ ہے اور اس کا صلہ لَا تَعْلَمُونَ ہے مفعول کی جانب پلٹنے والی ضمیر کلام کے طولانی ہونے کی وجہ سے حذف کردی گئی ہے یعنی: لَا تَعْلَمُونَهُ۔ مَا محلاً منصوب ہے أَعْلَمُ کا مفعول بہ ہونے کی بنا پر۔

تفسیر:

آدمؑ خلیفۃ اللہ

اے محمد! یاد کیجیے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ (اس وقت کو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا) کہا گیا ہے کہ یہ تمام فرشتوں سے خطاب ہے۔

بیان کیا گیا ہے یہ ان ملائکہ سے خطاب ہے جنھیں جنات کے بعد زمین پر بسایا گیا تھا، یہ ابن عباس کا قول ہے۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً یعنی خَالِقٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں) خلیفہ سے مراد جناب آدمؑ ہیں جو اس کی زمین پر اس کے خلیفہ ہیں اور حق کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔ خداوند عالم نے اپنے فرشتوں کو آگاہ کیا کہ ان کی ذریت سے ایسے افراد پیدا ہوں گے جو زمین پر فساد برپا کریں گے۔ یہ ابن عباس اور ابن مسعود سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے اس لیے خلیفہ کہا کہ اس نے آدمؑ اور ان کی ذریت کو فرشتوں کا خلیفہ بنایا

تھا اس لیے کہ ملائکہ زمین کے باشندے تھے۔

کہا گیا ہے کہ زمین میں جنات تھے جنھوں نے فساد کیا، خون بہایا پس ہلاک کر دیے گئے۔ آدمؑ اور ان کی ذریت کو ان کے عوض پیدا کیا گیا ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ سے اولاد آدمؑ مراد ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئیں گے اور یہ حق کو قائم کرنے اور زمین کی آبادکاری میں اپنے بابا آدمؑ کے خلیفہ ہوں گے۔ یہ روایت حسن بصری سے ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ زمین سے مراد مکہ ہے اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دُحِیَتِ الْاَرْضُ مِنْ مَكَّةَ زمین کے بچھانے کا آغاز مکہ سے ہوا۔ اسی وجہ سے اسے اُمُّ الْقُرٰی کہا جاتا ہے۔

روایت کی گئی ہے کہ حضرت نوح، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کی قبریں زم زم و رکن اور مقام کے درمیان ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ الارض سے مراد یہی عام زمین ہے اور یہی صحیح ہے۔

ملائکہ نے سوال کیوں کیا؟

قَالُوْٓا ملائکہ نے اللہ سے عرض کیا: کیا تو ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو کفر، معصیت کے ذریعہ فساد برپا کریں گے اور ناحق خون بہائیں گے۔ اس بارے میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ ایک مخلوق تھی جنہیں جنات کہا جاتا تھا جو زمین میں رہتے تھے اور اس میں فساد برپا کرتے تھے تو اللہ نے فرشتوں کو بھیجا جنہوں نے ان جنات کو زمین سے جلاوطن کر دیا اور وہی فرشتے تھے جو ان جنات کے بعد زمین میں سکونت پذیر ہوئے۔ انہوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کیا تو زمین میں اسے خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا جیسا کہ جنوں کی اولاد نے کیا تھا۔ انہوں نے جو کچھ نظر آرہا تھا اس کے ذریعے غائب پر قیاس کیا۔

۲۔ فرشتوں نے استفہام، استخبار اور استعلام (سمجھنے، باخبر ہونے اور معلومات فراہم کرنے) کے لیے کہا تھا تاکہ وہ اس کی مصلحت اور حکمت کے بارے میں جان سکیں نہ کہ انکار اور نہ ہی خبر دینے کے عنوان سے گویا وہ کہہ رہے تھے کہ اے اللہ! اگر یہ اسی طرح ہے کہ جیسا ہمارا گمان ہے تو ہم کو اپنی حکمت سے آگاہ فرمادے!

۳۔ خداوند عالم نے ملائکہ کو خبر دی عنقریب اس خلیفہ کی اولاد میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جو گناہ کریں گے اور خون بہائیں گے جیسا کہ ابن عباس اور ابن مسعود سے روایت کی گئی ہے۔ خداوند عالم کے

فرشتوں کو باخبر کرنے کی غرض یہ تھی کہ ان کے یقین میں اپنے علم غیب کی نسبت اضافہ فرمائے اور (ایسا ہی ہوا کہ) جیسی ان کو خبر دی گئی تھی۔ بیان کیا گیا ہے تا کہ آدم کو بتادے کہ انھیں زمین کے لیے خلق کیا گیا ہے نہ کہ جنت کے لیے، ملائکہ نے کہا: کیا تو ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو یہ سب کچھ کرے گا؟ اس طرح فرشتے اس کی تدبیر سے استفادہ کرتے ہوئے حکمت کی وجہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ یہ وجہ تقاضا کرتی ہے کہ اول کلام میں ایک حذف ہے جس کی تقدیر اس طرح ہوگی: میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ عنقریب اس کی ذریت میں وہ افراد ہوں گے جو زمین پر فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے۔ اس فقرہ کو اختصار کے پیش نظر حذف کر دیا ہے۔

اسی طرح پروردگار کا یہ ارشاد ہے:

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔

(تو اسے زمین میں خلیفہ مقرر کرے گا جو وہاں پر فساد برپا کرے گا اور خوں ریزی کرے گا۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح وتقدیس کر رہے ہیں) اس میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے "جس کا ہم گمان وخیال کر رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس امر سے ہم زمین پر خلافت کے زیادہ حقدار ہیں اس لیے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہمارا غیر تیری نافرمانی کرتا ہے"

اسی طرح اس کے ارشاد: إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (میں جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے) میں بھی اختصار ہے اس لئے کہ اس کی تقدیر یہ ہے کہ: میں مکلفین کے متعلق زیادہ واقف کار ہوں جسے تم نہیں جانتے اور جو مخالف ہے جس کا تم ظاہری امور پر گمان کر رہے ہو۔

قرآن کریم میں اس طرح کے عجیب اور بدیع محذوفات بکثرت ہیں۔ حذف فصاحت کے اقسام میں شمار ہوتا ہے جب اس میں زیادہ پائدار دلیل ہو۔

ملائکہ کا یہ کہنا کہ: أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے فرزندان آدم مراد ہیں جو نہ تو نبی تھے، نہ معصوم، نہ ہی خود آدمؑ، نہ ہی ان کے مانند انبیاءؑ اور معصومینؑ۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ کے معنی ہیں: ہم تیری حمد کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ اللہ کی حمد کے ذریعہ گویا ہوتے ہیں یہی ان کی تسبیح ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ۔ (سورۂ شوریٰ، آیت ۴۲) (اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں) خدا کی حمد کرنے والے کی حمد اس کی

تسبیح ہے۔ اللہ کی حمد کے معنی اس کی تعریف وثنا اور شکر ہے۔ یہی اس کی تنزیہ اور پاکیزگی بیان کرنا ہے، اس کا اعتراف ہے کہ وہ اہل ہے، اسی لیے وہ اس کی پاکیزگی، اس کی عظمت اور اس کی تعریف کرتا ہے۔ یہ روایت مجاہد سے منقول ہے۔

اس طرح بھی معنی بیان کئے گئے ہیں: ہم تیری حمد کے ذریعہ تیری تسبیح کرتے ہیں، تیری نماز پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ۔ (سورۂ صافات، آیت ۱۴۳) (اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے) یعنی نماز پڑھنے والے۔ یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود سے بیان ہوئی ہے۔

بیان کیا گیا ہے: تسبیح یعنی بلند آواز سے ذکر خدا کرنا۔ اس کی روایت مفضل سے کی گئی ہے۔

اس کا ارشاد: وَنُقَدِّسُ لَكَ، ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں ان چیزوں سے جس کی تیری ذات شایان شان نہیں ہے۔ نہ ہی تیری جانب قبائح (بری باتوں) کی نسبت دیتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں یعنی تیرے لیے نماز پڑھتے ہیں۔

کہا گیا ہے: ہم خطا اور گناہوں سے اپنے نفوس کو پاک کرتے ہیں۔

اس کا ارشاد: اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ، (میں جو جانتا ہوں تم نہیں جانتے) بیان کیا گیا ہے کہ اس سے ابلیس کا پوشیدہ تکبر، عُجب وخود پسندی اور نافرمانی مراد ہے۔ اس وقت جب اللہ نے آدمؑ کے سجدے کے لیے حکم دیا تھا۔ یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس سے یہ مراد ہے: میں ذریت آدمؑ میں انبیاء وصالحین کے بارے میں زیادہ واقف کار ہوں۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے: خدا سے مخصوص تدبیر ومصالح کا علم مراد ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ملائکہ نے اللہ سے سوال کیا کہ کیا خلیفہ ان میں سے بنائے گا اور ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں، تیری اطاعت کرتے ہیں اور دوسروں کی طرح تیری نافرمانی نہیں کرتے؟! پھر امامؑ نے فرمایا: جب انھیں جواب دیا گیا کہ جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے تو وہ سمجھ گئے کہ انھوں نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے لہٰذا وہ عرش کی طرف متوجہ ہو کر استغفار کرنے لگے۔

خداوند عالم نے آدمؑ کو (زمین پر) بھیجنے کے بعد انھیں حکم دیا کہ وہ زمین پر ایک گھر تعمیر کریں جس سے

گناہ گار اسی طرح وابستہ ہوں جس طرح عرش پر ملائکہ مقربین پھر اللہ نے فرشتوں سے فرمایا: میں تمھاری مصلحت سے زیادہ واقف کار ہوں یہی معنی ہیں اس ارشاد کے: اِنِّیٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ، جو اس امر پر دلیل ہے کہ اللہ فعل قبیح انجام نہیں دیتا اس لیے کہ اگر ہر چیز اس کی جانب سے حسن ہوتی تو اس کلام کے کوئی معنی نہیں ہوتے جس کا استفادہ جواب کے ذریعہ ہوتا ہے جب حمل کیا جاتا ہے کہ اس کی مراد ہے میں مصلحتوں سے واقف ہوں جو امر زیادہ مصلحت کا حامل ہوتا ہے اسی کو انجام دیتا ہوں۔

نظم:

یہ آیت اپنے سے ماقبل آیت سے متصل ہے جس میں اللہ نے ہم پر اپنی پہلی نعمت کا ذکر فرمایا ہے جو نعمت حیات ہے، پھر ہم پر زمین اور اس میں موجود اشیاء کو بطور انعام بیان فرمایا ہے، اسی طرح آسمانوں کی خلقت پھر اس نے ہمارے باپ آدمؑ کی خلقت کے ذریعہ نعمت کا ذکر کیا ہے اور انھیں جو کچھ فضیلت عطا کی گئی تھی اس کا ذکر فرمایا گویا اس نے فرمایا: انھیں یاد دہانی کرائیے کہ تم اللہ کا کس طرح انکار کر سکتے ہو جبکہ اس نے تمھارے ساتھ یہ احسانات کیے اور تم پر اس طرح کی تمام نعمتیں نازل فرمائیں۔

❁❁❁❁❁

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾

اور اللہ نے آدم کو تمام اسماء کا علم سکھا دیا۔ اور پھر ان سب کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے کہا: ذرا ان کے نام تو بتاؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

قرائت:

اہل مدینہ اور اہل بصرہ نے ھٰٓؤُلَآءِ کو ایک مد کے برابر پڑھا ہے۔ وہ اسے صرف الف کے خارج ہونے کی مقدار بھر کھینچتے ہیں اور اُوۡلَآءِ کو کھینچتے ہیں گویا اسے دو کلمہ کے برابر کر دیتے ہیں اور بقیہ قراء پورے قرآن میں اسے دو مد کے برابر کھینچتے ہیں لیکن ان دونوں کلموں (ھٰٓؤُلَآءِ اور اُوۡلَآءِ) کے دونوں ہمزہ جیسے: ھٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۔ وغیرہ میں تو ابو جعفر، نافع اور ورش کی روایت ابن کثیر اور قواس کی روایت اور

یعقوب پہلے ہمزہ کو باقی رکھتے ہیں اور دوسرے ہمزہ میں تخفیف کرتے ہیں اور کسرہ کے ذریعے ہمزہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور وہ لوگ یہی کام وہاں بھی کرتے ہیں جہاں دو ہمزے ایک ساتھ جمع ہو جائیں دو کلمے میں چاہے مکسور ہوں، یا مضموم، یا مفتوح دونوں ہمزے مکسور ہوں جیسے عَلَى الْبِغَآءِ إِنْ أَرَدْنَ ہے دونوں مضموم جیسے: أَوْلِيَاءُ أُولَٰئِكَ، قرآن میں اس کے علاوہ کوئی مثال بھی نہیں ہے۔ دونوں مفتوح ہوں جیسے :جَآءَ أَحَدَكُمْ، شَآءَ أَنْشَرَحَ۔

ابو عمرو اور بزی نے ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں اصل کی بنیاد پر ایک کو چھوڑ دیتے ہیں جب دونوں حرکت میں متفق ہیں۔

نافع اسماعیل کی روایت کی بنا پر ابن کثیر ابن فلیح کی روایت کے مطابق پہلے ہمزہ کو حرف لین سے بدل دیتے ہیں اور دوسرے ہمزہ کو باقی رکھتے ہیں اور اگر دونوں حرکت میں مختلف ہوں تو ان لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پہلے ہمزہ کو باقی رکھیں گے اور دوسرے کو حرف لین سے بدل دیں گے جیسے: اَلسُّفَهَآءُ اَلَا، اَلْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

لیکن ابن عامر، عاصم اور کسائی یہ لوگ ان تمام صورتوں میں دونوں ہمزے کو ہمزہ ہی پڑھتے ہیں چاہے دونوں حرکت میں متفق ہوں یا مختلف۔

حذف کرنا اور لین بنانا تخفیف اور آسانی کے لئے ہے اور ہمزہ کو ہمزہ رکھنا اصل اور قانون کی بنا پر ہے۔

الفاظ و معانی:

لفظ آدم کے مشتق ہونے کے سلسلہ میں دو قول وارد ہوئے ہیں:

اول: اَدِيمُ الْاَرْض (یعنی زمین کی ظاہری سطح) سے مشتق ہے۔

دوم: اَدَمَهُ سے مشتق ہے جس کے معنی رنگ اور صفت کے ہیں۔

انباء، اعلام اور اخبار تینوں کا مفہوم ایک ہے آگاہ کرنا۔ نباء خبر کو کہتے ہیں۔

أَنبِئُونِي بِأَسْمَآءِ هَٰؤُلَآءِ یعنی تم مجھے مطلع کرو، آگاہ کرو۔

اور نبوت اگر انباء سے ماخوذ ہوگی تو مہموزہ ہوگی یعنی اس میں ہمزہ لکھا جائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے کہ جب ایک شخص آپ کو یا نبیء اللہ کہہ کر آواز دے رہا تھا تو آپ نے فرمایا:

لَا تُنَبِّئَنَّ بِاسْمِي تم میرے نام میں ہمزہ نہ لگاؤ، یعنی یا نبیء اللہ نہ کہو۔
اعلام اور اخبار میں یہ فرق ہے کہ اعلام کبھی دل میں علم ضروری کی تخلیق کے ذریعے سے ہوتا ہے جس طرح اللہ نے کمال عقل وعلم کو مشاہدات کے ذریعہ خلق کیا ہے اور کبھی کسی بات پر دلیلیں قائم کر کے ہوتا ہے۔ اخبار یعنی خبر کو ظاہر و بیان کرنا چاہے وہ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اور نہ ہی خبر دینے والا ایسا ہوتا ہے کہ جو کچھ بتا رہا ہے وہ دل میں پیدا ہونے والے علم کی بنا پر ہو جیسا کہ مُعْلِم یعنی اعلام کرنے والا ہوتا ہے۔

تفسیر:

جناب آدمؑ کی برتری

اللہ نے ملائکہ کے لیے جناب آدمؑ کی فضیلت ظاہر فرمائی ہے اپنی تمام مخلوقات پر اس علم کے ذریعہ سے انھیں مخصوص کیا تھا۔
ارشاد فرمایا: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا. (اور اللہ نے آدمؑ کو تمام اسماء کا علم سکھا دیا) یعنی انھیں اسماء کے معنی کی تعلیم دی اس لیے کہ معنی کے بغیر اسماء مفید نہیں ہوتے اسماء کے ذریعہ، فضیلت کا اشارہ کرنے میں کوئی وجہ نہیں تھی اس لیے کہ خداوند عالم ملائکہ کو متنبہ اور آگاہ فرما چکا تھا اپنی لطیف حکمت کے متعلق جس کا انھوں نے اقرار کر لیا تھا جب ان سے سوال کیا گیا تھا تو "انھیں اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے" تو اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ۔ اے آدم! تم ان فرشتوں کو ان ناموں سے آگاہ کر دو۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔
کہا گیا ہے کہ "خداوند عالم نے آدمؑ کو جملہ اسماء و صنعتیں، زمین کی آباد کاری، خوراک، دوائیں، معدنیات برآمد کرنے، درخت لگانے، ان کے منافع اور دین و دنیا کو تعمیر کرنے والی جملہ اشیاء کے متعلق تمام علوم کی تعلیم دے دی تھی۔" یہ ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر اور بیشتر متاخرین سے منقول ہے۔
بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے آدمؑ کو خلق ہونے والی اور خلق نہ ہونے والی تمام اشیاء کے اسماء اور ان تمام لغات کا علم جس کے ذریعہ ان کی اولاد ان کے بعد کلام کرے گی دے دیا تھا۔
ابو علی جبائی، علی ابن عیسیٰ وغیرہ نے کہا: آدمؑ سے ان کے فرزندوں نے زبان سیکھی لیکن جب وہ متفرق ہو گئے تو ہر گروہ نے اس زبان میں کلام کیا جس کے وہ عادی ہو گئے تھے اور زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ انھوں

نے اسے فراموش کر دیا۔ ممکن ہے اسماء سے حضرت نوحؑ کے زمانے تک کی یہ تمام لغات اور زبانیں مراد ہوں پس جب اللہ نے نوحؑ اور ان کے تابعین جو ان لغات اور زبانوں سے واقف تھے کے علاوہ تمام لوگوں کو ہلاک کر دیا اور دوبارہ لوگوں کی کثرت ہوگئی اور وہ مختلف خطوں میں گئے تو ان میں سے ہر گروہ نے الگ الگ زبان اختیار کر لی جس میں وہ گفتگو کرتے اور دوسری زبان کو ترک اور فراموش کر دیا۔

روایت ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا آپؑ نے فرمایا: زمینوں، پہاڑوں، غاروں اور وادیوں۔ پھر آپؑ نے اپنے نیچے فرش کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا یہ فرش بھی شامل ہے جس کا علم آدمؑ کو دیا گیا تھا۔

بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ کے اسماء اور ذریت آدمؑ کے اسماء کا علم انھیں دیا گیا تھا، یہ ربیع کا قول ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انھیں اشیاء کے القاب، ان کے معانی اور اس کے خواص کے علم کی تعلیم دی گئی۔ یہ کہ گھوڑے میں یہ صلاحیت اور خوبی کس لیے ہے؟ یا گدھے میں یہ صلاحیت کس لیے ہے (شیخ طبرسیؒ فرماتے ہیں) یہ بات زیادہ بلیغ ہے اس لیے کہ اشیاء کے معنی اور ان کے خواص زمانے اور اوقات کے تغیر کے سبب تبدیل نہیں ہوتے جبکہ چیزوں کے القاب طویل زمانہ کے باعث متغیر ہو جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے: اللہ نے انھیں عربی زبان کی تعلیم نہیں دی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے جناب اسماعیلؑ نے عربی میں کلام کیا، وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے جناب آدمؑ و جناب اسماعیلؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین انبیاء کے لیے کلام کو معجزہ قرار دیا پھر انھوں نے جناب آدمؑ کو اللہ کی تعلیم اسماء کی کیفیت میں اختلاف کیا بیان کیا گیا ہے۔ انھیں تعلیم دی یعنی ان کے قلب میں اسماء کی معرفت ودیعت فرما دی جس کے ذریعہ ان کی زبان کھلی (انھوں نے کلام کیا) وہ ان اسماء کے ذریعہ کلام کرتے تھے یہ ان کا معجزہ تھا جو عادت کے برخلاف تھا۔

بیان کیا گیا ہے کہ انھیں اسماء کی تعلیم دی یعنی انھیں علم حاصل کرنے پر مجبور کیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انھیں ملائکہ کی زبان کی تعلیم دی پھر اس زبان سے تمام زبانوں کے علم کی تعلیم دی۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ معین اسماء کی تعلیم دی یعنی ان چیزوں کو حاضر کر کے ان کے اسماء ہر لغت میں تعلیم فرما دیئے کہ یہ کس چیز کے لیے مناسب ہے اس میں کیا نفع اور کیا نقصان ہے۔

اس کے ارشاد: ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ، میں ابن عباس سے روایت ہے کہ مخلوقات کو پیش کیا۔ اس طرح معنی ہوں گے کہ پھر ملائکہ کے سامنے مسمیات (نام والے) پیش کیے جن میں ذی عقل تھے اور

غیر ذی عقل تھے۔ کہا: جنھیں پیش کیا گیا ان میں بیشتر ذی عقل تھے اور ذی عقل پر کنایہ کے ساتھ ہر ایک کے لئے قرار دیا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ (سورۂ نور، آیت ۴۵) (اور اللہ نے ہر جان دار کو پانی سے پیدا کیا ہے ان میں سے وہ ہے جو اپنے شکم کے بل چلتا ہے اور ان میں سے وہ بھی ہے جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے۔ اور کوئی چار ٹانگوں پر چل رہا ہے) ان پر ذی عقول کا کنایہ کیا ہے۔ اُبی کی قرائت میں ہے: ثُمَّ عَرَضَهَا. ابن مسعود کی قرائت میں: ثُمَّ عَرَضَهُنَّ ہے۔ دونوں قرأتوں کے مطابق اسماء کا مراد ہونا زیادہ مناسب ہے نہ کہ مسمیات (ان اشیاء کا)

کس طرح پیش کیا؟

اسماء کے ملائکہ پر پیش کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ ملائکہ پر پیش کیا یعنی اسماء کے معنی خلق کیے جن کی تعلیم آدمؑ کو دی گئی تھی یہاں تک کہ ملائکہ نے انھیں دیکھ لیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان اشیاء کی شکل وصورت ان کے دلوں میں قرار دی گئی گویا وہ ان کے لیے مشاہدہ کے مانند ہوگئیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے ان کے سامنے ہر جنس سے ایک کو پیش کر دیا اس طرح ملائکہ کو عاجز بنانا مقصود تھا جب ان سے کہا جائے کہ اس چیز کا کیا نام ہے اور کیا خاصیت ہے؟ اس لیے کہ جب انسان سے کہا جائے کہ اس چیز کا نام اس کی خاصیت کیا ہے یا اسی کے مانند اور وہ اس سے ناواقف ہو تو جس پر پیش کیا گیا ہے اس کے لیے اتمام حجت زیادہ بلیغ ہوگا اسی طرح آدمؑ کے متعلق سوال کیا گیا۔ اس طرح خداوند عالم نے واضح فرمادیا کہ آدمؑ فرشتوں کی نسبت زمین کی آبادکاری، مختلف خواص، زمین میں کھیتی کرنے، زراعت کرنے، پانی نکالنے اور لطیف حکمت کے ذریعہ معدنیات سے جواہرات کا استخراج کرنے اور سمندر کی گہرائیوں سے (بیش قیمتی) چیزوں کے نکالنے میں زیادہ صلاحیت کے حامل ہیں (جس سے ملائکہ واقف نہیں ہیں) یہ قول قوی ہے جس میں کہا گیا ہے خدا نے آدمؑ کو خواص اشیاء کی تعلیم فرمائی جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ جب تم مشاہدہ کے باوجود ان چیزوں کی معرفت سے عاجز ہو تو تم امور غیب کی معرفت سے زیادہ عاجز ہو۔

سوال

ارشاد ہوا: اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. یہاں پر کہا جاتا ہے کہ کیوں ملائکہ کو اس

طرح خطاب کیا گیا اور کیونکر خداوند عالم نے انھیں اس چیز کے بارے میں خبر دینے کا حکم فرمایا کہ جس کے متعلق وہ نہیں جانتے تھے؟

جواب

اس کے جواب میں علماء نے متعدد وجوہات بیان فرمائی ہیں:

اول: جب خدا نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین پر خلیفہ بنا رہا ہوں تو ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اگر آدمؑ اور ذریت آدمؑ کے عوض ان میں سے کوئی خلیفہ بنے گا تو وہ زمین پر نہ تو فساد ہوگا نہ ہی خونریزی، جس طرح اولاد آدمؑ میں ہوگی اگرچہ خداوند عالم وہی فعل انجام دیتا ہے جو اس کی تدبیر میں زیادہ مناسب اور حکمت میں حق سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے اللہ نے ارشاد فرمایا: اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ، کہ اس بارے میں تمھارا جو گمان ہے تا کہ ان پر دلالت کرے اس کے معنی ہیں وہ (ملائکہ) اس چیز سے ناواقف ہیں جس کا انھوں نے مشاہدہ کیا ہے لہٰذا جو چیزیں ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں ان کا جاننا بہت بعید ہے۔

دوم: انھوں نے اپنے دل میں یہ خیال کیا اللہ نے ایک ایسی مخلوق کو خلق فرمایا ہے جو ان سے زیادہ عالم اور تمام انواع علم میں ان سے افضل ہے پس کہا گیا "اگر تم اس گمان میں سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ"

سوم: اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ۔ سے مراد یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ میں زمین پر خلیفہ کیوں بنانا چاہتا ہوں لہٰذا مجھے ان کے نام بتاؤ اگر سچے ہو کیوں کہ علم غیب کا ہر معاملہ ایسا ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔

چہارم: اخفش، جبائی اور علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے (اگر تم ان چیزوں میں سچے ہو) جس کا تمھیں علم ہے ان کے اسماء میں سے تو ان اسماء کی خبر دو۔ یہ قول قائل کے اس قول کی مانند ہے جو کسی سے کہتا ہے: "میرے ہاتھ میں کیا ہے بتاؤ اگر تم سچے ہو" یعنی اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کیوں کہ ایسے معاملات میں اسی کی تصدیق کی جاتی ہے جو علم کی بنیاد پر خبر دے علم کے بغیر اسے مکلف نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ بات ان احادیث کی جانب لے جارہی ہے جن کے بارے میں انھیں اس شرط کا علم نہیں ہے، اس بنیاد پر لفظ 'امر' کے معنی تنبیہ اور متوجہ کرنے کے ہیں۔ اس امر سے مراد مشروط ہے جیسے ایک عالم اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ تم اس مسئلہ میں کیا کہتے ہو جب کہ اسے معلوم ہے کہ وہ جواب نہیں جانتا ایسا امر فقط تنبیہ اور اس کی جستجو کے لیے ہوتا ہے، اگر ان سے یہ کہا جاتا: مجھے اس کی خبر دو اگر تم جانتے ہو یا اگر تم سچے ہو تو زیادہ بہتر تھا اگر وہ اس بات پر متوجہ کرے کہ وہ اس کے جواب پر قادر نہیں ہے اس کے باوجود وہ جواب دے دے تو اس کا جواب رفتہ رفتہ اس کے قلب اور

نفس میں ثابت ہو جائے گا لیکن یہ حکم تکلیفی نہیں ہے کیوں کہ اگر حکم تکلیفی ہوتا تو اس میں تبیین (وضاحت) نہ کی گئی ہوتی کہ آدمؑ ان چیزوں کے اسماء کو جانتے ہیں اور ان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور جب اس کا جاننا صرف آدمؑ سے مخصوص ہو گیا تو یہ تکلیفی نہیں ہے۔

اس آیت میں علم اور اہل علم کی عظمت وفضیلت پر دلالت پائی جاتی ہے کہ اس طرح کہ جب اللہ تبارک وتعالی نے آدم علیہ السلام کا شرف بیان کرنا چاہا تو خاص طور سے ان کے علم کا تذکرہ کیا اور اسی کے ذریعہ انھیں دوسروں پر برتری دی۔

❀❀❀❀❀

قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾
انھوں نے کہا تیری ذات پاک اور منزہ ہے ہمارے پاس تو بس وہی علم ہے جسے تو نے ہمیں سکھایا ہے بے شک تو سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا ہے۔

الفاظ ومعانی:

حِكْمَة سَفَاهَة کی ضد ہے اور اِحْكَام سے اِتْقَان مراد ہے اور حَكِيم وہ (ذات) ہے جو فساد سے روکے۔ اسی سے حَكَمَةُ اللِّجَام (یعنی لگام کا وہ حصہ جو گھوڑے کے دونوں جبڑوں کی جانب ہوتا ہے) ہے، لگام گھوڑے کو تیز دوڑنے سے روکتی ہے۔

حکمت وہ چیز ہے جو تمہیں ایسے امر حق سے آگاہ کرتی ہے کہ باطل جس سے مخلوط نہیں ہوتا۔ صدق جس میں کسی طرح کے کذب وجھوٹ کی ملاوٹ نہیں ہوتی، انسان کے اندر حکمت وہ علم ہے جو صاحب علم کو جہل و نادانی سے روکتا ہے۔

ترکیب:

سُبْحَانَكَ: منصوب ہے مفعول مطلق ہونے کی بنا پر۔ سیبویہ نے کہا: سَبَّحْتُ اللّٰهَ تَسْبِيحاً وَسُبْحَاناً پس لفظ تسبیح مصدر ہے اور سُبْحَان ایک ایسا اسم ہے جو مصدر کا قائم مقام ہے۔

لَنَا میں لام کا متعلق محذوف ہے۔ پس جملہ ظرفیہ (جار و مجرور) محلاً مرفوع ہے خبر ہونے کی وجہ سے، اس لئے کہ "لَا عِلْمَ" محلاً مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر۔

مَا عَلَّمْتَنَا موصول وصلہ ہے۔ عَلَّمْتَنَا سے موصول کی جانب پلٹنے والی ضمیر محذوف ہے گویا اس طرح ہے: عَلَّمْتَنَاهُ۔

مَا عَلَّمْتَنَا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ لَا عِلْمَ کے محل کا بدل ہے۔

اَنْتَ ضمیر فصل بھی ہوسکتی ہے ایسی صورت میں اس کا کوئی اعراب نہیں ہوگا اور اِنَّ کی خبر الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ہے۔ ممکن ہے اَنْتَ مبتدا ہو اور جملہ (اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ) اِنَّ کی خبر ہو۔

تفسیر:

فرشتوں کا اعتراف

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے اللہ کی جانب رجوع کیا اور اس کے امر کو تسلیم کر لیا۔ قَالُوْا۔ (فرشتوں نے کہا: سُبْحٰنَكَ تیری ذات پاک ومنزہ اور باعظمت ہے، اس بات سے کہ تیرے علاوہ کوئی دوسرا غیب جانتا ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے ہے۔

اور کہا گیا ہے: سُبْحٰنَكَ یعنی ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں کہ تیرے حکم پر کسی قسم کا اعتراض کیا جائے۔

اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ وہ ایسا جواب دیں کہ جس میں تعظیم کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو تو انہوں نے ہر فعل قبیح سے تیری تنزیہ کے لیے کہا حالانکہ ہم تیرے افعال کی حکمت سے نا آشنا ہیں۔

بیان کیا گیا ہے: یہ تعجب کی وجہ سے ہے ان کا ایسی چیز کے بارے میں سوال کرنا جسے وہ نہیں جانتے تھے۔

اس کے ارشاد: لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، کے معنی ہیں ہم تیری تعلیم کے علاوہ نہیں جانتے، یہ وہ نہیں ہے جس کی تو نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ اگر وہ اپنے بیان میں لَا عِلْمَ لَنَآ کہنے پر ہی اکتفا کر لیتے تو یہ بھی جواب میں کافی تھا، لیکن اس طرح انھوں نے اس کی تعظیم کا اضافہ اور اپنے اوپر تعلیم کے انعام کا اعتراف کیا کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ اسی کا تعلیم کردہ ہے۔ اللہ نے ان سے سوال بھی کیا تھا اس علم کے متعلق جس کو وہ نہیں جانتے تھے تا کہ ان کے لیے مقرر کر دے کہ وہ مالک نہیں ہیں بجز اس چیز کے جس کی اللہ نے انھیں تعلیم دی ہے تا کہ اس طرح ان کے نزدیک آدمؑ کا درجہ بلند کرے کہ اس نے آدمؑ کو وہ سکھایا ہے جسے فرشتے نہیں جانتے۔

ارشادالٰہی: اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ. یعنی بے شک تو ہی تمام معلومات کا عالم ہے۔علیم ہونا اس کے صفات ذات سے ہے اور عالم کا مبالغہ ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے اللہ کے لیے وہ چیز ثابت کی جس کی انھوں نے اپنی ذات سے نفی کی تھی یعنی تو تعلیم کے بغیر عالم ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے۔

اَلْحَكِيْمُ کے معنی کے سلسلہ میں دو احتمال ہیں:

۱۔ عالم کے معنی میں ہے، کسی چیز کے جاننے والے کو حکیم کہا جاتا ہے۔اس طرح حکیم بھی صفات ذات سے ہوگا جیسے علیم ان دونوں کے ذریعہ اس کی دائمی صفت کو بیان کیا گیا ہے اس لیے کہ یہ اس کی ذات کے لیے واجب وضروری ہے۔

۲۔ اَلْمُحْكِمُ لِاَفْعَالِهٖ. یعنی وہ اپنے افعال میں باحکمت ہے۔فَعِيْل مُفْعِل کے معنی میں ہے یعنی حَكِيْم مُحْكِم. اس بنیاد پر اس کا تعلق صفات افعال سے ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام افعال مبنی برحکمت ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ہی ان میں قبح کا کوئی پہلو ہے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: اَلْعَلِيْمُ جو اپنے علم میں کامل ہو۔ وَالْحَكِيْمُ، جو اپنی حکمت میں کامل ہو۔اس آیت میں اس بات کی نشاندہی ہے کہ تمام علوم اللہ کی جانب سے ہیں جو کہ ایسا ہی ہے اس لیے کہ علوم اس بات سے خالی نہیں ہیں کہ یا تو ضروری ہوں یہ بھی اللہ کا فعل ہے یا استدلالی ہوں جس پر دلیل قائم کی جا چکی ہے کہ کسی شے کے لیے بھی۔حصول علم ممکن نہیں بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تعلیم دے دے۔

❀❀❀❀❀

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اللہ نے آدم سے کہا: اے آدم! ان فرشتوں کو ذرا ان ہستیوں کے نام تو بتادو پس جب آدم نے فرشتوں کو ان ہستیوں کے ناموں سے آگاہ کیا تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان وزمین کی تمام مخفی باتوں کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو میں ان تمام باتوں سے باخبر ہوں۔

قرائت:

ابن عامر نے اَنۡبِئۡهِمۡ ، ہمزہ اور ہاء کے زیر کے ساتھ مروی ہے اور باقی قراء سے ہاء کے پیش کے ساتھ مروی ہے۔

حجت:

جن قراء نے ہاء کو پیش دیا ہے انھوں نے ہاء کو اس کی اصل پر حمل کیا ہے اس لئے کہ اصل یہ ہے کہ ہاء ضمیر کو مضموم ہونا چاہئے اور اسے اس وقت کسرہ دیا جاتا ہے جب وہ کسرہ یا یاء کے بعد آئے جیسے: بِهِمۡ، عَلَيۡهِمۡ اس کے باوجود بھی بعض لوگوں نے ہاء کو ضمہ دیا ہے اصل پر حمل کرتے ہوئے۔

اور جس نے اس ہاء کو کسرہ دیا ہے کہ جس سے پہلے ہمزۂ مخففہ ہے تو یہ ایک طرح کا قیاس ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے ہاء کے کسرہ کو اس کسرہ کا تابع قرار دیا ہے جو اس سے پہلے ہے اور ساکن کو مانع نہیں مانا ہے جیسا کہ عربوں سے یہ حکایت کی گئی ہے جیسے: جَاءَ الْمُرۡءُ، رَأَيۡتُ الۡمَرۡءَ وَ مَرَرۡتُ بِالۡمِرۡءِ تو ان لوگوں نے اس فاصلہ کے باوجود ہمزہ کو ماقبل کا تابع قرار دیا ہے اسی طرح دیگر کلمات میں بھی تابع قرار دیا ہے، جیسے: هٰذَا امۡرُءٌ، رَأَيۡتُ امۡرَءاً وَ مَرَرۡتُ بِامۡرِئٍ۔

ابوزید نے عرب سے حکایت کی ہے: اَخَذۡتُ هٰذَا مِنۡهِ وَ مِنۡهِمَا وَ مِنۡهِمِي انھوں نے وقف و وصل دونوں صورتوں میں ضمیر کو کسرہ دیا ہے: وَلَمۡ اَعۡرِفۡهِ وَلَمۡ يَضۡرِبۡهِ بھی حکایت کیا گیا ہے۔

الفاظ ومعانی:

اِبۡدَاء اِعۡلَان اور اِظۡهَار تینوں کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی ظاہر کرنا اور اِبۡدَاء کی ضد كِتۡمَان ہے یعنی چھپانا اِظۡهَار کی ضد اِبۡطَان ہے چھپا کر رکھنا، پوشیدہ رکھنا اور اِعۡلَان کی ضد اِسۡرَار ہے رازداری کے ساتھ رکھنا۔

علی ابن عیسیٰ رمانی نے کہا ہے: ظُهُور کے معنیٰ کسی ایسی حقیقت تک رسائی ہے جسے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہو۔ اللہ اپنے دلائل کے سبب ظاہر اور مخلوقات کے احساس سے باطن (پوشیدہ) ہے۔

ترکیب:

لفظ آدَمُ منادیٰ مفرد معرفہ مبنی برضمہ ہے اور محلاً منصوب ہے اس لئے کہ منادیٰ مَدعُوّ ہوتا ہے اور مدعو مفعول ہوتا ہے۔

تفسیر:

آدم! انھیں بتادیجئے

خداوند عالم نے جناب آدمؑ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یٰاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ ، اے آدم ملائکہ کو بتاؤ، بِاَسۡمَآئِهِمۡ ان لوگوں کے اسماء کہ جنھیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ هُمۡ کنایہ ہے ان افراد سے جو اَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ سے مراد لیئے گئے ہیں۔

فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ، جب آدمؑ نے انھیں بتایا، بِاَسۡمَآئِهِمۡ ہر چیز کے بارے میں، ان کے فائدے اور نقصان کے متعلق۔ تو اللہ نے ملائکہ سے ارشاد فرمایا: اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ ، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا! بعض مفسرین نے کہا ہے کہ 'اَ' کے معنی توبیخ وسرزنش کے ہیں اور جس نے ملائکہ کے لیے معصیت و نافرمانی کو جائز وممکن نہیں سمجھا ہے اس نے اس سے انکار کیا ہے۔

اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ، جو (زمین وآسمان) دونوں کے اندر تم سے پوشیدہ ہے اسے جانتا ہوں جسے تم نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ میں تمھارے سامنے موجود چیز کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔

ظاہر و باطن کو جاننے کی وضاحت

وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ، (اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو میں ان تمام باتوں سے باخبر ہوں) اس میں چند اقوال ہیں:

اول: میں تمھارے راز اور علانیہ امور سے زیادہ واقف ہوں۔ اللہ نے یہ بات ملائکہ کی تنبیہ اور ان کی آگاہی کے لیے فرمائی اس استدلال کی بنیاد پر جو ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ پہلا اصول جس کے ذریعہ استدلال کیا جاتا ہے وہ تنبیہ کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے اس نے اپنے بندوں کو اس چیز پر خلق فرمایا ہے جس پر فرشتوں کو خلق فرمایا ہے۔ طلب خیر یا جس چیز کا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔

دوم: میں زیادہ واقف کار ہوں۔ مَا تُبْدُوْنَ، تمھاری اس بات سے کہ ''کیا ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو زمین پر خوں ریزی کرے۔''

وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ، ابلیس کا معصیت ونا فرمانی اور مخالفت کا پوشیدہ رکھنا۔ علی ابن عیسیٰ نے بیان کیا ہے: یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ خطاب ملائکہ سے ہے نہ کہ ابلیس سے۔ نیز یہ کہ حکم عام ہے جس کو مخصوص نہیں کیا جا سکتا ہے سوائے دلیل کے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ابلیس (آدمؑ کو) سجدہ کرنے کے حکم میں فرشتوں میں داخل ہے تو اس کا ان تمام کے ساتھ ذکر کرنا صحیح ہے اور روایات بھی اس بات کی تائید کر رہی ہیں۔ اسی قول کو طبری نے اختیار کیا ہے۔

سوم: جب اللہ نے جناب آدمؑ کو خلق فرمایا تو ان کے جسم میں روح پھونکے جانے سے قبل ملائکہ کا وہاں سے گذر ہوا، ابھی تک انھوں نے ان جیسا نہیں دیکھا تھا لہذا کہنے لگے ''اللہ نے کوئی ایسی مخلوق خلق نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک ہم سے زیادہ محترم اور افضل ہو'' وہ بات تھی جسے ملائکہ چھپا رہے تھے البتہ اس بات کا انھوں نے یہ کہہ کر اظہار کیا تھا کہ: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا، (کیا تو زمین پر اسے خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے) اس کی روایت حسن سے کی گئی ہے۔ پہلا قول اقویٰ ہے اس لیے کہ عام ہے۔

اسرار بیان کرنے کا فلسفہ

اس آیت سے متعلق جو سوال ہوتا ہے کہ فرشتوں کے لیے خداوند عالم کا علم غیب سے متعلق اسرار بیان کرنے کی کیا وجہ ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ملائکہ نے اعتراض کی شکل میں کہا تھا، نہ کہ وضاحت چاہتے ہوئے: ''کیا فساد کرنے والے اور خون بہانے والے کو خلیفہ بنائے گا؟'' جبکہ خداوند عالم اس بارے میں اپنے بندوں سے متعلق مصلحت سے زیادہ واقف تھا جس چیز کا اس نے انھیں مکلف بنایا تھا۔ اس طرح خداوند عالم نے ان کی خلقت اپنے علم کی مصلحت کے سبب فرمائی ہے جس کے ذریعہ ان پر دلالت فرمائی ہے کہ ان پر لازم ہے کہ حکم خداوندی پر راضی رہیں اور اللہ کے فیصلے کو تسلیم کریں۔ اس لیے کہ غیب سے متعلق وہ باخبر ہے، جسے ملائکہ نہیں جانتے۔ اسی طرح ان کی دینی ودنیاوی مصلحت سے باخبر ہے، جس سے وہ باخبر نہیں ہیں۔

تعلیم اسماء کی کیفیت

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی تعلیم جناب آدمؑ کے لیے تمام اسماء کے متعلق کس چیز کے بارے میں تھی جو اس

کے علم غیب سے متعلق دلالت کر رہا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم نے جناب آدمؑ کو تمام اسماء کے معنی کی تعلیم فرمائی جو ان کی زبان کے رواں ہونے (اور زبان کھلنے) پر اور ان پر الہام پر دلیل تھے۔ یہ وہ معجزہ ہے جسے خداوند عالم نے ملائکہ کے لیے مقرر فرمایا تھا جو جناب آدمؑ کی نبوت اور ان کی جلالت قدر کی دلیل ہے۔ اسی طرح ان کی شان کی رفعت و بلندی ہے جسے خداوند عالم نے علم کی شکل میں ان سے مخصوص کیا ہے، جس تک خدا کی تعلیم کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا جو اس بات پر دلیل ہے کہ خدا نے سب سے پہلے اقرار لیا کہ ملائکہ کو کسی چیز کا علم نہیں ہے۔ پھر خدا نے ان کے لیے ظاہر فرمایا کہ جناب آدمؑ خدا کی تعلیم کے ذریعہ جانتے ہیں۔ اس طرح یہ اعجاز اطلاع کے سبب ظاہر ہوا جس کی جانب علام الغیوب کے سوا کسی کو سبیل اور راہ نہیں تھی۔ یہ بات معجزہ ہے کہ جناب آدمؑ کی زبان عادت کے خلاف جاری ہوئی کہ انھیں حکمت کے لطائف کی تعلیم دی گئی جسے ملائکہ اپنے علوم کی کثرت کے باوجود نہیں جانتے تھے، ارشاد ہوا:

اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ، (کیا میں نے تم سے نہیں کیا تھا کہ میں زمین اور آسمان کی مخفی باتوں کو جانتا ہوں) یعنی میں تمھیں پہلے ہی اس بارے میں دلیل دے چکا ہوں۔ خداوند عالم نے جناب آدمؑ کے کلام سے اعجاز کا آغاز کیا جس کا اختتام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا۔

جناب آدمؑ صحیح کہہ رہے ہیں!

سید الاجل سید مرتضیٰ (قدس اللہ سرہ) فرماتے ہیں: اس آیت میں ایک سوال ہے کہ ہم نے مفسرین میں کسی کو نہیں پایا کہ جس نے یہ سوال کیا ہو اور وہ یہ کہ اگر کہا جائے کہ ملائکہ کو حضرت آدمؑ کے قول کی صحت اور مسمیات سے اسماء کی مطابقت کا کس طرح علم ہوا جب کہ وہ پہلے سے اس بارے میں نہیں جانتے تھے، کلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جب آدمؑ کو اسماء کے بارے میں خبر دی گئی اس وقت ملائکہ کو اس کے صحیح ہونے کا علم ہوا۔ اگر اس طرح نہیں ہوتا تو اللہ کا یہ ارشاد نہیں ہوتا: اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ، اسی طرح فرشتے جناب آدمؑ کی نبوت سے استفادہ نہیں کر رہے تھے، نہ ہی جناب آدمؑ کا فرق کر پا رہے تھے اس چیز سے جو ملائکہ کے لیے نہیں تھی اس لیے کہ یہ تمام چیزیں علم کے ساتھ مکمل ہوتی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے: اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ خداوند عالم نے ملائکہ کے لیے اسماء کی صحت اور مسمیات سے مطابقت کے بارے میں علم بدیہی قرار دیا ہو یا تو کسی ذریعہ سے یا تو ابتدائی طور پر کسی ذریعہ کے

بغیر جس سے انھوں نے جناب آدمؑ کے اختصاص کو سمجھ لیا ہو، ان کے علم میں اس چیز کی صحت نہ ہو جس کی انھیں خبر دی گئی تھی جو قطعی طور پر جناب آدمؑ کی نبوت کے علم کا تقاضا کرتا ہے بلکہ بعد میں درجات و مراتب جس پر استدلال ضروری ہوتا کہ یقینی طور پر نبوت کا علم حاصل ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ ملائکہ کی مختلف لغات اور زبانیں ہوں اور ان میں سے ہر گروہ اپنی لغت اور زبان میں اسماء اجناس سے واقف ہو دوسرے کی زبان ولغت سے واقف نہ ہو مگر یہ کہ کسی ایک عالم کا تمام لغات کے اسماء اجناس پر احاطہ ہو، یہ چیز خارق العادت ہے جب خداوند عالم نے جناب آدمؑ کی نبوت سے آگاہ کرنا چاہا تو انھیں تمام اسماء کی تعلیم فرمادی۔ پس جب ملائکہ کو خبر دی تو ہر فریق نے اسماء سے متعلق دی گئی خبر کے مطابق اس کی لغت کے بارے میں واقف ہو گئے اور باقی لغات کے بارے میں ہر طرح کی خبر کے مطابق جان لیا۔ اس طرح اس کا جواب ہے پس اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ ، کے معنی یہ ہوں گے: تم میں سے ہر قبیلہ مجھے تمام اسماء کے متعلق خبر دے۔

یہ دونوں جوابات اس چیز پر مبنی ہیں کہ جناب آدمؑ کی نبوت کا علم ملائکہ کو پہلے سے نہیں تھا اور اسماء کے بارے میں جناب آدم کا خبر دینا ان کے معجزات کا آغاز ہے۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۴﴾

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے آگے جھک جاؤ تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

قرائت:

صرف ابو جعفر نے لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اسۡجُدُوۡا، میں لِلۡمَلٰٓـئِكَةُ کی تاء کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے چاہے جہاں بھی ہو اور اسی طرح قُل رَّبُّ احۡكُمۡ، میں باء کو پیش کے ساتھ قرائت کی ہے۔

حجت:

ابو جعفر نے تاء کو جیم کے ضمہ کا تابع قرار دیا ہے کہا گیا ہے کہ انھوں نے ہمزہ کے ضمہ کو تاء کو دے دیا ہے

اگر وہ ہمزہ سے شروع ہوتا تو ہمزہ مضموم ہی ہوتا پہلا قول زیادہ قوی ہے اس لئے کہ وصل کی صورت میں ہمزہ گر جاتا ہے پس کوئی حرکت ہی نہیں بچتی کہ وہ منتقل کی جائے۔

الفاظ و معانی:

سُجُود لغت میں خُضُوع و تَذَلُّل (انکساری) کو کہتے ہیں اور شریعت میں اس سے مراد نماز کا ایک خاص عمل ہے جیسے رکوع، قنوت وغیرہ۔ سجدہ یعنی پیشانی کو زمین پر رکھنا۔ کہا جاتا ہے: سَجَدَ و اَسْجَدَ۔ یعنی اس نے خضوع کیا۔ نِسَاءٌ سُجَّدٌ ان عورتوں کو کہتے ہیں جن کی آنکھوں میں فتور ہو۔

اَبیٰ یعنی اطاعت کو ترک کیا اور رک گیا۔ اِبَاء، ترك اور امتناع تینوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ ابی کی ضد اَجَابَ ہے یعنی قبول کرلیا۔

اِسْتِکْبَار، تَکَبُّر اور تَعَظُّم اور تَجَبُّر ایک دوسرے کی نظیریں ہیں اور ان کی ضد ہے تَوَاضُع

اِبْلِیْس عجمی نام ہے۔ زجاج اور دیگر نحویوں کا خیال ہے کہ یہ عجمی نام ہے جسے عربی بنایا گیا ہے۔

اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ عربی ہے، اِبْلَاس سے مشتق ہے اور اِبْلِیْس اِفْعِیْل کے وزن پر ہے۔

ترکیب:

اِذْ محلا منصوب ہے اس لئے کہ پہلے والے اِذْ پر معطوف ہے۔

لفظ آدَمَ لام کے ذریعہ مجرور ہے اور غیر منصرف ہے اس لئے کہ اَفْعَل کے وزن پر ہے جب آپ یہ کہیں گے کہ مَرَرْتُ بِآدَمَ وَآدَمٍ آخَرَ (میں آدم اور ایک دوسرے آدم کے پاس سے گزرا) تو سیبویہ اور خلیل کہتے ہیں کہ وہ نکرہ کی صورت میں غیر منصرف نہیں رہ جائے گا اس لئے کہ جب آپ نے اسے نکرہ بنا دیا تو وہ اس حالت کی جانب پلٹ جائے گا جس میں منصرف تھا۔

اخفش نے کہا: جب آپ کسی کا نام آدَمَ رکھ دیں گے تو اسے باب صفت سے خارج کر دیں گے لہٰذا جب آپ اسے نکرہ بنا دیں گے تو لازم ہے کہ اسے منصرف مانئے اور یہ کہیں کہ وہ آدَمٍ آخَرَ

اُسْجُدُوْا: ہمزۂ وصل میں قاعدہ یہ ہے کہ اسے التقاء ساکنین کی بنا پر کسرہ دیا جائے لیکن اسے ضمہ دیا

جاتا ہے اس لئے کہ کسرہ کے بعد ضمہ ثقیل ہوتا ہے اسی طرح ہر وہ فعل مضارع کہ جس کا تیسرا حرف مضموم ہو جیسے: اُنْظُرُوْنَا. اُقْتُلُوْا يُوْسُفَ، تب بھی ہمزہ کو ضمہ دیا جائے گا۔

عرب کی ناپسندیدگی کی بنا پر عربی میں کوئی ایسا فعل نہیں ہے جس میں کسرہ کے بعد ضمہ ہو۔

اِبْلِيْسَ منصوب ہے کلام موجب میں مستثنیٰ متصل ہونے کی بنا پر یہ ان لوگوں کے نزدیک ہے جو ابلیس کو ملائکہ میں سے قرار دیتے ہیں اور منصوب ہے ان لوگوں کے قول کے مطابق بھی جو اسے ملائکہ میں سے نہیں مانتے ہیں۔

تفسیر:

سجدۂ آدم کا حکم

خداوند عالم نے جناب آدمؑ کو عطا کی گئی عظمت اور اجلال و اکرام کے بیان کے بعد فرمایا: اے محمدؐ! یاد کیجیے: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ، (کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ تم سب کے سب آدم کو سجدہ کرو) اس جملہ کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جناب آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم تمام ملائکہ کو دیا گیا تھا یہاں تک کہ جبرئیلؑ و میکائیلؑ کو بھی جیسا کہ ارشاد ہے: فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ، (تمام فرشتوں نے سجدہ کیا) اس جملہ میں عام ہونے پر زور دیا گیا ہے۔

مفسرین کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ حکم ملائکہ کے اس گروہ سے مخصوص تھا جو ابلیس کے ساتھ تھا جس کے ذریعہ خدا نے زمین کو جنات سے پاک کیا تھا۔

سجدہ کی کیفیت

اسی طرح جناب آدمؑ کے لیے ملائکہ کا سجدہ کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ سجدہ کس سبب سے تھا۔ ہمارے ائمہ علیہم السلام سے روایت ہے کہ جناب آدمؑ کی شان و عظمت اور ان کے ملائکہ پر مقدم ہونے کے سبب تھا۔ یہی قول قتادہ اور اہل علم کی ایک جماعت کا ہے جسے علی بن عیسیٰ الرمانی نے اختیار کیا ہے اور ہمارے علماء نے اس آیت کو انبیاء علیہم السلام کی ملائکہ پر برتری کی دلیل بنایا ہے کہ انبیاءؑ ملائکہ سے افضل ہیں کیوں کہ انھیں جناب آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا جو جناب آدمؑ کے ملائکہ پر برتری کا تقاضا کرتی ہے: اس لیے

کہ مفضول کو فاضل پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوا جاتا ہے کہ انبیاءؑ ملائکہ سے افضل ہیں۔

جبائی اور ابوالقاسم بلخی نے کہا ہے: اسی طرح مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے: آدمؑ کو ملائکہ کا قبلہ قرار دے کر انھیں سجدہ کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ بھی تعظیم کی ایک قسم ہے۔

(شیخ طبرسیؒ فرماتے ہیں) یہ قول صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو ابلیس سجدہ کرنے سے انکار نہ کرتا جبکہ ملائکہ آدمؑ کی تعظیم کر رہے تھے اور قرآن نے صاف طور پر بیان کیا ہے ابلیس کا سجدۂ آدم سے انکار اس لیے تھا کہ وہ ان کی فضیلت وعظمت کا اعتقاد رکھتا تھا جیسا کہ اس نے خود کہا ہے:

أَرَءَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (سورۂ اسراء، آیت ۶۲) (اس نے کہا دیکھ تو سہی یہی ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت عطا کی ہے۔ یا اللہ اگر تو روز قیامت تک مجھے مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا سوائے چند افراد کے)

یا اس کا یہ آیت کہ: قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ (سورۂ اعراف، آیت ۱۲) (پوچھا تجھے سجدہ نہ کرنے سے کس چیز نے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا تو اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے)

اگر یہ امر اس وجہ سے نہ ہوتا تو خدا پر ابلیس کو یہ بتانا واجب تھا کہ اسے آدمؑ کی اس پر تعلّی برتری کے سبب اسے حکم سجدہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ دوسری وجہ سے دیا گیا ہے کہ اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے، نہ ہی اس امر سے تغافل (غفلت برتنا) جائز تھا اس لیے کہ (یہ تغافل) ابلیس کی نافرمانی کا سبب ہوتا پس جب ایسا نہیں ہوا ہمیں معلوم ہو گیا کہ سجدہ کا حکم فقط آدمؑ کی تعظیم وتفضیل، اکرام وجلالت کے باعث تھا۔

ابلیس فرشتہ ہے یا جن؟

پھر اس بات میں اختلاف کیا گیا ہے آیا ابلیس ملائکہ میں سے تھا یا نہیں؟

علماء کے ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ وہ ملائکہ میں سے تھا، اس کی روایت ابن عباس، ابن مسعود اور قتادہ نے کی ہے جس کو شیخ سعید ابوجعفر طوسیؒ نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے۔ ہماری کتب تفاسیر سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ جنھوں نے کہا ہے: ملائکہ سے تھا تو بعض نے کہا ہے کہ وہ خازن جنت تھا۔

بعض نے کہا ہے: آسمان دنیا اور دنیا کا اقتدار اس کے سپرد کیا گیا تھا، ان میں سے بعض نے کہا ہے وہ

آسمان وزمین کے درمیان منتظم تھا۔

شیخ مفید ابوعبداللہ محمد بن محمد بن نعمان (قدس اللہ روحہ) نے بیان فرمایا ہے کہ ابلیس جن تھا۔ ملائکہ میں سے نہیں تھا۔ مزید فرمایا کہ اس بارے میں ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے روایات متواترہ وارد ہوئی ہیں۔ یہی امامیہ کا نظریہ ہے اور یہی بات حسن بصری سے منقول ہے، یہی علی بن عیسیٰ اور بلخی وغیرہ کا قول ہے۔ اس قول کی صحیح ہونے پر مختلف طریقوں سے دلیل پیش کی گئی ہے:

اول: ارشاد الٰہی: اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ كَانَ مِنَ الۡجِنِّ (سورۂ کہف، آیت ۵۰؛ سوائے ابلیس کے کہ وہ جن میں سے تھا) جس نے لفظ جن کو مطلق مانا ہے اس نے جائز نہیں قرار دیا ہے کہ اس سے جنس مشہور کے علاوہ کا قصد کیا جائے اور جہاں کہیں قرآن میں انس (انسان) کے ساتھ جن کا ذکر ہوا ہے اس پر دلیل ہے۔

دوم: ارشاد الٰہی: مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمۡ وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ (سورۂ تحریم، آیت ۶) (اللہ انھیں جو حکم دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے انھیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں) اس آیت میں (ملائکہ) سے معصیت ونافرمانی کی عام نفی کی گئی ہے۔

سوم: ابلیس کی نسل اور ذریت ہے، ارشاد ہوتا ہے: اَفَتَتَّخِذُوۡنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِىۡ وَهُمۡ لَكُمۡ عَدُوٌّ (سورۂ کہف، آیت ۵۰) (تمھیں کیا ہوگیا ہے تم مجھے چھوڑ کر ابلیس اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو درآں حالے کہ وہ تمھارے دشمن ہیں)

حسن نے کہا ہے: ابلیس جن کا باپ ہے جس طرح آدمؑ انسانوں کے باپ ہیں، ابلیس کی خلقت آگ سے ہوئی ہے ملائکہ روحانی ہیں جن کی خلقت ہوا سے ہوئی ہے اور بعض علماء کے نزدیک نور سے خلقت ہوئی ہے اور حسن کے قول کے مطابق ملائکہ کے یہاں سلسلۂ نسل نہیں ہے، اور نہ ہی وہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں۔

چہارم: ارشاد باری ہے: جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا (اس نے فرشتوں کو پیغام رساں بنایا ہے) اللہ کے رسول پر نہ کفر جائز وممکن ہے نہ ہی فسق، اگر ان کے لیے فسق جائز ہو تو کذب بھی جائز ہو جائے گا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم کا ابلیس کا ملائکہ سے استثنا اس بات پر دلیل نہیں کہ وہ ان میں سے تھا، ابلیس کا فرشتوں سے استثنا اس لیے تھا کہ فرشتوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی سجدہ کا حکم دیا گیا تھا جب ابلیس ملائکہ کے ساتھ حکم میں داخل ہے تو اس کا ملائکہ سے خارج کرنا صحیح ہے۔ اسی طرح بیان کیا گیا ہے یہاں پر استثنا منقطع ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (اور کسی کو گمان کی پیروی

کے علاوہ کوئی علم نہیں ہے)

اس قول کی تائید شیخ ابو جعفر بن بابویہ (رحمہ اللہ) کی روایت کر رہی ہے کہ انھوں نے کتاب النبوۃ میں ابن ابو عمیر کے واسطہ سے جمیل بن دراج سے انھوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی، جمیل بن دراج کہتے ہیں: میں نے امام صادقؑ سے ابلیس کی بابت دریافت کیا کہ کیا وہ فرشتوں میں سے تھا؟ اور آسمان پر موکل تھا؟ تو امامؑ نے فرمایا: نہ تو وہ ملائکہ میں سے تھا، نہ ہی آسمان پر موکل تھا، وہ جن تھا اور ملائکہ کے ساتھ تھا۔ ملائکہ سمجھتے تھے کہ وہ ان میں سے ہے اور اللہ جانتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ جب اسے آدمؑ کے سجدہ کا حکم دیا گیا تو وہی ہوا جیسا کہ وہ تھا۔

اسی بات کی روایت عیاشی نے اپنی تفسیر میں کی ہے۔ جو اس بات کا قائل ہے کہ وہ ملائکہ سے تھا تو اس نے دلیل یہ دی ہے اگر وہ ملائکہ سے نہیں تھا تو سجدہ نہ کرنے پر اس کی مذمت و سرزنش کیوں کی گئی، حکم ملائکہ کو ہی شامل تھا غیر ملائکہ کو نہیں۔ اس کا جواب سابقاً گذر چکا ہے۔

ارشادِ الٰہی: قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۲) (پوچھا، تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا)

ہم جانتے ہیں ابلیس سجدہ کرنے والوں میں سے تھا اگر چہ وہ ان (ملائکہ) سے نہیں تھا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ اہل بصرہ کو مسجد میں داخل ہونے کا حکم دیا جائے، وہ سب داخل ہو گئے سوائے اہل کوفہ کے ایک شخص کے۔ اس لیے کہ وہ اس حکم سے یہ جانتا تھا کہ غیر اہل بصرہ کو مسجد میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا، اہل بصرہ کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ یہی قول اس آیت میں ہے کہ ایک گروہ نے پہلے احتجاج (دلیل و حجت) کا جواب دیا ہے اس قول کے ذریعہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ کہ جن ملائکہ کی جنس ہے اور انھیں یہ نام آنکھوں سے پوشیدہ ہونے کے سبب دیا گیا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (سورۂ صافات، آیت ۱۵۸) (اور انھوں نے اللہ اور جنات کے درمیان نسبی رشتہ قرار دیا ہے) ان کا کہنا ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور دوسرے اعتراض کا جواب دیا ہے ارشاد ہوتا ہے: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (سورۂ تحریم، آیت ۶) (اللہ انھیں جو حکم دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے انھیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں) یہ صفت ہے آگ پر موکل (فرشتوں) کی نہ کہ تمام فرشتوں کی جو فرشتوں کے علاوہ دوسروں کی عصمت کا سبب

تمیں ہیں۔

تیسرے اعتراض کا جواب اس طرح سے دیا گیا ہے یہ ممکن ہے کہ خداوند عالم نے نکاح کی خواہش پیدا کردی ہو جو اس کی تکلیف کے دشوار بنانے کے لیے تھی اگر چہ یہ شہوت دیگر ملائکہ میں نہیں تھی، یہ بھی ممکن ہے کہ جب اللہ نے ابلیس کو زمین پر پھینکا تھا تو اس کی حالت فرشتوں کی حالت سے جدا تھی اور وہ یہ کہتے ہیں آپ کا یہ کہنا کہ ملائکہ کی خلقت ہوا سے ہوئی ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور حسن کا کہنا ہے: ان کی خلقت نورانی ہے، نار اور نور مساوی ہیں، آپ کا یہ کہنا کہ جن کھاتے اور پیتے ہیں عرب کلام میں وارد ہوا ہے جس بات کی دلیل ہے فرشتے نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔

جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ فرشتے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں بلکہ سب کے سب روحانی ہیں۔ روایات میں ہڈی اور گوبر سے علاج معالجہ سے متعلق نفی وارد ہوئی ہے کیونکہ اس میں جنات اور ان کے چوپایوں کی خوراک ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ان چیزوں کو سونگھتے ہیں کھاتے نہیں ہیں۔

پنجم: اشکال کا جواب اس ارشاد کے ذریعہ دیا گیا ہے: جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا کہ یہ آیت معارض ہے اس آیت سے: اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ. (سورۂ حج، آیت ۷۵) (اللہ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے کچھ پیغام رساں چن لیتا ہے) اس لیے کہ مِنْ تبعیض (بعض حصہ کو بیان کرنے کے لیے) آیا ہے۔ یہ دونوں قول ابن عباس سے منقول ہیں اور آپؑ سے روایت کی گئی ہے کہ ملائکہ نے جنات سے جنگ کی اور ابلیس کو اسیر بنالیا جبکہ وہ چھوٹا تھا کیوں کہ ابلیس ملائکہ کے ساتھ رہتا تھا اسی لیے اس کو بھی جناب آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ملائکہ نے سجدہ کیا اور ابلیس نے انکار سجدہ کیا۔ چنانچہ اللہ کا ارشاد: فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس کا تعلق جنوں سے تھا) مجاہد اور طاؤس نے بھی ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ابلیس اس نافرمانی سے پہلے صف ملائکہ میں شامل تھا اس کا نام عزازئیل تھا اور وہ زمین کا باشندہ تھا اور زمین میں ملائکہ کے ساتھ رہتا تھا۔ ملائکہ اس کو جن کہتے تھے۔ فرشتوں میں کوئی بھی کوشش اور علم میں اس سے زیادہ نہ تھا، جب اس نے خدا سے تکبر کیا اور سجدۂ آدمؑ سے انکار کیا تو خدا کی نافرمانی کی، خدا نے اس پر لعنت کی اور شیطان قرار دیا اور اس کا نام ابلیس رکھ دیا۔

اللہ کا ارشاد: وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ، اس کے معنی میں بیان کیا گیا ہے کہ درحقیقت وہ کافر تھا، یہ قول ہمارے نظریہ کے مطابق ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ علم الٰہی میں کافروں میں سے تھا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ کافروں میں ہو گیا۔ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (وہ غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا) اس آیت کے ذریعہ بعض نے استدلال کیا ہے اعضاء وجوارح کا عمل ایمان ہے اور کہا ہے: اگر ایسا نہ ہوتا تو ابلیس کا اللہ کی معرفت کے سبب مومن ہونا لازمی تھا اگرچہ وہ اپنے انکار کے ذریعہ فاسق ہو گیا۔ یہ قول ضعیف ہے: اس لیے کہ جب ہم کو اجماعی طور پر اس کے کفر کا یقین ہو گیا تو اس کے پاس بالکل ایمان نہیں تھا۔ جس طرح ہم بت کو سجدہ کرنے والے کے بارے میں مان لیتے ہیں کہ وہ کافر ہے اگرچہ فقط سجدہ کفر کا باعث نہیں ہے۔

ملائکہ کا سجدہ کرنے کے بارے میں اللہ کے امر کی صفت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ کہا گیا ہے خطاب ملائکہ سے تھا نہ کہ ابلیس سے، یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی وحی کے ذریعہ تھا ان کی طرف جن کی طرف اس نے اپنے پیغمبر بھیجے اس لیے کہ رسول کا کلام مرسِل (اللہ) کا کلام ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے فعل کا اظہار فرمایا جس پر انھیں رہنمائی کی کہ انھیں سجدہ کا حکم دیا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ کیوں اللہ نے اسے کافر کہا باوجودیکہ جو اللہ کا سجدہ ترک کرتا ہے اس کو کافر نہیں کہا جاتا، تو ہم (صاحب مجمع البیان) کہتے ہیں: سجدہ ترک کرنے میں کفر کی خصوصیت کو جمع کر دیا گیا ہے وہ یہ کہ اس نے مانا کہ اللہ نے اس کو امر قبیح کا حکم دیا ہے۔ اس نے سجدہ کی حکمت پر غور نہیں کیا اور یہ کہ اس نے تکبر کیا اور حکم خدا پر اعتراض کرتے ہوئے سجدہ سے انکار کیا اور جو لوگ آج بھی اسی طرح سجدہ ترک کریں گے وہ بھی کافر ہوں گے اور اسی جواب سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اس نے پیغمبر الٰہی کو حقیر سمجھا ان کا مضحکہ بنایا اور ایسی باتیں کفر کا عقیدہ رکھنے والے سے صادر ہو سکتی ہے۔

یہ آیت چند وجھوں سے نظریہ جبر کے بطلان پر دلیل ہے منجملہ اس کا ارشاد ہے: اَبٰی، جو اس کے سجدہ پر اختیار ہے جس سے اس نے انکار کیا اور ترک کر دیا ورنہ اس کا انکار کے ذریعہ ذکر کرنا صحیح نہیں ہوتا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: فَسَجَدُوْا، جو اس بات پر دلیل ہے کہ سجدہ ملائکہ کا فعل ہے اور ایک دلیل یہ ہے کہ ملائکہ کی سجدہ کرنے کے ذریعہ تعریف کی گئی ہے جب کہ ترک سجدہ پر ابلیس کی مذمت کی گئی ہے (جیسا کہ مجبرہ کا قول ہے) کہ اس نے سجدہ اس لیے نہیں کیا کیوں کہ اس وقت سجدہ پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی وہ قدرت وطاقت خلق کی گئی تھی جو سجدہ کا سبب ہوتی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں اطمینان کے ساتھ جو چاہے کھاؤ پیؤ۔ خبردار اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم دونوں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

الفاظ ومعانی:

سُکُون، اِطْمِئْنَان، هُدُوّ مترادف ہیں۔

سَکَن عیال اور اہل خانہ کو کہتے ہیں اور سَکَن منزل اور گھر کو اور سَکَن کے معنی رحمت و برکت کے ہیں۔ جیسے ارشاد ہوا: إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (سورۂ توبہ، آیت ۱۰۳)

بے شک آپ کی دعا ان کے لئے سکون کا باعث ہے۔

اَلْاَکْل، اَلْمَضْغ اور اللُّقْم قریب المعنی ہیں اور اَکْل کی ضد اَزْم ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے حارث بن کلدہ عرب کے طبیب سے سوال کیا: یا حار! اے حارث! مَا الدَّوَاءُ دوا کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: اَلْاَزْم یعنی کھانا ترک کر دینا۔

رَغَد۔ ایسا فائدہ جو وسیع ہو اور اس سے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ ابن درید نے کہا: اَلرَّغَدُ السَّعَةُ فِي الْعَيْش زندگی گزارنے میں وسعت اور مَشِيَّة ارادہ کے قبیل سے ہے اور اسی طرح محبت، اختیار اور ایثار ہے اگرچہ اس کی کچھ شرطیں ہیں جن کو اصول کلام میں بیان کیا گیا ہے۔

قرب کے معنی دنو (یعنی نزدیکی) کے ہیں۔

شَجَرَةٌ مَا قَامَ عَلٰى سَاقٍ۔ درخت وہ ہے جو اپنے تنے پر کھڑا ہو۔ اس کی جمع اَشْجَار، شَجَرَات اور شَجَر ہے۔ تَشَاجَرَ الْقَوْمُ کے معنی ہیں باہمی اختلاف کرنا۔

ظُلْم اور جَوْر کے معنی ایک ہیں۔ ظلم کی ضد انصاف ہے اور جور کی ضد عدل ہے اور ظلم کے لغوی معنی حق میں کمی کرنے کے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ ظلم دراصل وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَوْضِعِهٖ۔ ہے یعنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر

دوسری جگہ رکھ دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا۔ (سورۂ کہف، آیت ۳۳) (دونوں باغات خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی) یعنی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ترکیب:

اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ : اسم ظاہر کو ضمیر مستتر اور متصل پر عطف کرنے کو قبیح قرار دیا گیا ہے لہٰذا فرمایا: اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔ اَنْتَ اُسْكُنْ میں پوشیدہ ضمیر کی تاکید کے لئے ہے جو کہ اُسْكُنْ فاعل ہے۔

زَوْجُكَ محل اَنْتَ پر عطف ہے اگر زَوْجُكَ کو ضمیر مستتر پر عطف کرتا تو ظاہر میں اشتباہ ہو جاتا کہ اسم کو فعل پر عطف کیا اسی لئے ضمیر منفصل لایا ہے اور زَوْجُكَ کو اسی ضمیر منفصل پر عطف کیا ہے۔

رَغَداً منصوب ہے اس لئے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: اَكْلًا رَغَداً یعنی وَاسِعاً كَثِيْراً یہ بھی ممکن ہے کہ رَغَداً ایک ایسا مصدر ہو جسے كُلَا میں ضمیر کے لئے حال کی جگہ پر رکھ دیا جائے۔

خلیل نے کہا: بولا جاتا ہے: قَوْمٌ رَغَدٌ وَنِسَاءٌ رَغَدٌ وَعَيْشٌ رَغْدٌ وَرَغِيْدٌ۔ امرؤ القیس نے کہا:

بَيْنَمَا　الْمَرْءُ　تَرَاهُ　نَاعِمًا　يَأْمَنُ الْأَحْدَاثَ فِيْ عَيْشٍ رَغَد

اس اثنا میں کہ انسان کو آپ ناز اور نعمتوں میں دیکھتے ہیں وہ خوشگوار زندگی میں حادثات سے امن و امان میں ہوتا ہے۔ اس قول کی بنا پر گویا اس طرح ہوگا: وَ كُلَا مِنْهَا مُتَوَسِّعِيْنَ فِي الْعَيْشِ، تم دونوں جنت میں سے زندگی میں وسعت دیتے ہوئے کھاؤ۔

حَيْثُ مبنی بر ضمہ ہے جس طرح ادات غایت جیسے مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ مبنی ہوتے ہیں اس لئے کہ حَيْثُ کو مفرد کی جانب اضافت سے روک دیا گیا ہے جس طرح غایت کو اضافت سے روک دیا گیا ہے۔

حَيْثُ کے بعد جملہ اسمیہ یا جملہ فعلیہ آتا ہے کہ اس جملہ کو مضاف الیہ فرض کیا جاتا ہے۔

لَا تَقْرَبَا: لاء نہی کے ذریعہ مجزوم ہے، الف ضمیر فاعل ہے۔

فَتَكُوْنَا: میں دو احتمال پائے جاتے ہیں: (۱) وہ نہی کا جواب ہے ایسی صورت میں وہ اَنْ کو پوشیدہ رکھنے کی وجہ سے منصوب ہے اور اَنْ فعل کے ساتھ اسم مفرد (مصدر) کی تاویل میں چلا جاتا ہے اگر آپ فاء

کے بعد اَن کو پوشیدہ مانیں گے تو وہ گذشتہ فعل کے مصدر پر عطف ہوگا گویا اس طرح ہوگا: لَا یَکُوْنُ مِنْكُمَا قُرْبٌ لِهٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ایسی صورت میں کلام ایک جملہ ہوگا اس لئے کہ معطوف معطوف علیہ کے اجزاء میں سے ہوجائے گا۔

ہم نے اسے جواب کا نام دیا ہے کہ وہ جزاء سے مشابہ ہے کہ دوسرے کا سبب وہی پہلا ہے اس لئے کہ کلام کے معنی یہ ہوں گے: اِنْ تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ تَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ نہی پر معطوف ہے تو ایسی صورت میں مجزوم ہوگا اور فاء جملہ کو جملہ پر عطف کرنے والا ہوگا۔ گویا خدا نے اس طرح فرمایا: فَلَا تَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

تفسیر:

جنت میں رہیے

پھر خداوند عالم نے اس بات کا ذکر کیا جس کا آدمؑ کو حکم دیا تھا ان پر نعمت علم کے اختصاص کے بعد جو ان کی عظمت کا سبب تھا اور جس کے سبب ملائکہ سے سجدہ کروایا گیا تھا۔

ارشاد ہوا: وَقُلْنَا (اور ہم نے کہا) قُلْنَا میں نون (نا) کبریائی اور عظمت کا ہے نہ کہ نون جمع۔

ارشاد تعالیٰ: یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ، (اے آدم! تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو) یعنی تم اور تمھاری زوجہ جنت کو اپنا مسکن وماٗ ویٰ قرار دو اور اس میں تم اور تمھاری زوجہ سکون حاصل کرو۔

اس اُمرُ کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے:

بعض مفسرین نے کہا کہ یہ امر تعبدی تھا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مباحی حکم تھا اس لیے اس میں مشقت نہیں تھی جس سے تکلیف کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کا ارشاد: وَكُلَا (تم دونوں کھاؤ) یہ کھانے کو مباح قرار دینے کے لئے۔

وَلَا تَقْرَبَا (تم دونوں قریب نہ ہو) متفق طور پر یہ حکم تعبدی ہے۔

ابن عباس اور ابن مسعود سے روایت کی گئی ہے کہ جب ابلیس کو جنت سے نکالا گیا اور اس پر لعنت کردی گئی اور آدمؑ تنہا رہ گئے تو انہوں نے وحشت اور گھبراہٹ محسوس کی اس لئے کہ ان کے ساتھ کوئی نہ تھا کہ جس سے وہ سکون حاصل کرتے تو حوا کو خلق کیا گیا تا کہ آدمؑ ان سے سکون حاصل کریں، راحت محسوس کریں۔

روایت کی گئی ہے: اللہ نے آدمؑ پر نیند طاری کر دی اور ان سے ایک پسلی نکال لی جہاں سے حوا کی خلقت ہوئی، آدمؑ بیدار ہوئے اپنے سر کے ہانے عورت کو دیکھا، سوال کیا تم کون ہو؟ کہا: عورت، کس لیے خلق کی گئی ہو؟ حوا نے کہا تا کہ آپ مجھ سے سکون حاصل کریں۔ ملائکہ نے آدمؑ سے کہا: ان کا کیا نام ہے؟ آدمؑ نے کہا: حوا۔ ملائکہ نے وجہ تسمیہ معلوم کی، تو انھوں نے جواب دیا اس لیے کہ یہ زندہ سے پیدا کی گئی ہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (اے آدم! تم اور تمھاری زوجہ جنت میں رہو)

بیان کیا گیا ہے: حوا کو آدمؑ کے جنت میں رہنے سے پہلے خلق کیا گیا تھا۔ پھر دونوں کو ایک ساتھ جنت میں داخل کیا گیا۔

کتاب النبوۃ میں آیا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور حوا کو آدمؑ سے۔ مردوں کا عزم پانی اور مٹی سے ہے اور عورتوں کی ہمت و جرأت مرد سے ہے۔

محققین نے بیان کیا ہے کہ محال نہیں ہے خداوند عالم جناب حواؑ کو جناب آدمؑ کے پورے جسم سے خلق کرے، بعد اس کے کہ کوئی بھی حی دوسرے حی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ جو اس صفت کا حامل ہوگا وہ غیر کی جانب منتقل نہیں ہوسکتا ہے یا اس سے کوئی دوسری زندہ شے خلق ہو۔ اسی حیثیت سے کہ وہ پہنچانے والی ہوگی اس بات کی طرف کہ ثواب کا مستحق ثواب تک پہنچانا ممکن نہیں ہوگا اور یہاں مستحق وہ ہے جو اپنی تمام چیزوں کے ساتھ پایا جاتا ہے اور حوا کا نام حوا اس لیے رکھا گیا کیونکہ وہ زندہ سے پیدا کی گئی ہیں۔ جس کا ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے اور حوا کو اس وجہ سے بھی حوا کہا جاتا ہے کہ وہ ہر زندہ انسان کی ماں ہیں۔

یہ جنت کون سی جنت تھی؟

جناب آدمؑ نے جس جنت میں سکونت اختیار کی تھی اس جنت کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابو ہشام کا کہنا ہے کہ یہ آسمان کی جنتوں میں سے ایک جنت تھی ہمیشہ رہنے والی جنت نہیں تھی کیونکہ ہمیشہ رہنے والی جنت کا پھل کھانے والا ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس میں کوئی فریضہ انسان کی گردن پر نہیں ہوگا۔

ابو مسلم نے کہا ہے کہ وہ زمین میں دنیا کی جنتوں میں سے ایک جنت تھی اور اللہ کا یہ فرمان کہ: اِهْبِطُوْا مِنْهَا۔ (تم یہاں سے اتر جاؤ) اس جنت کے آسمان میں ہونے پر دلالت نہیں کرتا کیوں کہ یہ فرمان: اِهْبِطُوْا مِصْرًا (کسی شہر چلے جاؤ) کے فرمان کے مانند ہے۔

بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ یہ جنت خلد کی جنت نہیں تھی اور انھوں نے دلیل اس آیت: هَلْ

اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ (سورۂ طہ، آیت ۱۲۰) (میں تمہیں ہمیشگی کے درخت کی طرف رہنمائی کردوں) کو قرار دیا ہے۔ اگر وہ خلد کی جنت ہوتی تو جناب آدمؑ کو اس کا علم ہوتا اور وہ کسی رہنمائی کے محتاج نہ ہوتے۔

اکثر مفسرین جیسے حسن بصری، عمرو ابن عبید، واصل بن عطا اور بہت سے معتزلہ جیسے جبائی، رمانی اور ابن اخشید نے کہا ہے کہ وہ جنت، جنت خلد تھی، کیونکہ الجنۃ میں الف اور لام معرفہ بنانے کے لئے ہے جو عَلَم (نام) کے مانند ہو گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آدمؑ کو جنت سے نکالنے کے لئے ابلیس کا وسوسہ اس جنت کے باہر سے رہا ہو آدم وحوا ابلیس کی باتوں کو سن رہے تھے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنت خلد میں داخل ہونے والا کبھی اس سے باہر نہیں آئے گا، صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہ اس وقت ہوگا جب اہل جنت جنت میں ثواب کی وجہ سے داخل ہوں گے۔ جہاں تک اس سے پہلے کا تعلق ہے تو سب کا سب فنا ہو جائے گا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سورۂ قصص، آیت ۸۸) ہر شئے ہلاک ہو جانے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔

اور اس کا یہ فرمان کہ: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا یعنی دونوں جنت سے کھاؤ کثرت سے جو نہایت وسیع ہے اس میں کوئی زحمت نہیں ہے۔

حَيْثُ شِئْتُمَا یعنی جنت کے حصوں میں سے کسی بھی جگہ سے کھاؤ۔ کہا گیا ہے کہ جنت کے ہر پھل سے کھاؤ سوائے اس درخت سے جس سے منع کیا گیا ہے۔

اور آیت: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (خبردار اس درخت کے قریب نہ جانا) یعنی اس سے نہ کھانا۔ یہی روایت امام باقر علیہ السلام سے ہے کہ تم دونوں کھانے کے لیے اس کے نزدیک نہ جانا جو اس بات پر دلالت ہے کہ مخالفت کھانے کے سبب واقع ہوئی ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ نہ کہ درخت کے نزدیک ہونے کے باعث، اس لیے خداوند عالم نے فرمایا ہے: فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى۔ (سورۂ طہ، آیت ۱۲۱) (دونوں نے اس کا پھل کھالیا دونوں کے ستر ان کے سامنے ظاہر ہو گئے اور وہ جنت کے پتوں سے خود کو ڈھانپنے لگے آدمؑ نے پروردگار کی نصیحت پر عمل نہ کیا تو جنت کی راحت سے دور ہو گئے)

گناہ یا ترک اولیٰ؟!

لَا تَقْرَبَا (خبردار تم دونوں قریب نہ جانا) اس نہی کے سلسلہ میں اختلاف ہے، کہا گیا ہے کہ یہ نہی تحریمی ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ نہی تنزیہی ہے نہ کہ تحریمی۔ جس طرح کوئی کسی سے یہ کہے کہ "راستہ میں نہ بیٹھنا" یہ نظریہ ہمارے مذہب سے نزدیک ہے اس لیے کہ ہمارے نزدیک آدمؑ کو درخت سے تناول نہ کرنے کے لیے کہا تھا، تناول کا ان کے لیے ترک کرنا مستحب اور پسندیدہ بات تھی کہ اس کے لئے کہ جناب آدمؑ فعل قبیح انجام دینے والے نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاءؑ کے لیے صغیرہ اور کبیرہ (گناہ) کا انجام دینا ممکن نہیں ہے۔

معتزلہ نے کہا ہے: جناب آدمؑ کا یہ عمل (گناہ) صغیرہ تھا۔

ان کے درمیان اس بات پر اختلاف ہے، یہ فعل ان سے عمداً واقع ہوا یا سہواً یا تاویل کے سبب۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ انبیاءؑ کے لیے کبائر کا انجام دینا ممکن نہیں ہے چونکہ قبیح افعال کا انجام دینے والا مذمت اور عذاب کا مستحق ہوتا ہے اس لیے کہ ہمارے نزدیک سارے گناہ کبائر ہیں البتہ چونکہ بڑے گناہ میں عذاب زیادہ ہوتا ہے اسی لیے اس کے مقابل میں کم عذاب والے گناہ کو صغیرہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ جناب آدمؑ کا ہبوط (زمین پر لایا جانا) ہمارے نزدیک اس نظریہ کے باطل ہونے نشاندہی کرتا ہے۔

جب عمل باطل ہو گیا تو کوئی معصیت و گناہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کا انجام دینے والا مذمت اور عذاب کا مستحق ہو گا جب کہ مذمت اور عذاب کی انبیاء علیہم السلام سے نفی کی گئی ہے لہذا ضروری ہے کہ ان سے تمام گناہوں کی نفی کی جائے اس لیے کہ اگر انبیاء سے کوئی گناہ سرزد ہو گا تو ان کی بات ماننے سے نفرت ہو گی۔ نفرت سے مراد یہ ہے کہ نفس ایسی ذات کی بات قبول کرے جس کے لیے گناہ و معصیت کرنا ممکن نہ ہو تو نفس زیادہ سکون محسوس کرتا ہے بنسبت اس کے کہ جس کے لیے گناہ کا امکان ہو اگر یہ صحیح ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمؑ کا ظاہری نہی کی مخالفت کرنا اس سبب سے تھا جسے ہم واضح کر چکے ہیں۔

یہ درخت کون سا درخت تھا؟

اس درخت کے متعلق اختلاف ہے جس سے آدمؑ کو نہی کی گئی تھی۔ کہا گیا ہے کہ وہ درخت گندم تھا۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے۔ ابن مسعود و سدی سے روایت ہے کہ انگور کا درخت تھا۔ ابن جریج سے روایت ہے درخت زیتون تھا۔ کہا گیا ہے کہ درخت کافور تھا، اس کی روایت حضرت علی علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ درخت علم تھا، یہ روایت کلبی سے ہے کہ یہ خیر و شر کا علم تھا۔ ابن جذعان سے روایت ہے کہ یہ شجرۃ الخلد تھا جس سے فرشتے کھایا کرتے تھے۔

ارشاد الٰہی: فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ یعنی اسے کھانے کے بعد تم دونوں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے

والے ہو جاؤ گے۔اس شخص کے لیے جو اپنے لیے کار ثواب کم کرتا ہے کہا جاتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے۔جیسا کہ اللہ نے حضرت ایوبؑ کے واقعہ میں فرمایا ہے: اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ اس لیے کہ انھوں نے ایسے امر کو ترک کر کے کہ جس کی انھیں دعوت دی گئی تھی ثواب کم کر لیا تھا۔

عمل کے بغیر ثواب

اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا جنت میں خلقت کا آغاز ممکن ہے؟ اہل بصرہ کے اہل عدل (شیعوں) نے اسے ممکن سمجھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم کے لیے جنت میں ہمیشہ نعمت عطا کرنا ممکن ہے۔ یہ اس کی جانب سے فضل ہے، ثواب کی بنیاد پر نہیں ہے۔ یہ اس کی جانب سے نعمت ہے جس طرح اس کا خلق کرنا اور ان کے لیے ثواب مہیا کرنا نعمت ہے۔

ابوالقاسم بلخی کا کہنا ہے: ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ کام دو صورتوں سے خالی نہیں ہے یا تو وہ معرفت کے پابند ہوں گے یا پابند نہیں ہونگے۔ اگر پابند ہوں گے تو ان کے لیے ترغیب خوف وعدو وعید کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح ان کے لیے ایک دوسرے مقام کا ہونا ضروری ہے جہاں انھیں جزا دی جائے اور وہ ہمیشہ اس میں باقی رہیں۔ اگر پابند نہیں ہوں گے تو لغو و بیکار ہوں گے جو کہ ناممکن ہے، اس بات کا جواب کہ اگر خداوند عالم ان کی ابتدائی خلقت جنت میں فرماتا تو انھیں معرفت کا پابند بناتا اور انھیں فعل حسن کی ترغیب اور فعل قبیح سے روکتا جب بھی وہ اس کا ارادہ کرتے وہ اس سے مانع ہوتا۔ یہ چیز اس امر کو بیان نہیں کرتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ خداوند عالم بچوں اور غیر مکلفین کو ثواب کے علاوہ داخل جنت فرمائے گا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

آخر کار دونوں کو شیطان نے ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں وہاں سے نکلوا دیا جس عیش و آرام میں وہ تھے۔ پس ہم نے حکم دیا: تم سب نیچے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اب زمین میں تمھارے لیے رہائش اور ایک خاص وقت تک سامان حیات مہیا رہے گا۔

الفاظ و معانی:

زَلَّة، خَطِيْئَة، مَعْصِيَة اور سَيِّئَة کے ایک ہی معنی ہیں۔ خَطِيْئَة (غلطی) کی ضد اِصَابَة ہے۔ صحیح اور درست کو پالینا اور اس تک پہنچ جانا۔ کہا جاتا ہے: زَلَّتْ قَدَمُهٗ زَلًّا (اس کے قدم پھسل گئے اور اپنی جگہ پر قائم نہ رہے) زَلَّ فِيْ مَقَالَتِهٖ (اس نے اپنی گفتگو میں لغزش کی) اَلْمَزَلَّة، اَلْمَكَان الزَّحِض پھسلنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس کے اصل معنی زوال کے ہیں۔ زَلَّة کے معنی حق سے پھسلنا اور لغزش کرنا ہے۔ اَزَلَّهُ الشَّيْطَانُ یعنی جب شیطان نے اسے حق سے پھسلا دیا۔

وَاَزْلَلْتُ اِلٰى فُلَانٍ نِعْمَةً میں نے فلاں شخص تک نعمت پہنچادی۔

ایک حدیث میں آیا ہے: مَنْ اُزِلَتْ اِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا۔ جس تک کوئی نعمت پہنچے اسے اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

هُبُوط، نُزُوْل، وُقُوْع باہم مشابہ ہیں اور یہ بلندی سے نیچے کی طرف حرکت کرنے کے معنیٰ میں ہیں۔ کبھی هُبُوط کا استعمال کسی جگہ میں حلول کرنے اور اس میں اترنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: اِهْبِطُوا مِصْرًا۔ (کسی شہر میں اتر پڑو)

عَدُوّ وَلِيّ (دوست) کی ضد ہے۔ عَدَاوَة مصدر ہے اس کے حقیقی معنیٰ مُجَاوَزَة (حد سے گزر جانے) کے ہیں۔

قَرَار کے معنی ثبات اور بقا کے ہیں۔ قَرَار کی ضد اِضْطِرَاب اور بے قراری ہے۔ ثَبَات کی ضد زَوَال ہے۔ بَقَاء کی ضد فَنَاء ہے۔ استقرار کے معنی ایک وقت سے زیادہ میں اسی حالت میں ہونا یا پایا جانا

ہے۔ مستقر ممکن ہے استقرار کے معنی میں ہو یا اس جگہ کے معنی میں ہو جس میں قیام کیا اور ٹھہرا جاتا ہے۔

مَتَاع، تَمَتُّع، مُتعَة اور تَلَذُّذ معنی کے لحاظ سے باہم نزدیک ہیں۔

حِین، مُدَّة اور زمان ایک دوسرے سے نزدیک ہیں۔ حین اس مقام کے علاوہ چھ مہینوں کو کہا جاتا ہے جس پر اللہ کا ارشاد دلالت کر رہا ہے: تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۔ (یہ شجرہ ہر زمانہ میں حکم پروردگار سے پھل دیتا رہتا ہے) حین تمام اوقات کی بھی صلاحیت رکھتا ہے مگر زیادہ سے بہت زیادہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر:

شیطان نے اپنا کام کر دیا

پھر اللہ نے جناب آدمؑ و جناب حواؑ کی حالت و کیفیت بیان فرمائی: فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ، یعنی شیطان نے دونوں کو اس جنت سے ہٹا دیا جس میں وہ عظیم مرتبہ اور بلند مقام پر فائز تھے۔ اِزْلَال کی نسبت شیطان کی جانب دی گئی ہے چونکہ اس کی دعوت، وسوسے اور غلط راستہ دکھانے کے سبب ایسا ہوا تھا۔ فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ، اور انہیں وہاں سے نکلوا دیا جس عیش و آرام میں وہ تھے۔ شیطان سے ابلیس مراد ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اِخْرَاج سے مراد جنت سے نکلوانا ہے یہاں تک کہ دونوں چلے گئے۔

احتمال یہ بھی ہے کہ اطاعت سے معصیت کی جانب جانا مراد ہو۔

اِخْرَاج نکالنے کی نسبت کو شیطان کی طرف دی ہے اس لئے کہ ان دونوں کو جنت سے نکالے جانے کا سبب وہی بنا تھا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: صَرَفَنِي فُلَانٌ مِنْ هٰذَا الْأَمْرِ؛ فلاں شخص نے مجھے اس کام سے برگشتہ کر دیا۔ دونوں (آدمؑ و حوا) کا جنت سے اخراج اور ان کا زمین کی طرف جانا عقاب و عذاب کے سبب نہیں تھا اس بات پر دلیل موجود ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے کسی بھی صورت میں قبائح ممکن نہیں ہے اور جس نے انبیاءؑ کے لیے عذاب کو ممکن قرار دیا ہے اس نے ان کی شان میں گستاخی کی ہے اور اللہ پر بہتان باندھا اور جو کچھ ہم نے کہا اگر وہ درست ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا تھا اس لئے کہ درخت کا پھل کھانے کی وجہ سے مصلحت تبدیل ہوگئی تھی۔ اللہ نے جناب آدمؑ کو جنت سے نکالا چونکہ درخت (کا پھل) کھاتے ہی مصلحت تبدیل ہوگئی، حکمت اور تدبیر الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ انھیں زمین پر بھیجا جائے

تکلیف و زحمت کے سبب ان کی آزمائش کی جائے اور ان سے لباس جنت واپس لے لیے جائیں، یہ ان پر احسان، اکرام اور تفضل کے سبب تھا جس طرح (خدا) شدید آزمائش و امتحان میں مبتلا ہونے سے روکتا ہے (اسے اختیار ہے) جس طرح وہ ثروت مندی کے بعد فقر میں مبتلا کرتا ہے، زندگی کے بعد موت دیتا ہے، صحت کے بعد مرض میں مبتلا کر دیتا ہے اور مشقت پر مشقت دیتا ہے۔

شیطان آدمؑ و حواؑ تک کیسے پہنچا؟

ابلیس کے جناب آدمؑ و حواؑ تک پہنچنے کی کیفیت میں اختلاف ہے یہاں تک کہ اس نے دونوں کو وسوسہ میں مبتلا کیا جبکہ ابلیس کو انکار سجدہ پر جنت سے نکال دیا تھا اور جناب آدمؑ و جناب حواؑ ابھی جنت میں تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جناب آدمؑ در جنت تک نکل جاتے تھے اور ابلیس کو در جنت سے قریب ہونے سے ممانعت نہیں تھی وہ ان سے گفتگو کرتا، یہ عمل زمین کی طرف بھیجے جانے سے قبل اور جنت سے نکالے جانے کے بعد ہوا تھا۔ یہ روایت ابوعلی الجبائی سے مروی ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس ان سے زمین سے ایسی باتیں کرتا جنھیں وہ سمجھتے تھے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس سانپ کے منہ میں داخل ہوا اور وہاں سے اس نے ان سے گفتگو کی لیکن ظاہر قرآن دلالت کر رہا ہے کہ ابلیس نے خطاب کے ساتھ دونوں کو دیکھا بھی تھا۔

نیچے جاؤ

ارشاد الٰہی: وَقُلْنَا اهْبِطُوْا (ہم نے حکم دیا: تم سب نیچے جاؤ)، صیغہ جمع کے ذریعہ خطاب کیا گیا ہے تو اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: اللہ نے آدمؑ و حوا اور ابلیس سے خطاب کیا ہے۔ اس قول کو زجاج اور مفسرین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابلیس کو اس سے قبل نکالا جا چکا تھا جس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان: اُخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مروی روایات کو اس طرح جمع کیا گیا کہ تمام کے تمام نیچے جانے میں جمع ہو گئے اگرچہ ان کے نکالے جانے کے اوقات مختلف تھے جس طرح زندان میں موجود افراد سے کہا جائے تم سب نکل جاؤ اگرچہ تمام متفرق طور پر نکلیں۔

دوم: اس سے آدمؑ، حوا اور سانپ مراد ہیں۔ یہ وجہ بعید ہے اس لیے نہ سمجھنے والے سے خطاب کرنا حسن و

بہتر نہیں ہے اس لیے کہ سابق میں سانپ کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور غیر مذکور سے کنایہ کرنا اچھی بات نہیں ہے مگر اس طرح کہ لُبس (اشتباہ) نہ ہو جیسا کہ اللہ ارشاد ہے: حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ. (سورۂ ص، آیت ۳۲) (یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا) یا یہ ارشاد: مَّا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِن دَآبَّةٍ، (سورۂ فاطر، آیت ۴۵) (تو روئے زمین پر وہ کسی چلنے والے جاندار کو نہ چھوڑتا)

سوم: اس سے جناب آدمؑ و جناب حواؑ اور دونوں کی اولاد مراد ہے۔ والدین ذریت پر دلالت کرتے ہیں اور اولاد انھیں سے متعلق ہوتی ہے۔

چہارم: خطاب جناب آدمؑ و جناب حواؑ سے مخصوص ہے ان دونوں کو صیغہ جمع کے ذریعہ خطاب کیا گیا ہے اور یہ عربوں کی عادت کے مطابق ہے اور اس لیے کہ دو جمع سے پہلے ہوتا ہے اللہ کا ارشاد ہے: اِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ. (سورۂ انبیاء، آیت ۷۸) (اور داؤد اور سلیمان جب ایک کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے جسے رات کو ایک قوم کی بکریاں چر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کے شاہد تھے) اس سے داؤد و سلیمانؑ کا فیصلہ مراد ہے جس کی تاویل اس ارشاد سے کی گئی ہے: فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ یعنی فَاِنْ كَانَ لَهٗ اَخَوَان. (سورۂ نساء، آیت ۱۱) یہ صیغۂ جمع ہے لیکن اس آیت میں دو بھائی مراد ہیں۔

پنجم: آدمؑ و حوا اور وسوسہ مراد ہے۔ یہ قول حسن کا ہے جو کہ ضعیف ہے۔

اللہ کا ارشاد: بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، (تم ایک دوسرے کے دشمن ہو) یعنی آدمؑ اور ان کی ذریت اور ابلیس اور اس کی ذریت۔ جناب آدمؑ کی جانب سے کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو اس سے عداوت کا باعث ہوتی لیکن ملعون (ابلیس) کی مخالفت اور حسد کے ذریعہ دونوں کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی۔ جناب آدمؑ کی جانب سے ابلیس کی مخالفت ایمان ہے، ابلیس کی جانب سے آدمؑ کی عداوت کفر ہے۔

حسن نے کہا ہے: اولاد آدمؑ اور اولاد ابلیس مراد ہیں یہ امر نہیں ہے بلکہ تحذیر ہے اس لیے کہ اللہ عداوت اور دشمنی کا حکم نہیں دیتا۔ امر مخصوص ہے ہبوط سے (یعنی نیچے اتر جانا) اس حالت میں کہ ان کی ذریت بعض سے بعض کی دشمنی کرے گی۔ خطاب کو ان دونوں سے معلق کیا گیا ہے ذریت اور ان کی اصل کے درمیان اختصاص کے ساتھ۔

اللہ کا ارشاد: لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ، یعنی تمھارے لیے زمین کو مستقر اور جائے قرار بنایا گیا ہے۔

وَّمَتَاعٌ، یعنی فائدہ حاصل کرنے کا مقام۔

اِلٰى حِيْنٍ، وقت موت تک کے لیے اور کہا گیا ہے کہ قیامت تک کے لیے۔

بہتر نہیں ہے اس لیے کہ سابق میں سانپ کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور غیر مذکور سے کنایہ کرنا اچھی بات نہیں ہے مگر اس طرح کہ لُبس (اشتباہ) نہ ہو جیسا کہ اللہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ. (سورۂ ص، آیت ۳۲) (یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا) یا یہ ارشاد: مَّا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ، (سورۂ فاطر، آیت ۴۵) (تو روئے زمین پر وہ کسی چلنے والے جاندار کو نہ چھوڑتا)

سوم: اس سے جناب آدمؑ و جناب حوّاؑ اور دونوں کی اولاد مراد ہے۔ والدین ذریت پر دلالت کرتے ہیں اور اولاد انھیں سے متعلق ہوتی ہے۔

چہارم: خطاب جناب آدمؑ و جناب حوّاؑ سے مخصوص ہے ان دونوں کو صیغہ جمع کے ذریعہ خطاب کیا گیا ہے اور یہ عربوں کی عادت کے مطابق ہے اور اس لیے کہ دو جمع سے پہلے ہوتا ہے اللہ کا ارشاد ہے: اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ. (سورۂ انبیاء، آیت ۷۸) (اور داؤد اور سلیمان جب ایک کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے جسے رات کو ایک قوم کی بکریاں چر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کے شاہد تھے) اس سے داؤد و سلیمانؑ کا فیصلہ مراد ہے جس کی تاویل اس ارشاد سے کی گئی ہے: فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ یعنی فَاِنْ كَانَ لَهٗ اَخَوَان. (سورۂ نساء، آیت ۱۱) یہ صیغہ جمع ہے لیکن اس آیت میں دو بھائی مراد ہیں۔

پنجم: آدمؑ و حوا اور وسوسہ مراد ہے۔ یہ قول حسن کا ہے جو کہ ضعیف ہے۔

اللہ کا ارشاد: بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ. (تم ایک دوسرے کے دشمن ہو) یعنی آدمؑ اور ان کی ذریت اور ابلیس اور اس کی ذریت۔ جناب آدمؑ کی جانب سے کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو اس سے عداوت کا باعث ہوتی لیکن ملعون (ابلیس) کی مخالفت اور حسد کے ذریعہ دونوں کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی۔ جناب آدمؑ کی جانب سے ابلیس کی مخالفت ایمان ہے، ابلیس کی جانب سے آدمؑ کی عداوت کفر ہے۔

حسن نے کہا ہے: اولاد آدمؑ اور اولاد ابلیس مراد ہیں یہ امر نہیں ہے بلکہ تحذیر ہے اس لیے کہ اللہ عداوت اور دشمنی کا حکم نہیں دیتا۔ امر مخصوص ہے ہبوط سے (یعنی نیچے اتر جانا) اس حالت میں کہ ان کی ذریت بعض سے بعض کی دشمنی کرے گی۔ خطاب کو ان دونوں سے معلق کیا گیا ہے ذریت اور ان کی اصل کے درمیان اختصاص کے ساتھ۔

اللہ کا ارشاد: لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ، یعنی تمھارے لیے زمین کو مستقر اور جائے قرار بنایا گیا ہے۔

وَّمَتَاعٌ، یعنی فائدہ حاصل کرنے کا مقام۔

اِلٰى حِيْنٍ، وقت موت تک کے لیے اور کہا گیا ہے کہ قیامت تک کے لیے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص کی مدت کے تمام ہونے تک۔ ابوبکر سراج نے کہا ہے کہ اگر اس طرح کہا جاتا: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ، تو اس کے غیر منقطع ہونے کا گمان ہوتا۔ اِلٰی حِیْنٍ، یعنی وقت کے تمام ہونے تک۔ قائل کے قول: اِنَّ ھٰذَا لَکُمْ حِیْنًا، اور اِلٰی حِیْنٍ کے درمیان فرق ہے۔

اِلٰی (تک) انتہاء پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کے لیے ابتداء کا ہونا لازمی ہے اور دوسری وجہ میں اس طرح نہیں ہے، آیت دلالت کر رہی ہے خداوند عالم معصیت و نافرمانی نہیں چاہتا، نہ ہی کسی کو اطاعت سے روکتا ہے، نہ ہی اس کو اطاعت سے خارج کرتا ہے، نہ ہی گناہ کا سبب بنتا ہے، یہ کام شیطان کا ہے۔ اس سے ہمارے پروردگار کی ذات بلند و پاک ہے اور جس کی نسبت ابلیس و شیاطین کی جانب دی گئی ہے اس امر پر دلیل ہے کہ ابلیس کے وسوسہ سے گناہ میں تاثیر ہے۔

❀❀❀❀❀

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾
آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہ توبہ کا قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

قرائت:

ابن کثیر لفظ اٰدَمَ کو منصوب پڑھا ہے اور کلمات کو مرفوع، بقیہ قراء نے اٰدَمُ مرفوع اور کلماتٍ کو منصوب پڑھا ہے۔

حجت:

لفظ اٰدَمَ کو نصب دینے پر ابن کثیر کی دلیل یہ ہے کہ وہ معنی کے لحاظ سے دوسری قرائت کے مانند ہے اس لئے کہ افعال متعدی تین طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) کچھ ایسے ہیں کہ وہ فاعل مفعول بہ بن سکتے ہیں اور مفعول بہ فاعل بن جا سکتا ہے جیسے: ضَرَبَ زَيْدٌ عَمْرًا (زید نے عمر کو مارا)

(۲) کچھ ایسے ہیں کہ آپ کو ان میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے جیسے: اَکَلْتُ الْخُبْزَ (میں نے روٹی کھائی)

(۳) کچھ ایسے افعال ہیں کہ فاعل کی جانب ان کی نسبت معنی (ذہن) میں ہوتی ہے جس طرح فعل کی نسبت مفعول بہ کی جانب دینا جیسے: نِلْتُ، اَصَبْتُ، تَلَقَّیْتُ آپ کہیں گے: نِلْتُ وَ أَصَبْتُ وَ تَلَقَّیْتُ، آپ یہ کہتے ہیں: نَالَنِیْ خَیْرٌ وَّ نِلْتُ خَیْرًا وَ أَصَابَنِیْ شَیْءٌ وَ أَصَبْتُ شَیْئًا وَّ تَلَقَّانِیْ زَیْدٌ وَ تَلَقَّیْتُ زَیْدًا۔ (دونوں صورتوں میں جائز ہے) اسی کے مانند یہ آیت ہے: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ، عبداللہ کی قرائت میں جیسا کہ کہا گیا ہے اس طرح ہے: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمُوْنَ۔

الفاظ و معانی

اَلتَّلَقِّیْ اور اَلتَّلَقُّنِ ایک جیسے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تَلَقَّیْتُ مِنْهُ یعنی اَخَذْتُ وَ قَبِلْتُ میں نے اس سے لیا اور قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً (۱۱، الدھر، ۷۶) اور انہیں تازگی اور سرور سے نوازے گا۔ کَلِمَات کَلِمَة کی جمع ہے کلمہ اسم جنس ہے جو قلیل اور کثیر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

کلام کی تقسیم مہمل اور مستعمل میں کی گئی ہے۔ سیبویہ کی مراد یہ ہے کہ مہمل کلام نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ مفید نہیں ہوتا۔ سیبویہ کے نزدیک کلام کا اطلاق مفید پر ہوتا ہے اور ابوالقاسم بلخی کا بھی یہی نظریہ ہے۔

اَلتَّوْبَة، اَلْاِقْلَاع اور اَلْاِنَابَة لغت میں ایک ہی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ توبہ کی ضد اصرار ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توصیف کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں سے توبہ کو قبول کرتا ہے۔ توبہ کی اصل یہ ہے کہ جو پہلے گزر چکا ہے اس پر پلٹ جانا اور زیادتی پر شرمندہ ہونا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تائب ہے، بندوں پر، توبہ قبول کرنے کے لئے اور بندہ تائب ہے اللہ کی جانب اپنی معصیت پر شرمندہ ہو کر۔

تفسیر:

جناب آدمؑ نے کلمات سیکھے

ارشاد الٰہی: فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ، یعنی آدمؑ نے سیکھا اور قبول کیا اور اطاعت کے راستہ پر گامزن ہوئے۔ مِنْ رَّبِّهٖ، اپنے اور ہر شے کے پروردگار سے کَلِمٰتٍ، (چند کلمات) فَتَلَقّٰۤی کہہ کر اللہ کی جانب رغبت کہنے سے بے نیاز ہو گیا کہ ان کلمات کے ذریعہ سے یا ان اَسْمَاء کا واسطہ دے کر جناب آدمؑ نے دعا کی۔

تُلقِیْ (قبول کرنا سیکھنا تعلیم حاصل کرنا) سے ان معنی کا استفادہ ہوتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے اور جس چیز کو اختصار کے پیش نظر کلام سے حذف کیا گیا ہے اس کا اظہار ہوتا ہے، چنانچہ اللہ نے ارشاد فرمایا: فَتَابَ عَلَيْهِ (تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی)، اس لیے کہ (آدم) کی توبہ قبول نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ ان کلمات کے واسطہ سے سوال کریں اور جس شخص نے اس طرح قرأت کی ہے: فَتَلَقّٰٓى اٰدَمَ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٌ، تو تَلَقّٰى کے معنی قبول کرنے کے نہیں ہوں گے بلکہ معنی اس طرح ہوں گے کہ کلمات نے نجات ورحمت کا تدارک کیا۔

یہ کلمات کیا تھے؟

كَلِمَات کے متعلق اختلاف ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ بیان کیا گیا ہے کہ وہ یہ قول ہے کہ: رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا... یہ روایت حسن وقتادہ وعکرمہ اور سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ اس جملہ میں اپنی غلطی اور خطا کا اعتراف ہے اسی لیے یہ ندامت کا قائم مقام ہے جو درحقیقت توبہ ہے۔

کہا گیا ہے: (جناب آدمؑ) نے اس طرح کہا تھا: اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ۔

اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ۔

اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

یہ مجاہد سے مروی ہے اور امام باقر علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ کلمات یہ تھے: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔

بیان کیا گیا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام سے مخصوص روایت اس طرح ہے کہ جناب آدمؑ نے عرش پر محترم اور برگزیدہ نام لکھے ہوئے دیکھے جن کے متعلق انھوں نے سوال کیا تو ان سے کہا گیا: اللہ کے نزدیک مقام و مرتبہ میں تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ صاحب جلالت ہیں وہ اسماء یہ ہیں: محمد وعلی و فاطمہ وحسن و حسین (علیہم السلام) پس آدمؑ نے ان اسماء کے ذریعہ پروردگار سے توسل کیا۔ توبہ کی قبولیت اور مقام کی رفعت وبلندی کے لیے۔

فَتَابَ عَلَيْهِ، اس میں یہ جملہ محذوف ہے: فَتَابَ اٰدَمُ فَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، یعنی آدمؑ نے توبہ کی

پس اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

بیان کیا گیا ہے: فَتَابَ عَلَيۡهِ یعنی انھیں توبہ کی توفیق عطا کی، کامیابی دی، اس کی جانب ان کی ہدایت فرمائی یعنی انھیں کلمات کی تلقین و تعلیم دی یہاں تک کہ انھوں نے انھیں بیان کیا اور ادا کیا۔ جب ان کلمات کو بیان کیا تو ان کی توبہ قبول ہوئی۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ یعنی توبہ کا کثرت سے قبول کرنے والا ہے۔ پے در پے توبہ قبول کرتا ہے اور یہ اُن توبہ کرنے والے بندوں کی صفت ہے جو کثرت سے توبہ کرتے ہیں۔

بیان کیا گیا ہے: وہ توبہ قبول کرتا ہے، اگرچہ گناہ بہت بڑے ہی کیوں نہ ہوں ان سے عذاب ساقط کر دیتا ہے۔

الرَّحِيۡمُ. اسے اس لیے بیان کیا تا کہ دلالت کرے کہ وہ توبہ قبول کرنے میں فضل وکرم سے کام لیتا ہے اور انعام عطا کرتا ہے اگرچہ یہ باعتبار وجوب نہیں ہے۔ خداوند عالم نے فَتَابَ عَلَيۡهِ، ہے: فَتَابَ عَلَيۡهِمَا. نہیں فرمایا ہے کہ اختصار اور غلبہ کے پیش نظر حذف کر دیا ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے: وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ يُّرۡضُوۡهُ اِنۡ كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ (سورۂ توبہ، آیت ۶۲) (اللہ اور اس کے رسول اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کریں) اس کا مفہوم ہے: اَنۡ يُّرۡضُوۡهُمَا. یعنی ان دونوں کو راضی کریں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوَا نِ انۡفَضُّوۡۤا اِلَيۡهَا، (سورۂ جمعہ، آیت ۱۱) (اور جب ان لوگوں نے تجارت اور کھیل تماشے کو دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور آپ کو تنہا کھڑا چھوڑ دیا)

اسی طرح آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے دونوں (آدمؑ وحوا) کی توبہ قبول کی۔

حسن بصری نے کہا ہے: جناب آدمؑ کی خلقت اللہ نے زمین ہی کے لیے فرمائی تھی اگر وہ ترک اولیٰ نہ بھی کرتے تو انھیں کسی دوسری صورت میں زمین پر بھیجا جاتا ایک دوسرے عالم نے کہا: ممکن ہے کہ انھیں زمین کے لیے خلق کیا گیا ہو اگر وہ عصیان کریں اور اگر عصیان نہیں کرتے تو کسی دوسری جگہ کے لیے خلق کیا ہو یہی قول اقویٰ ہے۔

فصل: توبہ، اس کے شرائط اور اس میں اختلاف کے متعلق

معلوم ہونا چاہئے کہ توبہ کے شرائط میں گذشتہ قبیح فعل پر ندامت و شرمندگی اور اس جیسے فعل قبیح کو انجام نہ

دینے پر عزم مصمم ہے۔اس طرح کی توبہ پر عذاب کے برطرف اور ساقط ہوجانے پر تمام مسلمانوں نے اتفاق کیا ہے اور اگر ان شرائط کے ساتھ توبہ نہ ہو تو عذاب کے ساقط ہونے کے سلسلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔خدا کی ہر معصیت و نافرمانی پر اس سے توبہ کرنا واجب ہے۔اطاعت پر توبہ صحیح نہیں ہے۔ہمارے نزدیک توبہ صحیح ہے جب مستحب امر کے ترک کرنے پر ہو اور اس فعل کی جانب رجوع کرنے کے اعتبار سے ہو۔انبیاء علیہم السلام کی توبہ کو اسی پر حمل کیا جائے گا اور ان تمام صورتوں کا جس کے متعلق قرآن نے توبہ کی قبولیت اور عذاب کے برطرف کرنے کے متعلق گفتگو کی ہے جب کہ توبہ کی جائے۔ہمارے نزدیک تفضّل کرنا خدا پر واجب نہیں ہے جب کہ تمام معتزلہ کے نزدیک واجب ہے۔اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے، ہم جانتے ہیں کہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ایک فعل قبیح سے توبہ کرنا اور دوسرے فعل قبیح جانتے ہوئے یا مانتے ہوئے قائم رہنے کی صورت میں اکثر علمائے کلام کے نزدیک ایسی توبہ صحیح ہے۔

پہلے قول کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک فعل قبیح سے اس کے قبح کی وجہ سے دوری کرے اور ساتھ ساتھ دانستہ طور پر دوسرے فعل قبیح کو انجام دے اسی طرح ممکن ہے کہ ایک فعل قبیح پر اظہار ندامت کرے، دوسرے فعل قبیح پر اس کی قباحت کو جانتے ہوئے باقی رہے۔

علامت قیامت کے ظاہر ہونے پر توبہ کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ توبہ صحیح ہے یا نہیں؟ حسن نے بیان کیا ہے کہ قیامت کی چھ نشانیاں ظاہر ہونے پر توبہ کی قبولیت میں حجاب اور رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چھ نشانیاں ظاہر ہونے سے قبل اعمال میں جلدی کرو! آفتاب کے مغرب سے طلوع ہونے، دجال، دخان (دھواں) دَابَّۃُ الْاَرْض کے ظاہر ہونے سے پہلے اپنی موت سے قبل اور قیامت سے پہلے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان بعض نشانیوں کے ظہور کے وقت توبہ قبول نہیں ہوگی اور بعض کے نزدیک ممکن ہے کہ توبہ کی قبولیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔واللہ اعلم!

❀❀❀❀❀

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہم نے کہا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ پس جب تمھارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت کا اتباع کرتے رہیں گے انھیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہ ہوگا۔

قرائت:

یعقوب نے پورے قرآن میں فَلَا خَوْفَ فاء کو منصوب پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے اسے رفع اور تنوین کے ساتھ (خَوْفٌ) پڑھا ہے۔

لفظ هُدَايَ میں الف کے ثابت اور یاء کے متحرک ہونے پر قراء کا اجماع ہے۔ اعرج سے مروی ہے کہ انھوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے مگر یہ کہ وقف کی نیت کی گئی ہے۔

بعض قراء نے هُدَيَّ پڑھا ہے کہ یہ بنی ہذیل کا تلفظ ہے کہ وہ الف کو بعد والی یاء کی وجہ سے یاء سے بدل دیتے ہیں اس لئے کہ یاء اضافت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے والے حرف کو کسرہ دیا جائے تو یہاں پر الف کو کسرہ دینے کے بجائے اسے یاء سے بدل دیا اس لئے کہ الف پر حرکت نہیں آسکتی ہے۔ پس هُدَيَّ عَلَيَّ اور لَدَيَّ کے مانند ہے۔ هَوَيَّ بھی کہا ہے جیسا کہ ابوذویب کا شعر ہے:

سَبَقُوْا هَوَيَّ وَاَعْنَقُوْا لِسَبِيْلِهِمْ فَتُخُرِّمُوْا وَلِكُلِّ جَنْبٍ مَضْجَعٌ

الفاظ ومعانی:

هُبُوْط کے معنی بلند مقام سے پستی کی طرف اترنا ہے۔

اِتْيَان، مَجِيْئ، اِقْبَال (آنا) مشابہ ہیں۔ اس کی ضد ذِهَاب (جانا) اور انصراف (پلٹ جانا) ہے۔

اِتِّبَاع، اِقْتِدَاء، اِحْتِذَاء مترادف ہیں۔ تابع بعد میں آنے والے کو کہتے ہیں۔

خَوْف، جَزَع و فَزَع (اضطراب و بے قراری) باہم مشابہ ہیں۔ خَوف کی ضد اَمْن ہے۔

حُزن، غَمّ، هَمّ باہم مشابہ ہیں۔ اس کی ضد سُرُوْر ہے۔

ترکیب:

اِمَّا دراصل اِنْ شرطیہ ہے جو مَا پر داخل ہوا ہے تاکہ فعل پر نون تاکید کا داخل ہونا صحیح ہو جائے اور اگر مَا کو ساقط کر دیا گیا ہوتا تو پھر فعل نون کا داخل ہونا جائز نہ ہوتا اس لئے کہ نون خبر لازم پر داخل نہیں ہوتا ہے سوائے قسم اور شبہ قسم کے جیسے آپ کا یہ کہنا: زَیْدٌ لَیَأْتِیَنَّکَ، (زید یقیناً ضرور بلا ضرور آپ کے پاس آئے گا) اور اگر آپ بغیر لام کے کہتے تو جائز نہ ہوا اسی طرح آپ کہیں: بِعَیْنٍ مَا أَرَیَنَّکَ وَبِجُھْدٍ مَا تَبْلُغَنَّ وَفِی عُضَّۃٍ مَا یَنْبُتَنَّ شَکِیْرُھَا ۔ اگر آپ بِعَیْنٍ اَرَیَنَّکَ بغیر مَا کے کہتے تو یہ جائز نہ ہوتا۔ پس یہاں پر مَا کا داخل ہونا انہا میں لام کے داخل ہونے کے مانند ہے اول کلام کی تاکید کرتا ہے اور نون آخر کلام کی تاکید کرتا ہے۔

امر، نہی اور استفہام میں بھی نون داخل ہوتا ہے اگر چہ اس کے ساتھ مَا نہ ہو۔ جب امر و نہی ایسی چیزوں میں سے ہو کہ اس میں تاکید کی سخت ضرورت ہو اور استفہام بھی اسی سے مشابہ ہے جب اس کے معنی آخْبِرْنِیْ کے ہوں (مجھے خبر دو) ان مقامات پر نون، تاکید کے لئے آتا ہے انھیں مقامات میں سے یہ آیت بھی ہے: لَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ۔

زجاج نے کہا: ارشاد الٰہی: یَأْتِیَنَّکُمْ میں نون سے پہلے والے حرف کو فتحہ دیا جائے گا اس لئے کہ یاء ساکن ہے اور پہلا نون ساکن ہے۔

ابو علی نے کہا: اگر ایسا ہوتا تو فعل صحیح میں سے ھَلْ تَضْرِبَنَّ جیسے فعل میں نون سے پہلے والے حرف کو حرکت کیوں دی جاتی اس لئے کہ اس طرح کے فعل میں دو ساکن تو ایک جگہ جمع نہیں ہوتے ہیں اور اس میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ یہ حرکت مبنی ہونے کی بنا پر ہے، التقاء ساکنین کی بنا پر نہیں ہے جیسا کہ زجاج نے بیان کیا ہے۔

جواب شرط فاء میں دوسری شرط اور اس کی جزا کے ساتھ ہے اس لئے کہ شرط اور جواب شرط، مبتدا اور خبر کے مقام میں ہوتے ہیں۔ جس طرح مبتدا، خبر کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی طرح شرط بھی جزاء کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ہے۔ آپ کو اختیار حاصل ہے کہ مبتدا کی خبر کو جملہ قرار دیں اور وہ جملہ مبتدا اور خبر ہو جیسے: زَیْدٌ اَبُوْہُ مُنْطَلِقٌ ۔

اسی طرح وہ چیز جو جزاء کے لئے ہے جب اس کا جواب فاء کے ساتھ ہو اور فاء کے بعد کلام از سرِ نو شروع ہو تو وہ جزاء اور غیر جزا دونوں ہو سکتا ہے جیسے: اِنْ تَأْتِنِیْ فَاَنْتَ مُکْرَمٌ ۔ اور آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں: اِنْ تَأْتِنِیْ فَمَنْ یُّکْرِمُکَ اُکْرِمْہُ۔

اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ شرط ہے اور یَاْتِیَنَّكُمْ مجزوم ہے اِنْ کی وجہ سے اور اس کی جزاء فاء اور مابعد فاء ہے اور وہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ ہے۔

مَنْ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ تَبِعَ شرط ہونے کی بنا پر محلاً مجزوم ہے اس کی جزاء فاء و مابعد فاء یعنی: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ہے۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ جملہ اسمیہ ہے۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: یہ بھی جملہ اسمیہ ہے جو پہلے جملہ پر عطف ہے۔

فاء اپنے مابعد کے ساتھ محلاً مجزوم ہے کہ مَنْ تَبِعَ هُدَایَ کی جزاء ہے شرط اور جزاء حرف شرط کے معنی کے ساتھ جو کہ مَن میں پایا جاتا ہے محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ مبتدا کی خبر ہے جو کہ مَنْ ہے۔

پھر فاء اور مابعد فاء: فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ محلاً مجزوم ہے اس لئے کہ وہ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ کی جزاء ہے۔

مقدمات قیاسیہ میں اسے شرطیہ مرکبہ کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس میں مقدم جب ثابت ہوگا تو تالی بھی ثابت ہوگا جو اس پر مرتب ہے۔

تفسیر:

تکرار کا مقصد

خداوند عالم نے زمین پر جانے کے لیے فرمایا: اهْبِطُوْا، یعنی تم سب اتر جاؤ، خطاب آدمؑ وحوا سے ہے جیسا کہ اس بارے میں ہم اختلاف کا ذکر کر چکے ہیں۔ آیت نمبر ۳۶ میں بھی اِهْبِطُوا (اتر جاؤ) کہا گیا ہے اور اس آیت میں بھی وہی حکم دیا جا رہا ہے۔ اس تکرار کے متعلق اختلاف ہے؛ بیان کیا گیا ہے: پہلا ہبوط جنت سے آسمان کی جانب ہوا اور دوسرا اهُبُوط آسمان سے زمین کی جانب ہے۔ یہ ابوعلی سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ تکرار تاکید کی غرض سے ہے۔

اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ دو حالتوں کے اختلاف کے سبب تکرار کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا: وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، (اور ہم نے کہا کہ تم نیچے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو) یہ ہبوط ایک دوسرے سے عداوت ودشمنی کی حالت میں تھا۔ دوسرا ہبوط: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (ہم نے حکم دیا کہ تم سب کے سب نیچے اتر جاؤ) یہ نزول اور نیچے بھیجنا آزمائش اور تکلیف (مکلف قرار دینے) کے لیے تھا: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى، (تمھارے پاس میری ہدایت ضرور آئے گی) یعنی دلالت اور بیان۔

بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء اور رسلؑ اس آخری قول کی بنیاد پر اس کے ارشاد: اِهْبِطُوْا میں خطاب جناب آدمؑ وجناب حواؑ اوران حضرات کی ذریت سے تھا۔ اس کا ارشاد: فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ (سورۂ فصلت، آیت ۱۱) (تو اس نے اسے اور زمین کو حکم دیا کہ خوشی خوشی یا بکراہت ہماری طرف آؤ ان دونوں نے کہا: ہم فرمانبردار بن کر تیرے حضور آ گئے) یعنی ہمارے پاس آئے جو مخلوقات میں اطاعت گذار تھے۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ: یعنی جس نے میرے رسولوں اور میرے معجزات کی پیروی کی اس کے لیے قیامت میں عذاب کا خوف نہیں ہوگا نہ ہی انھیں ثواب کے ضائع ہونے کا حزن وملال ہوگا، ممکن ہے انھیں دنیا میں خوف واندوہ رہا ہو اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ مومنین اس سے خالی نہیں ہیں۔ اس آیت میں دلالت ہے کہ ہدایت ثابت ہے نہ کہ اِهْتِدَاء (یعنی ہدایت پانا) اس لیے کہ اِهْتِدَاء اتباع اور قبولیت سے پیدا ہوگی۔

❁❁❁❁❁

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾
اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ جہنم کے ساتھی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

الفاظ ومعانی:

آیات آیَة کی جمع ہے، لغت میں آیت کے معنی علامت ونشانی کے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ. یعنی ہمارے لیے آپ کا دسترخوان منگوانا علامت ونشانی قرار پائے گا۔ کتاب الٰہی کی ہر آیت علامت اور دلیل ہے اس میں موجود مضمون پر۔

ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے: آیَة کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے سے گذشتہ اور اپنے سے بعد کلام سے منقطع (جدا) ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: آیت قصہ (واقعہ) اور پیغام ہے۔ اس طرح آیات کے معنی قصوں اور واقعات کے ہوں گے یعنی واقعہ کے بعد واقعہ بیان کرنا۔

ابن سکیت نے بیان کیا ہے: خَرَجَ الْقَوْمُ بِاٰيَاتِهِمْ اَيْ بِجَمَاعَتِهِمْ (قوم اپنی آیتوں یعنی

کے حروف بھی) اس اعتبار سے کتاب الٰہی کی آیت کے معنی، مخصوص معنی پر دلالت کرنے والے حروف کی جماعت کے ہوں گے۔

اَصْحَاب صَاحِب کی جمع ہے یعنی ساتھی۔ صُحْبَۃ کے حقیقی معنیٰ مقارنت ونزدیکی کے ہیں۔ صاحب (ساتھی،صحابی) جو آخری مدت تک ساتھ رہنے سے پیدا ہوتی ہے چونکہ اگر کسی ایک وقت میں ساتھ رہے تو اس کو صاحب (صحابی، ساتھی) نہیں ہوگا لیکن اس طرح کہا جائے گا کہ یہ (شخص) ایک وقت تک اس کے ساتھ رہا پھر اس سے علیحدہ ہوگیا۔

ترکیب:

اُولٰٓئِكَ کی ترکیب کے سلسلہ میں تین صورتیں ہیں:

(۱) اَلَّذِیْنَ کا بدل ہے۔ یا عطف بیان ہے اور اَصْحٰبُ النَّارِ، اُولٰٓئِكَ کا بیان ہے گویا صفت ہے اور خبر هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ہے۔

(۲) مبتدا اور خبر ہے خبر اول کے مقام میں۔

(۳) مبتدا ہے دو خبر کی بنا پر کہ جو خبر واحد کے مقام میں ہیں جیسے: هٰذَا حُلْوٌ حَامِضٌ۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیوں دوسرے مقامات پر اس طرح کلام پر فاء داخل ہوا ہے جیسے: فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ اور یہاں پر فاء داخل نہیں ہوا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر فاء داخل ہوا ہے تو وہ الَّذِیْ اور اخوات الَّذِیْ کی خبر ہے جو جزاء سے مشابہ ہے اور جہاں پر فاء نہیں تو وہ اصل خبر کی بنا پر ہے۔

اگر یہ کہیں کہ مَالِیْ فَهُوَ لَكَ اگر آپ نے مَا کو الَّذِیْ کے معنی میں مانا ہے تو فاء کا داخل کرنا جائز ہے اور اگر مَال کا ارادہ کیا ہے تو جائز نہیں ہے۔

تفسیر:

یہی اصحاب نار ہیں

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا اور وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا، وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ ہماری نشانیوں اور جو چیزیں ہم

نے انبیاءؑ پر نازل کیں، انھیں جھٹلا دیا، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ، ایسے ہی لوگ آتش جہنم میں رہیں گے۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ، اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو شخص توبہ کیے بغیر کفر پر مر جائے، اپنے پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلاتے ہوئے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ معجزات اور رسولوں پر نازل شدہ کتب اللہ کی آیات (نشانیاں) ہیں۔ آیت حجت اور دلالت کے مانند ہے اگرچہ دلالۃ اور آیت کے درمیان حقیقت میں فرق ہے، اس لئے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ: دَلَالَةُ هٰذَا الْكَلَامِ كَذَا، لیکن یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ: آيَةُ هٰذَا الْكَلَامِ كَذَا۔

جس نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جوارح کا عمل بھی کفر ہوتا ہے تو اس کی دلیل اس یہ ارشاد ہے: وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (اور انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا) تو اس کا یہ نظریہ باطل ہے اس لیے کہ تکذیب بذات خود اگرچہ کفر نہیں ہے بلکہ کفر پر دلالت ہے اس لیے کہ کفر صرف کافر سے صادر ہوتا ہے جیسے سورج کو سجدہ کرنا وغیرہ۔

❀❀❀❀❀

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

اے بنی اسرائیل! یاد کرو وہ نعمت جو میں نے تمھیں دی تھی اور تم وہ عہد پورا کرو جو مجھ سے کیا تھا، میں وہ عہد پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا اور مجھی سے ڈرتے رہو۔

قرائت:

مشہور قرائت اِسْرَائِيْل ہمزہ، مد اور اشباع کے ساتھ ہے اور یہی فصیح ہے۔ قرائت شواذ میں حسن اور زہری سے اِسْرَايِل بغیر ہمزہ اور مد کے منقول ہے۔ اس طرح اعشیٰ اور عیسیٰ بن عمر سے۔ اخفش سے اِسْرَائِل ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اور یاء کے بغیر حکایت کیا گیا ہے۔ قطرب سے اِسْرَال بغیر ہمزہ اور یاء کے نقل کیا گیا ہے اور اِسْرَائِيْن نون کے ساتھ۔

ابو علی نے کہا: عرب جب عجم سے بات کرتے ہیں تو مخلوط کر دیتے ہیں اور شاعر نے یہ شعر کہا ہے:

هَلْ تَعْرِفُ الدَّارَ لِأُمِّ الْخَزْرَجِ مِنْهَا فَظَلْتَ الْيَوْمَ كَالْمُزَرَّجِ

مُزَرَّج سے مراد مُزَرَّجَن ہے اور وہ شراب ہے زَرْجُوْن سے۔ کہا ہے کہ زَرْجُوْن میں نون اصل ہے جیسے قَرْبُوْس میں سین ہے جب عربوں کے لئے ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں میں مخلوط کر دیں جو کہ خود ان کی زبان ہے تو اس کلمہ کی کیا بات جو ان کی زبان نہیں ہے۔

نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ میں یاء کو حرکت دینا اختیار کیا گیا ہے اس لئے کہ اس کے بعد ہمزۂ وصل اور لام ہے۔ پس کوئی چارہ نہیں ہے مگر یہ کہ یا تو یاء کو حذف کر دیا جائے یا اس کو حرکت دے دی جائے ایسی صورت میں حرکت دینا زیادہ بہتر تھا اس لئے کہ ایسا کرنا اصل کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

آیت کریمہ: يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا: میں اس چیز سے زیادہ مشابہ ہے کہ جہاں شروع میں ہمزۂ وصل کو فتحہ دیا جائے اور یاء کو ساکن کر دیا جائے یعنی یہاں ساقط کر دینا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ یاء اضافت کا حق ہے کہ وہ ندا میں ثابت نہ رہے اور جب ثابت ہی نہیں ہے تو اسے حرکت دینے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے اور اسی قانون کو فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ میں اختیار کیا گیا ہے کہ عبادی سے یاء کو گرا دیا گیا ہے اس لئے کہ وہ آیت کے شروع میں ہے اور آیات کے آغاز میں یاء ثابت نہیں رہتی اس لئے کہ یہ فواصل ہیں کہ ان میں وقف کی نیت کی جاتی ہے جیسا کہ قافیوں میں کیا جاتا ہے۔

فَارْهَبُونِ میں یاء کو ساقط کرنے پر قراء نے اجماع کیا ہے سوائے ابن کثیر کے کہ انھوں نے وصل میں نہ کہ وقف میں یاء کو باقی رکھا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یاء پر وقف کرنا ناپسندیدہ ہے اور نون کے مکسور ہونے میں یاء کے حذف ہونے پر دلالت موجود ہے۔

الفاظ و معانی:

اِبْن، وَلَد، نَسْل، ذُرِّيَّة باعتبار معنی باہم نزدیک ہیں۔ مگر اِبْن مذکر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وَلَد مذکر اور مونث دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ نسل اور ذریت ان سب کے لیے استعمال ہوتے ہیں اس کی اصل بِنَاء ہے جو ایک چیز کو دوسری چیز پر رکھنا ہے۔ فرزند کی بنیاد باپ ہے چونکہ باپ اصل ہے اور فرزند فرع ہے۔

اِسْرَائِيْل (حضرت) یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہما السلام ہیں کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں مضاف ہے چونکہ اِسْر کے معنی عبد کے ہیں اِيْل عبرانی زبان میں اللہ ہے۔ عبداللہ کے مانند ہے۔ اسی طرح جبرئیل و

میکائیل ہے۔

ذِکْر کسی چیز کا حفظ (یاد) کرنا ہے جس کی ضد نِسْیَان ہے۔ذکر کسی بات کو آپ زبان پر جاری ہونا۔ذِکر (اللہ کے) ارشاد میں شرف ہے۔وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ. (سورہ زخرف، ۴۴) (اور بلاشبہ یہ کتاب آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے ایک نصیحت ہے) ذکر وہ کتاب (قرآن) ہے جس میں دین کی تفصیل ہے۔انبیاء کی کتب میں ہر کتاب ذکر ہے۔نماز اور دعا ذکر ہے۔روایات میں وارد ہوا ہے کہ انبیاءؑ جب کسی بات سے محزون ورنجیدہ ہوتے تو ذکر (یعنی نماز) کے ذریعہ اللہ سے پناہ طلب کرتے۔

اور عہد امر ہے اور عہد وصیت ہے اور رَهْبَة کے معنی خوف کے ہیں اور اس کی ضد رَغْبَة ہے۔

ضرب المثل ہے رَهْبُوتٌ خَيْرٌ مِنْ رَحْمُوتٍ (تمہیں ڈرایا جانا تم پر رحم کئے جانے سے بہتر ہے)

ترکیب:

یا حرف نداء ہے اور بَنِي مقام نصب میں ہے اس لئے کہ منادی مضاف ہے اور اِسْرَائِيْلَ مقام جر میں ہے اس لئے کہ مضاف الیہ ہے اور مفتوح ہے اس لئے کہ غیر منصرف ہے اور اس میں غیر منصرف ہونے کے دو اسباب موجود ہیں: ۱۔اس کا عجمہ (غیر عربی ہونا) ۲۔تعریف (معرفہ ہونا)

اِيَّايَ ضمیر منصوبی ہے اور یہ فَارْهَبُوْنِ کی وجہ سے منصوب نہیں ہوسکتی ہے اس لئے کہ فَارْهَبُوْنِ یاء محذوف میں عمل کر رہا ہے اسی طرح زَيْدًا أَفَاضْرِبْهُ میں زَيْدًا کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اِضْرِبْهُ کے ذریعہ منصوب ہو بلکہ وہ منصوب ہے ایک ایسے فعل کے ذریعہ جس پر فعل مذکور پر دلالت کر رہا ہے گویا اس طرح آیا ہے کہ وَاِيَّايَ ارْهَبُوْا أَفَارْهَبُوْنِ اور یہ فعل محذوف ظاہر نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ بے نیاز ہوگیا ہے اس فعل کے ذریعہ جو اس کی تفسیر کر رہا ہے اگر چہ اس فعل کو پوشیدہ رکھنا صحیح ہے۔ایسے مقام پر فَارْهَبُوْنِ کی خبر مان کر اسے رفع دینا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ محذوف فرض کیا جائے جیسا کہ سیبویہ کا شعر ہے:

وَقَائِلَةٍ خَوْلَانُ فَانْكِحْ فَتَاتَهُمْ وَأُكْرُوْمَةُ الْحَيَّيْنِ خِلْوٌ كَمَا هِيَا

یہاں پر هٰؤُلَاءِ خَوْلَانُ فَانْكِحْ فَتَاتِهِمْ کو فرض کیا گیا ہے۔اسی پر اس آیت کو حمل کیا گیا ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا (سورہ مائدہ، آیت ۳۸)؛ الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (سورہ نور، آیت ۲) گویا اس طرح فرمایا: فِيْمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا ... وَفِيمَا فُرِضَ عَلَيْكُمُ الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔

تفسیر:

میری نعمتوں کو یاد کرو

جب خداوند عالم نے اپنی توحید پر تمام مخلوقات کے لیے واضح دلیلیں پیش کیں اور انھیں ان کے باپ جناب آدمؑ پر کی گئی نعمتوں کو یاد دلایا تو بنی اسرائیل کو دلیلوں سے مخصوص کیا اور ان کے آباء واجداد کو عطا کی گئیں نعمتوں کا ذکر کیا اور ان نعمتوں کی یاددہانی کراتے ہوئے ارشاد فرمایا: یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یعنی اے اولاد یعقوبؑ، ان کی نسبت ان کے بابائے بزرگ کی طرف دی گئی ہے جس طرح یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ کہہ کر یہود و نصاریٰ سے خطاب کیا گیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہ خطاب مدینہ اور اس کے اردگرد آباد یہودیوں سے ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے ہے۔ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ. (تم میری ان نعمتوں کو یاد کرو میں نے تمھیں جن سے نوازا ہے) اس سے مراد ان کے اسلاف و بزرگوں کو عطا کی گئی نعمتیں ہیں۔ ان کے درمیان انبیاء کی کثرت اور کتابیں، فرعون سے نجات دلانا اور غرق ہونے سے بچانا ہے۔ ان پر مَنّ و سَلْوٰی نازل کرنا، حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ان کے درمیان بادشاہوں کا ہونا، ان کے آباء واجداد کو مسلسل نعمتیں عطا کرنا گویا انھیں نعمتیں عطا کرنا ہے؛ اس لیے کہ اولاد آباؤ اجداد کے ذریعہ فضیلت حاصل کرتی ہے۔ جس طرح مقام فخر میں کہا جاتا ہے: قَتَلْنَاكُمْ يَوْمَ الْفِخَارِ وَهَزَمْنَاكُمْ يَوْمَ ذِي قَارٍ وَغَلَبْنَاكُمْ يَوْمَ النِّسَارِ. (فخار کے دن ہم نے تم سے جنگ کی، ذی قار کے دن تمہیں شکست دی اور نسار کے دن تم پر فتح حاصل کی۔ یہ سارے کارنامے کہنے والوں کے نہیں تھے بلکہ یہ ان کے آباء واجداد کے کارنامے تھے)

لفظ نعمت کو واحد لایا گیا ہے اور مراد جنس نعمت ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (سورہ ابراہیم، آیت ۳۴) (اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ان کا شمار نہ کرسکو گے) اس لئے کہ اگر یہاں پر نعمت سے مراد جنس نعمت نہ ہو تو نعمۃ یعنی ایک نعمت ہوگی اور ایسی صورت میں واحد کا شمار کرنا ممکن نہیں۔

بیان کیا گیا ہے: اس سے مراد وہ نعمتیں ہیں جس سے انھیں مخصوص کیا گیا ہے نہ کہ ان کے آباء واجداد۔ وہ اپنے آباء واجداد کے ساتھ اس میں شریک ہیں، اس طرح نعمت سب پر ہوگی۔ انھیں نعمتوں میں آباء واجداد کا باقی رکھنا یہاں تک کہ انھوں نے نسل بڑھائی اور یہ لوگ ان کی اولاد قرار پائے، انھیں میں ان کے آباء واجداد کا خلق کرنا اس اعتبار سے کہ اس کی توحید پر دلیل قائم ہو سکے اور اس کی معرفت تک پہنچا جا سکے، اس طرح یہ لوگ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اس کے ثواب کے مستحق بنیں۔

انھیں نعمتوں میں یہ ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں جو ان تک رزق پہنچا ہے اور ان سے جو پریشانیاں دور کی جاتی ہیں اور ان پر دین و دنیا کی نعمتیں فراواں کی جاتی ہیں۔ پس قول اول کے مطابق آیت ان کے بزرگوں پر نعمت کی یاددہانی کرا رہی ہے، دوسرے قول کی بنا پر آیت جن کو نعمت عطا کی گئی ہے انھیں کو یاددہانی کرا رہی ہے۔ ان کے بزرگوں کو عطا کی گئی نعمتوں کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۲۰) (جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم کے لوگو! ذرا ان نعمتوں کو یاد کرو جو اللہ نے تمھیں دی تھیں، اس نے تم میں سے نبی بنائے اور تمھیں بادشاہت عطا کی اور تمھیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو عطا نہیں کیا تھا)

ابن الانباری نے کہا ہے: اُذْكُرُوْا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے تمھیں علم تورات دے کر نعمت عطا کی، تمھارے لیے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف کی، تم پر ان کی تصدیق اور اتباع کو لازمی قرار دیا جب ہم نے انھیں بھیجا تو تم نے ان کی پیروی نہیں کی گویا تم نے اس نعمت کو فراموش کر دیا۔

اس کا ارشاد: وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ، (تم نے مجھ سے جو عہد کیا ہے اسے پورا کرو میں نے تم سے جو عہد کیا ہے اسے پورا کروں گا)

یہ کون سا عہد و پیمان ہے؟

اس عہد کے سلسلہ میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: یہ عہد وہ ہے جسے خداوند عالم نے توریت میں بیان کیا ہے کہ وہ اس نبی کو مبعوث کرے گا جسے محمدؐ کہا جائے گا۔ جو ان کی اتباع کرے گا اسے دو اجر ملیں گے، ایک اجر جناب موسیٰؑ کا اتباع کرنے اور توریت پر ایمان رکھنے کا، ایک اجر حضرت محمدؐ کے اتباع اور قرآن پر ایمان رکھنے کا، جو اس عہد کا انکار کرے گا تو اس کے

گناہ مکمل ہو جائیں گے اور جہنم اس کی جزا ہوگی۔

فرمایا: اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ تم محمدؐ کے بارے میں مجھ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو۔ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ میں تم سے کئے ہوئے عہد کو پورا کروں گا۔ میں تم سب کو جنت میں داخل کر دوں گا۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے اسے عہد اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کا بیان سابقہ کتب میں کیا گیا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کی تاکید کے سبب اسے عہد کی منزل میں قرار دیا گیا ہے جو کہ قسم ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۷) (آپ اس وقت کو یاد کریں جب خدا نے ان لوگوں سے عہد لیا تھا جن کو کتاب عنایت کی گئی تھی کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے لوگوں کے سامنے واضح طور سے بیان کرنا اور اسے پوشیدہ نہ رکھنا)

دوم: یہ وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے اس وقت لیا گیا کہ جب ان سے کہا گیا: خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ (سورۂ بقرہ، آیت ۶۳) جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا وَاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ اور جو کچھ کتاب میں ہے اسے یاد رکھنا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

سوم: وہ عہد مراد ہے جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ‌ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا‌ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مَعَكُمۡ‌ؕ لَئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيۡتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِىۡ (سورۂ مائدہ، آیت ۱۲) اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب بھیجے اور خدا نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوۃ ادا کی اور ہمارے رسولوں پر ایمان لے آئے۔

چہارم: اس عہد سے تمام اوامر و نواہی مراد ہیں۔

پنجم: خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو نعمتیں پہنچوانے کو ان سے عہد و میثاق (پیمان) لینا قرار دیا ہے اس لئے کہ ان نعمت کا شکر ادا کرنے کا پابند بنایا گیا ہے، جس طرح خاص عہد کو وفا کرنے کی پابندی لازمی قرار دی ہے جو عہد ان سے لیا گیا تھا۔

پہلا قول اقویٰ ہے۔ یہی قول بیشتر مفسرین کا ہے جس کی گواہی قرآن اس طرح دیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول: وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ اور مجھی سے ڈرتے رہو یعنی عہد شکنی کے بارے میں میرا خوف رکھو۔

اس آیت میں شکر منعم کے واجب ہونے پر دلالت ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے نعمت کا ذکر کرنا شکر ہے، اس میں کفران نعمت کے گناہ کبیرہ ہونے پر دلیل ہے۔ اسی طرح آیت بندوں کے ثبوت افعال پر دلیل ہے اگر ان کے افعال نہیں ہوتے تو ان کے لیے عہد و پیمان، امر و نہی، وعد و وعید صحیح نہیں ہوتے۔ اسی طرح رسول کا بھیجا جانا اور کتب کا نازل کرنا باطل ہو جاتا۔

❁❁❁❁❁

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾
اور جو کچھ میں نے نازل کیا اس پر ایمان لے آؤ، جو کچھ تمھارے پاس ہے یہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے، لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ اور تھوڑی سی قیمت پر میری آیتوں کو فروخت نہ کرو اور صرف مجھی سے ڈرتے رہو۔

الفاظ و معانی:

ارشاد الٰہی: اَوَّلَ كَافِرٍ کے متعلق زجاج نے کہا ہے: کافروں میں پہلا۔ اس بارے میں دو اقوال ہیں: اخفش نے کہا ہے: جس نے اس کا سب سے پہلے انکار کیا۔ اخفش کے علاوہ دیگر بصریین نے کہا ہے: اس کے معنی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے پہلے انکار کرنے والا مراد ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ دونوں قول درست اور احسن ہیں۔

ثَمَن عِوَض اور بَدَل مترادف ہیں، ان کے درمیان فرق بھی ہے۔ ثمن بیع (خرید و فروخت) میں عین (چیز) کا بدل ہے یا چاندی کا سکہ ہے جب اسے ان دونوں کے علاوہ استعمال کیا جائے گا تو ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے۔ عِوَض بدل کو کہتے ہیں جس سے استفادہ کیا جاتا ہے جس طرح بھی ہو بدل وہ چیز ہے جسے دوسرے کے مقام پر قرار دیا جاتا ہے: ثَوْبٌ ثَمِيْن (یعنی قیمتی کپڑا)

ثَمَن اور قِيْمَة میں فرق ہے، ثمن کبھی مطابق ہوتا ہے کبھی ناقص ہوتا ہے اور کبھی زائد ہوتا ہے اور قیمت ثمن کی مقدار کے مساوی اور برابر ہوتی ہے۔

ترکیب:

مُصَدِّقاً منصوب ہے اس لئے کہ اَنْزَلْتُ سے محذوف ہاء ضمیر کے لئے حال ہے گویا اس طرح فرمایا: اَنْزَلْتُہُ مُصَدِّقاً۔ مُصَدِّقاً، اٰمِنُوْا کی وجہ سے بھی منصوب ہوسکتا ہے گویا اس طرح فرمایا: اٰمِنُوْا بِالْقُرْاٰنِ مُصَدِّقاً۔

مَعَكُمْ، مَا کا صلہ ہے اور اس کا عامل اِسْتَقَرَّ ہے یعنی اَلَّذِیْ اسْتَقَرَّ مَعَكُمْ۔ بِهٖ کی ہاء ضمیر بِمَآ اَنْزَلْتُ میں مَا کی جانب یا لِمَا مَعَكُمْ کے مَا کی جانب پلٹ رہی ہے۔

اَوَّلَ كَافِرٍ منصوب ہے اس لئے کہ كَانَ کی خبر ہے۔

تفسیر:

ایمان لے آو

خداوند عالم نے پھر یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: وَاٰمِنُوْا، یعنی تصدیق کرو، بِمَآ اَنْزَلْتُ اس قرآن کی جسے ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آسمان سے زمین پر نازل کیا ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ، (جو کچھ تمہارے پاس ہے جیسے تورات یہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے) انھیں قرآن کی تصدیق کا حکم دیا ہے اور انھیں آگاہ کیا کہ ان کا قرآن کی تصدیق کرنا توریت کی تصدیق کرنا ہے اس لیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے اقرار اور آپ کی تصدیق کا حکم جو کہ قرآن مجید میں موجود ہے یہی حکم تورات وانجیل میں بھی موجود ہے اس لئے کہ ان دونوں کتابوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت اور آپ کی تعریف وتوصیف موجود ہے۔ پس قرآن ان دونوں کتابوں تورات وانجیل کی تصدیق کرنے والا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ (قرآن) توریت کی تصدیق کرنے والا ہے جس میں اس کے حق ہونے اور یہ کہ وہ اللہ کی جانب سے ہونے کی دلیل ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے چونکہ یہ (قرآن) ان پر حجت ہے۔ قرآن میں وہ صفت وارد ہوئی ہے جس میں سابقاً موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی بشارت دی گئی ہے۔

پہلے منکر نہ بنو

ارشادالٰہی: وَلَا تَكُونُوٓا أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ۔ (لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ) اہل کتاب میں سے پہلے منکر مت بن جاؤ اس لیے کہ قریش نے یہودیوں سے پہلے مکہ میں آپ کا انکار کیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ آپ کا انکار کرنے والوں میں سابقین میں نہ ہو جاؤ کہ لوگ تمھاری پیروی کریں یعنی اس کا انکار کرنے کے سبب (کفر کے) ائمہ نہ بن جاؤ۔

کہا گیا ہے کہ اس کا انکار کرنے والوں میں پہلے نہ بن جاؤ پیغمبرؐ کی اس صفت کے جو تمھاری کتاب میں موجود ہے، اس طرح 'بِهِ' کی ضمیر پیغمبرؐ کی جانب پلٹ رہی ہے۔

ابن جریج سے روایت ہے کہ بیان کیا گیا ہے: اول کافر نہ بنو جو تمھاری کتاب میں تمھارے ہمراہ ہے اگر تم نے صفات پیغمبرؐ کا انکار کیا جو اس میں موجود ہیں تو تم نے پیغمبرؐ کا انکار کیا ہے۔

زجاج نے بیان کیا ہے اور اسے قوی قرار دیا ہے کہ خطاب اہل کتاب کے علماء سے ہے جب انھوں نے انکار کیا۔ اسی کے ساتھ ان کے پیروکاروں نے بھی انکار کر دیا اسی لیے ان سے کہا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرنے والوں میں اول نہ ہو جاؤ اور کہا ہے اگر 'بِهِ' کی ضمیر قرآن کی جانب پلٹ رہی ہے تو اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے اس لیے کہ وہ تو یہ ظاہر کر چکے تھے کہ وہ قرآن کا انکار کرتے ہیں۔

علی بن عیسیٰ نے کہا ہے: احتمال ہے قرآن کا انکار کرنے والا پہلا ہو اس لیے کہ (قرآن) تمھاری کتاب میں حق ہے اور اول کفر کو اس لیے بڑا قرار دیا گیا ہے کہ جب وہ ان کے پیشرو اور گمراہی کے قائد ہوں گے تو ان کی ضلالت و گمراہی بہت بڑی ہوگی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: جس نے کسی نیک کام کی بنیاد ڈالی اس کے لیے اس کا اجر و ثواب ہے اور اس کا اجر بھی ہے جو اس پر قیامت تک عمل کرتا رہے گا۔ اگر کسی نے برے کام کی بنا ڈالی تو اس پر اس کا گناہ بھی ہوگا اور جو اس برے کام پر قیامت تک عمل کرتا رہے گا اس کا گناہ بھی ہوگا۔

اول کافر ہونے کی نہی میں اس امر کی دلالت نہیں ہے کہ آخر کافر ہونا جائز ہے بلکہ ہر حالت میں کفر سے نہی مقصود و مطلوب ہے۔ اول کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ان کی عظیم موقعیت کے اعتبار سے کیا گیا ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا۔ اس آیت کے بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی

گئی ہے کہ حیی بن اخطب، کعب بن اشرف اور دیگر یہودیوں کی ہر سال یہود کے یہاں دعوت ہوتی تھی جسے انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے ذریعہ باطل قرار دیئے جانے کو ناپسند کیا تھا، اس سبب سے انھوں نے تورات کی آیات میں آپؐ کی صفت اور ذکر میں تحریف کردی۔

آیت میں ثمن (قیمت) سے مراد یہی ہے۔ آیت کے معنی ہیں: تورات میں موجود میری آیات کو جن میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات اور تعریف ہے ان کو مختصر قیمت سے تبدیل نہ کرو یعنی دنیا کی گھٹیا اور معمولی چیز سے۔

وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مجھ سے ڈرو نہ کہ کھانے اور ریاست و اقتدار کے فوت ہونے کے خوف سے۔ قیمت کا قلیل سے مقید کرنا اس امر پر دلیل نہیں ہے کہ اگر قیمت کثیر ہو تو اس کا خریدنا جائز ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس چیز کے عوض بھی آیات الٰہی کو فروخت کیا جائے گا وہ قلیل اور مختصر ہوگی اور جائز نہیں ہے کہ قیمت اس کے برابر ہو جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ... (سورۂ مومنون، آیت ۲۳) اور جو بھی اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو پکارتا ہے تو اس کے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔۔۔

اس سے مراد ہر حال میں برہان و دلیل کی نفی ہے یعنی اس پر برہان کا ہونا جائز نہیں ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ، جس کا مطلب ہے انبیاء کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوگا۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

آیت میں دین میں رشوت لینے کی حرمت پر دلیل ہے اس لئے کہ یہ رشوت لینا دو حالت سے خالی نہیں ہے یا تو ایسے امر پر ہوگا جس کا اظہار واجب ہوگا یا ایسے امر پر ہوگا کہ جس کا اظہار حرام ہوگا۔ دونوں صورتوں میں (رشوت لینا) حرام ہے۔ اسی طرح یہ حکم اس امت کے علمائے سوء سے متعلق ہے جب وہ دنیا کو دین پر ترجیح دیں۔ اسی حکم میں گواہیاں فیصلے اور فتاویٰ وغیرہ بھی داخل ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾
اور باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ ہی جان بوجھ کر حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔

الفاظ و معانی:

لَبْس، تَغْطِيَة، تَعْمِيَة (باعتبار معنی) ایک جیسے ہیں یعنی ڈھانپنا، پوشیدہ کرنا۔ تَغْطِيَة اور تَعْمِيَة کے درمیان یہ فرق ہے کہ تَغْطِيَة اضافہ اور زیادتی کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ تَعْمِيَة کمی اور زیادتی دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

لَبْس کی ضد اِیْضَاح (وضاحت) ہے، لِبَاس کے ذریعہ تم اپنا جسم ڈھانپتے ہو۔ لباس تقویٰ حیا ہے۔ لَبْس کے معنی بعض امور کا بعض امور میں خلط ملط کرنا ہے۔ لبس اور اخفاء کے درمیان فرق یہ ہے اخفا کے ساتھ معنی کا ادراک ممکن ہوتا ہے جبکہ لَبْس کے ساتھ معنی و اشکال کا ادراک ممکن نہیں ہوتا کہ کبھی تعقید (دشواری) کے سبب مشکل سے معنی کا ادراک ہوتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے حرث بن حوط سے فرمایا:

يَا حَارِ اِنَّهُ مَلْبُوسٌ عَلَيْكَ اَنَّ الْحَقَّ لَا يُعْرَفُ بِالرِّجَالِ اِعْرَفِ الْحَقِّ تَعْرِفُ اَهْلَهُ. (اے حارث! یہ (حق) تم پر مشتبہ اور مشکوک ہے لوگوں کے ذریعہ حق کی معرفت نہیں ہوسکتی (پہلے) حق کو پہچان لوگے تو اس کے اہل کی بھی معرفت حاصل ہوجائے گی۔

بَاطِل اور بُطْل ایک ہی ہیں جو حق کی ضد ہے، بُطْلَان، فَسَاد، كِذْب، زُوْر، بُهْتَان ایک جیسے ہیں۔ اَبْطَلْتُ الشَّيْءَ (یعنی میں نے چیز کو باطل کر دیا) اور اَبْطَلَ الرَّجُل یعنی آدمی باطل پرست ہوگیا۔

ترکیب:

تَكْتُمُوا الْحَقَّ میں اعراب کی دو صورتوں کا احتمال پایا جاتا ہے:

(۱) تکتموا لاء نہی کی وجہ سے مجزوم ہے گویا اس طرح فرمایا: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ وَلَا تَكْتُمُوا۔ ایسی صورت میں جملہ، جملہ پر عطف ہے۔

(۲) منصوب ہے ظرف ہونے کی بنا پر آنْ کو پوشیدہ رکھ کر پس ایسی صورت میں اسم اس فعل کے مصدر پر عطف ہے جو اس سے پہلے ہے گویا اس طرح ہے: لَا یَکُنْ مِنْکُمْ لُبْسُ الْحَقِّ وَ کِتْمَانُهٗ (تمھاری جانب سے حق کو پوشیدہ رکھنا اور چھپانا نہیں ہونا چاہئے)، تَلْبَسُوا لُبْس پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: مَنْ کَذَبَ کَانَ شَرًّا لَّهٗ یعنی مَنْ کَذَبَ کَانَ الْکِذْبُ شَرًّا لَّهٗ (جو شخص جھوٹ بولے گا وہ جھوٹ خود اسی کے لئے برا ثابت ہوگا) نیز شاعر نے کہا ہے:

لَا تَنْهَ عَنْ خُلُقٍ وَّ تَأْتِیَ مِثْلَهٗ عَارٌ عَلَیْكَ اِذَا فَعَلْتَ عَظِیْمٌ

ایسے اخلاق سے منع نہ کرو جسے تم خود انجام دیتے ہو کہ جب تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے لئے بڑی بدنامی ہوگی۔

یعنی اس اخلاق سے اور اس کے جیسے اخلاق کو بچانے کے درمیان جمع مت کرو۔

تفسیر:

حق میں باطل کی ملاوٹ نہ کرو

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ، یعنی ملاوٹ نہ کرو حق میں، بِالْبَاطِلِ، باطل کی۔ ان کے حق میں باطل کی ملاوٹ اور مخلوط کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لائے اور بعض سے انکار کر دیا، اس لیے کہ انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کا انکار کر دیا۔ یہ باطل تھا اور اس کے علاوہ جو کچھ کتاب میں تھا اس کا اقرار کر لیا۔ اس کے معنی اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ کلمات کی ان کے مقام سے تحریف نہ کرو، تحریف باطل ہے اور کتاب میں موجود چیز کا ترک کرنا ہے، وہ جس صورت میں ہے حق ہے۔

ابن عباس نے کہا ہے: سچ کو جھوٹ میں نہ ملاؤ۔

کہا گیا ہے کہ حق وہ توراۃ ہے جسے اللہ نے جناب موسیٰ پر نازل کیا اور جسے ان یہودیوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے وہ باطل ہے۔

نیز بیان کیا گیا ہے کہ حق یہ ہے انھوں نے اقرار کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیروں کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ باطل ان کا اس بات سے انکار کرنا کہ حضور کو ان کی طرف بھیجا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَتَکْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی توراۃ میں موجود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی صفت کو نہ چھپاؤ باوجودیکہ تم جانتے ہو وہ حق ہیں۔ خطاب اہل کتاب کے رؤساء (سرداروں) سے ہے جیسا کہ ان کا وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کے لئے تَلْبِیْس (ملاوٹ) کے ذریعہ کلمات کو ان کے مقامات سے تحریف کر دیتے ہیں۔ یہ برائی بیان کرنا ہے اس کی جسے وہ انجام دیتے تھے یعنی جس چیز کو جانتے تھے اسی سے انکار کر رہے تھے۔ عالم کا انکار جاہل کے انکار سے بہت بڑا (گناہ) ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم قیامت اور جزا کے بارے میں جانتے ہو۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو کچھ بنی اسرائیل پر نازل کیا گیا ہے تم ان سے بخوبی واقف ہو اور جو عنقریب نازل ہوگا اس کے متعلق جس نے خدا پر جھوٹ بولا۔

کہا گیا ہے کہ تم جانتے ہو مسخ وغیرہ کے بارے میں جو کچھ بنی اسرائیل پر نازل ہوا۔

اگر کہا جائے کس طرح ممکن ہے کہ یہ لوگ حضورؐ کی نبوت کی معرفت رکھنے والے تھے جو کہ اللہ کی معرفت پر مبنی ہے اور آپ کے نزدیک یہ ہے کہ جو اللہ کی معرفت رکھتا اور اسے پہچانتا ہے اس کا کافر ہونا ممکن نہیں ہے جبکہ یہ لوگ کافر ہو گئے اور اپنے کفر پر ہی مرے؟!

اس کا جواب ہم اس طرح دیتے ہیں کہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ وہ اللہ کو اس طرح پہچانتے ہوں جس سے وہ ثواب کے مستحق نہ ہوں اس لیے کہ ثواب کا مستحق اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس طرح غور وفکر کریں جس سے ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے اگر انھوں نے اس کے علاوہ غور وفکر کیا تو ثواب کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اس طرح ممکن ہے کہ وہ اللہ و تورات اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفات کی معرفت رکھتے ہوں پھر بھی اگر وہ ثواب کے مستحق نہیں ہوئے تو ان کے کافر قرار پانے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: ان کے ایمان پر ثواب کا مستحق ہونا پورا حق دینے پر موقوف ہے اگر وہ ایمان کے ساتھ اس کے شرائط کو انجام نہ دیں تو ثواب کے مستحق نہیں قرار پائیں گے۔ اس طرح ممکن ہے کہ وہ معرفت رکھنے والے ہوں اور ثواب کے مستحق نہ ہوں جو کفر کے سبب باطل ہو جاتا ہے۔

قابل اعتماد پہلا قول ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾
نماز قائم کرو، زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

الفاظ و معانی:

صَلَاۃ کے لغوی معنی بیشتر اہل لغت کے نزدیک دعا کے ہیں جسے ہم سابقاً بیان کر چکے ہیں۔

صَلَاۃ یعنی اس حد تک عبادت کی پابندی کرنا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

اس کی اصل صَلَا ہے جو کہ رکوع و سجود میں نہایت عاجزی کا اظہار ہے۔

قول اول پر بیشتر علماء کی رائے ہے۔

اِقَامَةُ الصَّلَاۃ کے بارے میں ہم سابقاً بیان کر چکے ہیں۔

لفظ زَکٰوۃ لغت میں نَمَاء اور زِیَادَۃ کے معنی میں ہے۔ صاحب کتاب العین نے کہا ہے: الزَّکَاۃ زَکَاۃُ الْمَال یعنی مال کو پاک کرنا۔ اس کے حقیقی معنی مال میں برکت کے سبب بڑھت اور اضافہ ہے جسے اللہ نے اس میں قرار دیا ہے۔

رُکُوع، اِنْحِنَاء، اِنْخِفَاض لغت میں ہم معنی ہیں۔ (رکوع کرنے والا وہ ہے جو منہ کے بل جھکتا ہے)

اسی طرح نماز میں رکوع ہے۔

تفسیر:

حکم نماز و زکوۃ

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ، نماز کو اس کے ارکان، حدود اور شرائط کے ساتھ قائم کرو جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، زکوۃ دو یعنی جس چیز کو خدا نے تمہارے اموال میں واجب کیا اس میں سے ادا کرو جس طرح تمہارے رسولؐ نے تمہارے لیے بیان فرمایا ہے۔ یہ مکمل حکم ہے جو اجمالی طور پر قرآن میں وارد ہوا ہے جس کا بیان و تشریح پیغمبرؐ کے سپرد کی گئی ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اٰتٰٮكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰٮكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا ۚ (سورۂ حشر، آیت ۷) (جو کچھ رسول تمہیں دیں وہ لے لو اور جس بات سے منع

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾

نماز قائم کرو، زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

الفاظ ومعانی:

صَلَاۃ کے لغوی معنیٰ بیشتر اہل لغت کے نزدیک دعا کے ہیں جسے ہم سابقاً بیان کر چکے ہیں۔

صَلَاۃ یعنی اس حد تک عبادت کی پابندی کرنا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

اس کی اصل صَلَا ہے جو کہ رکوع وسجود میں نہایت عاجزی کا اظہار ہے۔

قول اول پر بیشتر علماء کی رائے ہے۔

اِقَامَۃُ الصَّلَاۃ کے بارے میں ہم سابقاً بیان کر چکے ہیں۔

لفظ زکوۃ لغت میں نَمَاء اور زِیَادَۃ کے معنیٰ میں ہے۔ صاحب کتاب العین نے کہا ہے: اَلزَّکَاۃ زَکَاۃُ الْمَال یعنی مال کو پاک کرنا۔ اس کے حقیقی معنیٰ مال میں برکت کے سبب بڑھت اور اضافہ ہے جسے اللہ نے اس میں قرار دیا ہے۔

رُکُوع، اِنۡحِنَاء، اِنۡخِفَاض لغت میں ہم معنیٰ ہیں۔ (رکوع کرنے والا وہ ہے جو منہ کے بل جھکتا ہے) اسی طرح نماز میں رکوع ہے۔

تفسیر:

حکم نماز وزکوۃ

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ، نماز کو اس کے ارکان، حدود اور شرائط کے ساتھ قائم کرو جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ، زکوۃ دو یعنی جس چیز کو خدا نے تمھارے اموال میں واجب کیا اس میں سے ادا کرو جس طرح تمھارے رسولؐ نے تمھارے لیے بیان فرمایا ہے۔ یہ مکمل حکم ہے جو اجمالی طور پر قرآن میں وارد ہوا ہے جس کا بیان وتشریح پیغمبرؐ کے سپرد کی گئی ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰىکُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا (سورۂ حشر، آیت ۷) (جو کچھ رسول تمھیں دیں وہ لے لو اور جس بات سے منع

سَہو، غَفلَۃ ایک جیسے ہیں۔نِسیَان کی ضد ذِکر (یاد) ہے۔نسیان کے لغوی معنی ذہن میں کسی بات کے موجود اور حاضر ہونے کے بعد اس کے غائب ہو جانے کے ہیں۔ سہو اس سے بھی واقع اور پیش آتا ہے جس کے متعلق انسان جانتا ہو اور جس کے بارے میں نہ جانتا ہو۔کبھی نسیان ترک کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُم یعنی انھوں نے خدا کو ترک کر دیا تو اللہ نے انھیں ترک کر دیا۔

تِلَاوَۃ کے معنی بعض حروف کا (دیگر) بعض حروف کے پیچھے آنا ہے۔تلاوت وقرأت کے درمیان فرق ہے کہ قرأت کے معنی حروف کا جمع کرنا اور تلاوت کے معنی حروف کا پے در پے ہونا ہے۔

عَقل، فَھم، مَعرِفَۃ اور لُبّ ہم معنی ہیں۔عقل کی ضد حُمق (بے وقوفی اور نادانی) ہے۔

کتاب العین کے مؤلف نے کہا ہے: عَقل جَھل کی ضد ہے۔عِقَال رسی کو کہتے ہیں۔اس طرح کہا جاتا ہے کہ عَقَلتُ البَعِیرَ، میں نے اونٹ کو مضبوطی سے باندھ دیا۔عقل علوم کا مجموعہ ہے جس کے سبب زندہ (انسان) بیشتر برائیوں سے محفوظ رہتا ہے اور بہت سے واجبات بجالاتا ہے۔ان علوم کو علوم عقلی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ انسانی کو برائی سے روک دیتے ہیں۔اللہ کو عاقل نہیں کہا جائے چونکہ کوئی چیز اسے فعل قبیح سے نہیں روکتی ہے، وہ فعل قبیح کرتا ہی نہیں چونکہ وہ اس کے قبح کو جانتا ہے اور اس لئے وہ اس سے بے نیاز ہے، نہ ہی وہ کسی چیز کے ذریعہ علم حاصل کرتا ہے کہ اس کا بعض علم بعض دوسرے علم کے ذریعہ ثابت ہو۔

علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے عقل وہ علم ہے جو فعل قبیح سے روکتا اور اس پر سرزنش کرتا ہے جس کی (فعل قبیح) سے روکنے والی طاقت زیادہ قوی ہوگی وہ اتنا ہی بڑا عاقل ہوگا۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ عقل معرفت ہے جو برائی اور اچھائی کے درمیان فرق ڈالتی ہے فی الجملہ (یعنی جزئی طور پر) یہ بھی کہا گیا ہے کہ عقل امتیاز کرنے والی وہ چیز ہے جو انسان اور تمام حیوانات کے درمیان امتیاز اور فرق ڈالتی ہے۔ان عبارتوں کے معنی ایک دوسرے سے نزدیک ہیں۔عقل وعلم کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس کے بعض علوم مفقود ہو جائیں اس کی عقل پھر بھی مکمل رہتی ہے اور جس کی بعض عقل مفقود ہو جائے اس کا علم کامل نہیں رہتا۔اگر یہ کہا جائے کہ عقل کے بارے میں اختلاف ہے تو اس کے ذریعہ گواہی پیش کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اختلاف عقل کی ماہیت میں ہے جو اس کے قضایا کے اختلاف کا سبب نہیں ہے (عقل) معرفت ہے، بعض نے کہا ہے کہ قوت ہے۔یہ اس اختلاف کا سبب نہیں ہو سکتا کہ سو (۱۰۰) کا عدد ایک سے زائد ہے اور کل جز سے بڑا ہے اس کے علاوہ وہ فیصلے جو مبنی بر عقل ہیں۔

تفسیر:

دوسروں کو نصیحت تو خود کو کیوں نہیں

یہ آیت علمائے یہود کو مخاطب قرار دے رہی ہے جو اپنے مسلم رشتہ داروں سے کہتے تھے کہ جس پر تم قائم ہو اسی پر باقی رہو حالانکہ وہ خود ایمان نہیں لاتے تھے۔

ہمزہ استفہام کے لیے ہے جس کے معنی توبیخ اور سرزنش کے ہیں۔

اَلْبِرّ سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان ہے۔ خداوند عالم نے علمائے یہود کے اس فعل کی مذمت کی ہے جو وہ لوگوں کے ساتھ حضرت محمدؐ پر ایمان لانے کے سبب انجام دیتے تھے اور اپنے آپ کو چھوڑ دیتے تھے۔

ابو مسلم نے کہا ہے: یہ لوگ عربوں کو محمد کے مبعوث ہونے پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن جب آپ مبعوث ہوئے تو انھوں نے آپ کا انکار کر دیا۔

ابن عباس کا کہنا ہے کہ یہ اپنی پیروی کرنے والوں کو توریت سے متمسک رہنے کا حکم دیتے اور خود کو تمسک سے دور رکھتے اس لیے کہ پیغمبرؐ سے اور آپؐ کی صفت سے انکار کرنا تمسک کا ترک کرنا ہے۔

قتادہ سے روایت ہے کہ لوگوں کو اللہ کی اطاعت کا حکم دیتے تھے اور خود اس کی مخالفت کرتے تھے۔

انس ابن مالک سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب مجھے معراج پر لے جایا گیا تو میرا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ہونٹ آتش جہنم کی قینچی سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے جبرئیلؑ سے سوال کیا: یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: دنیادار خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود کو بھول جاتے تھے۔

بعض نے کہا ہے: تم لوگوں کو صدقہ دینے کا حکم دیتے ہو اور خود کو چھوڑ دیتے ہو اور جب تمھارے پاس کمزور لوگ صدقہ لیکر آتے ہیں تاکہ تم ان کو مساکین پر خرچ کرو تو تم خیانت کرتے ہو۔

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ یعنی تم توریت پڑھتے ہو جس میں محمدؐ کی صفت اور توصیف و شناخت ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، کیا تم نہیں سمجھتے جو تم انجام دے رہے ہو عقلاً قبیح ہے۔ ابو مسلم سے روایت ہے کہ اس ایسا کرنا کسی عقل مند کا کام نہیں ہے۔

کہا گیا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ خداوند عالم تم کو اس بات پر عذاب میں مبتلا کرے گا۔

اور بیان کیا گیا ہے کہ تم نہیں جانتے جو توریت میں ہے وہ حق ہے، محمدؐ کی تصدیق کرو اور ان کی پیروی کرو۔

اگر یہ کہا جائے کہ نیکی کرنا واجب ہے اور اس کا حکم دینا بھی واجب ہے پس کیونکر خداوند عالم نے نیکی کا حکم دینے پر ان لوگوں کی مذمت و سرزنش کی ہے؟ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ خدا نے نیکی کا حکم دینے پر ان کی سرزنش نہیں کی ہے بلکہ نیکی کو ترک کرنے پر جو کہ نیکی کے حکم کے ساتھ ساتھ تھا اس لیے کہ جو شخص نیکی کا حکم دیتا ہے خود اس کا نیکی کو ترک کرنا اس شخص کے نیکی کو ترک کرنے سے زیادہ قبیح ہے جو نیکی کا حکم نہیں دیتا ہے۔

یہ بات واضح ہے اس سے مراد اخلاق مذموم کی نہی کرنا نہیں ہے بلکہ مراد ایسا کرنے سے نہی کرنا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿۴۵﴾
صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو بے شک نماز ایک مشکل اور دشوار عمل ہے مگر ان کے لیے نہیں جو فرماں بردار بندے ہیں۔

الفاظ و معانی:

صَبْر یعنی نفس کو اس کی پسندیدہ چیزوں سے روکنا اور اس کی خواہشات سے اسے باز رکھنا اور اس میں سے مصیبت پر صبر بھی ہے اس لئے کہ صابر اپنے آپ کو جزع و فزع سے روکتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ماہ رمضان المبارک کو شَهْرُ الصَّبْرِ (صبر کا مہینہ) کہا گیا ہے اس لیے کہ روزہ دار روزہ کو باطل کرنے والی چیزوں سے اپنے آپ کو روکتا ہے۔

خُشُوع و خُضُوع کے معنی تذلل اور انکساری کے ہیں۔ خشوع کی ضد استکبار ہے۔ خشوع اور خضوع قریب المعنی ہیں فرق یہ ہے کہ خضوع جسم کے ذریعہ ہوتا ہے اور خشوع آواز اور آنکھ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے: خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ (ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی) وَ خَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ (تمام آوازیں دب جائیں گی) یعنی خاموشی کے ساتھ۔

خَاشِع، مُتَوَاضِع، مُتَذَلِّل اور مُسْتَكِين کے ایک ہی معنی ہیں۔

ترکیب:

اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ۔ لام اِنَّ کی خبر پر داخل ہوتا ہے لیکن اخوات اِنَّ کی خبر پر داخل نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ لام تاکید ہے پس ان کے مثل ہوتا ہے مبتدا اور خبر پر داخل ہونے میں جس طرح اِنَّ داخل ہوتا ہے جیسے وَاللهِ لَتَخرُجَنَّ۔ وَاللهِ اِنَّكَ خَارِجٌ۔ جب ان دونوں میں یہ مشابہت پائی جاتی ہے تو جب لام تاکید اِنَّ پر داخل ہو کہ لَاِنَّھَا کَبِیْرَۃٌ جیسے مقامات پر تو علماء نے دو حرف جو کہ معنی میں ایک جیسے ہیں کہ ایک جگہ جمع کرنے کو ناپسند قرار دیا ہے لہذا انہوں نے لام کو خبر پر داخل کر دیا ہے تا کہ لام اور اِنَّ کے درمیان اسم کے ذریعہ فاصلہ واقع ہو جائے۔ جیسے اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ لیکن دیگر اخوات اِنَّ جب وہ مبتدا اور خبر پر داخل ہوں تو مبتدا کی صورت سے نکل کر ایک دوسری قسم بن جاتا ہے لہذا اس پر لام داخل نہیں ہوتا اور جب لام دیگر اخوات اِنَّ کے اسم پر داخل نہیں ہوتا ہے تو پھر مناسب یہی ہے کہ اس کی خبر پر بھی داخل نہ ہو۔

شانِ نزول:

جبائی نے کہا ہے: اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے نہ کہ اہل کتاب سے۔ رمانی اور دیگر علماء نے کہا ہے: اہل کتاب سے خطاب ہے اور تادیب کے سبب مومنین کو بھی شامل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمام مکلفین سے خطاب ہو اس لیے کہ تخصیص پر دلالت موجود نہیں۔ جس کا کہنا ہے: خطاب اہل کتاب سے ہے اس کی تائید میں یہ قول ہے کہ آیت سے پہلے اور بعد کی آیت میں اہل کتاب سے خطاب ہے۔

تفسیر:

صبر و نماز سے استعانت

جو اس بات کا قائل ہے کہ آیت کا خطاب یہودیوں سے ہے، اس کا یہ کہنا ہے کہ علماء یہود کی ریاست و اقتدار ان کے اتباع پیغمبرؐ سے مانع تھا انھیں اس بات کا خوف لاحق تھا کہ اگر وہ پیغمبرؐ کا اتباع کریں گے تو ان میں ریاست چھن جائے گی۔ لہذا اللہ نے انھیں حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاسْتَعِیْنُوْا (امداد طلب کرو) اس عہد کو پورا کرتے ہوئے جو میں نے تمھاری کتاب میں اپنی بندگی اور امر کے اتباع کے سلسلہ میں تم سے لیا

ترکیب:

اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ۔ لام اِنَّ کی خبر پر داخل ہوتا ہے لیکن اخوات اِنَّ کی خبر پر داخل نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ لام تاکید ہے پس ان کے مثل ہوتا ہے مبتدا اور خبر پر داخل ہونے میں جس طرح اِنَّ داخل ہوتا ہے جیسے وَاللہِ لَتَخْرُجَنَّ۔ وَاللہِ اِنَّکَ خَارِجٌ۔ جب ان دونوں میں یہ مشابہت پائی جاتی ہے تو جب لام تاکید اِنَّ پر داخل ہو کہ لَاِنَّھَا کَبِیْرَۃٌ جیسے مقامات پر تو علماء نے دو حرف جو کہ معنی میں ایک جیسے ہیں کہ ایک جگہ جمع کرنے کو ناپسند قرار دیا ہے لہٰذا انہوں نے لام کو خبر پر داخل کر دیا ہے تا کہ لام اور اِنَّ کے درمیان اسم کے ذریعہ فاصلہ واقع ہو جائے۔ جیسے اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ لیکن دیگر اخوات اِنَّ جب وہ مبتدا اور خبر پر داخل ہوں تو مبتدا کی صورت سے نکل کر ایک دوسری قسم بن جاتا ہے لہٰذا اس پر لام داخل نہیں ہوتا اور جب لام دیگر اخوات اِنَّ کے اسم پر داخل نہیں ہوتا ہے تو پھر مناسب یہی ہے کہ اس کی خبر پر بھی داخل نہ ہو۔

شانِ نزول:

جبائی نے کہا ہے: اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے نہ کہ اہل کتاب سے۔ رمانی اور دیگر علماء نے کہا ہے: اہل کتاب سے خطاب ہے اور تادیب کے سبب مومنین کو بھی شامل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمام مکلفین سے خطاب ہو اس لیے کہ تخصیص پر دلالت موجود نہیں۔ جس کا کہنا ہے: خطاب اہل کتاب سے ہے اس کی تائید میں یہ قول ہے کہ آیت سے پہلے اور بعد کی آیت میں اہل کتاب سے خطاب ہے۔

تفسیر:

صبر و نماز سے استعانت

جو اس بات کا قائل ہے کہ آیت کا خطاب یہودیوں سے ہے، اس کا یہ کہنا ہے کہ علماء یہود کی ریاست و اقتدار ان کے اتباع پیغمبرؐ سے مانع تھا انھیں اس بات کا خوف لاحق تھا کہ اگر وہ پیغمبرؐ کا اتباع کریں گے تو ان میں ریاست چھن جائے گی۔ لہٰذا اللہ نے انھیں حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاسْتَعِیْنُوْا (امداد طلب کرو) اس عہد کو پورا کرتے ہوئے جو میں نے تمھاری کتاب میں اپنی بندگی اور امر کے اتباع کے سلسلہ میں تم سے لیا

ہے اور جس چیز سے تمھیں نہی کی ہے اسے ترک کر کے میرے امر کو تسلیم کرو اور میرے پیغمبرؐ کا اتباع کرتے ہوئے معاش کی تنگی پر (صبر کرو) جو اموال تم اپنے عوام سے حاصل کرتے ہو۔

ہمارے ائمہ علیہم السلام سے روایت ہے کہ صبر سے روزہ مراد ہے۔ اس کے ذریعہ استعانت کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خواہش نفس کنٹرول میں رہتی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلصَّوْمُ وِجَاءٌ (روزہ شہوت جماع پر کنٹرول کرتا ہے)

نماز کے ذریعہ استعانت کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ان آیات کی تلاوت کی جاتی ہے جن سے خدا کے پاس موجود چیزوں کی جانب رغبت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا اور حب ریاست سے بے تعلقی پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ (سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵) (بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے)

نماز میں اللہ کے حضور تواضع و انکساری ہے کہ جس سے حب ریاست دور ہوتی ہے (روایت ہے کہ) جب کبھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بات سے محزون و مغموم ہوتے تو نماز اور روزہ کے ذریعہ مدد طلب فرماتے تھے۔

جو اس بات کا قائل ہے کہ آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے اس کا یہ کہنا ہے کہ وَاسْتَعِیْنُوْا سے مراد یہ ہے کہ مدد حاصل کرو ایفائے عہد پر جس کا ہم نے اتباع پیغمبرؐ کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے یا تکلیف کی زحمت پر صبر کے ذریعہ یعنی اطاعت پر نفس کو روک کر گناہوں اور شہوات سے روک کر مدد حاصل کرو اور نماز کے ذریعہ استعانت (طلب مدد کرو) چونکہ اس میں تلاوت قرآن ہے اس کے معنی میں تدبر کر کے اس کے مواعظ سے نصیحت حاصل کر کے اوامر پر عمل کر کے اور اس کے نواہی سے خود کو روکتے ہوئے اور اس کے علاوہ دیگر وجہ سے اس لیے کہ افعال قلوب میں صبر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے نہ ہی اعضاء و جوارح کے افعال میں نماز سے بڑھ کر کوئی عبادت ہے چنانچہ دونوں کے ذریعہ طلب امداد کا حکم دیا گیا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کسی کے لیے کون سی چیز مانع ہے کہ جب اس پر دنیاوی غم سے کوئی غموں وارد ہو تو وہ وضو کرے اور مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کرے اور اس بارے میں خدا سے دعا کرے۔ کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے کہ: وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ (بے شک نماز ایک مشکل اور دشوار عمل ہے) کہا گیا ہے کہ اِنَّهَا کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں چند وجہیں ہیں:

اول: صَلٰوةٌ (نماز) کی جانب پلٹ رہی ہے۔ یہی اہم اور افضل ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور ضمیر کے واحد کی جانب پلٹنے سے متعلق دو قول بیان کیے گئے ہیں جن میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے صرف صلاۃ مراد ہے نہ اس کے علاوہ اس کی نزدیکی کے باعث خاص طور سے اس کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہ صلاۃ اہم اور افضل ہے۔ اس کی حالت کی تاکید اس کی شان کو بلند اور فرض کو عام قرار دیا ہے۔ دوسرا قول ہے کہ دونوں (صبر اور نماز) مراد ہیں اگرچہ ضمیر مفرد ہے اس کی گواہی اس ارشاد میں ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ (سورۂ توبہ، آیت ۳۴) (اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) ینفقونہا میں ھا کی ضمیر سے الذھب و الفضۃ دونوں مراد ہیں۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا۔ (سورۂ جمعہ، آیت ۱۱) (اور جب ان لوگوں نے تجارت اور کھیل تماشے کو دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے) الیہا میں ھا کی ضمیر سے تجارۃ اور لھو دونوں مراد ہیں۔

وَاللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (سورۂ توبہ، آیت ۶۲) (اللہ اور اس کے رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں) يُّرْضُوْهُ میں ہ کی ضمیر اللہ اور رسول دونوں کو شامل ہے۔

دوم: ضمیر استعانت کی طرف پلٹتی ہے یعنی دونوں کے ذریعہ استعانت بڑا مشکل کام ہے۔

سوم: ضمیر کسی محذوف کی طرف پلٹ رہی ہے اور وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز اور دعوت پر لبیک کہنا ہے۔ یہ روایت اصم سے ہے۔ یا دونوں کے ذریعہ مواخذۂ نفس کرنا ہے یا گذشتہ کی ادائیگی ہے یا نماز کی ادائیگی ہے اور اسی طرح خطاؤں پر صبر کرنا ہے۔ یہ روایت ابومسلم سے مروی ہے۔ یہ آخری تمام وجوہات ضعیف ہیں اس لیے کہ ان کا ذکر نہیں ہوا ہے۔

لَكَبِيْرَةٌ یعنی ثقیل (دشوار) اور گراں ہے۔ یہ روایت حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ اس میں اصل یہ ہے کہ ہر بڑی چیز کا برداشت کرنا انسان پر ثقیل و گراں ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو نفس پر دشوار ہوتی ہے اگرچہ حمل کے

لحاظ سے نہ ہو پھر بھی نفس پر گراں گزرتا ہے، بوجھ سے تشبیہ دیتے ہوئے۔

اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (مگر ان کے لئے نہیں ہے جو فرمانبرداری ہوتے ہیں) یعنی اللہ کے متواضعین کے لیے (جو اللہ کے حضور انکساری سے پیش آتے ہیں) چونکہ انھوں نے اپنے نفس کو اس کی انجام دہی کے لیے عادی بنالیا ہے اس لیے اس کا انجام دینا ان پر گراں اور دشوار نہیں ہے۔ اسی طرح متواضع اور منکسر المزاج جب اسے ایمان حاصل ہو جائے تو زوال ریاست کی پرواہ نہیں کرتا۔

مجاہد نے کہا ہے: خاشعین سے مومنین مراد ہیں اس لیے کہ جب انھیں اس کی انجام دہی سے حاصل ہونے والے ثواب کا علم ہو جاتا ہے تو اس کی انجام دہی ان پر دشوار و گراں نہیں ہوتی جس طرح جب انسان کو شفایابی کی امید ہوتی ہے تو دوا کے کڑوے گھونٹ برضا و رغبت پی لیتا ہے۔

حسن نے کہا ہے: خاشعین سے خائفین یعنی ڈرنے والے مراد ہیں۔

❀❀❀❀❀

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿٤٦﴾
جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔

الفاظ و معانی:

آیت میں ذکر شدہ ظن، علم و یقین کے معنی میں ہے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ظن کے لغوی معنی یہ ہیں کہ جو تصورات و خیالات نفس میں گردش کرتے ہیں وہ قلب پر غالب آجاتے ہیں گویا وہ کسی شئی کے متعلق نفس کی گفتگو ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں کہیں ظن استعمال ہوا ہے اس سے علم کے معنی کی تاویل کی گئی ہے۔ ظن، شک، تجویز ایک جیسے ہیں مگر یہ کہ ظن شک و تجویز میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ظن کی ضد یقین ہے۔ ظَنِيْن، مُتَّهَم کو کہتے ہیں جس کا مصدر ظِنَّة ہے۔ ظَنُوْن جو شخص ہر ایک کے بارے میں بدگمانی رکھتا ہے۔ ظُنُوْن اس کنویں کو کہتے ہیں جس کے متعلق اس میں پانی کا گمان کیا جاتا ہے جب کہ پانی موجود نہ ہو۔

ترکیب:

اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ: محلاً مجرور، اَلْخَاشِعِیْنَ کی صفت ہے۔ اَنَّھُمْ ہمزہ کے ساتھ ہے فتحہ کے علاوہ اسے کوئی دوسری حرکت دینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ظَنّ فعل ہے جو معنی پر واقع ہوا ہے کہ وہ متعدی ہے غیر سے متعلق ہے اس کے بعد جو بھی آئے گا وہ اس کا مفعول ہوگا۔ اَنّ مفتوح الہمزہ اپنے اسم مفرد کی تاویل میں جائے گا وہ یہاں پر یَظُنُّ کے دو مفعول کا قائم مقام ہے مفعول ثانی کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کلام سے واضح ہے پوشیدہ نہیں ہے جس طرح اَقَائِمٌ اَلزَّیْدَانِ میں فاعل خبر کا قائم مقام ہوتا ہے کلام کے طولانی ہونے اور اس سے بے نیاز ہونے کی بنیاد پر ابوعلی کے نزدیک یہی نظریہ منتخب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دوسرا قول بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اَنّ اپنے اسم و خبر کے ساتھ مفعول اول کے مقام میں ہے اور مفعول ثانی پوشیدہ و محذوف ہے اس لئے کہ مخاطب کو معلوم ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ مُلَاقَاۃَ رَبِّھِمْ وَاقِعَۃً۔

اہل بصرہ کے نزدیک مُلٰقُوْ رَبِّھِمْ سے نون کو آسانی و تخفیف کی خاطر حذف کر دیا گیا ہے اور اس کو باقی رکھنے کی صورت میں معنی یہ ہیں کہ یہاں پر مضاف الیہ اگرچہ ظاہر القفظاً مجرور ہے لیکن معنیً میں منصوب ہے یہ اضافتِ لفظیہ ہے، حقیقیہ نہیں ہے۔ اسی کے مانند ایک دوسری آیت بھی ہے: اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَۃِ و کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ۔

شاعر نے کہا:

هَلْ اَنْتَ بَاعِثُ دِیْنَارٍ لِحَاجَتِنَا　اَوْ عَبْدَ رَبِّ اَخَا عَوْنَ بَنِیْ مِخْرَاق

کیا تم ہماری حاجت روائی کے لئے دینار بھیجو گے یا بنی عون بن مخراق کے مالک کے غلام کو؟

اور اگر آپ نے ماضی کا ارادہ کیا تو پھر اسم اضافہ کی وجہ سے معرفہ ہو جائے گا اس میں کسی بھی صورت میں نون کو ظاہر کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ: محلاً منصوب ہے پہلے والے جملہ پر عطف ہے۔

تفسیر:

لقاء اللہ

خَاشِعِیۡنَ کا ذکر کیا گیا، پھر ان کے صفات بیان کیے گئے: اَلَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ (جو یہ سمجھتے ہیں کہ۔۔۔) یعنی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اس چیز سے ملاقات کریں گے جس کا ان کے پروردگار نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ یہ حسن، مجاہد وغیرہ سے روایت ہے اور اسی طرح یہ آیت ہے: اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَهۡ۔ (سورۂ حاقہ، آیت ۲۰) (مجھے یقین تھا کہ مجھے حساب دینا ہے)

ظن کے معنی یقین کے علاوہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں اور شدید خوف کے ساتھ ملاقات کریں گے۔ رمانی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ایسی صورت میں کتنی چیزوں کو محذوف ماننا پڑے گا۔ اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی مدت کے خاتمہ سرعت موت کا گمان کرتے ہیں وہ ہمیشہ خوف وہراس کے عالم میں رہتے ہیں، دنیا پر بھروسہ نہیں کرتے جس طرح مرنے والے کے لیے کہا جاتا ہے: لَقِیَ اللہَ (یعنی اس نے اللہ سے ملاقات کی) اللہ کا یہ ارشاد: مُلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ، دلالت کر رہا ہے کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی جزا سے ملاقات کریں گے۔ منافقین کی صفت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰی یَوۡمِ یَلۡقَوۡنَهٗ۔ (سورۂ توبہ، آیت ۷۷) (اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق جاگزیں کر دیا ہے اس روز تک کے لیے جب وہ خدا کے روبرو حاضر ہوں گے)

اس میں اختلاف نہیں ہے کہ منافق کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کو دیکھے۔ اسی طرح اس کا ارشاد ہے:

وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ وُقِفُوۡا عَلٰی رَبِّهِمۡ قَالَ اَلَیۡسَ هٰذَا بِالۡحَقِّ قَالُوۡا بَلٰی وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ۔ (سورۂ انعام، آیت ۳۰) (اور کاش آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور رب ان سے پوچھے گا کیا دوبارہ زندہ ہونا برحق نہیں؟ تو وہ کہیں گے کیوں نہیں قسم ہے پروردگار کی یہ بالکل برحق ہے۔ تو خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو)

حدیث میں وارد ہوا ہے: جس نے کسی مسلمان کے مال کے خلاف جھوٹا حلف اٹھایا وہ اللہ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر غضبناک ہوگا۔ ملاقات سے مراد رویت (دیکھنا) نہیں ہے جیسا کہ کہا

جاتا ہے: اللہ تم سے محبت سے ملاقات کرے گا۔ یہاں شخصی اور ذاتی طور پر دیکھنا مراد نہیں ہے بلکہ ایسی ملاقات مراد ہے جو اسے مسرور و شادماں کر دے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ. (اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے آیت میں رجوع کے کیا معنی ہیں؟ جبکہ وہ آخرت میں پلٹنے کا ذرا بھی یقین نہیں رکھتے۔ اس کے جواب میں متعدد طریقے سے دیا گیا ہے:

اول: یہ لوگ واپسی کے ذریعہ آخرت میں پلٹنے والے ہیں۔ ابو العالیہ سے روایت ہے۔

دوم: موت کے ذریعہ پلٹیں گے جس طرح وہ سابقہ حالت میں مردہ تھے، پھر انھیں زندہ کیا جائے گا، پھر انھیں موت دی جائے گی، پھر اس کی بارگاہ میں مر کر پلٹیں گے جس طرح کہ وہ تھے۔

سوم: ایسے مقام پر پلٹیں گے جن کے نفع و نقصان کا اس (خدا) کے سوا کوئی مالک نہیں ہوگا جس طرح وہ ابتدائے خلقت میں تھے، اس لیے کہ ان کی زندگی میں غیر ان پر حکم فرماتا تھا اور ان کے نفع و نقصان کی تدبیر کرتا تھا جس چیز کو اس کے اس ارشاد میں واضح کیا گیا ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔

آیت کے معنی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ نشأۃ ثانیہ (دوسری خلقت) کا اقرار کر رہے ہیں لہٰذا موت کے بعد محشر کی طرف واپسی کو اس کی جانب رجوع قرار دیا ہے۔

❁❁❁❁❁

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اے بنی اسرائیل تم میری اس نعمت کو یاد کرو جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔

تفسیر

عالمین پر برتری کا مطلب

اس سے پہلے آیت کے پہلے حصے کی تفسیر گذر چکی ہے۔

ارشاد الٰہی: وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی

تھی) ابن عباس نے کہا ہے: بنی اسرائیل کے اپنے زمانہ کی قومیں مراد ہیں اس لیے کہ ہماری امت اجماعی طور پر تمام امتوں سے افضل ہے، جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افضل انبیاء ہیں۔ اس دلیل سے کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے)

بیان کیا گیا ہے: اس سے مخصوص اشیاء کی فضیلت مراد ہے کہ ان کے لیے من وسلویٰ کا نازل کیا جانا، رسولوں کا ان کے درمیان بھیجا جانا اور کتب کا نازل کیا جانا اور بکثرت آیات جن کے ذریعہ استدلال آسان اور عہدو پیمان سہل ہو جائے۔ اللہ کا انھیں مخصوص اشیاء میں فضیلت عطا کرنا، مطلق طور پر ان کے تمام انسانوں پر افضل ہونے کا سبب نہیں ہے جس طرح کہا جاتا ہے: 'حاتم باعتبار سخاوت تمام لوگوں میں افضل ہے' اسی آیت کے مانند اس کا یہ ارشاد ہے:

وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآئَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۴۹) (اور یاد کرو جب ہم نے تمھیں آل فرعون سے نجات دی انھوں نے تم کو سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا وہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی)

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (آیت: ۵۰) (اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر کو پھاڑ کر تمہارے لیے راستہ بنایا تھا تمھیں نجات دی اور تمھاری نظروں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کر دیا تھا)

اگر کہا جائے کہ اس بات کی تکرار سے کیا فائدہ ہے کہ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۵۰) تو ہم کہیں گے: جب اللہ کی نعمتیں اصل ہیں جن پر شکر واجب ہے تو اس کی تاکید کی احتیاج و ضرورت تھی جس طرح قائل کہتا ہے: اِذْهَبْ اِذْهَبْ (جاؤ جاؤ) عَجِّلْ عَجِّلْ (جلدی کرو جلدی کرو)

اسی طرح کہا گیا ہے کہ پہلی یاددہانی اجمالی طور پر وارد ہوئی ہے، دوسری مفصل ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اول میں خود ان کو عطا کی گئی نعمت کی یاددہانی کرائی گئی ہے دوسرے میں ان کے آباء و اجداد پر عطا کی گئی نعمت کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی اس کی طرف سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

قرائت:

اہل مکہ اور اہل کوفہ نے لَا تُقْبَلُ تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کے ساتھ یُقْبَلُ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے تاء کے ساتھ تُقْبَلُ پڑھا ہے اس سے علامت تانیث ملحق کی ہے تا کہ یہ بتایا جائے کہ وہ اسم جس کی جانب فعل کی نسبت دی گئی ہے یعنی شَفَاعَةٌ وہ مونث ہے اور جن قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اسم شَفَاعَةٌ میں تانیث حقیقی نہیں ہے پس معنی پر حمل کر کے فعل کو مذکر لایا گیا ہے۔ اس لئے کہ شَفَاعَةٌ اور تَشَفُّع ایک ہی ہیں جس طرح وَعْظ و مَوْعِظَة اور صَيْحَة و صَوْت ایک ہیں۔ خداوند عالم نے فرمایا: فَمَنْ جَاءَهٗ مَوْعِظَةٌ نیز اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ۔

فعل کو مذکر لانے کو یہ بات بھی قوی بناتی ہے کہ فعل اور نائب فاعل کے درمیان مِنْهَا فاصلہ بن گیا ہے اور فاصلہ کے ساتھ فعل کو مذکر لانا حسن ہے جیسا کہ تانیث حقیقی میں بھی ایسا کیا جاتا ہے: حَضَرَ الْقَاضِيَ الْيَوْمَ اِمْرَاَةٌ۔

الفاظ و معانی:

اَلْجَزَاءُ وَالْمُكَافَاةُ وَالْمُقَابَلَةُ نَظَائِر جَزَاء (جزاء، مکافات اور مقابلہ باہم مشابہ ہیں)

ارشاد الٰہی ہے: لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا۔ (جب کوئی شخص کسی کی طرف سے فدیہ نہ ہو سکے گا) یعنی اس کے مقابل کوئی مکروہ (ناگوار) چیز نہیں ہوگی جس سے وہ خود کو دور کرے۔ یعنی اس کی ناپسندیدہ

چیز کا سامنا کسی ایسی شئے سے نہیں ہوگا جس سے وہ خود کو دور کر لے۔

اور اسی بارے میں حدیث وارد ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو ہریرہ کو حکم دیا اس بچھڑے کے بارے میں جو ابھی چھوٹا تھا کہ وہ اس کی قربانی دے۔ تمہارے بعد کسی سے اس کی قربانی قبول نہ ہوگی اور آنحضرت نے فرمایا: اَلْبَقَرَۃُ تَجْزِیْ عَنْ سَبْعَۃٍ۔ گائے سات افراد کی طرف سے کافی ہوگی۔

وَالْقَبُوْلُ وَالْاِنْقِیَادُ وَالطَّاعَۃُ وَالْاِجَابَۃ باہم مشابہ ہیں اور اس کی ضد اِمْتِنَاع ہے یعنی روکنا۔

شَفَاعَۃ شَفْع سے مشتق ہے گویا شفاعت کرنے والے کے متعلق سوال ہے کہ شفاعت کرنے والا کون ہے جو مَشْفُوْعٌ لَہٗ (جس کی شفاعت کی جاتی ہے) کی شفاعت کرے۔

وَالشَّفَاعَۃُ وَالْوَسِیْلَۃُ وَالْقُرْبَۃُ وَالصِّلَۃُ نَظَائِر شفاعت، وسیلہ، قربت اور وصلت ایک جیسے ہیں۔

عَدْل، حَقّ، اِنْصَاف باہم مشابہ ہیں۔ عدل کی ضد جور (ظلم) ہے۔ آیت میں عدل سے فدیہ مراد ہے۔ عِدل اور عَدل کے درمیان یہ فرق ہے کہ عِدل اسی جنس کی چیز کے مثل ہوتا ہے جب کہ عَدل چیز کا بدل ہوتا ہے جو غیر جنس سے بھی ہوسکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَوْ عِدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا (سورۂ مائدہ، آیت ۹۵) (یا اس کے برابر روزے رکھنے ہوں گے)

نُصْرَۃ، مَعُوْنَۃ، تَقْوِیَۃ باہم مشابہ ہیں۔ حدیث میں اس طرح وارد ہوا ہے: اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ (تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم) (یعنی اگر تمہارا بھائی ظالم ہو تو اسے ظلم سے روکو اور اگر مظلوم ہو تو اس سے ظلم کا دفاع کرو) وَالْاَنْصَارُ الرَّجُل سے مراد اس شخص کے مددگار ہیں۔

نَصَرَتِ السَّمَآءُ، اس وقت کہتے ہیں جب بارش ہو۔

ترکیب:

یومًا کا منصوب ہونا، مفعول بہ کی بنا پر ہے ظروف کے منصوب ہونے جیسا نہیں ہے اس لئے کہ اس کے معنیٰ ہیں: آج کے دن سے ڈرو اور ہوشیار رہو۔ یہ معنی نہیں ہے کہ آج کے دن میں ڈرو اس لئے کہ آج کے دن ڈرنے کا حکم نہیں دیا جارہا ہے بلکہ دوسرے دن میں آج کے دن کی وجہ سے ڈرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔

لَا تَجْزِیْ: محلاً منصوب ہے اس لئے کہ یومًا کی صفت ہے موصوف کی جانب پلٹنے والی ضمیر کے سلسلہ

میں اختلاف ہے۔سیبویہ کا نظریہ ہے کہ اس کلام میں فِیۡهِ محذوف ہے یعنی لَا تَجۡزِیۡ فِیۡهِ (لہٰذا فِیۡهِ میں ہاء کی ضمیر موصوف کی جانب پلٹ رہی ہے)

دیگر نحویین نے کہا: یہاں پر فِیۡهِ کو پوشیدہ ماننا جائز نہیں ہے اس لئے کہ آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ: هٰذَا رَجُلٌ قَصَدۡتُ یا هٰذَا رَجُلٌ رَغِبۡتُ اور آپ اِلَیۡهِ یا فِیۡهِ کا ارادہ کریں پس اس کلام کو وسعت کی بنا پر مفعول پر حمل کیا جائے گا گویا اس طرح کہا گیا ہے کہ:۔ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَا تَجۡزِیۡهِ پھر ہاء کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: رَأَیۡتُ رَجُلًا اُحِبُّ یعنی اُحِبُّهٗ۔ یہ دوسراج کا قول ہے۔

* ابو علی نے کہا: صفت سے ہاء کو حذف کر دیا گیا ہے جس طرح صلہ سے حذف کر دیتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں میں مشابہت پائی جاتی ہے اس لئے کہ صفت موصوف کو خاص بنا دیتی ہے جس طرح صلہ موصول کو خاص بنا دیتا ہے وہ موصوف میں عمل نہیں آتی اور نہ ہی اس پر مقدم ہوتی ہے جس طرح صلہ موصول میں عمل نہیں کرتا صفت کا مرتبہ موصوف کے بعد ہوتا ہے اسی طرح صلہ کا مرتبہ بھی موصول کے بعد ہوتا ہے بعض مقامات پر صفت لازم ہوتی ہے جس طرح صلہ لازم ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب موصوف صرف صفت ہی کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے صلہ اور موصول سے پہلے والے کلمات میں عمل نہیں کرتی ہے جب ایسا ہے تو صفت سے ضمیر عائد کو حذف کرنا حسن ہے جیسا کہ صلہ سے حذف کرنا حسن ہے اس آیت میں: اَهٰذَا الَّذِیۡ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوۡلًا۔

اخفش نے کہا: لفظ شَیۡئًا مصدر (مفعول مطلق) کا قائم مقام ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لَا تَجۡزِیۡ جَزَآءً وَلَا تُغۡنِیۡ غِنَآءً۔

رمانی نے کہا: اقرب یہ ہے کہ شَیۡئًا حَقًّا کی جگہ پر ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لَا یُؤَدِّیۡ عَنۡهَا حَقًّا وَجَبَ عَلَیۡهَا (اس کی جانب سے کوئی حق ادا نہیں کرے گا جو اس پر واجب تھا)

وَلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ: یہ جملہ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ اس جملہ پر عطف ہے جو اس سے پہلے صفت واقع ہوا ہے۔

اور جو اس بات کا قائل ہے کہ جار کو حذف کر کے فعل کو مفعول سے متصل کر دیا ہے پھر صفت میں سے عائد (یعنی موصوف کی جانب پلٹنے والی ضمیر) کو حذف کر دیا ہے۔ لَا یُقۡبَلُ کے سلسلہ میں بھی اس کا نظریہ وہی ہوگا جہاں پر صفت کی جانب پلٹنے والی ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے ان میں سے ایک شاعر کا یہ شعر ہے:

وَمَا شَيْءٌ حَمَيْتَ بِمُسْتَبَاحٍ

اور تم نے جس چیز کی حمایت کی ہے وہ مباح نہیں تھی۔

مِنْهَا میں ہاء کی ضمیر لفظ کی بنا پر نفس کی طرف پلٹ رہی ہے۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ: یہ معنی کی بنا پر ہے اس لئے کہ مراد مفرد نہیں ہے اسی لئے جمع لائے ہیں۔

تفسیر:

اس دن سے ڈرو۔۔۔

جب خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے لیے اپنی عظیم نعمتوں کو بیان کیا پھر انہیں روز قیامت کفران نعمت سے ڈرایا، تو ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوا، ڈرو اور خوف کرو، يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا اس دن سے جس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی کوئی نفس کسی نفس کی پریشانی اور دشواری کو دور کر سکتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ کوئی ایک کسی ایک کی جانب سے حق ادا نہیں کرے گا جس پر اللہ کا حق ہو یا اس کے غیر کا (یعنی حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے) نفس کو نکرہ ذکر کیا ہے تا کہ واضح کر دے کہ ہر نفس کا یہی حال ہے۔

یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے: وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا۔ (سورۂ لقمان، آیت ۳۳) (اور اس دن سے ڈرو جب کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی اولاد اپنے والد کے کچھ کام آئے گی)

مسئلہ شفاعت

اور اس کا یہ ارشاد: وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، (اور نہ ہی اس کی طرف سے سفارش قبول کی جائے گی) مفسرین کا کہنا ہے: اس آیت کا حکم یہودیوں سے مخصوص ہے اس لیے کہ ان کا کہنا تھا کہ ہم اولاد انبیاء ہیں، ہمارے آباء واجداد ہماری شفاعت کریں گے۔ خدا نے انہیں اس امید سے مایوس کیا ہے۔ کلام کو عمومیت کے ساتھ بیان کی ہے، مراد خصوص ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ امت (مسلمہ) کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ کی شفاعت مقبولہ ہے اگرچہ شفاعت کی کیفیت میں اختلاف کیا گیا ہے۔

ہمارے یہاں شفاعت گنہگار مومن سے دفع ضرر اور عذاب کے مستحقین سے عذاب کے ساقط و برطرف کرنے سے مخصوص ہے۔ معتزلہ کا کہنا ہے کہ یہ اطاعت شعاروں کے لیے ان کے منافع میں زیادتی کرنا

ہے توبہ کرنے والوں کے لیے نہ کہ گناہگاروں کے لیے۔ یہ ہمارے نزدیک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ثابت ہے۔ آپ کے برگزیدہ اصحاب اور ائمہ اہلبیت طاہرین علیہم السلام اور مومنین صالحین کے لیے جن کی شفاعت کے ذریعہ خداوند عالم بہت سے خطا کاروں کو نجات بخشے گا۔ اس بات کی تائید وہ حدیث کر رہی ہے جس کو امت نے تسلیم کیا ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ہے: اِدَّخَرْتُ شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ (میں نے اپنی شفاعت کو ذخیرہ کر رکھا ہے اپنی امت کے گناہان کبیرہ کرنے والوں کے لئے)

ہمارے علماء سے جو روایات مرفوعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، یہ ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: میں روز قیامت شفاعت کروں گا، میری شفاعت مقبول ہوگی اور میرے اہلبیتؑ شفاعت کریں گے ان کی شفاعت مقبول ہوگی اور ادنیٰ مومنین اپنے اپنے چالیس برادر مومن کی شفاعت کریں گے جن پر آتش جہنم واجب ہو چکی ہوگی (ان کی بھی شفاعت کریں گے)

خداوند عالم نے اپنے ارشاد میں کفار کی اس حسرت کی خبر دی ہے جو صاحبان ایمان کو حاصل ہونے والی شفاعت کے ان سب سے فوت ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوگی (اور وہ اس طرح کہیں گے) فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ (ہمارا نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہے، نہ ہی کوئی پکا دوست ہے)

وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، (اور نہ ہی اس سے فدیہ لیا جائے گا) یعنی فدیہ اور عوض۔ عدل کو فدیہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مُفدیٰ کے معادل اور مماثل ہوتا ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی سے بھی فدیہ نہیں لیا جائے گا جو ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کے گناہوں کا بدل اور عوض نہیں لیا جائے گا۔ حدیث میں وارد ہوا ہے: لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَرْفاً وَّلَا عَدْلًا. اس کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حسن نے کہا ہے: صَرْف سے عمل اور عَدْل سے فدیہ مراد ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: صَرْف (اطاعت یعنی استحباباً) اور عَدْل فریضہ ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے: صَرْف حِيْلَة (بہانہ) اور عَدْل فدیہ ہے۔

کلبی نے کہا ہے: صَرْف، فدیہ اور عَدْل یعنی اس کی جگہ کوئی اور شخص۔

ارشاد الٰہی: وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ. ان کی مدد نہ کی جائے گی کہ وہ عذاب سے نجات حاصل کر سکیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا جو ان کی اللہ کے مقابلہ میں نصرت کر سکے جب اللہ ان پر عذاب نازل کرے گا۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ‌ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۴۹﴾

اور یاد کرو جب ہم نے تمھیں آل فرعون سے نجات دی انھوں نے تم کو سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی۔

قرائت:

قرأتِ شواذ میں ابن محیصن نے یَذۡبَحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ پڑھا ہے۔

حجت:

ابن جنی نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فَعَلۡتَ (ثلاثی مجرد سے) کبھی کبھی اس میں تکثیر کے معنی ہوتے ہیں اور ایسا فعل کے اپنے مصدر پر دلالت کی وجہ سے ہے اور مصدر اسم جنس ہے اور وسعت وعمومیت کے لئے جنس ہی کافی ہے۔ ابوالحسن کا شعر ہے:

اَنۡتَ الۡفِدَاءُ لِقِبۡلَةٍ هَدَّمۡتَهَا وَ نَقَّرۡتَهَا بِيَدَيۡكَ كُلَّ مُنَقَّر

تم اس قبلہ پر قربان کہ جسے تم نے ڈھایا ہے اور اسے اپنے ہاتھوں سے چوٹ پہنچائی ہے۔

گویا شاعر نے وَنَقَّرۡتَهَا کہا ہے اس لئے کہ لفظ مُنَقَّر گواہ ہے کہ (کہ مُنَقَّر باب تفعیل سے ہے) چونکہ فعل میں مصدر کے معنی پائے جاتے ہیں جو کہ جنس پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس کی تثنیہ اور جمع بنایا جائز نہیں ہے اس لئے کہ تثنیہ اور جمع میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔

الفاظ ومعانی:

اِنۡجَاء، تَنۡجِيَة اور تَخۡلِيۡص معنی کے لحاظ سے ایک ہی ہیں، یعنی نجات دلانا۔

اَلنَّجَاۃُ وَالسَّلَامَۃُ وَالْخَلَاصُ وَالتَّخَلُّصُ چھٹکارا پانا۔ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔
اِنْجَاء اور تَنْجِیَۃ کے درمیان بعض نے فرق بیان کیا ہے کہ اِنْجَاء کا استعمال ہلاکت میں واقع ہونے سے قبل چھٹکارا اور نجات حاصل کرنے میں ہوتا ہے جبکہ تَنْجِیَۃ کا استعمال ہلاکت میں مبتلا ہونے کے بعد نجات پانے میں ہوتا ہے۔
آل اور اَھْل کے ایک ہی معنی ہیں۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل کی اصل اہل ہے،اس لئے کہ آل کی تصغیر اُھَیْل ہے اور کسائی نے نقل کیا ہے کہ اُوَیْل آتی ہے اور احتمال دیا گیا ہے کہ یاء کو ہاء سے بدل دیا گیا ہے جس طرح ھیھات اور ایھات میں کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل بذات خود اصل ہے۔آل اور اہل کے درمیان فرق یہ ہے کہ اہل آل سے عام ہے اور اس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔اہل بصرہ کہا جاتا ہے آل بصرہ نہیں کہتے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرد کی آل اس کے قریبی (قربت دار) اور اہل بیت ہیں۔آل جبل (پہاڑ کے اطراف وجوانب کے لوگ ہیں) ابن درید نے بیان کیا ہے کہ ہر شخص کی آل خود اس کی ذات اور شخصیت ہے۔آل الرجل سے مراد مرد کے اہل اور اس کے قرابت دار ہیں۔
فرعون عمالقہ کے بادشاہ کا نام ہے جس طرح روم کے بادشاہ کو قیصر،فارس (ایران) کے بادشاہ کو کسریٰ،ترک کے بادشاہ کو خاقان اور یمن کے بادشاہ کو تُبّع کہا جاتا ہے۔یہ صفت کے معنی میں ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرعون کا نام مصعب بن ریان تھا۔محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ اس کا نام ولید بن مصعب تھا۔
یَسُوْمُوْنَکُمْ (یعنی تمہیں زحمت وتکلیف میں مبتلا کرتا ہے) کہا گیا ہے کہ تمہیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔
سُوْءُ الْعَذَاب، اَلِیْمُ الْعَذَابِ اور شَدِیْدُ الْعَذَاب ایک جیسے ہیں۔صاحب کتاب العین نے بیان کیا ہے کہ سُوْء عذاب کا نام ہے جو تمام آفات اور امراض کا جامع اور شامل ہے۔
ذِبح، نَحر اور شَقّ باہم مشابہ ہیں۔
یَسْتَحْیُوْنَ یعنی یَسْتَبْقُوْن (باقی رکھتے ہیں، زندہ رکھتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اُقْتُلُوا شُیُوْخَ الْمُشْرِکِیْنَ وَاسْتَحْیُوا شَرْخَھُمْ، (یعنی بوڑھے مشرکین کو قتل کردو اور ان کے جوانوں کو باقی رکھو۔
نِسَآء، نِسْوَۃ، نِسْوَان (عورتیں) کے لفظ کی واحد نہیں ہے۔
بَلَاء، نِعْمَۃ، اِحْسَان لغت میں ایک جیسے ہیں۔بَلَاء خیر وشر (دونوں) میں استعمال ہوتا ہے۔اللہ

ارشاد فرماتا ہے: نَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء/ ۳۵) اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی کے ذریعہ آزماتے ہیں۔

اِبْلَاء، اِنْعام معنیٰ میں ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا (سورۂ انفال، آیت ۱۷) (اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مومنین کو بہترین آزمائش میں کامیابی عطا کرے) بلاء (کا استعمال) انعام میں بھی ہوتا ہے جس طرح انتقام میں ہوتا ہے۔ بَلاء کی اصل امتحان واختبار ہے۔

ترکیب:

وَاِذْ نَجَّيْنَاكُمْ میں اِذْ میں عامل يَا بَنِي اِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ میں اُذْكُرُوا ہے اور وہ ماقبل پر عطف ہے۔

يَسُومُونَكُمْ ممکن ہے کہ محلاً منصوب ہو آل فرعون کی حال ہونے کی بنا پر اور اس میں عامل نَجَّيْنَاكُمْ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ استیناف ہو۔ (نیا جملہ ہو)

اَبْنَاء اِبْن کی جمع ہے اور اِبْن کی اصل بَنَو باء اور نون کے فتحہ کے ساتھ اور یہ کہ باء مفتوح ہے اس کی دلیل عربوں کا اس کی جمع بنانے میں اَبْنَاء کہنا ہے اَفْعَال کے وزن پر اور اَفْعَال ان اسماء کی جمع کا وزن ہے جو فَعَل کے وزن پر ہوں جیسے جَبَل سے اَجْبَال۔ جیسا کہ فَعْل (عین ساکن) اس کی جمع اَفْعُل پر آتی ہے جیسے فَرْح سے اَفْرُح۔

لفظ ابن سے واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا اس لئے کہ واؤ زیادہ سنگین تھا لہٰذا اسے حذف کرنا زیادہ بہتر تھا۔ یہ اخفش اور ابوعلی فارسی کا نظریہ ہے۔

تفسیر:

نعمت آزادی

خداوند عالم نے ان نعمتوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے جس کا اجمالی طور پر سابق میں بیان گزر چکا ہے۔ ارشاد فرمایا: وَاِذْ نَجَّيْنَاكُمْ، اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمھیں نجات دلائی، مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ، فرعون اور اس کے دین والوں سے، يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ، جنھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا

تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ تمھیں زحمت و مشقت میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ تمھیں عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھے، یہ دونوں معانی قریب قریب ہیں۔ اس عذاب کے بارے میں اختلاف وارد ہوا ہے جس عذاب سے اللہ نے انھیں نجات بخشی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

يُذَبِّحُونَ أَبْنَآئَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ، (وہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمھاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے) اس کی تفسیر یہ ہے کہ بیان کیا گیا ہے کہ آل فرعون ان کو زحمت میں مبتلا کرتے تھے انھوں نے انھیں متعدد گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک گروہ ان کی خدمت کرتا تھا، ایک ان کے لیے کھیتی باڑی کرتا تھا اور جن میں کسی کام کی صلاحیت نہیں ہوتی ان پر جزیہ اور ٹیکس لگا دیتے، ان کے بیٹوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے۔ سورہ ابراہیم میں بھی اس بات کی نشاندہی ہے کہ:

يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآئَكُمْ (سورہ ابراہیم، آیت ۶) (تمھارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمھاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے)

يُذَبِّحُونَ أَبْنَآئَكُمْ کو يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ پر عطف کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں لاگ الگ ہیں: يُذَبِّحُونَ أَبْنَآئَكُمْ، کے معنی ہیں تمھارے لڑکوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ باقی رکھتے۔ لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے تاکہ انھیں کنیز بنائیں، انھیں اسیر و قیدی بنا کر ان سے مجامعت کریں، یہ قتل کرنے سے زیادہ سخت تھا، بَنَاتِكُمْ، نہیں ارشاد ہوا اس لیے کہ انھیں اسی نام سے یاد کیا جو ان کی حالت و کیفیت کی تاویل اور معنی تھے۔ بیان کیا گیا ہے: نِسَآءَكُمْ (یعنی تمھاری عورتیں) غلبہ کے سبب کہا ہے اس لیے کہ چھوٹی اور بڑی (عورت) کو باقی رکھتے تھے بطور مثال کہا جاتا ہے "مرد آئے" اگرچہ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح أَبْنَآء (فرزندوں) کے مانند چھوٹی اور بڑی پر نِسَآء (عورت) کی لفظ کا استعمال صحیح ہے۔

ارشاد باری: وَفِي ذَٰلِكُمْ، تمھارے عذاب میں مبتلا ہونے اور فرزندوں کے قتل میں بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ، (تمھارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی) جب تمھیں اور فرعون کو چھوڑ دیا گیا تو اس نے تمھارے اوپر اس طرح کے مظالم ڈھائے۔ بیان کیا گیا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم سے نجات پانے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہارے لئے عظیم نعمت ہے۔

واقعہ

بیٹوں کو قتل کرنے کا سبب یہ تھا کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا کہ گویا ایک آگ بیت المقدس کی جانب سے بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ اس نے مصر کے گھروں کو اپنی زد میں لے لیا ہے اور انھیں جلا دیا ہے۔ قبط (قبیلہ) کو بھی جلا دیا ہے اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیا ہے۔ فرعون خواب دیکھ کر گھبرایا اور جادوگروں، کاہنوں اور قیافہ شناسوں کو بلا کر خواب کی تعبیر دریافت کی؛ انھوں نے کہا: بنی اسرائیل میں ایک فرزند پیدا ہوگا اور تیری ہلاکت اسی کے ہاتھوں ہوگی، تیرے اقتدار کا خاتمہ ہوگا اور تیرا دین تبدیل ہو جائے گا۔ پس فرعون نے بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا اور اپنی حکومت کی تمام دایاؤں کو حکم دیا کہ تمھارے ذریعہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے اور لڑکی پیدا ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے۔ دایاؤں پر نگراں مقرر کر دیے۔ اس طرح انھوں نے یہ کام کرنا شروع کر دیا اور بنی اسرائیل کے بوڑھوں میں موت کا بازار گرم ہو گیا (قبیلہ) قبط کے رؤساء فرعون کے پاس آکر کہنے لگے بنی اسرائیل میں موت وارد ہو چکی ہے چھوٹے قتل کیے جا رہے ہیں اور بزرگ اپنی موت مر رہے ہیں قریب ہے کہ ہماری نوبت بھی آن پہنچے۔ فرعون نے حکم دیا کہ ایک برس قتل کیا جائے اور ایک سال چھوڑ دیا جائے۔ جناب ہارونؑ کی ولادت اس برس میں ہوئی جس برس بچے قتل نہیں کیے گئے۔ اس طرح انھیں چھوڑ دیا گیا اور جناب موسیٰؑ اس برس پیدا ہوئے جس میں بچوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾
اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر کو پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا تھا تمھیں نجات دی اور تمھاری نظروں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کر دیا تھا۔

قرائت:

قرأت شواذ میں زہری نے وَاِذْ فَرَّقْنَا بِكُمْ (راء کو) مشدد پڑھا ہے۔

ابن جنی نے کہا: فَرَّقْنَا میں فَرَقْنَا سے زیادہ اور شدید تفریق ہے۔ فَرَّقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے سمندر کو فرقہ فرقہ یعنی ٹکڑے ٹکڑے بنا دیا اور فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کے معنی ہیں کہ ہم نے تمہارے لئے سمندر کو شگافتہ کر دیا۔

الفاظ و معانی:

فَرْق دو چیزوں کے درمیان فاصلہ کو کہتے ہیں۔ فِرْق ہر چیز کے گروہ کو کہتے ہیں (مثلاً) پانی کو کہتے ہیں جب اس کا بعض پانی بعض سے جدا اور علیحدہ ہو جائے ان میں سے ہر گروہ فِرْق ہے۔ اسی سے متعلق ارشاد ہے: فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ. (سورہ شعراء ر ۶۳) (اور ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی طرف ہو گیا)۔ فَرَق خوف کے معنی میں ہے۔

بَحْر کو بحر اس کی وسعت کشادگی اور پھیلاؤ کے سبب کہا گیا ہے۔ اِسْتَبْحَرَ فِی الْعِلْمِ، اس وقت کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص وسیع علم اور اس میں تمکن اور قدرت رکھتا ہو۔ بَاحِر وہ احمق و نادان ہے کہ جب گفتگو کرے تو مبہوت و حیران ہو جائے۔ عرب نمکین اور شیریں پانی کو بحر کہتے ہیں جب بکثرت ہو۔ اللہ کا ارشاد ہے: مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ (سورہ رحمن ر ۱۹) (اس نے دو دریا بہائے جو آپس میں مل جاتے ہیں) یعنی شیریں اور نمکین پانی۔

غَرَق پانی کی تہہ میں بیٹھ جانے کو کہتے ہیں۔ نجات غرق کی ضد ہے اسی طرح نجات ہلاکت کی بھی ضد ہے۔

نَظَر کے معنی آنکھ سے دیکھنے کے ہیں جس طرح نَظَرْتُ فِی الْکِتَابِ (میں نے کتاب پر نظر کی کتاب دیکھی) کہا جاتا ہے۔ قائل کا یہ کہنا: اَنْظُرُ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ اِلَیْكَ، یعنی میں فضل خدا کا متوقع ہوں پھر آپ کے فضل کا۔ نَظَرْتُه و اِنْتَظَرْتُهٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ نَظَر کے معنی تَفَکُّر کے بھی ہیں۔ حقیقی معنی کسی وجہ کے سبب کسی چیز کی جانب اقبال کرنا اور بڑھنا ہے۔ رحمت کے ذریعہ نظر رحمت کی جانب بڑھنا ہے۔ نظر کی حقیقت کسی چیز کو دیکھنے کے لیے صحیح حدقہ (چشم) کا منقلب کرنا اور گھمانا ہے۔

تفسیر:

فرعونیوں کے چنگل سے آزادی

پھر خداوند عالم نے بنی اسرائیل پر دوسری نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ، اور یاد کرو جب ہم نے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ تم اس کے درمیان سے گذر گئے اور تم دونوں (پانی) کے درمیان فرقے (گروہ) تھے جو خشک راستے پر چل رہے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ تمھارے داخل ہوتے ہی ہم نے سمندر کو پھاڑ دیا اور اس کے شگاف میں تمھارے ہر گروہ نے خشک راستے پر چلنا شروع کر دیا اور تمھارے مابین فاصلہ واقع ہو گیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا یعنی تمہارے سبب سے دریا کو پھاڑ دیا تا کہ تم اس میں سے گذرو۔ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ، تمھیں نجات بخشی سمندر سے اور ڈوبنے سے۔ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ (اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا) یہاں پر فرعون کا غرق ہونا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کو دوسرے مقام پر ذکر کیا گیا ہے: فَاَغۡرَقۡنٰهُ وَمَنۡ مَّعَهٗ، (ہم نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا) یہاں پر کلام کی دلالت کے سبب اختصار سے کام لیا گیا ہے اس لیے کہ غرض فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت پر مبنی ہے۔ اس کی مثال قائل کا قول ہے: دَخَلَ جَيۡشُ الۡاَمِيۡرِ الۡبَادِيَةَ (یعنی سردار کا لشکر صحرا میں داخل ہوا) ظاہر ہے کہ سردار لشکر کے ہمراہ تھا۔ ممکن ہے آل فرعون سے خود فرعون مراد ہو جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ هٰرُوۡنَ، (اس میں سے جسے آل موسیٰ اور آل ہارون نے چھوڑا ہے) یعنی موسیٰ و ہارون۔

ارشاد ہوتا ہے: وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ، یعنی تم ان کے غرق ہونے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ سرزنش اور اظہار معجزہ کے لئے زیادہ بلیغ ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ تم ان کے منظر اور مشہد (نظر آنے اور مشاہدہ کے مقام) میں تھے۔ یہاں تک کہ اگر تم انھیں دیکھنا چاہتے تو یہ ممکن تھا وہ اس حالت میں تھے کہ انھیں دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ زجاج کا قول ہے اور اسی سے ملتا جلتا فراء کا قول ہے۔ قول اول زیادہ صحیح ہے؛ اس لیے کہ انھیں دیکھنے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ سب سمندر سے گذر رہے تھے۔ مفسرین کے اقوال میں اختلاف ہے کہ اصحاب موسیٰ نے سمندر کو پھٹتے ہوئے اور اس کی لہروں کو بلند ہوتے ہوئے دیکھا یہاں تک سب اس میں غرق ہو گئے۔ ظاہر سے عدول کرنے

میں کوئی وجہ نہیں۔ (یعنی ظاہر آیت پر عمل کیا جائے گا)

واقعہ

سمندر میں فرعون کے واقعہ کو بنی اسرائیل کے ساتھ ابن عباس نے اس طرح بیان کیا ہے: ''خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ پر وحی فرمائی کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے جائیں۔ جناب موسیٰؑ رات میں بنی اسرائیل کو لیکر نکل گئے۔ فرعون نے ایک کروڑ گھوڑوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا جس میں ایک بھی گھوڑی نہیں تھی۔ جناب موسیٰؑ چھ لاکھ بیس ہزار لوگوں کے ہمراہ تھے۔ فرعون نے جب انھیں دیکھا تو کہنے لگا یہ تو نہایت مختصر لوگ ہیں، ہم انھیں خوف زدہ کرلیں گے۔ جناب موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ہمراہ چلتے رہے یہاں تک کہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ جناب موسیٰؑ کے ساتھی فرعون سے خائف ہو کر کہنے لگے: اے موسیٰ! آپ اس سے قبل بھی ہمیں اذیت میں مبتلا کرتے رہے ہیں اور اب آپ ہمیں یہاں لے آئے ہیں، اب سمندر ہمارے روبرو ہے اور یہ فرعون ہے جو ہم پر ظلم کر رہا ہے اور اس کے ساتھی بھی ہم پر ستم ڈھا رہے ہیں۔ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: عنقریب تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کردیگا اور تمھیں زمین پر خلیفہ بنائے گا۔ غور کرو تم کیا کر رہے ہو۔ یوشع بن نون نے موسیٰؑ سے عرض کیا: آپ کو کس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ موسیٰؑ نے کہا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنا عصا سمندر پر ماروں۔ یوشع بن نون نے کہا: ماریئے! اللہ نے سمندر پر وحی فرمائی کہ جب موسیٰ عصا ماریں تو ان کی اطاعت کرنا۔ (ابن عباس) کہتے ہیں: موسیٰؑ نے سمندر پر عصا مارا جس سے بارہ راستے پیدا ہو گئے۔ ہر قبیلہ کے لیے کہ ایک راستہ بن گیا۔ بنی اسرائیل کہنے لگے: ہمیں گیلا راستہ نہیں چاہیے۔ خداوند عالم نے ہوا کے ذریعہ راستہ خشک کردیا جیسا کہ ارشاد ہے: فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا، (سورۂ طہ، آیت ۷۷) (اور ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنالو)

جب ان لوگوں نے راستہ پر چلنا شروع کردیا ان میں سے بعض نے بعض سے کہا: ہم اپنے ساتھیوں کو کیوں نہیں دیکھ پا رہے ہیں؟ جناب موسیٰؑ سے کہنے لگے: ہمارے ساتھی کہاں ہیں؟ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: تمھاری طرح راستہ میں ہیں۔ کہنے لگے ہم راضی نہیں ہوں گے جب تک انھیں دیکھ نہ لیں۔ موسیٰؑ نے بارگاہ خدا میں عرض کیا: پروردگارا! ان کی بداخلاقیوں پر میری مدد فرما۔ اللہ نے وحی فرمائی اپنا عصا دائیں بائیں جانب گھماؤ۔ موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا۔ پس پانی (جو دیوار کے مانند کھڑا تھا) میں سوراخ پیدا ہو گئے جن سے ایک نے

دوسرے کو دیکھا۔فرعون جب ساحل سمندر پر پہونچا جو اپنے گھوڑے پر سوار تھا جو پانی میں داخل ہونے سے خوف کھا رہا تھا۔حضرت جبرئیل نے اس کے لیے ایک گھوڑی کی شبیہ بنادی اور وہ سمندر میں اتر گئی۔اس کے ساتھ گھوڑا بھی سمندر میں داخل ہوگیا۔اس طرح فرعون کی قوم بھی سمندر میں داخل ہوگئی۔جب حضرت موسیؑ کے تمام ساتھی سمندر سے باہر نکل گئے اور فرعون کا آخری ساتھی بھی سمندر میں داخل ہوگیا تو سمندر باہم مل گیا اور انھیں ڈھانپ لیا۔فرعون کے تمام ساتھی غرق ہوگئے اور جناب موسیؑ اور آپ کے تمام ساتھیوں کو نجات حاصل ہوگئی۔"

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے، یہ جو کہا جاتا ہے خداوند عالم نے جناب موسیؑ کے مانند ہر نبی اور پیغمبر کو روشن آیات اور معجزات کیوں عطا نہیں کیے تاکہ دلیل بہت زیادہ نمایاں اور شبہہ بہت دور ہوتا؟ اس کا جواب ہے: خداوند عالم اپنی مخلوقات کی اصلاح کے لیے ان کی بہتری کے مطابق انھیں روشن نشانیاں، زبردست معجزات عطا کرتا ہے۔جناب موسیؑ کی قوم میں نفس کی سستی اور کاہلی اس درجہ پر تھی کہ ان کے لیے حقیقی آیات کے ساتھ استدلال مناسب نہیں تھا۔کیا تم نے نہیں دیکھا جب وہ ایک نہر کو عبور کر کے ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرے جو بتوں کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔تمام تر نشانیوں کے دیکھنے کے بعد کہنے لگے: موسیؑ ہمارے لیے بھی ایسے ہی خدا بنادو جیسے ان لوگوں کے ہیں۔جناب موسیؑ نے اس پر فرمایا: تم لوگ جہالت سے کام لے رہے ہو۔جبکہ عرب میں پیغمبرؐ کی امت ذہنی ذکاوت اور قوت فہم میں بہت تیز تھی لہٰذا ان کے پاس ایسی ہی آیات اور نشانیاں پہنچیں جو تمام کی تمام حجت ظاہرہ اور بینات باہرہ پر مشتمل تھیں جن کے ذریعہ علم ویقین کی فضا تک پہونچا جاسکتا تھا جو ان کے لیے صداقت وسچائی کی راہ کو واضح کرنے والی تھیں۔جن میں اعمیٰ اور بصیر (بے بصیرت اور صاحب بصیرت) مساوی نہیں ہوسکتے۔"وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ" (سورۂ فاطر، آیت ۱۴)

(کوئی آپ کو اس باخبر اللہ کی طرح باخبر نہیں کرے گا)

❀❀❀❀❀

وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسَىٰٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظٰلِمُونَ ﴿٥١﴾

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ لیا تھا تو تم نے ان کے جانے کے بعد بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا اس وقت تم نے بہت بڑی زیادتی کی تھی۔

قرائت:

اہل بصرہ اور ابو جعفر نے یہاں سورۂ بقرہ میں وَعَدْنَا بغیر الف کے پڑھا ہے اور سورۂ اعراف و سورۂ طٰہ میں بھی اور بقیہ قراء نے وَاعَدْنَا الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، حفص برجمی اور رویس نے اِتَّخَذْتُم اور اَخَذْتُمْ پڑھا ہے اور اس میں سے جو آیا ہے وہ ذال کے اظہار کے ساتھ آیا ہے اور اعشیٰ نے ان لوگوں کی موافقت کی ہے اِفْتَعَلْتُ میں یعنی باب افتعال میں اور بقیہ قراء ادغام کرتے ہیں۔

حجت:

جن حضرات نے الف کو باقی رکھ کر وَاعَدْنَا قرأت کی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ صورتحال دو حالتوں سے خالی نہیں ہے یا تو جناب موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا یا وعدہ نہیں کیا تھا اگر انہوں نے وعدہ کیا تھا تو وَاعَدْنَا کی قرأت کے واجب ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے اور اگر انہوں نے وعدہ نہیں کیا تھا تو ان کی طرف سے جو عمل انجام پایا وہ وعدہ کو قبول کرنا اور اسے وفا کرنے کی کوشش کرنا ہے یہ بھی وعدہ کا قائم مقام ہے۔

وَاعَدْنَا کی قرأت میں اللہ کی جانب سے وعدہ اور موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے قبولیت پر دلالت پائی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اس ارشاد: بِمَآ أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ میں اس بات کی خبر دینا حسن ہے کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا تو یہاں پر بھی وَاعَدْنَا ہی اختیار کیا جانا چاہئے تھا اور جن حضرات نے وَعَدْنَا پڑھا ہے بغیر الف کے تو وہ معنیٰ سے بہت زیادہ مطابقت رکھتا ہے اس لئے کہ قبول کرنا درحقیقت وعدہ نہیں ہے اس لئے کہ وعدہ دراصل موعود کو خبر دینا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کون سی نیکی کرے گا اس بنا پر بِمَآ أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ مجاز ہوگا اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی خبر دی ہے۔

بعض علماء نے کہا: مُوَاعَدَۃ درحقیقت اللہ اور انسان کے درمیان ہوگا حالانکہ خدا ہی تنہا وعد و وعید کرنے والا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

*وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ

*وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ دونوں قرائتیں قوی ہیں۔

اور جن لوگوں نے ذال کو تاء میں ادغام کیا ہے اِتَّخَذْتُمْ میں تو ان کی دلیل یہ ہے کہ ذال کا مخرج تاء کے مخرج سے قریب ہے اور جن لوگوں نے ادغام نہیں کیا ان کی دلیل یہ ہے کہ دونوں کے مخرج الگ الگ ہیں۔

الفاظ و معانی:

وَعْد، مَوْعِد، وَعِيْد، عِدَة، مَوْعِدَة مصادر ہیں۔ وَعْد کو خیر کے لیے اور وَعِيْد کو شر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ وَعْد اور مَوْعِد کی جمع نہیں بن سکتی۔ کبھی مقام اور وقت اور مصدر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مِيْعَاد یا تو وقت کے لیے ہوگا یا جگہ اور مقام کے لیے ہوگا۔ اور کبھی کہا جاتا ہے: وَعَدْتُهٗ فِي الشَّر میں نے اس سے شر کے بارے میں وعدہ کیا۔

اس طرح کہا جاتا ہے: وَعَدْتُهٗ فِي الشَّرِّ، اللہ فرماتا ہے: اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، (سورۂ حج، آیت ۷۲) (وہ آگ ہے اللہ نے کافروں سے جس کا وعدہ کر رکھا ہے)

وعد کے حقیقی معنیٰ خیر کی خبر دینا ہیں جو مُخْبَر (جسے خبر دی جا رہی ہے) کو مستقبل میں پہنچتی ہے یا مستقبل کے بارے میں شر کی خبر دی جاتی ہے۔

لفظِ موسیٰ قبطی زبان کے دو اسموں سے مرکب ہے: ایک مُو جس کے معنی پانی کے ہیں اور دوسرا سیٰ جس کے معنی درخت کے ہیں۔ موسیٰ نام کی وجہ یہ ہے کہ جس تابوت میں موسیٰ تھے وہ پانی اور درخت کے نزدیک ملا تھا جسے فرعون کی زوجہ آسیہ کی کنیزوں نے پایا تھا۔ سُدی سے روایت ہے آپ موسیٰ بن عمران بن یَصْهُر بن فاهث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراهیم ہیں۔ محمد بن اسحاق بن یسار سے روایت ہے۔

خداوند عالم نے اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (یعنی چالیس راتیں) کہا ہے، اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا، (چالیس دن) نہیں

فرمایا ہے اس لئے کہ راتیں دنوں کو شامل ہوتی ہیں۔

مبرد کے قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ راتوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں دن بھی داخل ہو جاتے ہیں اور جب آپ دنوں کا ذکر کریں گے تو ان میں راتیں داخل نہیں ہوں گی۔ رات کا ذکر کر کے دنوں کے ذکر سے اکتفاء کیا ہے، رات غروب سے فجر (صادق) تک شمار ہوتی ہے اور دن طلوع فجر دوم سے غروب تک ہوتا ہے۔

ترکیب:

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً میں أَرْبَعِينَ کا تعلق وعدہ سے ہے یا تو اس لئے کہ وہ ظرف ہے یا مفعول دوم ہے۔ یہ ظرف ہو نہیں سکتا اس لئے کہ وعدہ ان پوری راتوں میں نہیں ہے کہ وہ كَمْ کا جواب ہو اور نہ ہی بعض میں ہے کہ مَتَىٰ کا جواب ہو بلکہ وعدہ أَرْبَعِينَ کا تقاضا کرتا ہے جب ظرف نہیں ہے تو اس کا منصوب ہونا مفعول ثانی کی بنا پر ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَعَدْنَا مُوسَىٰ انْقِضَاءَ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً أَوْ تَتِمَّةَ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً پس مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ اَلْيَوْمُ خَمْسَةَ عَشَرَ مِنَ الشَّهْرِ یعنی تَمَامُ خَمْسَةَ عَشَرَ۔

لیکن اس آیت فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً میں أَرْبَعِينَ کا منصوب ہونا تو یہاں پر میقات أَرْبَعِينَ ہے اور وہ وعدہ ہے۔ پس گویا اس طرح ہے کہ تَمَّ الْقَوْمُ عِشْرِينَ رَجُلًا یعنی قوم مکمل ہوئی بیس کی عدد سے۔ میقات مکمل ہوئی اس گنتی سے۔ لفظ مِيقَات مِيعَاد کی جگہ آیا ہے جس طرح لفظ وَقْت وَعْد کی جگہ آیا ہے اس آیت میں: إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ۔ اور دوسرے مقام پر اَلْيَوْمِ الْمَوْعُودِ کی جگہ آیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ آیت کرتی ہے: فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً۔

آیت کریمہ۔ وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً میں لَيْلَةً عدد کی وضاحت وتمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ عدد کے بیان میں قاعدہ یہ ہے کہ اسے معدود کے ذکر کے ذریعہ بیان کیا جائے۔ لَيْلَةً اسم تام کی بنا پر منصوب ہے اور وہ اسم تام أَرْبَعُونَ ہے۔ اس کلام تام سے مشابہ ہے کہ جس کے بعد وہ منصوب ہوتا ہے جو فضلہ اور اضافی ہوتا ہے۔

یہاں پر اسم کے تام ہونے کے معنی اس نون کا مرکب ہونا ہے کہ جو اس اسم کو مکمل وتام بنا تا ہے۔ پس

یہ اسم اس جملہ سے مشابہ ہے جو فعل وفاعل سے مرکب اس جہت سے کہ وہ ایک دوسرے معنیٰ کے ذریعہ مکمل ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک اور شباہت ہے اور وہ یہ ہے کہ جو فعل و فاعل سے مرکب ہوتا ہے اس میں ایک ایسا معنیٰ پایا جاتا ہے جو مفعول کا تقاضا کرتا ہے اور وہ فعل کا ذکر ہے عدد میں بھی ابہام پایا جاتا ہے جو تفسیر و وضاحت کا تقاضا کرتا ہے تاکہ بتائے کہ یہ انواع میں سے کس نوع کا ہے پس اس معنیٰ کے لحاظ سے وہ منصوب ہوتا ہے اس لئے کہ سیبویہ نے کہا کہ اس قسم میں تمام الاسم میں ایک ایسا معنیٰ پایا جاتا ہے جو اسم اول اور تمام کے بعد آتا ہے ان دونوں کے درمیان فاصلہ بنتا ہے پس اَرْبَعِیْنَ کا نون فاعل کے مانند ہے جو فعل کو مفعول کی جانب سے مسند ہونے سے روک دیتا ہے لہٰذا فعل و فاعل کی جانب سے مسند ہوتا اور مفعول اس کے سبب منصوب ہوتا ہے نون اسم اول کو تام بناتا ہے اور اس کے بعد والا اسم منصوب ہوتا ہے۔

اتَّخَذْتُم:

اِتَّخَذْتُ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک مفعول کا جانب متعدی ہوتا ہے جیسے: وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللهِ آلِهَةً۔

(۲) دو مفعول کا جانب متعدی ہوتا ہے جیسے: اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً۔ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا۔ لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ۔

پس ارشاد الٰہی: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ گویا اسطرح ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ إِلٰهًا۔ (پھر تم نے گوسالہ کو معبود بنا دیا لیا) پس یہاں پر مفعول ثانی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہاں پر مفعول ثانی کو محذوف ماننا ضروری ہے اس لئے کہ جو شخص گوسالہ ڈھالتا یا بناتا ہے وہ خدا کی جانب سے عذاب و غضب کا سزاوار نہیں ہوتا ہے (بلکہ وہ عذاب اور غضب کا شکار بنتا ہے جو گوسالہ کو معبود بناتا ہے)

تفسیر:

بنی اسرائیل کی سب سے بڑی گمراہی

وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسٰى، اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انھیں (اَلْوَاح) تختیاں دیں گے جن میں توریت و بیان اور شفا ہے۔ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً چالیس راتوں کے گزر جانے پر یا چالیس راتیں مکمل ہونے پر۔ ہم نے کہا ہے کہ اللہ کا قول 'اُذْكُرُوا' (یاد کرو) اس میں مضمر ہے اس لیے کہ خداوند عالم نے اس سے

قبل ارشاد فرمایا ہے: يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ۔ یہاں پر گذشتہ آیات پر معطوف ہے اور یہ چالیس راتیں وہ ہیں جن کا ذکر خداوند عالم نے سورۂ اعراف میں بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَوٰعَدۡنَا مُوۡسٰى ثَلٰثِيۡنَ لَيۡلَةً وَّاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِيۡقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۴۲) (اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ لیا اور اس میں دس کا اور اضافہ کر دیا) جو ماہ ذی القعدہ اور ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں۔

مفسرین نے بیان کیا کہ جب بنی اسرائیل سمندر سے نجات پانے اور فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد مصر واپس آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ توریت اور شرائع (شریعت کے قوانین) نازل کرے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو ان پر اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ وہ کوہ طور پر چالیس راتیں مقیم رہے اور ان پر توریت بصورت الواح نازل کی گئی۔

ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ، تم نے بچھڑے کو الٰہ بنالیا اس لیے کہ وہ فقط بچھڑے کی شکل وصورت بنانے سے ظالم نہیں ہوئے اس فعل کی ممانعت بھی نہیں تھی بلکہ فعل مکروہ تھا۔ روایت میں جو مصوروں پر لعنت کی گئی ہے اس سے مراد ہے کہ جو اللہ کی تشبیہ اس کی مخلوقات سے دیتے ہیں یا اس سے کا عقیدہ رکھے کہ یہ اللہ کی شکل اور صورت ہے۔

ارشاد الٰہی: مِنۡۢ بَعۡدِهٖ، یعنی موسیٰ کی غیبت اور ان کے خروج کے بعد۔ بیان کیا گیا ہے: اللہ کا تم سے توریت میں وعدہ کرنے کے بعد۔ نیز بیان کیا گیا ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد جو کچھ تم نے نشانیاں دیکھیں تمام احتمالات ہیں۔

وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ، تم نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اس عذاب کے ذریعہ جس کے تم بچھڑے کو الٰہ بنا کر مستحق ہو گئے تھے۔

واقعہ

ابن عباس سے روایت ہے کہ سامری اہل باجومی میں سے ایک شخص تھا۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام میخا تھا۔ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ اس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا اور وہ گائے کی پرستش کرنے والی قوم سے تھا۔ اس کے دل میں گائے کی پرستش کی محبت تھی۔ بنی اسرائیل میں اس نے اسلام کا اظہار کیا۔ موسیٰؑ نے جب اپنے

پروردگار کی بارگاہ میں جانے کا قصد کیا اور بنی اسرائیل میں ہارون کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ہارون نے اپنی قوم سے کہا تم اپنے ہمراہ قوم کی زینت کے آلات لیکر آئے ہو انھیں پاک کرو سب نجس ہیں۔ یعنی انھوں نے قبطیوں سے زیورات لیے تھے۔ جناب ہارونؑ نے کہا: اپنے آپ کو ان سے پاک کرو یہ سب نجس ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے آگ روشن کی گئی، کہا جو کچھ بھی تمھارے پاس آگ میں ڈال دو چنانچہ اس طرح کے آلات اور زیورات ان کے پاس موجود تھے اسے آگ میں ڈال دیا (ابن عباس بیان کرتے ہیں) سامری جبرئیلؑ کی سواری کا نشان دیکھ چکا تھا اور اس نے گھوڑے کے کھر کے نیچے کی مٹی اٹھالی تھی وہ لے آیا، آگ کے قریب گیا اور جناب ہارون سے کہنے لگا: اے نبی خدا! جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے اسے آگ میں ڈال دوں؟

حضرت ہارون نے اجازت دے دی۔ بظاہر وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے ہاتھ میں کیا چیز ہے، ان کا خیال تھا دوسروں کے مانند آلات اور زیورات ہوں گے۔ اس نے وہ مٹی آگ میں ڈال دی اور کہا: آواز والا بچھڑا بن جا! یہ ان کے لیے آزمائش اور فتنہ تھا۔ کہنے لگا یہ تمھارا اور موسیٰ کا اللہ ہے۔ تمام لوگ اس کے اردگرد جمع ہو کر اس سے شدید محبت کا اظہار کرنے لگے۔ ایسی محبت کہ کسی سے اس طرح کی محبت نہیں کی تھی۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ ان کے لیے آزمائش اور فتنہ تھا اور اس پر انھوں نے کچھ اضافہ نہیں کیا۔ حسن نے کہا ہے: بچھڑا گوشت اور خون کا بن گیا۔ ان کے علاوہ بعض حضرات نے کہا: یہ ممکن نہیں ہے اس لیے کہ یہ انبیاء کا معجزہ ہے جس نے حسن کی تائید کی ہے اس کا کہنا ہے فرشتہ کی (مٹی) کا اثر ہے اللہ نے اس میں یہ عادت جاری فرمائی ہے اسے جس شکل میں بھی قرار دیا جائے وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ یہ معجزہ نہیں ہے اور جس نے بچھڑے کے زندہ ہونے کو ممکن نہیں سمجھا ہے اس نے بچھڑے کی آواز کی تاویل اس طرح کی ہے کہ سامری نے ایسا بچھڑا بنایا تھا جس میں سوراخ تھے جس میں ہوا داخل ہوتی اور خارج ہوتی تھی، جس سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ سامری نے لوگوں کو اس کی عبادت کے لیے بلایا جسے انھوں نے قبول کیا اور عبادت کی۔ یہ روایت ابوعلی الجبائی سے ہے۔

❀❀❀❀❀

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

مگراس کے بعد ہم نے تمھیں معاف کر دیا کہ شاید اب تم شکر گذار بن جاؤ۔

الفاظ و معانی:

عَفْو، صَفْح، مَغْفِرَۃ، تَجَاوُز ایک جیسے ہیں یعنی معاف کرنا۔ انباری نے بیان کیا ہے: عَفَى اللّٰهُ عَنْكَ. یعنی اللہ نے تمھارے گناہ محو کر دیئے۔ یہ چیز عربوں کے اس محاورہ سے حاصل کی گئی ہے: عَفَتِ الرِّيْحُ الْاَثَرَ اِذَا دَرَسَتْهُ وَ مَحَتْهُ. عرب یہ فقرہ اس وقت کہتے ہیں جب ہوا کسی چیز کو ختم کر کے اس کے آثار مٹا دیتی ہے۔ اللہ کا معاف کرنا بندے سے اس کے گناہوں کا محو کر دینا ہے۔

رمانی نے بیان کیا ہے: عفو کے حقیقی معنی ترک کے ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۸) (ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا برادر ایمانی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو) یعنی ترک کر دے، عفو کے معنی عذاب کا ترک کرنا ہے۔ عفو حلال اور پاکیزہ مال ہے۔

عَافِيَة کے معنی اللہ کا بندے سے دفاع کرنا ہے۔ شکر کے معنی تعظیم و احترام کے ساتھ اعتراف نعمت ہے۔

تفسیر:

اسے بھی معاف کر دیا

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ (مگر اس کے بعد ہم نے تمھیں معاف کر دیا) یعنی تم بچھڑے کی پوجا کر کے جس عذاب کے مستحق ہو گئے تھے ہم نے تمھاری توبہ قبول کر کے تم سے اس عذاب کو اٹھا لیا۔ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ، تمھارا اس کو الٰہ قرار دینے کے بعد۔ بیان کیا گیا ہے تمھارے بچھڑے کے الٰہ قرار دینے کے بعد تم پر جلد عذاب کرنے کو ترک کر دیا۔

شکر

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، تاکہ تم اس (اللہ) کے درگذر کرنے اور جملہ نعمتیں عطا کرنے پر اس کا شکر کرو۔

کہا گیا ہے کہ اس کے معنی تعریض کے ہیں یعنی ہم نے تمھیں شکر کی معرفت عطا کی۔ اس آیت میں شکرِ نعمت کے وجوب پر دلالت ہے اور یہ کہ توبہ کے بعد گناہ سے عفو و درگذر بندوں پر اللہ کی نعمت ہے تاکہ وہ

اس کا شکر ادا کریں۔ اللہ کے بارے میں ہمارے یہ کہنا کہ "اِنَّہٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ" ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم بندے کو اپنی اطاعت پر اس کے حق میں کسی چیز کی کمی کیے بغیر جزا دیتا ہے۔ اطاعت پر جزا کو بطور شکر قرار دینا لغت میں مجازی اعتبار سے ہے۔

انسان اپنے آپ شکر کا مستحق نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو نعمت عطا نہیں کرتا لہٰذا نعمت کے شکر کا تقاضا کرتی ہے جو مُنْعَمْ عَلَیْہِ (جس کو نعمت عطا کی گئی ہے) کے علاوہ ہے۔ کبھی انسان کا ذات پر احسان کرنا صحیح ہوتا ہے جس طرح نفس کے ساتھ برائی کرنا ہے اس لیے کہ احسان حُسن سے ہے جب انسان اچھا کام کرتا ہے کہ جس سے استفادہ کرے تو وہ اپنے نفس کا محسن ہوتا ہے اس فعل کی نسبت سے اور جب فعل قبیح (برا فعل) انجام دیتا ہے کہ جس سے نقصان وضرر ہو تو نفس کے ساتھ برا کرنے والا ہوتا ہے جس سبب سے مومن شکر کا مستحق ہوتا ہے، کافر شکر کا مستحق نہیں ہوتا اس لیے کہ مومن جلالت وعظمت کے سبب شکر کا مستحق ہوتا ہے جبکہ کافر ایسا نہیں ہوتا اس کے لیے نعمت کی مکافات (احسان کا احسان سے یا اس سے زائد چیز سے بدلہ دینا) واجب ہے تعظیم کے بغیر۔ شکر اور مکافات کے درمیان فرق یہ ہے کہ مکافات مساوی اور برابری کے معنی میں ہے جب کہ شکر ایسا نہیں ہے۔ نعمت کی مکافات میں اس بات پر دلالت ہے کہ اس کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے کبھی شکر اس سے کم ہوتا ہے اگر چہ منعم علیہ پر اس سے بیشتر نہیں ہوتا مگر یہ کہ جس قدر شکر میں اضافہ ہوگا نعمتوں میں اضافہ اسی خوبی کے ساتھ ہوگا۔ اگر چہ یہ ضروری نہیں ہے اس لئے کہ واجب ایک حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر جیسا ہے۔ شکر چاہے جتنا زیادہ کیا جائے گا پھر بھی وہ کسی ایسی حد تک نہیں پہنچے گا کہ جس کے بعد اس میں اضافہ ممکن نہ ہو۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾
اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کیا تا کہ تم (اس کے ذریعہ سے) راہ ہدایت پاسکو۔

الفاظ ومعانی:

فُرْقَان مصدر ہے۔ یعنی دو چیزوں کے درمیان تفریق (امتیاز قائم کرنا) ہے۔ ہر فرق کرنے والی چیز کو

فرقان کہتے ہیں جس طرح کتاب خدا (قرآن) کوحق و باطل میں فرق (اور امتیاز) کرنے کے سبب فرقان کہتے ہیں۔ اللہ نے روز بدر کو فرقان کہا ہے چونکہ اس دن حق و باطل کے درمیان امتیاز کیا گیا۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا. (یعنی اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے اور تمھارے گناہوں کے درمیان (جدائی اور علیحدگی) پیدا کردے گا)

تفسیر:

کتاب اور فرقان

(اور یاد کرو) وَاِذۡ اٰتَیۡنَا ، جب ہم نے عطا کیا، مُوۡسَی الۡکِتٰبَ، موسیٰ کو کتاب اور وہ تورات ہے وَالۡفُرۡقَانَ، اور فرقان۔ کتاب اور فرقان کے سلسلہ میں متعدد وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: ابن عباس کا قول ہے کہ فرقان سے بھی مراد تورات ہے۔

دوم: کتاب سے توریت مراد ہے، فرقان (سمندر) میں شگاف ڈالنا مراد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا۔

سوم: فرقان سے حلال و حرام، اور جناب موسیٰؑ اور آپ کے مومنین اصحاب، فرعون اور اس کے کافر ساتھیوں کے درمیان فرق مراد ہے جو بیشتر چیزوں میں ہے جن میں موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نجات اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کا غرق ہونا ہے۔

چہارم: فرقان سے مراد قرآن ہے جس کو اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے: ہم نے موسیٰ کو تورات عطا کی اور محمدؐ کو فرقان عطا کیا۔ آیت میں مجازی طور پر فرقان سے قرآن مراد لینا ضروری نہیں ہے۔ جبکہ خداوند عالم نے خبر دی ہے کہ موسیٰ کو فرقان عطا کیا گیا اس کا ارشاد ہے: وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی وَ ھٰرُوۡنَ الۡفُرۡقَانَ (اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان عطا کیا)

ارشاد (خدا): لَعَلَّکُمۡ تَھۡتَدُوۡنَ (تا کہ تم اس کے ذریعہ سے راہ ہدایت پا سکو)، تا کہ تم تورات میں موجود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت اور ان کے بارے میں بیان کردہ اوصاف سے ہدایت حاصل کرو۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے لوگو! تم نے گوسالہ پرستی کر کے اپنے نفسوں پر ظلم ڈھایا ہے تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اپنی جانوں کو ہلاک کر ڈالو اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے۔ پھر اس نے تمھاری توبہ قبول کر لی، بے شک وہی توبہ کا قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

قرائت:

ابوعمر نے بَارِئِكُمْ، يَأْمُرُكُمْ اور يَنْصُرُكُمْ کو اختلاس (امالہ) حرکت کے ساتھ قرائت کی ہے اور انھیں سے سکون کی بھی روایت کی گئی ہے اور بقیہ قراء نے بغیر اختلاس (امالہ) وتخفیف کے قرائت کی ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: حروف معجم کی دو قسمیں ہیں: ساکن ومتحرک۔

ساکن کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) جس کی اصل استعمال میں سکون ہے۔

(۲) جس کی اصل حرکت ہے۔

جس کی اصل حرکت ہے دو طرح سے ساکن ہوتا ہے:

(۱) حرکت مبنی کی حرکت ہو۔

(۲) حرکت معرب کی حرکت ہو۔

مبنی کی حرکت دو طرح سے ساکن ہوتی ہے:

(۱) حرف ساکن کلمہ مفرد میں ہو جیسے: فَخِذٌ، سَبُعٌ، اِبِلٌ، عُلِمَ، جس نے تخفیف کی ہے اس نے: فَخْذ، سَبْع، اِبْل، ضُرْب، عُلْم کہا ہے۔

(۲) حرف ساکن دوکلموں میں ہوتو منفصل کو متصل سے تشبیہ کی بنا پر ساکن کر دیا جاتا ہے جیسے اس شخص کی قرائت کہ جس نے یَخْشَی اللہَ وَ یَتَّقْہِ پڑھا ہے۔اسی کے مانند عجاج کا یہ قول ہے: فَبَاتَ مُنْتَصِباً وَّ مَا تَکْرْدَسَا۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ یَتَّقِہِ سے تَقِہ کَتِف کے مانند ہے۔اسی سے شاعر کا یہ شعر ہے:

قَالَتْ سُلَیمیٰ اشْتَرْ لَنَا سُوَیْقا۔

سلیمیٰ نے مجھ سے کہا کہ ہمارے کے سویق کی خریداری کرو۔

ہم نے عربوں اور نحویوں کی بول چال میں جو مثالیں ذکر کی ہیں ان میں مبنی کی حرکت کو ساکن کرنے کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن معرب کی حرکت کو ساکن کرنے کا جواز کے سلسلہ میں اختلاف ہے کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر معرب کے لئے علم ہوتو اس کی حرکت کو سکون سے بدلنا جائز نہیں ہے لیکن سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور دونوں قبیلوں (مبنی و معرب) کے درمیان فرق نہیں ڈالا ہے اور امرؤالقیس کے اس شعر کو نقل کیا ہے:

فَالْیَوْمَ اشْرَبْ غَیْرَ مُسْتَحْقَبٍ اِثْمًا مِّنَ اللہِ وَ لَا وَاغِلٍ

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

وَقَدْ بَدَا ھَنْكِ مِنَ الْمَیْزَرِ

اسی طرح جریر کا یہ شعر ہے۔

سِیْرُوْا بَنِی الْعَمِّ فَالْاَھْوَازُ مَنْزِلُکُمْ وَ نَھْرُ تِیْرِیْ لَا تَعْرِفُکُمُ الْعَرَبُ

اے میرے چچازاد بھائیوں سفر کرو کہ اہواز اور نہر تیری تمہاری منزل ہے اور تمھیں عرب نہیں پہنچاتے۔

سیبویہ نے معرب پر داخل ہونے والے حرکات کو مبنی پر داخل ہونے والے حرکات سے مشابہ قرار دیا ہے جیسا کہ علماء نے مبنی کی حرکات کو معرب کے حرکات کے مشابہ قرار دیا ہے۔اسی لئے رُدّ، فِرّ، اور عَضّ وغیرہ میں ادغام کیا ہے جس طرح یَرُدُّ، یَفِرُّ، اور یَعَضُّ میں ادغام کیا ہے۔

جان لیجئے کہ اعراب و بناء (معرب و مبنی) کے حرکات کہ ان کے ضمہ اور کسرہ میں کبھی کبھی اختلاس (امالہ) اور تخفیف کا استعمال کرتے ہیں۔لیکن فتحہ کہ اس میں صرف اشباع نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں تخفیف ہوتی ہے جیسے جَبَل، جس طرح سبع، کتف میں تخفیف کی تھی۔

اسی نظریہ پر سیبویہ نے ابوعمرو کے قول اِلٰی بَارِئِكُمْ کو حمل کیا ہے وہ اس بات کا قائل ہوا ہے کہ اس نے حرکت میں اختلاس کیا ہے، اشباع نہیں کیا ہے پس وہ حرف متحرک کے وزن پر ہے۔

جنہوں نے ابوعمرو سے ساکن کرنے کی روایت کی ہے تو شاید انہوں نے اختلاس سنا ہوا ہو اور اسکان سمجھا ہو۔ آواز کے کمزور اور پوشیدہ ہونے کی بنا پر۔ اسی طرح اس کا قول ولا ءامرکم وغیرہ بھی ہے۔

الفاظ و معانی:

بَارِئ کے معنی خالق اور صانع کے ہیں۔ باری اور خالق کے درمیان فرق سے مبدی اور محدث (یعنی خلقت کا آغاز اور عالم وجود میں لانے والا) مراد ہے۔ خالق تقدیر کرنے والا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرنے والا۔ لیکن اس کا ارشاد: اَنَا بُرَاءُ یہ بریٌٔ کی جمع ہے اصل معنیٰ کسی چیز کا (دوسری) چیز سے جدا کرنا ہے اسی سے بَرِئَ اللّٰهُ الْخَلْقَ، (اللہ نے مخلوق کو خلق کیا) ہے۔ یعنی اسے عدم سے وجود بخشا۔

قَتْل، ذَبْح، مَوت ایک جیسے ہیں البتہ قتل اور ذبح کے درمیان فرق ہے کہ قتل کے معنی زندگی کی بنیاد کو منہدم کر دینا ہے اور ذبح کے معنی گردن کی رگوں کا قطع کرنا ہے۔

ترکیب:

یَاقَوْمِ میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا یہی مختار و منتخب ہے اس لئے کہ قَوْمِ منادی مضاف ہے اور نداء باب حذف ہے پس یاء کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ وہ حرف واحد ہے اور اسم کے آخر میں ہے جس طرح تنوین اسم کے آخر میں ہوتی ہے اور کسرہ باقی رہ گیا ہے تاکہ یاء محذوف پر دلالت کرے جب یاء اضافت کو غیر ندا میں حذف کر دیا جاتا ہے تو نداء میں حذف کرنا لازم ہے۔

اس کلام میں چار صورتیں ممکن ہیں:

(۱) یَا قَوْمِ جیسا کہ پڑھا گیا ہے اور غیر قرآن میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ قرأت قابل اتباع سند ہے۔

(۲) یَا قَوْمِیْ بھی جائز ہے کہ یاء کو ثابت اور ساکن رکھا جائے۔

(۳) یَا قَوْمِی، یاء کو باقی رکھا جائے اور اسے تینوں حرکتیں دی جائیں: یَا قَوْمِیِ، یَا قَوْمِیُ، یَا قَوْمِیَ

(۴) یَاقَوْمُ بھی جائز ہے اس لئے کہ یہ منادی مفرد ہے۔

لیکن یہ آیت کہ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ تو اس میں یاء ثابت ہے اس لئے کہ اس سے کوئی ایسی چیز ملحق نہیں ہوتی ہے جو یاء کے حذف کا باعث ہو جس طرح نداء میں ملحق ہوتی تھی۔

تفسیر:

گوسالہ پرستی کی سزا

اور یاد کرو، وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ (جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ ان کی جانب واپسی کے وقت) جنھوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی، یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور بچھڑے کی پرستش کر کے عبادت کو غلط جگہ رکھا۔ ان کا اپنے اوپر ظلم ان کا اپنے اوپر وہ عمل تھا کہ جس کے کرنے پر وہ عذاب کے حقدار بن گئے۔ اسی طرح گناہ کرنے والا ہر آدمی اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے، فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ (پر تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو)، یعنی اطاعت و توحید کے ذریعہ اپنے خالق اور وجود میں لانے والے کی طرف رجوع کرو۔ خداوند عالم نے ان کی توبہ کو عزم محکم کے ساتھ ندامت اور اپنے آپ کو قتل کرنا قرار دیا ہے۔

یہاں اختصار و اضمار ہے گویا جب ان سے کہا گیا: اپنے خالق کے حضور توبہ کرو تو انھوں نے کہا: کس طرح توبہ کریں؟ تو ارشاد ہوا: فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم میں سے بعض بعض کو قتل کرے، بے گناہ مجرم کو قتل کرے۔ یہ روایت ہے ابن عباس، سعید بن جبیر اور مجاہد وغیرہ سے یہ فرمان الٰہی اس آیت کریمہ کے مانند ہے کہ: فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً (سورۂ نور، آیت ۶۱) (جب بھی گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو یہ اللہ کی جانب سے ایک تحفہ ہے بابرکت اور پاکیزہ) (جب تم گھروں میں داخل ہو تو خود اپنے نفسوں پر سلام کرو یعنی بعض بعض کو سلام کرے)

اور کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ قتل کے لیے تیار ہو جاؤ، ان کے قتل کے لیے خود سپردگی کو ان کے اپنے آپ کو قتل کیے جانے کو مجازاً کہا گیا ہے۔ یہ روایت ابن اسحاق سے ہے۔ جسے جبائی نے اختیار کیا ہے۔

مَامُوْر بِالْقَتْل (جن لوگوں کو قتل کا حکم دیا گیا تھا) ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ جناب موسیٰؑ نے انھیں دو صفوں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا کہ وہ غسل کریں اور کفن پہنیں، ہارون بارہ

ہزار ایسے لوگوں کو لے کر آئے جنھوں نے بچھڑے کی پرستش نہیں کی تھی، جن کے پاس تیز تلواریں تھیں جو انھیں قتل کرنے لگے۔ جب ستر ہزار قتل کر دیے گئے تو اللہ نے باقی لوگوں کی توبہ قبول کر لی اور قتل ہو جانے والوں قتل کو ان کے لئے شہادت قرار دی۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو ستر لوگ موسیٰؑ کے ہمراہ طور پر تھے انھوں نے بچھڑے کی پرستش کرنے والے ستر ہزار لوگوں کو قتل کیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ دو صفوں میں کھڑے ہو گئے اور بعض نے بعض کو نیزے مارے یہاں تک کہ ستر ہزار قتل کر دیے گئے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان پر شدید تاریکی چھا گئی اور بعض نے بعض کو قتل کرنا شروع کر دیا جب تاریکی چھٹ گئی تو ستر ہزار لوگ قتل ہو چکے تھے۔

روایت کی گئی ہے کہ جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ کھڑے ہو کر اللہ سے دعا اور اس کے حضور تضرع و زاری کر رہے تھے اور وہ (سب) ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ قتل کی برطرفی کی وحی نازل ہوئی اور باقی لوگوں کی توبہ قبول ہو گئی۔

ابن جریج نے بیان کیا ہے: ان کے قتل کیے جانے کا سبب جب کہ خداوند عالم ان میں سے بچھڑے کی پرستش نہ کرنے والوں کے متعلق جانتا تھا یہ ہے کہ وہ اپنے قتل کے خوف سے انھیں اس فعل سے نہیں روکتے تھے جبکہ وہ جانتے تھے بچھڑے (کی پرستش) باطل ہے۔

اسی سبب خداوند عالم نے انھیں بعض کو بعض کے قتل کرنے کی آزمائش میں مبتلا کیا اور عظیم معجزات اور آیات کے بعد ان کے کفر کے سبب اللہ نے انھیں اس سخت آزمائش میں مبتلا کیا۔

رمانی نے کہا ہے: قتل کا حکم دیئے جانے میں ان کے لئے اور دوسروں کے لئے ضروری لطف تھا جس طرح قاتل کے اِسْتِسْلَام (قبول اسلام) میں اس کے لئے اور دوسروں کے لیے لطف ہو سکتا ہے اور ان پر کوئی تکلیف نہ ہو قتل کے بعد۔ گذشتہ پر لطف نہیں ہوتا نہ ہی اس کے مقارن (متصل) پر ہوتا ہے۔

جواب اس طرح ہے: جب قوم کو حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں تو ان میں سے ہر ایک کا ارادہ دوسرے کو قتل کرنے کا ہوگا ممکن ہے اس کے بعد ایک بچ جائے پس اس طرح یہ اس کے لیے لطف ہوگا جو بچ جائے گا چاہے وہ اتنے ہی وقت کے لیے ہو جس میں وہ واجب انجام دے سکے اور خود کو قبیح سے روک سکے جیسا

کہ آپ ہماری عبادتوں میں مشرکین سے قتال (وجہاد) کے متعلق کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں پابند بنایا ہے کہ ہم ان سے قتال کریں یہاں تک کہ ہم انھیں قتل کر دیں یا خود قتل کر دیے جائیں۔

اسی طرح سیرت نگاروں نے کہا ہے: جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی انھیں پابند (مکلف) بنایا گیا تھا کہ وہ قتل پر صبر کریں یہاں تک کہ بعض بعض کو قتل کر دیں، قتل ہو جانے والے کے لیے شہادت ہے اور باقی ماندہ کے لیے توبہ ہے۔ یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے اگر انھیں خود کو اپنے ہاتھوں قتل کیے جانے کا حکم دیا جائے اگر یہ صحیح ہے تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی طرح زخمی کر لیں جو ان کی موت کا باعث بن جائے، اگر اس طرح اس کی عقل زائل نہ ہو۔ البتہ دوسرے قول کی بنا پر انھیں قتل کے لیے تسلیم ہونے اور اس پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا کوئی مسئلہ نہیں ہے اس لیے انھیں جو خود کو قتل کیے جانے کا حکم دیا گیا اس طرح ان کا قتال حسن (بہتر) ہوگا اس لیے کہ اگر یہ فعل قبیح ہوتا تو اس کو قبول کرنے کا حکم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ نبی یا امام کے لیے خود کو قتل کے لیے تسلیم خود سپرد کر دینا جائز نہیں ہے جب وہ اپنے دفاع کی قدرت و طاقت رکھتے ہوں اور اپنا دفاع نہ کریں اس لیے کہ اس میں دفاع کی قدرت کے باوجود قبیح کے لیے خود سپردگی ہے لہٰذا جائز نہیں ہے، اس طرح انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کا قتل دفاع کے امکان برطرف ہونے پر واقع ہوتا ہے مگر یہ کہ اس بارے میں دفاع اور تحمل مشقت پر صبر کرنے میں ممانعت نہیں ہے اور دوسروں کو قتل کرنا ظلم ہے۔ اگرچہ قتل کا حکم دینا عقل کے اعتبار سے قبیح (برا) ہے اور اس کا تبدیل و تغیر ہونا جائز ہے کہ وہ (فعل) حَسَن ہو جائے، یہ تمام آلام و تکالیف میں جاری ہے لیکن جہل اور کذب میں جاری نہیں ہے کہ وہ ہرگز حسن (اچھا) نہیں ہو سکتا اور قتل میں وجہ حسن ہونا کہ وہ لطف ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی جانب سے ممکن ہے کہ وہ زندہ کو مار دے، اسی طرح اس کے لیے ہمیں (دوسروں) کو مارنے کا حکم دینا اور ان پر پیش آنے والے تکالیف کا عوض و بدلہ دینا ممکن ہے، اس میں لطف ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

اس ارشاد: ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ، (اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے) یہ قتل کے ساتھ توبہ کی جانب اشارہ ہے جیسا کہ خدا نے حکم دیا ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: فَتُوبُوٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ، ارشاد فَتُوبُوٓا توبہ پر دلالت ہے جو مذکور ہے۔

فَاقْتُلُوٓا، قتل پر دلالت کر رہا ہے توبہ اور قتل نفس اللہ کی رضا سے ہے جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اگرچہ اس میں عظیم مشقت ہے تمھارے لیے تمھارے خالق کی طرف سے خیر ہے تمھاری دنیاوی زندگی میں اس لیے

کہ دنیاوی زندگی کو بقا نہیں بلکہ فنا ہونے والی ہے اور تم زندگی کے بعد شدید عذاب میں مبتلا ہو گے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو حکم خدا کے مطابق قتل کیا تو جلد ہی قتل کی مشقت ختم ہو جائے گی اور تم دائمی نعمتوں میں رہو گے جو فنا ہونے والی نہیں۔ ''بَارِئِكُمْ'' کا ذکر اس کی عظمت کے پیش نظر مکرر ہوا ہے اس کے سبب جو انہیں عطا کیا گیا ہے کہ وہ ان تمام کا خالق ہے۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ. یہاں پر اضمار (و پوشیدہ) ہے جس کی تقدیر ہے تم نے وہ کیا جس کا حکم دیا گیا تھا، تو تمھاری توبہ قبول ہوئی یا تم نے اپنے نفسوں کو قتل کیا اس لئے تمھاری توبہ قبول کر لی گئی۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ. یعنی اپنے بندوں کی بار بار توبہ قبول کرنے والا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ گناہان کبیرہ پر توبہ کا قبول کرنے والا ہے۔

الرَّحِيْمُ جب تم توبہ کرو گے تو وہ تم پر رحم کرے گا اور جنت میں داخل فرمائے گا۔ اس آیت میں دلالت ہے کہ ندامت کے علاوہ کوئی ایسی بھی شرط ہے جس کے بغیر توبہ درست نہیں ہے جیسا کہ قتل کے متعلق حکم دیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور یاد کرو وہ وقت جب تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم تمھاری بات کا یقین نہ کریں گے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ تو تمھارے دیکھتے ہی دیکھتے بجلی نے تم کو آ لیا۔

الفاظ و معانی:

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ. یعنی ہم آپ کی تصدیق نہیں کریں گے۔ آمَنَ بِهٖ وَ آمَنَ لَهٗ دونوں بولا جاتا ہے اللہ کے اس ارشاد کی دلالت کی بنیاد پر: قَالَ فِرْعَوْنُ آمَنْتُمْ بِهٖ۔

رُؤْيَة کے معنی بصارت کے ذریعہ ادراک کرنا ہے۔ پھر یہ لفظ علم کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

جَهْر، عَلَامَة، مُعَايَنَة باہم مشابہ ہیں۔

كَلَامٌ جَهِيْرٌ وَّ صَوْتٌ جَهِيْرٌ (یعنی بلند کلام اور بلند آواز) جَھر کی ضد سِرّ ہے۔

صَاعِقَةٌ کے تین اقسام ہیں:

ا۔ آسمان سے بجلی گرنا جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ (سورۂ رعد، آیت ۱۳) (وہ بجلیاں بھیجتا ہے اور جس پر چاہتا ہے انھیں گرا دیتا ہے)

۲۔ موت جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَات، (سورۂ زمر، آیت ۳۹) (تو آسمان کے تمام ساکنین غش کھا کر موت کی آغوش میں چلے جائیں گے) یا فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ (سورۂ بقرہ، آیت ۵۵) (پس تمھیں موت نے آلیا)

۳۔ عذاب جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُودَ (سورۂ فصلت، آیت ۱۳: میں تم کو ایسے اچانک آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا)

ترکیب:

حَتّٰى نَرَى لفظ حَتّٰى اِلٰی کے معنیٰ میں ہے اور اسم کو جر دینے والا ہے۔ نَرٰی حتیٰ کے بعد منصوب ہے اَن کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جس طرح لام کے بعد اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر فعل منصوب ہوتا ہے۔ اَنْ فعل کے ساتھ تاویل مصدر میں چلا جاتا ہے اور حَتّٰی کی وجہ سے محلاً مجرور ہو جاتا ہے۔ جار و مجرور محلاً منصوب ہیں اس لئے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ کا مفعول ہیں اور جَهْرَةً مصدر ہے جسے حال کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے۔

تفسیر:

عجیب وغریب مطالبہ

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ (یاد کرو جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ!) یعنی ہم ہرگز آپ کی باتوں کی تصدیق نہیں کریں گے کہ آپ پیغمبر ہیں۔ حَتّٰى نَرَى اللهَ جَهْرَةً (جب تک کہ ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں) اور وہ ہمیں بتا دے کہ آپ نبی ہیں جنہیں مبعوث کیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ہم سے جو صفات باری عز اسمہ بتا رہے ہیں ہم ہرگز اس کی تصدیق نہیں کریں گے کہ کون سی بات اس کے لئے ممکن ہے اور کون سی ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اللہ کو اپنی

آنکھوں سے نہ دیکھ لیں یعنی علانیہ اور ظاہر بہ ظاہر آپ ہمیں اس بارے میں باخبر کیجئے۔

بیان کیا گیا ہے: جب جناب موسیٰؑ الواح (تختیاں) لیکر آئے جن پر توریت مرقوم تھی، تو لوگ کہنے لگے ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے جب تک ہم اسے عینی طور پر نہ دیکھ لیں۔

بعض نے کہا ہے: اس کا ارشاد: جَهْرَةً موسیٰ سے ان کے خطاب کی صفت ہے جس کے ذریعہ انھوں نے اسے ظاہر کیا اور اس کا اعلان کیا جس کی تقدیر ہے: اگر تم ظاہر بظاہر کہو گے ہم ہرگز آپ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ خدا کو دیکھ لیں۔ قول اول زیادہ قوی ہے۔

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ (تمہیں بجلی نے آلیا) یعنی موت آگئی، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، درآنحالیکہ تم موت کو دیکھ رہے تھے اور کہا گیا ہے کہ تم آتش جہنم کو دیکھ رہے تھے۔

خداوند عالم نے یہودیوں کو ان کے بزرگوں کے سوال رؤیت کے سبب اس اعتبار سے کہ انھوں نے پیغمبر کی مخالفت میں انھیں کا راستہ اختیار کیا تھا حالانکہ ان پر انبیاء کرام کا اتباع واجب تھا اور ہر اس چیز کی تصدیق لازمی تھی جو موسیٰؑ کو عطا کی گئی تھی مگر ان یہودیوں نے اپنے بزرگوں کی عادت کو جاری رکھا جو کبھی تو اپنے پیغمبر سے مطالبہ کرتے کہ وہ ان کے لیے اللہ کے علاوہ الٰہ بنا دیں، کبھی اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کی پرستش کرتے، کبھی کہتے کہ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خداوند عالم کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔

ابوالقاسم بلخی نے اس آیت سے خدا کی رؤیت کے محال ہونے پر دلیل پیش کی ہے، ان کا کہنا ہے: فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً. (سورۂ نساء، آیت ۱۵۳) (تو انھوں نے موسیٰ سے اس سے زیادہ سنگین مطالبہ کیا تھا کہ انھوں نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہمیں خدا کو علانیہ طور سے دکھلا دیں) یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ اس سے دونوں باتوں کا انکار مراد ہے۔ اسی طرح یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ جناب موسیٰؑ کا یہ کہنا کہ: رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (سورۂ اعراف، ۱۴۳) (میرے پروردگار تو مجھے اپنا جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار کروں) اپنی قوم کی خاطر تھا اس لیے کہ اہل توریت کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جناب موسیٰؑ نے فقط ایک ہی مرتبہ رؤیت خدا کا مطالبہ کیا تھا وہ بھی اپنی قوم کی خاطر تھا۔

❀❀❀❀❀

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کیا کہ شاید تم شکر گذار بن جاؤ۔

الفاظ و معانی:

بَعَثَ کے معنی کسی چیز کا اس کی جگہ سے اٹھانا ہے، اسی وجہ سے روز قیامت کو یوم بعث کہا جاتا ہے چونکہ اس دن لوگوں کو حساب کے لئے ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ وَبَعَثۡتُهٗ مِنۡ نَوۡمِهٖ میں نے اسے نیند سے اٹھایا یعنی بیدار کیا تو وہ بیدار ہو گیا۔ بعث کے حقیقی معنیٰ ارسال یعنی بھیجنے کے ہیں۔

تفسیر:

پھر زندہ کر دیا

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ پھر ہم نے تمھیں زندہ کیا، مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ، (تمھاری موت کے بعد) تمھاری مدت حیات کی تکمیل کے لیے۔ یہ حسن اور قتادہ سے کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: انھوں نے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد دعا کی کہ پیغمبروں کو مبعوث کیا جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ یہ سُدی کا قول ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تمھارے پاس انبیاءؑ بھیجے۔ چند کے علاوہ تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ نے جناب موسیٰؑ کو موت نہیں دی تھی جس طرح ان کی قوم کو موت دی تھی بلکہ ان پر غشی طاری ہو گئی تھی جس پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کر رہا ہے: فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۴۳) (جب انھیں افاقہ ہوا تو کہا: پروردگار تو پاک ہے میں تیری جناب توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں) افاقہ غشی کے بعد ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ، تا کہ تم اللہ کا شکر اس نعمت پر ادا کرو کہ تمھاری زندگی تمھیں واپس پلٹادی۔ آیت میں پیغمبر اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ پر اثبات اور ان مشرکین عرب کے خلاف احتجاج ہے جو دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ انھیں ان کے واقعات کے ذریعہ یاددہانی کرائی جارہی ہے جنھیں خداوند عالم نے دنیا میں دوبارہ بھیجا، اس کی موافقت وہ یہود و نصاریٰ بھی کرتے

ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف تھے۔ ضروری ہے کہ وہ قوم کہ جسے خداوند عالم موت دے دے پھر زندہ کرے تو وہ معرفت خدا پر مجبور و ناچار ہو جس طرح ہم میں سے کوئی آج موت کے وقت اس کی معرفت پر مجبور ہوتا ہے اس دلیل کے ذریعہ کہ خداوند عالم نے انھیں اس دار تکلیف (دنیا) میں فرائض کی ادائیگی اور معرفت کے لیے پلٹا دیا ہے یہ بات ضروری ہوگی بلکہ حاصل شدہ ہوگی البتہ ان کی موت نیند جیسی تھی۔ خداوند عالم نے ان کی روح کو ان کے احوال آخرت کا مشاہدہ کیے بغیر قبض کر لیا تھا اس لیے کہ موت کے بعد زندگی دینے کے علم پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ اس لیے کہ موت کے بعد کی زندگی نہیں ہے مگر ایسی ہی جیسے نیند کے بعد بیدار ہونا اور بے ہوشی کے بعد افاقہ حالانکہ یہ اضطراری علم کا سبب نہیں ہے۔

رجعت کی دلیل

ہمارے علماء نے اس آیت کے ذریعہ رجعت کے ممکن ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔ قائل کا یہ قول باطل ہے کہ رجعت زمانہ پیغمبرؐ کے علاوہ میں ممکن نہیں ہے تاکہ وہ حضورؐ کا معجزہ اور آپؐ کی نبوت پر دلیل ہو بلکہ ہمارے نزدیک اور اکثر امت (مسلمہ) کے نزدیک ائمہ علیہم السلام اور اولیاء کے ذریعہ معجزات کا ظہور ممکن ہے۔ کتب کلام میں اس پر ادلہ موجود ہیں۔

ابوالقاسم بلخی کا کہنا ہے: اعلان کے ساتھ رجعت جائز نہیں ہے اس لیے کہ اس کے ذریعہ دوسری مرتبہ میں توبہ پر بھروسہ کرنے پر فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رجعت کا قائل اس کی نظریہ یہ نہیں کہ تمام لوگ رجعت میں پلٹیں گے کہ توبہ پر اعتماد کرتے ہوئے فریب میں مبتلا کرنا لازم آئے بلکہ کوئی بھی مکلفین میں سے کوئی بھی نہیں ہے مگر یہ وہ ممکن سمجھتا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے گا اور یہ بات از باب زجر و توبیخ ممکن ہے۔

❀❀❀❀❀

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر منّ وسلوی نازل کیا اور تم سے کہا: جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں ان میں سے کھاؤ۔ تمھارے اسلاف نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ وہ درحقیقت خود اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے تھے۔

الفاظ ومعانی:

ظِلَّة، غَمَامَة، سِتْرَة باہم مشابہ ہیں۔ ظِلّ (یعنی سایہ) کی ضد ضحیٰ (یعنی جس وقت آفتاب خوب چڑھا ہوا ہو) ہے۔ ظِلُّ الشَّجَرَة درخت کا سایہ یعنی اس کا پوشیدہ کر دینا، چھپا دینا۔ وَلَا اَزَالَ اللهُ عَنَّا ظِلَّ فُلَانٍ۔ اللہ فلاں کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔ وَيُقَالُ لِسَوَادِ اللَّيْلِ ظِلٌّ رات کی تاریکی کو ظِلّ کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اشیاء کو چھپا دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (سورۂ فرقان، آیت ۴۵) (آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ آپ کے پروردگار نے سایہ کو کیسے پھیلایا ہے) غَمَامَة کے معنی ابر کے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ غَمَام اس بادل کو کہتے ہیں جو سفید ہو، اس میں پانی نہ ہو اور غُمَّة دل کے اوپر غم کے سبب جو پردہ ہوتا ہے، اسے کہتے ہیں۔

مَنّ کے معنی احسان کے ہیں۔ مِنَّة اسم ہے۔ خداوند عالم ہم پر احسان کرنے والا ہے اور ہم پر دائمی رحم کرنے والا ہے۔ مُنَّة کے معنی قوت قلب کے ہیں، حقیقی معنی نیکی کرنے کے ہیں۔ بنی اسرائیل پر جو مَن نازل ہوتا تھا وہ اللہ نے ان پر احسان فرمایا تھا۔

سَلْوٰی بٹیر کے مانند پرندہ تھا۔ اخفش نے بیان کیا ہے: یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے ہے۔ خلیل نے کہا ہے: سلویٰ کا واحد سلواۃ ہے۔

ترکیب:

كُلُوا محلاً منصوب ہے فعل محذوف کی بنا پر گویا اس طرح فرمایا ہے کہ وَقُلْنَا لَهُمْ كُلُوا، اَلسَّلْوٰى

منصوب ہے اس لئے کہ الْمَنَّ پر عطف ہے۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا: یہ بھی اپنے ماقبل سے متصل ہے کہ محذوف کو فرض کیا گیا ہے گویا اس طرح فرمایا: فَخَالَفُوْا مَا اُمِرُوْا بِهٖ وَ كَفَرُوْا هٰذِهِ النِّعْمَةَ وَمَا ظَلَمُوْنَا ۔(انھوں نے جو کچھ حکم دیا گیا تھا اس کی مخالفت کی، اس نعمت کی ناشکری کی اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔

تفسیر:

مختلف نعمتیں

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ. ہم نے تمھارے لیے ابر کو سائبان اور پردہ بنا دیا جو تمھیں آفتاب کی گرمی سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ قول مفسرین کی ایک جماعت کی جانب سے ہے۔ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ (اور ہم نے تم پر مَنّ کو نازل کیا) اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: من وہ ہے جسے لوگ جانتے ہیں۔

دوم: گوند کے مانند ہوتا ہے جو درخت پر آ کر گرتا ہے اس کا ذائقہ شہد کی مانند ہوتا ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

سوم: چوڑی پتلی روٹی مراد ہے۔ یہ وہب کا قول ہے۔

چہارم: ایسی تمام نعمتیں جن کے ذریعہ اللہ نے بندوں پر احسان فرمایا ہے جس میں نہ کوئی زحمت ہو نہ کوئی پریشانی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءٌ لِّلْعَيْنِ۔ سانپ کی چھتری کا تعلق من سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے۔ وَالسَّلْوٰى کہا گیا ہے: سلویٰ بٹیر کے مانند سفید رنگ کا ایک پرندہ ہے، یہ ابن عباس کا قول ہے۔

ارشاد الٰہی: كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں ان میں سے کھاؤ) اس کے معنی ہیں کہ ہم نے ان سے کہا: لذیذ چیزیں کھاؤ۔ بیان کیا گیا ہے کہ مباح و حلال چیزیں کھاؤ۔ بیان کیا گیا ہے کہ مباح وہ ہے جس کا کھانا لذیذ ہوتا ہے۔

اَلَّذِيْ رَزَقْنَاكُمْ جو ہم نے تمھیں رزق دیا ہے یعنی عطا کیا ہے اور اسے تمھارے لیے روزی قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَا ظَلَمُوْنَا (انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا) یعنی انھوں نے کفران نعمت کیا تو ہم نے ان کے کفران نعمت کے سبب ان کی نعمتوں میں کمی نہیں کی۔

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ (بلکہ وہ درحقیقت خود اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے تھے) بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ کسی کی اطاعت اللہ کو فائدہ نہیں پہنچاتی نہ ہی کسی کی نافرمانی خدا کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اطاعت کی منفعت اور فائدہ مطیع و فرماں بردار کی طرف پلٹتا ہے اور معصیت و نافرمانی کا نقصان بھی گنہگار کی جانب ہی پلٹتا ہے۔

واقعہ

بنی اسرائیل پر من وسلویٰ کے نزول کا سبب یہ تھا کہ جب خداوند عالم نے انھیں ایسی وادی میں مبتلا کیا تھا جس میں چلنے والا بھٹک جائے، انھوں نے جناب موسیٰؑ سے کہا تھا: آپؑ اور آپؑ کا پروردگار قتال کرنے کے لیے جائیے ہم تو اسی جگہ بیٹھے ہیں۔ (یہ بات انھوں نے اس وقت کہی تھی) جب انھیں بیت المقدس جا کر عمالقہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا تھا کہ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ... (سورۂ مائدہ، آیت ۲۱) (اے میری قوم والو! تم اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ)

وہ لوگ ایسے صحرا میں پھنس گئے (جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے) وہ جس قدر چلتے (مثلاً) صبح کے وقت پانچ چھ فرسخ سفر کرتے لیکن شام ہوتی تو اسی مقام پر ہوتے جہاں سے چلے تھے۔ اسی طرح ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک مدت گزر گئی اور وہ چالیس برس تک اسی وادی میں رہے۔ اسی صحرا میں جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ کا انتقال ہوا۔ پھر جناب یوشعؑ بن نون آتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خداوند عالم ان لوگوں کو زمین کے جس حصہ تک پہونچتے پھر اسی مقام تک پلٹا دیتا جس مقام سے وہ چلے تھے۔ اس طرح وہ راستہ بھٹک جاتے تھے۔ چونکہ وہ عظیم مخلوق تھے لہٰذا ممکن نہیں ہے کہ سب کے سب اتنی طولانی مدت میں زمین کے اتنے سے حصہ میں راستہ بھٹک جائیں جب انھوں نے اس صحرا میں راستہ پالیا اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے اور آفتاب کی حرارت کا شکوہ کیا تو خداوند عالم نے ان پر ابر کا سایہ کیا اور ان پر ''من وسلویٰ'' نازل کیا۔

طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک ان پر ''من'' نازل ہوتا اور وہ اس میں سے اتنا لے لیتے جو اس روز کے لیے کافی ہوتا تھا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل پر فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک ''من'' نازل ہوتا جو اس وقت سو رہا ہوتا اس کا حصہ نازل نہیں ہوتا۔ اسی سبب سے اس وقت سے طلوع آفتاب تک سونا مکروہ ہے۔ ابن جریر نے کہا ہے: ان میں سے جب کوئی شخص ایک روز سے زیادہ کا مَن و

سلویٰ لے لیتا تو وہ خراب ہو جاتا تھا سوائے روز جمعہ کے، جب وہ جمعہ کے روز دو دن کا کھانا لیتا تو خراب نہیں ہوتا تھا۔ اس دن وہ جمعہ اور ہفتہ کے دن کا کھانا لے لیتے تھے چونکہ روز ہفتہ نازل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے روٹی کے مانند ٹکیا کی طرح بنا لیتے جو ان کے لیے شہد اور گھی میں (مخلوط) ذائقہ کی طرح ہوتا۔ خداوند عالم دن میں ان کے لیے ابر بھیجتا جو انھیں آفتاب کی حرارت سے محفوظ رکھتا اور شب میں ان پر آسمان سے نورانی ستون نازل ہوتا جو ان کے لیے چراغ کی جگہ روشنی عطا کرتا۔ جب ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا اس پر اس کے قد کے برابر جلد کی طرح کپڑا ہوتا تھا۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾

اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ تم اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ پیو۔ اور بستی کے دروازہ سے سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور حطہ کہتے ہوئے (آنا)، ہم تمھاری خطاؤں کو معاف کر دیں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔

قرائت:

ابوجعفر اور نافع نے يُغۡفَرۡ یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے نَغۡفِرۡ لَكُمۡ نون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی مختار و منتخب ہے اس لئے کہ وہ گذشتہ ارشاد الٰہی: ظَلَّلۡنَا اور اَنۡزَلۡنَا کے زیادہ مشابہ ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر قراء نے یہی پڑھا ہے۔

قرآء کا اس بات پر اجماع ہے کہ لام کے ساتھ راء کا اظہار کرنا ضروری ہے مگر یہ ابوعمرو سے روایت کی گئی ہے اور یزیدی کی روایت میں ہے کہ راء کو لام میں ادغام کرنا زیادہ بہتر ہے۔

قراء کا یہاں پر خَطَايَاكُمۡ ہونے پر اجماع ہے اگرچہ انہوں نے سورۂ اعراف اور سورۂ نوح میں اس سلسلہ میں اختلاف کیا ہے کہ بعض قراء نے وہاں پر خَطِيۡٓـٰٔتِهِمۡ بھی پڑھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ

اعراف اور سورۂ نوح میں مصحف میں بغیر الف کے لکھا ہوا ہے اور یہاں پر الف کے ساتھ لکھا ہے۔

الفاظ و معانی:

دُخُول، وُلُوج، اِقْتِحام باعتبار معنی باہم مشابہ ہیں۔ البتہ دُخُول اور اِقْتِحام میں فرق ہے۔ اقتحام کے معنی دشواری کے ساتھ داخل ہونا ہے۔

قَرْیَۃ، بَلَد، مَدِیْنَۃ معنی کے اعتبار سے مشابہ ہیں۔ خلیل نے بیان کیا ہے: قَرْیَۃ اور قِرْیَۃ دو لغتیں ہیں۔ قُریٰ ہر چیز کا اوپری حصہ ہے جس کی جمع اَقْرَاء ہے۔

سُجُود کے معنی باقاعدہ طور پر جھکنے کے ہیں۔

حِطَّۃ مصدر ہے مانند رِدَّۃ و جِدَّۃ۔ حنبل نے کہا: حط کے معنی جانور سے بوجھ اتارنے کے ہیں۔ وَضع اور خَفض معنی کے اعتبار سے مشابہ ہیں، حطّ بلندی سے نیچے اترنا ہے۔

غُفْرَان، عَفْو، صَفْح معنی کے اعتبار سے مشابہ ہیں۔ غَفَرَ اللہُ لَہٗ غُفْرَانًا یعنی اللہ نے اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کی۔ مَغْفُوْر و مِغْفَار گوند ہے اَغْفَر درخت ہے۔ اس بارے میں یہ حدیث ہے کہ جب پیغمبر حضرت عائشہ کے یہاں آئے تو انھوں نے کہا: اللہ کے رسول آپ نے مَغَافِیْر کھایا ہے، یعنی اس کا گوند کھایا ہے۔

سَتْر اور مَغْفِرَۃ کے معنی عذاب برطرف کر کے خطاؤں اور گناہوں کی پردہ پوشی کرنا ہے۔

خَطِیْئَۃ و زِلَّۃ و مَعْصِیَۃ مشابہ ہیں۔ اگر ارادہ کے بغیر غلطی سرزد ہو تو خَطَا کہیں گے اور ارادہ کے ساتھ ہو تو اَخْطَا کہا جائے گا۔ پہلا خَاطِئ ہے دوسرا مُخْطِئ ہے۔ خَطِیَّۃ کی جمع خَطِیَّات ہے اسی طرح خَطِیْئَۃ کی جمع خَطَایَا ہے۔

مُحْسِن نیکی کرنے والا یا فَاعِلِ حسن ہے یا احسان ہے: اَحْسَنَ اِلٰی غَیْرِہٖ اور اَحْسَنَ فِیْ فِعْلِہٖ کہا جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان فرق ہے اَحْسَنَ اِلَیْہِ فقط نفع کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ فلسفہ کی رو سے حسن وہ فعل جس کی دعوت عقل دیتی ہے اس کی ضد قَبِیْح ہے یعنی یہ وہ فعل کہ جس سے عقل روکتی ہے۔ احسان کے معنی نفع کے ہیں۔ اِسَاءَۃ کے معنی قبیح ضرر و نقصان کے ہیں۔ یہ معنی اس شخص کے نظریہ کے مطابق صحیح ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ انسان اپنے ساتھ نیکی کرتا ہے اور اپنے ساتھ برا کرتا ہے لیکن جو اس

نظریہ کا قائل نہیں ہے وہ قصد وارادہ کے ساتھ دوسرے تک نقصان کے پہنچنے کا اضافہ کرتا ہے لہذا حسن کی تعریف میں یہ کہنا بہتر ہے کہ حسن وہ فعل ہے کہ جب اسے جاننے والا کماحقہ انجام دے تو قابل مذمت نہیں ہوگا۔

ترکیب:

حَیۡثُ ظرف مکان مبنی برضمہ ہے اس کے مبنی ہونے کے متعلق پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ حَیۡثُ کے بعدوالا جملہ، مضاف الیہ ہے۔

اس سلسلہ میں جوسوال کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ حَیۡثُ کیونکر مبنی برضمہ ہے حالانکہ وہ مضاف ہے جملہ کی جانب اس لئے کہ وہ مشابہ قرار دیا گیا ہے اس چیز کے جس کے مضاف الیہ کوحذف کر دیا گیا ہے اوروہ قبل وبعد ہے۔ تواس کا جواب یہ ہے کہ حَیۡثُ جملہ کی طرف مضاف ہونے کے باوجود قبل و بعد سے مشابہ ہونے سے محروم نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنی شباہت پر باقی رہتا ہے اس لئے کہ اسے مفرد کی جانب مضاف ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ یہ جواب اس شخص کے قول کے مطابق ہے جو حَیۡثُ کے مبنی برضمہ ہونے کا قائل ہے لیکن جو شخص ضمہ کے علاوہ کسی اور حرکت پر مبنی ہونے کا قائل تو اس سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا اور قرآن میں تو صرف ضمہ ہی صحیح ہے۔

حِطَّةٌ: حکایت کی بنا پر مرفوع ہے۔ زجاج نے کہا کہ گویا اس طرح ہے: مَسۡاَلَتُنَا حِطَّةٌ یعنی ہماری دعا ہے کہ ہمارے گناہوں کو ہم سے گرادے۔

کہا گیا ہے کہ اس طرح ہے: دُخُوۡلُنَا الۡبَابَ سُجَّدًا حِطَّةٌ لِذُنُوۡبِنَا ۔(سجدہ کرتے ہوئے ہمارا دروازہ میں داخل ہونا ہمارے گناہوں کے جھڑنے کا باعث ہے)

اگر حِطَّةً کو منصوب پڑھنا جائز ہوتا ہے تو عربی میں اس کی یہ صورت ہوتی کہ حُطَّ عَنَّا ذُنُوۡبَنَا حِطَّةً۔ ہمارے گناہوں کو ہم سے اس طرح جھاڑ دے جو جھاڑنے کا حق ہے (یعنی حِطَّةً مفعول مطلق ہوتا) جیسا کہ کہا جاتا ہے: سَمۡعًا وَّ طَاعَةً یعنی اَسۡمَعُ سَمۡعًا وَّ اُطِیۡعُ طَاعَةً. مَعَاذَ اللهِ یعنی نَعُوۡذُ بِاللهِ مَعَاذًا۔

نَغۡفِرۡ لَكُمۡ مجزوم ہے اس لئے کہ وہ امر کا جواب ہے اور شرط کی بنیاد پر مجزوم ہے۔ مراد یہ ہے کہ اِنۡ

تَقُوْلُوْا نَغْفِرْ لَكُمْ: (اگر تم نے یہ کہا تو ہم تمہیں بخش دیں گے) یہاں پر شرط کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ جزاء اس پر دلالت کر رہی ہے۔ کلام میں امر واقع ہوا ہے اور اس کے ذریعہ کلام طولانی ہو گیا ہے اور شرط کا حذف کرنا بہتر ہے اس لئے کہ وہ اس کے بعد واقع ہونے کی بنا پر پے در پے واقع ہونے والے کے مانند بن گیا ہے اس طرح سے کہ دونوں اس بات پر جمع ہو گئے ہیں کہ دونوں غیر موجب (منفی) اور غیر خبر (انشاء) ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے کہ جیسے مبتدا کو حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ خبر اس پر دلالت کرتی ہے۔ کبھی کبھی جزاء کو بھی حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ شرط اس پر دلات کرتی ہے جیسے عربوں کا یہ کہنا ہے کہ اَنْتَ ظَالِمٌ اِنْ فَعَلْتَ. اسی طرح مبتدا کی خبر کو بھی حذف کر دیا جاتا ہے کہ مبتدا اس پر دلالت کرتا ہے۔

سیبویہ نے کہا: خَطَايَا کی اصل خَطَائِيُ ہے جیسے خَطَائِعِ، یاء کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہے پس خَطَاءِءِ ہو گیا جیسے خَطَاعِعِ دو ہمزہ جمع ہو گئے تو ہمزۂ دوم کو یاء سے بدل دیا گیا ہے خَطَائِيْ ہو گیا جیسے خَطَاعِيْ پھر یاء اور کسرہ کو الف سے اور فتحہ سے بدل دیا گیا ہے اور خَطَاءً کہا گیا ہے خَطَاعًا کے مانند جیسا کہ مُدَارِيْ کے ساتھ کیا گیا ہے اور مُدَارَىٰ کہا گیا۔ پھر دو الف کے درمیان ہمزہ سنگین لگنے لگا اس لئے کہ ہمزہ الف کے مجانس ہے گویا تین الف جمع ہو گئے پس ہمزہ کو یاء سے بدل دیا گیا ہے اور خَطَايَا ہو گیا۔

خلیل نے کہا: خَطَايَا دراصل فَعَايِلُ کے وزن پر تھا، اسے فَعَالِيْ کے وزن پر کر دیا گیا ہے پھر اس میں قلب کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے قول میں بیان کیا گیا۔ یہ اعلان اس لئے کیا گیا ہے کہ ہمزہ کہ جس کے بعد الف ہوتا ہے وہ ہمزہ عارضی ہوتا ہے، اصلی نہیں ہوتا ہے۔ آپ مِرْآةٌ کی جمع مَرَائِيْ بناتے ہیں اور عدل نہیں کرتے اس لئے کہ اس لئے کہ ہمزہ عین الفعل ہے۔

تفسیر:

بنی اسرائیل کی سخت ہٹ دھرمی

تمام مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اس مقام پر قریہ سے بیت المقدس مراد ہے۔ اس کی تائید اُس کا یہ ارشاد کر رہا ہے: اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ. ابن زید نے کہا ہے: بیت المقدس سے نزدیک قریہ اریحا مراد ہے جس میں قوم عاد اور عمالقہ کے بقایا موجود تھے۔ جن کا سردار عوج ابن عنق تھا۔ وہ ارشاد فرماتا ہے: وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ، (جب ہم نے کہا: اُس قریہ میں

داخل ہو جاؤ) یعنی جہاں سے چاہو، رَغَدًا، من وسلویٰ کے بعد تم پر وسعت وکشائش ہے قریہ کے کھانے سے جس طرح چاہو استفادہ کرو۔

بیان کیا گیا ہے: ان کے لیے یہ اباحت اس کے غنائم سے ہے جسکے اموال کا انھیں ان پر نعمت تمام کرنے کے لیے مالک بنا دیا گیا۔

وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ، (داخل ہو جاؤ دروازہ سے) یعنی اس دروازہ سے داخل ہو جاؤ جس سے داخل ہونے کا تمھیں حکم دیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے: یہ بیت المقدس کا باب حطہ ہے جو آٹھواں دروازہ ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

کہا گیا ہے کہ بَابُ الۡقُبَّة مراد ہے جس کی طرف رخ کر کے جناب موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نماز پڑھتے تھے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ باب قریہ ہے جس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ ابو علی الجبائی نے کہا ہے کہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ باب الحطہ سے مراد، باب القبہ ہے تو یہ آیت ان کے اس نظریے پر زیادہ دلالت کرتی ہے، ان لوگوں کے قول کے مقابلہ میں جو یہ کہتے ہیں کہ باب القریہ مراد ہے، اس لیے کہ بنی اسرائیل موسیٰؑ کی زندگی میں قریہ میں داخل نہیں ہوئے تھے اور آیت کا آخری حصہ اس امر پر دلالت کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل اس دروازہ سے داخل ہوتے تھے جو اس کے علاوہ تھا۔ جناب موسیٰؑ کے زمانہ کا واقعہ نہیں تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ. کے ذریعہ عطف کرنا جو تاخیر کے علاوہ استعمال ہوتا ہے اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل کی جانب سے یہ تبدیلی امر کے سبب تھی جو اس بات پر دلیل ہے کہ یہ تبدیلی جناب موسیٰؑ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔

ارشاد الٰہی: سُجَّدًا، بیان کیا گیا ہے کہ رکوع کی حالت مراد ہے جو با قاعدہ جھکنے کی حالت وکیفیت ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے: خاضعین اور متواضعین (یعنی خاضع اور انکساری کی حالت) میں داخل ہو۔

بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی ہیں دروازہ میں داخل ہو جاؤ جب تم داخل ہو تو اللہ کا سجدہ کرو اور شکر بجا لاؤ۔ یہ وہب کا قول ہے۔

اس کا ارشاد: حِطَّةٌ، حسن اور قتادہ اور اکثر علماء نے اس کے معنی اس طرح بیان کئے ہیں: حِطَّ عَنَّا ذُنُوۡبَنَا (یعنی ہم سے ہمارے گناہ برطرف کر دے) یہ استغفار کے مانند ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے: انھیں

حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس امر کو حق کہیں۔
عکرمہ نے کہا: انھیں یہ کہنے کا حکم دیا گیا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. اس طرح کہنے سے گناہ برطرف ہوتے ہیں۔
ان اقوال سے ہر ایک جس سے گناہ برطرف ہوتے ہیں اس کا حِطَّة کے ذریعہ ترجمہ کرنا درست ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: نَحْنُ بَابُ حِطَّتِكُمْ ،ہم تمہارے لیے باب حطہ ہیں۔
اس کا ارشاد: نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ، ہم تمہارے گناہوں کو معاف کردیں گے وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی جس ثواب کے تم مستحق ہو گے اس میں فضل کرتے ہوئے عنقریب اضافہ کردیں گے۔
ارشاد ہوتا ہے: لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (سورۂ فاطر، آیت ۳۰) (تا کہ اللہ انھیں (اس کے بدلے میں) پورا پورا اجر عطا کرے اور اپنے فضل سے ان کے لیے اس میں اضافہ بھی کردے)
بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی ہیں من و سلویٰ کے نازل کرنے اور ابر وغیرہ کا سایہ کر کے گذشتہ احسان پر احسان میں اضافہ کردیں گے۔

❀❀❀❀❀

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

مگر وہ بات جو ان سے کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل دیا آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے آسمان سے عذاب نازل کیا۔

الفاظ و معانی:

تَبْدِيْل کے معنی کسی چیز کا اس کی حالت سے بدل دینے کے ہیں۔
رِجْز کے معنی اہل حجاز کی لغت میں عذاب کے ہیں۔ یہ رجس کے علاوہ ہے چونکہ رجس پلیدگی اور نجاست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ رِجْزٌ عُذِّبَ بِهٖ بَعْضُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ، طاعون عذاب ہے تم سے قبل بعض امتوں کو اس میں مبتلا کیا گیا۔ عبیدہ نے کہا ہے: رِجْس اور رِجْز دو لغتیں ہیں مانند بُزاق و بُساق، زَرْع و سَرْع۔ رُجز (را) کے ضمہ (پیش) کے ساتھ بت پرستی ہے۔

لغت میں فِسْق کے معنی عقیدہ سے خارج ہونا ہے، کسی چیز سے خارج ہونے والا فسق کرنے والا ہے مگر شریعت میں امر الٰہی یا اطاعت الٰہی سے خارج ہوجانے سے مخصوص ہے۔

ترکیب:

غَيْرَ الَّذِي میں غیرَ منصوب ہے اس لئے کہ وہ قولًا کی صفت ہے۔ غیر کی اصل یہ ہے کہ وہ صفت ہے جو مثل کے مانند ہے جب مثل اور غیر معرفہ کی جانب مضاف ہوتے ہیں تو یہ دونوں معرفہ نہیں بنتے ہیں اس لئے کہ ان میں ابہام پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مِثْلُ الشَّيْءِ بہت طرح کی چیزیں ہوسکتی ہیں اسی طرح غَيْرُ الشَّيْءِ بھی بہت سی چیزیں ہوسکتی ہیں جو مختلف نہ ہوں۔

تفسیر:

ظالموں نے بدل ڈالا

پھر خداوند عالم نے بیان فرمایا: جس چیز کا انھیں حکم دیا گیا تھا اس کی انھوں نے اس کی نافرمانی کی: فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ ، انھوں نے نافرمانی کی اور وہ فعل انجام دیا جو انھیں نہیں کرنا تھا اور جس چیز کا انھیں حکم دیا گیا تھا انھوں نے اسے بدل دیا۔ اس غیر کے متعلق اختلاف ہے:

بیان کیا گیا ہے: انھوں نے سریانی (زبان) میں هَطَّا سُمْقَاتًا کہا۔ جس کے معنی سرخ گندم کے ہیں جس میں جو مخلوط ہوں۔ ایسا کرنے سے ان کا مقصد استہزا اور حکم کی مخالفت تھی۔

بیان کیا گیا ہے: انھوں نے جہالت و استہزا کرتے ہوئے حِنْطَة کہا۔ انھیں سجدہ کرتے ہوئے دروازہ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا اور دروازہ ان کے لیے جھک گیا تھا تاکہ وہ داخل ہوسکیں اور وہ گھٹنوں پر چل کر داخل ہوئے۔ انھوں نے داخل ہونے میں بھی مخالفت کی۔

ارشاد الٰہی: فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا ، یعنی انھوں نے وہ کیا جو انھیں نہیں کرنا چاہیے تھا اس چیز کو بدل کر قول اور فعل کے ذریعہ جس کا حکم اللہ نے دیا تھا۔ تو خداوند عالم نے آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور حسن کا قول ہے۔

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ، یعنی ان کے فاسقین ہونے سے یا ان کے فسق کے باعث، جیسا کہ ارشاد ہوتا

ہے: ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا یعنی ان کے عصیان اور نافرمانی کے سبب۔ ابن زید نے کہا ہے: طاعون کے ذریعہ ہلاک کر دیئے گئے۔ ان میں سے چوبیس ہزار افراد کی موت کچھ ہی دیر میں واقع ہوگئی جس میں ان کے بزرگ اور بوڑھے شامل تھے اور جوان باقی بچے، ان سے علم اور عبادت منتقل ہوگئے گویا اس امر کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ان کے درمیان سے افاضل حضرات کو نکال کر بقیہ پر عذاب کیا گیا۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾
اور یاد کرو وہ وقت جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے ان سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے ہر قبیلے کو اپنے اپنے گھاٹ کا علم تھا۔ (ہم نے کہا) تم اللہ کے رزق میں سے کھاؤ، پیو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

الفاظ و معانی:

اِسْتِسْقَاء کے معنی طلب سُقْيَة (یعنی سیرابی کی خواہش کرنا) ہے۔

اِنْفِجَار کے معنی شگافتہ ہونے کے ہیں۔ اِنْبِجَاس اِنْشِقَاق سے زیادہ تنگ ہے پہلے اِنْبِجَاس (بہنا، رسنا) ہوتا ہے پھر اِنْفِجَار ہوتا ہے۔

عَيْن اسماء مشترک میں سے ہے۔ پانی کا عَيْن (چشمہ) حیوان کی عَيْن (آنکھ) سے آنسو جاری ہونے سے مشابہ ہے۔ جس شہر (اور آبادی میں) لوگ کم ہوں اسے بَلَدٌ قَلِيْلُ الْعَيْنِ کہتے ہیں۔ بارش، سونے کی (کان) میزان، آفتاب اور جاسوسی کرنے والے کو بھی عَيْن کہتے ہیں۔

وَلَا تَعْثَوْا (یعنی فساد نہ کرو) عُثِي شدید فساد کو کہتے ہیں۔

ترکیب:

إِذْ کلام محذوف سے متعلق ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَاذْكُرُوْا اِذِ اسْتَسْقٰى

ممکن ہے کہ ان چیزوں پر معطوف ہو جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہوا ہے۔

اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا: عَشْرَةَ میں شین ساکن ہے تمام قراء کے نزدیک۔ لغت میں اسے کسرہ دینا جائز ہے اور کسرہ ربیعہ اور تمیم کی لغت ہے اور ساکن کرنا اہل حجاز کی لغت ہے۔

ابن جنی نے کہا: الفاظ عدد میں بہت سے انحرافات پائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اہل حجاز کی لغت عدد جیسے عُشْرَة اور عَشْرَة کے علاوہ میں وہ کہتے ہیں کہ نَبِقَة اور فَخِذ دوسرے حرف کو کسرہ دیتے ہیں اور بنی تمیم ساکن کرتے ہیں اور نَبْقَة و فَخْذ کہتے ہیں۔ جب دو اسم مرکب ہو جائیں تو پھر وزن بنانا محال ہو جاتا ہے۔ بنی تمیم نے کہا: إِحْدَىٰ عَشِرَةَ وَ اثْنَتَا عَشِرَةَ شین کے کسرہ کے ساتھ۔

اہل حجاز نے کہا: عَشْرَةَ شین کو سکون قرار دیا تھا۔

عَيْنًا بر بنائے تمیز منصوب ہے۔ اِثْنَتَا عَشْرَةَ کا دوسرا اسم عِشْرُوْنَ میں نون کا قائم مقام ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کے بعد عَشْرَةَ آئے تو اِثْنَتَانِ سے نون گر جاتا ہے اور یہی ہر ایک میں فرض کیا گیا ہے اور وہ ثَلَاثَةٌ ثَلَاثٌ ہے ثَلَاثَةَ عَشَرَ اور ثَلَاثَ عَشْرَ میں تِسْعَةَ عَشَرَ اور تِسْعَ عَشْرَةَ تک کہ نون ان میں عَشْرَةَ کا قائم مقام ہے۔ اسی لئے اس پر تنوین نہیں آئی ہے اور جب تنوین داخل نہیں ہوگی تو مبنی ہوگا۔

مُفْسِدِيْنَ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

تفسیر:

بیابان میں پانی کا چشمہ

پھر خداوند عالم نے بنی اسرائیل پر پہلی نعمت کے بعد دوسری نعمت شمار کی اور ارشاد فرمایا: وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى، موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا 'سین' طلب کا سین ہے، جس سے طلب کیا گیا اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لیے کہ جو کلام میں ذکر کیا گیا ہے وہ معنوی طور پر اس پر دلالت کر رہا ہے جس کو ترک کر دیا گیا ہے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ ، (اور یاد کرو وہ وقت جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے ان سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، چنانچہ اس

سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے) یعنی انھوں نے عصا پتھر پر مارا۔ اس سے چشمے جاری ہو گئے، جناب موسیٰؑ کے پتھر پر عصا مارنے والی خبر کو ترک کر دیا اس لیے کہ جس چیز کو کلام میں باقی رکھا گیا ہے وہ اس پر دلالت کر رہی ہے جس کو چھوڑا گیا ہے گویا اس طرح ہے کہ "میں نے فلاں شخص کو تجارت کرنے کا حکم دیا اس نے مال کمایا" یعنی اس نے تجارت کی اور مال کمایا۔ جناب موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل تھی، آپ نے بنی اسرائیل کے لیے اپنے پروردگار سے پانی طلب کیا، جب وہ صحرا میں تھے اور بنی اسرائیل نے ان سے تشنگی کا شکوہ کیا تھا تو اللہ نے ان سے کہا کہ وہ اپنا عصا ماریں جو کہ مشہور عصا تھا اور جنت کی لکڑی کا تھا جسے جناب موسیٰؑ کو حضرت شعیبؑ نے دیا تھا، اس عصا کو جناب آدمؑ جنت سے اپنے ہمراہ زمین پر لے کر آئے تھے۔ اس کی لمبائی طول جناب موسیٰؑ کے قد کے دس ہاتھ تھی، اس میں دو شگاف تھے جو تاریکی میں نور دیتے تھے اسی عصا کو (موسیٰ نے) سمندر پر مارا تھا جس سے شگاف پیدا ہوئے تھے اور یہی عصا اژدہا بن تھا۔ البتہ حجر (پتھر) کے بارے میں اختلاف ہے۔

بیان کیا گیا ہے اس سے چشمے پھوٹتے تھے ہر قبیلہ کے لیے ایک چشمہ تھا وہ بارہ قبیلے تھے پھر ہر چشمہ اس قبیلہ کی جانب بڑھتا تھا جسکے پلائے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ روایت وھب بن منبہ سے منقول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: پتھر بذات خود بہت ہلکا تھا۔ جب سفر کرتے تو اسے اپنے ہمراہ لے جاتے، جب کہیں اترتے تو جناب موسیٰ اس پر اپنا عصا مارتے اور اس سے پانی جاری ہو جاتا۔ یہ ابن عباس سے منقول ہے۔ یہ معنیٰ زیادہ بہتر اور اولیٰ ہیں اور اس پر الف لام کا داخل ہونا اس کی دلیل ہے جو کہ عہد کے لیے ہے۔

بیان کیا گیا ہے: ایسا پتھر جس میں بارہ سوراخ تھے۔ پتھر ڈھیلے کے مانند نرم تھا۔ جسکے ہر سوراخ سے میٹھے پانی کا چشمہ جاری ہوتا تھا۔ جب بنی اسرائیل سیراب ہو جاتے اور جناب موسیٰ اسے اٹھانا چاہتے تو اس پر عصا مارتے پانی ختم ہو جاتا تھا۔ یہ پتھر ہر روز چھ لاکھ لوگوں کو سیراب کرتا تھا۔ یہ روایت ابو مسروق سے ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ یہ چوکور پتھر تھا اور یہ بھی روایت کی گئی ہے سر کے مانند تھا۔ جب جناب موسیٰؑ اس پر عصا مارتے تو اس کے ہر جانب سے تین تین چشمے (جاری ہوتے) ہر قبیلہ کے لیے ایک چشمہ تھا۔ وہ کسی منزل کا سفر نہیں کرتے مگر اس پتھر کو پہلی ہی منزل میں پاتے تھے۔

ارشاد الٰہی: فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا سورۂ اعراف کے فَانْبَجَسَتْ سے منافات نہیں رکھتا ہے۔ (اِنْبِجَاس) کے معنی بھی پھوٹنے اور جاری ہونے کے ہیں مگر یہ مختصر ہوتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے پہلی مرتبہ جب عصا مارتے ہوں تو پہلے کم پانی نکلتا ہو پھر

زیادہ ہوجاتا ہو یہاں تک کہ جاری ہوجاتا ہو۔

بیان کیا گیا ہے کہ جیسی ضرورت ہوتی ویسا ہی ہوتا کم ضرورت کے وقت کم پانی نکلتا اور زیادہ ضرورت کے موقع پر پانی زیادہ جاری ہوتا۔

اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ اٹھاتے اور لے جاتے وقت پانی کم نکلتا اور رکھتے وقت پانی جاری ہوتا اور پھوٹ کر نکلتا۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ. ان میں کے ہر قبیلہ اور ہر فرد نے اپنے اپنے پینے کا مقام جان لیا۔

اس کا ارشاد: كُلُوا وَاشْرَبُوا. یعنی ہم نے ان سے کہا کہ کھاؤ اور پیو۔ یہ نیا جملہ ہے۔

ارشاد: مِن رِّزْقِ اللَّهِ ان نعمتوں میں سے کھاؤ (من وسلویٰ) کی شکل میں جن کے ذریعہ تم پر احسان کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ میں سے بھی کھاؤ) اور پانی پیو۔ یہ تمام رزق خدا ہے جو تم تک کسی مشقت اور عوض کے بغیر پہونچتا ہے۔ رزق وہ چیز ہے جس سے رزق پانے والا نفع حاصل کرے، جس سے کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے۔

وَلَا تَعْثَوْا. زمین پر فساد کرنے کی کوشش نہ کرو یہ جو ارشاد: وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ہے۔ اگرچہ عثی فساد ہی ہوتا ہے اس لیے ممکن ہے کہ فعل کا ظاہر فساد ہو اور اس کے باطن میں مصلحت ہو۔ اس طرح اللہ نے واضح فرما دیا کہ ان کا فعل عبث (کسی چیز کا فاسد کرنا) ہے جو کہ فساد ہے، ظاہر ہو چاہے باطن۔

اگر سوال کیا جائے کہ اس مختصر سے پتھر میں پانی کی اتنی بڑی مقدار کس طرح جمع کر دی گئی کیا یہ ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اللہ کی روشن نشانیاں اور ظاہری عجائبات ہیں جو اللہ کے فعل پر دلالت کر رہی ہیں جو اشیاء کو وجود میں لانے والا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے، صعوبتیں اس کے سامنے سرنگوں ہیں، وہ ان کے لیے اسباب فراہم کرتا ہے، اس کے کمال قدرت اور جلال عزت سے یہ امر بعید نہیں کہ وہ ابتدائی طور پر جناب موسیٰؑ کے لیے کثیر مقدار میں پانی خلق فرما دے جو خود جناب موسیٰؑ اور ان کی قوم کے لیے نعمت ہو۔ ملحدین میں سے جو اس امر کو بعید اور ناممکن سمجھتے ہیں وہ اس کی قدرت کو کما حقہ نہیں سمجھتے اور اسے برحق معرفت کے ساتھ نہیں پہچانتے۔ ملحدین سے بحث تو وجود صانع، صفات الٰہی کے اثبات اور اس کی بے پایاں قدرت سے متعلق ہے، جب وہ اصل کے مخالف ہیں تو پھر فرع کے بارے میں ان سے بحث کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَکُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡکَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّکَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾

اور یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم ایک طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے اپنے رب سے دعا مانگیے کہ وہ ہمارے لیے زمین سے اگنے والی چیزیں پیدا کر دے جیسے ساگ پات، کھیرا ککڑی (گیہوں) لہسن، مسور اور پیاز وغیرہ تو موسیٰ نے کہا کہ تم ایسی چیز کو جو ہر طرح سے بہتر ہے ادنیٰ چیز سے بدلنا چاہتے ہو، جاؤ کسی شہری آبادی میں جا رہو تم نے جو کچھ مانگا ہے وہاں مل جائے گا اور آخر کار انھیں ذلت پستی اور بدحالی میں گرفتار کر دیا گیا اور وہ لوگ اللہ کے غضب میں گھر گئے یہ سب اس لیے ہوا کہ وہ لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کر رہے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر رہے تھے۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور حدود شرع سے تجاوز کرنے کا نتیجہ تھا۔

قرائت:

اہل مدینہ نے اَلنَّبِیۡٓئِیۡنَ ہمزہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے بغیر ہمزہ کے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جنہوں نے اَلنَّبِیۡءِ کو ہمزہ دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کلمہ کی اصل وہی ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ اہل حجاز اپنے کلام میں ہمزہ کو ثابت و باقی رکھتے ہیں اسے بدلتے نہیں ہیں۔ وہ یَدَعُ وغیرہ کے ماضی کے مانند نہیں ہے کہ جس کے استعمال کو چھوڑ دیا گیا ہو۔

لیکن حدیث میں جو منقول ہے کہ بعض لوگوں نے کہا: یا نبئ اللہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نبئ اللہ نہیں ہوں بلکہ میں نبی اللہ ہوں۔

میں گمان کرتا ہوں کہ روایات نقل کرنے والوں میں ایسے بھی افراد ہیں جنہوں نے اس حدیث کی اسناد کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس سند کے ضعف کو اور قوی بنا دیا ہے اس شاعر نے کہ اس نے مدح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کہا:

یَاخَاتَمَ النَّبَاءِ اِنَّکَ مُرْسَلٌ بِالْحَقِّ خَیْرُ هُدَی الْاِلٰهِ هَدَاکَا

جہاں تک ہم جانتے ہیں کہ اس کا انکار و ممانعت نے اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑا ہے اگر واحد میں یہ بات ناپسندیدہ ہے تو جمع بھی واحد کے مانند ناپسندیدہ ہوگی۔

اور جس نے بدل دیا ہے اور قرآن مجید میں تحقیق نہیں کی کہ انبیاء بھی آیا ہے تو وہ زیادہ تر معتل اللام میں ہے جیسے صَفِیّ سے اَصْفِیَاء، غَنِیّ سے اَغْنِیَاء یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں ابدال لازم ہے جب ابدال لازم ہے تو ہمزہ کو باقی رکھنا ضعیف ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ نبی ،نَبْوَة سے مشتق ہے جو ارتفاع و بلندی کے معنی میں ہے اور نہ ہی نَبَاوَة سے مشتق ہے اس لئے کہ سیبویہ نے حکایت کی ہے کہ سارے عرب کہتے ہیں کہ تَنَبَّأَ مُسَیْلَمَةُ، ہمزہ کے ساتھ۔ سیبویہ کی یہ حکایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی اصل ہمزہ ہے۔

زجاج نے کہا: نَبِیّ اَنْبَأْتُ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے کہ کثرت استعمال کی بنا پر ہمزہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ نَبَا ،یَنْبُوْ سے ہو جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں اور نَبِیّ فَعِیْل کے وزن پر ہے بلند مقام کے معنی میں۔

الفاظ ومعانی:

طَعَام کے معنی جس چیز کے ذریعہ غذا حاصل کی جائے (جسے بطور غذا استعمال کیا جائے)

اَکْل و طَعْم عرض ہے جس کا ادراک قوت ذائقہ سے ہوتا ہے۔ طعام اجسام کے قبیل (قسم) سے ہے۔

وَاحِد حساب کا پہلا عدد ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ جسے اجزاء میں تقسیم نہ کیا جا سکے۔ اللہ اپنے صفات حسنہ کے منفرد ہونے کے سبب واحد (ایک) ہے۔

دُعَاء کے معنیٰ نِداء (پکارنے) کے ہیں۔ یہ ابن سراج نے کہا ہے کہ جو (شخص) بھی اپنے پروردگار کو پکارتا ہے وہ اسے ندا دیتا ہے۔ حقیقت دعا یہ ہے کہ قائل اپنے سے بلند مرتبہ ذات سے اس طرح کہتا ہے "یہ کام انجام دے!" دعا اور امر کے درمیان فرق مرتبہ کے اعتبار سے ظاہر ہوتا ہے۔

بَقْل ہر وہ چیز جس کی جڑ نہیں ہوتی۔

قِثَّاء میں دو لغتیں ہیں قاف کے پیش (قُثَّاء) اور زیر کے ساتھ (قِثَّاء) زیر کے ساتھ سب سے بہتر و افضل ہے۔ یہی لغت قرآن ہے۔

وَالْفُوْمِ هُوَ الْحِنْطَة. فوم کے معنی حنطہ یعنی گیہوں کے ہیں۔ ابن عباس وقتادہ اور سُدی سے روایت ہے، امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی یہی مروی ہے۔ فراء اور ازہری نے بیان کیا ہے کہ یہ گندم اور روٹی ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ اناج ہے جس سے روٹی بنائی جاتی ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ یہ ثوم (لہسن) ہے۔ ث کو ف سے بدل دیا گیا۔ یہ فراء نے کہا ہے۔

بَصَل (پیاز) سے بہت زیادہ مشابہ ہے جس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ یہ بعید ہے چونکہ ثوم فوم کے معنی میں مشہور نہیں ہے۔ چونکہ قوم کے لیے ممکن نہیں تھا کہ ثوم کا مطالبہ کرتی نہ ہی قوم نے روٹی کا مطالبہ کیا جو کہ اصل ہے۔ یہ قول ضعیف ہے چونکہ ابن مسعود وابن عباس سے شواذ (روایت) میں ثُومِهَا کی ث کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔

عَدَس مسور کی دال جو کہ مشہور ہے۔

ارشاد الٰہی: ادنیٰ یعنی بہت زیادہ نزدیک، ممکن ہے اَدْنیٰ، دِنَائَة سے ہو جو حقیر و پست اور گھٹیا کے معنی میں ہے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی ذلت ورسوائی ان کے لیے فرض اور لازمی کر دی گئی جس طرح کہا جاتا ہے: ضَرَبَ الْاِمَامُ الْجِزْيَةَ عَلٰى اَهْلِ الذِّمَّةِ (امام نے اہل ذمہ پر ٹیکس واجب کر دیا) یا اس طرح کہا جاتا ہے: ضَرَبَ الْاَمِيْرُ عَلٰى عَبِيْدِهِ الْخَرَاجَ (حاکم نے اپنے غلاموں پر خراج لازمی کر دیا ہے۔ ذلة ذَلَّ سے مشتق ہے۔

مَسْكَنَة مِسْكِيْن کا مصدر ہے۔ مَسْكَنَة یہاں پر فقر و فاقہ اور محتاجی کے معنی میں ہے۔ یہ اس کا خشوع اور ذلت ہے۔

ارشاد الٰہی: وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ یعنی غضب الٰہی کی طرف پلٹ گئے۔ مبرد نے بیان کیا ہے: اس کی اصل مَنْزِلَة ہے یعنی غضب الٰہی کی منزل میں پہنچ گئے۔ روایت کی گئی ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو لیکر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا: هٰذَا قَاتِلُ اَخِي وَ هُوَ بَوَاءٌ بِه "یعنی مقتول بہ ہے۔ زجاج نے بیان کیا ہے: اس کے اصلی معنی تَسْوِيَة کے ہیں اسی سے متعلق ہے وہ قول جس کی روایت عبادہ بن صامت سے کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: جَعَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى الْاَنْفَالَ اِلٰى نَبِيِّه فَقَسَّمَهَا بَيْنَهُمْ عَلٰى بَوَاءٍ اللہ نے انفال اپنے پیغمبرؐ کے لیے قرار دیا پس اسے انھوں نے لوگوں کے درمیان برابر سے تقسیم کر دیا۔

ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ اعتراف کرنے کے معنی میں ہے کہ ان لوگوں نے غضب الٰہی کے سبب کا اعتراف کرلیا۔

غَضَب کے معنی ہیں جس پر غضب کرنا ہے اسے ضرر ونقصان پہونچانے کا ارادہ کرنا۔ جب اس کی نسبت اللہ کی طرف دی جائے گی تو مغضوب علیہ پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ مراد ہوگا (ہم سب اللہ کے غضب سے پناہ چاہتے ہیں)

نَبِيّ، نَبَاء سے مشتق ہے یعنی خبر دینا چونکہ نبی اللہ کی جانب سے خبر دیتا ہے۔

ترکیب:

يُخْرِجْ لَنَا: مجزوم ہے اس لئے کہ امر محذوف کا جواب ہے، گویا اس طرح ہے: اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ وَقُلْ لَهٗ: اَخْرِجْ لَنَا يُخْرِجْ لَنَا، (آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے اور اس سے کہئے کہ وہ ہمارے لئے اگائے تو وہ ہمارے لئے اگائے گا)

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کی اصل یہ ہے کہ وہ شرط کی وجہ سے مجزوم ہے شرط کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس طرح فرض کیا جائے کہ يُخْرِجْ لام امر کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے یعنی لِيُخْرِجْ لَنَا (وہ ہمارے لئے اُگائے) جیسا کہ اس آیت میں ہے: قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ یعنی لِيُقِيْمُوْا، لام کو حذف کر دیا گیا ہے ابو زید نے یہ شعر کہا:

فَيُضْحِيْ صَرِيْعًا مَّا يَقُوْمُ لِحَاجَةٍ وَلَا يَسْمَعُ الدَّاعِيْ وَ يُسْمِعُكَ مَنْ دَعَا

لِیُسْمِعَكَ، ایک دوسرے شاعر نے کہا:

فَقُلْ ادْعِیْ وَ أَدْعُ فَإِنَّ أَنْدیٰ　لِصَوْتٍ أَن یُّنَادِیَ دَاعِیَانِ

یعنی لِاَدْعُ نیز کہا:

مُحَمَّدُ تَفْدِ نَفْسَكَ كُلُّ نَفْسٍ　إِذَا مَا خِفْتَ مِنْ أَمْرٍ تَبَالَا

یعنی لِتَفْدِ۔

مبرد نے کہا: مازنی نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ میں قراء کے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ انہیں اپنے ساتھیوں سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لام امر کو حذف کرنا جائز نہیں ہے سوائے شعر کے پھر یہ شعر کہا:

مَنْ كَانَ لا يَزْعَمُ أَنِّيْ شَاعِرٌ　فَيَدْنُ مِنِّيْ يَنْهَهُ الزَّوَاجِرُ

جو شخص گمان نہیں کرتا ہے کہ میں شاعر ہوں تو وہ میرے قریب آئے منع کرنے والی چیزیں اسے منع کر دیں گی۔

میں نے ان سے کہا: ایسا کیوں ہے کہ شعر میں جائز ہے اور کلام (نثر) میں جائز نہیں ہے۔ جواب دیا: اس لئے کہ شعر میں شاعر مجبور ہوتا ہے اور حذف کر دیتا ہے، میں نے عرض کیا: کیا اس شعر میں شاعر کو کس چیز نے مجبور کیا تھا کہ یَدْنُ کہے جبکہ وہ فَلْيَدْنُ کہہ سکتا تھا۔ تب انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا یا۔

مِمَّا تُنۢبِتُ الْاَرْضُ: یہاں پر مِنْ تبعیض کے لئے آیا ہے اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ خدا ہمارے لئے زمین جن چیزوں کو اگاتی ہے ان میں سے کچھ کو اگائے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ یہاں پر مِنْ زائدہ ہے جیسے عربوں کا یہ کہنا ہے: مَا جَاءَنِیْ مِنْ اَحَدٍ

صحیح قول پہلا قول ہے اس لئے کہ مِنْ مثبت میں زائدہ نہیں ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے معین کئے بغیر شہروں میں سے کسی ایک شہر کا ارادہ کیا ہے اس لئے کہ وہ وادی تیہ میں تھے۔ ممکن ہے کہ خود ملک مصر مراد ہو اور اس کے منصرف ہونے کی وجہ اس کا مذکر ہونا ہے۔

ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے بغیر الف کے قرأت کی ہے ممکن ہے کہ مراد یہی مصر ہو جیسا کہ فرمایا ہے: اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ - اسے غیر منصرف نہیں لایا ہے اس لئے کہ شہر کا نام ہے لفظ مذکر اور مونث کا نام رکھ دیا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ جن لوگوں نے تنوین دی ہے انہوں نے مصحف کے اتباع کی بنا پر تنوین دی ہے اس

لئے کہ مصحف میں الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ ۔زجاج نے کہا: مراد یہ ہے کہ خدا نے بتا دیا کہ غضب ان پر خود ان کے کفر کی بنا پر نازل ہوا ہے اور اس آیت کی وضاحت میں کہتا ہوں کہ ذٰلِكَ ارشاد الٰہی: وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ میں غضب کی جانب اشارہ ہے لہٰذا مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے انّ اپنے صلہ اسم وخبر کے ساتھ مجرور ہے اور جار مجرور کا متعلق مبتدا کی خبر ہے اور فعل و فاعل سے مرکب جملہ ہے جسے حذف کر دیا گیا ہے اس کہ جو چیز اس سے متصل ہے وہ اس جملہ پر دلالت کر رہی ہے۔

اسی طرح :ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا بھی ہے۔ مَا اپنے صلہ کے ساتھ تاویل مصدر میں ہے اس جملہ پر دلالت کر رہی ہے۔

تفسیر:

رنگ برنگے کھانے کی تمنا

جب خداوند عالم نے سابق میں بنی اسرائیل کو عطا کی گئیں نعمتوں اور احسانات کا شمار کرایا پھر ذکر فرمایا (ان چیزوں کے بارے میں) جن کا انھوں نے کفران نعمت عصیان و نافرمانی کے ذریعہ اپنے سوء اختیار سے مقابلہ کیا وَإِذْ قُلْتُمْ. جب تم نے کہا یعنی بنی اسرائیل میں جو تمہارے اسلاف تھے انہوں نے کہا: يَامُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ، ہم ایک قسم کے کھانے پر باقی رہنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ جو کہا گیا ہے ایک کھانے پر اگر چہ ان کا کھانا من وسلویٰ تھا، جو دو چیزیں تھیں۔ اس سے ان کی مراد ہر دن ایک جیسا کھانا تھا۔ یعنی (موجودہ) دن میں وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ گذشتہ روز کھا چکے تھے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: فلاں شخص کا کھانا ہر دن ایک ہوتا ہے اگر چہ وہ کئی قسم کے کھانے کھاتا ہے اگر وہ اپنے آپ کو چند قسموں کے کھانے کا پابند بنالے اس کے سوا وہ شمار نہیں کرتا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان پر فقط من نازل ہوتا تھا جس سے وہ اکتا گئے تھے۔ جسکے متعلق انھوں نے کہا تھا۔ اس کے بعد ان پر سلویٰ نازل کیا گیا۔

اس کا ارشاد: فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ. اپنے پروردگار سے طلب کیجیے، ہمارے لیے اس سے مانگئے، يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا، یعنی سبزیوں سے وہ چیزیں جو زمین سے اگتی ہیں جن کا ذکر اللہ نے فرمایا ہے۔ ان لوگوں کی مانگ کا سبب یہ ہے جس کی روایت قتادہ

نے کی ہے۔ انھوں نے کہا: قوم صحرا میں تھی۔ ان پر ابر کا سایہ کیا اور ان پر من وسلویٰ نازل کیا جس سے وہ اُکتا گئے تھے۔ انھیں مصر کی زندگی یاد آئی۔ انھوں نے موسیٰ سے مانگ کی تو اللہ نے ارشاد فرمایا: اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ. یہ اصل میں اس طرح ہے کہ موسیٰ نے دعا کی جس کو ہم نے قبول کرلیا۔ پھر ہم نے ان سے کہا: مصر میں چلے جاؤ اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے کہا ہم اس ثروت مندی پر صبر نہیں کر سکتے کہ ہم سب غنی وثروت مند ہوں اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے مدد نہ لے سکے اس لیے انھوں نے کہا: ہمارے لیے وہ چیز نکالئے جو زمین سے پیدا ہوتی ہے تاکہ اس میں مددگاروں کی ضرورت ہو۔ اس طرح فقیر ثروت مند کا مددگار بن جائے۔

ارشادِ الٰہی: قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ. اسکے معنی یہ ہیں کہ ان سے موسیٰ نے کہا۔ کہا گیا ہے: بلکہ اللہ نے ان سے کہا: کیا تم اس چیز کو ترک کر رہے ہو جسے تمہارے لیے اللہ نے اختیار اور پسند کی ہے اور اس چیز سے پست اور گھٹیا چیز کو ترجیح دے رہے ہو (اس پر خوش ہو؟)

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ کیا تم زراعت اور صنعت میں صرف کردہ چیز کو اس چیز سے تبدیل کر رہے ہو جو تم سے عفو و درگذر کرتے ہوئے من وسلویٰ عطا فرمایا ہے؟

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم کم قیمت والی چیز کو بیش قیمت اور زیادہ لذت بخش چیز پر اختیار کر رہے ہو۔ ان لوگوں کی مانگ میں اختلاف ہے کہ آیا ان کا مطالبہ کرنا معصیت و نافرمانی تھی؟

کہا گیا ہے کہ معصیت نہیں تھی، اس لیے کہ پہلا مباح تھا۔ پس انھوں نے دوسرے مباح کی مانگ کی اور کہا گیا ہے کہ بلکہ معصیت تھی اس لیے کہ وہ اس چیز پر راضی نہیں تھے جسے اللہ نے ان کے لیے اختیار کیا تھا۔ اسی لئے ان کی مذمت کی گئی ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے۔

اس کا ارشاد اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا (کسی شہری آبادی میں چلے جاؤ) اس مصر کے بارے میں اختلاف ہے۔ حسن اور ربیع نے کہا ہے: اس سے فرعون والا مصر مراد ہے جس سے وہ نکلے تھے۔ ابو مسلم نے کہا ہے: بیت المقدس مراد ہے۔ یہی روایت ابن زید سے کی گئی ہے۔ قتادہ، سدی اور مجاہد نے کہا ہے: (عام) شہروں میں سے ایک شہر مراد ہے۔ یعنی جس چیز کا تم نے مطالبہ کیا ہے وہ شہروں میں ہوتی ہے نہ کہ ایسے صحرا میں جس میں پانی تک کا فقدان ہو۔ فَاِنَّ لَكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ. اس میں تمھارے لئے زمین سے اگنے والے وہ سارے سامان ہیں جن کی تم نے مانگ کی ہے۔

یہاں پر کلام مکمل ہو جاتا ہے پھر ان لوگوں کے بیان کا آغاز ہوتا ہے جنھوں نے روز ہفتہ کے متعلق

سرکشی کی اور انبیاء کا قتل کیا۔ ارشاد ہوا: وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ یعنی ذلت ان کے ساتھ لگا دی گئی جس سے ان کو چھٹکارا نہیں ہے۔ جس طرح کسی چیز میں کیل ٹھوک دی جاتی ہے وہ اس سے وابستہ اور پیوستہ ہو جاتی ہے۔ کہا گیا ہے: ذلت سے جزیہ (ٹیکس) مراد ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ۔ (سورۂ توبہ، آیت ۲۹) (یہاں تک کہ وہ لوگ ذلیل وخوار ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کریں) حسن اور قتادہ سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ زنار کے علاوہ ایک دھاگا جس کو ذمّی اپنے لباس پر باندھتے ہیں اور وہ یہود کا پہناوا ہے۔ یہ عطا سے منقول ہے۔ اس کا ارشاد ہے: وَالۡمَسۡكَنَةُ یعنی آپ ان کے فقر کی حالت میں ان میں سے تنگ دست افراد کو جزیہ بڑھ جانے کے خوف سے مایوس پائیں گے۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت ثروت مندی اور امیری کی برتری پر دلالت کر رہی ہے اس لیے کہ لوگوں کی ان کے فقر کے سبب مذمت کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ اس سے قلب کی فقیری مراد ہے اس لیے کہ یہودیوں میں بہت سے صاحبان ثروت پائے جاتے ہیں لیکن باعتبار نفس غنی نہیں ہوتے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ثروت ودولت تو نفس کا ثروت مند ہونا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: خداوند عالم نے یہودیوں کی عزت کو ذلت سے، نعمت کو بدحالی سے اور ان سے رضا کو غضب سے بدل دیا ان کے (آیات الٰہی) کے انکار، قتل انبیاء ورسل اور سرکشی وظلم کے باعث۔ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ، یعنی پلٹ گئے اس حالت میں کہ غضب الٰہی کا شکار ہو چکے تھے۔ اللہ کی طرف سے ان پر غضب لازمی ہو گیا اور اس کی ناراضگی ان پر حتمی ہو گئی۔

ایک گروہ نے کہا ہے: غضب سے مراد دنیا میں ان پر خوشگوار زندگی اور نعمت کے عوض مصیبت اور عذاب کا حتمی ہونا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے ان کی نافرمانیوں اور گناہوں پر ملنے والا آخرت کا عذاب ہے۔ پھر اس چیز کی جانب اشارہ کیا جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكَ غضب، ذلت پستی اور بدحالی میں گرفتاری کا سبب یہ ہے کہ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وہ اللہ کی حجتوں اور اس کی واضح نشانیوں کا انکار کرتے تھے۔ کہا گیا ہے: آیات الٰہی سے انجیل وقرآن مراد ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ وہ غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے۔ پہلا غضب جناب عیسیٰؑ اور انجیل کے انکار پر تھا۔ دوسرا غضب ان کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کے انکار کی بنا پر تھا۔ کہا گیا ہے آیات اللہ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات ہیں۔ ارشاد الٰہی: وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ، یعنی بے جرم وخطا (انبیاء کو قتل کرتے ہیں) جیسے

جناب زکریاؑ اور جناب یحییٰؑ وغیرہ اس کا ارشاد بِغَيْرِ الْحَقِّ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ انبیاء کا قتل برحق بھی ہوسکتا ہے اس لیے کہ یہ انبیاء کا قتل صرف اور صرف ناحق ہی ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ. اس کے معنی ہیں کہ اس پر برہان و دلیل ہونا ناممکن ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

عَلَىٰ لَاحِبٍ لَا يُهْتَدَىٰ بِمَنَارِهِ

جب راستہ کشادہ ہو تو پھر مینار کے ذریعہ ہدایت کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ. اس میں انبیاء کا قتل کرنے اور روز ہفتہ کے سلسلہ میں ان سے تجاوز و سرکشی کرنے جیسی نافرمانیوں کی جانب اشارہ ہے جس کا بیان سابق میں گذر چکا ہے۔ کہا گیا ہے ان کی عہد شکنی اور قتل انبیاء میں سرکشی سے مراد یہ ہے کہ میں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ان کی میرے امر کی نافرمانی اور نہیں کا پاس و لحاظ نہ رکھتے ہوئے اس کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے۔

سوال: اگر کہا جائے کہ کفار اور قتل انبیاء کے درمیان آزادی فراہم کر دینا (یعنی کفار کو انھیں قتل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا) کس طرح ممکن ہے؟

جواب: یہ اس لیے ممکن ہے کہ انبیائے کرام اللہ کے بلند مراتب اور درجات تک پہنچ سکیں جہاں تک شہادت کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا اور یہ ان کو چھوڑنے اور ان سے قطع تعلق کی بنا پر نہیں ہے۔ اسی طرح مومنین، اولیاء اور اطاعت شعاروں اور ان کے قاتلوں کے درمیان آزاد چھوڑ دینا ان سے قطع تعلق نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ خداوند عالم نے کسی پیغمبر کو اس لئے جہاد کرنے کا حکم نہیں دیا کہ وہ اس میں قتل ہو جائے۔ انبیاء کا قتل کسی جہاد میں نہیں ہوا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ کسی نبی نے اگر اس شریعت کو ابھی تک نہیں پہونچایا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے تو پھر ممکن نہیں کہ خداوند عالم اس کے قتل کے امکان فراہم کرے اگر ایسا ہوتا تو بندے الطاف اور مصالح سے محروم رہ جائیں گے اور اگر اس نے پہونچا دیا ہے تو خدا نبی اور اس کے قاتل کے درمیان چھوڑ سکتا ہے اور پھر اسے قتل سے روکنا واجب نہیں ہے۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: بنی اسرائیل نے جناب موسیٰؑ کے بعد پانچ سو برس تک اختلاف کیا یہاں تک کہ ان کے درمیان کنیزوں کی اولاد بکثرت ہوگئیں اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دو سو برس تک اختلاف کیا۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

یقین جانو کہ جو لوگ نبی اکرم پر ایمان لائے اور یہودی، نصاریٰ اور ستارہ پرست ان میں سے جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انھیں نہ تو خوف ہوگا اور نہ ہی وہ لوگ محزون ہونگے۔

قرائت:

نافع نے پورے قرآن میں صَابِیْنَ اور صَابُوْنَ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور بقیہ قراءؔ ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

حجت:

ہمزہ کو ترک کرنے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں:

(۱) یہ لفظ ممکن ہے کہ صَبَا، یَصْبُوْ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کسی شے کی جانب مائل ہونا ہیں۔

(۲) ممکن ہے کہ ہمزہ کو بدل دیا گیا ہے۔

ابو علی نے کہا: اسے صَبَا یَصْبُوْ سے مشتق ماننا آسان نہیں ہے اس لئے کہ کبھی انسان کسی دین کی طرف مائل تو ہوتا ہے لیکن اسے اپنا دین نہیں بناتا ہے باوجودیکہ اس کی جانب میلان ورجحان رکھتا ہے۔ جب یہ بعید ہے تو صَابِئِیْنَ جب دین نے انہیں گرفت میں لیا تو اس سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہو گئے وہ قائم نہ رکھ سکے مگر کہ اپنے دین سے ایک ایسے دین کی طرف منتقل ہو گئے کہ جس دین کو ان کے لئے بنایا گیا تھا۔ پس یہ ہمزہ کو قلب (بدلنے) کی بنا پر ہے اور اس حد تک ہمزہ کو بدلنے کی سیبویہ نے اجازت نہیں دی ہے مگر شعر میں پس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایسا کہنے والا غیر فصیح ہے اور وہ لغت میں خلط وملط کرنے والا ہے لہٰذا ہمزہ کو اختیار کرنا ہی صحیح نظریہ ہے نیز اکثر قراء کی قرأت ہے اور تفسیر سے زیادہ قریب ہے۔

الفاظ و معانی:

هَادُوْا یعنی یہودی ہو گئے یعنی یہودیت کو اپنا دین بنا لیا۔ هَادَ يَهُوْدُ هُوْدًا کے معنی توبہ کرنے کے ہیں۔
یَهُوْد نام کے اشتقاق میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ یہ هُوْد سے بنایا گیا ہے جس کے معنی توبہ کے ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ ہم تیری بارگاہ میں پلٹ آئے، یہ ابن جریج سے منقول ہے اور انھیں یہ نام اس لئے دیا گیا کہ انھوں نے بچھڑے کی پرستش سے توبہ کر لی تھی۔
کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یہوذا کی جانب منسوب ہیں جو جناب یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ عربی میں ذال کو دال سے بدل دیا گیا۔
بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کو اسلام اور دین موسیٰؑ سے انحراف کرنے کے سبب یہود کہا گیا۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے اس نام کی وجہ یہ ہے یہ لوگ توارات کی تلاوت کے وقت ہلتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب اللہ نے جناب موسیٰؑ کو توارات عطا کی تھی تو اس وقت آسمان وزمین حرکت میں تھے۔ یہود اسم جمع ہے جس کا واحد یہودی ہے مانند زنجی و زنج، رومی و روم۔
نصاریٰ نصران کی جمع ہے عربوں کے قول کے مطابق سکران و سکاریٰ، ندمان و ندامیٰ کے مطابق۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔
یہ بھی کہا گیا ہے: نَصَارٰی کا واحد نصری ہے مانند مھری و مھاری۔ اس نام کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ نصاریٰ نَاصِرَہ قریہ سے ہے جہاں جناب عیسیٰؑ رہتے تھے چنانچہ نصاریٰ کی نسبت ناصرہ کی طرف دی گئی ہے۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے کی نصرت و مدد کرنے کے سبب یہ نام دیا گیا۔
یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اس نام کی وجہ جناب عیسیٰؑ کا یہ ارشاد ہے: قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (سورۂ آل عمران، آیت ۵۲) (ان سے کہا کہ کون ہے جو خدا کی راہ میں میرا مددگار ہوگا؟ حواریون نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں)
صابِئُون جمع ہے صابئی کی جو کسی دوسرے دین کی طرف منتقل ہو جائے اور ہر وہ انسان جو کسی دین پر ہو اس دین سے نکل جائے لغت میں اسے صابئی کہتے ہیں گویا صابئی کے معنی اس دین کو ترک

کرے جو اس کے لیے بطور شریعت (قانون الہی) قرار دیا گیا تھا۔ دوسرا دین اختیار کرنا ہے جس دین کو اس نے ترک کیا ہے وہ توحید الہی ترک کر کے ستارہ پرستی اختیار کرنا یا ستارہ کی تعظیم و احترام کرنا ہے۔ قتادہ نے بیان کیا ہے کہ یہ قوم (ستارہ پرست) مشہور ہے، یہ ان کا مذہب ہے جس میں وہ منفرد ہیں، ان کے دین میں ستارہ پرستی ہے۔ یہ لوگ خالق کائنات، قیامت اور بعض انبیاء کا اقرار کرتے ہیں۔ مجاہد و حسن نے بیان کیا ہے کہ الصابِئُون یہودیوں اور مجوسیوں میں بے دین افراد کو کہتے ہیں۔ یہ اہل کتاب کا ایک گروہ ہے، جو زبور کی تلاوت کرتے ہیں۔ خلیل نے بیان کیا ہے کہ وہ قوم ہے جس کا دین دین نصاریٰ سے مشابہ ہے مگر ان کا قبلہ جنوب کی جانب ہے، ان کا خیال ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کے دین پر ہیں جو موصل جزیرہ میں تھے۔ 'لا الہ الا اللہ' کہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اسی وجہ سے مشرکین پیغمبرؐ اور آپؐ کے اصحاب سے کہتے تھے وہ تمام صابِئُون ہیں، ان سے تشبیہ دیتے تھے۔

دیگر حضرات کا کہنا ہے کہ یہ اہل کتاب کا ایک گروہ ہے، تمام فقہاء ان سے ٹیکس وصولنا جائز قرار دیتے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک یہ جائز نہیں ہے چونکہ یہ لوگ اہل کتاب نہیں ہیں۔

ترکیب:

اِنَّ کی خبر جملہ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ہے؛ اس لئے کہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان میں سے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان لایا، مِنْهُمْ کا ذکر نہیں کیا ہے اس لئے کہ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔

لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ مقام جزا میں ہے۔ لَا خَوْفٌ کو رفع دیا ہے اس لئے لَا کی تکرار ہوئی ہے جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

وَ مَا صَرَمْتُكِ حَتّٰى قُلْتِ مُعْلِنَةً لَا نَاقَةٌ لِيْ فِيْ هٰذا وَ لَا جَمَلُ

(میں نے تجھے الگ نہیں کیا جب تک تو نے علی الاعلان نہیں کہا کہ اس میں نہ میرے پاس کوئی اونٹنی ہے اور نہ کوئی اونٹ ہے)

یہ شعر گویا جواب ہے اس شخص کا جو یہ سوال کرتا ہے کہ: أَنَاقَةٌ لَكَ فِيْ هٰذا أَمْ جَمَلٌ۔

ہاں اگر نکرہ مفردہ ہو تو اس میں صرف فتحہ ہوگا جیسے: لَا رَجُلَ فِي الدَّارِ اور یہ اس شخص کا جواب ہے جو یہ سوال کرتا ہے کہ: هَلْ مِنْ رَّجُلٍ فِي الدَّارِ، کیا گھر میں کوئی مرد ہے؟

خدا نے مَنْ آمَنَ فرمایا ہے اور فعل مفرد لایا ہے پھر فرمایا ہے: فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ یہاں جمع کی ضمیریں لایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مَنْ لفظ کے اعتبار سے واحد اور معنیٰ کے لحاظ سے جمع ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

تفسیر:

قانونِ نجات

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ، ان مومنین کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون ہیں؟ ایک گروہ نے کہا ہے: یہ وہ افراد ہیں جو جناب عیسیٰؑ پر ایمان لائے پھر نہ تو انھوں نے یہودیت اختیار کی، نہ نصرانیت اور نہ ہی ستارہ پرست بنے اور انھوں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا انتظار کیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ طالب دین ہیں جن میں حبیب نجار وقُس بن ساعدہ وزید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل و براء الشنی وابوذر غفاری وسلمان فارسی وبحیرا راہب اور نجاشی کا وفد ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے حضورؐ کی بعثت سے قبل ان میں بعض وہ ہیں جنہوں نے آپؐ کا زمانہ درک کیا اور آپؐ کی متابعت کی اور بعض نے آپؐ کا زمانہ درک نہیں کیا اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ گذشتہ امتوں کے اہل ایمان ہیں اور کہا گیا ہے اس امت کے مومنین ہیں۔ سُدی نے کہا ہے: وہ سلمان فارسی اور ان کے اصحاب نصاریٰ ہیں جن کی نصرت ان کے ہاتھوں کی جاتی تھی حضورؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے اور انھیں خبر دی گئی تھی کہ وہ عنقریب مبعوث ہوں گے اگر وہ انھیں درک کریں گے تو ان پر ایمان لائیں گے۔ اس قول میں اختلاف کیا گیا ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ، اس جملہ کے بارے میں اختلاف کیا ہے، ایک گروہ نے کہا ہے: یہ یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرستوں کے بارے میں خبر ہے۔ ضمیر تمام کی طرف پلٹ رہی ہے اس لیے کہ وہ ایمان لا کر مومن ہو گئے، ان کے لیے از سرنو ایمان کی شرط لگانے کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔ گویا کہا جا رہا ہے جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرستوں میں سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے ان کے لیے اجر ہے۔ دیگر نے کہا: ان میں سے جو ایمان لائے اس کی ضمیر تمام کی جانب پلٹ رہی ہے (ضمیر) صاحبان ایمان کی طرف پلٹے گی جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو اپنے ایمان میں ثابت ہیں انھوں نے تبدیلی کو ترک کر دیا ہے اسی طرح ضمیر کا یہود، نصاریٰ اور صابئین کی جانب پلٹنا جو پیغمبرؐ اور آپ جو کچھ لائے ہیں ان پر از سرنو ایمان لانا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور گذشتہ کتب پر ایمان کے بعد پیغمبرؐ پر

ایمان لائے اس لیے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا جس کی مثال اللہ کا یہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (سورۂ محمد، آیت ۲) (اور جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے اس پر بھی ایمان لائے ہیں)

ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: یہ آیت اللہ کے اس ارشاد سے منسوخ ہوگئی: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۸۵) (اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا)

یہ قول بعید ہے اس لیے کہ نسخ کا ایسی خبر پر داخل ہونا صحیح نہیں ہے جو وعدہ پر مشتمل ہو بلکہ نسخ کا احکام شرعیہ پر داخل ہونا صحیح ہوتا ہے جن میں مصلحت کے تغیر و تبدیلی کے ساتھ (حکم) کا تبدیل ہونا ممکن ہوتا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ اس قول کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔

ایک گروہ نے کہا ہے: (آیت) کا حکم ثابت ہے اس سے مراد منافقین، یہود و نصاریٰ اور ستارہ پرست ہیں جنہوں نے فقط زبان سے ایمان کا اقرار کیا اور دل سے ایمان قبول نہیں کیا۔ جب وہ نفاق کے بعد ایمان اور عناد و دشمنی کے بعد اسلام قبول کریں گے تو ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہوگا جس طرح وہ نفاق و عناد کے بغیر ایمان کی پہلی دعوت پر ایمان لائے ہوں مسلمانوں کا ایک گروہ کہتا تھا کہ جو نفاق اور عناد کے بعد اسلام لائے گا اس کا ثواب مختصر اور اجر قلیل ہوگا۔ اس آیت کریمہ کے ذریعہ خداوند عالم نے باخبر کیا ہے کہ دونوں اجر و ثواب میں مساوی ہیں۔

ارشاد الٰہی: بِاللّٰهِ، یعنی اللہ کی توحید اس کے صفات اور عدل پر: وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یعنی روز قیامت، بعث و نشور اور جنت و جہنم پر، وَعَمِلَ صَالِحًا، اللہ نے جس چیز کا حکم دیا ہے اطاعت کے بارے میں اس پر عمل کرے ترک گناہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لیے کہ گناہوں کا ترک کرنا اعمال صالحہ ہیں۔ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ، ان کی جزا اور ثواب، عِنْدَ رَبِّهِمْ، ان کے پروردگار کے پاس موجود ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، اس کی تفسیر سابق میں گذر چکی ہے۔ اس کے معنی میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ پر انھیں حزن و ملال نہیں ہے اور آئندہ کا خوف نہیں ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ انھیں عقبیٰ کا خوف نہیں ہوگا اور دنیا پر حزن نہیں ہوگا۔

اس آیت میں دلالت ہے کہ دل سے تصدیق اور اعتقاد کا نام ایمان ہے۔

خدا کا ارشاد: مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ پر عمل صالحاً کو عطف کیا ہے: وَعَمِلَ صَالِحًا، جس نے عمل صالحاً کو تاکید یا فضل (اضافی) مانا ہے اس نے ظاہر کو ترک کر دیا اس لئے کہ پہلے جملہ میں معطوف کے داخل ہونے کے بعد دوسرے جملہ کو پہلے جملہ پر عطف کرنا ان آیات کے مانند ہے کہ: فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (سورۂ رحمٰن، ۶۸) ان میں بکثرت پھل نیز کھجور اور انار کے درخت بھی ہوں گے۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ: جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا میثاق (عہد و پیان) لیا آپ سے اور نوح سے، یہ سب بر بنائے مجاز ہے اگر ظاہر سے ظاہر کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ دوم اول میں داخل نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾
اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور کوہ طور کو تمھارے اوپر بلند کر دیا کہ جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا اور اس میں مندرج احکام کو یاد رکھنا ہو سکتا ہے اس طرح تم پرہیزگار بن جاؤ۔

الفاظ و معانی:

مِيْثَاق وَثِيْقَة سے مِفْعَال کے وزن پر ہے یا قسم کے ذریعہ ہے یا عہد کے ذریعہ ہے یا معاہدہ ہے۔

طُوْر لغت میں پہاڑ کے معنیٰ میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے طور اس پہاڑ کا نام ہے جس پر موسیٰؑ نے اللہ سے مناجات کی تھی۔ یہ ابن عباس نے کہا ہے۔ قوت، قدرت و طاقت ہے جو کہ عَرَض (پیش کردہ چیز) ہے جس کے ذریعہ زندہ قدرت مند ہو جاتا ہے، ہر جسم قادر بس اتنی ہی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اپنا جسم ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔

اَلْاَخْذ (لینا) عطا کی ضد ہے۔

ترکیب:

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ محلاً منصوب ہے قُلْنَا لَکُمْ خُذُوْا کو فرض کرنے کی صورت میں جیسا کہ آپ کہتے ہیں: اَوْجَبْتُ عَلَیْهِ قُمْ: میں نے اس پر لازم قرار دیا ہے کہ کھڑے ہو یعنی اَوْجَبْتُ عَلَیْهِ فَقُلْتُ: قُمْ: میں نے اس پر لازم قرار دیا اور کہا: قُمْ۔

فراء نے کہا: اَخَذَ مِیْثَاق خود قول ہے کلام میں ضرورت نہیں ہے کہ قول کا پوشیدہ ہونا فرض کیا جائے، مگر یہ کہ مناسب ہے کہ وہ کلام جو قول کے معنیٰ میں ہے اگر اس میں کوئی ایسی چیز ہو جو قول کے مخالف ہو تو اس کے ساتھ اَنْ ہونا چاہئے جیسا کہ ارشاد الٰہی: اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ۔

نیز یہ کہا: اَنْ کو حذف کرنا جائز ہے۔ مَا یہاں پر محلاً منصوب ہے۔

تفسیر:

آیات الٰہی کو پوری طاقت سے پکڑو

اور کہا: وَاذْكُرُوْا اور یاد کرو وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ اس وقت کو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ اور عہد وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو خلق فرمایا ہے۔ جیسے توحید اور عدل اور ان کے لئے حجج واضحہ (روشن دلائل) اور براہین ساطعہ (واضح ثبوت) مقرر فرمائے ہیں جو اس بات کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں اور انبیاء و مرسلین کی صداقت کی وضاحت کر رہے ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو خداوند عالم نے اپنے رسولوں سے اس ارشاد میں لیا ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۸۱) (اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا۔ ہم نے جو تمہیں کتاب و حکمت سے نوازا ہے اس کے بعد تمہارے پاس کوئی رسول اس کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ (یہ ارشاد فرما کر) اللہ نے پوچھا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس کی ذمہ داری کا عہد اٹھا لیا؟ انہوں نے

کہا: ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں)
بیان کیا گیا ہے کہ جناب موسیٰؑ سے توریت کا عہد لیا تھا۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (اور ہم نے کوہ طور کو تم پر بلند کر دیا) ابوزید نے کہا ہے: یہ اس وقت ہوا جب جناب موسیٰؑ کوہ طور سے پلٹے اور توریت کی الواح اپنے ہمراہ لے کر آئے تو انھوں نے اپنی قوم سے کہا: میں تمہارے پاس الواح لے کر آیا ہوں۔ جس میں توریت اور حلال وحرام (کے احکام) ہیں اس پر عمل کرو۔ لوگ کہنے لگے آپ کی بات کون تسلیم کرے گا؟ خداوند عالم نے ملائکہ کو بھیجا یہاں تک کہ انھوں نے پہاڑ کو ان کے سروں پر بلند کر دیا۔ جناب موسیٰؑ نے ان سے کہا: اگر تم میری دی ہوئی چیز (توراۃ) کو قبول کرتے ہو (تو بہتر) ورنہ یہ ملائکہ پہاڑ کو تمہارے اوپر سے چھوڑ دیں گے۔ انھوں نے توریت لے لی اور اللہ کا سجدہ کرنے لگے (دوران سجدہ) پہاڑ کو بھی دیکھ رہے تھے۔
یہی سبب ہے کہ یہودی اپنے چہرے کے ایک رخ سے سجدہ کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ عہد لینے کے یہی معنی ہیں (یہ واقعہ) ان کے اوپر پہاڑ بلند ہونے کے وقت کا ہے۔ اسی حالت میں ان سے کہا گیا: خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ. ہم نے جو توریت، دی ہے اسے پکڑلو بِقُوَّةٍ، محکم یقین کے ساتھ جس میں کسی قسم کا شک نہ ہو۔ یہ ابن عباس قتادہ اور سُدی کا قول ہے۔ اسی سے نزدیک وہ قول ہے جس کی روایت عیاشی نے کی ہے (وہ کہتے ہیں کہ) امام صادق علیہ السلام سے اس ارشاد الٰہی: خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ، کے بارے میں سوال کیا گیا کہ جسمانی قوت و طاقت مراد ہے یا قلوب کی طاقت؟ تو امامؑ نے فرمایا: دونوں مراد ہیں۔ کہا گیا ہے (توراۃ) کا قوت کے ساتھ لینا عزم و یقین کے ساتھ اس پر عمل کرنا ہے اور کہا گیا ہے کہ قدرت کے ساتھ اور تم اس کے حاصل کرنے پر قادر رہو۔ یہ قول ابوعلی اور اصم سے مروی ہے۔ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ، فِيْهِ کی ضمیر مَآ اٰتَيْنٰكُمْ میں 'مَا' کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی توراۃ ہے۔ جو کچھ توراۃ میں حلال وحرام موجود ہے اس کی حفاظت کرو، اسے فراموش نہ کرو۔

بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی ہیں جسکے ترک کرنے پر عذاب ہے اسے یاد رکھو اور یہ امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں جو کچھ موجود ہے اس پر عمل کرو اسے ترک نہ کرو۔
بیان کیا گیا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں: ہم نے جو تمھیں عطا کیا ہے اس میں وعدو عید اور ترغیب و خوف

ہے۔ اس میں غور وفکر کرو، اس سے نصیحت حاصل کرو اور اسے قبول کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، تاکہ تم اس کے بجالانے پر مجھ سے ڈرتے رہو۔ جب تم اسے انجام دو گے تو میرے عذاب سے ڈرو گے۔ میری اطاعت و فرمانبرداری کرو گے اور معصیت و نافرمانی سے پرہیز کرو گے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾
مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے۔ (اس کے باوجود) اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔

الفاظ و معانی:

تَوَلَّيْتُمْ کے معنی ہیں: تم نے اعراض و انحراف کیا۔ عرب وَلَّاهُ فُلَانٌ دُبُرَهٗ اس وقت کہتے ہیں جب کسی سے پیٹھ پھیری جائے اور اسے اپنی پشت کے پیچھے قرار دیا جائے پھر اس کا استعمال ہر حکم کرنے والے کی اطاعت کو ترک کرنے میں کیا جانے لگا اور کسی سے روگردانی کرنے کو تَوَلّٰی فُلَانٌ عَنْ طَاعَةِ فُلَانٍ وَ تَوَلّٰی عَنْ صَدَاقَتِهٖ یعنی فلاں نے فلاں کی اطاعت سے روگردانی کی جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا اٰتَاهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا، یعنی انھوں نے اللہ سے اپنے اس قول کے ذریعہ کیے گئے وعدہ کی مخالفت کی کہ ''ہم ضرور تصدیق کریں گے اور صالحین میں سے ہو جائیں گے''

خَاسِر وہ شخص ہے جس کا رأس مال (اصل پونجی) برباد ہو جائے۔ انسان کا رأس مال اس کا نفس ہے اس کے علاوہ اسے منافع میں سے جو کچھ بھی حاصل ہو جائے وہ ربح (فائدہ) ہے۔

تفسیر:

اگر فضل خدا نہ ہوتا۔۔۔

اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ پھر تم نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اس سے روگردانی کی جو ہم نے تم سے تمہارے پیمانوں کے بعد لیا تھا۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ، اگر اللہ نے تمہارے عہد و پیمان کے توڑنے کے بعد جس کا تم نے وثوق واطمینان دلایا تھا توبہ کے سبب تم پر اپنا فضل نہ کیا ہوتا جب تم پر طور کو بلند کیا،

تم پر اسلام اور اس کی رحمت عطا کی جس رحمت کے ذریعہ تمھاری خطاؤں سے درگذر کیا، تمہارے اپنے پروردگار کی جانب مراجعت کے سبب۔ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ، (توتم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے) ابو العالیہ نے بیان کیا ہے: اللہ کا فضل ایمان اور اس کی رحمت قرآن ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم تمھیں بیان لانے پر قدرت عطا نہ کرتے اور راہ ایمان کی رکاوٹوں کو دور نہ کرتے کہ تم ایمان لے آئے تو تمھارا شمار نقصان اٹھانے والوں میں ہوتا۔ ایمان کو فضل و رحمت قرار دیا ہے جسکے سبب انھوں نے نجات حاصل کی ہے، اس کے سبب نقصان اٹھانے والوں میں شامل نہیں ہوتے ہیں کہ یہ فضل ہی انھیں اس کی جانب دعوت دینے والا، اسے قدرت عطا کرنے والا اور اس میں رغبت پیدا کرانے والا ہے۔

ممکن ہے اس کے معنی یہ ہوں کہ اللہ کی اطاعت سے روگردانی کرنے کے بعد اگر میں سے بعض لوگوں کے اللہ کی جانب پلٹنے اور خدا کے ان کی توبہ قبول کرنے کے بعد تمھیں مہلت دے کر تم پر خدا کا فضل نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔ ممکن ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تمھیں توبہ کی توفیق عطا کرنے اور تمھارے ساتھ لطف و مہربانی کی خاطر تمھارے سروں پر پہاڑ کو بلند کرنے میں میرا فضل تم پر نہ ہوتا یہاں تک کہ عذاب ٹل گیا اور پہاڑ کرنے سے بچ گیا، تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾
تم اپنی قوم کے ان لوگوں کے بارے میں تو جانتے ہی ہو جنھوں نے سَبت کا قانون توڑا تھا، تو ہم نے انھیں حکم دیا "تم ذلیل و خوار بندر بن جاؤ۔"

الفاظ و معانی:

عَلِمْتُمْ کے معنی ہیں: تم نے پہچان لیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (سورۂ انفال ر ۶۰) اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کردو جنہیں تم نہیں پہچانتے مگر اللہ انہیں پہچانتا ہے۔

وَاعْتَدَوْا یعنی انہوں نے ظلم ڈھایا اور اپنی حد سے تجاوز کیا۔

سبت۔ ہفتہ، سنیچر۔ ہفتہ کے دنوں میں سے ایک دن۔ ہفتہ کے دن ہر شئے کو خلق کیا گیا۔ بعض علماء نے کہا کہ اس دن کو سبت اس لئے کہا جاتا ہے: اَلْیَهُوْدُ یَسْتَبُوْنَ فِیْهِ کہ یہودی اس دن سبت سے کام لیتے ہیں یعنی اس دن کوئی کام انجام نہیں دیتے۔ اسے سبت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں راحت وسکون ہے۔

اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (سورۂ نبا، آیت ۹) اور ہم نے تمہاری نیند کو سکون کا ذریعہ بنایا اور نَائِم یعنی سونے والے کو مَسْبُوْت کہتے ہیں اس کی استراحت اور جسم کے پرسکون ہونے کی وجہ سے۔

قِرَدَۃ قِرْد کی جمع ہے بندر اور بندریا کو قِرْدَۃ کہتے ہیں۔

اَلْخَاسِی کے معنی ہیں دور کیا ہوا، دھتکارا ہوا۔

تفسیر:

روز شنبہ کے نافرمان

خداوند عالم نے یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ، تم نے پہچان لیا، الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ (ان لوگوں کو جنھوں نے سبت کا قانون توڑا تھا) یعنی جنہوں نے تجاوز کیا شنبہ کے دن شکار نہ کرنے کے حکم کی مخالفت کی۔ مچھلیاں ہفتہ کے روز امن کی بنا پر جمع ہو جاتی تھیں اور بنی اسرائیل جنھیں وہ ہفتہ کے روز روک لیتے اور یکشنبہ کو انہیں پکڑ لیتے تھے۔ انھوں نے ہفتہ سے (متعلق حکم میں) سرکشی کی، ظلم کیا اور مقررہ حد سے تجاوز کیا اس لیے کہ ان کا شکار کرنا انھیں مقید کرنا ہے۔ حسن سے روایت کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل نے ہفتہ کے روز حلال سمجھتے ہوئے شکار کیا جب کہ انھیں اس کی نہی کی گئی تھی۔ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً. (توہم نے انھیں حکم دیا کہ ذلیل وخوار بندر بن جاؤ) یہ فعل کو بہت جلد انجام دینے اور انھیں مسخ کرنے سے متعلق خبر ہے۔ یہاں پر امر ہے جسکے معنی ہیں ہم نے انھیں بندر بنا دیا۔ یہ اس ارشاد الٰہی کے مانند ہے: ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ۔ (سورۂ فصلت، آیت ۱۱) (پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت دھواں تھا تو اس نے اسے اور زمین کو حکم دیا کہ خوشی خوشی یا بکراہت ہماری طرف آؤ ان دونوں نے کہا: ہم فرماں بردار بن کر

تیرے حضور آ گئے)

اس مقام پر یہ قول نہیں ہے بلکہ فعل کے بآسانی انجام پانے اور اس کی مشقت و دشواری کے بغیر تکوین (قرار پانے) کی خبر دی گئی ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے: اللہ نے انھیں عذاب کر کے مسخ کر دیا وہ آواز نکال رہے تھے، تین روز تک زندہ رہے، نہ کھا سکتے تھے، نہ پی سکتے تھے، نہ ہی افزائش نسل کر سکے تھے۔ پھر خداوند عالم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ ان پر تیز آندھی چلی جس نے انھیں پانی میں پھینک دیا۔ خدا نے جس امت کو بھی مسخ کیا اسے ہلاک کر ڈالا۔ موجودہ بندر اور خنزیر اس مسخ شدہ بندروں کی نسل سے نہیں ہیں البتہ بنی اسرائیل کو ان کی صورت میں مسخ کیا گیا تھا۔

اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے کہ بندروں اور خنزیروں میں سے جناب آدمؑ کی اولاد نہیں ہیں اور اگر مسخ شدہ (بندروں اور خنزیروں) سے ہوتے تو وہ بھی فرزندان آدم ہوتے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ بندروں کی شکل میں مسخ نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ ایک مثال ہے جسے اللہ نے پیش کیا ہے جس طرح ارشاد ہوتا ہے: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا۔ اسی طرح ان کی بھی حکایت کی گئی ہے کہ ان کے قلوب مسخ کئے گئے تھے۔ ان کے قلوب کو بندروں کے قلوب کے مانند کر دیا تھا؛ نہ تو وہ وعظ و نصیحت قبول کر پا رہے تھے نہ ہی نہی اور مخالفت سے پرہیز کر رہے تھے۔

یہ دونوں اقوال اس ظاہر کے خلاف ہیں کہ جس پر بیشتر مفسرین کی رائے ہے بغیر اس ضرورت کے جو اس کی جانب دعوت دے: خَاسِئِينَ، یعنی خیر سے دور کئے جانے والے۔ کہا گیا ہے کہ ذلت و رسوائی مردود حالت میں۔ یہ روایت مجاہد سے منقول ہے۔ ان آیات میں اللہ کی جانب سے یہودیوں پر ان کے آباء و اجداد پر مسلسل نعمتوں کے نازل کرنے اور رسول سے اللہ سے متعلق خبر دینے اور ان کے بزرگوں کی مسلسل دشمنی کرنے، روشن آیات اور واضح معجزات کے باوجود ان کے کفران نعمت اور گناہ کرنے پر حجتیں اور دلائل ہیں۔ ان چیزوں کے ذریعہ پیغمبرؐ کے قلب کی تثبیت کی جا رہی ہے اور انھیں دلاسا دیا جا رہا ہے ان مصیبتوں پر کہ آپ بنی اسرائیل سے سہہ رہے تھے اور ان کے مکر و فریب ان کے انکار، کفر اور عناد و دشمنی سے اظہار بیزاری ہے تاکہ حضور کا قیام و ثبات قدم ان کے بزرگوں کے مقابلہ میں ان کے لیے حجت ہے، ان کے خواہشات والحاد میں ہمیشہ مبتلا ہونے میں اور ان کے لیے تحذیر (خوف زدہ کرنا) ہو کہ ان کے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو ان کے آباء و اجداد کے ساتھ کیا گیا۔

❀❀❀❀❀

فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۶۶﴾

اس طرح ہم نے ان کے انجام کو اس زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے سامان عبرت اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

الفاظ ومعانی:

اَلنَّکَال کے معنی ہیں کسی اور کو خوفزدہ کرنا اور اس کے لغوی معنی منع کرنے اور روکنے کے ہیں اس لئے کہ یہ نَکَلَ سے مشتق ہے اور اس کے معنی قید کرنے کے ہیں اور وہ لِجَام یعنی لگام بھی ہے۔ سزا کو نَکَال کہا جاتا ہے اس لئے کہ یہ روک دیتا ہے اس چیز کے ارتکاب کرنے سے جسے ان لوگوں نے انجام دیا تھا جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اور مَوۡعِظَة وعظ ونصیحت ہے اور اس کے لغوی معنی ڈرانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: وَعَظۡتُ فُلَانًا مَوۡعِظَةً وَعِظَةً میں نے فلاں کو وعظ کیا، موعظت ونصیحت۔

تفسیر:

متقین کے لئے موعظہ

فَجَعَلۡنٰهَا (ہم نے انھیں قرار دیا) ضمیر ھَا اس قوم کی جانب پلٹ رہی ہے جو مسخ کر دی گئی تھی جو ایلہ قریہ کے باشندے تھے۔ یہ قریہ دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ اس کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے یا تو مسخ کی جانب پلٹ رہی ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے۔ یا قریۃ کی جانب پلٹ رہی ہے جس کے باشندوں نے وہاں پر سرکشی کی تھی۔ نَکَالًا یعنی عذاب۔ کہا گیا ہے کہ شہرت یا رسوائی۔ کہا گیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یاددہانی اور عبرت قرار دیا۔

ارشاد ہوتا ہے: لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا۔ اس میں متعدد وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: ابن عباس اور ضحاک نے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ان امتوں کے لئے جو ان کے دور میں موجود تھیں اور جو ان کے بعد آئیں اور جو ان کے بعد آتی رہیں گی۔ یہ اس روایت سے نزدیک ہے جو

امام باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے کہ آپ حضرات نے فرمایا: لما بین یدیھا یعنی ان لوگوں کے لئے جو ان کے ساتھ تھے اور دیکھ رہے تھے۔ وما خلفھا یعنی ہم ہیں اور اس میں ہمارے لئے موعظہ اور پند ونصیحت ہے۔ اس طرح ''مَا'' ''مَنْ'' کے معنی میں ہے، یعنی یہ سامان عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو ان کے ساتھ تھے اور تا قیامت آتے رہیں گے تا کہ وہ ایسے کام نہ کریں جو انھوں نے انجام دیئے تھے۔

دوم: مراد یہ ہے کہ ہم نے اسے ان کے گذشتہ گناہوں کے لیے عذاب قرار دیا اور بعد کے گناہوں کے لیے جو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ ان کے ساتھ عذاب میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ یہ روایت ابن عباس سے منقول ہے۔ اس طرح لام سبب کے معنی میں ہوگا یعنی اس کے سبب سے۔

سوم: لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا، سے قریہ اور اس کے بعد کے قریہ مراد ہوں۔ یہ روایت عکرمہ سے مروی ہے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے۔

چہارم: لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا، سے ان کی گذشتہ اور بعد والی خطائیں مراد ہیں۔ جن کے سبب انھیں ہلاک کیا گیا۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ اس کے معنی ہیں کہ اس سے متقین وعظ ونصیحت حاصل کرتے ہیں گویا یہ ان کے لیے موعظہ ہے دوسروں کے لیے نہیں۔ یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو گذشتہ اور ان کے بعد والوں کی طرح افعال انجام دے گا انہی کے مانند تغیر خلقت کی طرح عذاب کا حق دار ہوگا اگر یہ ان سب کے لئے نکال ہے اور یہ صاحبان تقویٰ کے لئے خوف دلانا ڈرانا ہے تو اس لئے کہ وہ ان لوگوں کے مانند گناہ انجام نہ دیں ورنہ انھیں کے مانند عذاب کے مستحق ہوں گے۔ ہم اللہ سے اس کی نافرمانی سے پناہ مانگتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے کیا آپ ہم سے مذاق کررہے ہیں؟ موسیٰ نے کہا میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہوجاؤں (٦٧) انھوں نے کہا آپ اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں گائے کی ماہیت بتائے، موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے ایسی گائے چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اس کے درمیان اوسط عمر کی ہو اب تمھیں جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرو۔ (٦٨) وہ کہنے لگے اپنے رب سے پوچھیے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہو اس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہو۔ (٦٩) وہ کہنے لگے اے موسیٰ اپنے رب سے وضاحت طلب کریں کہ کیسی گائے چاہیے؟ کیوں کہ اس کی شناخت میں ہمیں اشتباہ ہوگیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب ہم اس گائے کو تلاش کرلیں گے۔ (٧٠) موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے نہ خدمت لی جاتی ہے، نہ وہ زمین جوتتی ہے اور نہ ہی کھیتوں کو سیراب کرتی ہے، صحیح وسالم اور بے داغ ہے، وہ لوگ کہنے لگے اب آپ نے ٹھیک ٹھیک پہچان بتائی ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کر دیا حالانکہ وہ ایسا کرنے والے نہیں تھے۔

قرائت:

حمزہ نے اور اسماعیل نے نافع سے اور عباس نے ابوعمرو سے پورے قرآن میں هُزْءًا اور كُفْوًا کی قرأت کی ہے۔

حفص نے عاصم سے زاء اور فاء کے ضمہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یعقوب نے هُزُوًا کی زاء کو ضمہ کے ساتھ، كُفْوًا کو فاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بقیہ قراء نے زاء اور فاء کو ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ (هُزُءًا اور كُفُؤًا) پڑھا ہے۔

حجت:

ابوالحسن نے کہا: عیسیٰ نے گمان کیا ہے کہ ہر وہ اسم جو تین حرفی ہو اس کا پہلا حرف مضموم ہو تو عربوں میں سے کچھ لوگ اس کے حرف دوم کو بھی ضمہ دے دیتے ہیں اور کچھ لوگ اسے ساکن رکھتے ہیں: جیسے عُسُر، یُسُر، حُلُم ۔۔۔ اس حکایت کو قوی بنانے والی بات یہ ہے کہ جو جمع فُعُل کے وزن پر ہوتی ہے جیسے كُتُب اور رُسُل تو اس میں دو صورتیں جاری ہیں یہاں تک کہ معتل العین واوی میں بھی آیا ہے جیسے سُوُك۔ اخطل نے کہا:

وَفِي الأَكُفِّ اللَّامِعَاتِ سُوُر

ابوزید نے قُوُل اور قُوُم کی حکایت کی ہے لیکن أفعل کی جمع فُعْل جیسے أحمر کی جمع حُمْر میں تو گویا اس میں سکون کو لازم قرار دیا ہے تا کہ دو جمع کے درمیان فاصلہ ڈالا جائے۔ شعر میں اس میں حرکت بھی آتی ہے جب صورت حال یہ ہے تو واجب ہے کہ كُفُو اور هُزُء میں بھی یہی قاعدہ جاری رہے، جب ہمزہ کو خفیف بنا دیا اور عین الفعل کو ضمہ دے دیا تو لازم ہے کہ ہمزہ کو واؤ سے بدل دیا جائے اور هُزُوًا اور لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ پڑھا جائے۔ اگر کوئی ہمزہ کو خفیف کرے اور عین الفعل کو ساکن کر کے هُزْوًا کر دے تو واؤ جو کہ ہمزہ سے بدل کر آیا ہے اسے باقی رکھے اس لئے کہ اس کا ماقبل مضموم ہے اور اگر لفظ میں عین الفعل مضموم نہ ہو تو اس لئے کہ معنی میں وہی مراد ہے جیسا کہ عربوں نے کہا ہے: لَقَضُو الرَّجُل۔ انہوں نے واؤ کو باقی رکھا ہے اور لام الفعل جو کہ یاء تھا اسے قَضِیتُ سے پلٹا یا نہیں ہے؛ اس لئے کہ معنی میں ضمہ مراد ہے اسی طرح عربوں نے کہا ہے: رضی زید ان کے بارے میں جنہوں نے علم زید کہا ہے انہوں نے بھی واؤ جو کہ لام الفعل تھا

اسے پلٹایا نہیں ہے اس لئے کہ کسرہ زائل ہو گیا ہے وجہ یہ ہے کہ وہ مقدر اور مراد ہے اگر چہ ظاہر میں محذوف ہے اسی طرح آپ هُزُوًا اور كُفُوًا کہتے ہیں واؤ کو باقی رکھتے ہیں اگر چہ ضمہ کو حذف کرتے ہیں جو اختلاف کا سبب بنتا ہے جب صورت حال یہ ہے تو اس شخص کی قرأت کہ جس نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جواز وحسن میں ہمزہ کو باقی رکھا ہے اس شخص کی قرأت کے مانند ہے جس نے ساکن کر کے ہمزہ کو واؤ سے بدل کر رکھا ہے انہوں نے تخفیف (ساکن کرنے) وتثقیل (ضمہ دینے) کے درمیان اختیار دیا ہے۔

الفاظ ومعانی:

بَقَرۃ (گائے) اس جنس کی مادہ کا نام ہے جس کے نر کا نام ثُور (بیل) ہے۔ بَقْر کے اصلی معنیٰ شق کرنا ہیں اور بقر کو بقر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کا کام ہل کے ذریعے زمین کو شگافتہ کرنا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: بَقَرْتُ بَطْنَہٗ اَیْ شَقَقْتُہٗ، میں نے اس کے شکم کو شق کر دیا۔

هُزْء، اَللَّعِب، السُّخْرِیَۃ مشابہ ہیں۔ هُزْء کے معنی کھیل کود اور مذاق اڑانا ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے معنیٰ ہیں: میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اَلْعِیَاذُ کے لغوی معنیٰ یہ ہیں کہ جس کے شر سے خوف ہو اس سے اس چیز کے ذریعہ طلب دفاع کرنا ہے جس سے دفاع کی امید ہو۔

جَھْل علم کی ضد ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حِلم کی ضد ہے۔ صحیح یہ ہے کہ موجودہ چیز کے برخلاف اعتقاد رکھنا جہل ہے۔ یعنی جیسا ماننا ہو اس کے برخلاف ماننا جہل ہے۔

تَبْیِین کے معنیٰ تعریف کے ہیں۔ اس کی اصل بَیْن ہے، یہ فراق وجدائی ہے جو کسی چیز کو بیان کرتا ہے وہ اس کے اشتباہ کو واضح کرتا ہے یہاں تک کہ دوسرا شخص (مخاطب) اسے جان پہچان لیتا ہے۔

فَارِض بڑی اور سن رسیدہ کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے: فَارِض (وہ مادہ) ہے جس نے کئی مرتبہ بچے دیئے ہوں جس کے باعث اس کا شکم کشادہ ہو گیا ہو چونکہ لغت میں الفارض کے معنیٰ وسیع اور موٹے جسم والے کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا جبڑا بڑا ہو۔

بِکْر اس چھوٹی گائے (بچھیا) کو کہتے ہیں جس پر بوجھ نہ لادا جا سکتا ہو۔ انسانوں اور جانوروں میں بِکْر اسے کہتے ہیں جس پر اس کا نر جفتی نہ کرتا ہو۔ ہر چیز کا بِکْر اس کا پہلا ہے۔ بکر وہ جانور ہے جو کسی ایک (بچہ) کو پیدا کرے بِکْر اس کی پہلی اولاد ہے۔ ابن عائشہ نے اپنے والد کے واسطہ سے اپنے جد کے ذریعہ

اس طرح روایت کی ہے: كَانَتْ ضَرَبَاتُ عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَبْكَارًا، (علی ابن ابی طالب کی ضربیں (دشمن پر) نو بنو ہوتی تھیں)

ابن فارس نے مجمع اللغۃ میں بیان کیا ہے: بَکْر (بَ کے فتح کے ساتھ) جوان اونٹ ہے اور عوان بوڑھی سے کم اونٹنی اور چھوٹی سے زیادہ ہے جو ایک بطن بچہ دے یا دو بطن۔

ذبح کے معنی گردن کی رگوں کو منقطع کرنا ہے۔ یہ گائے اور بھیڑ میں کیا جاتا ہے۔ اونٹ کو نحر کیا جاتا ہے۔ اونٹ کا ذبح کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا گیا: اہل مکہ گائے کو مقام نحر سے ذبح کرتے ہیں، اس کا گوشت کھانے میں آپؑ کی کیا رائے ہے؟ ذرا دیر آپؑ خاموش ہوئے پھر فرمایا: خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ، پھر انھوں نے اسے ذبح کیا حالانکہ وہ ایسا کرنے والے نہ تھے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: تم اس جانور کا گوشت نہ کھاؤ مگر جسے صحیح طور پر ذبح کیا گیا ہو یعنی مقامِ ذبح سے ذبح کیا جائے۔

ترکیب:

قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا سے فاء کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ اس سے پہلے کا کلام ذکر فاء سے بے نیاز ہے۔

أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً پر وقف کرنا بہتر ہے جیسا کہ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا میں اسقاط بہتر ہے۔ فَقَالُوا نہیں کہا ہے اگر فاء کے ساتھ کہا جاتا ہے تو بہتر تھا۔ اعراب آپ یہ کہیں: قُمْتُ فَفَعَلْتُ تو فاء کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں تھا اس لئے کہ وہ عطف ہے استفہام نہیں ہے کہ اس پر سکوت صحیح ہو۔

هُزُوًا دو صورتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہے:

(۱) مضاف محذوف ہو اس لئے کہ هُزْءٌ حدث ہے تَتَّخِذُ کا مفعول ثانی مفعول اول ہو گا جیسے یہ ارشاد الٰہی: لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ۔

(۲) هُزْءٌ مَهْزُوءٌ بِهِ کے معنیٰ میں (جس کا مذاق اڑایا جائے) جیسا کہ لفظ صَيْد اس آیہ کریمہ میں أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وغیرہ میں ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ رَجُلٌ رِضًى یعنی رَجُلٌ مَرْضِيٌّ وہ آدمی

کہ جس سے لوگ راضی ہوں یعنی مصدر مفعول کا قائم مقام بن گیا ہے۔

لیکن یہ ارشاد الٰہی ہے کہ: لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا
اس میں کسی محذوف شے کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ دین کوئی عینی اور خارج میں موجود شے نہیں ہے۔

اَعُوذُ بِاللهِ اس کی اصل اَعْوُذُ تھی ضمہ کو واؤ سے منتقل کر کے ساکن یعنی عین کو دے دیا گیا ہے چونکہ اس کے ماضی کے عین الفعل کے متحرک ہونے اور ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے اس میں اعلال ہو گیا تھا لہٰذا مضارع کے عین الفعل میں بھی اعلال کر دیا گیا ہے تا کہ باب ایک طریقہ پر چلے یہی قول اَعَاذَ يُعِيذُ اور اِسْتَعَاذَ يَسْتَعِيذُ کے سلسلہ میں بھی ہے اصل اَعْوَذَ. يُعْوِذُ. اِسْتَعْوَذَ. يَسْتَعْوِذُ ہے۔

لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ، اخفش نے کہا: مرفوع ہے منصوب نہیں ہے، جیسا کہ منفی منصوب ہوتا ہے اس لئے کہ یہ بَقَرَة کی صفت ہے عَوَانٌ مرفوع ہے اس لئے کہ وہ مبتدأ محذوف کی خبر ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: هِيَ عَوَانٌ۔ زجاج نے کہا: فَارِضٌ هِيَ کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی هِيَ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ۔

بَيْنَ ذٰلِكَ کہنا جائز ہے اور بَيْنَ دو یا دو سے زیادہ کے درمیان ہوتا ہے اس لئے کہ وہ جمل کا قائم مقام ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ظَنَنْتُ زَيْدًا قَائِمًا قائل یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کا گمان کیا اور میں نے اس کا گمان کیا، ابوعلی نے کہا: عربوں نے ظَنَنْتُ ذٰلِكَ کہا ہے تو وہ اس بات سے خالی نہیں ہے کہ ذٰلِكَ مصدر کی طرف اشارہ ہے اور جملہ کا نائب ہے جیسا کہ ابوالاسحاق نے کہا ہے اور دو مفعول میں سے ایک کی جانب اشارہ نہیں ہو سکتا ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو دوسرے مفعول کا ذکر کرنا بھی لازم ہوتا ہے جیسا کہ اگر آپ اسم مشار الیہ کا ذکر کریں تو ذٰلِكَ کا ذکر کرنا لازم ہوتا۔ جس طرح جب آپ مبتدا کا تذکرہ کریں تو خبر کا ذکر کرنا بھی لازم ہے۔ یا پھر حال سے معلوم ہو کہ اس کا ذکر کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔

یہاں ذٰلِكَ جملہ کا نائب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی جملہ کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہاں کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی جملہ کا نائب نہیں ہو سکتا ہے۔ ان مقامات پر جہاں جملہ اَلَّذِيْ کے صلہ کے مانند واقع ہو اور نکرہ کی صفت ہو۔ پس یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کے کلام ظَنَنْتُ ذٰلِكَ مصدر کی جانب اشارہ ہے اور وہ ظَنّ ہے اسم مفرد جملہ کی جگہ واقع نہیں ہو سکتا ہے اگر جائز ہوتا کہ وہ جملہ کا نائب واقع ہو تب بھی یہاں پر واقع

ہونا جائز نہیں تھا اس لئے کہ یہ مقام جملوں کے ان مقامات میں سے نہیں ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ذٰلِكَ اشارہ ہے ان چیزوں کی جانب جو گذر چکی ہے جن پر ارشاد الٰہی: لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ دلالت کر رہا ہے اور وہ بکارت وفروض ہے۔ ذٰلِكَ انہیں دونوں پر دلالت کر رہا ہے اوگر ذٰلِكَ جملہ کا قائم مقام ہوتا تو ان دونوں پر دلالت نہ کرتا ہے اس لئے کہ جملہ میں حدث (فعل) کی نسبت محدث عنہ (فاعل) کی جانب دی جاتی ہے اور بکارت وفروض میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کی جانب مسند نہیں ہے کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ مراد ان دونوں صفتوں کے درمیان ہے اور یہ واضح وعیاں بات ہے۔

جان لیجئے کہ وہ اسم کہ مَنْ جس کی جانب مضاف ہے وہ ان باتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہے:

(۱) یا تو وہ واحد پر دلالت کر رہا ہے یا ایک سے زیادہ پر اگر وہ ایک پر دلالت کر رہا ہے تو ایک سے زیادہ پر دلالت نہیں کر رہا ہے کہ اس پر کوئی دوسرا اسم عطف ہو اس لئے کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کی اصل افتراق وجدائی ہے جس طرح زید کے افتراق اور اجتماع کی بات نہیں کی جاسکتی ہے کہ آپ اس کی جانب ایک ایسی چیز کو مضاف کریں کہ جو ایک سے زیادہ ہو اسی لئے کہ آپ بَيْنَ زَيْدٍ نہیں کہہ سکتے ہیں جب تک واؤ عاطفہ نہ کہ دوسرے حروف عاطفہ کے ذریعہ اس کی جانب کسی دوسرے کو مضاف نہ کریں۔

اگر اسم کثرت پر دلالت کرنے والا ہے اگر چہ وہ مفرد ہو تو بَيْنَ کو اس کی جانب مضاف کرنا جائز ہے۔ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ اس میں بَيْنَ کو ذٰلِكَ کی جانب مضاف کیا گیا ہے اس لحاظ سے بین کا قوم اور اس جیسے دیگر اسماء جو کہ کثرت پر دلالت کرتے ہیں ان کی جانب مضاف ہونا صحیح ہے۔

ممکن ہے کہ ہمارا ذٰلِكَ کہنا اس سے ایک بار انفراد اور ایک بار جمع اور کثرت مراد ہو اس لئے کہ وہ موصولہ جیسے اَلَّذِی اور مَا سے مشابہ ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں بات (اشارہ اور موصولہ) اس بات میں مشابہ ہیں کہ دونوں بعینہ کسی چیز پر دلالت نہیں کرتے ہیں پس اس کے کبھی ایک اور کبھی آپ سے زیادہ مراد لے سکتے ہیں اور ہم نے جو بیان کیا ہے کہ ذٰلِكَ سے جمع اور ایک سے زیادہ کا ارادہ کرتے ہیں اس پر دلیل یہ ہے کہ روبہ سے ابوعبیدہ نے شعر میں کہا:

فِيهِ خُطُوطٌ مِنْ سَوَادٍ وَّ بَلَقْ　　كَأَنَّهُ فِي الْجِلْدِ تَوْلِيعُ الْبَهَقْ

اگر خطوط کا ارادہ کیا تو لازم ہے کہ کَاَنَّھَا کہئے۔ تو انہوں نے کہا: میں نے ارادہ کیا وہی تھا پس معلوم ہوا کہ عرب ذٰلِكَ سے غیر مفرد کا ارادہ کرتے ہیں اور اس پر شاعر کا یہ شعر بھی دلالت کرتا ہے:

اِنَّ لِلْخَیْرِ وَلِلشَّرِّ مَدًی وَکِلَا ذٰلِكَ وَجْهٌ وَّقَبَل

آپ مشاہدہ کرتے ہیں کہ کِلَا مفرد کی جانب مضاف نہیں ہوتا ہے اگر ذٰلِكَ سے غیر مفرد مراد نہ ہوتا تو پھر کِلَا ذٰلِكَ کی جانب مضاف نہ ہوتا یہی قول عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِكَ کے بارے میں بھی ہے۔ ذٰلِكَ سے مراد ایک سے زیادہ ہے اور یہ اشارہ ہے کہ اس چیز کی طرف جو گذر چکی ہے اور وہ اس کا قول ہے جو فروض و بکارت پر دلالت کرتا ہے۔

مَا هِیَ اور مَا لَوْنُهَا میں مَا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ مبتدا کی خبر ہے اس لئے کہ اس کی تاویل استفہام ہے یعنی اَیُّ شَیْءٍ هُوَ وَ اَیُّ لَوْنٍ لَوْنُهَا۔

قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا قول کے بعد اِنَّ ہمیشہ مکسور واقع ہوتا ہے گویا آپ نے صدر کلام میں قول کا ذکر نہیں کیا ہے کلام عرب میں قُلْتُ واقع ہوتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ ایسے کلام کی حکایت کی جائے تو اِنَّ کے داخل ہونے سے پہلے بذات خود قائم تھا۔ پس قُلْتُ کے ذکر کے ساتھ اسی لفظ کو ادا کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں: قُلْتُ زَیْدًا مُنْطَلِقٌ بھی صحیح ہے کہ جب آپ اس کی حکایت کریں گے تو کہیں گے: قُلْتُ اِنَّ زَیْدًا مُنْطَلِقٌ۔

عرب کے کچھ لوگ اور وہ بنو سلیم ہیں جو باب قُلْتُ کو باب ظَنَنْتُ جیسا قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں: قُلْتُ زَیْدًا مُنْطَلِقًا۔

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا: لَوْنُهَا مرفوع ہے اس لئے کہ فَاقِعٌ کا فاعل ہے اور وہ بَقَرَةٌ کی صفت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فَقَعَ لَوْنُهٗ فُقُوْعًا اَفْقَعَ، یَفْقَعُ یعنی اس کی زردی خالص ہوگئی۔

اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا. ہر وہ جمع جس کی واحد یاء کے ذریعہ بنتی ہے ہو جیسے: بَقَر، نَخْل، سَحَاب، اسے مذکر و مونث دونوں قرار دے سکتے ہیں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: کَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ (یہاں پر نَخْل کی صفت خَاوِیَة لایا ہے جو کہ مونث اور ایک دوسری آیت نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ فرمایا ہے (نَخْل کی صفت مذکر لایا ہے) حالانکہ مذکر لانا غالب ہے۔

تُثِیْرُ الْاَرْضَ: محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ ذَلُوْلٌ کی صفت ہے اور وہ نفی کے معنی میں داخل ہے یعنی

ایسی گائے کہ جو ذَلُوۡلٌ زمین کھونے والی اور کھیتی کی سینچائی کرنے والی نہ ہو مُسَلَّمَۃٌ بھی بَقَرَۃٌ کی صفت ہے۔

لَّا شِیَۃَ فِیۡہَا: جملہ ہے یہ بھی محلا مرفوع ہے اس لئے کہ بَقَرَۃٌ کی صفت ہے شِیَۃٌ وَشَیۡتٌ کا مصدر ہے اسکی اصل وَشۡیٌ ہے جب واؤ کو گرادیا گیا تو اس کے عوض آخر میں ہاء لے آئے۔ عرب کہتے ہیں کہ وَشَیۡتُہٗ شِیَۃً جس طرح وَزَنۡتُہٗ زِنَۃً و وَصَلۡتُہٗ صِلَۃً پس اس کا وزن عِلَۃٌ ہے۔

قَالُوا الۡاٰنَ: اس میں چند صورتیں پائی جاتی ہیں کہ سب سے بہترین صورت الآن میں لام کو ساکن قرار دینا ہے اور لفظ سے واؤ کو حذف کرنا ہے قَالَ الۡاٰنَ بھی کہنا صحیح ہے کہ الۡاٰنَ سے ہمزہ کو کالعدم اور لام کو فتحہ دے دیا جائے اور واؤ کو محذوف چھوڑ دیا جائے التقاء ساکنین کی بنا پر اور فتحہ کو شمار نہ کیا جائے۔

قَالُوا الۡاٰنَ بھی کہنا صحیح ہے واؤ کو ظاہر کیا جائے لام کی حرکت کی بنا پر اس لئے کہ عربوں نے واؤ کو حذف کر دیا ہے اس کے ساکن ہونے کی بنا پر جب واؤ کو حذف کرنا ہی زیادہ بہتر ہے اور سزاوار نہیں ہے کہ پڑھا جائے مگر یہ کہ صحیح روایت میں وارد ہو اس لئے کہ قرأت اتباع و پیروی لانے جانے والی سنت ہے۔

ابو علی نے کہا: الۡاٰنَ مبنی ہے اس لئے کہ اس میں حرف کے معنی پائے جاتے ہیں اور تعریف (معرفہ بنانے) کے معنیٰ ہیں اس لئے کہ تعریف (معرفہ بنانے) کا حکم یہ ہے کہ حرف کے ذریعہ ہو۔ اس میں موجود الف لام سے معرفہ نہیں بناتا ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو لام کو داخل ہونے سے پہلے اسے نکرہ ہونا چاہئے تھا۔ جیسے رَجُلٌ اور اَلرَّجُل اسی طرح اَلَّذِیۡ بھی ہے اس لئے کہ اس میں بھی الف لام ہے اور ان دونوں کے ذریعہ معرفہ نہیں بنانا ہے بلکہ ان دونوں سے ہٹ کر معرفہ بناتا ہے۔

اور وہ اس کا اسم موصول مخصوص ہونا ہے اگر اَلَّذِیۡ لام کے ذریعہ معرفہ بنتا تو پھر سارے موصولات جو کہ صلہ کے ذریعہ معرفہ ہوتے ہیں جیسے مَنۡ و مَا تو یہ سب کے سب غیر معرفہ ہوتے۔ لام کے زائد ہونے کے قول کو وہ روایت قوی بناتی ہے جیسے مبرد نے مازنی سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے اصمعی سے اس شعر کے بارے میں سوال کیا:

وَلَقَدۡ جَنَیۡتُكَ اَکۡمُؤًا وَّعَسَاقِلا   وَلَقَدۡ نَهَیۡتُكَ عَنۡ بَنَاتِ الۡاَوۡبَر

اَلۡاَوۡبَر پر الف لام کیوں داخل کیا ہے؟ تو کہا: ضرورت شعری کی بنا پر داخل کیا ہے جیسے ایک دوسرے شاعر کا شعر ہے: بَاعَدَ اُمَّ الۡعَمۡرِو عَنۡ اَسِیۡرِھَا، عمرو پر الف لام داخل کیا گیا ہے۔

ابن عربی نے کہا:

یَا لَیْتَ أُمَّ الْعَمْرِو کَانَتْ صَاحِبِیْ مَکَانَ مَنْ أَنْشَأَ عَلَی الرَّکَائِبِ

پس جس طرح لام اَلَّذِیْ اور اس حکایت میں زائدہ ہے اسی طرح اَلْآنَ میں بھی زائد ہے۔

وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ: کَادَ براہ راست مقاربہ پر دلالت کرتا ہے۔ یَفْعَلُوْنَ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ کَادَ کی خبر ہے اور فصیح یہ ہے کہ اس کی خبر پر اَنْ داخل نہ ہو۔ اس لئے کہ اَنْ ایک ایسا حرف ہے جو اپنے فعل سے مرکب ہو کر مصدر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور اس بات کی طرف مسند ہوتا ہے کہ یہ افعال ثابت اور مستقر نہیں رہی جیسے طمع اور رجاء جیسے عَسَیٰ اَنْ تَفْعَلَ، اور اس بات پر دلیل ہے کہ اَنْ فعل حال پھر داخل نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پر داخل ہوتا ہے جس کے آغاز کی توقع ہو اسی لئے عَسَیٰ کے ساتھ ان کا ہونا لازم ہے اور کَادَ کے ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے اس لئے کہ کَادَ حال سے قریب ہوتا ہے۔

کبھی کبھی کَادَ بھی ان کے ساتھ استعمال ہوا ہے جیسا کہ اصمعی کا شعر ہے:

کَادَتِ النَّفْسُ أَنْ تَفِیْضَ عَلَیْهِ إِذْ ثَوَیٰ حَشْوَ رَیْطَةٍ وَّبُرُوْدٍ

واقعہ

گائے ذبح کرنے کے اللہ کے حکم کے سبب کو یہ ہے عیاشی نے امام رضا علیہ السلام سے ایک مرفوعہ روایت اس طرح بیان کیا ہے: بنی اسرائیل کے ایک شخص کو اس کے ایک قریبی رشتہ دار نے قتل کر کے بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے دروازہ ڈال دیا پھر اسی سے اس کا خوں بہا طلب کرنے لگا۔ لوگوں نے موسیٰؑ سے کہا: فلاں کا پوتا قتل کر دیا گیا ہے، آپ ہمیں بتایئے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: میرے پاس ایک گائے لے کر آؤ تو قَالُوْا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۔ (انھوں نے کہا کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟) اگر وہ لوگ ایک گائے لے آتے تو وہی کافی ہوتی۔ لیکن انھوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو اللہ نے ان پر سختی اور شدت کی۔ وہ کہنے لگے کہ آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دُعا کیجئے کہ وہ بیان فرمائے کہ اس گائے کی ماہیت کیا ہو؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اس کے درمیان اوسط عمر کی ہو (یہاں تک) وہ لوگ کہنے لگے اب آپ نے ٹھیک پہچان بتائی ہے۔

پس انھوں نے اسے تلاش کیا، اسے بنی اسرائیل کے ایک نوجوان کے پاس پایا۔ اس نے کہا: میں اسے فروخت نہیں کروں گا مگر اس کے برابر سونے کے بدلے۔ وہ لوگ جناب موسیٰؑ کے پاس آئے اور اس کے متعلق

بتایا۔ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: اسے خرید کرلاؤ۔ (امام رضا علیہ السلام نے فرمایا) پیغمبرؐ کے بعض اصحاب نے آپؐ سے عرض کیا: اس گائے کی کیا حالت تھی؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے ایک جوان نے اپنے باپ کے ساتھ حسن عمل کیا تھا۔ ایک چیز خرید کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ باپ سو رہا ہے۔ پیسہ باپ کے سر کے نیچے تھا، اس نے باپ کو اٹھانا بہتر نہیں سمجھا، جب اس کا باپ بیدار ہوا اس نے باپ سے پورا واقعہ بیان کیا۔ باپ نے بیٹے سے کہا: تم نے بہت اچھا کیا۔ یہ گائے تمھاری ہے اسے لے لو۔ یہ اس چیز کا عوض ہے جو تم سے ضائع ہوگئی ہے۔

(امامؑ نے فرمایا کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس نیکی کو دیکھو کہ اس نے نیکوکار کو کس مقام تک پہنچا دیا۔

عبداللہ بن عباس نے فرمایا: مقتول ایک بزرگ صاحب ثروت تھا۔ اس کے برادرزادوں نے اسے قتل کر کے ایک قبیلہ کے دروازے پر ڈال دیا، پھر ان لوگوں نے قتل کا دعویٰ کیا اور فیصلہ جناب موسیٰؑ سے چاہا۔ جناب موسیٰؑ نے سوال کیا: اس بات کا علم کسے ہے؟ لوگوں نے عرض کی: آپ نبی خدا ہیں۔ آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اللہ نے جناب موسیٰؑ پر وحی فرمائی کہ انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیجئے، جناب موسیٰؑ نے حکم دیا کہ وہ گائے ذبح کریں اور مقتول کے بدن کے ایک حصہ سے گائے کے ایک ٹکڑے کو مس کریں۔ خداوند عالم مقتول کو زندہ کر دے گا جو بتائے گا کہ اس کا قاتل کون ہے؟

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے چچازاد بھائیوں نے اسے قتل کیا تھا تا کہ اس کی میراث پا سکیں۔ اسی طرح بیان کیا گیا ہے قتل کرنے کی وجہ تھی کہ وہ مقتول کی لڑکی سے شادی کر لے جبکہ اس نے شادی کی کوشش بھی کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا اور اس نعمت سے محروم رہ گیا تھا اور اس لڑکی کی شادی بنی اسرائیل کے ایک شریف انسان سے ہوگئی تھی۔ اس کے چچازاد بھائی کو اس سبب سے حسد پیدا ہو گیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ مقتول کو جناب موسیٰ کی خدمت میں لا کر کہنے لگا اے نبی خدا! یہ میرا چچازاد بھائی ہے جسے قتل کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا: کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا: مجھے نہیں معلوم۔ بنی اسرائیل میں قتل بہت بڑی بات تھی جو جناب موسیٰؑ پر بہت گراں تھا۔ یہ روایت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے۔

تفسیر:

بنی اسرائیل کی گائے

یہ آیات بھی گذشتہ آیات پر عطف ہیں جو بنی اسرائیل پر نعمتوں کے نزول اور ان کے کفر و عصیان کے ذریعہ مقابلہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ ارشاد ہوا: وَاذْكُرُوْا؛ تم یاد کرو تم نے اس عہد و پیمان کو توڑ دیا ہے جسے میں نے تم سے لیا تھا کہ تم میری اطاعت کرو گے۔ ارشاد ہوا: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا، پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ موسیٰؑ کی قوم نے ان سے کہا: کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ (یعنی) ہم آپ سے مقتول کی بابت دریافت کر رہے ہیں اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دے رہے ہیں! انھوں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ بظاہر دونوں باتوں کے درمیان کوئی ربط نہیں تھا اور وہ اس حکم کی حکمت سے ناواقف تھے جس کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ جناب موسیٰؑ نے انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا لیکن ان کے لیے اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی تھی کہ ذبح کا مقصد کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے کہا گائے ذبح کرنے اور اس معاملہ کے درمیان جو ہم آپ کے پاس لے کر آئے ہیں کیا ربط ہے؟ یہ تو ہمارے ساتھ مذاق ہے!

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ، موسیٰ نے کہا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ یعنی معاذ اللہ میں مذاق اڑانے والوں میں سے ہو جاؤں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاہلین کہا تا کہ وہ اس بات کی نشاندہی کر دیں کہ استہزاء جاہلوں کا کام ہے۔ اس لیے دوسروں کا مذاق اڑانا دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو اس کی خلقت کا مذاق اڑایا جائے گا یا اس کے کسی کام کا۔ اگر خلقت کا مذاق اڑانا جائے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر کسی کام پر مذاق اڑانا جا رہا ہے جو کہ برا ہے تو اس کے انجام دینے والے کو اس کی برائی پر آگاہ کرنا ضروری ہے تا کہ اسے روکا جا سکے۔

اگر استہزا اس سے ہٹ کر صحیح کام پر ہو تو پھر مذاق اڑانا تو استہزا اس طرح (گناہ) کبیرہ ہوگا جو اس سے ناواقف اور جاھل سے ہی واقع ہوگا یا جو اس کا محتاج ہو۔ پس اگر یہ کہا جائے گائے ہی کے ذبح کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟ کسی دوسری نے جانور کو ذبح کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا گیا۔ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ گائے بچھڑے کی جنس سے ہے، جس کی وہ پرستش کیا کرتے تھے تا کہ اس چیز کو حقیر قرار دیا جائے

جس کی وہ تعظیم کرتے تھے اوران کے نفسوں میں جاگزیں پرستش کونابوداوراس کا خاتمہ کیا جاسکے اور یہ کہ خداوند عالم نے مقتول کوزندہ کے قتل کے ذریعہ زندہ کردیا تا کہ اشیاء کے اضداد کے سبب کسی چیز کوعدم سے وجود میں لانے بھی اس کی قدرت پرظاہر ونمایاں ہوجائے۔

جب انھیں معلوم ہوگیا کہ گائے کا ذبح کرنا اللہ کی طرف سے واجب ہے توانھوں نے اس بھی بارے میں دریافت کرنا شروع کردیا کہ اس کی عمر کتنی ہواور جناب موسیٰؑ سے انھوں نے کہا: ''اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ'' اپنے پروردگار سے ہمارے لیے سوال کیجئے: يُبَيِّن لَّنَا مَاهِيَ، بتادے کہ اس گائے کی ماہیت ہوسوال سے ظاہر نہیں ہورہا ہے کہ سوال گائے کی عمر کے بارے میں کیا جارہا ہے بلکہ یہ توجواب سے ظاہر ہوا ہے۔ قَالَ موسیٰ نے کہا: اِنَّهٗ يَقُوْلُ، خدا فرماتا ہے: اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ، نہ تو اسقدر بڑی ہو کہ بوڑھی ہو، نہ ہی چھوٹی، عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ یعنی چھوٹی اور بڑی کے درمیانی عمر کی ہو۔ یہ قول اقوی اور احسن ہے اور یہ ابن عباس کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ عوان وہ ہے جس نے ایک بطن یا دو بطن (یعنی ایک مرتبہ یا دومرتبہ) ہی بچہ دیا ہو۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ، جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اسے ذبح کرو۔ جب خدانے گائے کی عمر بیان کردی تو اس کے رنگ کے بارے میں سوال کرنے لگے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا، اپنے پروردگار سے دریافت کیجئے اس گائے کا رنگ کیا ہے جسکے ذبح کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ قَالَ، موسیٰ نے کہا: اِنَّهٗ خداوند عالم، يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ، (وہ فرماتا ہے: وہ زرد رنگ کی گائے ہو) یہاں تک کہ اس کے کھر اور سینگ بھی زرد ہونے چاہئیں۔ یہ حسن اور سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا بہت شوخ زرد کہا گیا ہے۔ خالص زرد کہا گیا ہے۔ بہتر زرد ہے۔ اس کا ارشاد: تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ دیکھنے والوں کو حیرت واستعجاب میں مبتلا کردے۔ انھیں اپنے حسن کے باعث خوش کردے۔ یہ روایت قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: ''جو شخص زرد نعلین پہنے گا وہ اس کے کہنہ ہونے تک مسرور رہے گا'' جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ، (زرد رنگ کی گائے ہو اس کا رنگ ایسا ہو کہ دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہو) جب اللہ نے گائے کی عمر اور اس کا رنگ بیان کردیا تو انھوں نے اس کی صفت کے بارے میں سوال کیا، قَالُوا، کہا: اے موسیٰؑ! ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَاهِيَ، عوامل (کام

کرنے والے جانور) یا سوائم (صحرا میں چرنے والے جانور) سے ہو؟

اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا، ہم پر گائے کی صفت مشتبہ ہوگئی جسکے ذبح کرنے کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ وَاِنَّآ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ، اور اللہ نے چاہا تو اب ہم گائے کو تلاش کرلیں گے۔ ہمارے لیے گائے کی صفت اللہ کے بیان کرنے سے اور جو کچھ اس نے ہم پر لطف فرمایا ہے۔

ابن جریج و قتادہ نے ابن عباس کے حوالے سے پیغمبرؐ سے روایت کی ہے (آنحضرتؐ نے فرمایا:) انھیں ادنیٰ اور معمولی گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن جب انھوں نے خود پر زیادتی کی تو خدا نے بھی ان پر سختی کی۔ خدا کی قسم اگر وہ لوگ استثنیٰ نہ کرتے تو ان کے لیے کبھی بھی واضح نہ ہو پاتا۔ قَالَ، جناب موسیٰؑ نے کہا، سختی اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ، اللہ فرماتا ہے کہ جس گائے کے ذبح کرنے کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اور وہ گائے ایسی ہو: لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِيۡرُ الۡاَرۡضَ، نہ زمین کی جتائی کے لیے اپنے کھروں کو نہ استعمال کرتی ہو۔ وَلَا تَسۡقِى الۡحَـرۡثَ، نہ ہی کھیتوں میں سینچائی کرتی ہو۔ مُسَلَّمَةٌ، عیوب سے پاک و بری ہو۔ یہ روایت قتادہ اور عطا سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے مُسَلَّمَةٌ یعنی بے داغ ہو یعنی اس پر کوئی ایسا رنگ نہ ہو جو اس کے رنگ کے مخالف ہو۔ یہ روایت مجاہد سے ہے۔

کہا گیا ہے کہ کام کے نشانات سے سالم ہو اس لیے کہ جو جانور کام کرتے ہیں ان کے پیروں اور جسم میں کام کے نشانات پڑ جاتے ہیں۔

حسن نے بیان کیا ہے کہ وہ گائے وحشی جنگلی ہو۔

لَّا شِيَةَ فِيۡهَا، اہل لغت نے کہا ہے: اس میں کوئی ایسا داغ دھبہ نہ ہو جو اس کی جلد کے مخالف ہو۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں گائے کے زرد رنگ کے علاوہ کوئی دوسرا رنگ نہ ہو۔ یہ روایت قتادہ اور مجاہد سے منقول ہے۔

قَالُوا الۡـٰٔنَ جِئۡتَ بِالۡحَـقِّ، (انھوں نے کہا: اب آپ نے ٹھیک نشانی بتائی ہے) یعنی اب ہمارے لیے واضح ہو گیا کہ وہ گائے کیسی ہو۔

یہ بات اس چیز پر دلالت کر رہی ہے کہ انھوں نے ممکن طور پر جان لیا کہ اس سے قبل مفصل حق نہیں آیا تھا، بلکہ اجمالی طور پر آیا تھا۔ قتادہ نے کہا ہے: اب حق واضح ہو گیا جو اس چیز پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کے

درمیان جو شک کر رہا تھا کہ موسیٰ نے حق واضح نہیں کیا۔

فَذَبَحُوْهَا، انھوں نے گائے کو ذبح کر دیا جس کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ، وہ قاتل کی رسوائی اور اس کے طشت ازبام ہونے کے خوف سے ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گائے کے بیش قیمتی ہونے کے باعث ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ابن عباس سے حکایت کی گئی ہے کہ انھوں نے گائے کو مقتول کے مال سے گائے کی کھال میں بھرے سونے کے برابر قیمت میں خریدا تھا، مقتول کے مال سے۔ سُدی سے روایت کی گئی ہے کہ اس کے دس گنا سونے سے خریدی تھی۔ عکرمہ نے کہا ہے کہ اس کی قیمت فقط تین دینار تھی۔

اس مقام پر ہم اصول فقہ سے متعلق مختصر فصل تحریر کر رہے ہیں:

ان آیات کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، بعض کی رائے ہے کہ آیت میں مختلف تکالیف (ذمہ داریاں) کی نشاندہی کی گئی ہے جب ان سے گائے ذبح کرنے کے لیے کہا گیا تو اس سے کسی بھی گائے کا ذبح کرنا مقصود تھا جسے بھی وہ چاہتے، کوئی صفت معین نہیں کی گئی تھی وہ جس گائے کو بھی ذبح کرتے حکم کی بجا آوری کرنے والے شمار ہوتے۔ پس جب انھوں نے اسے انجام نہیں دیا تو مصلحت قرار پائی کہ ان کے فریضہ میں شدّت کر دی جائے، جب انھوں نے دوسری مرتبہ رجوع کیا تو ان کی مصلحت تیسرے فریضہ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر (علماء علم اصول نے) دوسری وجہ سے اختلاف کیا ہے ان میں بعض نے آخری تکلیف کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے لیے ہر گذشتہ صفت کا بجالانا واجب تھا۔ پس اس قول کے مطابق دوسری اور تیسری تکلیف ضم ہو جائیگی جو ان پر شدید ہوگی جس میں مصلحت موجود ہوگی۔ بعض کا کہنا ہے آخری صفت ہوگی فقط گذشتہ نہیں۔ اس قول کے مطابق دوسری تکلیف پہلی تکلیف کے لیے ناسخ ہوگی اور تیسری تکلیف دوسری تکلیف کے لیے ناسخ ہوگی، کسی حکم کو اس پر عمل کرنے سے پہلے منسوخ کرنا جائز ہے، اس لیے کہ مصلحت مجوز قرار دیتی ہے کہ وقت گذرنے کے بعد تبدیل ہو جائے بلکہ فعل کے وقت سے قبل مسخ شے جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ امر بداء کی طرف لے جاتا ہے۔ دیگر علمائے علم اصول کا نظریہ یہ ہے کہ حکم ہی ایک ہے بعد کے صفات اسی گائے کے ہیں۔ فقط بیان میں تاخیر کی گئی ہے۔ یہ سید مرتضیٰ قدس اللہ سرہ کا نظریہ ہے۔

اس آیت کے ذریعہ علمائے علم اصول نے وقت خطاب سے وقت حاجت تک بیان کو ٹالنے کے جائز ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔ سید مرتضیٰ فرماتے ہیں: جب خداوند عالم نے لوگوں کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو

انھوں نے جناب موسیؑ سے کہا: اُدۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ، ان کا یہ کہنا اس بات سے خالی نہیں کہ مَا هِيَ سابقہ گائے سے کنایہ ہے، جس کا ذکر گذر چکا ہے یا اس سے کنایہ ہے جس کا انھیں دوسری مرتبہ حکم دیا گیا، ان کے اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مَا هِيَ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سوال اس گائے کی صفت سے متعلق ہو جسکے ذبح کرنے کا انھیں حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ انھیں دوسری گائے کے ذبح کرنے کے حکم کا علم نہیں تھا لہٰذا انھوں نے اس کے بارے میں سوال کیا۔ پس جب یہ صحیح اور درست ہے تو اس کا ارشاد: اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ، اس امر سے خالی نہیں کہ اس میں "ھا" پہلی گائے سے کنایہ ہو یا اس کے علاوہ ہو اور جائز نہیں کہ دوسری گائے سے کنایہ ہو۔ اس لیے کہ ظاہر (کلام) اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کنایہ اس چیز سے متعلق ہو جس سے ان کا سوال وابستہ ہوا ہے۔ اگر بات اس طرح نہیں ہوگی تو ان کا جواب نہیں ہو پائے گا۔

ان کا یہ کہنا کہ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا فقط اس لیے تھا کہ ان کا ماننا تھا کہ ان سے جو خطاب کیا گیا ہے مجمل اور غیر واضح ہے اور اگر بات اس طرح ہوتی جسکو اس گروہ نے اختیار کیا ہے تو ان سے یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ تم پر کیا چیز مشتبہ ہوگئی؟ تمھیں ابتدا میں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ گائے کیسی بھی ہوتی، دوسرے حکم میں اس کی مخصوص عمر تھی۔

تیسرا حکم مخصوص رنگ سے متعلق تھا، وہ کسی بھی گائے میں ہوتا البتہ اس کا ارشاد: فَذَبَحُوۡهَا وَمَا كَادُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ، بظاہر ان کی مذمت، ان کی تقصیر اور کوتاہی کی طرف پلٹ رہا ہے یا مکمل بیان اور وضاحت کے بعد حکم کی بجا آوری کی تاخیر سے متعلق ہے جو کہ ان کی مذمت کا تقاضا نہیں کرتا ہے۔ پہلی صورت میں گائے کے ذبح کرنے میں جلدی ترک کرنے پر آیت دلالت نہیں کر رہی ہے۔

❁❁❁❁❁

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا اور اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ اور اللہ ظاہر کر کے رہے گا جس بات کو تم چھپا رہے ہو۔ (۷۲) پھر ہم نے کہا: اس گائے کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم پر مارو، دیکھو، اللہ اس طرح مردوں کو حیات بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (۷۳)

الفاظ و معانی:

اِدّٰرَأْتُمْ تم نے اختلاف کیا: اس کی اصل تَدَارَأْتُمْ ہے، دَرْء کے معنی میں دور کرنا اور اسی سے حدیث میں آیا ہے: اِدْرَأُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ ۔ حدود کو شبہات سے دور کردو اور اسی سے اللہ کا قول ہے: وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ ۔ (سورۂ نور، آیت ۸) اور عورت کی سزا اس طرح ٹلتی ہے۔

تفسیر:

مردہ کو زندہ کر دیا

اس آیت میں خداوند عالم نے گائے کے ذبح کے حکم کا مقصد بیان فرمایا جس کا آغاز قتل کے ذکر سے فرمایا: وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا؛ اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ اس بارے میں دو صورتیں بیان کی گئی ہیں:

اول: گذشتہ آیات میں باعتبار معنی مقدم کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کی تاویل ہوگی کہ جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ پس تم نے موسیٰ سے سوال کیا، انھوں نے تم سے کہا: اللہ نے تمھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے (اس طرح) مؤخر کو مقدم اور مقدم کو مؤخر کیا گیا ہے۔ اس طرح کی مثالیں قرآن و اشعار میں بکثرت وجود ہیں۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا ۔ (مکمل حمد اللہ تعالیٰ

کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب کو نازل کیا اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی، وہ سیدھی ہے، (سورۂ کہف، آیت ۱-۲)) جس کی تقدیر اس طرح ہے: اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ قَيِّمًا وَّلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔

دوم: دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت اس سے متعلق ہے جو حقیقت میں متاخر ہے اس کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا، گویا اس نے کہا انھوں نے گائے کو ذبح کر دیا اور وہ ایسا کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ اس لیے کہ تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور (اسکے قاتل کے بارے میں) جھگڑنا شروع کر دیا تھا تو ہم نے تمھیں حکم دیا کہ مقتول کو گائے کے ٹکڑے سے مس کر دو تا کہ معاملہ صاف ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ یہ خطاب پیغمبرؐ کے زمانہ والوں سے ہے۔ اس سے مراد ان لوگوں کے بزرگ ہیں۔ یہ عربوں کی عادت کے مطابق ہے کہ خطاب فرزندان اور ان کی اولاد سے ہوتا ہے مقصود ان کے اسلاف اور اجداد ہوتے ہیں، خطاب پورے خاندان سے ہوتا ہے مگر مقصود ایک آدمی ہوتا ہے۔ بطور مثال کہا جاتا ہے: بنو تمیم نے اس طرح کیا اگر چہ فعل کا انجام دینے والا ایک ہوتا ہے۔ احتمال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے لوگوں سے خطاب ہو جس کی تقدیر ہے اور ہم نے ان سے کہا: جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔

بیان کیا گیا ہے: مقتول کا نام عامیل تھا" تم نے اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑا کیا۔" فِيْهَا میں 'هَا' کی ضمیر نفس کی طرف پلٹ رہی ہے یعنی ہر ایک اس شخص کے قتل کو اپنے آپ سے دفع کر رہا تھا۔ بیان کیا گیا ہے: قاتلوں کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی تم نے قاتلوں کے بارے میں اختلاف کیا۔ اس لیے کہ اللہ کا ارشاد قَتَلْتُمْ مصدر پر دلالت کر رہا ہے۔ ضمیر کا نفس کی جانب پلٹنا اولیٰ اور ظاہر سے زیادہ مشابہ ہے۔

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ، یعنی اللہ اس کا ظاہر کرنے والا ہے قتل کے متعلق جس چیز کو تم چھپا رہے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں: خداوند عالم تمھاری دقیق اور پیچیدہ خبر کو نکالنے والا ہے۔ تمہارے اور تمہارے اسلاف کے عیوب و معائب اور برائیوں سے مطلع کرنے والا ہے، جنھیں تم چھپا رہے ہو۔ یہ خطاب پیغمبرؐ کے زمانہ کے یہودیوں سے ہے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا، یعنی ہم نے ان سے کہا کہ مقتول کو گائے کے ٹکڑے سے مارو۔

لفظِ بَعْض کے متعلق اختلاف کیا ہے کہ مقتول کو گائے کے کسی حصہ سے مارا گیا۔ کہا گیا ہے کہ گائے کی ران سے مارا گیا اور وہ زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ مردہ ہو گیا۔ یہ روایت مجاہد، قتادہ اور عکرمہ سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ گائے کی دُم سے مارا گیا۔ یہ روایت

سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے زبان سے مارا گیا۔ یہ ضحاک سے روایت ہے۔ کہا گیا ہے: گائے کی ہڈی سے مارا گیا۔ یہ روایت ابو العالیہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے: دونوں شانوں کے درمیانی مقام سے مارا گیا۔ یہ سدی سے روایت ہے۔ کہا گیا ہے: بعض اعضا سے مارا گیا۔ یہ ابوزید سے روایت ہے۔ یہ تمام اقوال ہیں بظاہر جن کا امکان ہے۔

جو بات معلوم وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے مقتول کو گائے کے ایک حصہ سے مارنے کا حکم دیا تھا تا کہ مقتول زندہ ہو جائے۔ جب وہ لوگ اس عمل کو انجام دیں گے تو مقتول وہ کہے گا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے تا کہ قوم کے درمیان اختلاف دور ہو جائے۔ اگر چہ صانع اسے خلق کرنے والا اور بنانے والا اللہ اس کے بغیر بھی زندہ کرنے پر قادر تھا۔ اللہ نے انھیں اس چیز کا حکم اس لیے دیا کہ انھوں نے جناب موسیٰؑ سے مقتول کے متعلق وضاحت چاہی تھی اور وہ قربانی کو عظیم ترین قربت سمجھتے تھے۔ اسکے لیے انھوں نے علیحدہ مکان بنایا تھا جس میں فقط ان کے شرفاء ہی داخل ہوتے تھے۔ خداوند عالم نے انھیں قربانی پیش کرنے کا حکم دیا تا کہ درپیش امور سے تعلیم حاصل کریں کہ وہ خدوانداعالم سے اس قضیہ کے انکشاف اور ظاہر ہونے سے قبل اس کے حضور نزدیکی کا (نمونہ) پیش کریں تا کہ قبولیت کے زیادہ نزدیک ہو۔ اللہ نے (گائے کے اعضا کو) مقتول کے بدن پر مارنے کا انھیں حکم دیا جب کہ تمام لوگوں کے زندہ کرنے کا اختیار اسی کو ہے تا کہ وہ لوگ جان لیں خداوند عالم مردوں کو ہر وقت زندہ کرنے پر قادر ہے۔ آیت میں تقدیر اس طرح ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا فَضَرَبُوْهُ فَحَيِيَ ''ہم نے ان سے کہا گائے کے ایک حصّہ کو مقتول کے بدن کے ایک حصہ پر مارو۔ انھوں نے اسی طرح کیا اور وہ زندہ ہو گیا جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ اسکی تقدیر اس طرح ہے: فضرب فَانْفَلَقَ۔

ارشاد الٰہی: كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى، احتمال ہے۔ یہ جناب موسیٰؑ کے قول کی حکایت وترجمانی ہو کہ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: بخوبی جان لو کہ خداوند عالم جزا اور بدلہ کے لیے مردوں کو زندہ کرے گا۔ یہ بھی احتمال وامکان ہے اللہ کی طرف سے مشرکین قریش کے لیے خطاب ہو جو گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے بدن پر مارنے سے مقتول کے زندہ ہونے پر پیش آیا۔ چونکہ روایت کی گئی ہے: مقتول اس عالم میں کھڑا ہوا اس کی رگوں سے خون ابل رہا تھا اور کہنے لگا: مجھے فلاں چچازاد بھائی نے قتل کیا ہے۔ پھر اس کی روح قبض کر لی گئی۔

وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ یعنی خارق العادۃ، روشن معجزات جن میں اس مردہ کا زندہ کرنا ہے اور اس کے علاوہ

دیگر (معجزات) بیان کئے گئے ہیں۔نمایاں اور ظاہر اعلان و اعلام مراد ہے جو پیغمبرؑ کی نبوت پر دلیل ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تا کہ تم اپنی عقلوں کا استعمال کرو۔جو اپنی عقل کا استعمال نہیں کرتا وہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔وہ ایسا ہے جیسے اس کے عقل ہی نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ اس چیز میں عقل سے کام لو جو دینی امور میں تم پر واجب ہیں۔ان آیات کے ذریعہ خداوند عالم نے مشرکین عرب پر حجت و دلیل پیش کی ہے کہ وہ مردوں کا زندہ کیا جانا ناممکن سمجھتے تھے اور اس طرح کہتے تھے: أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۴۹) (ہم جب ہڈیاں اور خاک ہو کر چورہ چورہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے)

خداوند عالم نے انھیں مطلع کیا جس کا وہ انکار کرتے اور ناممکن سمجھتے تھے۔اسکی وسیع قدرت کے آگے یہ سب ناممکن نہیں ہے مقتول اور اس کی زندگی کا ذکر کر کے اس کے مرنے کے بعد باوجود ان لوگوں نے خبر قتل کو پوشیدہ رکھا تھا اسے زندہ کیا، وہ مخاطب ہوا اپنے قاتل کا نام لے کر اور ان لوگوں کے سامنے اس کا اعلان و اظہار کیا (خداوند عالم نے ان لوگوں کو) آگاہ اور متنبہ فرمایا ہے۔مردوں کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جانے کے باوجود تمام مردوں کا زندہ کرنا اس پر دشوار نہیں ہے بلکہ اس پر بہت زیادہ آسان ہے۔

اس آیت میں ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر دلالت ہے، جب آپؐ نے انھیں ان کی دقیق خبروں سے مطلع کیا جسے بجز اس کے کوئی دوسرا نہیں جانتا جس نے گذشتہ کتب پڑھی ہوں یا جس پر عالمین کے پروردگار کی جانب سے وحی کی گئی ہو جس کی تصدیق آپؐ کے مخالف یہودیوں نے کی، جب انھیں ان واقعات کی خبر دی گئی تو انھوں نے جان لیا کہ آپ اُمی ہیں جنہوں نے کتاب نہیں پڑھی ہے اور اس بارے میں ان لوگوں نے ذرا بھی شک نہیں کیا۔چنانچہ یہ آیت حضورؐ کی نبوت کے اثبات میں دلیل قاطع ہے۔

ترکیب:

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ۔ لام اِنَّ کی خبر پر داخل ہوتا ہے لیکن اخوات اِنَّ کی خبر پر داخل نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ لام تاکید ہے پس ان کے مثل ہوتا ہے مبتدا اور خبر پر داخل ہونے میں جس طرح اِنَّ داخل ہوتا ہے جیسے وَاللهِ لَتَخْرُجَنَّ۔ وَاللهِ اِنَّكَ خَارِجٌ۔ جب ان دونوں میں یہ مشابہت پائی جاتی ہے تو جب لام تاکید اِنَّ پر داخل ہو کہ لَاِنَّهَا كَبِيْرَةٌ جیسے مقامات پر تو علماء نے دو حرف جو کہ معنی میں ایک جیسے ہیں کہ ایک جگہ جمع کرنے کو ناپسند قرار دیا ہے لہٰذا انہوں نے لام کو خبر پر داخل کر دیا ہے تاکہ لام اور اِنَّ کے درمیان اسم کے ذریعہ فاصلہ واقع ہو جائے۔ جیسے اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ لیکن دیگر اخوات اِنَّ جب وہ مبتدا اور خبر پر داخل ہوں تو مبتدا کی صورت سے نکل کر ایک دوسری قسم بن جاتا ہے لہٰذا اس پر لام داخل نہیں ہوتا اور جب لام دیگر اخوات اِنَّ کے اسم پر داخل نہیں ہوتا ہے تو پھر مناسب یہی ہے کہ اس کی خبر پر بھی داخل نہ ہو۔

شانِ نزول:

جبائی نے کہا ہے: اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے نہ کہ اہل کتاب سے۔ رمانی اور دیگر علماء نے کہا ہے: اہل کتاب سے خطاب ہے اور تادیب کے سبب مومنین کو بھی شامل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمام مکلفین سے خطاب ہو اس لیے کہ تخصیص پر دلالت موجود نہیں۔ جس کا کہنا ہے: خطاب اہل کتاب سے ہے اس کی تائید میں یہ قول ہے کہ آیت سے پہلے اور بعد کی آیت میں اہل کتاب سے خطاب ہے۔

تفسیر:

صبر و نماز سے استعانت

جو اس بات کا قائل ہے کہ آیت کا خطاب یہودیوں سے ہے، اس کا یہ کہنا ہے کہ علماء یہود کی ریاست و اقتدار ان کے اتباع پیغمبرؐ سے مانع تھا انھیں اس بات کا خوف لاحق تھا کہ اگر وہ پیغمبرؐ کا اتباع کریں گے تو ان میں ریاست چھن جائے گی۔ لہٰذا اللہ نے انھیں حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاسْتَعِيْنُوْا (امداد طلب کرو) اس عہد کو پورا کرتے ہوئے جو میں نے تمھاری کتاب میں اپنی بندگی اور امر کے اتباع کے سلسلہ میں تم سے لیا

ہے اور جس چیز سے تمھیں نہی کی ہے اسے ترک کر کے میرے امر کو تسلیم کرو اور میرے پیغمبرؐ کا اتباع کرتے ہوئے معاش کی تنگی پر (صبر کرو) جو اموال تم اپنے عوام سے حاصل کرتے ہو۔

ہمارے ائمہ علیہم السلام سے روایت ہے کہ صبر سے روزہ مراد ہے۔ اس کے ذریعہ استعانت کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خواہش نفس کنٹرول میں رہتی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلصَّوْمُ وِجَاءٌ (روزہ شہوت جماع پر کنٹرول کرتا ہے)

نماز کے ذریعہ استعانت کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ان آیات کی تلاوت کی جاتی ہے جن سے خدا کے پاس موجود چیزوں کی جانب رغبت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا اور حب ریاست سے بے تعلقی پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ (سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵) (بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے)

نماز میں اللہ کے حضور تواضع وانکساری ہے کہ جس سے حب ریاست دور ہوتی ہے (روایت ہے کہ) جب کبھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بات سے محزون ومغموم ہوتے تو نماز اور روزہ کے ذریعہ مدد طلب فرماتے تھے۔

جو اس بات کا قائل ہے کہ آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے اس کا یہ کہنا ہے کہ وَاسْتَعِيْنُوْا سے مراد یہ ہے کہ مدد حاصل کرو ایفائے عہد پر جس کا ہم نے اتباع پیغمبرؐ کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے یا تکلیف کی زحمت پر صبر کے ذریعہ یعنی اطاعت پر نفس کو روک کر گناہوں اور شہوات سے روک کر مدد حاصل کرو اور نماز کے ذریعہ استعانت (طلب مدد کرو) چونکہ اس میں تلاوت قرآن ہے اس کے معنی میں تدبر کر کے اس کے مواعظ سے نصیحت حاصل کر کے اوامر پر عمل کر کے اور اس کے نواہی سے خود کو روکتے ہوئے اور اس کے علاوہ دیگر وجہ سے اس لیے کہ افعال قلوب میں صبر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے نہ ہی اعضاء وجوارح کے افعال میں نماز سے بڑھ کر کوئی عبادت ہے چنانچہ دونوں کے ذریعہ طلب امداد کا حکم دیا گیا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کسی کے لیے کون سی چیز مانع ہے کہ جب اس پر دنیاوی غم سے کوئی غموں وارد ہو تو وہ وضو کرے اور مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کرے اور اس بارے میں خدا سے دعا کرے۔ کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے کہ: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ (بے شک نماز ایک مشکل اور دشوار عمل ہے) کہا گیا ہے کہ اِنَّهَا کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں چند وجہیں ہیں:

اول: صَلٰوةٌ (نماز) کی جانب پلٹ رہی ہے۔ یہی اہم اور افضل ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور ضمیر کے واحد کی جانب پلٹنے سے متعلق دو قول بیان کیے گئے ہیں جن میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے صرف صلاۃ مراد ہے نہ اس کے علاوہ اس کی نزدیکی کے باعث خاص طور سے اس کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہ صلاۃ اہم اور افضل ہے۔ اس کی حالت کی تاکید اس کی شان کو بلند اور فرض کو عام قرار دیا ہے۔ دوسرا قول ہے کہ دونوں (صبر اور نماز) مراد ہیں اگرچہ ضمیر مفرد ہے اس کی گواہی اس ارشاد میں ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ، آیت ۳۴) (اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) ینفقونہا میں ھا کی ضمیر سے الذھب و الفضۃ دونوں مراد ہیں۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا۔ (سورۂ جمعہ، آیت ۱۱) (اور جب ان لوگوں نے تجارت اور کھیل تماشے کو دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے) الیہا میں ھا کی ضمیر سے تجارۃ اور لھو دونوں مراد ہیں۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (سورۂ توبہ، آیت ۶۲) (اللہ اور اس کے رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں) يُّرْضُوْهُ میں ہ کی ضمیر اللہ اور رسول دونوں کو شامل ہے۔

دوم: ضمیر استعانت کی طرف پلٹتی ہے یعنی دونوں کے ذریعہ استعانت بڑا مشکل کام ہے۔

سوم: ضمیر کسی محذوف کی طرف پلٹ رہی ہے اور وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز اور دعوت پر لبیک کہنا ہے۔ یہ روایت اصم سے ہے۔ یا دونوں کے ذریعہ مواخذۂ نفس کرنا ہے یا گذشتہ کی ادائیگی ہے یا نماز کی ادائیگی ہے اور اسی طرح خطاؤں پر صبر کرنا ہے۔ یہ روایت ابو مسلم سے مروی ہے۔ یہ آخری تمام وجوہات ضعیف ہیں اس لیے کہ ان کا ذکر نہیں ہوا ہے۔

لَكَبِيْرَةٌ یعنی ثقیل (دشوار) اور گراں ہے۔ یہ روایت حسن وغیرہ سے مروی ہے۔ اس میں اصل یہ ہے کہ ہر بڑی چیز کا برداشت کرنا انسان پر ثقیل وگراں ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو نفس پر دشوار ہوتی ہے اگرچہ حمل کے

لحاظ سے نہ ہو پھر بھی نفس پر گراں گزرتا ہے، بوجھ سے تشبیہ دیتے ہوئے۔

اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (مگران کے لئے نہیں ہے جو فرمانبرداری ہوتے ہیں) یعنی اللہ کے متواضعین کے لیے (جو اللہ کے حضور انکساری سے پیش آتے ہیں) چونکہ انھوں نے اپنے نفس کو اس کی انجام دہی کے لیے عادی بنالیا ہے اس لیے اس کا انجام دینا ان پر گراں اور دشوار نہیں ہے۔ اسی طرح متواضع اور منکسر المزاج جب اسے ایمان حاصل ہو جائے تو زوال ریاست کی پرواہ نہیں کرتا۔

مجاہد نے کہا ہے: خاشعین سے مومنین مراد ہیں اس لیے کہ جب انھیں اس کی انجام دہی سے حاصل ہونے والے ثواب کا علم ہو جاتا ہے تو اس کی انجام دہی ان پر دشوار و گراں نہیں ہوتی جس طرح جب انسان کو شفایابی کی امید ہوتی ہے تو دوا کے کڑوے گھونٹ برضا ورغبت پی لیتا ہے۔

حسن نے کہا ہے: خاشعین سے خائفین یعنی ڈرنے والے مراد ہیں۔

❀❀❀❀❀

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ 《۴۶》
جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔

الفاظ و معانی:

آیت میں ذکر شدہ ظن، علم و یقین کے معنی میں ہے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ظن کے لغوی معنی یہ ہیں کہ جو تصورات و خیالات نفس میں گردش کرتے ہیں وہ قلب پر غالب آجاتے ہیں گویا وہ کسی شئ کے متعلق نفس کی گفتگو ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں کہیں ظن استعمال ہوا ہے اس سے علم کے معنی کی تاویل کی گئی ہے۔ ظن، شک، تجویز ایک جیسے ہیں مگر یہ کہ ظن شک و تجویز میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ظن کی ضد یقین ہے۔ ظَنِيْن، مُتَّهَم کو کہتے ہیں جس کا مصدر ظِنَّة ہے۔ ظَنُوْن جو شخص ہر ایک کے بارے میں بدگمانی رکھتا ہے۔ ظُنُوْن اس کنویں کو کہتے ہیں جس کے متعلق اس میں پانی کا گمان کیا جاتا ہے جب کہ پانی موجود نہ ہو۔

ترکیب:

اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ: محلاً مجرور، اَلْخَاشِعِیْنَ کی صفت ہے۔ اَنَّهُمْ ہمزہ کے ساتھ ہے فتحہ کے علاوہ اسے کوئی دوسری حرکت دینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ظَنَّ فعل ہے جو معنی پر واقع ہوا ہے کہ وہ متعدی ہے غیر سے متعلق ہے اس کے بعد جو بھی آئے گا وہ اس کا مفعول ہوگا۔ اَنَّ مفتوح الہمزہ اپنے اسم مفرد کی تاویل میں جائے گا وہ یہاں پر یَظُنُّ کے دو مفعول کا قائم مقام ہے مفعول ثانی کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کلام سے واضح ہے پوشیدہ نہیں ہے جس طرح اَقَائِمٌ اَلزَّیْدَانِ میں فاعل خبر کا قائم مقام ہوتا ہے کلام کے طولانی ہونے اور اس سے بے نیاز ہونے کی بنیاد پر ابوعلی کے نزدیک یہی نظریہ منتخب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دوسرا قول بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اَنَّ اپنے اسم وخبر کے ساتھ مفعول اول کے مقام میں ہے اور مفعول ثانی پوشیدہ ومحذوف ہے اس لئے کہ مخاطب کو معلوم ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ مُلَاقَاةَ رَبِّهِمْ وَاقِعَةً۔

اہل بصرہ کے نزدیک مُلٰقُوْ رَبِّهِمْ سے نون کو آسانی وتخفیف کی خاطر حذف کر دیا گیا ہے اور اس کو باقی رکھنے کی صورت میں معنیٰ یہ ہیں کہ یہاں پر مضاف الیہ اگرچہ ظاہر القفظاً مجرور ہے لیکن معنیٰ میں منصوب ہے یہ اضافتِ لفظیہ ہے، حقیقیہ نہیں ہے۔ اسی کے مانند ایک دوسری آیت بھی ہے: اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ وَكُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔

شاعر نے کہا:

هَلْ اَنْتَ بَاعِثُ دِیْنَارٍ لِحَاجَتِنَا اَوْ عَبْدَ رَبٍّ اَخَاعَوْنَ بَنِی مِخْرَاق

کیا تم ہماری حاجت روائی کے لئے دینار بھیجو گے یا بنی عون بن مخراق کے مالک کے غلام کو؟

اور اگر آپ نے ماضی کا ارادہ کیا تو پھر اسم اضافہ کی وجہ سے معرفہ ہو جائے گا اس میں کسی بھی صورت میں نون کو ظاہر کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ: محلاً منصوب ہے پہلے والے جملہ پر عطف ہے۔

تفسیر:

لقاء اللہ

خَاشِعِیْنَ کا ذکر کیا گیا، پھر ان کے صفات بیان کیے گئے: الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ (جو یہ سمجھتے ہیں کہ۔۔۔) یعنی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اس چیز سے ملاقات کریں گے جس کا ان کے پروردگار نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ یہ حسن، مجاہد وغیرہ سے روایت ہے اور اسی طرح یہ آیت ہے: اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ. (سورہ حاقہ، آیت ۲۰) (مجھے یقین تھا کہ مجھے حساب دینا ہے)

ظن کے معنی یقین کے علاوہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں اور شدید خوف کے ساتھ ملاقات کریں گے۔ رمانی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ایسی صورت میں کتنی چیزوں کو محذوف ماننا پڑے گا۔ اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی مدت کے خاتمہ سرعت موت کا گمان کرتے ہیں وہ ہمیشہ خوف و ہراس کے عالم میں رہتے ہیں، دنیا پر بھروسہ نہیں کرتے جس طرح مرنے والے کے لیے کہا جاتا ہے: لَقِیَ اللّٰهَ (یعنی اس نے اللہ سے ملاقات کی) اللہ کا یہ ارشاد: مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ، دلالت کررہا ہے کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی جزا سے ملاقات کریں گے۔ منافقین کی صفت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ. (سورہ توبہ، آیت ۷۷) (اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق جاگزیں کردیا ہے اس روز تک کے لیے جب وہ خدا کے روبرو حاضر ہوں گے)

اس میں اختلاف نہیں ہے کہ منافق کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کو دیکھے۔ اسی طرح اس کا ارشاد ہے:

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ. (سورہ انعام، آیت ۳۰) (اور کاش آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور رب ان سے پوچھے گا کیا دوبارہ زندہ ہونا برحق نہیں؟ تو وہ کہیں گے کیوں نہیں قسم ہے پروردگار کی یہ بالکل برحق ہے۔ تو خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو)

حدیث میں وارد ہوا ہے: جس نے کسی مسلمان کے مال کے خلاف جھوٹا حلف اٹھایا وہ اللہ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر غضبناک ہوگا۔ ملاقات سے مراد رویت (دیکھنا) نہیں ہے جیسا کہ کہا

جاتا ہے: اللہ تم سے محبت سے ملاقات کرے گا۔ یہاں شخصی اور ذاتی طور پر دیکھنا مراد نہیں ہے بلکہ ایسی ملاقات مراد ہے جو اسے مسرور و شادماں کر دے۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے آیت میں رجوع کے کیا معنی ہیں؟ جبکہ وہ آخرت میں پلٹنے کا ذرا بھی یقین نہیں رکھتے۔ اس کے جواب میں متعدد طریقے سے دیا گیا ہے:

اول: یہ لوگ واپسی کے ذریعہ آخرت میں پلٹنے والے ہیں۔ ابو العالیہ سے روایت ہے۔

دوم: موت کے ذریعہ پلٹیں گے جس طرح وہ سابقہ حالت میں مردہ تھے، پھر انھیں زندہ کیا جائے گا، پھر انھیں موت دی جائے گی، پھر اس کی بارگاہ میں مر کر پلٹیں گے جس طرح کہ وہ تھے۔

سوم: ایسے مقام پر پلٹیں گے جن کے نفع و نقصان کا اس (خدا) کے سوا کوئی مالک نہیں ہوگا جس طرح وہ ابتدائے خلقت میں تھے، اس لیے کہ ان کی زندگی میں غیر ان پر حکم فرماتا تھا اور ان کے نفع و نقصان کی تدبیر کرتا تھا جس چیز کو اس کے اس ارشاد میں واضح کیا گیا ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔

آیت کے معنی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ نشأۃ ثانیہ (دوسری خلقت) کا اقرار کر رہے ہیں لہٰذا موت کے بعد محشر کی طرف واپسی کو اس کی جانب رجوع قرار دیا ہے۔

❀❀❀❀❀

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾
اے بنی اسرائیل تم میری اس نعمت کو یاد کرو جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔

تفسیر

عالمین پر برتری کا مطلب

اس سے پہلے آیت کے پہلے حصے کی تفسیر گذر چکی ہے۔

ارشاد الٰہی: وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی

تھی) ابن عباس نے کہا ہے: بنی اسرائیل کے اپنے زمانہ کی قومیں مراد ہیں اس لیے کہ ہماری امت اجماعی طور پر تمام امتوں سے افضل ہے، جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افضل انبیاء ہیں۔ اس دلیل سے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے)

بیان کیا گیا ہے: اس سے مخصوص اشیاء کی فضیلت مراد ہے کہ ان کے لیے من وسلویٰ کا نازل کیا جانا، رسولوں کا ان کے درمیان بھیجا جانا اور کتب کا نازل کیا جانا اور بکثرت آیات جن کے ذریعہ استدلال آسان اور عہد و پیمان سہل ہو جائے۔ اللہ کا انھیں مخصوص اشیاء میں فضیلت عطا کرنا، مطلق طور پر ان کے تمام انسانوں پر افضل ہونے کا سبب نہیں ہے جس طرح کہا جاتا ہے: 'حاتم باعتبار سخاوت تمام لوگوں میں افضل ہے' اسی آیت کے مانند اس کا یہ ارشاد ہے:

وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۴۹) (اور یاد کرو جب ہم نے تمھیں آل فرعون سے نجات دی انھوں نے تم کو سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا وہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی)

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ ٱلْبَحْرَ فَأَنجَيْنَٰكُمْ وَأَغْرَقْنَآ ءَالَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ (آیت: ۵۰) (اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر کو پھاڑ کر تمہارے لیے راستہ بنایا تھا تمھیں نجات دی اور تمھاری نظروں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کر دیا تھا)

اگر کہا جائے کہ اس بات کی تکرار سے کیا فائدہ ہے کہ يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۵۰) تو ہم کہیں گے: جب اللہ کی نعمتیں اصل ہیں جن پر شکر واجب ہے تو اس کی تاکید کی احتیاج و ضرورت تھی جس طرح قائل کہتا ہے: اِذْهَبْ اِذْهَبْ (جاؤ جاؤ) عَجِّلْ عَجِّلْ (جلدی کرو جلدی کرو)

اسی طرح کہا گیا ہے کہ پہلی یاد دہانی اجمالی طور پر وارد ہوئی ہے، دوسری مفصل ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اول میں خود ان کو عطا کی گئی نعمت کی یاد دہانی کرائی گئی ہے دوسرے میں ان کے آباء و اجداد پر عطا کی گئی نعمت کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی اس کی طرف سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

قرائت:

اہل مکہ اور اہل کوفہ نے لَا تُقْبَلُ تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کے ساتھ يُقْبَلُ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے تاء کے ساتھ تُقْبَلُ پڑھا ہے اس سے علامت تانیث ملحق کی ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ وہ اسم جس کی جانب فعل کی نسبت دی گئی ہے یعنی شَفَاعَةٌ وہ مونث ہے اور جن قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اسم شَفَاعَةٌ میں تانیث حقیقی نہیں ہے پس معنی پر حمل کر کے فعل کو مذکر لایا گیا ہے۔ اس لئے کہ شَفَاعَةٌ اور تَشَفُّع ایک ہی ہیں جس طرح وَعْظ و مَوْعِظَة اور صَيْحَة و صَوْت ایک ہیں۔ خداوند عالم نے فرمایا: فَمَنْ جَاءَهٗ مَوْعِظَةٌ نیز اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ۔

فعل کو مذکر لانے کو یہ بات بھی قوی بناتی ہے کہ فعل اور نائب فاعل کے درمیان مِنْهَا فاصلہ بن گیا ہے اور فاصلہ کے ساتھ فعل کو مذکر لانا حسن ہے جیسا کہ تانیث حقیقی میں بھی ایسا کیا جاتا ہے: حَضَرَ الْقَاضِيَ الْيَوْمَ اِمْرَاَةٌ۔

الفاظ و معانی:

اَلْجَزَاءُ وَالْمُكَافَاةُ وَالْمُقَابَلَةُ نَظَائِرُ جَزَاء (جزاء، مکافات اور مقابلہ باہم مشابہ ہیں)

ارشاد الٰہی ہے: لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا۔ (جب کوئی شخص کسی کی طرف سے فدیہ نہ ہو سکے گا) یعنی اس کے مقابل کوئی مکروہ (ناگوار) چیز نہیں ہوگی جس سے وہ خود کو دور کرے۔ یعنی اس کی ناپسندیدہ

چیز کا سامنا کسی ایسی شئے سے نہیں ہوگا جس سے وہ خود کو دور کرلے۔

اور اسی بارے میں حدیث وارد ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوہریرہ کو حکم دیا اس بچھڑے کے بارے میں جو ابھی چھوٹا تھا کہ وہ اس کی قربانی دے۔تمہارے بعد کسی سے اس کی قربانی قبول نہ ہوگی اور آنحضرت نے فرمایا: اَلْبَقَرَةُ تَجْزِیْ عَنْ سَبْعَةٍ۔ گائے سات افراد کی طرف سے کافی ہوگی۔

وَالْقَبُوْلُ وَالْاِنْقِیَادُ وَالطَّاعَةُ وَالْاِجَابَۃ باہم مشابہ ہیں اور اس کی ضد اِمْتِنَاع ہے یعنی روکنا۔

شَفَاعَة شَفْع سے مشتق ہے گویا شفاعت کرنے والے کے متعلق سوال ہے کہ شفاعت کرنے والا کون ہے جو مَشْفُوْعٌ لَہٗ (جس کی شفاعت کی جاتی ہے) کی شفاعت کرے۔

وَالشَّفَاعَةُ وَالْوَسِیْلَةُ وَالْقُرْبَةُ وَالصِّلَةُ نَظَائِر شفاعت، وسیلہ، قربت اور وصلت ایک جیسے ہیں۔

عَدْل، حَقّ، اِنْصَاف باہم مشابہ ہیں۔عدل کی ضد جور (ظلم) ہے۔آیت میں عدل سے فدیہ مراد ہے۔عِدل اور عَدل کے درمیان یہ فرق ہے کہ عِدل اسی جنس کی چیز کے مثل ہوتا ہے جب کہ عَدل چیز کا بدل ہوتا ہے جو غیر جنس سے بھی ہوسکتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے: اَوْعِدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا (سورۂ مائدہ، آیت ۹۵) (یا اس کے برابر روزے رکھنے ہوں گے)

نُصْرَة، مَعُوْنَة، تَقْوِیَة باہم مشابہ ہیں۔حدیث میں اس طرح وارد ہوا ہے: اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ (تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم) (یعنی اگر تمہارا بھائی ظالم ہو تو اسے ظلم سے روکو اور اگر مظلوم ہو تو اس سے ظلم کا دفاع کرو) وَالْاَنْصَارُ الرَّجُل سے مراد اس شخص کے مددگار ہیں۔

نَصَرَتِ السَّمَآءُ، اس وقت کہتے ہیں جب بارش ہو۔

ترکیب:

یومًا کا منصوب ہونا، مفعول بہ کی بنا پر ہے ظروف کے منصوب ہونے جیسا نہیں ہے اس لئے کہ اس کے معنیٰ ہیں: آج کے دن سے ڈرو اور ہوشیار رہو۔یہ معنی نہیں ہے کہ آج کے دن میں ڈرو اس لئے کہ آج کے دن ڈرنے کا حکم نہیں دیا جارہا ہے بلکہ دوسرے دن میں آج کے دن کی وجہ سے ڈرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔

لَا تَجْزِیْ: محلاً منصوب ہے اس لئے کہ یومًا کی صفت ہے موصوف کی جانب پلٹنے والی ضمیر کے سلسلہ

میں اختلاف ہے۔ سیبویہ کا نظریہ ہے کہ اس کلام میں فِیْہِ محذوف ہے یعنی لَا تَجْزِیْ فِیْہِ (لہٰذا فِیْہِ میں ہاء کی ضمیر موصوف کی جانب پلٹ رہی ہے)

دیگر نحویین نے کہا: یہاں پر فِیْہِ کو پوشیدہ ماننا جائز نہیں ہے اس لئے کہ آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ: هٰذَا رَجُلٌ قَصَدْتُ یا هٰذَا رَجُلٌ رَغِبْتُ اور آپ اِلَیْہِ یا فِیْہِ کا ارادہ کریں پس اس کلام کو وسعت کی بنا پر مفعول پر حمل کیا جائے گا گویا اس طرح کہا گیا ہے کہ:۔ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَا تَجْزِیْہِ پھر ہاء کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: رَأَیْتُ رَجُلًا اُحِبُّ یعنی اُحِبُّہٗ۔ یہ دوسراج کا قول ہے۔

٭ ابو علی نے کہا: صفت سے ہاء کو حذف کر دیا گیا ہے جس طرح صلہ سے حذف کر دیتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں میں مشابہت پائی جاتی ہے اس لئے کہ صفت موصوف کو خاص بنا دیتی ہے جس طرح صلہ موصول کو خاص بنا دیتا ہے وہ موصوف میں عمل نہیں آتی اور نہ ہی اس پر مقدم ہوتی ہے جس طرح صلہ موصول میں عمل نہیں کرتا صفت کا مرتبہ موصوف کے بعد ہوتا ہے اسی طرح صلہ کا مرتبہ بھی موصول کے بعد ہوتا ہے بعض مقامات پر صفت لازم ہوتی ہے جس طرح صلہ لازم ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب موصوف صرف صفت ہی کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے صلہ اور موصول سے پہلے والے کلمات میں عمل نہیں کرتی ہے جب ایسا ہے تو صفت سے ضمیر عائد کو حذف کرنا حسن ہے جیسا کہ صلہ سے حذف کرنا حسن ہے اس آیت میں: اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا۔

اخفش نے کہا: لفظ شَیْئًا مصدر (مفعول مطلق) کا قائم مقام ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لَا تَجْزِیْ جَزَآءً وَلَا تُغْنِیْ غِنَآءً۔

رمانی نے کہا: اقرب یہ ہے کہ شَیْئًا حَقًّا کی جگہ پر ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لَا یُؤَدِّیْ عَنْهَا حَقًّا وَجَبَ عَلَیْهَا (اس کی جانب سے کوئی حق ادا نہیں کرے گا جو اس پر واجب تھا)

وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ: یہ جملہ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ اس جملہ پر عطف ہے جو اس سے پہلے صفت واقع ہوا ہے۔

اور جو اس بات کا قائل ہے کہ جار کو حذف کر کے فعل کو مفعول سے متصل کر دیا ہے پھر صفت میں سے عائد (یعنی موصوف کی جانب پلٹنے والی ضمیر) کو حذف کر دیا ہے۔ لَا یُقْبَلُ کے سلسلہ میں بھی اس کا نظریہ وہی ہوگا جہاں پر صفت کی جانب پلٹنے والی ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے ان میں سے ایک شاعر کا یہ شعر ہے:

وَمَا شَیْءٌ حَمَیْتَ بِمُسْتَبَاحٍ

اور تم نے جس چیز کی حمایت کی ہے وہ مباح نہیں تھی۔

مِنْهَا میں ہاء کی ضمیر لفظ کی بنا پر نفس کی طرف پلٹ رہی ہے۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ: یہ معنی کی بنا پر ہے اس لئے کہ مراد مفرد نہیں ہے اسی لئے جمع لائے ہیں۔

تفسیر:

اس دن سے ڈرو۔۔۔

جب خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے لیے اپنی عظیم نعمتوں کو بیان کیا پھر انہیں روز قیامت کفران نعمت سے ڈرایا، تو ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوا، ڈرو اور خوف کرو، يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا اس دن سے جس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی کوئی نفس کسی نفس کی پریشانی اور دشواری کو دور کر سکتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ کوئی ایک کسی ایک کی جانب سے حق ادا نہیں کرے گا جس پر اللہ کا حق ہو یا اس کے غیر کا (یعنی حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے) نفس کو نکرہ ذکر کیا ہے تا کہ واضح کر دے کہ ہر نفس کا یہی حال ہے۔

یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے: وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا۔ (سورۂ لقمان، آیت ۳۳) (اور اس دن سے ڈرو جب کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی اولاد اپنے والد کے کچھ کام آئے گی)

مسئلہ شفاعت

اور اس کا یہ ارشاد: وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، (اور نہ ہی اس کی طرف سے سفارش قبول کی جائے گی) مفسرین کا کہنا ہے: اس آیت کا حکم یہودیوں سے مخصوص ہے اس لیے کہ ان کا کہنا تھا کہ ہم اولاد انبیاء ہیں، ہمارے آباء واجداد ہماری شفاعت کریں گے۔ خدا نے انہیں اس امید سے مایوس کیا ہے۔ کلام کو عمومیت کے ساتھ بیان کی ہے، مراد خصوص ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ امت (مسلمہ) کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ کی شفاعت مقبولہ ہے اگرچہ شفاعت کی کیفیت میں اختلاف کیا گیا ہے۔

ہمارے یہاں شفاعت گنہگار مومن سے دفع ضرر اور عذاب کے مستحقین سے عذاب کے ساقط و برطرف کرنے سے مخصوص ہے۔ معتزلہ کا کہنا ہے کہ یہ اطاعت شعاروں کے لیے ان کے منافع میں زیادتی کرنا

ہے توبہ کرنے والوں کے لیے نہ کہ گناہگاروں کے لیے۔ یہ ہمارے نزدیک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ثابت ہے۔ آپ کے برگزیدہ اصحاب اور ائمہ اہلبیت طاہرین علیہم السلام اور مومنین صالحین کے لیے جن کی شفاعت کے ذریعہ خداوند عالم بہت سے خطا کاروں کو نجات بخشے گا۔ اس بات کی تائید وہ حدیث کر رہی ہے جس کو امت نے تسلیم کیا ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ہے: اِدَّخَرْتُ شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ (میں نے اپنی شفاعت کو ذخیرہ کر رکھا ہے اپنی امت کے گناہان کبیرہ کرنے والوں کے لئے)

ہمارے علماء سے جو روایات مرفوعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، یہ ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: میں روز قیامت شفاعت کروں گا، میری شفاعت مقبول ہوگی اور میرے اہلبیتؑ شفاعت کریں گے ان کی شفاعت مقبول ہوگی اور ادنیٰ مومنین اپنے اپنے چالیس برادر مومن کی شفاعت کریں گے جن پر آتش جہنم واجب ہو چکی ہوگی (ان کی بھی شفاعت کریں گے)

خداوند عالم نے اپنے ارشاد میں کفار کی اس حسرت کی خبر دی ہے جو صاحبان ایمان کو حاصل ہونے والی شفاعت کے ان سب سے فوت ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوگی (اور وہ اس طرح کہیں گے) فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ (ہمارا نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہے، نہ ہی کوئی پکا دوست ہے)

وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، (اور نہ ہی اس سے فدیہ لیا جائے گا) یعنی فدیہ اور عوض۔ عدل کو فدیہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ مُفدیٰ کے معادل اور مماثل ہوتا ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی سے بھی فدیہ نہیں لیا جائے گا جو ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کے گناہوں کا بدل اور عوض نہیں لیا جائے گا۔ حدیث میں وارد ہوا ہے: لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ صَرْفاً وَّلَا عَدْلاً. اس کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حسن نے کہا ہے: صَرْف سے عمل اور عَدْل سے فدیہ مراد ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: صَرْف (اطاعت یعنی استحباباً) اور عَدْل فریضہ ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے: صَرْف حِیْلَة (بہانہ) اور عَدْل فدیہ ہے۔

کلبی نے کہا ہے: صَرْف. فدیہ اور عَدْل یعنی اس کی جگہ کوئی اور شخص۔

ارشاد الٰہی: وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ. ان کی مدد نہ کی جائے گی کہ وہ عذاب سے نجات حاصل کر سکیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا جو ان کی اللہ کے مقابلہ میں نصرت کر سکے جب اللہ ان پر عذاب نازل کرے گا۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۴۹﴾

اور یاد کرو جب ہم نے تمھیں آل فرعون سے نجات دی انھوں نے تم کو سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی۔

قرائت:

قرأتِ شواذ میں ابن محیصن نے یَذۡبَحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ پڑھا ہے۔

حجت:

ابن جنی نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فَعَلۡتَ (ثلاثی مجرد سے) کبھی کبھی اس میں تکثیر کے معنی ہوتے ہیں اور ایسا فعل کے اپنے مصدر پر دلالت کی وجہ سے ہے اور مصدر اسم جنس ہے اور وسعت وعمومیت کے لئے جنس ہی کافی ہے۔ ابوالحسن کا شعر ہے:

اَنۡتَ الۡفِدَاءُ لِقِبۡلَةٍ هَدَّمۡتَهَا وَ نَقَرۡتَهَا بِيَدَيۡكَ كُلَّ مُنَقَّرِ

تم اس قبلہ پر قربان کہ جسے تم نے ڈھایا ہے اور اسے اپنے ہاتھوں سے چوٹ پہنچائی ہے۔

گویا شاعر نے وَنَقَرۡتَهَا کہا ہے اس لئے کہ لفظ مُنَقَّر گواہ ہے کہ (کہ مُنَقَّر باب تفعیل سے ہے) چونکہ فعل میں مصدر کے معنی پائے جاتے ہیں جو کہ جنس پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس کی تثنیہ اور جمع بنانا جائز نہیں ہے اس لئے کہ تثنیہ اور جمع میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔

الفاظ و معانی:

اِنۡجَاء، تَنۡجِيَة اور تَخۡلِيۡص معنیٰ کے لحاظ سے ایک ہی ہیں، یعنی نجات دلانا۔

اَلنَّجَاۃ وَالسَّلَامَۃ وَالْخَلَاص وَالتَّخَلُّص چھٹکارا پانا۔ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔

اِنْجَاء اور تَنْجِیَۃ کے درمیان بعض نے فرق بیان کیا ہے کہ اِنْجَاء کا استعمال ہلاکت میں واقع ہونے سے قبل چھٹکارا اور نجات حاصل کرنے میں ہوتا ہے جبکہ تَنْجِیَۃ کا استعمال ہلاکت میں مبتلا ہونے کے بعد نجات پانے میں ہوتا ہے۔

آل اور اَھْل کے ایک ہی معنی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل کی اصل اہل ہے، اس لئے کہ آل کی تصغیر اُھَیْل ہے اور کسائی نے نقل کیا ہے کہ اُوَیْل آتی ہے اور احتمال دیا گیا ہے کہ یاء کو ہاء سے بدل دیا گیا ہے جس طرح ھیھات اور ایھات میں کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل بذات خود اصل ہے۔آل اور اہل کے درمیان فرق یہ ہے کہ اہل آل سے عام ہے اور اس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔اہل بصرہ کہا جاتا ہے آل بصرہ نہیں کہتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرد کی آل اس کے قریبی (قربت دار) اور اہل بیت ہیں۔آل جبل (پہاڑ کے اطراف وجوانب کے لوگ ہیں) ابن درید نے بیان کیا ہے کہ ہر شخص کی آل خود اس کی ذات اور شخصیت ہے۔آل الرجل سے مراد مرد کے اہل اور اس کے قرابت دار ہیں۔

فرعون عمالقہ کے بادشاہ کا نام ہے جس طرح روم کے بادشاہ کو قیصر، فارس (ایران) کے بادشاہ کو کسریٰ، ترک کے بادشاہ کو خاقان اور یمن کے بادشاہ کو تُبّع کہا جاتا ہے۔ یہ صفت کے معنی میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرعون کا نام مصعب بن ریان تھا۔محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ اس کا نام ولید بن مصعب تھا۔

یَسُوْمُوْنَکُمْ (یعنی تمھیں زحمت وتکلیف میں مبتلا کرتا ہے) کہا گیا ہے کہ تمھیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

سُوْءُ الْعَذَاب، اَلِیْمُ الْعَذَابِ اور شَدِیْدُ الْعَذَاب ایک جیسے ہیں۔صاحب کتاب العین نے بیان کیا ہے کہ سُوْءِ عذاب کا نام ہے جو تمام آفات اور امراض کا جامع اور شامل ہے۔

ذِبح، نَحر اور شَقّ باہم مشابہ ہیں۔

یَسْتَحْیُوْنَ یعنی یَسْتَبْقُوْن (باقی رکھتے ہیں، زندہ رکھتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اُقْتُلُوا شُیُوْخَ الْمُشْرِکِیْنَ وَاسْتَحْیُوا شَرْخَھُمْ (یعنی بوڑھے مشرکین کو قتل کردو اور ان کے جوانوں کو باقی رکھو۔

نِسَآء، نِسْوَۃ، نِسْوَان (عورتیں) کے لفظ کی واحد نہیں ہے۔

بَلَاء، نِعْمَۃ، اِحْسَان لغت میں ایک جیسے ہیں۔بَلَاء خیر وشر (دونوں) میں استعمال ہوتا ہے۔اللہ

ارشاد فرماتا ہے: نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء/ ۳۵) اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی کے ذریعہ آزماتے ہیں۔

اِبْلاء ، اِنْعام معنی میں ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا (سورۂ انفال، آیت ۱۷) (اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مومنین کو بہترین آزمائش میں کامیابی عطا کرے) بلاء (کا استعمال) انعام میں بھی ہوتا ہے جس طرح انتقام میں ہوتا ہے۔ بَلاء کی اصل امتحان واختیار ہے۔

ترکیب:

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ میں إِذْ میں عامل يَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ میں اُذْكُرُوْا ہے اور وہ ما قبل پر عطف ہے۔

يَسُوْمُوْنَكُمْ ممکن ہے کہ محلاً منصوب ہو آل فرعون کی حال ہونے کی بنا پر اور اس میں عامل نَجَّيْنٰكُمْ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ استیناف ہو۔ (نیا جملہ ہو)

اَبْنَاء اِبْن کی جمع ہے اور اِبْن کی اصل بَنَو باء اور نون کے فتحہ کے ساتھ اور یہ کہ باء مفتوح ہے اس کی دلیل عربوں کا اس کی جمع بنانے میں اَبْنَاء کہنا ہے اَفْعَال کے وزن پر اور اَفْعَال ان اسماء کی جمع کا وزن ہے جو فَعَل کے وزن پر ہوں جیسے جَبَل سے اَجْبَال۔ جیسا کہ فَعْل (عین ساکن) اس کی جمع اَفْعُل پر آتی ہے جیسے فَرْخ سے اَفْرُخ۔

لفظ ابن سے واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا اس لئے کہ واؤ زیادہ سنگین تھا لہٰذا اسے حذف کرنا زیادہ بہتر تھا۔ یہ اخفش اور ابوعلی فارسی کا نظریہ ہے۔

تفسیر:

نعمت آزادی

خداوند عالم نے ان نعمتوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے جس کا اجمالی طور پر سابق میں بیان گزر چکا ہے۔

ارشاد فرمایا: وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ ، اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمھیں نجات دلائی ، مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ ، فرعون اور اس کے دین والوں سے ، يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ، جنھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا

تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ تمھیں زحمت و مشقت میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ تمھیں عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھے، یہ دونوں معانی قریب قریب ہیں۔ اس عذاب کے بارے میں اختلاف وارد ہوا ہے جس عذاب سے اللہ نے انھیں نجات بخشی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآئَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ ، (وہ تمھارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمھاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے) اس کی تفسیر یہ ہے کہ بیان کیا گیا ہے کہ آل فرعون ان کو زحمت میں مبتلا کرتے تھے انھوں نے انھیں متعدد گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک گروہ ان کی خدمت کرتا تھا، ایک ان کے لیے کھیتی باڑی کرتا تھا اور جن میں کسی کام کی صلاحیت نہیں ہوتی ان پر جزیہ اور ٹیکس لگا دیتے، ان کے بیٹوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے۔ سورہ ابراہیم میں بھی اس بات کی نشاندہی ہے کہ:

يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآئَكُمْ (سورہ ابراہیم، آیت ۶) (تمھارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمھاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے)

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآئَكُمْ کو يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ پر عطف کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں: يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآئَكُمْ، کے معنی ہیں تمھارے لڑکوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ باقی رکھتے۔ لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے تاکہ انھیں کنیز بنائیں، انھیں اسیر و قیدی بنا کر ان سے مجامعت کریں، یہ قتل کرنے سے زیادہ سخت تھا، اَبْنَآئَكُمْ، نہیں ارشاد ہوا اس لیے کہ انھیں اسی نام سے یاد کیا جو ان کی حالت و کیفیت کی تاویل اور معنی تھے۔ بیان کیا گیا ہے: نِسَآءَ كُمْ (یعنی تمھاری عورتیں) غلبہ کے سبب کہا ہے اس لیے کہ چھوٹی اور بڑی (عورت) کو باقی رکھتے تھے بطور مثال کہا جاتا ہے "مرد آئے" اگرچہ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح اَبْنَآءِ (فرزندوں) کے مانند چھوٹی اور بڑی پر نِسَآءِ (عورت) کی لفظ کا استعمال صحیح ہے۔

ارشاد باری: وَفِیْ ذٰلِكُمْ، تمھارے عذاب میں مبتلا ہونے اور فرزندوں کے قتل میں بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ، (تمھارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی) جب تمھیں اور فرعون کو چھوڑ دیا گیا تو اس نے تمھارے اوپر اس طرح کے مظالم ڈھائے۔ بیان کیا گیا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم سے نجات پانے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمھارے لئے عظیم نعمت ہے۔

واقعہ

بیٹوں کو قتل کرنے کا سبب یہ تھا کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا کہ گویا ایک آگ بیت المقدس کی جانب سے بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ اس نے مصر کے گھروں کو اپنی زد میں لے لیا ہے اور انھیں جلا دیا ہے۔ قبط (قبیلہ) کو بھی جلا دیا ہے اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیا ہے۔ فرعون خواب دیکھ کر گھبرایا اور جادوگروں، کاہنوں اور قیافہ شناسوں کو بلا کر خواب کی تعبیر دریافت کی؛ انھوں نے کہا: بنی اسرائیل میں ایک فرزند پیدا ہوگا اور تیری ہلاکت اسی کے ہاتھوں ہوگی، تیرے اقتدار کا خاتمہ ہوگا اور تیرا دین تبدیل ہو جائے گا۔ پس فرعون نے بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا اور اپنی حکومت کی تمام دایاؤں کو حکم دیا کہ تمھارے ذریعہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے اور لڑکی پیدا ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے۔ دایاؤں پر نگراں مقرر کر دیے۔ اس طرح انھوں نے یہ کام کرنا شروع کر دیا اور بنی اسرائیل کے بوڑھوں میں موت کا بازار گرم ہو گیا (قبیلہ) قبط کے رؤساء فرعون کے پاس آ کر کہنے لگے بنی اسرائیل میں موت وارد ہو چکی ہے چھوٹے قتل کیے جا رہے ہیں اور بزرگ اپنی موت مر رہے ہیں قریب ہے کہ ہماری نوبت بھی آن پہنچے۔ فرعون نے حکم دیا کہ ایک برس قتل کیا جائے اور ایک سال چھوڑ دیا جائے۔ جناب ہارونؑ کی ولادت اس برس میں ہوئی جس برس بچے قتل نہیں کیے گئے۔ اس طرح انھیں چھوڑ دیا گیا اور جناب موسیٰؑ اس برس پیدا ہوئے جس میں بچوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

❀❀❀❀❀

وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾
اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر کو پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا تھا تمھیں نجات دی اور تمھاری نظروں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کر دیا تھا۔

قرائت:

قرأت شواذ میں زہری نے وَاِذۡ فَرَّقۡنَا بِكُمُ (راء کو) مشدد پڑھا ہے۔

ابن جنی نے کہا: فَرَّقْنَا میں فَرَقْنَا سے زیادہ اور شدید تفریق ہے۔ فَرَّقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے سمندر کو فرقہ فرقہ یعنی ٹکڑے ٹکڑے بنا دیا اور فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ کے معنی ہیں کہ ہم نے تمہارے لئے سمندر کو شگافتہ کر دیا۔

الفاظ ومعانی:

فَرْق دو چیزوں کے درمیان فاصلہ کو کہتے ہیں۔ فِرَق ہر چیز کے گروہ کو کہتے ہیں (مثلاً) پانی کو کہتے ہیں جب اس کا بعض پانی بعض سے جدا اور علیحدہ ہو جائے ان میں سے ہر گروہ فِرَق ہے۔ اسی سے متعلق ارشاد ہے: فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ. (سورۂ شعراء ر ۶۳) (اور ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی طرف ہو گیا)۔ فَرَق خوف کے معنی میں ہے۔

بَحْر کو بحر اس کی وسعت کشادگی اور پھیلاؤ کے سبب کہا گیا ہے۔ اِسْتَبْحَرَ فِي الْعِلْمِ، اس وقت کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص وسیع علم اور اس میں تمکن اور قدرت رکھتا ہو۔ بَاحِر وہ احمق و نادان ہے کہ جب گفتگو کرے تو مبہوت و حیران ہو جائے۔ عرب نمکین اور شیریں پانی کو بحر کہتے ہیں جب بکثرت ہو۔ اللہ کا ارشاد ہے: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ (سورۂ رحمٰن ر ۱۹) (اس نے دو دریا بہائے جو آپس میں مل جاتے ہیں) یعنی شیریں اور نمکین پانی۔

غَرَق پانی کی تہہ میں بیٹھ جانے کو کہتے ہیں۔ نجات غرق کی ضد ہے اسی طرح نجات ہلاکت کی بھی ضد ہے۔

نَظَر کے معنی آنکھ سے دیکھنے کے ہیں جس طرح نَظَرْتُ فِي الْكِتَابِ (میں نے کتاب پر نظر کی کتاب دیکھی) کہا جاتا ہے۔ قائل کا یہ کہنا: اَنْظُرُ اِلَى اللهِ ثُمَّ اِلَيْكَ، یعنی میں فضل خدا کا متوقع ہوں پھر آپ کے فضل کا۔ نَظَرْتُه و اِنْتَظَرْتُهٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ نَظَر کے معنی تَفَكُّر کے بھی ہیں۔ حقیقی معنی کسی وجہ کے سبب کسی چیز کی جانب اقبال کرنا اور بڑھنا ہے۔ رحمت کے ذریعہ نظر رحمت کی جانب بڑھنا ہے۔ نظر کی حقیقت کسی چیز کو دیکھنے کے لیے صحیح حدقہ (چشم) کا منقلب کرنا اور گھمانا ہے۔

تفسیر:

فرعونیوں کے چنگل سے آزادی

پھر خداوند عالم نے بنی اسرائیل پر دوسری نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ،
اور یاد کرو جب ہم نے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ تم اس کے درمیان سے گذر گئے اور تم دونوں (پانی) کے درمیان فرقے (گروہ) تھے جو خشک راستے پر چل رہے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ تمھارے داخل ہوتے ہی ہم نے سمندر کو پھاڑ دیا اور اس کے شگاف میں تمھارے ہر گروہ نے خشک راستے پر چلنا شروع کر دیا اور تمھارے مابین فاصلہ واقع ہو گیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا یعنی تمہارے سبب سے دریا کو پھاڑ دیا تا کہ تم اس میں سے گذرو۔ فَاَنْجَيْنٰكُمْ، تمھیں نجات بخشی سمندر سے اور ڈوبنے سے۔ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ (اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا) یہاں پر فرعون کا غرق ہونا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کو دوسرے مقام پر ذکر کیا گیا ہے: فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ، (ہم نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا) یہاں پر کلام کی دلالت کے سبب اختصار سے کام لیا گیا ہے اس لیے کہ غرض فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت پر مبنی ہے۔ اس کی مثال قائل کا قول ہے: دَخَلَ جَيْشُ الْاَمِيْرِ الْبَادِيَةَ (یعنی سردار کا لشکر صحرا میں داخل ہوا) ظاہر ہے کہ سردار لشکر کے ہمراہ تھا۔ ممکن ہے آل فرعون سے خود فرعون مراد ہو جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ، (اس میں سے جسے آل موسیٰ اور آل ہارون نے چھوڑا ہے) یعنی موسی وہارون۔

ارشاد ہوتا ہے: وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، یعنی تم ان کے غرق ہونے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ سرزنش اور اظہار معجزہ کے لئے زیادہ بلیغ ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ تم ان کے منظر اور مشہد (نظر آنے اور مشاہدہ کے مقام) میں تھے۔ یہاں تک کہ اگر تم انھیں دیکھنا چاہتے تو یہ ممکن تھا وہ اس حالت میں تھے کہ انھیں دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ زجاج کا قول ہے اور اسی سے ملتا جلتا فراء کا قول ہے۔ قول اول زیادہ صحیح ہے؛ اس لیے کہ انھیں دیکھنے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ سب سمندر سے گذر رہے تھے۔ مفسرین کے اقوال میں اختلاف ہے کہ اصحاب موسیٰ نے سمندر کو پھٹتے ہوئے اور اس کی لہروں کو بلند ہوتے ہوئے دیکھا یہاں تک سب اس میں غرق ہو گئے۔ ظاہر سے عدول کرنے

میں کوئی وجہ نہیں۔ (یعنی ظاہر آیت پر عمل کیا جائے گا)

واقعہ

سمندر میں فرعون کے واقعہ کو بنی اسرائیل کے ساتھ ابن عباس نے اس طرح بیان کیا ہے: ''خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ پر وحی فرمائی کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے جائیں۔ جناب موسیٰؑ رات میں بنی اسرائیل کو لیکر نکل گئے۔ فرعون نے ایک کروڑ گھوڑوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا جس میں ایک بھی گھوڑی نہیں تھی۔ جناب موسیٰؑ چھ لاکھ بیس ہزار لوگوں کے ہمراہ تھے۔ فرعون نے جب انھیں دیکھا تو کہنے لگا یہ تو نہایت مختصر لوگ ہیں، ہم انھیں خوف زدہ کرلیں گے۔ جناب موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ہمراہ چلتے رہے یہاں تک کہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ جناب موسیٰؑ کے ساتھی فرعون سے خائف ہو کر کہنے لگے: اے موسیٰ! آپ اس سے قبل بھی ہمیں اذیت میں مبتلا کرتے رہے ہیں اور اب آپ ہمیں یہاں لے آئے ہیں، اب سمندر ہمارے روبرو ہے اور یہ فرعون ہے جو ہم پر ظلم کر رہا ہے اور اس کے ساتھی بھی ہم پر ستم ڈھا رہے ہیں۔ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: عنقریب تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کردیگا اور تمھیں زمین پر خلیفہ بنائے گا۔ غور کرو تم کیا کر رہے ہو۔ یوشع بن نون نے موسیٰؑ سے عرض کیا: آپ کو کس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ موسیٰؑ نے کہا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنا عصا سمندر پر ماروں۔ یوشع بن نون نے کہا: ماریئے! اللہ نے سمندر پر وحی فرمائی کہ جب موسیٰ عصا ماریں تو ان کی اطاعت کرنا۔ (ابن عباس) کہتے ہیں: موسیٰؑ نے سمندر پر عصا مارا جس سے بارہ راستے پیدا ہو گئے۔ ہر قبیلہ کے لیے کہ ایک راستہ بن گیا۔ بنی اسرائیل کہنے لگے: ہمیں گیلا راستہ نہیں چاہیے۔ خداوند عالم نے ہوا کے ذریعہ راستہ خشک کردیا جیسا کہ ارشاد ہے: فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا، (سورۂ طہ، آیت ۷۷) (اور ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنالو)

جب ان لوگوں نے راستہ پر چلنا شروع کردیا ان میں سے بعض نے بعض سے کہا: ہم اپنے ساتھیوں کو کیوں نہیں دیکھ پا رہے ہیں؟ جناب موسیٰؑ سے کہنے لگے: ہمارے ساتھی کہاں ہیں؟ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: تمھاری طرح راستہ میں ہیں۔ کہنے لگے ہم راضی نہیں ہوں گے جب تک انھیں دیکھ نہ لیں۔ موسیٰؑ نے بارگاہ خدا میں عرض کیا: پروردگارا! ان کی بداخلاقیوں پر میری مدد فرما۔ اللہ نے وحی فرمائی اپنا عصا دائیں بائیں جانب گھماؤ۔ موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا۔ پس پانی (جو دیوار کے مانند کھڑا تھا) میں سوراخ پیدا ہو گئے جن سے ایک نے

دوسرے کو دیکھا۔فرعون جب ساحل سمندر پر پہونچا جو اپنے گھوڑے پر سوار تھا جو پانی میں داخل ہونے سے خوف کھا رہا تھا۔حضرت جبرئیل نے اس کے لیے ایک گھوڑی کی شبیہ بنادی اور وہ سمندر میں اتر گئی۔اس کے ساتھ گھوڑا بھی سمندر میں داخل ہوگیا۔اس طرح فرعون کی قوم بھی سمندر میں داخل ہوگئی۔جب حضرت موسیٰؑ کے تمام ساتھی سمندر سے باہر نکل گئے اور فرعون کا آخری ساتھی بھی سمندر میں داخل ہوگیا تو سمندر باہم مل گیا اور انھیں ڈھانپ لیا۔فرعون کے تمام ساتھی غرق ہوگئے اور جناب موسیٰؑ اور آپ کے تمام ساتھیوں کو نجات حاصل ہوگئی۔"

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے، یہ جو کہا جاتا ہے خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ کے مانند ہر نبی اور پیغمبر کو روشن آیات اور معجزات کیوں عطا نہیں کیے تاکہ دلیل بہت زیادہ نمایاں اور شبہہ بہت دور ہوتا؟ اس کا جواب ہے: خداوند عالم اپنی مخلوقات کی اصلاح کے لیے ان کی بہتری کے مطابق انھیں روشن نشانیاں، زبردست معجزات عطا کرتا ہے۔جناب موسیٰؑ کی قوم میں نفس کی سستی اور کاہلی اس درجہ پر تھی کہ ان کے لیے حقیقی آیات کے ساتھ استدلال مناسب نہیں تھا۔کیا تم نے نہیں دیکھا جب وہ ایک نہر کو عبور کر کے ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرے جو بتوں کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔تمام تر نشانیوں کے دیکھنے کے بعد کہنے لگے: موسیٰ ہمارے لیے بھی ایسے ہی خدا بنادو جیسے ان لوگوں کے ہیں۔جناب موسیٰؑ نے اس پر فرمایا: تم لوگ جہالت سے کام لے رہے ہو۔جبکہ عرب میں پیغمبرؐ کی امت ذہنی ذکاوت اور قوت فہم میں بہت تیز تھی لہٰذا ان کے پاس ایسی ہی آیات اور نشانیاں پہنچیں جو تمام کی تمام حجت ظاہرہ اور بینات باہرہ پر مشتمل تھیں جن کے ذریعہ علم ویقین کی فضا تک پہونچا جاسکتا تھا جو ان کے لیے صداقت وسچائی کی راہ کو واضح کرنے والی تھیں۔جن میں اعمیٰ اور بصیر (بے بصیرت اور صاحب بصیرت) مساوی نہیں ہوسکتے۔"وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ" (سورۂ فاطر، آیت ۱۴)

(کوئی آپ کو اس باخبر اللہ کی طرح باخبر نہیں کرے گا)

❀❀❀❀❀

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ لیا تھا تو تم نے ان کے جانے کے بعد بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا اس وقت تم نے بہت بڑی زیادتی کی تھی۔

قرائت:

اہل بصرہ اور ابو جعفر نے یہاں سورۂ بقرہ میں وَعَدْنَا بغیر الف کے پڑھا ہے اور سورۂ اعراف وسورۂ طہ میں بھی اور بقیہ قراء نے وَاعَدْنَا الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، حفص برجمی اور رویس نے اِتَّخَذْتُم اور اَخَذْتُمْ پڑھا ہے اور اس میں سے جو آیا ہے وہ ذال کے اظہار کے ساتھ آیا ہے اور اعشیٰ نے ان لوگوں کی موافقت کی ہے اِفْتَعَلْتُ میں یعنی باب افتعال میں اور بقیہ قراء ادغام کرتے ہیں۔

حجت:

جن حضرات نے الف کو باقی رکھ کر وَاعَدْنَا قرأت کی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ صورتحال دو حالتوں سے خالی نہیں ہے یا تو جناب موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا یا وعدہ نہیں کیا تھا اگر انہوں نے وعدہ کیا تھا تو وَاعَدْنَا کی قرأت کے واجب ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے اور اگر انہوں نے وعدہ نہیں کیا تھا تو ان کی طرف سے جو عمل انجام پایا وہ وعدہ کو قبول کرنا اور اسے وفا کرنے کی کوشش کرنا ہے یہ بھی وعدہ کا قائم مقام ہے۔

وَاعَدْنَا کی قرأت میں اللہ کی جانب سے وعدہ اور موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے قبولیت پر دلالت پائی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اس ارشاد: بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ میں اس بات کی خبر دینا حسن ہے کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا تو یہاں پر بھی وَاعَدْنَا ہی اختیار کیا جانا چاہئے تھا اور جن حضرات نے وَعَدْنَا پڑھا ہے بغیر الف کے تو وہ معنیٰ سے بہت زیادہ مطابقت رکھتا ہے اس لئے کہ قبول کرنا درحقیقت وعدہ نہیں ہے اس لئے کہ وعدہ دراصل موعود کو خبر دینا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کون سی نیکی کرے گا اس بنا پر بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ مجاز ہوگا اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی خبر دی ہے۔

بعض علماء نے کہا: مُوَاعَدَۃ درحقیقت اللہ اور انسان کے درمیان ہوگا حالانکہ خدا ہی تنہا وعد و وعید کرنے والا ہے۔جیسا کہ فرمایا ہے:

*وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ

*وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ دونوں قرائتیں قوی ہیں۔

اور جن لوگوں نے ذال کو تاء میں ادغام کیا ہے اِتَّخَذْتُمْ میں تو ان کی دلیل یہ ہے کہ ذال کا مخرج تاء کے مخرج سے قریب ہے اور جن لوگوں نے ادغام نہیں کیا ان کی دلیل یہ ہے کہ دونوں کے مخرج الگ الگ ہیں۔

الفاظ و معانی:

وَعْد، مَوْعِد، وَعِيْد، عِدَۃ، مَوْعِدَۃ مصادر ہیں۔وَعْد کو خیر کے لیے اور وَعِیْد کو شر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔وَعْد اور مَوْعِد کی جمع نہیں بن سکتی۔کبھی مقام اور وقت اور مصدر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔مِيْعَاد یا تو وقت کے لیے ہوگا یا جگہ اور مقام کے لیے ہوگا۔اور کبھی کہا جاتا ہے: وَعَدْتُہٗ فِي الشَّر میں نے اس سے شر کے بارے میں وعدہ کیا۔

اس طرح کہا جاتا ہے: وَعَدْتُّهٗ فِي الشَّرِّ، اللہ فرماتا ہے: اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، (سورۂ حج، آیت ۷۳) (وہ آگ ہے اللہ نے کافروں سے جس کا وعدہ کر رکھا ہے)

وَعد کے حقیقی معنیٰ خیر کی خبر دینا ہیں جو مُخْبَر (جسے خبر دی جا رہی ہے) کو مستقبل میں پہنچتی ہے یا مستقبل کے بارے میں شر کی خبر دی جاتی ہے۔

لفظِ موسیٰ قبطی زبان کے دو اسموں سے مرکب ہے: ایک مُو جس کے معنی پانی کے ہیں اور دوسرا سیٰ جس کے معنی درخت کے ہیں۔موسیٰ نام کی وجہ یہ ہے کہ جس تابوت میں موسیٰ تھے وہ پانی اور درخت کے نزدیک ملا تھا جسے فرعون کی زوجہ آسیہ کی کنیزوں نے پایا تھا۔سُدی سے روایت ہے آپ موسیٰ بن عمران بن یَصْهُر بن فاهث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراهیم ہیں۔محمد بن اسحاق بن یسار سے روایت ہے۔

خداوند عالم نے اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (یعنی چالیس راتیں) کہا ہے، اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا، (چالیس دن) نہیں

فرمایا ہے اس لئے کہ راتیں دنوں کو شامل ہوتی ہیں۔

مبرد کے قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ راتوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں دن بھی داخل ہو جاتے ہیں اور جب آپ دنوں کا ذکر کریں گے تو ان میں راتیں داخل نہیں ہوں گی۔ رات کا ذکر کر کے دنوں کے ذکر سے اکتفاء کیا ہے، رات غروب سے فجر (صادق) تک شمار ہوتی ہے اور دن طلوع فجر دوم سے غروب تک ہوتا ہے۔

ترکیب:

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً میں أَرْبَعِينَ کا تعلق وعدہ سے ہے یا تو اس لئے کہ وہ ظرف ہے یا مفعول دوم ہے۔ یہ ظرف ہو نہیں سکتا اس لئے کہ وعدہ ان پوری راتوں میں نہیں ہے کہ وہ کَمْ کا جواب ہو اور نہ ہی بعض میں ہے کہ مَتىٰ کا جواب ہو بلکہ وعدہ أَرْبَعِينَ کا تقاضا کرتا ہے جب ظرف نہیں ہے تو اس کا منصوب ہونا مفعول ثانی کی بنا پر ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَعَدْنَا مُوسَىٰ انْقِضَاءَ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً أَوْ تَتِمَّةَ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً پس مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ اَلْيَوْمُ خَمْسَةَ عَشَرَ مِنَ الشَّهْرِ یعنی تَمَامُ خَمْسَةَ عَشَرَ۔

لیکن اس آیت فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً میں أَرْبَعِينَ کا منصوب ہونا تو یہاں پر میقات أَرْبَعِينَ ہے اور وہ وعدہ ہے۔ پس گویا اس طرح ہے کہ تَمَّ الْقَوْمُ عِشْرِينَ رَجُلًا یعنی قوم مکمل ہوئی بیس کی عدد سے۔ میقات مکمل ہوئی اس گنتی سے۔ لفظ مِيقَات مِيعَاد کی جگہ آیا ہے جس طرح لفظ وَقْت وَعْد کی جگہ آیا ہے اس آیت میں: إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ۔ اور دوسرے مقام پر اَلْيَوْمِ الْمَوْعُودِ کی جگہ آیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ آیت کرتی ہے: فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً۔

آیت کریمہ وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً میں لَيْلَةً عدد کی وضاحت و تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ عدد کے بیان میں قاعدہ یہ ہے کہ اسے معدود کے ذکر کے ذریعہ بیان کیا جائے۔ لَيْلَةً اسم تام کی بنا پر منصوب ہے اور وہ اسم تام أَرْبَعُونَ ہے۔ اس کلام تام سے مشابہ ہے کہ جس کے بعد وہ منصوب ہوتا ہے جو فضلہ اور اضافی ہوتا ہے۔

یہاں پر اسم کے تام ہونے کے معنی اس نون کا مرکب ہونا ہے کہ جو اس اسم کو مکمل و تام بناتا ہے۔ پس

یہ اسم اس جملہ سے مشابہ ہے جو فعل و فاعل سے مرکب اس جہت سے کہ وہ ایک دوسرے معنیٰ کے ذریعہ مکمل ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک اور شباہت ہے اور وہ یہ ہے کہ جو فعل و فاعل سے مرکب ہوتا ہے اس میں ایک ایسا معنیٰ پایا جاتا ہے جو مفعول کا تقاضا کرتا ہے اور وہ فعل کا ذکر ہے عدد میں بھی ابہام پایا جاتا ہے جو تفسیر و وضاحت کا تقاضا کرتا ہے تاکہ بتائے کہ یہ انواع میں سے کس نوع کا ہے پس اس معنیٰ کے لحاظ سے وہ منصوب ہوتا ہے اس لئے کہ سیبویہ نے کہا کہ اس قسم میں تمام الاسم میں ایک ایسا معنیٰ پایا جاتا ہے جو اسم اول اور تمام کے بعد آتا ہے ان دونوں کے درمیان فاصلہ بنتا ہے پس اَرْبَعِیْنَ کا نون فاعل کے مانند ہے جو فعل کو مفعول کی جانب سے مسند ہونے سے روک دیتا ہے لہٰذا فعل و فاعل کی جانب سے مسند ہوتا اور مفعول اس کے سبب منصوب ہوتا ہے نون اسم اول کو تام بناتا ہے اور اس کے بعد والا اسم منصوب ہوتا ہے۔

اتَّخَذْتُم:

اِتَّخَذْتُ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک مفعول کا جانب متعدی ہوتا ہے جیسے: وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللهِ آلِهَةً۔

(۲) دو مفعول کا جانب متعدی ہوتا ہے جیسے: اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً۔ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا۔ لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ۔

پس ارشاد الٰہی: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ گویا اسطرح ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ اِلٰهًا۔ (پھر تم نے گوسالہ کو معبود بنا دیا لیا) پس یہاں پر مفعول ثانی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہاں پر مفعول ثانی کو محذوف ماننا ضروری ہے اس لئے کہ جو شخص گوسالہ ڈھالتا یا بناتا ہے وہ خدا کی جانب سے عذاب و غضب کا سزاوار نہیں ہوتا ہے (بلکہ وہ عذاب اور غضب کا شکار بنتا ہے جو گوسالہ کو معبود بناتا ہے)

تفسیر:

بنی اسرائیل کی سب سے بڑی گمراہی

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى، اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انھیں (اَلْوَاح) تختیاں دیں گے جن میں توریت و بیان اور شفا ہے۔ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً چالیس راتوں کے گزر جانے پر یا چالیس راتیں مکمل ہونے پر۔ ہم نے کہا ہے کہ اللہ کا قول 'اُذْكُرُوْا' (یاد کرو) اس میں مضمر ہے اس لیے کہ خداوند عالم نے اس سے

قبل ارشاد فرمایا ہے: یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ، یہاں پر گذشتہ آیات پر معطوف ہے اور یہ چالیس راتیں وہ ہیں جن کا ذکر خداوند عالم نے سورۂ اعراف میں بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَوٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّاَتۡمَمۡنٰہَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّہٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۴۲) (اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ لیا اور اس میں دس کا اور اضافہ کر دیا) جو ماہ ذی القعدہ اور ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں۔

مفسرین نے بیان کیا کہ جب بنی اسرائیل سمندر سے نجات پانے اور فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد مصر واپس آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ توریت اور شرائع (شریعت کے قوانین) نازل کرے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو ان پر اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ وہ کوہ طور پر چالیس راتیں مقیم رہے اور ان پر توریت بصورت الواح نازل کی گئی۔

ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ، تم نے بچھڑے کو الٰہ بنا لیا اس لیے کہ وہ فقط بچھڑے کی شکل و صورت بنانے سے ظالم نہیں ہوئے اس فعل کی ممانعت بھی نہیں تھی بلکہ فعل مکروہ تھا۔ روایت میں جو مصوروں پر لعنت کی گئی ہے اس سے مراد ہے کہ جو اللہ کی تشبیہ اس کی مخلوقات سے دیتے ہیں یا اس سے کا عقیدہ رکھے کہ یہ اللہ کی شکل اور صورت ہے۔

ارشاد الٰہی: مِنۡۢ بَعۡدِہٖ، یعنی موسیٰ کی غیبت اور ان کے خروج کے بعد۔ بیان کیا گیا ہے: اللہ کا تم سے توریت میں وعدہ کرنے کے بعد۔ نیز بیان کیا گیا ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد جو کچھ تم نے نشانیاں دیکھیں تمام احتمالات ہیں۔

وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ، تم نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اس عذاب کے ذریعہ جس کے تم بچھڑے کو الٰہ بنا کر مستحق ہو گئے تھے۔

واقعہ

ابن عباس سے روایت ہے کہ سامری اہل باجومی میں سے ایک شخص تھا۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام میخا تھا۔ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ اس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا اور وہ گائے کی پرستش کرنے والی قوم سے تھا۔ اس کے دل میں گائے کی پرستش کی محبت تھی۔ بنی اسرائیل میں اس نے اسلام کا اظہار کیا۔ موسیٰؑ نے جب اپنے

پروردگار کی بارگاہ میں جانے کا قصد کیا اور بنی اسرائیل میں ہارون کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ہارون نے اپنی قوم سے کہا تم اپنے ہمراہ قوم کی زینت کے آلات لیکر آئے ہو انھیں پاک کرو سب نجس ہیں۔ یعنی انھوں نے قبطیوں سے زیورات لیے تھے۔ جناب ہارونؑ نے کہا: اپنے آپ کو ان سے پاک کرو یہ سب نجس ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے آگ روشن کی گئی، کہا جو کچھ بھی تمھارے پاس آگ میں ڈال دو چنانچہ اس طرح کے آلات اور زیورات ان کے پاس موجود تھے اسے آگ میں ڈال دیا (ابن عباس بیان کرتے ہیں) سامری جبرئیلؑ کی سواری کا نشان دیکھ چکا تھا اور اس نے گھوڑے کے کھر کے نیچے کی مٹی اٹھالی تھی وہ لے آیا، آگ کے قریب گیا اور جناب ہارون سے کہنے لگا: اے نبی خدا! جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے اسے آگ میں ڈال دوں؟

حضرت ہارون نے اجازت دے دی۔ بظاہر وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے ہاتھ میں کیا چیز ہے، ان کا خیال تھا دوسروں کے مانند آلات اور زیورات ہوں گے۔ اس نے وہ مٹی آگ میں ڈال دی اور کہا: آواز والا بچھڑا بن جا! یہ ان کے لیے آزمائش اور فتنہ تھا۔ کہنے لگا یہ تمھارا اور موسیٰ کا اللہ ہے۔ تمام لوگ اس کے اردگرد جمع ہو کر اس سے شدید محبت کا اظہار کرنے لگے۔ ایسی محبت کہ کسی سے اس طرح کی محبت نہیں کی تھی۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ ان کے لیے آزمائش اور فتنہ تھا اور اس پر انھوں نے کچھ اضافہ نہیں کیا۔ حسن نے کہا ہے: بچھڑا گوشت اور خون کا بن گیا۔ ان کے علاوہ بعض حضرات نے کہا: یہ ممکن نہیں ہے اس لیے کہ یہ انبیاء کا معجزہ ہے جس نے حسن کی تائید کی ہے اس کا کہنا ہے فرشتہ کی (مٹی) کا اثر ہے اللہ نے اس میں یہ عادت جاری فرمائی ہے اسے جس شکل میں بھی قرار دیا جائے وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ یہ معجزہ نہیں ہے اور جس نے بچھڑے کے زندہ ہونے کو ممکن نہیں سمجھا ہے اس نے بچھڑے کی آواز کی تاویل اس طرح کی ہے کہ سامری نے ایسا بچھڑا بنایا تھا جس میں سوراخ تھے جس میں ہوا داخل ہوتی اور خارج ہوتی تھی، جس سے آواز پیدا ہوتی تھی۔ سامری نے لوگوں کو اس کی عبادت کے لیے بلایا جسے انھوں نے قبول کیا اور عبادت کی۔ یہ روایت ابو علی الجبائی سے ہے۔

❀❀❀❀❀

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

مگر اس کے بعد ہم نے تمھیں معاف کر دیا کہ شاید اب تم شکر گذار بن جاؤ۔

الفاظ و معانی:

عَفو، صَفح، مَغفِرَۃ، تَجَاوُز ایک جیسے ہیں یعنی معاف کرنا۔ انباری نے بیان کیا ہے: عَفَی اللّٰہُ عَنۡكَ یعنی اللہ نے تمھارے گناہ محو کر دیئے۔ یہ چیز عربوں کے اس محاورہ سے حاصل کی گئی ہے: عَفَتِ الرِّیۡحُ الۡاَثَرَ اِذَا دَرَسَتۡہُ وَ مَحَتۡہُ. عرب یہ فقرہ اس وقت کہتے ہیں جب ہوا کسی چیز کو ختم کر کے اس کے آثار مٹا دیتی ہے۔ اللہ کا معاف کرنا بندے سے اس کے گناہوں کا محو کر دینا ہے۔

رمانی نے بیان کیا ہے: عفو کے حقیقی معنی ترک کے ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۸) (ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا برادر ایمانی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو) یعنی ترک کر دے، عفو کے معنی عذاب کا ترک کرنا ہے۔ عفو حلال اور پاکیزہ مال ہے۔

عَافِیَۃ کے معنی اللہ کا بندے سے دفاع کرنا ہے۔ شکر کے معنی تعظیم و احترام کے ساتھ اعتراف نعمت ہے۔

تفسیر:

اسے بھی معاف کر دیا

ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنۡكُمۡ (مگر اس کے بعد ہم نے تمھیں معاف کر دیا) یعنی تم بچھڑے کی پوجا کر کے جس عذاب کے مستحق ہو گئے تھے ہم نے تمھاری توبہ قبول کر کے تم سے اس عذاب کو اٹھا لیا۔ مِّنۡ بَعۡدِ ذٰلِكَ، تمھارا اس کو الٰہ قرار دینے کے بعد۔ بیان کیا گیا ہے تمھارے بچھڑے کے الٰہ قرار دینے کے بعد تم پر جلد عذاب کرنے کو ترک کر دیا۔

شکر

لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ، تا کہ تم اس (اللہ) کے درگذر کرنے اور جملہ نعمتیں عطا کرنے پر اس کا شکر کرو۔

کہا گیا ہے کہ اس کے معنی تعریض کے ہیں یعنی ہم نے تمھیں شکر کی معرفت عطا کی۔ اس آیت میں شکرِ نعمت کے وجوب پر دلالت ہے اور یہ کہ توبہ کے بعد گناہ سے عفو و درگذر بندوں پر اللہ کی نعمت ہے تا کہ وہ

اس کا شکر ادا کریں۔ اللہ کے بارے میں ہمارے یہ کہنا کہ "اِنَّہٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ" ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم بندے کو اپنی اطاعت پر اس کے حق میں کسی چیز کی کمی کیے بغیر جزا دیتا ہے۔ اطاعت پر جزا کو بطور شکر قرار دینا لغت میں مجازی اعتبار سے ہے۔

انسان اپنے آپ شکر کا مستحق نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو نعمت عطا نہیں کرتا لہذا نعمت کے شکر کا تقاضا کرتی ہے جو مُنْعَمٌ عَلَیْہِ (جس کو نعمت عطا کی گئی ہے) کے علاوہ ہے۔ کبھی انسان کا ذات پر احسان کرنا صحیح ہوتا ہے جس طرح نفس کے ساتھ برائی کرنا ہے اس لیے کہ احسان حُسن سے ہے جب انسان اچھا کام کرتا ہے کہ جس سے استفادہ کرے تو وہ اپنے نفس کا محسن ہوتا ہے اس فعل کی نسبت سے اور جب فعل قبیح (برا فعل) انجام دیتا ہے کہ جس سے نقصان وضرر ہو تو نفس کے ساتھ برا کرنے والا ہوتا ہے جس سبب سے مومن شکر کا مستحق ہوتا ہے، کافر شکر کا مستحق نہیں ہوتا اس لیے کہ مومن جلالت وعظمت کے سبب شکر کا مستحق ہوتا ہے جبکہ کافر ایسا نہیں ہوتا اس کے لیے نعمت کی مکافات (احسان کا احسان سے یا اس سے زائد چیز سے بدلہ دینا) واجب ہے تعظیم کے بغیر۔ شکر اور مکافات کے درمیان فرق یہ ہے کہ مکافات مساوی اور برابری کے معنی میں ہے جب کہ شکر ایسا نہیں ہے۔ نعمت کی مکافات میں اس بات پر دلالت ہے کہ اس کا حق پوری طرح ادا کر دیا گیا ہے کبھی شکر اس سے کم ہوتا ہے اگرچہ منعم علیہ پر اس سے بیشتر نہیں ہوتا مگر یہ کہ جس قدر شکر میں اضافہ ہوگا نعمتوں میں اضافہ اسی خوبی کے ساتھ ہوگا۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے اس لئے کہ واجب ایک حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر جیسا ہے۔ شکر چاہے جتنا زیادہ کیا جائے گا پھر بھی وہ کسی ایسی حد تک نہیں پہنچے گا کہ جس کے بعد اس میں اضافہ ممکن نہ ہو۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾
اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کیا تا کہ تم (اس کے ذریعہ سے) راہ ہدایت پاسکو۔

الفاظ ومعانی:

فُرْقَان مصدر ہے۔ یعنی دو چیزوں کے درمیان تفریق (امتیاز قائم کرنا) ہے۔ ہر فرق کرنے والی چیز کو

فرقان کہتے ہیں جس طرح کتاب خدا (قرآن) کوحق و باطل میں فرق (اور امتیاز) کرنے کے سبب فرقان کہتے ہیں۔ اللہ نے روز بدر کو فرقان کہا ہے چونکہ اس دن حق و باطل کے درمیان امتیاز کیا گیا۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَل لَّکُمْ فُرْقَانًا. (یعنی اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے اور تمھارے گناہوں کے درمیان (جدائی اور علیحدگی) پیدا کر دے گا)

تفسیر:

کتاب اور فرقان

(اور یاد کرو) وَاِذْ اٰتَیْنَا، جب ہم نے عطا کیا، مُوْسَی الْکِتٰبَ، موسیٰ کو کتاب اور وہ تورات ہے وَالْفُرْقَانَ، اور فرقان۔ کتاب اور فرقان کے سلسلہ میں متعدد وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: ابن عباس کا قول ہے کہ فرقان سے بھی مراد تورات ہے۔

دوم: کتاب سے توریت مراد ہے، فرقان (سمندر) میں شگاف ڈالنا مراد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا۔

سوم: فرقان سے حلال و حرام، اور جناب موسیٰؑ اور آپ کے مومنین اصحاب، فرعون اور اس کے کافر ساتھیوں کے درمیان فرق مراد ہے جو بیشتر چیزوں میں ہے جن میں موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نجات اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کا غرق ہونا ہے۔

چہارم: فرقان سے مراد قرآن ہے جس کو اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے: ہم نے موسیٰ کو تورات عطا کی اور محمدؐ کو فرقان عطا کیا۔ آیت میں مجازی طور پر فرقان سے قرآن مراد لینا ضروری نہیں ہے۔ جبکہ خداوند عالم نے خبر دی ہے کہ موسیٰ کو فرقان عطا کیا گیا اس کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ (اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان عطا کیا)

ارشاد (خدا): لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (تا کہ تم اس کے ذریعہ سے راہ ہدایت پا سکو)، تا کہ تم تورات میں موجود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت اور ان کے بارے میں بیان کردہ اوصاف سے ہدایت حاصل کرو۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے لوگو! تم نے گوسالہ پرستی کر کے اپنے نفسوں پر ظلم ڈھایا ہے تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اپنی جانوں کو ہلاک کر ڈالو اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے۔ پھر اس نے تمھاری توبہ قبول کر لی، بے شک وہی توبہ کا قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

قرائت:

ابوعمر نے بَارِئِكُمْ، يَأْمُرُكُمْ اور يَنْصُرُكُمْ کو اختلاس (امالہ) حرکت کے ساتھ قرائت کی ہے اور انھیں سے سکون کی بھی روایت کی گئی ہے اور بقیہ قراء نے بغیر اختلاس (امالہ) وتخفیف کے قرائت کی ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: حروف معجم کی دو قسمیں ہیں: ساکن ومتحرک۔

ساکن کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) جس کی اصل استعمال میں سکون ہے۔

(۲) جس کی اصل حرکت ہے۔

جس کی اصل حرکت ہے دو طرح سے ساکن ہوتا ہے:

(۱) حرکت مبنی کی حرکت ہو۔

(۲) حرکت معرب کی حرکت ہو۔

مبنی کی حرکت دو طرح سے ساکن ہوتی ہے:

(۱) حرف ساکن کلمہ مفرد میں ہو جیسے: فَخِذٌ، سَبُعٌ، اِبِلٌ، عَلِمَ، جس نے تخفیف کی ہے اس نے: فَخْذ، سَبْع، اِبْل، ضُرْبَ، عُلْم کہا ہے۔

(۴) حرف ساکن دوکلموں میں ہوتو منفصل کو متصل سے تشبیہ کی بنا پر ساکن کر دیا جاتا ہے جیسے اس شخص کی قرائت کہ جس نے یَخْشَی اللّٰہَ وَ یَتَّقْہِ پڑھا ہے۔اسی کے مانند عجاج کا یہ قول ہے: فَبَاتَ مُنْتَصِباً وَّ مَا تَکَرْدَسَا۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ یَتَّقِہِ سے تَقِہ کَتِف کے مانند ہے۔اسی سے شاعر کا یہ شعر ہے:

قَالَتْ سُلَیْمٰی اشْتَرْلَنَا سُوَیْقاً۔

سلیمیٰ نے مجھ سے کہا کہ ہمارے کے سویق کی خریداری کرو۔

ہم نے عربوں اور نحویوں کی بول چال میں جو مثالیں ذکر کی ہیں ان میں مبنی کی حرکت کو ساکن کرنے کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن معرب کی حرکت کو ساکن کرنے کا جواز کے سلسلہ میں اختلاف ہے کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر معرب کے لئے علم ہوتو اس کی حرکت کو سکون سے بدلنا جائز نہیں ہے لیکن سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور دونوں قبیلوں (مبنی و معرب) کے درمیان فرق نہیں ڈالا ہے اور امرؤالقیس کے اس شعر کو نقل کیا ہے:

فَالْیَوْمَ اشْرَبْ غَیْرَ مُسْتَحْقَبٍ اِثْمًا مِّنَ اللّٰہِ وَ لَا وَاغِلٍ

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

وَقَدْ بَدَا ھَنْكِ مِنَ الْمِیْزَرِ

اسی طرح جریر کا یہ شعر ہے۔

سِیْرُوْا بَنِی الْعَمِّ فَالْاَھْوَازُ مَنْزِلُکُمْ وَ نَھْرُ تِیْرِیْ لَا تَعْرِفُکُمُ الْعَرَبُ

اے میرے چچازاد بھائیوں سفر کرو کہ اہواز اور نہر تیری تمہاری منزل ہے اور تمھیں عرب نہیں پہنچاتے۔

سیبویہ نے معرب پر داخل ہونے والے حرکات کو مبنی پر داخل ہونے والے حرکات سے مشابہ قرار دیا ہے جیسا کہ علماء نے مبنی کی حرکات کو معرب کے حرکات کے مشابہ قرار دیا ہے۔اسی لئے رُدَّ، فِرَّ، اور عَضَّ وغیرہ میں ادغام کیا ہے جس طرح یَرُدُّ، یَفِرُّ، اور یَعَضُّ میں ادغام کیا ہے۔

جان لیجئے کہ اعراب و بناء (معرب و مبنی) کے حرکات کہ ان کے ضمہ اور کسرہ میں کبھی کبھی اختلاس (امالہ) اور تخفیف کا استعمال کرتے ہیں۔لیکن فتحہ کہ اس میں صرف اشباع نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں تخفیف ہوتی ہے جیسے جَبَل، جس طرح سبع، کتف میں تخفیف کی تھی۔

اسی نظریہ پر سیبویہ نے ابوعمرو کے قول اِلٰی بَارِئِکُمۡ کو حمل کیا ہے وہ اس بات کا قائل ہوا ہے کہ اس نے حرکت میں اختلاس کیا ہے، اشباع نہیں کیا ہے پس وہ حرف متحرک کے وزن پر ہے۔

جنہوں نے ابوعمرو سے ساکن کرنے کی روایت کی ہے تو شاید انہوں نے اختلاس سنا ہوا ہو اور اسکان سمجھا ہو۔ آواز کے کمزور اور پوشیدہ ہونے کی بنا پر۔ اسی طرح اس کا قول ولا اُمرکم وغیرہ بھی ہے۔

الفاظ ومعانی:

بَارِئ کے معنی خالق اور صانع کے ہیں۔ باری اور خالق کے درمیان فرق سے مبدی اور محدث (یعنی خلقت کا آغاز اور عالم وجود میں لانے والا) مراد ہے۔ خالق تقدیر کرنے والا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرنے والا۔ لیکن اس کا ارشاد: اَنَا بُرَاۤء یہ بریٓ کی جمع ہے اصل معنی کسی چیز کا (دوسری) چیز سے جدا کرنا ہے اسی سے بَرِئَ اللّٰہُ الْخَلْقَ، (اللہ نے مخلوق کو خلق کیا) ہے۔ یعنی اسے عدم سے وجود بخشا۔

قَتَل، ذَبَح، مَوت ایک جیسے ہیں البتہ قتل اور ذبح کے درمیان فرق ہے کہ قتل کے معنی زندگی کی بنیاد کو منہدم کر دینا ہے اور ذبح کے معنی گردن کی رگوں کا قطع کرنا ہے۔

ترکیب:

یَاقَوۡمِ میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا یہی مختار ومنتخب ہے اس لئے کہ قَوۡمِ منادی مضاف ہے اور نداء باب حذف ہے پس یاء کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ وہ حرف واحد ہے اور اسم کے آخر میں ہے جس طرح تنوین اسم کے آخر میں ہوتی ہے اور کسرہ باقی رہ گیا ہے تا کہ یاء محذوف پر دلالت کرے جب یاء اضافت کو غیر ندا میں حذف کر دیا جاتا ہے تو نداء میں حذف کرنا لازم ہے۔

اس کلام میں چار صورتیں ممکن ہیں:

(۱) یَاقَوۡمِ جیسا کہ پڑھا گیا ہے اور غیر قرآن میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ قرأت قابل اتباع سند ہے۔

(۲) یَاقَوۡمِیۡ بھی جائز ہے کہ یاء کو ثابت اور ساکن رکھا جائے۔

(۳) یَاقَوۡمِیَ، یاء کو باقی رکھا جائے اور اسے تینوں حرکتیں دی جائیں: یَاقَوۡمِیِ، یَاقَوۡمِیُ، یَاقَوۡمِیَ

(۴) یَاقَوْمُ بھی جائز ہے اس لئے کہ یہ منادی مفرد ہے۔

لیکن یہ آیت کہ یَالَیْتَ قَوْمِیْ تو اس میں یاء ثابت ہے اس لئے کہ اس سے کوئی ایسی چیز ملحق نہیں ہوتی ہے جو یاء کے حذف کا باعث ہو جس طرح نداء میں ملحق ہوتی تھی۔

تفسیر:

گوسالہ پرستی کی سزا

اور یاد کرو، وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ (جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ ان کی جانب واپسی کے وقت) جنھوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی، یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ، یعنی تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور بچھڑے کی پرستش کر کے عبادت کو غلط جگہ رکھا۔ ان کا اپنے اوپر ظلم ان کا اپنے اوپر وہ عمل تھا کہ جس کے کرنے پر وہ عذاب کے حقدار بن گئے۔ اسی طرح گناہ کرنے والا ہر آدمی اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے، فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ (پر تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو)، یعنی اطاعت و توحید کے ذریعہ اپنے خالق اور وجود میں لانے والے کی طرف رجوع کرو۔ خداوند عالم نے ان کی توبہ کو عزم محکم کے ساتھ ندامت اور اپنے آپ کو قتل کرنا قرار دیا ہے۔

یہاں اختصار و اضمار ہے گویا جب ان سے کہا گیا: اپنے خالق کے حضور توبہ کرو تو انھوں نے کہا: کس طرح توبہ کریں؟ تو ارشاد ہوا: فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَکُمْ، یعنی تم میں سے بعض بعض کو قتل کرے، بے گناہ مجرم کو قتل کرے۔ یہ روایت ہے ابن عباس، سعید بن جبیر اور مجاہد وغیرہ سے یہ فرمان الٰہی اس آیت کریمہ کے مانند ہے کہ: فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَکَةً طَیِّبَةً (سورۂ نور، آیت ۶۱) (جب بھی گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو یہ اللہ کی جانب سے ایک تحفہ ہے بابرکت اور پاکیزہ) (جب تم گھروں میں داخل ہو تو خود اپنے نفسوں پر سلام کرو یعنی بعض بعض کو سلام کرے)

اور کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ قتل کے لیے تیار ہو جاؤ، ان کے قتل کے لیے خودسپردگی کو ان کے اپنے آپ کو قتل کیے جانے کو مجازاً کہا گیا ہے۔ یہ روایت ابن اسحاق سے ہے۔ جسے جبائی نے اختیار کیا ہے۔

مَامُوْرِ بِالْقَتْلِ (جن لوگوں کو قتل کا حکم دیا گیا تھا) ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ جناب موسیٰؑ نے انھیں دو صفوں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا کہ وہ غسل کریں اور کفن پہنیں، ہارون بارہ

ہزار ایسے لوگوں کو لے کر آئے جنھوں نے بچھڑے کی پرستش نہیں کی تھی، جن کے پاس تیز تلواریں تھیں جو انھیں قتل کرنے لگے۔ جب ستر ہزار قتل کر دیے گئے تو اللہ نے باقی لوگوں کی توبہ قبول کر لی اور قتل ہو جانے والوں قتل کو ان کے لئے شہادت قرار دی۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو ستر لوگ موسیٰؑ کے ہمراہ طور پر تھے انھوں نے بچھڑے کی پرستش کرنے والے ستر ہزار لوگوں کو قتل کیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ دو صفوں میں کھڑے ہو گئے اور بعض نے بعض کو نیزے مارے یہاں تک کہ ستر ہزار قتل کر دیے گئے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان پر شدید تاریکی چھا گئی اور بعض نے بعض کو قتل کرنا شروع کر دیا جب تاریکی چھٹ گئی تو ستر ہزار لوگ قتل ہو چکے تھے۔

روایت کی گئی ہے کہ جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ کھڑے ہو کر اللہ سے دعا اور اس کے حضور تضرع و زاری کر رہے تھے اور وہ (سب) ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ قتل کی برطرفی کی وحی نازل ہوئی اور باقی لوگوں کی توبہ قبول ہو گئی۔

ابن جریح نے بیان کیا ہے: ان کے قتل کیے جانے کا سبب جب کہ خداوند عالم ان میں سے بچھڑے کی پرستش نہ کرنے والوں کے متعلق جانتا تھا یہ ہے کہ وہ اپنے قتل کے خوف سے انھیں اس فعل سے نہیں روکتے تھے جبکہ وہ جانتے تھے بچھڑے (کی پرستش) باطل ہے۔

اسی سبب خداوند عالم نے انھیں بعض کو بعض کے قتل کرنے کی آزمائش میں مبتلا کیا اور عظیم معجزات اور آیات کے بعد ان کے کفر کے سبب اللہ نے انھیں اس سخت آزمائش میں مبتلا کیا۔

رمانی نے کہا ہے: قتل کا حکم دیئے جانے میں ان کے لئے اور دوسروں کے لئے ضروری لطف تھا جس طرح قاتل کے اِستِسلام (قبول اسلام) میں اس کے لئے اور دوسروں کے لیے لطف ہو سکتا ہے اور ان پر کوئی تکلیف نہ ہو قتل کے بعد۔ گذشتہ پر لطف نہیں ہوتا نہ ہی اس کے مقارن (متصل) پر ہوتا ہے۔

جواب اس طرح ہے: جب قوم کو حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں تو ان میں سے ہر ایک کا ارادہ دوسرے کو قتل کرنے کا ہو گا ممکن ہے اس کے بعد ایک بچ جائے پس اس طرح یہ اس کے لیے لطف ہو گا جو بچ جائے گا چاہے وہ اتنے ہی وقت کے لیے ہو جس میں وہ واجب انجام دے سکے اور خود کو قبیح سے روک سکے جیسا

کہ آپ ہماری عبادتوں میں مشرکین سے قتال (وجہاد) کے متعلق کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں پابند بنایا ہے کہ ہم ان سے قتال کریں یہاں تک کہ ہم انھیں قتل کردیں یا خود قتل کردیے جائیں۔

اسی طرح سیرت نگاروں نے کہا ہے: جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی انھیں پابند (مکلف) بنایا گیا تھا کہ وہ قتل پر صبر کریں یہاں تک کہ بعض بعض کو قتل کردیں، قتل ہوجانے والے کے لیے شہادت ہے اور باقی ماندہ کے لیے توبہ ہے۔ یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے اگر انھیں خود کو اپنے ہاتھوں قتل کیے جانے کا حکم دیا جائے اگر یہ صحیح ہے تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی طرح زخمی کرلیں جو ان کی موت کا باعث بن جائے، اگر اس طرح اس کی عقل زائل نہ ہو۔ البتہ دوسرے قول کی بنا پر انھیں قتل کے لیے تسلیم ہونے اور اس پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا کوئی مسئلہ نہیں ہے اس لیے انھیں جو خود کو قتل کیے جانے کا حکم دیا گیا اس طرح ان کا قتال حسن (بہتر) ہوگا اس لیے کہ اگر یہ فعل قبیح ہوتا تو اس کو قبول کرنے کا حکم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ نبی یا امام کے لیے خود کو قتل کے لیے تسلیم خود سپرد کردینا جائز نہیں ہے جب وہ اپنے دفاع کی قدرت وطاقت رکھتے ہوں اور اپنا دفاع نہ کریں اس لیے کہ اس میں دفاع کی قدرت کے باوجود قبیح کے لیے خود سپردگی ہے لہٰذا جائز نہیں ہے، اس طرح انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کا قتل دفاع کے امکان برطرف ہونے پر واقع ہوتا ہے مگر یہ کہ اس بارے میں دفاع اور تحمل مشقت پر صبر کرنے میں ممانعت نہیں ہے اور دوسروں کو قتل کرنا ظلم ہے۔ اگرچہ قتل کا حکم دینا عقل کے اعتبار سے قبیح (برا) ہے اور اس کا تبدیل وتغیر ہونا جائز ہے کہ وہ (فعل) حَسَن ہوجائے، یہ تمام آلام و تکالیف میں جاری ہے لیکن جہل اور کذب میں جاری نہیں ہے کہ وہ ہرگز حسن (اچھا) نہیں ہوسکتا اور قتل میں وجہ حسن ہونا کہ وہ لطف ہے جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی جانب سے ممکن ہے کہ وہ زندہ کو مار دے ، اسی طرح اس کے لیے ہمیں (دوسروں) کو مارنے کا حکم دینا اور ان پر پیش آنے والے تکالیف کا عوض و بدلہ دینا ممکن ہے، اس میں لطف ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

اس ارشاد: ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ،(اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے) یہ قتل کے ساتھ توبہ کی جانب اشارہ ہے جیسا کہ خدا نے حکم دیا ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، ارشاد فَتُوْبُوْا توبہ پر دلالت ہے جو مذکور ہے۔

فَاقْتُلُوْٓا، قتل پر دلالت کر رہا ہے توبہ اور قتل نفس اللہ کی رضا سے ہے جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اگرچہ اس میں عظیم مشقت ہے تمھارے لیے تمھارے خالق کی طرف سے خیر ہے تمھاری دنیاوی زندگی میں اس لیے

کہ دنیاوی زندگی کو بقا نہیں بلکہ فنا ہونے والی ہے اور تم زندگی کے بعد شدید عذاب میں مبتلا ہو گے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو حکم خدا کے مطابق قتل کیا تو جلد ہی قتل کی مشقت ختم ہو جائے گی اور تم دائمی نعمتوں میں رہو گے جو فنا ہونے والی نہیں۔ "بَارِئِكُمْ" کا ذکر اس کی عظمت کے پیش نظر مکرر ہوا ہے اس کے سبب جو انہیں عطا کیا گیا ہے کہ وہ ان تمام کا خالق ہے۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ. یہاں پر اضمار (وپوشیدہ) ہے جس کی تقدیر ہے تم نے وہ کیا جس کا حکم دیا گیا تھا، تو تمھاری توبہ قبول ہوئی یا تم نے اپنے نفسوں کو قتل کیا اس لئے تمھاری توبہ قبول کر لی گئی۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ. یعنی اپنے بندوں کی بار بار توبہ قبول کرنے والا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ گناہان کبیرہ پر توبہ کا قبول کرنے والا ہے۔

الرَّحِيْمُ جب تم توبہ کرو گے تو وہ تم پر رحم کرے گا اور جنت میں داخل فرمائے گا۔ اس آیت میں دلالت ہے کہ ندامت کے علاوہ کوئی ایسی بھی شرط ہے جس کے بغیر توبہ درست نہیں ہے جیسا کہ قتل کے متعلق حکم دیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾
اور یاد کرو وہ وقت جب تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم تمھاری بات کا یقین نہ کریں گے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ تو تمھارے دیکھتے ہی دیکھتے بجلی نے تم کو آلیا۔

الفاظ ومعانی:

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ. یعنی ہم آپ کی تصدیق نہیں کریں گے۔ آمَنَ بِهٖ وَ آمَنَ لَهٗ دونوں بولا جاتا ہے اللہ کے اس ارشاد کی دلالت کی بنیاد پر: قَالَ فِرْعَوْنُ آمَنْتُمْ بِهٖ۔

رُؤْيَةٌ کے معنی بصارت کے ذریعہ ادراک کرنا ہے۔ پھر یہ لفظ علم کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

جَهْر، عَلَامَة، مُعَايَنَة باہم مشابہ ہیں۔

کَلَامٌ جَهِيْرٌ وَّ صَوْتٌ جَهِيْرٌ (یعنی بلند کلام اور بلند آواز) جَھْر کی ضد سِرّ ہے۔

صَاعِقَةٌ کے تین اقسام ہیں:

۱۔ آسمان سے بجلی گرنا جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ (سورۂ رعد، آیت ۱۳) (وہ بجلیاں بھیجتا ہے اور جس پر چاہتا ہے انھیں گرا دیتا ہے)

۲۔ موت جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ (سورۂ زمر، آیت ۶۹) (تو آسمان کے تمام ساکنین غش کھا کر موت کی آغوش میں چلے جائیں گے) یا فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ (سورۂ بقرہ، آیت ۵۵) (پس تمھیں موت نے آلیا)

۳۔ عذاب جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (سورۂ فصلت، آیت ۱۳؛ میں تم کو ایسے اچانک آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا)

ترکیب:

حَتّٰى نَرَى لفظ حَتّٰى اِلٰى کے معنیٰ میں ہے اور اسم کو جر دینے والا ہے۔ نَرٰى حَتّٰى کے بعد منصوب ہے اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جس طرح لام کے بعد اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر فعل منصوب ہوتا ہے۔ اَنْ فعل کے ساتھ تاویل مصدر میں چلا جاتا ہے اور حَتّٰى کی وجہ سے محلاً مجرور ہو جاتا ہے۔ جار و مجرور محلاً منصوب ہیں اس لئے کہ لَنْ نُّؤْمِنَ کا مفعول ہیں اور جَهْرَةً مصدر ہے جسے حال کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے۔

تفسیر:

عجیب و غریب مطالبہ

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ (یاد کرو جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ!) یعنی ہم ہرگز آپ کی باتوں کی تصدیق نہیں کریں گے کہ آپ پیغمبر ہیں۔ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (جب تک کہ ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں) اور وہ ہمیں بتا دے کہ آپ نبی ہیں جنہیں مبعوث کیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ہم سے جو صفات باری عز اسمہ بتا رہے ہیں ہم ہرگز اس کی تصدیق نہیں کریں گے کہ کون سی بات اس کے لئے ممکن ہے اور کون سی ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اللہ کو اپنی

آنکھوں سے نہ دیکھ لیں یعنی علانیہ اور ظاہر بہ ظاہر آپ ہمیں اس بارے میں باخبر کیجئے۔

بیان کیا گیا ہے: جب جناب موسیٰ الواح (تختیاں) لیکر آئے جن پر توراۃ مرقوم تھی، تو لوگ کہنے لگے ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے جب تک ہم اسے عینی طور پر نہ دیکھ لیں۔

بعض نے کہا ہے: اس کا ارشاد: جَهْرَةً موسیٰ سے ان کے خطاب کی صفت ہے جس کے ذریعہ انھوں نے اسے ظاہر کیا اور اس کا اعلان کیا جس کی تقدیر ہے: اگر تم ظاہر بظاہر کہو گے ہم ہرگز آپ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ خدا کو دیکھ لیں۔ قول اول زیادہ قوی ہے۔

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ (تمہیں بجلی نے آلیا) یعنی موت آگئی، وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، درآنحالیکہ تم موت کو دیکھ رہے تھے اور کہا گیا ہے کہ تم آتش جہنم کو دیکھ رہے تھے۔

خداوند عالم نے یہودیوں کو ان کے بزرگوں کے سوال رؤیت کے سبب اس اعتبار سے کہ انھوں نے پیغمبر کی مخالفت میں انھیں کا راستہ اختیار کیا تھا حالانکہ ان پر انبیاء کرام کا اتباع واجب تھا اور ہر اس چیز کی تصدیق لازمی تھی جو موسیٰ کو عطا کی گئی تھی مگر ان یہودیوں نے اپنے بزرگوں کی عادت کو جاری رکھا جو کبھی تو اپنے پیغمبر سے مطالبہ کرتے کہ وہ ان کے لیے اللہ کے علاوہ الٰہ بنا دیں، کبھی اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کی پرستش کرتے، کبھی کہتے کہ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خداوند عالم کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔

ابوالقاسم بلخی نے اس آیت سے خدا کی رؤیت کے محال ہونے پر دلیل پیش کی ہے، ان کا کہنا ہے: فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً. (سورۂ نساء، آیت ۱۵۳) (تو انھوں نے موسیٰ سے اس سے زیادہ سنگین مطالبہ کیا تھا کہ انھوں نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہمیں خدا کو علانیہ طور سے دکھلا دیں) یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ اس سے دونوں باتوں کا انکار مراد ہے۔ اسی طرح یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ جناب موسیٰ کا یہ کہنا کہ: رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (سورۂ اعراف، ۱۴۳) (میرے پروردگار تو مجھے اپنا جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار کروں) اپنی قوم کی خاطر تھا اس لیے کہ اہل توراۃ کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جناب موسیٰ نے فقط ایک ہی مرتبہ رؤیت خدا کا مطالبہ کیا تھا وہ بھی اپنی قوم کی خاطر تھا۔

❀❀❀❀❀

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کیا کہ شاید تم شکر گذار بن جاؤ۔

الفاظ ومعانی:

بَعۡث کے معنی کسی چیز کا اس کی جگہ سے اٹھانا ہے، اسی وجہ سے روز قیامت کو یوم بعث کہا جاتا ہے چونکہ اس دن لوگوں کو حساب کے لئے ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ وَبَعَثۡتُهٗ مِنۡ نَوۡمِهٖ میں نے اسے نیند سے اٹھایا یعنی بیدار کیا تو وہ بیدار ہو گیا۔ بعث کے حقیقی معنیٰ ارسال یعنی بھیجنے کے ہیں۔

تفسیر:

پھر زندہ کر دیا

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ پھر ہم نے تمھیں زندہ کیا، مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ. (تمھاری موت کے بعد) تمھاری مدت حیات کی تکمیل کے لیے۔ یہ حسن اور قتادہ سے کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: انھوں نے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد دعا کی کہ پیغمبروں کو مبعوث کیا جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ یہ سُدی کا قول ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تمھارے پاس انبیاءؑ بھیجے۔ چند کے علاوہ تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ نے جناب موسیٰؑ کو موت نہیں دی تھی جس طرح ان کی قوم کو موت دی تھی بلکہ ان پر غشی طاری ہو گئی تھی جس پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کر رہا ہے: فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۴۳) (جب انھیں افاقہ ہوا تو کہا: پروردگار تو پاک ہے میں تیری جناب توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں) افاقہ غشی کے بعد ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ، تاکہ تم اللہ کا شکر اس نعمت پر ادا کرو کہ تمھاری زندگی تمھیں واپس پلٹا دی۔ آیت میں پیغمبر اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ پر اثبات اور ان مشرکین عرب کے خلاف احتجاج ہے جو دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ انھیں ان کے واقعات کے ذریعہ یاد دہانی کرائی جا رہی ہے جنھیں خداوند عالم نے دنیا میں دوبارہ بھیجا، اس کی موافقت وہ یہود و نصاریٰ بھی کرتے

ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف تھے۔ ضروری ہے کہ وہ قوم کہ جسے خداوند عالم موت دے دے پھر زندہ کرے تو وہ معرفت خدا پر مجبور و ناچار ہو جس طرح ہم میں سے کوئی آج موت کے وقت اس کی معرفت پر مجبور ہوتا ہے اس دلیل کے ذریعہ کہ خداوند عالم نے انھیں اس دار تکلیف (دنیا) میں فرائض کی ادائیگی اور معرفت کے لیے پلٹا دیا ہے یہ بات ضروری ہوگی بلکہ حاصل شدہ ہوگی البتہ ان کی موت نیند جیسی تھی۔ خداوند عالم نے ان کی روح کو ان کے احوال آخرت کا مشاہدہ کیے بغیر قبض کر لیا تھا اس لیے کہ موت کے بعد زندگی دینے کے علم پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ اس لیے کہ موت کے بعد کی زندگی نہیں ہے مگر ایسی ہی جیسے نیند کے بعد بیدار ہونا اور بے ہوشی کے بعد افاقہ حالانکہ یہ اضطراری علم کا سبب نہیں ہے۔

رجعت کی دلیل

ہمارے علماء نے اس آیت کے ذریعہ رجعت کے ممکن ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔ قائل کا یہ قول باطل ہے کہ رجعت زمانہ پیغمبرؐ کے علاوہ میں ممکن نہیں ہے تا کہ وہ حضورؐ کا معجزہ اور آپؐ کی نبوت پر دلیل ہو بلکہ ہمارے نزدیک اور اکثر امت (مسلمہ) کے نزدیک ائمہ علیہم السلام اور اولیاء کے ذریعہ معجزات کا ظہور ممکن ہے۔ کتب کلام میں اس پر ادلہ موجود ہیں۔

ابوالقاسم بلخی کا کہنا ہے: اعلان کے ساتھ رجعت جائز نہیں ہے اس لیے کہ اس کے ذریعہ دوسری مرتبہ میں توبہ پر بھروسہ کرنے پر فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رجعت کا قائل اس کی نظریہ یہ نہیں کہ تمام لوگ رجعت میں پلٹیں گے کہ توبہ پر اعتماد کرتے ہوئے فریب میں مبتلا کرنا لازم آئے بلکہ کوئی بھی مکلفین میں سے کوئی بھی نہیں ہے مگر یہ وہ ممکن سمجھتا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے گا اور یہ بات از باب زجر و توبیخ ممکن ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۵۷﴾

اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر منّ و سلویٰ نازل کیا اور تم سے کہا: جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں ان میں سے کھاؤ۔ تمھارے اسلاف نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ وہ درحقیقت خود اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے تھے۔

الفاظ و معانی:

ظِلَّة، غَمَامَة، سِتْرَة باہم مشابہ ہیں۔ ظِلّ (یعنی سایہ) کی ضد ضحیٰ (یعنی جس وقت آفتاب خوب چڑھا ہوا ہو) ہے۔ ظِلُّ الشَّجَرَة درخت کا سایہ یعنی اس کا پوشیدہ کر دینا، چھپا دینا۔ وَلَا اَزَالَ اللّٰهُ عَنَّا ظِلَّ فُلَانٍ۔ اللہ فلاں کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔ وَيُقَالُ لِسَوَادِ اللَّيْلِ ظِلٌّ رات کی تاریکی کو ظِلّ کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اشیاء کو چھپا دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (سورۂ فرقان، آیت ۴۵) (آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ آپ کے پروردگار نے سایہ کو کیسے پھیلایا ہے) غَمَامَة کے معنی ابر کے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ غَمَام اس بادل کو کہتے ہیں جو سفید ہو، اس میں پانی نہ ہو اور غُمَّة دل کے اوپر غم کے سبب جو پردہ ہوتا ہے، اسے کہتے ہیں۔

مَنّ کے معنی احسان کے ہیں۔ مِنَّة اسم ہے۔ خداوند عالم ہم پر احسان کرنے والا ہے اور ہم پر دائمی رحم کرنے والا ہے۔ مُنَّة کے معنی قوت قلب کے ہیں، حقیقی معنی نیکی کرنے کے ہیں۔ بنی اسرائیل پر جو مَن نازل ہوتا تھا وہ اللہ نے ان پر احسان فرمایا تھا۔

سَلْویٰ بٹیر کے مانند پرندہ تھا۔ اخفش نے بیان کیا ہے: یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے ہے۔ خلیل نے کہا ہے: سلویٰ کا واحد سلواۃ ہے۔

ترکیب:

كُلُوا محلاً منصوب ہے فعل محذوف کی بنا پر گویا اس طرح فرمایا ہے کہ وَقُلْنَا لَهُمْ كُلُوا، اَلسَّلْوٰى

منصوب ہے اس لئے کہ اَلْمَنَّ پر عطف ہے۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا: یہ بھی اپنے ماقبل سے متصل ہے کہ محذوف کو فرض کیا گیا ہے گویا اس طرح فرمایا:
فَخَالَفُوْا مَا اُمِرُوْا بِہٖ وَ کَفَرُوْا ھٰذِہِ النِّعْمَۃَ وَمَا ظَلَمُوْنَا ۔ (انہوں نے جو کچھ حکم دیا گیا تھا اس کی مخالفت کی، اس نعمت کی ناشکری کی اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا۔

تفسیر:

مختلف نعمتیں

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ. ہم نے تمہارے لیے ابر کو سائبان اور پردہ بنا دیا جو تمھیں آفتاب کی گرمی سے محفوظ رکھتا ہے ۔ یہ قول مفسرین کی ایک جماعت کی جانب سے ہے۔ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ (اور ہم نے تم پر مَنّ کو نازل کیا) اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: من وہ ہے جسے لوگ جانتے ہیں۔

دوم: گوند کے مانند ہوتا ہے جو درخت پر آ کر گرتا ہے اس کا ذائقہ شہد کی مانند ہوتا ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

سوم: چوڑی پتلی روٹی مراد ہے۔ یہ وہب کا قول ہے۔

چہارم: ایسی تمام نعمتیں جن کے ذریعہ اللہ نے بندوں پر احسان فرمایا ہے جس میں نہ کوئی زحمت ہو نہ کوئی پریشانی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِّلْعَيْنِ۔ سانپ کی چھتری کا تعلق من سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے۔ وَالسَّلْوٰی کہا گیا ہے: سلویٰ بٹیر کے مانند سفید رنگ کا ایک پرندہ ہے، یہ ابن عباس کا قول ہے۔

ارشاد الٰہی: كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں ان میں سے کھاؤ) اس کے معنی ہیں کہ ہم نے ان سے کہا: لذیذ چیزیں کھاؤ۔ بیان کیا گیا ہے کہ مباح و حلال چیزیں کھاؤ۔ بیان کیا گیا ہے کہ مباح وہ ہے جس کا کھانا لذیذ ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْ رَزَقْنَاكُمْ جو ہم نے تمھیں رزق دیا ہے یعنی عطا کیا ہے اور اسے تمہارے لیے روزی قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَا ظَلَمُوْنَا (انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا) یعنی انھوں نے کفران نعمت کیا تو ہم نے ان کے کفران نعمت کے سبب ان کی نعمتوں میں کمی نہیں کی۔

وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ۔ (بلکہ وہ درحقیقت خود اپنے اوپر ظلم ڈھارہے تھے) بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ آیت اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ کسی کی اطاعت اللہ کو فائدہ نہیں پہنچاتی نہ ہی کسی کی نافرمانی خدا کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اطاعت کی منفعت اور فائدہ مطیع وفرماں بردار کی طرف پلٹتا ہے اور معصیت ونافرمانی کا نقصان بھی گنہگار کی جانب ہی پلٹتا ہے۔

واقعہ

بنی اسرائیل پر من وسلویٰ کے نزول کا سبب یہ تھا کہ جب خداوند عالم نے انھیں ایسی وادی میں مبتلا کیا تھا جس میں چلنے والا بھٹک جائے، انھوں نے جناب موسیٰؑ سے کہا تھا: آپؑ اور آپؑ کا پروردگار قتال کرنے کے لیے جایئے ہم تو اسی جگہ بیٹھے ہیں۔ (یہ بات انھوں نے اس وقت کہی تھی) جب انھیں بیت المقدس جاکر عمالقہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا تھا کہ یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ... (سورۂ مائدہ، آیت ۲۱) (اے میری قوم والو! تم اس مقدس سرزمین میں داخل ہوجاؤ)

وہ لوگ ایسے صحرا میں پھنس گئے (جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے) وہ جس قدر چلتے (مثلاً) صبح کے وقت پانچ چھ فرسخ سفر کرتے لیکن شام ہوتی تو اسی مقام پر ہوتے جہاں سے چلے تھے۔ اسی طرح ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک مدت گزر گئی اور وہ چالیس برس تک اسی وادی میں رہے۔ اسی صحرا میں جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ کا انتقال ہوا۔ پھر جناب یوشعؑ بن نون آتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خداوند عالم ان لوگوں کو زمین کے جس حصہ تک پہونچتے پھر اسی مقام تک پلٹا دیتا جس مقام سے وہ چلے تھے۔ اس طرح وہ راستہ بھٹک جاتے تھے۔ چونکہ وہ عظیم مخلوق تھے لہٰذا ممکن نہیں ہے کہ سب کے سب اتنی طولانی مدت میں زمین کے اتنے سے حصہ میں راستہ بھٹک جائیں جب انھوں نے اس صحرا میں راستہ پالیا اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے اور آفتاب کی حرارت کا شکوہ کیا تو خداوند عالم نے ان پر ابر کا سایہ کیا اور ان پر ''من وسلویٰ'' نازل کیا۔

طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک ان پر ''من'' نازل ہوتا اور وہ اس میں سے اتنا لے لیتے جو اس روز کے لیے کافی ہوتا تھا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل پر فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک ''من'' نازل ہوتا جو اس وقت سو رہا ہوتا اس کا حصہ نازل نہیں ہوتا۔ اسی سبب سے اس وقت سے طلوع آفتاب تک سونا مکروہ ہے۔ ابن جریر نے کہا ہے: ان میں سے جب کوئی شخص ایک روز سے زیادہ کا مَن و

سلویٰ لے لیتا تو وہ خراب ہوجاتا تھا سوائے روز جمعہ کے، جب وہ جمعہ کے روز دو دن کا کھانا لیتا تو خراب نہیں ہوتا تھا۔ اس دن وہ جمعہ اور ہفتہ کے دن کا کھانا لے لیتے تھے چونکہ روز ہفتہ نازل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے روٹی کے مانند ٹکیا کی طرح بنا لیتے جو ان کے لیے شہد اور گھی میں (مخلوط) ذائقہ کی طرح ہوتا۔ خداوند عالم دن میں ان کے لیے ابر بھیجتا جو انھیں آفتاب کی حرارت سے محفوظ رکھتا اور شب میں ان پر آسمان سے نورانی ستون نازل ہوتا جو ان کے لیے چراغ کی جگہ روشنی عطا کرتا۔ جب ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا اس پر اس کے قد کے برابر جلد کی طرح کپڑا ہوتا تھا۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾

اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ تم اس بستی میں داخل ہوجاؤ اور اس میں جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ پیو۔ اور بستی کے دروازہ سے سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہوجاؤ اور حطہ کہتے ہوئے (آنا)، ہم تمھاری خطاؤں کو معاف کردیں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔

قرائت:

ابوجعفر اور نافع نے یُغۡفَرۡ یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے نَغۡفِرۡ لَكُمۡ نون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی مختار و منتخب ہے اس لئے کہ وہ گذشتہ ارشاد الٰہی: ظَلَّلۡنَا اور اَنۡزَلۡنَا کے زیادہ مشابہ ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر قراء نے یہی پڑھا ہے۔

قراء کا اس بات پر اجماع ہے کہ لام کے ساتھ راء کا اظہار کرنا ضروری ہے مگر یہ ابوعمرو سے روایت کی گئی ہے اور یزیدی کی روایت میں ہے کہ راء کو لام میں ادغام کرنا زیادہ بہتر ہے۔

قراء کا یہاں پر خَطٰيٰكُمۡ ہونے پر اجماع ہے اگرچہ انہوں نے سورۂ اعراف اور سورۂ نوح میں اس سلسلہ میں اختلاف کیا ہے کہ بعض قراء نے وہاں پر خَطِيۡٓـٰٔتِهِمۡ بھی پڑھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ

اعراف اور سورۂ نوح میں مصحف میں بغیر الف کے لکھا ہوا ہے اور یہاں پر الف کے ساتھ لکھا ہے۔

الفاظ و معانی:

دُخُول، وُلُوج، اِقْتِحَام باعتبار معنی باہم مشابہ ہیں۔ البتہ دُخُول اور اِقْتِحَام میں فرق ہے۔ اقتحام کے معنی دشواری کے ساتھ داخل ہونا ہے۔

قَرْيَة، بَلَد، مَدِيْنَة معنی کے اعتبار سے مشابہ ہیں۔ خلیل نے بیان کیا ہے: قَرْيَة اور قِرْيَة دو لغتیں ہیں۔ قُرٰی ہر چیز کا اوپری حصہ ہے جس کی جمع اَقْرَاء ہے۔

سُجُود کے معنی با قاعدہ طور پر جھکنے کے ہیں۔

حِطَّة مصدر ہے مانند رِدَّة و جِدَّة۔ حنبل نے کہا: حط کے معنی جانور سے بوجھ اتارنے کے ہیں۔ وَضْع اور خَفْض معنی کے اعتبار سے مشابہ ہیں، حطّ بلندی سے نیچے اترنا ہے۔

غُفْرَان، عَفْو، صَفْح معنی کے اعتبار سے مشابہ ہیں۔ غَفَرَ اللهُ لَهٗ غُفْرَانًا یعنی اللہ نے اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کی۔ مَغْفُوْر و مِغْفَار گوند ہے اَغْفَر درخت ہے۔ اس بارے میں یہ حدیث ہے کہ جب پیغمبر حضرت عائشہ کے یہاں آئے تو انھوں نے کہا: اللہ کے رسول آپ نے مَغَافِیْر کھایا ہے، یعنی اس کا گوند کھایا ہے۔

سَتْر اور مَغْفِرَة کے معنی عذاب برطرف کر کے خطاؤں اور گناہوں کی پردہ پوشی کرنا ہے۔

خَطِيْئَة و زِلَّة و مَعْصِيَة مشابہ ہیں۔ اگر ارادہ کے بغیر غلطی سرزد ہو تو خَطَا کہیں گے اور ارادہ کے ساتھ ہو تو اَخْطَا کہا جائے گا۔ پہلا خَاطِئ ہے دوسرا مُخْطِئ ہے۔ خَطِيَّة کی جمع خَطِيَّات ہے اسی طرح خَطِيْئَة کی جمع خَطَايَا ہے۔

مُحْسِن نیکی کرنے والا یا فَاعِلِ حسن ہے یا احسان ہے: اَحْسَنَ اِلٰی غَیْرِہٖ اور اَحْسَنَ فِیْ فِعْلِه کہا جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان فرق ہے اَحْسَنَ اِلَیْهِ فقط نفع کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ فلسفہ کی رو سے حسن وہ فعل جس کی دعوت عقل دیتی ہے اس کی ضد قَبِيْح ہے یعنی یہ وہ فعل کہ جس سے عقل روکتی ہے۔ احسان کے معنی نفع کے ہیں۔ اِسَاءَة کے معنی قبیح ضرر و نقصان کے ہیں۔ یہ معنی اس شخص کے نظریہ کے مطابق صحیح ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ انسان اپنے ساتھ نیکی کرتا ہے اور اپنے ساتھ برا کرتا ہے لیکن جو اس

نظریہ کا قائل نہیں ہے وہ قصد و ارادہ کے ساتھ دوسرے تک نقصان کے پہنچنے کا اضافہ کرتا ہے لہٰذا حسن کی تعریف میں یہ کہنا بہتر ہے کہ حسن وہ فعل ہے کہ جب اسے جاننے والا کماحقہ انجام دے تو قابل مذمت نہیں ہوگا۔

ترکیب:

حَیۡثُ ظرف مکان مبنی برضمہ ہے اس کے مبنی ہونے کے متعلق پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ حَیۡثُ کے بعد والا جملہ، مضاف الیہ ہے۔

اس سلسلہ میں جو سوال کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ حَیۡثُ کیونکر مبنی برضمہ ہے حالانکہ وہ مضاف ہے جملہ کی جانب اس لئے کہ وہ مشابہ قرار دیا گیا ہے اس چیز کے جس کے مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا ہے اور وہ قَبۡل وبَعۡد ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حَیۡثُ جملہ کی طرف مضاف ہونے کے باوجود قبل و بعد سے مشابہ ہونے سے محروم نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنی شباہت پر باقی رہتا ہے اس لئے کہ اسے مفرد کی جانب مضاف ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ یہ جواب اس شخص کے قول کے مطابق ہے جو حَیۡثُ کے مبنی برضمہ ہونے کا قائل ہے لیکن جو شخص ضمہ کے علاوہ کسی اور حرکت پر مبنی ہونے کا قائل تو اس سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا اور قرآن میں تو صرف ضمہ ہی صحیح ہے۔

حِطَّۃٌ: حکایت کی بنا پر مرفوع ہے۔ زجاج نے کہا کہ گویا اس طرح ہے: مَسۡأَلَتُنَا حِطَّۃٌ یعنی ہماری دعا ہے کہ ہمارے گناہوں کو ہم سے گرا دے۔

کہا گیا ہے کہ اس طرح ہے: دُخُوۡلُنَا الۡبَابَ سُجَّداً حِطَّۃٌ لِذُنُوۡبِنَا ۔ (سجدہ کرتے ہوئے ہمارا دروازہ میں داخل ہونا ہمارے گناہوں کے جھڑنے کا باعث ہے)

اگر حِطَّۃً کو منصوب پڑھنا جائز ہوتا ہے تو عربی میں اس کی یہ صورت ہوتی کہ حُطَّ عَنَّا ذُنُوۡبَنَا حِطَّۃً۔ ہمارے گناہوں کو ہم سے اس طرح جھاڑ دے جو جھاڑنے کا حق ہے (یعنی حِطَّۃً مفعول مطلق ہوتا) جیسا کہ کہا جاتا ہے: سَمۡعاً وَّ طَاعَۃً یعنی اَسۡمَعُ سَمۡعًا وَّ اُطِیۡعُ طَاعَۃً۔ مَعَاذَ اللّٰہِ یعنی نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مَعَاذًا۔

نَغۡفِرۡ لَکُمۡ مجزوم ہے اس لئے کہ وہ امر کا جواب ہے اور شرط کی بنیاد پر مجزوم ہے۔ مراد یہ ہے کہ اِنۡ

تَقُوْلُوْا نَغْفِرْ لَكُمْ :(اگرتم نے یہ کہا تو ہم تمہیں بخش دیں گے) یہاں پر شرط کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ جزاء اس پر دلالت کر رہی ہے۔ کلام میں امر واقع ہوا ہے اور اس کے ذریعہ کلام طولانی ہو گیا ہے اور شرط کا حذف کرنا بہتر ہے اس لئے کہ وہ اس کے بعد واقع ہونے کی بنا پر پے در پے واقع ہونے والے کے مانند بن گیا ہے اس طرح سے کہ دونوں اس بات پر جمع ہو گئے ہیں کہ دونوں غیر موجب (منفی) اور غیر خبر (انشاء) ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے کہ جیسے مبتدا کو حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ خبر اس پر دلالت کرتی ہے۔ کبھی کبھی جزاء کو بھی حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ شرط اس پر دلات کرتی ہے جیسے عربوں کا یہ کہنا ہے کہ اَنْتَ ظَالِمٌ اِنْ فَعَلْتَ. اسی طرح مبتدا کی خبر کو بھی حذف کر دیا جاتا ہے کہ مبتدا اس پر دلالت کرتا ہے۔

سیبویہ نے کہا: خَطَايَا کی اصل خَطَائِيْ ہے جیسے خَطَائِع ، یاء کو ہمزہ سے بدل دیا گیا ہے پس خَطَاءِء ہو گیا جیسے خَطَاعِع دو ہمزہ جمع ہو گئے تو ہمزہ دوم کو یاء سے بدل دیا گیا ہے خَطَائِيْ ہو گیا جیسے خَطَاعِيْ پھر یاء اور کسرہ کو الف سے اور فتحہ سے بدل دیا گیا ہے اور خَطَاءَا کہا گیا ہے خَطَاعَا کے مانند جیسا کہ مُدَارِيْ کے ساتھ کیا گیا ہے اور مُدَارَىٰ کہا گیا۔ پھر دو الف کے درمیان ہمزہ سنگین لگنے لگا اس لئے کہ ہمزہ الف کے مجانس ہے گویا تین الف جمع ہو گئے پس ہمزہ کو یاء سے بدل دیا گیا ہے اور خَطَايَا ہو گیا۔

خلیل نے کہا: خَطَايَا دراصل فَعَايِل کے وزن پر تھا، اسے فَعَالَىٰ کے وزن پر کر دیا گیا ہے پھر اس میں قلب کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے قول میں بیان کیا گیا۔ یہ اعلان اس لئے کیا گیا ہے کہ ہمزہ کہ جس کے بعد الف ہوتا ہے وہ ہمزہ عارضی ہوتا ہے، اصلی نہیں ہوتا ہے۔ آپ مِرْآةٌ کی جمع مَرَائِيْ بناتے ہیں اور عدل نہیں کرتے اس لئے کہ اس لئے کہ ہمزہ عین الفعل ہے۔

تفسیر:

بنی اسرائیل کی سخت ہٹ دھرمی

تمام مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اس مقام پر قریہ سے بیت المقدس مراد ہے۔ اس کی تائید اُس کا یہ ارشاد کر رہا ہے: اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ. ابن زید نے کہا ہے: بیت المقدس سے نزدیک قریہ اریحا مراد ہے جس میں قوم عاد اور عمالقہ کے بقایا موجود تھے۔ جن کا سردار عوج ابن عنق تھا۔ وہ ارشاد فرماتا ہے: وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ، (جب ہم نے کہا: اُس قریہ میں

داخل ہو جاؤ) یعنی جہاں سے چاہو، رَغَدًا، من وسلویٰ کے بعد تم پر وسعت و کشائش ہے قریہ کے کھانے سے جس طرح چاہو استفادہ کرو۔

بیان کیا گیا ہے: ان کے لیے یہ اباحت اس کے غنائم سے ہے جسکے اموال کا انھیں ان پر نعمت تمام کرنے کے لیے مالک بنا دیا گیا۔

وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ، (داخل ہو جاؤ دروازہ سے) یعنی اس دروازہ سے داخل ہو جاؤ جس سے داخل ہونے کا تمھیں حکم دیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے: یہ بیت المقدس کا باب حطہ ہے جو آٹھواں دروازہ ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

کہا گیا ہے کہ بَابُ الْقُبَّۃ مراد ہے جس کی طرف رخ کر کے جناب موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نماز پڑھتے تھے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ باب قریہ ہے جس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ ابوعلی الجبائی نے کہا ہے کہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ باب الحطہ سے مراد، باب القبہ ہے تو یہ آیت ان کے اس نظریے پر زیادہ دلالت کرتی ہے، ان لوگوں کے قول کے مقابلہ میں جو یہ کہتے ہیں کہ باب القریہ مراد ہے، اس لیے کہ بنی اسرائیل موسیٰؑ کی زندگی میں قریہ میں داخل نہیں ہوئے تھے اور آیت کا آخری حصہ اس امر پر دلالت کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل اس دروازہ سے داخل ہوتے تھے جو اس کے علاوہ تھا۔ جناب موسیٰؑ کے زمانہ کا واقعہ نہیں تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ. کے ذریعہ عطف کرنا جو تاخیر کے علاوہ استعمال ہوتا ہے اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل کی جانب سے یہ تبدیلی امر کے سبب تھی جو اس بات پر دلیل ہے کہ یہ تبدیلی جناب موسیٰؑ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔

ارشاد الٰہی: سُجَّدًا، بیان کیا گیا ہے کہ رکوع کی حالت مراد ہے جو با قاعدہ جھکنے کی حالت و کیفیت ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے: خاضعین اور متواضعین (یعنی خاضع اور انکساری کی حالت) میں داخل ہو۔

بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی ہیں دروازہ میں داخل ہو جاؤ جب تم داخل ہو تو اللہ کا سجدہ کرو اور شکر بجالاؤ۔ یہ وہب کا قول ہے۔

اس کا ارشاد: حِطَّةٌ، حسن اور قتادہ اور اکثر علماء نے اس کے معنی اس طرح بیان کئے ہیں: حِطَّ عَنَّا ذُنُوۡبَنَا (یعنی ہم سے ہمارے گناہ برطرف کر دے) یہ استغفار کے مانند ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے: انھیں

حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس امر کو حق کہیں۔
عکرمہ نے کہا: انھیں یہ کہنے کا حکم دیا گیا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ. اس طرح کہنے سے گناہ برطرف ہوتے ہیں۔
ان اقوال سے ہر ایک جس سے گناہ برطرف ہوتے ہیں اس کا حِطَّۃ کے ذریعہ ترجمہ کرنا درست ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: نَحْنُ بَابُ حِطَّتِکُمْ ، ہم تمہارے لیے باب حطہ ہیں۔
اس کا ارشاد: نَّغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ، ہم تمہارے گناہوں کو معاف کردیں گے وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ یعنی جس ثواب کے تم مستحق ہو گے اس میں فضل کرتے ہوئے عنقریب اضافہ کردیں گے۔
ارشاد ہوتا ہے: لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (سورۂ فاطر، آیت ۳۰) (تاکہ اللہ انھیں (اس کے بدلے میں) پورا پورا اجر عطا کرے اور اپنے فضل سے ان کے لیے اس میں اضافہ بھی کردے)
بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی ہیں من و سلویٰ کے نازل کرنے اور ابر وغیرہ کا سایہ کرکے گذشتہ احسان پر احسان میں اضافہ کردیں گے۔

❀❀❀❀❀

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

مگر وہ بات جو ان سے کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل دیا آخرکار ہم نے ظلم کرنے والوں پر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے آسمان سے عذاب نازل کیا۔

الفاظ و معانی:

تَبْدِیْل کے معنی کسی چیز کا اس کی حالت سے بدل دینے کے ہیں۔
رِجْز کے معنی اہل حجاز کی لغت میں عذاب کے ہیں۔ یہ رجس کے علاوہ ہے چونکہ رجس پلیدگی اور نجاست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ رِجْزٌ عُذِّبَ بِهٖ بَعْضُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمْ، طاعون عذاب ہے تم سے قبل بعض امتوں کو اس میں مبتلا کیا گیا۔ عبیدہ نے کہا ہے: رِجْس اور رِجْز دو لغتیں ہیں مانند بُزاق و بِساق، زَرْع و سَرْع. رُجْز (را) کے ضمہ (پیش) کے ساتھ بت پرستی ہے۔

لغت میں فِسق کے معنی عقیدہ سے خارج ہونا ہے، کسی چیز سے خارج ہونے والا فِسق کرنے والا ہے مگر شریعت میں امرالٰہی یا اطاعت الٰہی سے خارج ہوجانے سے مخصوص ہے۔

ترکیب:

غَيْرَ الَّذِي میں غیرَ منصوب ہے اس لئے کہ وہ قولاً کی صفت ہے۔غیر کی اصل یہ ہے کہ وہ صفت ہے جو مثل کے مانند ہے جب مثل اور غیر معرفہ کی جانب مضاف ہوتے ہیں تو یہ دونوں معرفہ نہیں بنتے ہیں اس لئے کہ ان میں ابہام پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مِثْلُ الشَّیْء بہت طرح کی چیزیں ہوسکتی ہیں اسی طرح غَيْرُ الشَّيْءِ بھی بہت سی چیزیں ہوسکتی ہیں جو مختلف نہ ہوں۔

تفسیر:

ظالموں نے بدل ڈالا

پھر خداوند عالم نے بیان فرمایا: جس چیز کا انھیں حکم دیا گیا تھا اس کی انھوں نے اس کی نافرمانی کی: فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ ، انھوں نے نافرمانی کی اور وہ فعل انجام دیا جو انھیں نہیں کرنا تھا اور جس چیز کا انھیں حکم دیا گیا تھا انھوں نے اسے بدل دیا۔اس غیر کے متعلق اختلاف ہے:

بیان کیا گیا ہے: انھوں نے سریانی (زبان) میں هَطّا سُمْقَاتَا کہا۔جس کے معنی سرخ گندم کے ہیں جس میں جو مخلوط ہوں۔ایسا کرنے سے ان کا مقصد استہزا اور حکم کی مخالفت تھی۔

بیان کیا گیا ہے: انھوں نے جہالت واستہزا کرتے ہوئے حِنْطَة کہا۔انھیں سجدہ کرتے ہوئے دروازہ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا اور دروازہ ان کے لیے جھک گیا تھا تا کہ وہ داخل ہوسکیں اور وہ گھٹنوں پر چل کر داخل ہوئے۔انھوں نے داخل ہونے میں بھی مخالفت کی۔

ارشادالٰہی: فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا ، یعنی انھوں نے وہ کیا جو انھیں نہیں کرنا چاہیے تھا اس چیز کو بدل کر قول اور فعل کے ذریعہ جس کا حکم اللہ نے دیا تھا۔تو خداوند عالم نے آسمان سے عذاب نازل کیا۔یہ ابن عباس، قتادہ اور حسن کا قول ہے۔

بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ، یعنی ان کے فاسقین ہونے سے یا ان کے فسق کے باعث، جیسا کہ ارشاد ہوتا

ہے: ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا یعنی ان کے عصیان اور نافرمانی کے سبب۔ ابن زید نے کہا ہے: طاعون کے ذریعہ ہلاک کر دیئے گئے۔ ان میں سے چوبیس ہزار افراد کی موت کچھ ہی دیر میں واقع ہوگئی جس میں ان کے بزرگ اور بوڑھے شامل تھے اور جوان باقی بچے، ان سے علم اور عبادت منتقل ہوگئے گویا اس امر کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ان کے درمیان سے افاضل حضرات کو نکال کر بقیہ پر عذاب کیا گیا۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾
اور یاد کرو وہ وقت جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے ان سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے ہر قبیلے کو اپنے اپنے گھاٹ کا علم تھا۔ (ہم نے کہا) تم اللہ کے رزق میں سے کھاؤ، پیو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

الفاظ و معانی:

اِسْتِسْقَاء کے معنی طلب سُقْیَۃ (یعنی سیرابی کی خواہش کرنا) ہے۔

اِنْفِجَار کے معنی شگافتہ ہونے کے ہیں۔ اِنْبِجَاس اِنْشِقَاق سے زیادہ تنگ ہے پہلے اِنْبِجَاس (بہنا، رسنا) ہوتا ہے پھر اِنْفِجَار ہوتا ہے۔

عَیْن اسماء مشترک میں سے ہے۔ پانی کا عَیْن (چشمہ) حیوان کی عَیْن (آنکھ) سے آنسو جاری ہونے سے مشابہ ہے۔ جس شہر (اور آبادی میں) لوگ کم ہوں اسے بَلَدٌ قَلِيْلُ الْعَيْنِ کہتے ہیں۔ بارش، سونے کی (کان) میزان، آفتاب اور جاسوسی کرنے والے کو بھی عَیْن کہتے ہیں۔

وَلَا تَعْثَوْا (یعنی فساد نہ کرو) عُثِیّ شدید فساد کو کہتے ہیں۔

ترکیب:

اِذْ کلام محذوف سے متعلق ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَاذْكُرُوْا اِذِ اسْتَسْقٰى

ممکن ہے کہ ان چیزوں پر معطوف ہو جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہوا ہے۔

اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا: عَشْرَةَ میں شین ساکن ہے تمام قراء کے نزدیک۔ لغت میں اسے کسرہ دینا جائز ہے اور کسرہ ربیعہ اور تمیم کی لغت ہے اور ساکن کرنا اہل حجاز کی لغت ہے۔

ابن جنی نے کہا: الفاظ عدد میں بہت سے انحرافات پائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اہل حجاز کی لغت عدد جیسے عُشَرَة اور عَشَرَة کے علاوہ میں وہ کہتے ہیں کہ نَبِقَة اور فَخِذ دوسرے حرف کو کسرہ دیتے ہیں اور بنی تمیم ساکن کرتے ہیں اور نَبْقَة و فَخْذ کہتے ہیں۔ جب دو اسم مرکب ہو جائیں تو پھر وزن بنانا محال ہو جاتا ہے۔ بنی تمیم نے کہا: إِحْدَىٰ عَشِرَةَ وَ اثْنَتَا عَشِرَةَ شین کے کسرہ کے ساتھ۔

اہل حجاز نے کہا: عَشْرَةَ شین کو سکون قرار دیا تھا۔

عَيْنًا بربنائے تمیز منصوب ہے۔ اِثْنَتَا عَشْرَةَ کا دوسرا اسم عِشْرُوْنَ میں نون کا قائم مقام ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کے بعد عَشْرَةَ آئے تو اِثْنَتَانِ سے نون گر جاتا ہے اور یہی ہر ایک میں فرض کیا گیا ہے اور وہ ثَلَاثَةٌ ثَلَاثٌ ہے ثَلَاثَةَ عَشَرَ اور ثَلَاثَ عَشْرَ میں تِسْعَةَ عَشَرَ اور تِسْعَ عَشْرَةَ تک کہ نون ان میں عَشْرَةَ کا قائم مقام ہے۔ اسی لئے اس پر تنوین نہیں آئی ہے اور جب تنوین داخل نہیں ہوگی تو مبنی ہوگا۔

مُفْسِدِيْنَ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

تفسیر:

بیابان میں پانی کا چشمہ

پھر خداوند عالم نے بنی اسرائیل پر پہلی نعمت کے بعد دوسری نعمت شمار کی اور ارشاد فرمایا: وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ، موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا 'سین' طلب کا سین ہے، جس سے طلب کیا گیا اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لیے کہ جو کلام میں ذکر کیا گیا ہے وہ معنوی طور پر اس پر دلالت کر رہا ہے جس کو ترک کر دیا گیا ہے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ، (اور یاد کرو وہ وقت جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے ان سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، چنانچہ اس

سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے) یعنی انھوں نے عصا پتھر پر مارا۔ اس سے چشمے جاری ہو گئے ، جناب موسیٰؑ کے پتھر پر عصا مارنے والی خبر کو ترک کر دیا اس لیے کہ جس چیز کو کلام میں باقی رکھا گیا ہے وہ اس پر دلالت کر رہی ہے جس کو چھوڑا گیا ہے گویا اس طرح ہے کہ ''میں نے فلاں شخص کو تجارت کرنے کا حکم دیا اس نے مال کمایا'' یعنی اس نے تجارت کی اور مال کمایا۔ جناب موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل تھی ، آپ نے بنی اسرائیل کے لیے اپنے پروردگار سے پانی طلب کیا ، جب وہ صحرا میں تھے اور بنی اسرائیل نے ان سے تشنگی کا شکوہ کیا تھا تو اللہ نے ان سے کہا کہ وہ اپنا عصا ماریں جو کہ مشہور عصا تھا اور جنت کی لکڑی کا تھا جسے جناب موسیٰؑ کو حضرت شعیبؑ نے دیا تھا ، اس عصا کو جناب آدمؑ جنت سے اپنے ہمراہ زمین پر لے کر آئے تھے۔ اس کی لمبائی طول جناب موسیٰؑ کے قد کے دس ہاتھ تھی ، اس میں دو شگاف تھے جو تاریکی میں نور دیتے تھے اسی عصا کو (موسیٰ نے) سمندر پر مارا تھا جس سے شگاف پیدا ہوئے تھے اور یہی عصا اژدہا بن تھا۔ البتہ حجر (پتھر) کے بارے میں اختلاف ہے۔

بیان کیا گیا ہے اس سے چشمے پھوٹتے تھے ہر قبیلہ کے لیے ایک چشمہ تھا وہ بارہ قبیلے تھے پھر ہر چشمہ اس قبیلہ کی جانب بڑھتا تھا جسکے پلائے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ روایت وھب بن منبہ سے منقول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: پتھر بذات خود بہت ہلکا تھا۔ جب سفر کرتے تو اسے اپنے ہمراہ لے جاتے ، جب کہیں اترتے تو جناب موسیٰ اس پر اپنا عصا مارتے اور اس سے پانی جاری ہو جاتا۔ یہ ابن عباس سے منقول ہے۔ یہ معنیٰ زیادہ بہتر اور اولیٰ ہیں اور اس پر الف لام کا داخل ہونا اس کی دلیل ہے جو کہ عہد کے لیے ہے۔

بیان کیا گیا ہے: ایسا پتھر جس میں بارہ سوراخ تھے۔ پتھر ڈھیلے کے مانند نرم تھا۔ جسکے ہر سوراخ سے میٹھے پانی کا چشمہ جاری ہوتا تھا۔ جب بنی اسرائیل سیراب ہو جاتے اور جناب موسیٰ اسے اٹھانا چاہتے تو اس پر عصا مارتے پانی ختم ہو جاتا تھا۔ یہ پتھر ہر روز چھ لاکھ لوگوں کو سیراب کرتا تھا۔ یہ روایت ابو مسروق سے ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ یہ چوکور پتھر تھا اور یہ بھی روایت کی گئی ہے سر کے مانند تھا۔ جب جناب موسیٰؑ اس پر عصا مارتے تو اس کے ہر جانب سے تین تین چشمے (جاری ہوتے) ہر قبیلہ کے لیے ایک چشمہ تھا۔ وہ کسی منزل کا سفر نہیں کرتے مگر اس پتھر کو پہلی ہی منزل میں پاتے تھے۔

ارشاد الٰہی: فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا سورۂ اعراف کے فَانْبَجَسَتْ سے منافات نہیں رکھتا ہے۔ (اِنْبِجَاس) کے معنیٰ بھی پھوٹنے اور جاری ہونے کے ہیں مگر یہ مختصر ہوتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے پہلی مرتبہ جب عصا مارتے ہوں تو پہلے کم پانی نکلتا ہو پھر

زیادہ ہوجاتا ہو یہاں تک کہ جاری ہوجاتا ہو۔

بیان کیا گیا ہے کہ جیسی ضرورت ہوتی ویسا ہی ہوتا کم ضرورت کے وقت کم پانی نکلتا اور زیادہ ضرورت کے موقع پر پانی زیادہ جاری ہوتا۔

اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ اٹھاتے اور لے جاتے وقت پانی کم نکلتا اور رکھتے وقت پانی جاری ہوتا اور پھوٹ کر نکلتا۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ. ان میں کے ہر قبیلہ اور ہر فرد نے اپنے اپنے پینے کا مقام جان لیا۔

اس کا ارشاد: كُلُوا وَاشْرَبُوا. یعنی ہم نے ان سے کہا کہ کھاؤ اور پیو۔ یہ نیا جملہ ہے۔

ارشاد: مِن رِّزْقِ اللهِ ان نعمتوں میں سے کھاؤ (من وسلویٰ) کی شکل میں جن کے ذریعہ تم پر احسان کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ میں سے بھی کھاؤ) اور پانی پیو۔ یہ تمام رزق خدا ہے جو تم تک کسی مشقت اور عوض کے بغیر پہونچتا ہے۔ رزق وہ چیز ہے جس سے رزق پانے والا نفع حاصل کرے، جس سے کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے۔

وَلَا تَعْثَوْا. زمین پر فساد کرنے کی کوشش نہ کرو یہ جو ارشاد: وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ہے۔ اگر چہ عثیٰ فساد ہی ہوتا ہے اس لیے ممکن ہے کہ فعل کا ظاہر فساد ہو اور اس کے باطن میں مصلحت ہو۔ اس طرح اللہ نے واضح فرما دیا کہ ان کا فعل عبث (کسی چیز کا فاسد کرنا) ہے جو کہ فساد ہے، ظاہر ہو چاہے باطن۔

اگر سوال کیا جائے کہ اس مختصر سے پتھر میں پانی کی اتنی بڑی مقدار کس طرح جمع کردی گئی کیا یہ ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اللہ کی روشن نشانیاں اور ظاہری عجائبات ہیں جو اللہ کے فعل پر دلالت کر رہی ہیں جو اشیاء کو وجود میں لانے والا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے، صعوبتیں اس کے سامنے سرنگوں ہیں، وہ ان کے لیے اسباب فراہم کرتا ہے، اس کے کمال قدرت اور جلال عزت سے یہ امر بعید نہیں کہ وہ ابتدائی طور پر جناب موسیٰؑ کے لیے کثیر مقدار میں پانی خلق فرما دے جو خود جناب موسیٰؑ اور ان کی قوم کے لیے نعمت ہو۔ ملحدین میں سے جو اس امر کو بعید اور ناممکن سمجھتے ہیں وہ اس کی قدرت کو کماحقہ نہیں سمجھتے اور اسے برحق معرفت کے ساتھ نہیں پہچانتے۔ ملحدین سے بحث تو وجود صانع، صفات الٰہی کے اثبات اور اس کی بے پایاں قدرت سے متعلق ہے، جب وہ اصل کے مخالف ہیں تو پھر فرع کے بارے میں ان سے بحث کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم ایک طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے اپنے رب سے دعا مانگیے کہ وہ ہمارے لیے زمین سے اگنے والی چیزیں پیدا کر دے جیسے ساگ پات، کھیرا ککڑی (گیہوں) لہسن، مسور اور پیاز وغیرہ تو موسیٰ نے کہا کہ تم ایسی چیز کو جو ہر طرح سے بہتر ہے ادنیٰ چیز سے بدلنا چاہتے ہو، جاؤ کسی شہری آبادی میں جا رہو تم نے جو کچھ مانگا ہے وہاں مل جائے گا اور آخر کار انھیں ذلت پستی اور بدحالی میں گرفتار کر دیا گیا اور وہ لوگ اللہ کے غضب میں گھر گئے یہ سب اس لیے ہوا کہ وہ لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کر رہے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر رہے تھے۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور حدود شرع سے تجاوز کرنے کا نتیجہ تھا۔

قرائت:

اہل مدینہ نے اَلنَّبِيْئِيْنَ ہمزہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے بغیر ہمزہ کے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جنہوں نے اَلنَّبِيْءِ کو ہمزہ دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کلمہ کی اصل وہی ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ اہل حجاز اپنے کلام میں ہمزہ کو ثابت و باقی رکھتے ہیں اسے بدلتے نہیں ہیں۔ وہ یَدَعُ وغیرہ کے ماضی کے مانند نہیں ہے کہ جس کے استعمال کو چھوڑ دیا گیا ہو۔

لیکن حدیث میں جو منقول ہے کہ بعض لوگوں نے کہا: یا نبیءَ اللہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نبیءُ اللہ نہیں ہوں بلکہ میں نبی اللہ ہوں۔

میں گمان کرتا ہوں کہ روایات نقل کرنے والوں میں ایسے بھی افراد ہیں جنہوں نے اس حدیث کی اسناد کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس سند کے ضعف کو اور قوی بنا دیا ہے اس شاعر نے کہ اس نے مدح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کہا:

یَا خَاتَمَ النَّبَاءِ اِنَّکَ مُرْسَلٌ بِالْحَقِّ خَیْرُ هُدَی الْاِلٰهِ هَدَاکَا

جہاں تک ہم جانتے ہیں کہ اس کا انکار و ممانعت نے اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑا ہے اگر واحد میں یہ بات ناپسندیدہ ہے تو جمع بھی واحد کے مانند ناپسندیدہ ہوگی۔

اور جس نے بدل دیا ہے اور قرآن مجید میں تحقیق نہیں کی کہ انبیاء بھی آیا ہے تو وہ زیادہ تر معتل اللام میں ہے جیسے صَفِیٌّ سے اَصْفِیَاء، غَنِیٌّ سے اَغْنِیَاء یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں ابدال لازم ہے جب ابدال لازم ہے تو ہمزہ کو باقی رکھنا ضعیف ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ نبی، نَبْوَۃ سے مشتق ہے جو ارتفاع و بلندی کے معنی میں ہے اور نہ ہی نَبَاوَۃ سے مشتق ہے اس لئے کہ سیبویہ نے حکایت کی ہے کہ سارے عرب کہتے ہیں کہ تَنَبَّأَ مُسَیْلَمَۃُ، ہمزہ کے ساتھ۔ سیبویہ کی یہ حکایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی اصل ہمزہ ہے۔

زجاج نے کہا: نَبِیٌّ اَنْبَأْتُ سے بھی مشتق ہوسکتا ہے کہ کثرت استعمال کی بنا پر ہمزہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ نَبَا، یَنْبُو سے ہو جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں اور نَبِیٌّ فَعِیْل کے وزن پر ہے بلند مقام کے معنی میں۔

الفاظ و معانی:

طَعَام کے معنی جس چیز کے ذریعہ غذا حاصل کی جائے (جسے بطور غذا استعمال کیا جائے)

اَکْل و طَعْم عرض ہے جس کا ادراک قوت ذائقہ سے ہوتا ہے۔ طعام اجسام کے قبیل (قسم) سے ہے۔

وَاحِد حساب کا پہلا عدد ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ جسے اجزاء میں تقسیم نہ کیا جاسکے۔ اللہ اپنے صفات حسنہ کے منفرد ہونے کے سبب واحد (ایک) ہے۔

دُعَاء کے معنیٰ نِداء (پکارنے) کے ہیں۔ یہ ابن سراج نے کہا ہے کہ جو (شخص) بھی اپنے پروردگار کو پکارتا ہے وہ اسے ندا دیتا ہے۔ حقیقت دعا یہ ہے کہ قائل اپنے سے بلند مرتبہ ذات سے اس طرح کہتا ہے ''یہ کام انجام دے!'' دعا اور امر کے درمیان فرق مرتبہ کے اعتبار سے ظاہر ہوتا ہے۔

بَقْل ہر وہ چیز جس کی جڑ نہیں ہوتی۔

قِثَّاء میں دو لغتیں ہیں قاف کے پیش (قُثَّاء) اور زیر کے ساتھ (قِثَّاء) زیر کے ساتھ سب سے بہتر و افضل ہے۔ یہی لغت قرآن ہے۔

وَالْفُوْمِ هُوَ الْحِنطَة. فوم کے معنی حنطہ یعنی گیہوں کے ہیں۔ ابن عباس وقتادہ اور سُدی سے روایت ہے، امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی یہی مروی ہے۔ فراء اور ازہری نے بیان کیا ہے کہ یہ گندم اور روٹی ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ اناج ہے جس سے روٹی بنائی جاتی ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ یہ ثوم (لہسن) ہے۔ ث کو ف سے بدل دیا گیا۔ یہ فراء نے کہا ہے۔

بَصَل (پیاز) سے بہت زیادہ مشابہ ہے جس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ یہ بعید ہے چونکہ ثوم فوم کے معنی میں مشہور نہیں ہے۔ چونکہ قوم کے لیے ممکن نہیں تھا کہ ثوم کا مطالبہ کرتی نہ ہی قوم نے روٹی کا مطالبہ کیا جو کہ اصل ہے۔ یہ قول ضعیف ہے چونکہ ابن مسعود وابن عباس سے شواذ (روایت) میں ثُومها کی ث کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔

عَدَس مسور کی دال جو کہ مشہور ہے۔

ارشاد الٰہی: ادنیٰ یعنی بہت زیادہ نزدیک، ممکن ہے اَدْنیٰ، دِنَائَة سے ہو جو حقیر و پست اور گھٹیا کے معنی میں ہے۔

وضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی ذلت ورسوائی ان کے لیے فرض اور لازمی کر دی گئی جس طرح کہا جاتا ہے: ضَرَبَ الْاِمَامُ الْجِزْيَةَ عَلٰى اَهْلِ الذِّمَّةِ (امام نے اہل ذمہ پر ٹیکس واجب کر دیا) یا اس طرح کہا جاتا ہے: ضَرَبَ الْاَمِيْرُ عَلٰى عَبِيْدِهِ الْخَرَاجَ (حاکم نے اپنے غلاموں پر خراج لازمی کر دیا ہے۔ ذلة ذَلَّ سے مشتق ہے۔

مَسْكَنَة مِسْكِيْن کا مصدر ہے۔ مَسْكَنَة یہاں پر فقر و فاقہ اور محتاجی کے معنی میں ہے۔ یہ اس کا خشوع اور ذلت ہے۔

ارشاد الٰہی: وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ یعنی غضب الٰہی کی طرف پلٹ گئے۔ مبرد نے بیان کیا ہے: اس کی اصل مَنْزِلَۃ ہے یعنی غضب الٰہی کی منزل میں پہنچ گئے۔ روایت کی گئی ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو لیکر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا: هٰذَا قَاتِلُ اَخِیْ وَ هُوَ بَوَاءٌ بِه" یعنی مقتول بہ ہے۔ زجاج نے بیان کیا ہے: اس کے اصلی معنی تَسْوِیَۃ کے ہیں اسی سے متعلق ہے وہ قول جس کی روایت عبادہ بن صامت سے کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: جَعَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی الْاَنْفَالَ اِلٰی نَبِیِّهٖ فَقَسَّمَهَا بَیْنَهُمْ عَلٰی بَوَاءٍ اللہ نے انفال اپنے پیغمبرؐ کے لیے قرار دیا پس اسے انھوں نے لوگوں کے درمیان برابر سے تقسیم کر دیا۔

ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ اعتراف کرنے کے معنی میں ہے کہ ان لوگوں نے غضب الٰہی کے سبب کا اعتراف کرلیا۔

غَضَب کے معنی ہیں جس پر غضب کرنا ہے اسے ضرر و نقصان پہونچانے کا ارادہ کرنا۔ جب اس کی نسبت اللہ کی طرف دی جائے گی تو مغضوب علیہ پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ مراد ہوگا (ہم سب اللہ کے غضب سے پناہ چاہتے ہیں)

نَبِیّ، نَبَاء سے مشتق ہے یعنی خبر دینا چونکہ نبی اللہ کی جانب سے خبر دیتا ہے۔

ترکیب:

یُخْرِجْ لَنَا: مجزوم ہے اس لئے کہ امر محذوف کا جواب ہے، گویا اس طرح ہے: اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ وَقُلْ لَهٗ: اَخْرِجْ لَنَا یُخْرِجْ لَنَا۔ (آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے اور اس سے کہئے کہ وہ ہمارے لئے اگائے تو وہ ہمارے لئے اگائے گا)

ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ اس کی اصل یہ ہے کہ وہ شرط کی وجہ سے مجزوم ہے شرط کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس طرح فرض کیا جائے کہ یُخْرِجْ لام امر کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے یعنی لِیُخْرِجْ لَنَا (وہ ہمارے لئے اُگائے) جیسا کہ اس آیت میں ہے: قُلْ لِعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یعنی لِیُقِیْمُوْا۔ لام کو حذف کر دیا گیا ہے ابو زید نے یہ شعر کہا:

فَیُضْحِیْ صَرِیْعًا مَّا یَقُوْمُ لِحَاجَةٍ وَلَا یَسْمَعُ الدَّاعِیْ وَ یُسْمِعُكَ مَنْ دَعَا

لِيُسْمِعَكَ. ایک دوسرے شاعر نے کہا:

فَقُلْ ادْعِیْ وَ أَدْعُ فَإِنَّ أَنْدیٰ لِصَوْتٍ أَنْ يُّنَادِيْ دَاعِيَانِ

یعنی لِأَدْعُ نیز کہا:

مُحَمَّدُ تَفْدِ نَفْسَكَ كُلُّ نَفْسٍ إِذَا مَا خِفْتَ مِنْ أَمْرٍ تَبَالَا

یعنی لِتَفْدِ۔

مبرد نے کہا: مازنی نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ میں قراء کے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ انہیں اپنے ساتھیوں سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لام امر کو حذف کرنا جائز نہیں ہے سوائے شعر کے پھر یہ شعر کہا:

مَنْ كَانَ لَا يَزْعَمُ أَنِّيْ شَاعِرٌ فَيَدْنُ مِنِّيْ يَنْهَهُ الزَّوَاجِرُ

جو شخص گمان نہیں کرتا ہے کہ میں شاعر ہوں تو وہ میرے قریب آئے منع کرنے والی چیزیں اسے منع کر دیں گی۔

میں نے ان سے کہا: ایسا کیوں ہے کہ شعر میں جائز ہے اور کلام (نثر) میں جائز نہیں ہے۔ جواب دیا: اس لئے کہ شعر میں شاعر مجبور ہوتا ہے اور حذف کر دیتا ہے، میں نے عرض کیا: کیا اس شعر میں شاعر کو کس چیز نے مجبور کیا تھا کہ يَدْنُ کہے جبکہ وہ فَلْيَدْنُ کہہ سکتا تھا۔ تب انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔

مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ: یہاں پر مِنْ تبعیض کے لئے آیا ہے اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ خدا ہمارے لئے زمین جن چیزوں کو اگاتی ہے ان میں سے کچھ کو اگائے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ یہاں پر مِنْ زائدہ ہے جیسے عربوں کا یہ کہنا ہے: مَا جَاءَنِيْ مِنْ أَحَدٍ

صحیح قول پہلا قول ہے اس لئے کہ مِنْ مثبت میں زائدہ نہیں ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے معین کئے بغیر شہروں میں سے کسی ایک شہر کا ارادہ کیا ہے اس لئے کہ وہ وادی تیہ میں تھے۔ ممکن ہے کہ خود ملک مصر مراد ہو اور اس کے منصرف ہونے کی وجہ اس کا مذکر ہونا ہے۔

ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے بغیر الف کے قرأت کی ہے ممکن ہے کہ مراد یہی مصر ہو جیسا کہ فرمایا ہے: أُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ۔ اسے غیر منصرف نہیں لایا ہے اس لئے کہ شہر کا نام ہے لفظ مذکر اور مونث کا نام رکھ دیا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ جن لوگوں نے تنوین دی ہے انہوں نے مصحف کے اتباع کی بنا پر تنوین دی ہے اس

لئے کہ مصحف میں الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ ۔زجاج نے کہا: مراد یہ ہے کہ خدا نے بتا دیا کہ غضب ان پر خود ان کے کفر کی بنا پر نازل ہوا ہے اور اس آیت کی وضاحت میں کہتا ہوں کہ ذٰلِكَ ارشاد الٰہی: وَ بَاۗءُوْا بِغَضَبٍ میں غضب کی جانب اشارہ ہے لہٰذا مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے انّ اپنے صلہ اسم وخبر کے ساتھ مجرور ہے اور جار مجرور کا متعلق مبتدا کی خبر ہے اور فعل و فاعل سے مرکب جملہ ہے جسے حذف کر دیا گیا ہے اس کہ جو چیز اس سے متصل ہے وہ اس جملہ پر دلالت کر رہی ہے۔

اسی طرح :ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا بھی ہے۔ مَا اپنے صلہ کے ساتھ تاویل مصدر میں ہے اس جملہ پر دلالت کر رہی ہے۔

تفسیر:

رنگ برنگے کھانے کی تمنا

جب خداوند عالم نے سابق میں بنی اسرائیل کو عطا کی گئیں نعمتوں اور احسانات کا شمار کرایا پھر ذکر فرمایا (ان چیزوں کے بارے میں) جن کا انھوں نے کفران نعمت عصیان و نافرمانی کے ذریعہ اپنے سوء اختیار سے مقابلہ کیا وَاِذْ قُلْتُمْ، جب تم نے کہا یعنی بنی اسرائیل میں جو تمہارے اسلاف تھے انہوں نے کہا: يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ، ہم ایک قسم کے کھانے پر باقی رہنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ جو کہا گیا ہے ایک کھانے پر اگر چہ ان کا کھانا من وسلویٰ تھا، جو دو چیزیں تھیں۔ اس سے ان کی مراد ہر دن ایک جیسا کھانا تھا۔ یعنی (موجودہ) دن میں وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ گذشتہ روز کھا چکے تھے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: فلاں شخص کا کھانا ہر دن ایک ہوتا ہے اگر چہ وہ کئی قسم کے کھانے کھاتا ہے اگر وہ اپنے آپ کو چند قسموں کے کھانے کا پابند بنالے اس کے سوا وہ شمار نہیں کرتا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان پر فقط من نازل ہوتا تھا جس سے وہ اکتا گئے تھے۔ جسکے متعلق انھوں نے کہا تھا۔ اس کے بعد ان پر سلویٰ نازل کیا گیا۔

اس کا ارشاد: فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ، اپنے پروردگار سے طلب کیجئے، ہمارے لیے اس سے مانگئے، يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا، یعنی سبزیوں سے وہ چیزیں جو زمین سے اگتی ہیں جن کا ذکر اللہ نے فرمایا ہے۔ ان لوگوں کی مانگ کا سبب یہ ہے جس کی روایت قتادہ

نے کی ہے۔ انھوں نے کہا: قوم صحرا میں تھی۔ ان پر ابر کا سایہ کیا اور ان پر من وسلویٰ نازل کیا جس سے وہ اُکتا گئے تھے۔ انھیں مصر کی زندگی یاد آئی۔ انھوں نے موسیٰ سے مانگ کی تو اللہ نے ارشاد فرمایا: اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ، یہ اصل میں اس طرح ہے کہ موسیٰ نے دعا کی جس کو ہم نے قبول کرلیا۔ پھر ہم نے ان سے کہا: مصر میں چلے جاؤ اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے کہا ہم اس ثروت مندی پر صبر نہیں کر سکتے کہ ہم سب غنی وثروت مند ہوں اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے مدد نہ لے سکے اس لیے انھوں نے کہا: ہمارے لیے وہ چیز نکالئے جو زمین سے پیدا ہوتی ہے تاکہ اس میں مددگاروں کی ضرورت ہو۔ اس طرح فقیر ثروت مند کا مددگار بن جائے۔

ارشاد الٰہی: قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ، اسکے معنی یہ ہیں کہ ان سے موسیٰ نے کہا۔ کہا گیا ہے: بلکہ اللہ نے ان سے کہا: کیا تم اس چیز کو ترک کر رہے ہو جسے تمہارے لیے اللہ نے اختیار اور پسند کی ہے اور اس چیز سے پست اور گھٹیا چیز کو ترجیح دے رہے ہو (اس پر خوش ہو؟)

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ کیا تم زراعت اور صنعت میں صرف کردہ چیز کو اس چیز سے تبدیل کر رہے ہو جو تم سے عفو ودرگذر کرتے ہوئے من وسلویٰ عطا فرمایا ہے؟

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم کم قیمت والی چیز کو بیش قیمت اور زیادہ لذت بخش چیز پر اختیار کر رہے ہو۔ ان لوگوں کی مانگ میں اختلاف ہے کہ آیا ان کا مطالبہ کرنا معصیت ونافرمانی تھی؟

کہا گیا ہے کہ معصیت نہیں تھی، اس لیے کہ پہلا مباح تھا۔ پس انھوں نے دوسرے مباح کی مانگ کی اور کہا گیا ہے کہ بلکہ معصیت تھی اس لیے کہ وہ اس چیز پر راضی نہیں تھے جسے اللہ نے ان کے لیے اختیار کیا تھا۔ اسی لئے ان کی مذمت کی گئی ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے۔

اس کا ارشاد اِهْبِطُوْا مِصْرًا (کسی شہری آبادی میں چلے جاؤ) اس مصر کے بارے میں اختلاف ہے۔ حسن اور ربیع نے کہا ہے: اس سے فرعون والا مصر مراد ہے جس سے وہ نکلے تھے۔ ابو مسلم نے کہا ہے: بیت المقدس مراد ہے۔ یہی روایت ابن زید سے کی گئی ہے۔ قتادہ، سدی اور مجاہد نے کہا ہے: (عام) شہروں میں سے ایک شہر مراد ہے۔ یعنی جس چیز کا تم نے مطالبہ کیا ہے وہ شہروں میں ہوتی ہے نہ کہ ایسے صحرا میں جس میں پانی تک کا فقدان ہو۔ فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ، اس میں تمھارے لئے زمین سے اگنے والے وہ سارے سامان ہیں جن کی تم نے مانگ کی ہے۔

یہاں پر کلام مکمل ہوجاتا ہے پھر ان لوگوں کے بیان کا آغاز ہوتا ہے جنھوں نے روز ہفتہ کے متعلق

سرکشی کی اور انبیاء کا قتل کیا۔ ارشاد ہوا: وَضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ یعنی ذلت ان کے ساتھ لگا دی گئی جس سے ان کو چھٹکارا نہیں ہے۔ جس طرح کسی چیز میں کیل ٹھوک دی جاتی ہے وہ اس سے وابستہ اور پیوستہ ہو جاتی ہے۔ کہا گیا ہے: ذلت سے جزیہ (ٹیکس) مراد ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ۔ (سورۂ توبہ، آیت ۲۹) (یہاں تک کہ وہ لوگ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کریں) حسن اور قتادہ سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ زنار کے علاوہ ایک دھاگا جس کو ذمی اپنے لباس پر باندھتے ہیں اور وہ یہود کا پہناوا ہے۔ یہ عطا سے منقول ہے۔ اس کا ارشاد ہے: وَالۡمَسۡكَنَةُ یعنی آپ ان کے فقر کی حالت میں ان میں سے تنگ دست افراد کو جزیہ بڑھ جانے کے خوف سے مایوس پائیں گے۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت ثروت مندی اور امیری کی برتری پر دلالت کر رہی ہے اس لیے کہ لوگوں کی ان کے فقر کے سبب مذمت کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ اس سے قلب کی فقیری مراد ہے اس لیے کہ یہودیوں میں بہت سے صاحبان ثروت پائے جاتے ہیں لیکن باعتبار نفس غنی نہیں ہوتے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ثروت و دولت تو نفس کا ثروت مند ہونا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: خداوند عالم نے یہودیوں کی عزت کو ذلت سے، نعمت کو بدحالی سے اور ان سے رضا کو غضب سے بدل دیا ان کے (آیات الٰہی) کے انکار، قتل انبیاء و رسل اور سرکشی و ظلم کے باعث۔ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ، یعنی پلٹ گئے اس حالت میں کہ غضب الٰہی کا شکار ہو چکے تھے۔ اللہ کی طرف سے ان پر غضب لازمی ہو گیا اور اس کی ناراضگی ان پر حتمی ہو گئی۔

ایک گروہ نے کہا ہے: غضب سے مراد دنیا میں ان پر خوشگوار زندگی اور نعمت کے عوض مصیبت اور عذاب کا حتمی ہونا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے ان کی نافرمانیوں اور گناہوں پر ملنے والا آخرت کا عذاب ہے۔ پھر اس چیز کی جانب اشارہ کیا جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكَ غضب، ذلت پستی اور بدحالی میں گرفتاری کا سبب یہ ہے کہ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وہ اللہ کی حجتوں اور اس کی واضح نشانیوں کا انکار کرتے تھے۔ کہا گیا ہے: آیات الٰہی سے انجیل و قرآن مراد ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ وہ غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے۔ پہلا غضب جناب عیسیٰؑ اور انجیل کے انکار پر تھا۔ دوسرا غضب ان کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کے انکار کی بنا پر تھا۔ کہا گیا ہے آیات اللہ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات ہیں۔ ارشاد الٰہی: وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ، یعنی بے جرم و خطا (انبیاء کو قتل کرتے ہیں) جیسے

جناب زکریاؑ اور جناب یحییٰؑ وغیرہ اس کا ارشاد بِغَیۡرِ الۡحَقِّ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ انبیاء کا قتل برحق بھی ہوسکتا ہے اس لیے کہ یہ انبیاء کا قتل صرف اور صرف ناحق ہی ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَمَن یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ لَا بُرۡھَانَ لَہٗ بِہٖ. اس کے معنی ہیں کہ اس پر برہان ودلیل ہونا ناممکن ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

عَلٰی لَاحِبٍ لَا یُھۡتَدٰی بِمَنَارِہٖ

جب راستہ کشادہ ہوتو پھر مینار کے ذریعہ ہدایت کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّکَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ. اس میں انبیاء کا قتل کرنے اور روز ہفتہ کے سلسلہ میں ان سے تجاوز و سرکشی کرنے جیسی نافرمانیوں کی جانب اشارہ ہے جس کا بیان سابق میں گذر چکا ہے۔ کہا گیا ہے ان کی عہد شکنی اور قتل انبیاء میں سرکشی سے مراد یہ ہے کہ میں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ان کی میرے امر کی نافرمانی اور نہیں کا پاس ولحاظ نہ رکھتے ہوئے اس کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے۔

سوال: اگر کہا جائے کہ کفار اور قتل انبیاء کے درمیان آزادی فراہم کردینا (یعنی کفار کو انھیں قتل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا) کس طرح ممکن ہے؟

جواب: یہ اس لیے ممکن ہے کہ انبیائے کرام اللہ کے بلند مراتب اور درجات تک پہنچ سکیں جہاں تک شہادت کے بغیر نہیں پہنچا جاسکتا اور یہ ان کو چھوڑنے اور ان سے قطع تعلق کی بنا پر نہیں ہے۔ اسی طرح مومنین، اولیاء اور اطاعت شعاروں اور ان کے قاتلوں کے درمیان آزاد چھوڑ دینا ان سے قطع تعلق نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ خداوند عالم نے کسی پیغمبر کو اس لئے جہاد کرنے کا حکم نہیں دیا کہ وہ اس میں قتل ہوجائے۔ انبیاء کا قتل کسی جہاد میں نہیں ہوا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ کسی نبی نے اگر اس شریعت کو ابھی تک نہیں پہونچایا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے تو پھر ممکن نہیں کہ خداوند عالم اس کے قتل کے امکان فراہم کرے اگر ایسا ہوتا تو بندے الطاف اور مصالح سے محروم رہ جائیں گے اور اگر اس نے پہونچا دیا ہے تو خدا نبی اور اس کے قاتل کے درمیان چھوڑ سکتا ہے اور پھر اسے قتل سے روکنا واجب نہیں ہے۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: بنی اسرائیل نے جناب موسیٰؑ کے بعد پانچ سو برس تک اختلاف کیا یہاں تک کہ ان کے درمیان کنیزوں کی اولاد بکثرت ہوگئیں اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دو سو برس تک اختلاف کیا۔

❀❀❀❀❀

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

یقین جانو کہ جولوگ نبی اکرم پر ایمان لائے اور یہودی، نصاریٰ اور ستارہ پرست ان میں سے جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انھیں نہ تو خوف ہوگا اور نہ ہی وہ لوگ محزون ہونگے۔

قرائت:

نافع نے پورے قرآن میں صَابِیِیْنَ اور صَابُوْنَ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور بقیہ قراء ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

حجت:

ہمزہ کو ترک کرنے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(۱) یہ لفظ ممکن ہے کہ صَبَا، یَصْبُوْ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کسی شے کی جانب مائل ہونا ہیں۔

(۲) ممکن ہے کہ ہمزہ کو بدل دیا گیا ہے۔

ابو علی نے کہا: اسے صَبَا یَصْبُوْ سے مشتق ماننا آسان نہیں ہے اس لئے کہ کبھی انسان کسی دین کی طرف مائل تو ہوتا ہے لیکن اسے اپنا دین نہیں بناتا ہے باوجودیکہ اس کی جانب میلان و رجحان رکھتا ہے۔ جب یہ بعید ہے تو صَابِیِیْنَ جب دین نے انہیں گرفت میں لیا تو اس سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہو گئے وہ قائم نہ رکھ سکے مگر کہ اپنے دین سے ایک ایسے دین کی طرف منتقل ہو گئے کہ جس دین کو ان کے لئے بنایا گیا تھا۔ پس یہ ہمزہ کو قلب (بدلنے) کی بنا پر ہے اور اس حد تک ہمزہ کو بدلنے کی سیبویہ نے اجازت نہیں دی ہے مگر شعر میں پس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایسا کہنے والا غیر فصیح ہے اور وہ لغت میں خلط وملط کرنے والا ہے لہذا ہمزہ کو اختیار کرنا ہی صحیح نظریہ ہے نیز اکثر قراء کی قرأت ہے اور تفسیر سے زیادہ قریب ہے۔

الفاظ و معانی:

هَادُوْا یعنی یہودی ہو گئے یعنی یہودیت کو اپنا دین بنالیا۔ هَادَیَهُوْدُ هُوْدًا کے معنی توبہ کرنے کے ہیں۔ یَهُوْد نام کے اشتقاق میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ یہ هُوْد سے بنایا گیا ہے جس کے معنی توبہ کے ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ ہم تیری بارگاہ میں پلٹ آئے، یہ ابن جریج سے منقول ہے اور انھیں یہ نام اس لئے دیا گیا کہ انھوں نے بچھڑے کی پرستش سے توبہ کرلی تھی۔

کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یہوذا کی جانب منسوب ہیں جو جناب یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ عربی میں ذال کو دال سے بدل دیا گیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کو اسلام اور دین موسیٰؑ سے انحراف کرنے کے سبب یہود کہا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے اس نام کی وجہ یہ ہے یہ لوگ تورات کی تلاوت کے وقت ہلتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب اللہ نے جناب موسیٰؑ کو تورات عطا کی تھی تو اس وقت آسمان و زمین حرکت میں تھے۔ یہود اسم جمع ہے جس کا واحد یہودی ہے مانند زنجی و زنج، رومی و روم۔

نصاریٰ نصران کی جمع ہے عربوں کے قول کے مطابق سکران و سکاریٰ، ندمان و ندامیٰ کے مطابق۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے: نَصَارٰی کا واحد نصری ہے مانند مہری و مہاری۔ اس نام کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ نصاریٰ نَاصِرَہ قریہ سے ہے جہاں جناب عیسیٰؑ رہتے تھے چنانچہ نصاریٰ کی نسبت ناصرہ کی طرف دی گئی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے کی نصرت و مدد کرنے کے سبب یہ نام دیا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اس نام کی وجہ جناب عیسیٰؑ کا یہ ارشاد ہے: قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (سورۂ آل عمران، آیت ۵۲) (ان سے کہا کہ کون ہے جو خدا کی راہ میں میرا مددگار ہوگا؟ حواریون نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں)

صَابِئُوْن جمع ہے صابئی کی جو کسی دوسرے دین کی طرف منتقل ہو جائے اور ہر وہ انسان جو کسی دین پر ہو اس دین سے نکل جائے لغت میں اسے صابئی کہتے ہیں گویا صابئی کے معنی اس دین کو ترک

کرے جو اس کے لیے بطور شریعت (قانون الٰہی) قرار دیا گیا تھا۔ دوسرا دین اختیار کرنا ہے جس دین کو اس نے ترک کیا ہے وہ توحید الٰہی ترک کر کے ستارہ پرستی اختیار کرنا یا ستارہ کی تعظیم واحترام کرنا ہے۔ قتادہ نے بیان کیا ہے کہ یہ قوم (ستارہ پرست) مشہور ہے، یہ ان کا مذہب ہے جس میں وہ منفرد ہیں، ان کے دین میں ستارہ پرستی ہے۔ یہ لوگ خالق کائنات، قیامت اور بعض انبیاء کا اقرار کرتے ہیں۔ مجاھد و حسن نے بیان کیا ہے کہ الصابِئُون یہودیوں اور مجوسیوں میں بے دین افراد کو کہتے ہیں۔ یہ اہل کتاب کا ایک گروہ ہے، جو زبور کی تلاوت کرتے ہیں۔ خلیل نے بیان کیا ہے کہ وہ قوم ہے جس کا دین دین نصاریٰ سے مشابہ ہے مگر ان کا قبلہ جنوب کی جانب ہے، ان کا خیال ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کے دین پر ہیں جو موصل جزیرہ میں تھے۔ 'لا الٰہ الا اللہ' کہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اسی وجہ سے مشرکین پیغمبرؐ اور آپؐ کے اصحاب سے کہتے تھے وہ تمام صابِئُون ہیں، ان سے تشبیہ دیتے تھے۔

دیگر حضرات کا کہنا ہے کہ یہ اہل کتاب کا ایک گروہ ہے، تمام فقہاء ان سے ٹیکس وصولنا جائز قرار دیتے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک یہ جائز نہیں ہے چونکہ یہ لوگ اہل کتاب نہیں ہیں۔

ترکیب:

اِنَّ کی خبر جملہ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ہے؛ اس لئے کہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ ان میں سے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان لایا، مِنْهُمْ کا ذکر نہیں کیا ہے اس لئے کہ کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔

لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ مقام جزا میں ہے۔ لَا خَوْفٌ کو رفع دیا ہے اس لئے لَا کی تکرار ہوئی ہے جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

وَ مَا صَرَمْتُكِ حَتّٰى قُلْتِ مُعْلِنَةً ‏ ‏ لَا نَاقَةٌ لِّيْ فِيْ هٰذَا وَ لَا جَمَلُ

(میں نے تجھے الگ نہیں کیا جب تک تو نے علی الاعلان نہیں کہا کہ اس میں نہ میرے پاس کوئی اونٹنی ہے اور نہ کوئی اونٹ ہے)

یہ شعر گویا جواب ہے اس شخص کا جو یہ سوال کرتا ہے کہ: أَنَاقَةٌ لَكَ فِيْ هٰذَا أَمْ جَمَلٌ۔

ہاں اگر نکرہ مفردہ ہو تو اس میں صرف فتحہ ہوگا جیسے: لَا رَجُلَ فِي الدَّارِ اور یہ اس شخص کا جواب ہے جو یہ سوال کرتا ہے کہ: هَلْ مِنْ رَّجُلٍ فِي الدَّارِ، کیا گھر میں کوئی مرد ہے؟

خدا نے مَنۡ آمَنَ فرمایا ہے اور فعل مفرد لایا ہے پھر فرمایا ہے: فَلَهُمۡ أَجۡرُهُمۡ یہاں جمع کی ضمیریں لایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مَنۡ لفظ کے اعتبار سے واحد اور معنی کے لحاظ سے جمع ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

تفسیر:

قانونِ نجات

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ، ان مومنین کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون ہیں؟ ایک گروہ نے کہا ہے: یہ وہ افراد ہیں جو جناب عیسیٰؑ پر ایمان لائے پھر نہ تو انھوں نے یہودیت اختیار کی، نہ نصرانیت اور نہ ہی ستارہ پرست بنے اور انھوں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا انتظار کیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ طالب دین ہیں جن میں حبیب نجار وقُس بن ساعدہ وزید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل وبراء الشنی وابوذر غفاری وسلمان فارسی وبحیرا راہب اور نجاشی کا وفد ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے حضورؐ کی بعثت سے قبل ان میں بعض وہ ہیں جنھوں نے آپ کا زمانہ درک کیا اور آپؐ کی متابعت کی اور بعض نے آپ کا زمانہ درک نہیں کیا اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ گذشتہ امتوں کے اہل ایمان ہیں اور کہا گیا ہے اس امت کے مومنین ہیں۔ سُدی نے کہا ہے: وہ سلمان فارسی اور ان کے اصحاب نصاریٰ ہیں جن کی نصرت ان کے ہاتھوں کی جاتی تھی حضورؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے اور انھیں خبر دی گئی تھی کہ وہ عنقریب مبعوث ہوں گے اگر وہ انھیں درک کریں گے تو ان پر ایمان لائیں گے۔ اس قول میں اختلاف کیا گیا ہے۔

مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ، اس جملہ کے بارے میں اختلاف کیا ہے، ایک گروہ نے کہا ہے: یہ یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرستوں کے بارے میں خبر ہے۔ ضمیر تمام کی طرف پلٹ رہی ہے اس لیے کہ وہ ایمان لاکر مومن ہو گئے، ان کے لیے از سر نو ایمان کی شرط لگانے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ گویا کہا جا رہا ہے جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرستوں میں سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے ان کے لیے اجر ہے۔ دیگر نے کہا: ان میں سے جو ایمان لائے اس کی ضمیر تمام کی جانب پلٹ رہی ہے (ضمیر) صاحبان ایمان کی طرف پلٹے گی جس کے معنی یہ ہیں کہ جو اپنے ایمان میں ثابت ہیں انھوں نے تبدیلی کو ترک کر دیا ہے اسی طرح ضمیر کا یہود، نصاریٰ اور صابئین کی جانب پلٹنا جو پیغمبرؐ اور آپ جو کچھ لائے ہیں ان پر از سر نو ایمان لانا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور گذشتہ کتب پر ایمان کے بعد پیغمبرؐ پر

ایمان لائے اس لیے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا جس کی مثال اللہ کا یہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (سورۂ محمد، آیت ۲) (اور جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے اس پر بھی ایمان لائے ہیں)

ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: یہ آیت اللہ کے اس ارشاد سے منسوخ ہوگئی: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۸۵) (اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام ونامراد رہے گا)

یہ قول بعید ہے اس لیے کہ نسخ کا ایسی خبر پر داخل ہونا صحیح نہیں ہے جو وعدہ پر مشتمل ہو بلکہ نسخ کا احکام شرعیہ پر داخل ہونا صحیح ہوتا ہے جن میں مصلحت کے تغیر وتبدیلی کے ساتھ (حکم) کا تبدیل ہونا ممکن ہوتا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ اس قول کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔

ایک گروہ نے کہا ہے: (آیت) کا حکم ثابت ہے اس سے مراد منافقین، یہود ونصاریٰ اور ستارہ پرست ہیں جنہوں نے فقط زبان سے ایمان کا اقرار کیا اور دل سے ایمان قبول نہیں کیا۔ جب وہ نفاق کے بعد ایمان اور عناد ودشمنی کے بعد اسلام قبول کریں گے تو ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہوگا جس طرح وہ نفاق وعناد کے بغیر ایمان کی پہلی دعوت پر ایمان لائے ہوں مسلمانوں کا ایک گروہ کہتا تھا کہ جو نفاق اور عناد کے بعد اسلام لائے گا اس کا ثواب مختصر اور اجر قلیل ہوگا۔ اس آیت کریمہ کے ذریعہ خداوند عالم نے باخبر کیا ہے کہ دونوں اجر وثواب میں مساوی ہیں۔

ارشاد الٰہی: بِاللّٰهِ، یعنی اللہ کی توحید اس کے صفات اور عدل پر: وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یعنی روز قیامت، بعث ونشور اور جنت وجہنم پر، وَعَمِلَ صَالِحًا، اللہ نے جس چیز کا حکم دیا ہے اطاعت کے بارے میں اس پر عمل کرے ترک گناہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لیے کہ گناہوں کا ترک کرنا اعمال صالحہ ہیں۔ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ، ان کی جزا اور ثواب، عِنْدَ رَبِّهِمْ، ان کے پروردگار کے پاس موجود ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، اس کی تفسیر سابق میں گذر چکی ہے۔ اس کے معنی میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ پر انھیں حزن وملال نہیں ہے اور آئندہ کا خوف نہیں ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ انھیں عقبیٰ کا خوف نہیں ہوگا اور دنیا پر حزن نہیں ہوگا۔

اس آیت میں دلالت ہے کہ دل سے تصدیق اور اعتقاد کا نام ایمان ہے۔

خدا کا ارشاد: مَنۡ آمَنَ بِاللّٰہِ پر وعمل صالحاً کو عطف کیا ہے: وَعَمِلَ صَالِحاً جس نے عمل صالحاً کو تاکید یا فضل (اضافی) مانا ہے اس نے ظاہر کو ترک کر دیا اس لئے کہ پہلے جملہ میں معطوف کے داخل ہونے کے بعد دوسرے جملہ کو پہلے جملہ پر عطف کرنا ان آیات کے مانند ہے کہ: فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخۡلٌ وَّرُمَّانٌ (سورۂ رحمٰن، ۶۸) ان میں بکثرت پھل نیز کھجور اور انار کے درخت بھی ہوں گے۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ نُّوۡحٍ: جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا میثاق (عہد و پیان) لیا آپ سے اور نوح سے، یہ سب بر بنائے مجاز ہے اگر ظاہر سے ظاہر کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ دوم اول میں داخل نہیں ہے۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور کوہ طور کو تمھارے اوپر بلند کر دیا کہ جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا اور اس میں مندرج احکام کو یاد رکھنا ہو سکتا ہے اس طرح تم پرہیزگار بن جاؤ۔

الفاظ و معانی:

مِيۡثَاق وَثِيۡقَة سے مِفۡعَال کے وزن پر ہے یا قسم کے ذریعہ ہے یا عہد کے ذریعہ ہے یا معاہدہ ہے۔

طُوۡر لغت میں پہاڑ کے معنیٰ میں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے طور اس پہاڑ کا نام ہے جس پر موسیٰؑ نے اللہ سے مناجات کی تھی۔ یہ ابن عباس نے کہا ہے۔ قوت، قدرت وطاقت ہے جو کہ عَرَض (پیش کردہ چیز) ہے جس کے ذریعہ زندہ قدرت مند ہو جاتا ہے، ہر جسم قادر بس اتنی ہی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اپنا جسم ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔

اَلۡاَخۡذ (لینا) عطا کی ضد ہے۔

ترکیب:

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ محلاً منصوب ہے قُلْنَا لَکُمْ خُذُوْا کو فرض کرنے کی صورت میں جیسا کہ آپ کہتے ہیں: اَوْجَبْتُ عَلَیْهِ قُمْ؛ میں نے اس پر لازم قرار دیا ہے کہ کھڑے ہو یعنی اَوْجَبْتُ عَلَیْهِ فَقُلْتُ: قُمْ؛ میں نے اس پر لازم قرار دیا اور کہا: قُمْ۔

فراء نے کہا: اَخْذِ مِیْثَاق خود قول ہے کلام میں ضرورت نہیں ہے کہ قول کا پوشیدہ ہونا فرض کیا جائے، مگر یہ کہ مناسب ہے کہ وہ کلام جو قول کے معنیٰ میں ہے اگر اس میں کوئی ایسی چیز ہو جو قول کے مخالف ہو تو اس کے ساتھ اَنْ ہونا چاہئے جیسا کہ ارشاد الٰہی: اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ۔

نیز یہ کہا: اَنْ کو حذف کرنا جائز ہے۔ مَا یہاں پر محلاً منصوب ہے۔

تفسیر:

آیات الٰہی کو پوری طاقت سے پکڑو

اور کہا: وَاذْکُرُوْا اور یاد کرو وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ اس وقت کو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ اور عہد وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو خلق فرمایا ہے۔ جیسے توحید اور عدل اور ان کے لئے حجج واضحہ (روشن دلائل) اور براہین ساطعہ (واضح ثبوت) مقرر فرمائے ہیں جو اس بات کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں اور انبیاء و مرسلین کی صداقت کی وضاحت کر رہے ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو خداوند عالم نے اپنے رسولوں سے اس ارشاد میں لیا ہے: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَةٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ (سورہ آل عمران، آیت ۸۱) (اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا۔ ہم نے جو تمہیں کتاب و حکمت سے نوازا ہے اس کے بعد تمہارے پاس کوئی رسول اس کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ (یہ ارشاد فرما کر) اللہ نے پوچھا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس کی ذمہ داری کا عہد اٹھا لیا؟ انہوں نے

کہا: ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں)
بیان کیا گیا ہے کہ جناب موسیٰؑ سے توریت کا عہد لیا تھا۔ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ (اور ہم نے کوہ طور کو تم پر بلند کر دیا) ابوزید نے کہا ہے: یہ اس وقت ہوا جب جناب موسیٰؑ کوہ طور سے پلٹے اور توریت کی الواح اپنے ہمراہ لے کر آئے تو انھوں نے اپنی قوم سے کہا: میں تمہارے پاس الواح لے کر آیا ہوں۔ جس میں توریت اور حلال وحرام (کے احکام) ہیں اس پر عمل کرو۔ لوگ کہنے لگے آپ کی بات کون تسلیم کرے گا؟ خداوند عالم نے ملائکہ کو بھیجا یہاں تک کہ انھوں نے پہاڑ کو ان کے سروں پر بلند کر دیا۔ جناب موسیٰؑ نے ان سے کہا: اگر تم میری دی ہوئی چیز (توراۃ) کو قبول کرتے ہو (تو بہتر) ورنہ یہ ملائکہ پہاڑ کو تمہارے اوپر سے چھوڑ دیں گے۔ انھوں نے توریت لے لی اور اللہ کا سجدہ کرنے لگے (دوران سجدہ) پہاڑ کو بھی دیکھ رہے تھے۔ یہی سبب ہے کہ یہودی اپنے چہرے کے ایک رخ سے سجدہ کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ عہد لینے کے یہی معنی ہیں (یہ واقعہ) ان کے اوپر پہاڑ بلند ہونے کے وقت کا ہے۔ اسی حالت میں ان سے کہا گیا: خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ، ہم نے جو توریت، دی ہے اسے پکڑ لو بِقُوَّةٍ، محکم یقین کے ساتھ جس میں کسی قسم کا شک نہ ہو۔ یہ ابن عباس قتادہ اور سُدی کا قول ہے۔ اسی سے نزدیک وہ قول ہے جس کی روایت عیاشی نے کی ہے (وہ کہتے ہیں کہ) امام صادق علیہ السلام سے اس ارشاد الٰہی: خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ، کے بارے میں سوال کیا گیا کہ جسمانی قوت وطاقت مراد ہے یا قلوب کی طاقت؟ تو امامؑ نے فرمایا: دونوں مراد ہیں۔ کہا گیا ہے (توراۃ) کا قوت کے ساتھ لینا عزم ویقین کے ساتھ اس پر عمل کرنا ہے اور کہا گیا ہے کہ قدرت کے ساتھ اور تم اس کے حاصل کرنے پر قادر رہو۔ یہ قول ابوعلی اور اصم سے مروی ہے۔ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ، فِيۡهِ کی ضمیر مَاۤ اٰتَيۡنَاكُمۡ میں 'مَا' کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی توراۃ ہے۔ جو کچھ توراۃ میں حلال وحرام موجود ہے اس کی حفاظت کرو، اسے فراموش نہ کرو۔

بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی ہیں جسکے ترک کرنے پر عذاب ہے اسے یاد رکھو اور یہ امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں جو کچھ موجود ہے اس پر عمل کرو اسے ترک نہ کرو۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں: ہم نے جو تمھیں عطا کیا ہے اس میں وعدو وعید اور ترغیب وخوف

ہے۔ اس میں غور و فکر کرو، اس سے نصیحت حاصل کرو اور اسے قبول کرو۔ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ، تا کہ تم اس کے بجالانے پر مجھ سے ڈرتے رہو۔ جب تم اسے انجام دو گے تو میرے عذاب سے ڈرو گے۔ میری اطاعت و فرمانبرداری کرو گے اور معصیت و نافرمانی سے پرہیز کرو گے۔

ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿٦٤﴾
مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے۔ (اس کے باوجود) اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔

الفاظ و معانی:

تَوَلَّيۡتُمۡ کے معنی ہیں: تم نے اعراض و انحراف کیا۔ عرب وَلَّاهُ فُلَانٌ دُبُرَهٗ اس وقت کہتے ہیں جب کسی سے پیٹھ پھیری جائے اور اسے اپنی پشت کے پیچھے قرار دیا جائے پھر اس کا استعمال ہر حکم کرنے والے کی اطاعت کو ترک کرنے میں کیا جانے لگا اور کسی سے روگردانی کرنے کو تَوَلّٰی فُلَانٌ عَنۡ طَاعَةِ فُلَانٍ وَ تَوَلّٰی عَنۡ صَدَاقَتِهٖ، یعنی فلاں نے فلاں کی اطاعت سے روگردانی کی جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا اٰتَاهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَ تَوَلَّوۡا، یعنی انھوں نے اللہ سے اپنے اس قول کے ذریعہ کیے گئے وعدہ کی مخالفت کی کہ "ہم ضرور تصدیق کریں گے اور صالحین میں سے ہو جائیں گے"

خَاسِر وہ شخص ہے جس کا رأس مال (اصل پونجی) برباد ہو جائے۔ انسان کا رأس مال اس کا نفس ہے اس کے علاوہ اسے منافع میں سے جو کچھ بھی حاصل ہو جائے وہ ربح (فائدہ) ہے۔

تفسیر:

اگر فضل خدا نہ ہوتا۔۔۔

اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ پھر تم نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اس سے روگردانی کی جو ہم نے تم سے تمہارے پیمانوں کے بعد لیا تھا۔ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ، اگر اللہ نے تمہارے عہد و پیمان کے توڑنے کے بعد جس کا تم نے وثوق و اطمینان دلایا تھا توبہ کے سبب تم پر اپنا فضل نہ کیا ہوتا جب تم پر طور کو بلند کیا،

تم پر اسلام اور اس کی رحمت عطا کی جس رحمت کے ذریعہ تمھاری خطاؤں سے درگذر کیا، تمہارے اپنے پروردگار کی جانب مراجعت کے سبب۔ لَكُنتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ، (توتم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے) ابو العالیہ نے بیان کیا ہے: اللہ کا فضل ایمان اور اس کی رحمت قرآن ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم تمھیں بیان لانے پر قدرت عطا نہ کرتے اور راہ ایمان کی رکاوٹوں کو دور نہ کرتے کہ تم ایمان لے آئے تو تمھارا شمار نقصان اٹھانے والوں میں ہوتا۔ ایمان کو فضل ورحمت قرار دیا ہے جسکے سبب انھوں نے نجات حاصل کی ہے، اس کے سبب نقصان اٹھانے والوں میں شامل نہیں ہوتے ہیں کہ یہ فضل ہی انھیں اس کی جانب دعوت دینے والا، اسے قدرت عطا کرنے والا اور اس میں رغبت پیدا کرانے والا ہے۔

ممکن ہے اس کے معنی یہ ہوں کہ اللہ کی اطاعت سے روگردانی کرنے کے بعد اگر میں سے بعض لوگوں کے اللہ کی جانب پلٹنے اور خدا کے ان کی توبہ قبول کرنے کے بعد تمھیں مہلت دے کر تم پر خدا کا فضل نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔ ممکن ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تمھیں توبہ کی توفیق عطا کرنے اور تمھارے ساتھ لطف ومہربانی کی خاطر تمھارے سروں پر پہاڑ کو بلند کرنے میں میرا افضل تم پر نہ ہوتا یہاں تک کہ عذاب ٹل گیا اور پہاڑ کرنے سے بچ گیا، تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾

تم اپنی قوم کے ان لوگوں کے بارے میں تو جانتے ہی ہو جنھوں نے سبت کا قانون توڑا تھا، تو ہم نے انھیں حکم دیا ''تم ذلیل وخوار بندر بن جاؤ۔''

الفاظ ومعانی:

عَلِمْتُمْ کے معنی ہیں: تم نے پہچان لیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (سورۂ انفال/۶۰) اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں پہچانتے مگر اللہ انہیں پہچانتا ہے۔

وَاعْتَدَوْا یعنی انہوں نے ظلم ڈھایا اور اپنی حد سے تجاوز کیا۔

سبت۔ ہفتہ، سنیچر۔ ہفتہ کے دنوں میں سے ایک دن۔ ہفتہ کے دن ہر شئے کو خلق کیا گیا۔ بعض علماء نے کہا کہ اس دن کو سبت اس لئے کہا جاتا ہے: اَلْیَہُوْدُ یَسْتَبُوْنَ فِیْہِ کہ یہودی اس دن سبت سے کام لیتے ہیں یعنی اس دن کوئی کام انجام نہیں دیتے۔ اسے سبت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں راحت وسکون ہے۔

اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا (سورۂ نبا، آیت ۹) اور ہم نے تمہاری نیند کو سکون کا ذریعہ بنایا اور نَائِم یعنی سونے والے کو مَسْبُوْت کہتے ہیں اس کی استراحت اور جسم کے پرسکون ہونے کی وجہ سے۔

قِرَدَۃ قِرْد کی جمع ہے بندر اور بندریا کو قِرْدَۃ کہتے ہیں۔

اَلْخَاسِی کے معنی ہیں دور کیا ہوا، دھتکارا ہوا۔

تفسیر:

روز شنبہ کے نافرمان

خداوند عالم نے یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ، تم نے پہچان لیا، اَلَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ فِی السَّبْتِ (ان لوگوں کو جنھوں نے سبت کا قانون توڑا تھا) یعنی جنہوں نے تجاوز کیا شنبہ کے دن شکار نہ کرنے کے حکم کی مخالفت کی۔ مچھلیاں ہفتہ کے روز امن کی بنا پر جمع ہو جاتی تھیں اور بنی اسرائیل جنھیں وہ ہفتہ کے روز روک لیتے اور یکشنبہ کو انہیں پکڑ لیتے تھے۔ انھوں نے ہفتہ سے (متعلق حکم میں) سرکشی کی، ظلم کیا اور مقررہ حد سے تجاوز کیا اس لیے کہ ان کا شکار کرنا انھیں مقید کرنا ہے۔ حسن سے روایت کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل نے ہفتہ کے روز حلال سمجھتے ہوئے شکار کیا جب کہ انھیں اس کی نہی کی گئی تھی۔ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً. (تو ہم نے انھیں حکم دیا کہ ذلیل وخوار بندر بن جاؤ) یہ فعل کو بہت جلد انجام دینے اور انھیں مسخ کرنے سے متعلق خبر ہے۔ یہاں پر امر ہے جسکے معنی ہیں ہم نے انھیں بندر بنا دیا۔ یہ اس ارشاد الٰہی کے مانند ہے: ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ۔ (سورۂ فصلت، آیت ۱۱) (پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت دھواں تھا تو اس نے اسے اور زمین کو حکم دیا کہ خوشی خوشی یا بکراہت ہماری طرف آؤ ان دونوں نے کہا: ہم فرماں بردار بن کر

تیرے حضور آ گئے)

اس مقام پر یہ قول نہیں ہے بلکہ فعل کے بآسانی انجام پانے اور اس کی مشقت و دشواری کے بغیر تکوین (قرار پانے) کی خبر دی گئی ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے: اللہ نے انھیں عذاب کر کے مسخ کر دیا وہ آواز نکال رہے تھے، تین روز تک زندہ رہے، نہ کھا سکتے تھے، نہ پی سکتے تھے، نہ ہی افزائش نسل کر سکتے تھے۔ پھر خداوند عالم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ ان پر تیز آندھی چلی جس نے انھیں پانی میں پھینک دیا۔ خدا نے جس امت کو بھی مسخ کیا اسے ہلاک کر ڈالا۔ موجودہ بندر اور خنزیر اس مسخ شدہ بندروں کی نسل سے نہیں ہیں البتہ بنی اسرائیل کو ان کی صورت میں مسخ کیا گیا تھا۔

اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے کہ بندروں اور خنزیروں میں سے جناب آدمؑ کی اولاد نہیں ہیں اور اگر مسخ شدہ (بندروں اور خنزیروں) سے ہوتے تو وہ بھی فرزندان آدم ہوتے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ بندروں کی شکل میں مسخ نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ ایک مثال ہے جسے اللہ نے پیش کیا ہے جس طرح ارشاد ہوتا ہے: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَاراً۔ اسی طرح ان کی بھی حکایت کی گئی ہے کہ ان کے قلوب مسخ کئے گئے تھے۔ ان کے قلوب کو بندروں کے قلوب کے مانند کر دیا تھا؛ نہ تو وہ وعظ و نصیحت قبول کر پا رہے تھے نہ ہی نہی اور مخالفت سے پرہیز کر رہے تھے۔

یہ دونوں اقوال اس ظاہر کے خلاف ہیں کہ جس پر بیشتر مفسرین کی رائے ہے بغیر اس ضرورت کے جو اس کی جانب دعوت دے: خَاسِئِينَ، یعنی خیر سے دور کئے جانے والے۔ کہا گیا ہے کہ ذلت و رسوائی مردود حالت میں۔ یہ روایت مجاہد سے منقول ہے۔ ان آیات میں اللہ کی جانب سے یہودیوں پر ان کے آباء واجداد پر مسلسل نعمتوں کے نازل کرنے اور رسول سے اللہ سے متعلق خبر دینے اور ان کے بزرگوں کی مسلسل دشمنی کرنے، روشن آیات اور واضح معجزات کے باوجود ان کے کفران نعمت اور گناہ کرنے پر حجتیں اور دلائل ہیں۔ ان چیزوں کے ذریعہ پیغمبرؐ کے قلب کی تثبیت کی جا رہی ہے اور انھیں دلاسا دیا جا رہا ہے ان مصیبتوں پر کہ آپ بنی اسرائیل سے سہہ رہے تھے اور ان کے مکر و فریب ان کے انکار، کفر اور عناد و دشمنی سے اظہار بیزاری ہے تا کہ حضور کا قیام و ثبات قدم ان کے بزرگوں کے مقابلہ میں ان کے لیے حجت ہے، ان کے خواہشات والحاد میں ہمیشہ مبتلا ہونے میں اور ان کے لیے تحذیر (خوف زدہ کرنا) ہو کہ ان کے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو ان کے آباء واجداد کے ساتھ کیا گیا۔

❀❀❀❀❀

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

اس طرح ہم نے ان کے انجام کو اس زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے سامان عبرت اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

الفاظ و معانی:

اَلنَّكَال کے معنی ہیں کسی اور کو خوفزدہ کرنا اور اس کے لغوی معنیٰ منع کرنے اور روکنے کے ہیں اس لئے کہ یہ نَكَل سے مشتق ہے اور اس کے معنیٰ قید کرنے کے ہیں اور وہ لِجَام یعنی لگام بھی ہے۔ سزا کو نَكَال کہا جاتا ہے اس لئے کہ یہ روک دیتا ہے اس چیز کے ارتکاب کرنے سے جسے ان لوگوں نے انجام دیا تھا جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اور مَوْعِظَة وعظ و نصیحت ہے اور اس کے لغوی معنیٰ ڈرانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: وَعَظْتُ فُلَانًا مَوْعِظَةً وَعِظَةً میں نے فلاں کو وعظ کیا، موعظت و نصیحت۔

تفسیر:

متقین کے لئے موعظہ

فَجَعَلْنٰهَا (ہم نے انھیں قرار دیا) ضمیر هَا اس قوم کی جانب پلٹ رہی ہے جو مسخ کر دی گئی تھی جو ایلہ قریہ کے باشندے تھے۔ یہ قریہ دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ اس کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے یا تو مسخ کی جانب پلٹ رہی ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے۔ یا قریۃ کی جانب پلٹ رہی ہے جس کے باشندوں نے وہاں پر سرکشی کی تھی۔ نَكَالًا یعنی عذاب۔ کہا گیا ہے کہ شہرت یا رسوائی۔ کہا گیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یاددہانی اور عبرت قرار دیا۔

ارشاد ہوتا ہے: لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا، اس میں متعدد وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: ابن عباس اور ضحاک نے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ان امتوں کے لئے جو ان کے دور میں موجود تھیں اور جو ان کے بعد آئیں اور جو ان کے بعد آتی رہیں گی۔ یہ اس روایت سے نزدیک ہے جو

امام باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے کہ آپ حضرات نے فرمایا: لما بین یدیہا یعنی ان لوگوں کے لئے جو ان کے ساتھ تھے اور دیکھ رہے تھے۔ وما خلفها یعنی ہم ہیں اور اس میں ہمارے لئے موعظہ اور پند و نصیحت ہے۔ اس طرح ''ما'' ''مَن'' کے معنی میں ہے، یعنی یہ سامان عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو ان کے ساتھ تھے اور تا قیامت آتے رہیں گے تا کہ وہ ایسے کام نہ کریں جو انھوں نے انجام دیئے تھے۔

دوم: مراد یہ ہے کہ ہم نے اسے ان کے گذشتہ گناہوں کے لیے عذاب قرار دیا اور بعد کے گناہوں کے لیے جو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ ان کے ساتھ عذاب میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ یہ روایت ابن عباس سے منقول ہے۔ اس طرح لام سبب کے معنی میں ہوگا یعنی اس کے سبب سے۔

سوم: لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا، سے قریہ اور اس کے بعد کے قریہ مراد ہوں۔ یہ روایت عکرمہ سے مروی ہے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے۔

چہارم: لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا، سے ان کی گذشتہ اور بعد والی خطائیں مراد ہیں۔ جن کے سبب انھیں ہلاک کیا گیا۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ اس کے معنی ہیں کہ اس سے متقین وعظ و نصیحت حاصل کرتے ہیں گویا یہ ان کے لیے موعظہ ہے دوسروں کے لیے نہیں۔ یہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو گذشتہ اور ان کے بعد والوں کی طرح افعال انجام دے گا انہی کے مانند تغیر خلقت کی طرح عذاب کا حق دار ہوگا اگر یہ ان سب کے لئے نکال ہے اور یہ صاحبان تقویٰ کے لئے خوف دلانا ڈرانا ہے تو اس لئے کہ وہ ان لوگوں کے مانند گناہ انجام نہ دیں ورنہ انھیں کے مانند عذاب کے مستحق ہوں گے۔ ہم اللہ سے اس کی نافرمانی سے پناہ مانگتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾

پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ موسیٰ نے کہا میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں (٦٧) انھوں نے کہا آپ اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں گائے کی ماہیت بتائے، موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے ایسی گائے چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اس کے درمیان اوسط عمر کی ہو اب تمھیں جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرو۔ (٦٨) وہ کہنے لگے اپنے رب سے پوچھیے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہو اس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہو۔ (٦٩) وہ کہنے لگے اے موسیٰ اپنے رب سے وضاحت طلب کریں کہ کیسی گائے چاہیے؟ کیوں کہ اس کی شناخت میں ہمیں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب ہم اس گائے کو تلاش کر لیں گے۔ (٧٠) موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے نہ خدمت لی جاتی ہے، نہ وہ زمین جوتتی ہے اور نہ ہی کھیتوں کو سیراب کرتی ہے، صحیح و سالم اور بے داغ ہے، وہ لوگ کہنے لگے اب آپ نے ٹھیک ٹھیک پہچان بتائی ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کر دیا حالانکہ وہ ایسا کرنے والے نہیں تھے۔

قرائت:

حمزہ نے اور اسماعیل نے نافع سے اور عباس نے ابو عمرو سے پورے قرآن میں ھُزْءًا اور کُفْوًا کی قرأت کی ہے۔

حفص نے عاصم سے زاء اور فاء کے ضمہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یعقوب نے ھُزُوًا کی زاء کو ضمہ کے ساتھ، کُفْوًا کو فاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بقیہ قراء نے زاء اور فاء کو ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ (ھُزُءًا اور کُفُؤًا) پڑھا ہے۔

حجت:

ابو الحسن نے کہا: عیسیٰ نے گمان کیا ہے کہ ہر وہ اسم جو تین حرفی ہو اس کا پہلا حرف مضموم ہو تو عربوں میں سے کچھ لوگ اس کے حرف دوم کو بھی ضمہ دے دیتے ہیں اور کچھ لوگ اسے ساکن رکھتے ہیں: جیسے عُسُر، یُسُر، حُلُم ۔۔۔ اس حکایت کو قوی بنانے والی بات یہ ہے کہ جو جمع فُعُل کے وزن پر ہوتی ہے جیسے کُتُب اور رُسُل تو اس میں دو صورتیں جاری ہیں یہاں تک کہ معتل العین واوی میں بھی آیا ہے جیسے سُوُك۔ اخطل نے کہا:

وَفِي الْأَكُفِّ اللَّامِعَاتِ سُوُر

ابو زید نے قُوُل اور قُوُم کی حکایت کی ہے لیکن اَفْعَل کی جمع فُعْل جیسے اَحْمَر کی جمع حُمْر میں تو گویا اس میں سکون کو لازم قرار دیا ہے تا کہ دو جمع کے درمیان فاصلہ ڈالا جائے۔ شعر میں اس میں حرکت بھی آتی ہے جب صورت حال یہ ہے تو واجب ہے کہ کُفو اور ھُزء میں بھی یہی قاعدہ جاری رہے، جب ہمزہ کو خفیف بنا دیا اور عین الفعل کو ضمہ دے دیا تو لازم ہے کہ ہمزہ کو واؤ سے بدل دیا جائے اور ھُزُوًا اور لَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ پڑھا جائے۔ اگر کوئی ہمزہ کو خفیف کرے اور عین الفعل کو ساکن کر کے ھُزْوًا کر دے تو واؤ جو کہ ہمزہ سے بدل کر آیا ہے اسے باقی رکھے اس لئے کہ اس کا ماقبل مضموم ہے اور اگر لفظ میں عین الفعل مضموم نہ ہو تو اس لئے کہ معنی میں وہی مراد ہے جیسا کہ عربوں نے کہا ہے: لَقَضُو الرَّجُل۔ انہوں نے واؤ کو باقی رکھا ہے اور لام الفعل جو کہ یاء تھا اسے قَضِيْتُ سے پلٹا یا نہیں ہے؛ اس لئے کہ معنی میں ضمہ مراد ہے اسی طرح عربوں نے کہا ہے: رَضِيَ زَيد ان کے بارے میں جنہوں نے عَلِمَ زَيد کہا ہے انہوں نے بھی واؤ جو کہ لام الفعل تھا

اسے پلٹایا نہیں ہے اس لئے کہ کسرہ زائل ہو گیا ہے وجہ یہ ہے کہ وہ مقدر اور مراد ہے اگرچہ ظاہر میں محذوف ہے اسی طرح آپ هُزُوًا اور كُفُوًا کہتے ہیں واؤ کو باقی رکھتے ہیں اگرچہ ضمہ کو حذف کرتے ہیں جو اختلاف کا سبب بنتا ہے جب صورت حال یہ ہے تو اس شخص کی قرائت کہ جس نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جواز و حسن میں ہمزہ کو باقی رکھا ہے اس شخص کی قرائت کے مانند ہے جس نے ساکن کر کے ہمزہ کو واؤ سے بدل کر رکھا ہے انہوں نے تخفیف (ساکن کرنے) و تثقیل (ضمہ دینے) کے درمیان اختیار دیا ہے۔

الفاظ و معانی:

بَقَرۃ (گائے) اس جنس کی مادہ کا نام ہے جس کے نر کا نام ثُور (بیل) ہے۔ بَقْر کے اصلی معنیٰ شق کرنا ہیں اور بقر کو بقر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کا کام ہل کے ذریعے زمین کو شگافتہ کرنا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: بَقَرْتُ بَطْنَهٗ اَیْ شَقَقْتُهٗ، میں نے اس کے شکم کو شق کر دیا۔

هُزْءٌ، اَللَّعِب، السُّخْرِیة مشابہ ہیں۔ هُزْء کے معنی کھیل کود اور مذاق اڑانا ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے معنیٰ ہیں: میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اَلْعِیَاذُ کے لغوی معنیٰ یہ ہیں کہ جس کے شر سے خوف ہو اس سے اس چیز کے ذریعہ طلب دفاع کرنا ہے جس سے دفاع کی امید ہو۔

جَھْل علم کی ضد ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حِلم کی ضد ہے۔ صحیح یہ ہے کہ موجودہ چیز کے برخلاف اعتقاد رکھنا جہل ہے۔ یعنی جیسا مانتا ہو اس کے برخلاف ماننا جہل ہے۔

تَبْیِیْن کے معنی تعریف کے ہیں۔ اس کی اصل بَیْن ہے، یہ فراق وجدائی ہے جو کسی چیز کو بیان کرتا ہے وہ اس کے اشتباہ کو واضح کرتا ہے یہاں تک کہ دوسرا شخص (مخاطب) اسے جان پہچان لیتا ہے۔

فَارِض بڑی اور سن رسیدہ کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے: فَارِض (وہ مادہ) ہے جس نے کئی مرتبہ بچے دیئے ہوں جس کے باعث اس کا شکم کشادہ ہو گیا ہو چونکہ لغت میں الفارض کے معنی وسیع اور موٹے جسم والے کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا جبڑا بڑا ہو۔

بِکْر اس چھوٹی گائے (بچھیا) کو کہتے ہیں جس پر بوجھ نہ لادا جا سکتا ہو۔ انسانوں اور جانوروں میں بِکْر اسے کہتے ہیں جس پر اس کا نر جفتی نہ کرتا ہو۔ ہر چیز کا بِکْر اس کا پہلا ہے۔ بکر وہ جانور ہے جو کسی ایک (بچہ) کو پیدا کرے بِکْر اس کی پہلی اولاد ہے۔ ابن عائشہ نے اپنے والد کے واسطہ سے اپنے جد کے ذریعہ

اس طرح روایت کی ہے: كَانَتْ ضَرَبَاتُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَبْكَارًا، (علی ابن ابی طالب کی ضربیں (دشمن پر) تو بنو ہوتی تھیں)

ابن فارس نے معجم اللغۃ میں بیان کیا ہے: بَكْر (بَ کے فتح کے ساتھ) جوان اونٹ ہے اور عوان بوڑھی سے کم اونٹنی اور چھوٹی سے زیادہ ہے جو ایک بطن بچہ دے یا دو بطن۔

ذبح کے معنی گردن کی رگوں کو منقطع کرنا ہے۔ یہ گائے اور بھیڑ میں کیا جاتا ہے۔ اونٹ کو نحر کیا جاتا ہے۔ اونٹ کا ذبح کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا گیا: اہل مکہ گائے کو مقام نحر سے ذبح کرتے ہیں، اس کا گوشت کھانے میں آپؑ کی کیا رائے ہے؟ ذرا دیر آپؑ خاموش ہوئے پھر فرمایا: خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ، پھر انھوں نے اسے ذبح کیا حالانکہ وہ ایسا کرنے والے نہ تھے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: تم اس جانور کا گوشت نہ کھاؤ مگر جسے صحیح طور پر ذبح کیا گیا ہو یعنی مقامِ ذبح سے ذبح کیا جائے۔

ترکیب:

قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا سے فاء کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ اس سے پہلے کا کلام ذکر فاء سے بے نیاز ہے۔

أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً پر وقف کرنا بہتر ہے جیسا کہ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا میں اسقاط بہتر ہے۔ فَقَالُوا نہیں کہا ہے اگر فاء کے ساتھ کہا جاتا ہے تو بہتر تھا۔ اعراب آپ یہ کہیں: قُمْتُ فَفَعَلْتُ تو فاء کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں تھا اس لئے کہ وہ عطف ہے استفہام نہیں ہے کہ اس پر سکوت صحیح ہو۔

هُزُوًا دو صورتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہے:

(١) مضاف محذوف ہو اس لئے کہ هُزُء حدث ہے تَتَّخِذُ کا مفعول ثانی مفعول اول ہوگا جیسے یہ ارشاد الٰہی: لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ۔

(٢) هُزُو مَهْزُوءٌ بِهِ کے معنیٰ میں (جس کا مذاق اڑایا جائے) جیسا کہ لفظ صَيْد اس آیہ کریمہ میں أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وغیرہ میں ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ رَجُلٌ رِضًى یعنی رَجُلٌ مَرْضِيٌّ وہ آدمی

کہ جس سے لوگ راضی ہوں یعنی مصدر مفعول کا قائم مقام بن گیا ہے۔

لیکن یہ ارشاد الٰہی ہے کہ: لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا

اس میں کسی محذوف شے کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ دین کوئی عینی اور خارج میں موجود شے نہیں ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اس کی اصل اَعْوُذُ تھی ضمہ کو واؤ سے منتقل کر کے ساکن یعنی عین کو دے دیا گیا ہے چونکہ اس کے ماضی کے عین الفعل کے متحرک ہونے اور ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے اس میں اعلال ہو گیا تھا لہٰذا مضارع کے عین الفعل میں بھی اعلال کر دیا گیا ہے تا کہ باب ایک طریقہ پر چلے یہی قول اَعَاذَ يُعِيْذُ اور اِسْتَعَاذَ يَسْتَعِيْذُ کے سلسلہ میں بھی ہے اصل اَعْوَذَ يُعْوِذُ اِسْتَعْوَذَ يَسْتَعْوِذُ ہے۔

لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ، اخفش نے کہا: مرفوع ہے منصوب نہیں ہے، جیسا کہ منفی منصوب ہوتا ہے اس لئے کہ یہ بَقَرَةٌ کی صفت ہے عَوَانٌ مرفوع ہے اس لئے کہ وہ مبتدأ محذوف کی خبر ہے۔ گویا اس طرح فرمایا ہے: هِيَ عَوَانٌ۔ زجاج نے کہا: فَارِضٌ هِيَ کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یعنی هِيَ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ۔

بَيْنَ ذٰلِكَ کہنا جائز ہے اور بَيْنَ دو یا دو سے زیادہ کے درمیان ہوتا ہے اس لئے کہ وہ جمل کا قائم مقام ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ظَنَنْتُ زَيْدًا قَائِمًا قائل یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کا گمان کیا اور میں نے اس کا گمان کیا، ابوعلی نے کہا: عربوں نے ظَنَنْتُ ذٰلِكَ کہا ہے تو وہ اس بات سے خالی نہیں ہے کہ ذٰلِكَ مصدر کی طرف اشارہ ہے اور جملہ کا نائب ہے جیسا کہ ابوالاسحاق نے کہا ہے اور دو مفعول میں سے ایک کی جانب اشارہ نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو دوسرے مفعول کا ذکر کرنا بھی لازم ہوتا ہے جیسا کہ اگر آپ اسم مشار الیہ کا ذکر کریں تو ذٰلِكَ کا ذکر کرنا لازم ہوتا۔ جس طرح جب آپ مبتدا کا تذکرہ کریں تو خبر کا ذکر کرنا بھی لازم ہے۔ یا پھر حال سے معلوم ہو کہ اس کا ذکر کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔

یہاں ذٰلِكَ جملہ کا نائب نہیں ہوسکتا اور نہ ہی جملہ کی جانب اشارہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح یہاں کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی جملہ کا نائب نہیں ہوسکتا ہے۔ ان مقامات پر جہاں جملہ اَلَّذِيْ کے صلہ کے مانند واقع ہو اور نکرہ کی صفت ہو۔ پس یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کے کلام ظَنَنْتُ ذٰلِكَ مصدر کی جانب اشارہ ہے اور وہ ظَنٌّ ہے اسم مفرد جملہ کی جگہ واقع نہیں ہوسکتا ہے اگر جائز ہوتا کہ وہ جملہ کا نائب واقع ہو تب بھی یہاں پر واقع

ہونا جائز نہیں تھا اس لئے کہ یہ مقام جملوں کے ان مقامات میں سے نہیں ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ذٰلِكَ اشارہ ہے ان چیزوں کی جانب جو گذر چکی ہے جن پر ارشاد الٰہی: لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ دلالت کر رہا ہے اور وہ بکارت و فروض ہے۔ ذٰلِكَ انہیں دونوں پر دلالت کر رہا ہے اور اگر ذٰلِكَ جملہ کا قائم مقام ہوتا تو ان دونوں پر دلالت نہ کرتا ہے اس لئے کہ جملہ میں حدث (فعل) کی نسبت محدث عنہ (فاعل) کی جانب دی جاتی ہے اور بکارت و فروض میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کی جانب مسند نہیں ہے کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ مراد ان دونوں صفتوں کے درمیان ہے اور یہ واضح وعیاں بات ہے۔

جان لیجئے کہ وہ اسم کہ مَنْ جس کی جانب مضاف ہے وہ ان باتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہے:

(ا) یا تو وہ واحد پر دلالت کر رہا ہے یا ایک سے زیادہ پر اگر وہ ایک پر دلالت کر رہا ہے تو ایک سے زیادہ پر دلالت نہیں کر رہا ہے کہ اس پر کوئی دوسرا اسم عطف ہو اس لئے کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کی اصل افتراق و جدائی ہے جس طرح زید کے افتراق اور اجتماع کی بات نہیں کی جاسکتی ہے کہ آپ اس کی جانب ایک ایسی چیز کو مضاف کریں کہ جو ایک سے زیادہ ہو اسی لئے کہ آپ بَيْنَ زَيْدٍ نہیں کہہ سکتے ہیں جب تک واوٴ عاطفہ نہ کہ دوسرے حروف عاطفہ کے ذریعہ اس کی جانب کسی دوسرے کو مضاف نہ کریں۔

اگر اسم کثرت پر دلالت کرنے والا ہے اگر چہ وہ مفرد ہو تو بَيْنَ کو اس کی جانب مضاف کرنا جائز ہے۔

عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ اس میں بَيْنَ کو ذٰلِكَ کی جانب مضاف کیا گیا ہے اس لحاظ سے بین کا قوم اور اس جیسے دیگر اسماء جو کہ کثرت پر دلالت کرتے ہیں ان کی جانب مضاف ہونا صحیح ہے۔

ممکن ہے کہ ہمارا ذٰلِكَ کہنا اس سے ایک بار انفراد اور ایک بار جمع اور کثرت مراد ہو اس لئے کہ وہ موصولہ جیسے اَلَّذِیْ اور مَا سے مشابہ ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں بات (اشارہ اور موصولہ) اس بات میں مشابہ ہیں کہ دونوں بعینہ کسی چیز پر دلالت نہیں کرتے ہیں پس اس کے کبھی ایک اور کبھی آپ سے زیادہ مراد لے سکتے ہیں اور ہم نے جو بیان کیا ہے کہ ذٰلِكَ سے جمع اور ایک سے زیادہ کا ارادہ کرتے ہیں اس پر دلیل یہ ہے کہ روبہ سے ابوعبیدہ نے شعر میں کہا:

فِيْهِ خُطُوْطٌ مِنْ سَوَادٍ وَّ بَلَقْ   كَاَنَّهٗ فِي الْجِلْدِ تَوْلِيْعُ الْبَهَقْ

اگر خطوط کا ارادہ کیا تو لازم ہے کہ كَأَنَّهَا کہئے۔ تو انہوں نے کہا: میں نے ارادہ کیا وہی تھا پس معلوم ہوا کہ عرب ذٰلِكَ سے غیر مفرد کا ارادہ کرتے ہیں اور اس پر شاعر کا یہ شعر بھی دلالت کرتا ہے:

إِنَّ لِلْخَيْرِ وَلِلشَّرِّ مَدًى وَكِلَا ذٰلِكَ وَجْهٌ وَّقَبَلٌ

آپ مشاہدہ کرتے ہیں کہ كِلَا مفرد کی جانب مضاف نہیں ہوتا ہے اگر ذٰلِكَ سے غیر مفرد مراد نہ ہوتا تو پھر كِلَا ذٰلِكَ کی جانب مضاف نہ ہوتا یہی قول عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ کے بارے میں بھی ہے۔ ذٰلِكَ سے مراد ایک سے زیادہ ہے اور یہ اشارہ ہے کہ اس چیز کی طرف جو گذر چکی ہے اور وہ اس کا قول ہے جو فروض و بکارت پر دلالت کرتا ہے۔

مَا هِيَ اور مَا لَوْنُهَا میں مَا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ مبتدا کی خبر ہے اس لئے کہ اس کی تاویل استفہام ہے یعنی اَيُّ شَيْءٍ هُوَ وَ اَيُّ لَوْنٍ لَوْنُهَا۔

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا قول کے بعد إِنَّ ہمیشہ مکسور واقع ہوتا ہے گویا آپ نے صدر کلام میں قول کا ذکر نہیں کیا ہے کلام عرب میں قُلْتُ واقع ہوتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ ایسے کلام کی حکایت کی جائے تو إِنَّ کے داخل ہونے سے پہلے بذات خود قائم تھا۔ پس قُلْتُ کے ذکر کے ساتھ اسی لفظ کو ادا کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں: قُلْتُ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ بھی صحیح ہے کہ جب آپ اس کی حکایت کریں گے تو کہیں گے: قُلْتُ إِنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ۔

عرب کے کچھ لوگ اور وہ بنو سلیم ہیں جو باب قُلْتُ کو باب ظَنَنْتُ جیسا قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں: قُلْتُ زَيْدًا مُنْطَلِقاً۔

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا: لَوْنُهَا مرفوع ہے اس لئے کہ فَاقِعٌ کا فاعل ہے اور وہ بَقَرَةٌ کی صفت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فَقَعَ لَوْنُهُ فُقُوعاً فَقَعَ، يَفْقَعُ یعنی اس کی زردی خالص ہوگئی۔

إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا، ہر وہ جمع جس کی واحد یاء کے ذریعہ بنتی ہے ہو جیسے: بَقَر، نَخْل، سَحَاب، اسے مذکر و مونث دونوں قرار دے سکتے ہیں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (یہاں پر نَخْل کی صفت خَاوِيَة لایا ہے جو کہ مونث اور ایک دوسری آیت نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ فرمایا ہے (نَخْل کی صفت مذکر لایا ہے) حالانکہ مذکر لانا غالب ہے۔

تُثِيرُ الْأَرْضَ: محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ ذَلُولٌ کی صفت ہے اور وہ نفی کے معنی میں داخل ہے یعنی

ایسی گائے کہ جو ذَلُولٌ زمین کھونے والی اور کھیتی کی سینچائی کرنے والی نہ ہو مُسَلَّمَةٌ بھی بَقَرَةٌ کی صفت ہے۔

لَا شِيَةَ فِيهَا: جملہ ہے یہ بھی محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ بَقَرَةٌ کی صفت ہے شِيَةٌ وَشَيْتٌ کا مصدر ہے اسکی اصل وَشْیٌ ہے جب واؤ کو گرا دیا گیا تو اس کے عوض آخر میں ہاء لے آئے۔ عرب کہتے ہیں کہ وَشَيْتُهٗ شِيَةً جس طرح وَزِنْتُهٗ زِنَةً و وَصَلْتُهٗ صِلَةً پس اس کا وزن عِلَةٌ ہے۔

قَالُوا الْآنَ: اس میں چند صورتیں پائی جاتی ہیں کہ سب سے بہترین صورت الآن میں لام کو ساکن قرار دینا ہے اور لفظ سے واؤ کو حذف کرنا ہے قَالَ الْآنَ بھی کہنا صحیح ہے کہ الْآنَ سے ہمزہ کو کالعدم اور لام کو فتحہ دے دیا جائے اور واؤ کو محذوف چھوڑ دیا جائے التقاء ساکنین کی بنا پر اور فتحہ کو شمار نہ کیا جائے۔

قَالُوا الْآنَ بھی کہنا صحیح ہے واؤ کو ظاہر کیا جائے لام کی حرکت کی بنا پر اس لئے کہ عربوں نے واؤ کو حذف کر دیا ہے اس کے ساکن ہونے کی بنا پر جب واؤ کو حذف کرنا ہی زیادہ بہتر ہے اور سزاوار نہیں ہے کہ پڑھا جائے مگر یہ کہ صحیح روایت میں وارد ہو اس لئے کہ قرأت اتباع و پیروی لانے جانے والی سنت ہے۔

ابو علی نے کہا: الْآنَ مبنی ہے اس لئے کہ اس میں حرف کے معنی پائے جاتے ہیں اور تعریف (معرفہ بنانے) کے معنیٰ ہیں اس لئے کہ تعریف (معرفہ بنانے) کا حکم یہ ہے کہ حرف کے ذریعہ ہو۔ اس میں موجود الف لام سے معرفہ نہیں بنا تا ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو لام کو داخل ہونے سے پہلے اسے نکرہ ہونا چاہئے تھا۔ جیسے رَجُلٌ اور اَلرَّجُل اسی طرح اَلَّذِیْ بھی ہے اس لئے کہ اس میں بھی الف لام ہے اور ان دونوں کے ذریعہ معرفہ نہیں بنا تا ہے بلکہ ان دونوں سے ہٹ کر معرفہ بنا تا ہے۔

اور وہ اس کا اسم موصول مخصوص ہونا ہے اگر اَلَّذِیْ لام کے ذریعہ معرفہ بنتا تو پھر سارے موصولات جو کہ صلہ کے ذریعہ معرفہ ہوتے ہیں جیسے مَنْ و مَا تو یہ سب کے سب غیر معرفہ ہوتے۔ لام کے زائد ہونے کے قول کو وہ روایت قوی بناتی ہے جیسے مبرد نے مازنی سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے اصمعی سے اس شعر کے بارے میں سوال کیا:

وَلَقَدْ جَنَيْتُكَ أَكْمُؤًا وَعَسَاقِلا وَلَقَدْ نَهَيْتُكَ عَنْ بَنَاتِ الْأَوْبَر

اَلْأَوْبَر پر الف لام کیوں داخل کیا ہے؟ تو کہا: ضرورت شعری کی بنا پر داخل کیا ہے جیسے ایک دوسرے شاعر کا شعر ہے: تَبَاعَدَ أُمُّ الْعَمْرِ وعَنْ أَسِيرِهَا، عمرو پر الف لام داخل کیا گیا ہے۔

ابن عربی نے کہا:

یَا لَیْتَ أُمَّ الْعَمْرِو کَانَتْ صَاحِبِیْ   مَکَانَ مَنْ أَنْشَأَ عَلَی الرَّکَائِبِ

پس جس طرح لام اَلَّذِیْ اوراس حکایت میں زائدہ ہے اسی طرح اَلْآنَ میں بھی زائد ہے۔

وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ: کَادَ براہ راست مقاربہ پر دلالت کرتا ہے۔ یَفْعَلُوْنَ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ کَادَ کی خبر ہے اور فصیح یہ ہے کہ اس کی خبر پر اَنْ داخل نہ ہو۔ اس لئے کہ اَنْ ایک ایسا حرف ہے جو اپنے فعل سے مرکب ہو کر مصدر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور اس بات کی طرف مسند ہوتا ہے کہ یہ افعال ثابت اور مستقر نہیں رہی جیسے طمع اور رجاء جیسے عَسَیٰ اَنْ تَفْعَلَ، اور اس بات پر دلیل ہے کہ اَنْ فعل حال پھر داخل نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پر داخل ہوتا ہے جس کے آغاز کی توقع ہو اسی لئے عَسَیٰ کے ساتھ ان کا ہونا لازم ہے اور کَادَ کے ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے اس لئے کہ کَادَ حال سے قریب ہوتا ہے۔

کبھی کبھی کَادَ بھی ان کے ساتھ استعمال ہوا ہے جیسا کہ اصمعی کا شعر ہے:

کَادَتِ النَّفْسُ أَنْ تَفِیْضَ عَلَیْهِ   إِذْ ثَوَیٰ حَشْوَ رَیْطَةٍ وَّبُرُوْدٍ

واقعہ

گائے ذبح کرنے کے اللہ کے حکم کے سبب کو یہ ہے عیاشی نے امام رضا علیہ السلام سے ایک مرفوعہ روایت اس طرح بیان کیا ہے: بنی اسرائیل کے ایک شخص کو اس کے ایک قریبی رشتہ دار نے قتل کر کے بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے دروازہ ڈال دیا پھر اسی سے اس کا خوں بہا طلب کرنے لگا۔ لوگوں نے موسیٰؑ سے کہا: فلاں کا پوتا قتل کر دیا گیا ہے، آپ ہمیں بتائیے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: میرے پاس ایک گائے لے کر آؤ تو قَالُوْا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا۔ (انھوں نے کہا کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟) اگر وہ لوگ ایک گائے لے آتے تو وہی کافی ہوتی۔ لیکن انھوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو اللہ نے ان پر سختی اور شدت کی۔ وہ کہنے لگے کہ آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دُعا کیجئے کہ وہ بیان فرمائے کہ اس گائے کی ماہیت کیا ہو؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اس کے درمیان اوسط عمر کی ہو (یہاں تک) وہ لوگ کہنے لگے اب آپ نے ٹھیک پہچان بتائی ہے۔

پس انھوں نے اسے تلاش کیا، اسے بنی اسرائیل کے ایک نوجوان کے پاس پایا۔ اس نے کہا: میں اسے فروخت نہیں کروں گا مگر اس کے برابر سونے کے بدلے۔ وہ لوگ جناب موسیٰؑ کے پاس آئے اور اس کے متعلق

بتایا۔ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: اسے خرید کر لاؤ۔ (امام رضا علیہ السلام نے فرمایا) پیغمبرؐ کے بعض اصحاب نے آپؐ سے عرض کیا: اس گائے کی کیا حالت تھی؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے ایک جوان نے اپنے باپ کے ساتھ حسن عمل کیا تھا۔ ایک چیز خرید کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ باپ سو رہا ہے۔ پیسہ باپ کے سر کے نیچے تھا، اس نے باپ کو اٹھانا بہتر نہیں سمجھا، جب اس کا باپ بیدار ہوا اس نے باپ سے پورا واقعہ بیان کیا۔ باپ نے بیٹے سے کہا: تم نے بہت اچھا کیا۔ یہ گائے تمھاری ہے اسے لے لو۔ یہ اس چیز کا عوض ہے جو تم سے ضائع ہو گئی ہے۔

(امامؑ نے فرمایا کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس نیکی کو دیکھو کہ اس نے نیکوکار کو کس مقام تک پہنچا دیا۔

عبداللہ بن عباس نے فرمایا: مقتول ایک بزرگ صاحب ثروت تھا۔ اس کے برادر زادوں نے اسے قتل کر کے ایک قبیلہ کے دروازے پر ڈال دیا، پھر ان لوگوں نے قتل کا دعویٰ کیا اور فیصلہ جناب موسیٰؑ سے چاہا۔ جناب موسیٰؑ نے سوال کیا: اس بات کا علم کسے ہے؟ لوگوں نے عرض کی: آپ نبی خدا ہیں۔ آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اللہ نے جناب موسیٰؑ پر وحی فرمائی کہ انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیجئے، جناب موسیٰؑ نے حکم دیا کہ وہ گائے ذبح کریں اور مقتول کے بدن کے ایک حصہ سے گائے کے ایک ٹکڑے کو مس کریں۔ خداوند عالم مقتول کو زندہ کر دے گا جو بتائے گا کہ اس کا قاتل کون ہے؟

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے چچازاد بھائیوں نے اسے قتل کیا تھا تاکہ اس کی میراث پا سکیں۔ اسی طرح بیان کیا گیا ہے قتل کرنے کی وجہ تھی کہ وہ مقتول کی لڑکی سے شادی کر لے جبکہ اس نے شادی کی کوشش بھی کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا اور اس نعمت سے محروم رہ گیا تھا اور اس لڑکی کی شادی بنی اسرائیل کے ایک شریف انسان سے ہو گئی تھی۔ اس کے چچازاد بھائی کو اس سبب سے حسد پیدا ہو گیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ مقتول کو جناب موسیٰ کی خدمت میں لا کر کہنے لگا اے نبی خدا! یہ میرا چچازاد بھائی ہے جسے قتل کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا: کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا: مجھے نہیں معلوم۔ بنی اسرائیل میں قتل بہت بڑی بات تھی جو جناب موسیٰؑ پر بہت گراں تھا۔ یہ روایت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے۔

تفسیر:

بنی اسرائیل کی گائے

یہ آیات بھی گذشتہ آیات پر عطف ہیں جو بنی اسرائیل پر نعمتوں کے نزول اور ان کے کفر وعصیان کے ذریعہ مقابلہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ ارشاد ہوا: وَاذْكُرُوْا؛ تم یاد کرو تم نے اس عہد و پیمان کو توڑ دیا ہے جسے میں نے تم سے لیا تھا کہ تم میری اطاعت کرو گے۔ ارشاد ہوا: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا، پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ موسیٰؑ کی قوم نے ان سے کہا: کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ (یعنی) ہم آپ سے مقتول کی بابت دریافت کر رہے ہیں اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دے رہے ہیں! انھوں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ بظاہر دونوں باتوں کے درمیان کوئی ربط نہیں تھا اور وہ اس حکم کی حکمت سے ناواقف تھے جس کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ جناب موسیٰؑ نے انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا لیکن ان کے لئے اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی تھی کہ ذبح کا مقصد کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے کہا گائے ذبح کرنے اور اس معاملہ کے درمیان جو ہم آپ کے پاس لے کر آئے ہیں کیا ربط ہے؟ یہ تو ہمارے ساتھ مذاق ہے!

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ، موسیٰ نے کہا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ یعنی معاذ اللہ میں مذاق اڑانے والوں میں سے ہو جاؤں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاہلین کہا تا کہ وہ اس بات کی نشاندہی کر دیں کہ استہزاء جاہلوں کا کام ہے۔ اس لیے دوسروں کا مذاق اڑانا دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو اس کی خلقت کا مذاق اڑایا جائے گا یا اس کے کسی کام کا۔ اگر خلقت کا مذاق اڑانا جائے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر کسی کام پر مذاق اڑانا جا رہا ہے جو کہ برا ہے تو اس کے انجام دینے والے کو اس کی برائی پر آگاہ کرنا ضروری ہے تا کہ اسے روکا جاسکے۔

اگر استہزا اس سے ہٹ کر صحیح کام پر ہو تو پھر مذاق اڑانا تو استہزا اس طرح (گناہ) کبیرہ ہوگا جو اس سے ناواقف اور جاہل سے ہی واقع ہوگا یا جو اس کا محتاج ہو۔ پس اگر یہ کہا جائے گائے ہی کے ذبح کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟ کسی دوسری نے جانور کو ذبح کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا گیا۔ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ گائے بچھڑے کی جنس سے ہے، جس کی وہ پرستش کیا کرتے تھے تا کہ اس چیز کو حقیر قرار دیا جائے

جس کی وہ تعظیم کرتے تھے اور ان کے نفسوں میں جاگزیں پرستش کو نابود اور اس کا خاتمہ کیا جاسکے اور یہ کہ خداوند عالم نے مقتول کو زندہ کے قتل کے ذریعہ زندہ کر دیا تاکہ اشیاء کے اضداد کے سبب کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانے بھی اس کی قدرت پر ظاہر و نمایاں ہو جائے۔

جب انھیں معلوم ہو گیا کہ گائے کا ذبح کرنا اللہ کی طرف سے واجب ہے تو انھوں نے اس بھی بارے میں دریافت کرنا شروع کر دیا کہ اس کی عمر کتنی ہو اور جناب موسیٰ سے انھوں نے کہا: ''اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ'' اپنے پروردگار سے ہمارے لیے سوال کیجئے: يُبَيِّن لَّنَا مَاهِيَ، بتادے کہ اس گائے کی ماہیت ہو سوال سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے کہ سوال گائے کی عمر کے بارے میں کیا جا رہا ہے بلکہ یہ تو جواب سے ظاہر ہوا ہے۔ قَالَ موسیٰ نے کہا: اِنَّهُ يَقُولُ، خدا فرماتا ہے: اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ، نہ تو اسقدر بڑی ہو کہ بوڑھی ہو، نہ ہی چھوٹی، عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ یعنی چھوٹی اور بڑی کے درمیانی عمر کی ہو۔ یہ قول اقوی اور احسن ہے اور یہ ابن عباس کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ عوان وہ ہے جس نے ایک بطن یا دو بطن (یعنی ایک مرتبہ یا دو مرتبہ) ہی بچہ دیا ہو۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ، جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اسے ذبح کرو۔ جب خدا نے گائے کی عمر بیان کر دی تو اس کے رنگ کے بارے میں سوال کرنے لگے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا، اپنے پروردگار سے دریافت کیجئے اس گائے کا رنگ کیا ہے جسکے ذبح کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ قَالَ، موسیٰ نے کہا: اِنَّهُ خداوند عالم، يَقُولُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ، (وہ فرماتا ہے: وہ زرد رنگ کی گائے ہو) یہاں تک کہ اس کے کھُر اور سینگ بھی زرد ہونے چاہئیں۔ یہ حسن اور سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا بہت شوخ زرد کہا گیا ہے۔ خالص زرد کہا گیا ہے۔ بہتر زرد ہے۔ اس کا ارشاد: تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ دیکھنے والوں کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دے۔ انھیں اپنے حسن کے باعث خوش کر دے۔ یہ روایت قتادہ وغیرہ سے مروی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: ''جو شخص زرد نعلین پہنے گا وہ اس کے کہنہ ہونے تک مسرور رہے گا'' جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ، (زرد رنگ کی گائے ہو اس کا رنگ ایسا ہو کہ دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہو) جب اللہ نے گائے کی عمر اور اس کا رنگ بیان کر دیا تو انھوں نے اس کی صفت کے بارے میں سوال کیا، قَالُوا، کہا: اے موسیٰ! ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَاهِيَ، عوامل (کام

کرنے والے جانور) یا سوائم (صحرا میں چرنے والے جانور) سے ہو؟

اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا، ہم پر گائے کی صفت مشتبہ ہوگئی جسکے ذبح کرنے کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ، اور اللہ نے چاہا تو اب ہم گائے کو تلاش کرلیں گے۔ ہمارے لیے گائے کی صفت اللہ کے بیان کرنے سے اور جو کچھ اس نے ہم پر لطف فرمایا ہے۔

ابن جریج و قتادہ نے ابن عباس کے حوالے سے پیغمبرؐ سے روایت کی ہے (آنحضرتؐ نے فرمایا:) انھیں ادنیٰ اور معمولی گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن جب انھوں نے خود پر زیادتی کی تو خدا نے بھی ان پر سختی کی۔ خدا کی قسم اگر وہ لوگ استثنیٰ نہ کرتے تو ان کے لیے کبھی بھی واضح نہ ہو پاتا۔ قَالَ، جناب موسیٰؑ نے کہا، سختی اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ، اللہ فرماتا ہے کہ جس گائے کے ذبح کرنے کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اور وہ گائے ایسی ہو: لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ، نہ زمین کی جتائی کے لیے اپنے کھروں کو نہ استعمال کرتی ہو۔ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ، نہ ہی کھیتوں میں سینچائی کرتی ہو۔ مُسَلَّمَةٌ، عیوب سے پاک و بری ہو۔ یہ روایت قتادہ اور عطا سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے مُسَلَّمَةٌ یعنی بے داغ ہو یعنی اس پر کوئی ایسا رنگ نہ ہو جو اس کے رنگ کے مخالف ہو۔ یہ روایت مجاہد سے ہے۔

کہا گیا ہے کہ کام کے نشانات سے سالم ہو اس لیے کہ جو جانور کام کرتے ہیں ان کے پیروں اور جسم میں کام کے نشانات پڑ جاتے ہیں۔

حسن نے بیان کیا ہے کہ وہ گائے وحشی جنگلی ہو۔

لَّا شِيَةَ فِيْهَا، اہل لغت نے کہا ہے: اس میں کوئی ایسا داغ دھبہ نہ ہو جو اس کی جلد کے مخالف ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں گائے کے زرد رنگ کے علاوہ کوئی دوسرا رنگ نہ ہو۔ یہ روایت قتادہ اور مجاہد سے منقول ہے۔

قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ، (انھوں نے کہا: اب آپ نے ٹھیک نشانی بتائی ہے) یعنی اب ہمارے لیے واضح ہوگیا کہ وہ گائے کیسی ہو۔

یہ بات اس چیز پر دلالت کر رہی ہے کہ انھوں نے ممکن طور پر جان لیا کہ اس سے قبل مفصل حق نہیں آیا تھا، بلکہ اجمالی طور پر آیا تھا۔ قتادہ نے کہا ہے: اب حق واضح ہوگیا جو اس چیز پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کے

درمیان جو شک کر رہا تھا کہ موسیٰ نے حق واضح نہیں کیا۔

فَذَبَحُوْهَا، انھوں نے گائے کو ذبح کر دیا جس کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ، وہ قاتل کی رسوائی اور اس کے طشت از بام ہونے کے خوف سے ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گائے کے بیش قیمتی ہونے کے باعث ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ابن عباس سے حکایت کی گئی ہے کہ انھوں نے گائے کو مقتول کے مال سے گائے کی کھال میں بھرے سونے کے برابر قیمت میں خریدا تھا، مقتول کے مال سے۔ سُدی سے روایت کی گئی ہے کہ اس کے دس گُنا سونے سے خریدی تھی۔ عکرمہ نے کہا ہے کہ اس کی قیمت فقط تین دینار تھی۔

اس مقام پر ہم اصول فقہ سے متعلق مختصر فصل تحریر کر رہے ہیں:

ان آیات کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، بعض کی رائے ہے کہ آیت میں مختلف تکالیف (ذمہ داریاں) کی نشاندہی کی گئی ہے جب ان سے گائے ذبح کرنے کے لیے کہا گیا تو اس سے کسی بھی گائے کا ذبح کرنا مقصود تھا جسے بھی وہ چاہتے، کوئی صفت معین نہیں کی گئی تھی وہ جس گائے کو بھی ذبح کرتے حکم کی بجا آوری کرنے والے شمار ہوتے۔ پس جب انھوں نے اسے انجام نہیں دیا تو مصلحت قرار پائی کہ ان کے فریضہ میں شدّت کر دی جائے، جب انھوں نے دوسری مرتبہ رجوع کیا تو ان کی مصلحت تیسرے فریضہ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر (علماء علم اصول نے) دوسری وجہ سے اختلاف کیا ہے ان میں بعض نے آخری تکلیف کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے لیے ہر گذشتہ صفت کا بجالانا واجب تھا۔ پس اس قول کے مطابق دوسری اور تیسری تکلیف ضم ہو جائیگی جو ان پر شدید ہوگی جس میں مصلحت موجود ہوگی۔ بعض کا کہنا ہے آخری صفت ہوگی فقط گذشتہ نہیں۔ اس قول کے مطابق دوسری تکلیف پہلی تکلیف کے لیے ناسخ ہوگی اور تیسری تکلیف دوسری تکلیف کے لیے ناسخ ہوگی، کسی حکم کو اس پر عمل کرنے سے پہلے منسوخ کرنا جائز ہے، اس لیے کہ مصلحت مجوّز قرار دیتی ہے کہ وقت گذرنے کے بعد تبدیل ہو جائے بلکہ فعل کے وقت سے قبل مسخ شے جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ امر بداء کی طرف لے جاتا ہے۔ دیگر علمائے علم اصول کا نظریہ یہ ہے کہ حکم ہی ایک ہے بعد کے صفات اسی گائے کے ہیں۔ فقط بیان میں تاخیر کی گئی ہے۔ یہ سید مرتضیٰ قدس اللہ سرہ کا نظریہ ہے۔

اس آیت کے ذریعہ علمائے علم اصول نے وقت خطاب سے وقت حاجت تک بیان کو ٹالنے کے جائز ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔ سید مرتضیٰ فرماتے ہیں: جب خداوند عالم نے لوگوں کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو

انھوں نے جناب موسیٰ سے کہا: ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ، ان کا یہ کہنا اس بات سے خالی نہیں کہ مَا هِيَ سابقہ گائے سے کنایہ ہے، جس کا ذکر گذر چکا ہے یا اس سے کنایہ ہے جس کا انھیں دوسری مرتبہ حکم دیا گیا، ان کے اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مَا هِيَ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سوال اس گائے کی صفت سے متعلق ہو جسکے ذبح کرنے کا انھیں حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ انھیں دوسری گائے کے ذبح کرنے کے حکم کا علم نہیں تھا لہٰذا انھوں نے اس کے بارے میں سوال کیا۔ پس جب یہ صحیح اور درست ہے تو اس کا ارشاد: اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ، اس امر سے خالی نہیں کہ اس میں "ھا" پہلی گائے سے کنایہ ہو یا اس کے علاوہ ہو اور جائز نہیں کہ دوسری گائے سے کنایہ ہو۔ اس لیے کہ ظاہر (کلام) اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کنایہ اس چیز سے متعلق ہو جس سے ان کا سوال وابستہ ہو ہے۔ اگر بات اس طرح نہیں ہوگی تو ان کا جواب نہیں ہو پائے گا۔

ان کا یہ کہنا کہ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا فقط اس لیے تھا کہ ان کا ماننا تھا کہ ان سے جو خطاب کیا گیا ہے مجمل اور غیر واضح ہے اور اگر بات اس طرح ہوتی جسکو اس گروہ نے اختیار کیا ہے تو ان سے یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ تم پر کیا چیز مشتبہ ہوگئی؟ تمھیں ابتدا میں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ گائے کیسی بھی ہوتی، دوسرے حکم میں اس کی مخصوص عمر تھی۔

تیسرا حکم مخصوص رنگ سے متعلق تھا، وہ کسی بھی گائے میں ہوتا البتہ اس کا ارشاد: فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ، بظاہر ان کی مذمت، ان کی تقصیر اور کوتاہی کی طرف پلٹ رہا ہے یا مکمل بیان اور وضاحت کے بعد حکم کی بجا آوری کی تاخیر سے متعلق ہے جو کہ ان کی مذمت کا تقاضا نہیں کرتا ہے۔ پہلی صورت میں گائے کے ذبح کرنے میں جلدی ترک کرنے پر آیت دلالت نہیں کر رہی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا اور اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ اور اللہ ظاہر کر کے رہے گا جس بات کو تم چھپا رہے ہو۔ (۷۲) پھر ہم نے کہا: اس گائے کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم پر مارو، دیکھو، اللہ اس طرح مردوں کو حیات بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (۷۳)

الفاظ و معانی:

اِدَّارَأْتُمْ تم نے اختلاف کیا؛ اس کی اصل تَدَارَأْتُمْ ہے، دَرْء کے معنیٰ میں دور کرنا اور اسی سے حدیث میں آیا ہے: اِدْرَأُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ۔ حدود کو شبہات سے دور کر دو اور اسی سے اللہ کا قول ہے: وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ۔ (سورۂ نور، آیت ۸) اور عورت کی سزا اس طرح ٹلتی ہے۔

تفسیر:

مردہ کو زندہ کر دیا

اس آیت میں خداوند عالم نے گائے کے ذبح کے حکم کا مقصد بیان فرمایا جس کا آغاز قتل کے ذکر سے فرمایا: وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا؛ اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ اس بارے میں دو صورتیں بیان کی گئی ہیں:

اول: گذشتہ آیات میں باعتبار معنی مقدم کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کی تاویل ہوگی کہ جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ پس تم نے موسیٰؑ سے سوال کیا، انھوں نے تم سے کہا: اللہ نے تمھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے (اس طرح) مؤخر کو مقدم اور مقدم کو مؤخر کیا گیا ہے۔ اس طرح کی مثالیں قرآن و اشعار میں بکثرت وجود ہیں۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا۔ (مکمل حمد اللہ تعالیٰ

کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب کو نازل کیا اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی، وہ سیدھی ہے، (سورۂ کہف، آیت ۱-۲)) جس کی تقدیر اس طرح ہے: اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ قَیِّمًا وَّلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا۔

دوم: دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت اس سے متعلق ہے جو حقیقت میں متاخر ہے اس کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوْہُ بِبَعْضِہَا، گویا اس نے کہا انھوں نے گائے کو ذبح کر دیا اور وہ ایسا کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ اس لیے کہ تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور (اسکے قاتل کے بارے میں) جھگڑنا شروع کر دیا تھا تو ہم نے تمھیں حکم دیا کہ مقتول کو گائے کے ٹکڑے سے مس کر دو تا کہ معاملہ صاف ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ یہ خطاب پیغمبرؐ کے زمانہ والوں سے ہے۔ اس سے مراد ان لوگوں کے بزرگ ہیں۔ یہ عربوں کی عادت کے مطابق ہے کہ خطاب فرزندان اور ان کی اولاد سے ہوتا ہے مقصود ان کے اسلاف اور اجداد ہوتے ہیں، خطاب پورے خاندان سے ہوتا ہے مگر مقصود ایک آدمی ہوتا ہے۔ بطور مثال کہا جاتا ہے: بنو تمیم نے اس طرح کیا اگر چہ فعل کا انجام دینے والا ایک ہوتا ہے۔ احتمال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے لوگوں سے خطاب ہو جس کی تقدیر ہے اور ہم نے ان سے کہا: جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔

بیان کیا گیا ہے: مقتول کا نام عامیل تھا "تم نے اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑا کیا۔" فِیْہَا میں 'ھا' کی ضمیر نفس کی طرف پلٹ رہی ہے یعنی ہر ایک اس شخص کے قتل کو اپنے آپ سے دفع کر رہا تھا۔ بیان کیا گیا ہے: قاتلوں کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی تم نے قاتلوں کے بارے میں اختلاف کیا۔ اس لیے کہ اللہ کا ارشاد قَتَلْتُمْ مصدر پر دلالت کر رہا ہے۔ ضمیر کا نفس کی جانب پلٹنا اولیٰ اور ظاہر سے زیادہ مشابہ ہے۔

وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ، یعنی اللہ اس کا ظاہر کرنے والا ہے قتل کے متعلق جس چیز کو تم چھپا رہے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں: خداوند عالم تمھاری دقیق اور پیچیدہ خبر کو نکالنے والا ہے۔ تمہارے اور تمہارے اسلاف کے عیوب و معائب اور برائیوں سے مطلع کرنے والا ہے، جنھیں تم چھپا رہے ہو۔ یہ خطاب پیغمبرؐ کے زمانہ کے یہودیوں سے ہے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْہُ بِبَعْضِہَا، یعنی ہم نے ان سے کہا کہ مقتول کو گائے کے ٹکڑے سے مارو۔

لفظِ بَعْض کے متعلق اختلاف کیا ہے کہ مقتول کو گائے کے کسی حصہ سے مارا گیا۔ کہا گیا ہے کہ گائے کی ران سے مارا گیا اور وہ زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ مردہ ہو گیا۔ یہ روایت مجاہد، قتادہ اور عکرمہ سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ گائے کی دُم سے مارا گیا۔ یہ روایت

سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے زبان سے مارا گیا۔ یہ ضحاک سے روایت ہے۔ کہا گیا ہے: گائے کی ہڈی سے مارا گیا۔ یہ روایت ابو العالیہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے: دونوں شانوں کے درمیانی مقام سے مارا گیا۔ یہ سدی سے روایت ہے۔ کہا گیا ہے: بعض اعضا سے مارا گیا۔ یہ ابو زید سے روایت ہے۔ یہ تمام اقوال ہیں بظاہر جن کا امکان ہے۔

جو بات معلوم وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے مقتول کو گائے کے ایک حصہ سے مارنے کا حکم دیا تھا تا کہ مقتول زندہ ہو جائے۔ جب وہ لوگ اس عمل کو انجام دیں گے تو مقتول وہ کہے گا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے تا کہ قوم کے درمیان اختلاف دور ہو جائے۔ اگر چہ صانع اسے خلق کرنے والا اور بنانے والا اللہ اس کے بغیر بھی زندہ کرنے پر قادر تھا۔ اللہ نے انھیں اس چیز کا حکم اس لیے دیا کہ انھوں نے جناب موسیٰؑ سے مقتول کے متعلق وضاحت چاہی تھی اور وہ قربانی کو عظیم ترین قربت سمجھتے تھے۔ اسکے لیے انھوں نے علیحدہ مکان بنایا تھا جس میں فقط ان کے شرفاء ہی داخل ہوتے تھے۔ خداوند عالم نے انھیں قربانی پیش کرنے کا حکم دیا تا کہ در پیش امور سے تعلیم حاصل کریں کہ وہ خداوند عالم سے اس قضیہ کے انکشاف اور ظاہر ہونے سے قبل اس کے حضور نزدیکی کا (نمونہ) پیش کریں تا کہ قبولیت کے زیادہ نزدیک ہو۔ اللہ نے (گائے کے اعضا کو) مقتول کے بدن پر مارنے کا انھیں حکم دیا جب کہ تمام لوگوں کے زندہ کرنے کا اختیار اسی کو ہے تا کہ وہ لوگ جان لیں خداوند عالم مردوں کو ہر وقت زندہ کرنے پر قادر ہے۔ آیت میں تقدیر اس طرح ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا فَضَرَبُوْهُ فَحَيِيَ ''ہم نے ان سے کہا گائے کے ایک حصّہ کو مقتول کے بدن کے ایک حصہ پر مارو۔ انھوں نے اسی طرح کیا اور وہ زندہ ہو گیا جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ اسکی تقدیر اس طرح ہے: فضرب فانفلق۔

ارشاد الٰہی: كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى، احتمال ہے۔ یہ جناب موسیٰؑ کے قول کی حکایت و ترجمانی ہو کہ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: بخوبی جان لو کہ خداوند عالم جزا اور بدلہ کے لیے مردوں کو زندہ کرے گا۔ یہ بھی احتمال و امکان ہے اللہ کی طرف سے مشرکین قریش کے لیے خطاب ہو جو گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے بدن پر مارنے سے مقتول کے زندہ ہونے پر پیش آیا۔ چونکہ روایت کی گئی ہے: مقتول اس عالم میں کھڑا ہوا اس کی رگوں سے خون ابل رہا تھا اور کہنے لگا: مجھے فلاں چچا زاد بھائی نے قتل کیا ہے۔ پھر اس کی روح قبض کر لی گئی۔

وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ یعنی خارق العادۃ، روشن معجزات جن میں اس مردہ کا زندہ کرنا ہے اور اس کے علاوہ

دیگر (معجزات) بیان کئے گئے ہیں۔ نمایاں اور ظاہر اعلان واعلام مراد ہے جو پیغمبرؐ کی نبوت پر دلیل ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تاکہ تم اپنی عقلوں کا استعمال کرو۔ جو اپنی عقل کا استعمال نہیں کرتا وہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ وہ ایسا ہے جیسے اس کے عقل ہی نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ اس چیز میں عقل سے کام لو جو دینی امور میں تم پر واجب ہیں۔ ان آیات کے ذریعہ خداوند عالم نے مشرکین عرب پر حجت ودلیل پیش کی ہے کہ وہ مردوں کا زندہ کیا جانا ناممکن سمجھتے تھے اور اس طرح کہتے تھے: أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۴۹) (ہم جب ہڈیاں اور خاک ہوکر چورہ چورہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے)

خداوند عالم نے انھیں مطلع کیا جس کا وہ انکار کرتے اور ناممکن سمجھتے تھے۔ اسکی وسیع قدرت کے آگے یہ سب ناممکن نہیں ہے مقتول اور اس کی زندگی کا ذکر کر کے اس کے مرنے کے بعد باوجود ان لوگوں نے خبر قتل کو پوشیدہ رکھا تھا اسے زندہ کیا، وہ مخاطب ہوا اپنے قاتل کا نام لے کر اور ان لوگوں کے سامنے اس کا اعلان واظہار کیا (خداوند عالم نے ان لوگوں کو) آگاہ اور متنبہ فرمایا ہے۔ مردوں کی ہڈیاں بوسیدہ ہوجانے کے باوجود تمام مردوں کا زندہ کرنا اس پر دشوار نہیں ہے بلکہ اس پر بہت زیادہ آسان ہے۔

اس آیت میں ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر دلالت ہے، جب آپؐ نے انھیں ان کی دقیق خبروں سے مطلع کیا جسے بجز اس کے کوئی دوسرا نہیں جانتا جس نے گذشتہ کتب پڑھی ہوں یا جس پر عالمین کے پروردگار کی جانب سے وحی کی گئی ہو جس کی تصدیق آپؐ کے مخالف یہودیوں نے کی، جب انھیں ان واقعات کی خبر دی گئی تو انھوں نے جان لیا کہ آپ اُمی ہیں جنہوں نے کتاب نہیں پڑھی ہے اور اس بارے میں ان لوگوں نے ذرا بھی شک نہیں کیا۔ چنانچہ یہ آیت حضورؐ کی نبوت کے اثبات میں دلیل قاطع ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے۔ پتھروں کی طرح بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت؛ اس لیے کہ پتھروں میں ایسے پتھر بھی ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور کوئی پتھر شگافتہ ہوتا ہے تو اس میں سے پانی نکل آتا ہے اور کوئی پتھر خوف خدا سے لرزہ براندام ہو کر گر پڑتا ہے اور اللہ تمھاری حرکتوں سے غافل نہیں ہے۔

قرائت:

اس آیت مبارکہ میں صرف ابن کثیر نے عَمَّا یَعْمَلُوْنَ یاء کے ساتھ قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے تاء کے ساتھ قرأت کی ہے۔

قراء نے ارشاد الٰہی: وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ صرف ابو جعفر نے پورے قرآن میں تاء کے ساتھ پڑھا ہے سوائے سورۂ انعام کے اور ابن عامر نے پورے قرآن میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ کسائی نے پورے قرآن میں اول (وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ) کو تاء کے ساتھ اور دوم (وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ) کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر، نافع، عاصم اور ابو عمرو سے اختلاف کیا ہے۔

حجت:

ابو علی نے اس بارے میں ایک بات کہی ہے کہ جہاں کہیں اس سے پہلے خطاب ہوگا وہاں پر تاء قرار دیا جائے گا تاکہ خطاب، خطاب پر معطوف ہو جیسے یہ فقرہ کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ پھر یہ فرمایا کہ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ تاء کے ساتھ اگر یاء کے ساتھ ہو غائب کا صیغہ یعنی وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُ هٰؤُلَاءِ الْمُسْلِمُوْنَ (یہ مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں خدا اس سے غافل نہیں ہے) تو بہتر ہوگا۔

اور اس سے پہلے غائب کا صیغہ ہو تو بہتر ہے کہ اسے غائب قرار دیا جائے اور اس میں خطاب بھی جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غائب اور حاضر کے درمیان جمع ہو جائے گا تو ایسی صورت میں خطاب کو غیبت پر غلبہ دیا جائے گا جس طرح مذکر کو مؤنث پر غلبہ دیا جاتا ہے کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ عرب باب ضمیر میں حاضر کو غائب پر مقدم کرتے ہیں اور یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ جب اشیاء کو ان کی اصل کی طرف پلٹا دیا جاتا ہے جیسے لفظ تَكُ اس کلام میں: فَلَا تَكُ مَا أَسَأَلَ وَلَا أَغَاماً

جب انہوں نے مخاطب کو غائب پر مقدم کیا تو: أَعْطَاهُوكَ نہیں کہا، اس سے پتہ چلا کہ مخاطب رتبہ میں مقدم ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو اس طرح کے موارد میں مراد غائب اور مخاطب دونوں میں۔ پس خطاب کو غائب پر غلبہ دلایا جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک وجہ اور بھی جائز ہے کہ اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ لیا جائے گا کہ وَ قُلْ لَهُمْ أَيُّهَا النَّبِيُّ مَا اللهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ وَ اللهُ أَعْلَمُ؛ اے نبی آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

الفاظ و معانی:

قَسْوَة کے معنی قلب سے نرمی و رحمت کا ختم ہونا ہے۔ قَسْوَة ہر چیز میں سختی ہے۔ اس کی ضد رقت و نرمی ہے۔ شدت و قوت جسم میں ہوتی ہے۔ شدت امر کا دشوار ہونا ہے۔

ترکیب و تفسیر:

پتھر سے بھی زیادہ سخت دل

جب خداوند عالم نے قاہر و زبردست معجزات اور واضح نشانیاں ذکر کر چکا تو اس کے بعد ان لوگوں کی سرکشی اور طغیان کو بیان فرمایا اور کہا: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ ،یعنی تمہارے قلوب سخت ٹھوس اور درشت ہو گئے ہیں۔ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ،یعنی ان تمام معجزات کے بعد جنھیں موسیٰؑ کے ذریعہ ظاہر کیا گیا۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مقتول بھائی کے بیٹے مراد ہیں، جب انھوں نے اس کے قتل کا انکار کیا جب کہ وہ مقتول کو اللہ کا زندہ کیا جانا سن چکے تھے کہ اسے فلاں شخص نے قتل کیا ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے منقول ہے۔ زندہ کئے جانے کی طرف بھی

اشارہ ہوسکتا ہے یعنی تمہارے لیے گائے کے ایک حصہ کے ذریعہ مقتول کا جسم مس کر کے اسے زندہ کیا جانا جب کہ تم اس بارے میں جھگڑا کر رہے تھے۔ تمھیں اس کے قاتل اور سبب قتل کے بارے میں باخبر کر دیا گیا اور جو شخص بھی اس عجیب آیت (نشانی) اور خارق العادۃ معجزہ کا مشاہدہ کرے گا وہ تواضع اور فروتنی سے پیش آئے اور اس کے قلب کا رقیق و نرم ہونا لازمی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آخری آیات کی جانب اشارہ ہو جو گذر چکی ہیں جیسا کہ ان کا بندروں اور خنزیر کی شکل میں مسخ ہو جانا، انکے اوپر پہاڑ کا بلند ہونا، پتھر سے پانی جاری ہونا اور سمندر میں شگاف پیدا ہونا وغیرہ ''ذٰلِكَ'' کہنا جائز ہے اگر چہ وہ لوگ جماعت کی شکل میں تھے (انہیں) ذٰلِكُمْ نہیں کہا گیا اس لیے کہ جماعت جمع اور فریق کے معنی میں ہے۔ خطاب کا لفظ مفرد ہے جو جمع کے معنی میں ہے اگر ذٰلِكُمْ کہتا تب بھی صحیح تھا۔

اس کا ارشاد: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ. ان کے دلوں کی سختی، درشتی شدت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پیغمبرؐ کی ایک حدیث میں آیا ہے آنحضرتؐ نے فرمایا: ذکر خدا کے علاوہ بکثرت گفتگو نہ کرو اس لیے کہ ذکر خدا کے بغیر بکثرت کلام کرنے سے دل سخت ہو جاتا ہے، اللہ سے دور ترین انسان سخت دل والا ہے، أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً. یا اس سے زیادہ سخت یعنی باعتبار سختی بہت زیادہ ہیں اس لیے کہ وہ قیام حجّت کے بعد لازمی اقرار اور آیات کے مشاہدہ کے باوجود واجب اطاعت پر عمل سے مانع ہوتا ہے۔

أَوْ کی تاویل میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اوّل: زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس کے معنی مباح کے ہیں، جس طرح کہا جاتا ہے: جَالِسِ الْحَسَنَ أَوِ ابْنَ سِيرِينَ، حسن کے پاس بیٹھو یا ابن سیرین کے پاس۔ اگر آپ کسی ایک کے پاس بیٹھیں یا دونوں کے پاس تو آپ اسے انجام دینے والے سمجھے جائیں گے۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی ہوں گے: ان کے دل سخت ہیں اگر آپ ان کے دل کی سختی کی تشبیہ پتھر سے دیں گے تو درست ہوگا اور اس کی سختی کو پتھر کی سختی سے تشبیہ دیں گے تب بھی صحیح ہوگا۔ اگر آپ دونوں کے ساتھ تشبیہ دیں گے تب بھی درست ہوگا جیسا کہ (امثال) میں گذر چکا ہے۔ اسی طرح اللہ کے اس ارشاد میں ہے: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ۔

دوم: أَوْ کو تفصیل اور تمیز کے لیے داخل کیا گیا ہے کہ ایسی صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے: ان کے دل سخت ہیں جس میں بعض پتھر کے مانند ہیں اور بعض پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں ارشاد الٰہی: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ میں انھیں دو وجہوں کا احتمال دیا گیا تھا۔

سوم: اَوْ کو ابہام کے بطور داخل کیا گیا ہے جس کی بازگشت مخاطب کی جانب ہوتی ہے، اگرچہ پروردگار عالم اس کے متعلق جانتا ہے، اسے اس میں شک نہیں ہے بلکہ وہ تو باخبر کر رہا ہے کہ ان کے دلوں کی سختی پتھر کے مانند یا اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کے مانند بہرحال ہے ان دونوں سے خارج نہیں ہے جس طرح کوئی کہتا ہے کہ: اَکَلْتُ بسرۃً او تمرۃً'' یعنی میں نے کچی کھجور کھائی یا پختہ کھجور کھائی باوجودیکہ وہ بالتفصیل یہ جانتا ہے اس نے کیا کھایا ہے یہ کہہ کر وہ مخاطب کو ابہام میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔

اسی طرح یہاں پر ان لوگوں کے قلوب کی شدت وسختی کے بارے میں خبر دینا ہے کہ وہ ان میں سے ہیں جو وعظ ونصیحت کو غور سے نہیں سنتے نہ ہی خیر کی جانب سبقت کرتے ہیں ان کے لئے مساوی ہے چاہے وہ پتھر کے مانند ہوں یا اس سے زیادہ سخت ہوں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

چہارم: اَوْ' بلکہ کے معنی میں ہو جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (سورۂ صافات، آیت ۱۴۷) (اور ہم نے انھیں ایک لاکھ یا کچھ زیادہ افراد کی طرف رسول بنا کر بھیجا) جس کے معنی بلکہ زائد کے ہیں۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا: وہ ایک لاکھ چالیس ہزار تھے۔

بیان کیا گیا ہے: کس طرح ممکن ہے خداوند عالم ہم سے لفظ بَلٰی کے ذریعہ خطاب کرے جو استدراک اور گذشتہ کلام کے نقص اور اس کے خاتمہ کا تقاضا کرتا ہے یہ خدا کے لئے بہتر اور مناسب نہیں ہے؛ اس لیے کہ استدراک سے استفادہ اور غیر معلوم کی یاد دہانی مقصود ہو تو درست نہیں ہے، اگر اس سے گذشتہ کلام کے نقص حصول اور از سر نو زیادتی مراد ہو تو درست ہے۔ اگر کہنے والا یوں کہے: میں نے اسے ایک ہزار دیا بلکہ دو ہزار اس طرح پہلا حکم نہیں ٹوٹتا کس طرح اسے توڑ سکتا ہے جب کہ پہلا حکم دوسرے میں داخل ہے، یہاں پر اس کا ارادہ بھی کیا گیا ہے؛ دوسرے حکم کو اس وقت ختم کرے گا اگر کوئی کہے کہ میں نے ملاقات کی مرد سے بلکہ گدھے سے اس لیے کہ پہلا حکم دوسرے حکم میں کسی بھی عنوان سے داخل نہیں ہے۔ اللہ کا ارشاد: اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (یا سختی میں اس سے بھی زیادہ) پہلے حکم کو نہیں ختم کرتا اس لیے کہ پتھر پر زیادہ اور اضافہ نہیں کیا گیا مگر یہ کہ وہ مساوی ہے مگر یہ کہ پتھر دونوں کے مساوی ہونے کے بعد ہی ان میں کوئی ایک زیادہ سخت ہوتا ہے۔

پنجم: اَوْ واوٗ کے معنی میں ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ. جسکے معنی ہیں (اور تمہارے آباء (واجداد) کے گھر۔

اگر کہا جائے کہ آیت میں اَوْ کس طرح واوٗ کے معنی میں ہوسکتا ہے جبکہ واوٗ جمع کے لیے ہے۔ اگر کوئی

چیز کسی صفت کی حامل ہوتو اس کا اس صفت کے برخلاف ہونا صحیح نہیں ہے؟!

اس سوال کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ ان کے دلوں کا ایک حالت میں پتھر کے مانند ہونا اور دوسری حالت میں ان کا پتھروں سے زیادہ سخت ہونا کہ دونوں کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے اور معنی درست ہیں جس میں منافات نہیں ہے۔ اس جواب کا فائدہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے دل اپنی قساوت اور سختی کے باوجود کبھی نرم بھی ہوتے ہیں اور قریب ہے کہ حق بات سُن لیں۔ پس اس حالت میں اس پتھر کے مانند ہوتے ہیں جو کبھی نرم بھی پڑ جاتے ہیں اور دوسری حالت میں خبر سے بہت زیادہ دور اور پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت نہیں ہوتے ہیں مگر یہ کہ بعد میں ان میں پتھر کی سختی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے کہ ہمارا یہ کہنا کہ ''فلاں شخص فلاں سے زیادہ عالم ہے'' خبر دے رہا ہے کہ وہ اس سے اس علم میں زیادہ جاننے والا ہے، جس میں دونوں مشترک ہیں۔ اشتراک بہر حال ضروری ہے پھر خواہ زیادہ ہو، اس مقام پر کسی قسم کی کوئی منافات نہیں ہے۔

پھر خداوند عالم نے پتھر کی سخت دل پر برتری کو بیان فرمایا: وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ، یعنی پتھروں میں ایسے بھی پتھر ہیں جو تمہارے سنگین دلوں سے زیادہ نفع بخش ہیں، جن سے پانی کی نہریں جاری ہوتی ہیں، نہروں کا ذکر کر کے (پروردگار) پانی کا ذکر کرنے سے بے نیاز ہے (یعنی اس نے فقط نہروں کے ذکر پر اکتفا کیا اور پانی کا ذکر نہیں کیا)

بیان کیا گیا ہے: اس سے وہ پتھر مراد ہے جس سے بارہ چشمے جاری ہوئے تھے اور کہا گیا ہے کہ عام پتھر مراد ہے۔

وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ، یعنی پتھر میں وہ پتھر بھی ہیں جن سے پانی نکلتا ہے اور وہ بہنے والا چشمہ ہو جاتا ہے نہ کہ جاری نہریں۔ یہاں تک (یہ قول) پہلے قول کے مخالف ہے۔ حسین بن علی مغربی نے کہا ہے: پہلا پتھر پہاڑ کا پتھر ہے جس سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور دوسرا جناب موسیؑ والا پتھر ہے جس پر وہ اپنا عصا مارتے اور اس سے چشمے جاری ہو جاتے تھے پس یہ تکرار نہیں ہے۔

اس کا ارشاد: وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ، مِنۡهَا میں ھَا کی ضمیر الحجارۃ کی طرف پلٹ رہی ہے جو خوف خدا کے سبب گر پڑتے ہیں۔ بیشتر مفسرین کا یہی نظریہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قلوب کی طرف پلٹ رہی ہے یعنی وہ دل جو خوف خدا سے جھک جاتے ہیں یعنی خوف زدہ ہو جاتے ہیں، ان میں خشوع

پیدا ہوتا ہے، یہ قلوب اہل کتاب میں سے ایمان لائے اور دیگر اہل کتاب کے سنگین اور سخت دلوں سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ روایت ابو مسلم سے ہے اور جس نے کہا ہے کہ ضمیر حجارۃ کی جانب پلٹ رہی ہے تو انھوں نے اس کی تاویل میں اختلاف کیا ہے جس کی چند وجہیں ہیں:

اول: مجاہد اور ابن جریج سے مروی ہے کہ جو کوئی پتھر پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرتا ہے وہ خوف خدا کے سبب گرتا ہے جس کے معنی ہیں کہ پتھر کا اس حالت میں ہونا جس کا ذکر کیا گیا وہ خوف خدا سے ہوتا ہے۔ یہودیوں کے دلوں میں نہ تو خوف پیدا ہوتا ہے، نہ ہی خشوع اور نہ ہی وہ نرم پڑتے ہیں کہ وہ پیغمبرؐ کی صداقت سے واقف ہیں پھر بھی ان پر ایمان نہیں لاتے لہٰذا ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔

دوم: زجاج نے کہا ہے کہ اللہ نے بعض پہاڑوں کو (شعور) معرفت عطا فرمایا ہے۔ انھوں نے اطاعت خدا کو سمجھ لیا ہے جیسے کہ وہ پہاڑ جس پر اللہ نے تجلی فرمائی جب جناب موسیٰؑ سے کلام کیا تھا اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: زمانۂ جاہلیت میں (مبعوث برسالت ہونے سے قبل) پتھر مجھے سلام کرتا تھا جسے میں آج بھی پہچانتا ہوں۔ یہ دلیل ضعیف ہے اس لیے کہ پہاڑ جب جماد ہے تو اس میں معرفت خدا کا ہونا محال و ناممکن ہے، اگر اس کی بنیاد ہی زندوں والی ہو تو وہ پہاڑ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خداوند عالم نے اس پتھر کو حیات دی، اس نے پیغمبرؐ پر سلام کیا پھر اسے پتھر بنا دیا۔ یہ پیغمبرؐ کا معجزہ شمار ہوگا۔

سوم: وہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کو خوف خدا کی دعوت دیتا ہے یا خوف کا سبب بنتا ہے کہ اس کے صانع پر دلالت کرتا ہے، جب اس میں معجزات و عجائبات کا مشاہدہ کرتا ہے تو (اس کے دل میں) خوف خدا پیدا ہوتا ہے۔ اس میں غور و فکر کرنا خوف کی طرف دعوت دینا ہے۔

چہارم: یہ ضرب المثل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے یعنی پتھر خدا کے امر کی اطاعت کرتے ہوئے اس سے ڈرتا ہے۔ اس میں وہی (خوف) پایا جاتا ہے جو کسی زندہ اور صاحب عقل میں پایا جاتا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (سورۂ کہف، آیت ۷۷) (وہاں پر انھوں نے دیکھا کہ ایک دیوار گرا چاہتی ہے انھوں نے اس دیوار کو درست کر دیا) گویا اس کا ارادہ ہے یعنی گرنا چاہتی ہے یعنی اس میں وہی میلان ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کسی زندہ سے ظاہر ہوتا تو اس کے ارادہ پر دلالت کرتا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۔ (سورۂ اسراء، آیت ۴۴) (اور کوئی شے ایسی

نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو)

اللہ کا ارشاد ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (سورۂ حشر، آیت ۲۱) (اگر ہم نے اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کر دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے) یعنی اگر پہاڑ ڈرنے والوں میں ہے تو آپ اسے خوف زدہ دیکھیں گے اس وجہ کی تائید اللہ کا یہ ارشاد کر رہا ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ. (سورۂ حشر، آیت ۲۱) (اور یہ مثالیں ہم انسانوں کے لیے بیان کرتے ہیں)

پنجم: هُبُوط (گرنا) ممکن ہے متعدی ہو یعنی گرانے کے معنی میں ہو۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ، (تم جو عمل کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے) اے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کرنے والو! اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے والو! اس کے متعلق ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں۔

❀❀❀❀❀

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾
اے مومنو! کیا تم امید لگائے بیٹھے ہو کہ یہ تمھاری بات مان لیں گے حالاں کہ ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا کو سنتے ہیں پھر اس کو سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کے اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔

الفاظ ومعانی:

طَمع کے معنی نفس کا اس چیز سے وابستہ ہونا ہے جس کے بارے میں وہ نفع کا گمان کرتا ہے اور اس کی نظیر ہے اَمَل اور رَجَاء اور اس کی ضد یَاس یعنی ناامیدی ہے۔

فَرِيْق مانند طَائِفَة (گروہ) جمع ہے اس کے لفظ سے اس کا واحد نہیں ہے۔ جس طرح جماعت کو حزب کہا جاتا ہے: تَحْرِيْفُ فِي الْكَلَامِ کے معنی کلمہ کو اس کے معنی سے بدل دینا ہیں۔

ترکیب:

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ میں ہمزہ استفہام کے لئے آیا ہے جو بہت سے مقامات پر انکار کے لئے آتا ہے جب اس کے ساتھ نفی نہ ہو۔ جب اس کے ساتھ نفی آئے تو نفی کا انکار تثبیت یعنی مثبت بناتا ہے اور اقرار کی درخواست کے معنی میں ہوتا ہے جیسے: اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ تو اس کا جواب بَلیٰ ہے۔ جس طرح اس آیت میں ہے: اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَذِیۡرٌ قَالُوۡا بَلیٰ، اَفَتَطۡمَعُوۡنَ کا جواب لَا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

تفسیر:

بے جا توقع

یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے خطاب ہے کہ: اَفَتَطۡمَعُوۡنَ۔ اے صاحبان ایمان کیا تم امید لگائے بیٹھے ہو کہ یہ تمھاری بات تسلیم کرلیں گے؟

اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ ،غور وفکر اور اعتبار کے ذریعہ اپنے اختیار سے حق کی پیروی اور اسے تسلیم کریں گے۔

وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ، یعنی وہ ہیں جن کی حالت اپنے بزرگوں جیسی ہے۔

یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ (وہ کلام خدا کو سنتے ہیں) جانتے ہیں کہ وہ حق ہے پھر بھی دشمنی کرتے ہیں اور (کلام خدا) میں تحریف کرتے ہیں اور غلط تاویل کرتے ہیں۔

بیان کیا گیا ہے: وہ علماء یہود ہیں جنہوں نے تورات میں تحریف کی، جو اپنے خواہشات کی پیروی کرتے تھے، رشوت دینے والوں کی کمک کرتے ہوئے اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے تھے۔ یہ روایت مجاہد اور سدی سے منقول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: یہ وہ ستر افراد تھے جنھیں جناب موسیٰ نے منتخب کیا تھا۔ انھوں نے کلام الٰہی کو سنا، لیکن اس کے حکم کو بجانہیں لائے جب ان کی قوم ان کی جانب رجوع کرتی تو وہ ان کی خبروں میں تحریف کردیتے۔ یہ ابن عباس اور ربیع کا قول ہے۔ اس طرح کلام اللہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ جناب موسیٰ سے اللہ کا کلام وگفتگو ہے جب وہ محو مناجات ہوتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ کلام الٰہی ہے جو تورات میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَه مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ، (پھر اس کو سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف کر دیتے ہیں) اس میں دو وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے سمجھنے کے بعد اسے بدل دیا اور دشمنی کرتے ہوئے اس کا انکار کر دیا۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ، وہ جان بوجھ کر اس میں تحریف کرتے یعنی بدل دیتے تھے۔

دوم: وہ جانتے تھے کہ ثابت ہونے کے بعد ان کے تحریف کرنے میں عذاب ہے۔ پہلا قول ہمارے مذہب سے زیادہ مناسب اور موافق ہے۔ اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہودی مراد ہیں جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے اور انھوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کی نبوت سے انکار کیا۔ پس ان کے آباء و اجداد جو جناب موسیٰ کے دور میں تھے، ان کے لیے نمونہ ہوں گے جب وہ انکار اور دشمنی پر باقی رہیں گے۔ جنہوں نے دشمنی اور تحریف کی وہ گنے چنے لوگ تھے۔ وہ انہی کی طرح حق کو پوشیدہ کرنے کو جائز جانتے تھے اگر چہ بڑی تعداد اور جم غفیر اس سے منع کرتی تھی اس امر کے باعث جو اسباب کے اختلاف کی جانب پلٹتے تھے۔

لہٰذا وہ قول باطل ہو جاتا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام کے تمام جاننے والے معاند اور دشمن تھے اس لیے کہ خداوند عالم نے ان میں سے فریق (ایک گروہ) کی جانب دشمنی کی نسبت دی ہے اگر چہ سب کے سب کافر تھے۔ اس آیت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ شریعت میں تحریف کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور جو فتاویٰ میں بدعت کا اظہار کرنے فیصلوں میں اور دیگر امور میں تحریف کو بھی شامل ہے۔

❀❀❀❀❀

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۷۶﴾

اور جب یہ لوگ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جس وقت آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمائی ہے تم انھیں اس لیے بتا دیتے ہو کہ وہ اس کے ذریعہ تم کو تمھارے پروردگار کے سامنے مورد الزام ٹھہرائیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

الفاظ و معانی:

حَدِيث، خَبَر، نَبَأ ایک جیسے ہیں۔ حدیث حدوث سے مشتق ہے گویا زمانہ کے حوادث کے بارے میں بتلایا جا رہا ہے۔

فَتح دراصل بند چیز کا کھولنا ہے۔ اس کا استعمال بیشتر موارد میں ہوتا ہے:

۱۔ ان میں سے ایک معنیٰ فیصلہ کے ہیں، اس طرح کہا جاتا ہے: اَللّٰهُمَّ افْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَ فُلَانٍ (یعنی پروردگار میرے اور فلاں کے درمیان فیصلہ فرما!)

۲۔ يَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ یعنی یہ فیصلہ کب ہوگا۔ يَوْمُ الْفَتْحِ وَيَوْمُ الْقَضَاءِ (یعنی فتح کا دن اور فیصلہ کا دن ہے) قاضی کو فَتَّاح کہا جاتا ہے۔

۳۔ تعلیم کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس طرح کہا جاتا ہے: اِفْتَحْ عَلَىٰ هَٰذَا (یعنی اس بارے میں جو کچھ تمھارے پاس ہے اس کی مجھے تعلیم دو)

۴۔ نصرت و مدد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی بارے میں ارشاد الٰہی ہے: إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ (سورۂ انفال، آیت ۱۹) اے کافرو! اگر تم مدد چاہتے تھے تو نصرت تمھارے سامنے آگئی ہے۔

۵۔ اس کا استعمال شہر فتح کرنے کے بارے میں بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے: مسلمانوں نے فلاں زمین کو فتح کیا۔

مُحَاجَّة، مُجَادَلَة اور مُنَاظَرَة باہم مشابہ ہیں۔ مُحَاجَّة یہ ہے کہ دو نزاع کرنے والوں میں سے ہر

ایک مدمقابل پر حجت پیش کرے۔ حدیث میں اس طرح وارد ہوا ہے: فَحَجَّ آدَمُ مُوسیٰ (یعنی آدم نے موسیٰ پر حجت میں غلبہ حاصل کیا)۔ حج کے لغوی معنی قصد کے ہیں۔ اسی سے الحج ہے جو کہ مخصوص صورت میں بیت اللہ کا ارادہ کرنا امور کی صحت و درستی کے لیے نقطۂ مقصود ہے۔

شان نزول:

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے آپ نے فرمایا: یہودیوں کا ایک گروہ تھا جو معاندین میں سے نہیں تھا جب مسلمانوں سے ملتا تو توریت میں موجود آنحضرتؐ کی صفات کے بارے میں گفتگو کرتا۔ ان کے بزرگ انھیں ایسا کرنے سے منع کرتے اور کہتے: تورات میں موجود محمدؐ کی صفات انھیں نہ بتانا کہ وہ انھیں چیزوں کو بارگاہ خدا میں تمہارے خلاف دلیل بنا کر پیش کریں گے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

مجاہد نے کہا ہے کہ یہ آیت بنی قریظہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب ان سے پیغمبرؐ نے فرمایا: یَا اِخْوَۃَ الْقِرَدَۃِ وَالْخَنَازِیْر، اے بندروں اور خنزیر کے برادران! وہ کہنے لگے اس بات کی خبر محمدؐ کو کس نے دی؟ یہ بات تمہارے ہی ذریعہ نکلی ہے۔

سُدی نے کہا ہے: یہ وہ یہودی تھے جو ایمان لانے کے بعد منافق ہو گئے تھے اور عرب مومنین سے اپنے بزرگوں پر عذاب کیے جانے سے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ بعض نے بعض سے کہا: کیا تم انھیں اس عذاب کے متعلق بتادو گے جو خدا نے تم پر واضح کر دیا ہے؟ (یعنی تورات کے مطالب) تاکہ وہ تمہارے خلاف دلیل بنا سکیں اور وہ کہتے تھے: ہم تمھاری نسبت اللہ کے نزدیک زیادہ محترم ہیں۔

تفسیر:

اندر کچھ باہر کچھ

وَ هُمُ الَّذِیْنَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ اور یہ وہی لوگ ہیں کہ جب مومنین سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں: اٰمَنَّا؛ ہم ایمان لے آئے یعنی ہم تصدیق کرتے ہیں کہ محمدؐ سچے نبی ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب میں انھیں اوصاف اور صفات کے ساتھ پایا ہے جس طرح تم ان کی تصدیق کرتے ہو۔

یہ یہودی کہ اللہ تعالیٰ نے جن کی صفات بیان کی ہیں: وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ، جب ایک

دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں، ان کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا تو وہ کہتے ہیں: أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ (جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمادی ہے تم انھیں بتلا دیتے ہو)

کلبی نے بیان کیا ہے: جس چیز کا حکم اللہ نے تمھاری کتاب میں دیا ہے کہ محمدؐ کی ذات گرامی حق ہے۔ آپ کا قول سچا ہے۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اس کے معنی ہیں: اس بارے میں عربوں سے نہ بتاؤ (تم انھیں توریت کے مطالب بتاتے ہو) تم اقرار نہ کرو کہ وہ نبیؐ ہیں۔ تم بخوبی واقف ہو ان کے بارے میں تم سے عہد و پیمان لیا گیا ہے کہ ان کی پیروی کرنے کا کہ وہ ایسے پیغمبر ہیں جن کا ہم انتظار کر رہے ہیں، جنھیں ہم اپنی کتاب میں پاتے ہیں ان کا انکار کرو۔ ان کے پیغمبر ہونے کا اقرار نہ کرو۔

کسائی نے بیان کیا ہے کہ کیا تم انھیں وہ باتیں بتاتے ہو کہ جن باتوں کو خداوند عالم نے تمھاری کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت، ان کی بشارت اور ان کے بارے میں بعض ارشادات کی وضاحت فرمائی ہے، جس کے بارے میں ہم شان نزول کے ذیل میں ذکر کر چکے ہیں۔ قوی ترین تاویلات میں سے وہ قول ہے جس میں کہا گیا ہے: أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ، یعنی جس چیز کا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے اور تمہارے متعلق حتمی فیصلہ کیا ہے اور تم پر اس کا حکم یہ ہے کہ اس نے تم سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد لیا ہے اور تمہارے لیے ان کے صفات تورات میں بیان کی ہے۔ تمہارے بارے میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ تمھیں بندر اور خنزیر بنا دیا۔

ارشاد الٰہی لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ، تاکہ ان کے لیے تمہارے اوپر اللہ کی طرف سے دنیا و آخرت میں حجت ہو، پیغمبرؐ پر ان کے ایمان کے بارے میں جب تم اس کا اقرار کر لو گے اور اپنی کتاب سے اس بات کی صحت کی خبر دو گے، اس چیز سے تم پر اللہ کے نزدیک حجت واضح ہوتی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں: تاکہ وہ تم سے بحث و تکرار کریں اور تم سے کہیں کہ تم نے اقرار کر لیا ہے کہ تمھاری کتاب میں نبیؐ کی ذات حق ہے، پھر بھی تم ان کی پیروی اور اتباع نہیں کرتے یہ اس کا ارشاد: عِنْدَ رَبِّكُمْ، ابن الانباری نے کہا ہے: اس کے معنی ہیں تمہارے پروردگار کے حکم میں۔ جس طرح کہا جاتا ہے: "شافعی کے نزدیک یہ چیز حلال ہے" یعنی ان کے حکم میں۔ یہ چیز اللہ کے نزدیک حلال ہے یعنی اللہ کے حکم میں۔

أَفَلَا تَعْقِلُونَ، اے لوگو! تم نہیں سمجھتے ہو کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب کے متعلق تمھاری خبریں جنھیں تم ان کے لیے بیان کرتے ہو (یعنی) تمھاری کتب میں محمدؐ کی تعریف کا پایا جانا پروردگار کی

طرف سے تم پر حجت ہے۔ جس سے وہ تم پر احتجاج واستدلال کرتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: اے صاحبان ایمان! تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس بارے میں ان کی نہ سنو۔ یہ روایت حسن سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں سے خطاب ہے۔ اے یہودیو! تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ جبکہ تمہارے روساء اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ بات ان کے لیے ایک طرح کی تحذیر اور ہوشیار باش ہے کہ انھوں نے اپنے سرداروں کی باتوں سے انحراف کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾
کیا وہ نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ چھپاتے ہیں یا جس بات کو ظاہر کرتے ہیں خدا کو وہ سب معلوم ہے؟

تفسیر:

خدا سب کچھ جانتا ہے

اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ یعنی کیا یہود نہیں جانتے ہیں کہ بے شک خداوند عالم ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ پس کس طرح اس بات کو صحیح قرار دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے برادران سے ان باتوں کے بتلانے کو پوشیدہ رکھیں جو حق ہیں جبکہ وہ ان کا اقرار کر رہے ہیں، انکار نہیں کر رہے ہیں جیسے کفار و منافقین کہ خداوند عالم ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہے، پس وہ لوگ اس جہت سے ملامت کے زیادہ حقدار ہیں اور مذمت ان کے لئے لازم وضروری ہے۔ یہ تفسیر بیشتر مفسرین کی جانب سے ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں: کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک یقیناً اللہ ان کے کفر اور حضرت محمدؐ کو جھٹلانے کے بارے میں جانتا ہے جسے وہ پوشیدہ رکھ رہے ہیں اور جو کچھ وہ اپنے قول آمنا سے اعلان کر رہے ہیں جب وہ اصحاب محمدؐ سے ملتے ہیں کہ اس طرح وہ انھیں راضی رکھیں۔ یہ روایت قتادہ اور ابو العالیہ سے مروی ہے۔

❁❁❁❁❁

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ إِلَّا اَمَانِيَّ وَ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

اور کچھ ان میں سے ایسے جاہل ہیں کہ وہ کتاب خدا کو اپنے مطلب کی باتوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور وہ محض خیالی باتیں بناتے رہتے ہیں۔

قرائت:

ابو جعفر، شبیہ اور حسن نے امانی کو بغیر تشدید کے اور بقیہ قراء نے تشدید کے ساتھ قرأت کیا ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں: لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ. میں ہے۔

حجت:

ابن جنی نے کہا: اَمَانِيّ میں اصل تشدید کے ساتھ ہونا ہے اس لئے کہ اَمَانِيّ اُمْنِيَّةٌ کی جمع ہے اور اس طرح کے کلمات میں تخفیف بہت زیادہ ہوتی ہے اسی میں سے پہلے یاء محذوف ہے جو غیر ادغام کے ساتھ یاء کے مانند ہے جیسے قَرَاطِيس، حَوَامِين، اَرَاجِيح کی یاء جو کہ قِرْطَاس، حَوْمَانَة اور اُرْجُوحَة کی جمع ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ اس طرح کے کلام میں یاء کو حذف کر دیا گیا ہے:

وَالْبَكَرَاتِ الْفُسَّجَ الْعَطَامِسَا

اور اس کلام میں:

وَغَيْرُ سُفْعٍ مُثَّلٍ يَحَامِمِ

کہ مراد عَطَامِيس اور يَحَامِيم ہے اس لئے کہ ادغام کے ساتھ یاء کو حذف کرنا زیادہ آسان ہے بغیر ادغام کے حذف کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یاء جب اس میں ادغام ہوتا ہے تو بغیر تشدید کے ہو جاتی ہے اور قریب ہوتا ہے کہ وہ ختم ہی ہو جائے۔ جب آپ اسے حذف کر دیں گے تو گویا آپ ایک ایسی چیز کو حذف کریں گے کہ جو ہوتے ہوئے بھی محذوف کے مانند تھی۔

الفاظ ومعانی:

اُمّیٌ (وہ شخص) جو اچھی طرح لکھ نہیں سکتا۔ اس کو اُمّی کہنے کی چند وجوہات ہیں:

اول: اُمَّۃُ الْخِلْقَۃ کو اُمی کہتے کیوں کہ وہ اپنی خلقت پر باقی رہتا ہے۔

دوم: اُمَّۃ سے ماخوذ ہے جو کہ گروہ اور جماعت ہے یعنی وہ اس اصل پر ہے جس پر امت ہوتی ہے چونکہ لکھتا نہیں ہے اس لیے کہ کتابت (تحریر) سے استفادہ نہیں کرتا ہے۔

سوم: اُم سے ماخوذ ہے یعنی وہ اس حالت پر ہے جس پر اس کی ماں نے پیدا کیا تھا کہ وہ لکھتا نہیں ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اُم (ماں) کی طرف اس لیے نسبت دی گئی کہ کتابت مردوں میں ہوتی ہے نہ کہ عورتوں میں (یعنی مرد لکھتے تھے عورتیں نہیں لکھتی تھیں)

اُمْنِیَّۃ کے بارے میں چند وجہیں ذکر کی گئی ہیں:

اول: اس کے معنی تلاوت کرنے کے ہیں۔ اس طرح کہا جاتا ہے: تَمَنّٰی کِتَابَ اللّٰہِ یعنی کتاب خدا کی تلاوت کی۔

دوم: اَمَانِی سے مختلف گفتگو اور باتیں مراد ہیں۔ یہ روایت فراء سے منقول ہے۔

سوم: اَمَانِی سے مراد یہ ہے کہ (یہودی) اللہ سے اس چیز کی تمنا کرتے تھے جو ان کے لیے نہیں تھی جیسا کہ وہ کہتے تھے: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً. (سورۂ بقرہ، آیت ۸۰) ہمیں آتش جہنم مس نہیں کرے گی مگر چند دن (کی سزا مل جائے گی)۔ یا ان کا یہ کہنا ہے کہ: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ. ہم اللہ کے فرزندان اور اس کے دوست ہیں۔ زجاج نے بیان کیا ہے کہ جب قائل کوئی ایسی بات کہتا ہے جسے وہ نہیں جانتا ہے تو گویا وہ اس کی تمنا کرتا ہے، یہ لوگوں کے کلام میں استعمال کیا جاتا ہے تم اس شخص کے لیے جو ایسی بات کہتا ہے کہ جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور وہ اسے چاہتا اور پسند کرتا ہے تو (اس طرح کہتا ہے:) ھٰذَا اُمْنِیَّتِیْ وَھٰذِہٖ اُمْنِیَّتُہٗ۔

ظَنٌّ کے معنی صحیح علامت ونشانی کے ذریعہ کسی ایک (طرف) کو دوسری جانب پر ترجیح دینا ہے یہ مذہب کے صحیح اعتقادات سے نہیں ہے۔ لوگوں میں بعض وہ ہیں جن کا کہنا ہے یہ اعتقاد (عقیدہ) ہے۔

ترکیب:

زجاج نے کہا: اُمِّيُّوْنَ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اور مِنْهُمْ اس کی خبر ہے۔ اخفش کے قول کے مطابق اُمِّيُّوْنَ ان کے فعل كَانَ اور اِسْتَقَرَّ کی بنا پر مرفوع ہے۔

ابو علی نے کہا: اُمِّيُّوْنَ اخفش کے نزدیک ایک فعل کی وجہ سے مرفوع نہیں ہے بلکہ ظرف کی وجہ سے مرفوع ہے جو مِنْهُمْ ہے۔

سیبویہ کا نظریہ ہے کہ وہ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اور اس کے نزدیک مِنْهُمْ میں اُمِّيُّوْنَ کی ضمیر ہے اور اس کے نظریہ کے مطابق مِنْهُمْ محلا مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر جگہ پر آیا ہے لیکن اخفش کے نزدیک مِنْهُمْ میں اُمِّيُّوْنَ کی ضمیر نہیں ہے اور نہ ہی اس کے نزدیک مِنْهُمْ کا کوئی محل اعراب ہے جس طرح آپ کے کلام ذَهَبَ زَيْدٌ میں ذَهَبَ کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔

اخفش نے اسم ظرف کی بنا پر رفع دیا ہے اس لئے کہ انہوں نے ان ظروف کو مدنظر رکھا تو دیکھا کہ یہ ظروف کئی مقامات پر فعل کی جگہ پر آتے ہیں اور یہ کہ ان میں ضمیر ہوتی ہے جس طرح فعل میں ضمیر ہوتی ہے اور اسم فاعل وغیرہ کا قائم مقام قرار پاتے ہیں اور ان موجود باتوں کی تاکید ہوتی ہے جس طرح فعل میں تاکید ہوتی ہے اور اسی طرح کے کلام میں قائم مقام ہوتا ہے جیسے: مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَكَ اَجْمَعُوْنَ اور اس کے حال کو نصب دیا جاتا ہے جس طرح فعل کے ذریعہ نصب دیا جاتا ہے اور ان دونوں کے ذریعہ اسماء موصولہ لایا جاتا ہے جس طرح فعل و فاعل میں موصول کی ضمیر ہوتی ہے اس کے ذریعہ نکرہ کی صفت لائی جاتی ہے جس طرح فعل و فاعل کے ذریعہ اس کی صفت لائی جاتی ہے۔ جب اخفش نے دیکھا کہ ظروف ان مقامات پر فعل کی جگہ جاری کر دیا اور اس کے ذریعہ اسم کو رفع دے دیا جس طرح فعل کے ذریعہ دیا جاتا ہے کہ جب یہ ظروف ان مقامات پر فعل کی جگہ آگئے تو عِنْدَكَ زَيْدٌ فِي الدَّارِ زَيْدٌ اَوْ عَمْرٌو اور مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ وغیرہ میں یہ کہہ دیا یہ سب ظرف کی وجہ سے مرفوع ہیں اس لئے کہ ظرف اور جار مجرور ان مقامات کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی فعل کا قائم مقام ہوا ہے۔

اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں پر اسم ظرف کی وجہ سے مرفوع ہے اس فعل کے ذریعہ جو اِسْتَقَرَّ وغیرہ ہے یہ ہے کہ اگر وہ فعل کے ذریعہ مرفوع ہوتا تو قَائِمًا اِسْتَقَرَّ زَيْدٌ صحیح ہوتا یہاں پر حال کو مقدم کرنے کا منع

ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں پر فعل نے عمل نہیں کیا۔

اِلَّا اَمَانِيَّ، استثناء منقطع کی بنا پر منصوب ہے جیسا کہ یہ ارشاد الٰہی ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔

جیسے شاعر کا شعر ہے:

لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ قَيْسٍ عِتَابٌ غَيْرَ طَعْنِ الْكُلٰى وَضَرْبِ الرِّقَابِ

اور نابغہ کا شعر ہے:

حَلَفْتُ يَمِيْنًا غَيْرَ ذِيْ مَثْنَوِيَّةٍ وَلَا عِلْمَ اِلَّا حُسْنَ ظَنٍّ بِصَاحِبِ

اِنْ هُمْ میں اِنْ، مَا کے معنی میں ہے یعنی مَا هُمْ اِلَّا ظَانُّوْنَ پس هُمْ مبتدا ہے اور يَظُنُّوْنَ اس کی خبر ہے۔

تفسیر:

ان میں بھی ان پڑھ ہیں

وَمِنْهُمْ، وہ یہودی جن کے واقعات خداوند عالم نے ان آیات میں بیان فرمائے ہیں اور ان کے ایمان سے لالچ کو ختم کر دیا ہے۔ اُمِّيُّوْنَ یعنی کتاب سے ناواقف کتاب کی حفظ و تلاوت سے واقف ہیں نہ کہ رعایت و درایت و فہم کے اعتبار سے جو اس میں موجود ہے۔ یہ روایت ابن عباس و قتادہ سے مروی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: اُمِّيُّوْن سے وہ امتیں مراد ہیں جن پر کتاب نازل نہیں ہوئی۔ نبی اُمّی نہ لکھنے والے کو کہتے ہیں۔

لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ، یعنی نہیں جانتے کہ اس کتاب میں کیا ہے جسے خداوند عالم نے نازل فرمایا ہے، نہ ہی اس سے واقف ہیں کہ خداوند عالم نے اس میں احکام و فرائض میں سے کیا ودیعت فرمایا ہے یہ لوگ چوپاؤں کے مانند ہیں وہ نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ الکتاب جس پر لام تعریف داخل ہوا ہے اس سے تورات مراد ہے۔ اِلَّا، لٰكِنَّ کے معنی میں ہے۔ اَمَانِيَّ یعنی ایسی بات کہ وہ اپنی زبان سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے: ایسی باتیں کہ جنھیں ان کے علماء گڑھ رہے ہیں۔ یہ کلبی کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: یہ تلاوت ہے جسے وہ صرف تلاوت کر رہے ہیں لیکن جانتے نہیں کہ کیا ہے۔ یہ کسائی اور

فراء کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: (اَمَانِیَّ) خدا سے رحمت کی تمنا کرتے ہیں، شیطان ان کی عقل میں داخل ہوجاتا ہے، انھیں سمجھاتا ہے کہ ان کے لیے خدا کے یہاں خیر ہے اور وہ پیغمبرؐ کی وفات پر اسلام کے خاتمہ اور اپنے اقتدار کی واپسی کی تمنا کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے: اَمَانِیَّ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اندازے سے جھوٹ بولتے ہیں اور باطل گفتگو کرتے ہیں۔

اس مقام پر تمنیٰ یعنی جھوٹ گڑھنا اور قیاس و اندازہ سے جھوٹ بولنا ہے جس کی تقویت اس کا یہ ارشاد کر رہا ہے: وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ، اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ وہ لوگ ظن اور گمان کے سبب اختلاف کر رہے ہیں نہ کہ یقینی طور پر۔ اگر امانی کے معنی یہ ہوں کہ وہ اس کی تلاوت کر رہے ہیں تو وہ گمان کرنے والے نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اگر وہ اس کی تمنا کریں گے چونکہ جو تلاوت کرتا ہے اور اس میں تدبر اور غور و فکر کرتا ہے تو اس سے واقف ہوجاتا ہے۔ تمنا کرنے والے کے لیے اس کی تمنا کی حالت میں نہیں کہا جاتا کہ وہ تمنا کا گمان کر رہا ہے، نہ ہی شک کرنے والا کہا جاتا ہے جس سے وہ واقف ہوتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو توارت کے اللہ کی جانب سے ہونے میں شک نہیں تھا۔

اس کا ارشاد: وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ، یعنی وہ شک کرنے والے ہیں۔

آیت کریمہ میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ معنیٔ کتاب میں اور ان چیزوں میں جن کا راستہ علم ہے تقلید جائز نہیں ہے اور ابواب دیات میں ظن و گمان پر انحصار کرنا جائز نہیں ہے۔ کتاب کی حجت تمام مخلوقات پر ثابت ہے اگرچہ وہ اس سے واقف نہ ہو جب ان کے لیے اس کا علم حاصل کرنا ممکن ہو معنی کتاب کی معرفت پر اعتماد واجب ہے، فقط تلاوت پر نہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۷۹﴾

پس تباہی ہو ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ تو اللہ کے پاس سے آئی ہے تا کہ اس کے معاوضے سے تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں افسوس ہے ان پر جو کچھ انھوں نے لکھا اور افسوس ہے ان پر جو کچھ انھوں نے کمایا۔

الفاظ و معانی:

وَيْلٌ باعتبار لغت وہ کلمہ ہے جسے ہر ہلاکت کے واقع ہونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے اصل معنی عذاب اور ہلاکت کے ہیں۔ اسی کے مانند وَيْح اور وَيْس ہے۔ اصمعی نے بیان کیا ہے یہ تَقْبِيح (یعنی کسی کی بدنمائی یا کسی کے کام کی خرابی اور برائی کو ظاہر کرتا ہے) اسی سے متعلق یہ ارشاد ہے: وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ (سورۂ انبیاء، آیت ۱۸) (اور تم پر افسوس ہے کہ ایسی ناحق باتیں بناتے ہو) مفضل نے کہا ہے: اس کے معنی حزن کے ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ هَوَان (یعنی کسی کے کام کو حقیر جاننے کے ہیں) اور رسوائی کرنے کے ہیں۔

اور کہا گیا ہے کہ كَسْب سے مراد ہر وہ عمل ہے جو اعضاء و جوارح سے انجام دیا جائے یا تو اس سے نفع حاصل کیا جائے یا اس سے ضرر و نقصان کو دور کیا جائے۔

ترکیب

وَيْلٌ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر لِّلَّذِينَ ہے۔

زجاج نے کہا: اگر قرآن کے علاوہ کہیں ہوتا تو فَوَيْلًا لِّلَّذِينَ ہوتا اس معنی کی بنا پر کہ جَعَلَ اللهُ وَيْلًا لِّلَّذِينَ (خدا نے ان لوگوں کے لئے ویل قرار دیا ہے)

رفع ان لوگوں کے لئے وَيْلٌ کے ثابت ہونے کے معنی کی بنا پر ہے۔

زجاج کے علاوہ ایک دوسرے عالم نے کہا: جب آپ وَيْل یا وَيْح یا وَيْس کو مضاف قرار دیں گے تو

بغیر تنوین کے انہیں نصب دیں گے اور وَیحَ زید، وَیلُ زید کہیں گے لیکن تعس اور بُعد وغیرہ میں اضافت بہتر نہیں ہے بغیر لام کے اسی لئے وہ مرفوع نہیں ہوگا بلکہ اسی طرح کے کلمات میں کیا کہا جائے گا: تَعَساً لَہٗ، بُعداً لَہٗ، تَبّاً لَہٗ، لام کے ساتھ نصب بھی دے سکتے ہیں جیسے: وَیلاً لِزَیدٍ وَ وَیحاً، شاعر نے کہا:

کَسَا اللُّؤمُ تَیماً خُضرَۃً فِی جُلُودِھَا فَوَیلاً لِتَیمٍ مِن سَرَابِیلِھَا الخُضرِ

تفسیر:

یہود اور کتاب خدا میں تحریف

خداوند عالم نے پھر سے علماء یہود کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: فَوَیلٌ لِّلَّذِینَ یَکتُبُونَ الکِتٰبَ، پس تباہی ہو ان کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں۔ ابن عباس نے کہا ہے: آیت میں ویل سے عذاب مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ وَیلٌ جہنم میں ایک وادی ہے۔ خُدری نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جہنم میں وادی ہے جس میں کافر کو اس کی گہرائی تک پہونچنے سے چالیس خریف (برس) قبل تک کے لیے ڈال دیا جائے گا۔ اصل وہ ہے جس کو ہم نے بیان کیا ہے کہ (وَیلٌ) حسرت واظہار اذیت اور تکلیف کا فقرہ ہے جسے تکلیف میں مبتلا اور ہر ہلاک ہونے والا کہتا ہے۔ قرآن میں اس طرح ہے: یَا وَیلَتَنَا مَا لِھٰذَا الکِتَابِ (سورۂ کہف، آیت ۴۹) (ہائے کم بختی یہ کیسی تحریر ہے!)

ارشاد ہوتا ہے: لِّلَّذِینَ یَکتُبُونَ الکِتٰبَ بِاَیدِیھِم ثُمَّ یَقُولُونَ ھٰذَا مِن عِندِ اللہِ، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر اس کی نسبت اللہ کی جانب دیتے ہیں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: مِمَّا عَمِلَت اَیدِینَا، یعنی اسے ہم نے خود انجام دیا ہے، اپنے بندوں میں سے کسی کے حوالے نہیں کیا ہے۔ اسی طرح خَلَقتُ بِیَدَیَّ ہے (یعنی ہم نے اسے خود خلق کیا ہے) اسی طرح کہا جاتا ہے: میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، میں نے اپنے کان سے سنا اور میں نے خود اس سے ملاقات کی ہے۔ ان سب کے معنی تاکید کے ہیں۔

اسی طرح انسان اس کتاب کی نسبت بھی اپنی طرف دیتا ہے جس کے لکھنے کا حکم کسی اور کو دیتا ہے اور کہتا ہے: "میں نے فلاں کو لکھا" "میری یہ تحریر فلاں کے لیے ہے" اس کا ارشاد ہے: یُذَبِّحُ اَبنَآءَھُم (فرعون ان کے مردوں کو ذبح کرتا تھا) جبکہ فرعون ذبح کرنے کا حکم دیتا تھا۔ خداوند عالم ہمیں بتلانا چاہتا ہے کہ وہ خود اپنے

ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ یقینی طور پر جانتے ہیں کہ وہ (اللہ) کی طرف سے نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں: اس چیز کو انھوں نے خود اپنی جانب سے انجام دیا، جس طرح کوئی شخص کسی مذہب، نظریہ یا قول کی اختراع و ایجاد کرے جسے پہلے انجام نہ دیا ہو تو اس سے کہا جاتا ہے۔ یہ تمھارا مذہب اور نظریہ ہے۔ یہ تمھارا قول ہے، اگرچہ تمام اقوال اس سے لیے جاتے ہیں اسی کا یہ قول ہے مگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ خود تمھاری طرف سے ہے جسے تم نے اس سے قبل بیان نہیں کیا۔

کہا گیا ہے: وہ خود توریت لکھتے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت میں تحریف کر دیتے تاکہ اس طرح کمزور یہودیوں کے درمیان شک پیدا کرا دیں۔ یہی بات امام محمد باقر علیہ السلام اور مفسرین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ تورات میں آپ کا رنگ گندم گوں اور قد میانہ تھا جسے انھوں نے طویل القامت لکھ دیا۔ عکرمہ کے واسطہ سے ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا احبار یہود (علمائے یہود) نے پیغمبرؐ کی صفت کو تورات میں پایا کہ آپ کی آنکھیں سرمگیں، میانہ قد اور خوبصورت چہرہ ہوگا جسے انھوں نے دشمنی اور حسد کے سبب مٹا کر دیا (علمائے یہود) کے پاس قریش کا ایک شخص آکر کہنے لگا: تم لوگ تورات میں ہمارے نبی کے بارے میں کیا پاتے ہو؟ وہ کہنے لگے: ہاں وہ طویل القامت، زرد رنگ اور طویل بالوں والے ہیں۔ اس کا ذکر واحدی نے اپنی سند سے وسیط میں کیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ آیت سے مراد پیغمبرؐ کا کاتب ہے، جو آپ کے لیے کتابت کرتا تھا، آپؐ جو باتیں اس سے لکھواتے وہ انھیں بدل دیتا تھا، آخر کار وہ مرتد ہو کر مرا۔ پہلی صورت زیادہ مناسب ہے چونکہ کلام کے سیاق و سباق سے بہت زیادہ موزوں ہے۔

اس کے ارشاد: لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا، سے مراد یہ ہے: تاکہ اس چیز کو حاصل کریں جو عوام سے اموال لیا کرتے تھے، اِشْتِرَاء (یعنی فروخت کرنا) کی لفظ توسیع کے اعتبار سے ذکر کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے حق کو ترک کر دیا اور باطل کا اظہار کیا تاکہ اس کے ذریعہ وہ کوئی چیز حاصل کریں جس طرح جنس فروخت کرنے والے کو عطا کیا جاتا ہے۔ ثَمَنًا قَلِيلًا کہنے میں فائدہ یہ ہے چونکہ ہر قیمت فقط قلیل و مختصر ہی ہوتی ہے۔ عربوں کا اس بارے میں مشہور طریقہ ہے ان کے کلام کی جستجو کرنے والا اس سے بخوبی واقف ہے قلت و کمی کے لیے کہا جاتا ہے کہ دنیا کی پونجی ہے جس کی مدت نہایت مختصر ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ، یہ روایت ابو العالیہ سے منقول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اسے قلیل و مختصر اس کے حرام ہونے کے سبب کہا گیا ہے۔

اس کا ارشاد ہے: فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ ، ان کے لیے عذاب اور رسوائی ہے اور ان کے لیے یہ چیز نہایت قبیح اور بری ہے کہ انھوں نے کتاب میں تحریف کردی۔ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ (اور افسوس ہے ان پر جو کچھ انھوں نے کمایا) گناہوں کے سبب۔ یہ بھی کہا گیا ہے جس چیز کو یہ لوگ مال حرام اور رشوت کے ذریعہ عوام سے اکٹھا کرتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾

اور وہ یہ کہتے ہیں کہ جہنم کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں ہے مگر یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے۔ ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ اللہ ہرگز اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔ یا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہو جس کا تمھیں علم ہی نہیں ہے۔

الفاظ و معانی:

مَسّ لَمْس کے مانند ہے دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ لَمْس کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ اس کی اصل لُصُوق (یعنی چپکنا اور چمٹنا) ہے اور دو چیزوں کا انتہائی قربت و نزدیکی کے ساتھ جمع ہونا ہے۔

اِخْلَاف کے معنی عمل کے ذریعہ گذشتہ عہد کا توڑنا ہے۔

ترکیب:

أَيَّامًا ظرف (مفعول فیہ) ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ أَتَّخَذْتُمْ کی اصل أَأَتَّخَذْتُمْ ہے، ہمزۂ استفہام ہمزۂ وصل پر داخل ہوا ہے تو ہمزۂ وصل گر گیا ہے۔

قراء میں سے بعض حضرات نے أَتَّخَذْتُمْ میں ذال کو تاء میں مدغم کیا ہے اور کچھ وہ بھی ہیں جنہوں نے ادغام نہیں کیا ہے۔

أَمْ یہاں پر احتمال ہے کہ أَمْ متصلہ ہو ہمزۂ استفہام کے معادلہ کے طور پر گویا اس طرح فرمایا ہے: عَلَى

اَیِّ الْحَالَتَیْنِ اَنْتُمْ أَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ مَا تَعْلَمُوْنَ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَیْهِ مَالَاتَعْلَمُوْنَ (ان دونوں حالتوں میں سے تم لوگ کس حالت میں خدا پر بہتان باندھ رہے ہو جو جانتے ہو وہ یا اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو نادانستہ طور پر) یہ احتمال دیا جاتا ہے کہ اَمْ منقطعہ ہو اس طرح کہ اس سے پہلا جملہ مکمل ہو چکا تھا پس ایسی صورت میں اَمْ، بَلْ اور ہمزہ کے معنی میں ہوگا گویا اس طرح جملہ کا آغاز ہوا ہے: بَلْ أَتَقُوْلُوْنَ ---

شانِ نزول:

ابن عباس ومجاہد نے بیان کیا ہے: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کا گمان تھا کہ دنیا کی مدت سات ہزار برس ہے۔ انھیں ہر برس کے عوض ایک روز عذاب میں مبتلا کیا جائے گا، اس کے بعد عذاب ختم ہو جائے گا۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ابوالعالیہ، عکرمہ وقتادہ نے کہا ہے کہ چالیس دن (عذاب کیا جائے گا) یہ مدت اس عدد کے مساوی ہے جس میں انھوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی۔

تفسیر:

کھوکھلے دعوے

وَقَالُوْا، یہودیوں نے کہا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ، آگ ہم تک ہرگز نہیں پہونچے گی، اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً، معنی مگر بہت کم دن جیسے یہ کہنا: دَرَاهِمُ مَعْدُوْدَةٌ یعنی گنتی کے چند درہم، جب معدودۃ مطلق طور پر بولا جاتا ہے تو اس کے معنی کم اور مختصر کے ہوتے ہیں۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے: اے محمدؐ ان سے کہیے: اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللهِ عَهْدًا، یعنی تمھیں اطمینان ہے کہ وہ تمھیں فقط اتنی ہی مدت تک عذاب میں رکھے گا اور اس چیز کو تم نے اس کی وحی اور تنزیل کے ذریعہ جان لیا ہے (اگر ایسا ہے) تو خداوند عالم اپنے عہد و پیمان کو نہیں توڑتا۔ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ، تمھاری طرف سے (یہ چیز) بطلان اور جہالت کا سبب ہے اور اللہ کے حضور جسارت ہے۔

❀❀❀❀❀

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

ہاں جنھوں نے برائی کا ارتکاب کیا اور ان کے گناہوں نے انھیں ہر طرف سے گھیر لیا تو ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے تو وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

قرائت:

اہل مدینہ نے خَطِيْٓـٰٔتُهٗ جمع کی صورت میں قرأت کی ہے اور باقی قراء نے واحد خَطِيْٓـَٔتُهٗ قرأت کی ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: ممکن ہے کہ مَنْ جزاء جازم کے لئے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ جزاء غیر جازم کے لئے ہو ایسی صورت میں سَيِّئَةً اگر چہ واحد ہے لیکن اس سے مراد کثرت ہے۔ اس طرح خَطِيْٓـَٔةً بھی مفرد ہے اور بہتر ہے کہ مفرد ہی رہے اس لئے کہ ضمیر مفرد کی جانب مضاف ہے۔ اگر چہ اس سے کثرت مراد ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا: بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ أَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ - یہاں پر وَجه اور آجر مفرد ہیں اگر چہ دونوں مقام پر جمع کے معنیٰ میں ہیں اسی طرح مضاف الیہ بھی ہے۔

خَطِيْٓـَٔةً چونکہ ضمیر جمع نہیں ہے لہٰذا اس کو جمع نہیں بنائیں گے جس طرح اس ارشاد الٰہی میں جمع ہے: نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَلِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا؛ اس لئے کہ ان مقامات پر مضاف الیہ جمع ہے۔

جن لوگوں نے خَطِيْٓـٰٔتُهٗ پڑھا ہے انہوں نے معنیٰ پر حمل کرتے ہوئے اس کی جمع بنائی ہے اور مقصود جمع اور کثرت ہے اور اس پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کرتا ہے: فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ؛ فَأُولٰٓئِكَ اس مبتدا کی خبر ہے جو موصول ہے اس شخص کے قول کے مطابق جس نے مَنْ کو جزاء غیر جازم قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ یا مَنْ مبتدا ہے اس نظریہ میں جس نے مَنْ کو جزاء جازم مانا ہے

دونوں صورتوں میں اُولٰئِكَ سے مراد بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً میں موجود مَنْ ہے۔

جو چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد کثرت ہے اس بنا پر خَطِيْئَة کی جمع بنا سکتے ہیں اس لئے کہ وہ معنیٰ کے لحاظ سے جمع کی طرف مضاف ہے تو وہ دلیل بعد والی آیت ہے: وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ أُوْلٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ۔

کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ اَلَّذِيْنَ جمع ہے اور وہ اس کے معادل ہے اسی طرح جو اس کے معادل ہو گا وہ بھی اپنے معادل کے مانند ہو گا۔

ترکیب:

بلیٰ ان لوگوں کی اس بات کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے کہ: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّاماً مَعْدُوْدَةً۔

بَلٰی اور نَعَمْ میں فرق ہے کہ بَلٰی نفی کے جواب میں آتا ہے اور نَعَمْ مثبت کے جواب میں آتا ہے۔

فراء نے کہا ہے کہ علمائے نحو نے جحد نفی کے جواب میں نَعَمْ کے استعمال سے منع کیا ہے اس لئے کہ جب کوئی کسی اور سے کہے گا کہ: مَالَكَ عَلَيَّ شَيْءٌ (میرے اوپر تمہارا کوئی حق نہیں ہے) اگر وہ جواب میں نَعَمْ کہے تو گویا وہ اس کی تصدیق کر رہا ہے اور گویا اس طرح کہا ہے: نَعَمْ لَيْسَ لِيْ عَلَيْكَ شَيْءٌ (ہاں میرا آپ پر کوئی حق نہیں ہے اور جب بَلٰی کہے گا تو وہ اس بات کو رد کرے گا یعنی: بَلٰی عَلَيْكَ شَيْءٌ (تمہارے اوپر میرا حق ہے)

هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ یہ جملہ پہلے جملہ پر عطف ہے بغیر حرف عطف کے اس لئے کہ دوسرے جملہ میں انہیں لوگوں کا تذکرہ ہے جن کا ذکر پہلے جملہ میں ہے اور ضمیر دوسرے جملہ کو پہلے جملہ سے ربط دے رہی ہے جس طرح حرف عطف ربط دیتا ہے۔ اس کے مانند یہ ارشاد الٰہی ہے: إِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلاً مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۔ دوسرے مقام پر واؤ کے ساتھ فرمایا: وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ نیز سَيَقُوْلُوْنَ ثَلَاثَةٌ رَابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْماً بِالْغَيْبِ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۔ رَابِعُهُمْ اور سَادِسُهُمْ سے واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ جملہ میں موجود چیزوں کی بنا پر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ پہلے میں اس کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے کہ حرف اتصال پر دلالت کرتا ہے اور جملہ میں جو باتیں گزر گئی ہیں وہ بھی آپ میں متصل ہی ہیں پس اس کے ذریعہ حرف اتصال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

تفسیر:

نجات اور عذاب کا معیار

خداوند عالم نے یہودیوں کے اس قول: لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً، کی تردید کی ہے۔ ارشاد فرمایا: بَلٰی، یعنی معاملہ اس طرح نہیں ہے جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں بلکہ مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً (جنھوں نے برائی کا ارتکاب کیا)

سَیِّئَۃً (برائی) میں اختلاف ہے۔ ابن عباس، مجاہد و قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: سیئۃ سے مراد شرک ہے اور حسن نے کہا ہے: ایسا گناہ کبیرہ جو آتش جہنم کا سبب ہو۔ سُدی نے کہا ہے: وہ گناہ ہیں جن پر خداوند عالم نے آتش جہنم کا وعدہ کیا ہے۔ پہلا قول ہمارے مذہب کے موافق ہے چونکہ ہمارے نزدیک شرک کے علاوہ کسی گناہ کے سبب (کوئی شخص) آتش جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

اس کا ارشاد: وَّاَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓئَتُہٗ اس میں دو باتوں کا احتمال ہے:

اول: یہ گناہ انھیں ہر طرف سے گھیر لے گا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ (سورۂ توبہ آیت ۴۹) (اور یقیناً جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے)

دوم: اس کے معنی ہیں گناہ نے انھیں ہلاک کر دیا، اس کا ارشاد ہے: اِلَّاۤ اَنۡ يُّحَاطَ بِكُمۡ (سورۂ یوسف، آیت ۶۶) (مگر یہ کہ تمھیں چاروں طرف سے گھیر لیا جائے) اور یہ ارشاد: وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اُحِيۡطَ بِهِمۡ۔ (سورۂ یونس، آیت ۲۲) (اور انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ چاروں طرف سے گھر گئے ہیں) یہ ارشاد: وَاُحِيۡطَ بِثَمَرِهٖ (سورۂ کہف، آیت ۴۲) (آخر کار اس کے پھلوں کو آفت نے گھیر لیا) یہ سب بربادی اور ہلاکت کے معنی میں ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان پر نجات کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ ابن عباس، ضحاک اور ابو العالیہ سے روایت کی گئی ہے کہ خَطِیۡٓئَۃٌ سے شرک مراد ہے۔ حسن سے روایت ہے کہ خطیئۃ گناہ کبیرہ ہے۔ عکرمہ و مقاتل نے کہا ہے کہ گناہ پر اصرار مراد ہے۔ بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓئَتُہٗ: اَحَاطَتۡ بِہٖ سَیِّئَۃٌ، نہیں فرمایا ہے (چونکہ خَطِیۡٓئَۃٌ اور سَیِّئَۃٌ کے درمیان فرق ہے) موجودہ لفظ خَطِیۡٓئَۃٌ بہت زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ، یعنی وہ آتش جہنم میں رہیں گے جو ان کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے:

هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ، وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ یہ ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ اس آیت کی

تفسیر جو ہمارے مذہب سے بہت زیادہ مناسب ہے۔ وہ ابن عباس کی تفسیر ہے چونکہ اہل ایمان اس آیت میں داخل نہیں ہیں۔

اس کا ارشاد: وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ ،اس بات کو قوی بنا تا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی خطائیں انھیں اس طرح گھیر لیں گی کہ جن سے کوئی چھٹکارا نہیں ہوگا ، نہ ہی کوئی بچ نکلنے کا راستہ ہوگا۔ اگر اس کے ساتھ کچھ اطاعت ہوتی تو برائیاں (گناہ) اس کا احاطہ نہ کرتیں۔ یہ آیت حبط (اعمال) کے بطلان پر دلالت کر رہی ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ. آیت میں تصدیق کرنے اور اطاعت کرنے والوں سے دائمی ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ثواب دائمی عذاب دائمی کے ساتھ کس طرح جمع ہو سکتا ہے؟ اسی طرح آیت دلالت کر رہی ہے کہ سَیِّئَةً سے شرک مراد ہے۔ پس عمل کے ایمان میں داخل ہونے کے لیے اس آیت سے استدلال کرنا باطل ہے جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ سَیِّئَةً (گناہ برائی) تو ایک ہے تمام اعمال کو باطل نہیں کر سکتا۔ اس طرح آیت کا عمومیت پر حمل کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اس کو گناہان کبیرہ پر حمل کیا جائے۔ اس لئے کہ سب سے بڑا گناہ شرک ہے تا کہ اس طرح دونوں آیتوں کا جمع کرنا ممکن ہو سکے۔

❁❁❁❁❁

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ "تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ نماز قائم کرنا اور زکوۃ دیتے رہنا" تو چند افراد کے سوا تم سب نے اس عہد سے روگردانی کی اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔

قرائت:

ابن کثیر نے حمزہ اور کسائی نے لَا يَعۡبُدُوۡنَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے تاء کے ساتھ لَا تَعۡبُدُوۡنَ قرأت کی ہے۔

حمزہ اور کسائی نے وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حَسَنًا (حاء اور سین کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے حُسۡنًا حاء پر پیش اور سین کو ساکن پڑھا ہے)

حجت:

جن قراء نے لَا تَعۡبُدُوۡنَ تاء کے ساتھ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ آیت ہے کہ: اِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ اور اس قرأت کو یہ ارشاد الٰہی بھی قوی بناتا ہے: وَقُوۡلُوۡا نیز ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ جب یہ خطاب ہے اور گذشتہ پر عطف ہے تو لازم ہے کہ معطوف علیہ بھی اسی کے حکم میں ہو۔

اور جن حضرات نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ يَّنۡتَهُوۡا يُغۡفَرۡ لَهُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ۔ پس ان لوگوں نے اسے غائب پر حمل کیا ہے۔

ہاں لفظ حُسْنًا کہ جس نے حاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) حُسْن حَسَن کے معنی میں ہے جیسے نُجْل سے نَجَل، رُشْد سے رَشَد کے معنی میں ہوتا ہے اور صفت میں ایسا کرنا جائز ہے جیسا کہ اسم میں بھی جائز ہے عُرب اور عَرَب دونوں بولا گیا ہے حالانکہ یہ صفت ہے اس کی دلیل یہ ہے: مَرَرْتُ بِقَوْمٍ عَرَبٍ اَجْمَعِیْنَ اس بنا پر حُسْن صفت ہے جیسے حُلْو اور مُرّ۔

(۲) حُسْن مصدر ہے جیسے شُکْر اور کُفْر ہے کہ اس کے ساتھ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے یعنی قُوْلُوْا قَوْلًا ذَا حُسْنٍ۔

(۳) منصوب ہے اس لئے کہ اس فعل کا مصدر (مفعول مطلق) ہے جس پر کلام دلالت کر رہا ہے۔ یعنی لِیُحْسِنْ قَوْلُکُمْ حُسْناً۔

جن حضرات نے حَسَنًا پڑھا ہے انہوں نے اسے صفت قرار دیا ہے گویا اس طرح ہے: وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حَسَنًا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا یعنی مَتَاعًا قَلِیْلًا۔

الفاظ و معانی:

اَخذ اِعْطاء کی ضد ہے۔ قُرْبیٰ مصدر ہے۔ یَتَامیٰ یَتِیْم کی جمع ہے مثل نَدِیْم و نَدَامیٰ۔ یتیم جس کا باپ مرگیا ہو وہ حد بلوغ تک یتیم ہے لیکن جس کی ماں مرگئی ہو اسے یتیم نہیں کہا جاتا ہے۔ اصمعی نے بیان کیا ہے کہ انسانوں میں یتیمی باپ کے مرنے سے ہے اور دیگر جانداروں میں ماں کے مرنے سے۔

مسکین وہ شخص ہے جو اپنی حاجت و ضرورت کے باعث عاجز و درماندہ ہو جائے یہ لفظ سکون سے مشتق ہے گویا اس کے فقر و ناداری نے اسے بٹھا دیا ہے۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی: لَا تَعْبُدُوْنَ چار حالتوں میں کسی ایک حالت سے خالی نہیں ہے:

(۱) یا تو حال ہے

(۲) یا قسم کے مانند ہے

(۳) یا لفظاً مجرور ہے اور مراد معنی امر ہے۔

(۴) یا اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا فرض کیا گیا ہے کہ اَنْ کو حذف کر دیا گیا اور فعل مرفوع ہو گیا ہے۔

اگر آپ لَا تَعْبُدُوْنَ کو حال مانتے ہیں تو بہتر ہے کہ یاء کے ساتھ لِيَكُوْنَ ہونا چاہئے تھا، اس طرح کہ لِيَكُوْنَ متعلق ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَقُلْنَا وَاَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ایسی صورت میں وَقُلْنَا اس بنا پر اَخَذْنَا پر معطوف ہوگا تو جائز ہوگا؛ اس لئے کہ اخذ یثاق قول ہی ہے گویا اس طرح فرمایا: وَقُلْنَا هُمْ كَذَا وَكَذَا (ہم نے کہا وہ ایسے ویسے ہیں)

اور اگر آپ نے اس بات پر حمل کیا کہ لفظاً خبر ہے لیکن مراد معنیٰ امر ہے تو اس ارشاد کے مانند ہوگا: تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اور اس پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کرتا ہے: يَغْفِرْ لَكُمْ اور اسی بات کی تاکید کرتا ہے کہ اس پر امر کے ذریعہ عطف کیا ہے اور وہ ارشاد الٰہی ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا. وَقُوْلُوْا. وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔

اور اگر آپ نے اس معنی پر حمل کیا کہ مراد یہ ہے: اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ بِاَنْ لَّا تَعْبُدُوْا -- جب اَنْ کو حذف کر دیا گیا تو فعل مضارع مرفوع ہو گیا جیسا کہ طرفہ کا شعر ہے:

اَلَا اَيُّهَذَا الزَّاجِرِيْ اَحْضُرُ الْوَغٰى وَاَنْ اَشْهَدَ اللَّذَّاتِ هَلْ اَنْتَ مُخْلِدِيْ

یہ ایک قول ہے کہ اگر آپ نے اسے اس پر حمل کیا تو اس میں حذف کے بعد حذف ہے اور سیبویہ نے گمان کیا ہے کہ اس طرح کے کلام سے اَنْ کا حذف کرنا کم ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا حرف جر کا متعلق پوشیدہ ہے اور اس کا اِحْسَانًا سے متعلق ہونا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جس کا متعلق مصدر ہو وہ مصدر پر مقدم نہیں ہو سکتا ہے۔

کلمہ اَحْسَنَ باء کے ذریعہ بھی متعدی ہوتا ہے اور اِلٰی کے ذریعہ بھی اور اس پر یہ ارشاد الٰہی دلیل ہے: وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ. یہاں پر باء کے ذریعہ متعدی ہوا ہے اور ارشاد الٰہی ہے: وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ میں اِلٰی کے ذریعہ متعدی ہوا ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ زجاج نے کہا: قَلِيْلًا استثناء کی بنا پر منصوب ہے یعنی اَسْتَثْنِيْ قَلِيْلًا مِّنْكُمْ (میں تم میں سے کم کو مستثنیٰ کرتا ہوں)

ابوعلی نے کہا: اس حال میں ذرا ابہام ہے۔ اسم مستثنیٰ معنی اَسْتَثْنِيْ کی بنا پر منصوب ہوتا ہے یا اِلَّا کے ذریعہ منصوب ہوتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جو اپنے اِلَّا سے پہلے والے جملہ اِلَّا کے ذریعہ مستثنیٰ ہوتا ہے جیسا

کہ جَاءَ الْبَرْدُ وَالطَّيَالِسَةَ وَمَاصَنَعْتَ وَاَبَاكَ وغیرہ میں اَلطَّيَالِسَةَ وَاَبَاكَ منصوب ہے واؤ کے ذریعہ کہ جس سے پہلے جملہ ہے اور اس بات پر عربوں کا یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ اگر مستثنیٰ میں اس کا کوئی عمل ہوتا تو یہاں پر بھی زید کو نصب دینا جائز ہوتا جیسا کہ آپ اگر کہتے ہیں: اَسْتَثْنِي زَيْدًا تو آپ اسے نصب دیتے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں پر نصب دینا جائز نہیں ہے اس لئے کہ فعل بغیر فاعل کے ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ منع کیوں ہے۔ یہ خود اس بات کے جواز کی دلیل ہے کہ اِلَّا کا مابعد اس کے ماقبل سے متصل ہے اور اِلَّا کا اس میں کوئی عمل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اثر ہے سوائے یہ کہ وہ استثناء پر دلالت کر رہا ہے۔

تفسیر:

عہد شکن قوم

پھر خداوند عالم نے بنی اسرائیل کے ذکر کا اعادہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تو یاد کرو، وَاِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاءِيْلَ، ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ میثاق (عہد و پیمان) عقل و شرع کے دلائل ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء کے اپنی امتوں سے عہد و پیمان ہیں۔ عہد و پیمان فقط قول کے ذریعہ ہوتا ہے۔ گویا کہا جا رہا ہے ہم نے انھیں حکم دیا انھیں وصیت کی اور انھیں تاکید کی اور ہم نے ان سے کہا: واللہ لَا تَعْبُدُوْنَ، جب ہم اسے جواب قسم پر حمل کریں یا اس کو حال پر حمل کریں یا معنی امر پر حمل کریں جیسا کہ ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں اگر ہم اسے حذف پر حمل کریں اس کی تقدیر اس طرح ہوگی کہ جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ عبادت نہ کریں، اِلَّا اللّٰهَ، سوائے اس ایک کی نہ کہ کسی اور کی اور نیک کام کریں۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، (اور والدین کے ساتھ نیکی کریں) جس احسان کا ان سے عہد لیا گیا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ ایسا عمل انجام دیں جو ہماری امت پر فرض ہے۔ اسی طرح ان کے ساتھ اچھا عمل کریں ان سے اچھی گفتگو کریں، ان کے لیے عاجزی کے ساتھ اپنے شانوں کو جھکا دیں، رحمت و رأفت کے ساتھ برتاؤ کرو اور دونوں کے لیے دعا کریں اور اسی کے مانند دیگر اچھے اور نیک کام انجام دیں۔

ارشاد الٰہی: وَّذِي الْقُرْبٰى، یعنی صاحبان قرابت کے ساتھ صلہ رحمی کریں۔ وَالْيَتٰمٰى، ان سے عطوفت (لطف و مہربانی) سے پیش آئیں۔ وَالْمَسٰكِيْنِ، اور مساکین کو ان کے وہ حقوق ادا کریں جنھیں خداوند عالم نے ان کے مال میں ان پر واجب کیے ہیں۔

اس کا ارشاد: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا. اس میں خبر کے بعد خطاب کی جانب عدول ہے۔ اس کی اجازت عرب دیتے ہیں (کلام کے لیے جائز جانتے ہیں) چونکہ خبر اس سے بطور خاص متعلق ہوتی ہے جس سے مخاطب ہوتے ہیں اس کے غیر سے نہیں۔ اسی طرح خطاب کرتے ہیں پھر خطاب کے بعد خبر کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں "ہم نے ان سے کہا کہ تم کہو۔"

اللہ کے ارشاد: حُسْنًا. کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ قول جمیل اور خُلق کریم ہے جس سے اللہ راضی ہو اور اسے دوست رکھتا ہو۔ قول ابن عباس کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: امر بالمعروف و نہی عن المنکر مراد ہے۔ یہ قول سفیان ثوری کا قول ہے۔ ربیع بن انس نے بیان کیا ہے کہ اس کا ارشاد: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا. یعنی لوگوں سے تم بہت اچھے انداز میں گفتگو کرو جس طرح خود تم سے گفتگو کی جائے اور تمھیں پسند ہو۔ خداوند عالم مومنین پر لعن و فحش اور طعن و تشنیع کرنے والے کو دشمن رکھتا ہے اور حلیم، عفیف اور بردبار کو دوست رکھتا ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا میں ایک دوسری جہت سے بھی اختلاف کیا گیا ہے، بیان کیا گیا ہے کہ الناس یہ مومن و کافر دونوں کو شامل ہے۔ اس کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

کہا گیا ہے: یہ مومنین سے مخصوص ہے جس نے عام قرار دیا ہے اس نے اختلاف کیا ہے۔ ابن عباس اور قتادہ نے کہا ہے: یہ حکم آیت السیف اور امامؑ کے ارشاد سے منسوخ ہو گیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: ان سے قتال کرو یہاں تک کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ. کہنے لگیں اور جزیہ کا اقرار کر لیں۔ اسی طرح اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ چونکہ انھیں ایمان کی طرف دعوت دے کر حُسن قول کے ذریعہ بھی ان سے قتال ممکن ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (سورۂ نحل، آیت ۱۲۵) ((اے محمدؐ) آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجیے اور احسن طریقے سے ان سے بحث و تمحیص کیجیے)

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (سورۂ انعام، آیت ۱۰۸) (اور یہ مشرکین خدا کے سوا جنھیں پکارتے ہیں تم انھیں گالی نہ دو،

کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی حد سے تجاوز کر کے نادانی میں اللہ کو برا کہنا شروع کر دیں)

اور اس کا ارشاد: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ. یعنی نماز کو ان حدود کے ساتھ ادا کرو جو تم پر واجب ہیں۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ. (زکوۃ) اس کے اہل کو دو جیسا کہ اللہ نے تم پر واجب کیا ہے۔ ابن عباس سے روایت ہے: جس زکوۃ کو خداوند عالم نے بنی اسرائیل پر فرض کیا تھا وہ قربانی تھی، جس پر آسمان سے آگ کا شعلہ آتا اور اسے اپنے ہمراہ لے جاتا تھا، یہی اس کی قبولیت کی دلیل ہوتی تھی اور جب آگ کا شعلہ اس طرح نہیں آتا تو قربانی قبول نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح ان سے روایت کی گئی ہے کہ اس کے معنی اللہ کی اطاعت اور اخلاص ہے۔

اس کا ارشاد: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ، پھر تم نے اعراض و انحراف کیا۔ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ، (سوائے تم میں سے چند لوگوں کے اور تم تو اعراض کرنے والے ہو) خداوند عالم نے یہودیوں کے متعلق خبر دی ہے۔ انھوں نے اللہ کا عہد و پیمان توڑ دیا، اس کے امر کی مخالفت کی اور اس سے روگردانی کی، سوائے ان افراد کے جنھیں اللہ نے محفوظ رکھا تو انھوں نے اللہ سے کئے عہد و پیمان کو پورا کیا اور اللہ نے یہ کہتے ہوئے ان کی تعریف و توصیف کی ''وہ بہت کم ہیں'' اس میں اختلاف ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ یہودیوں میں سے وہ افراد تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی۔ اس عہد کے توڑنے کے سبب اُن کی مذمت کی گئی جو اُن سے تورات میں لیا گیا تھا۔ انھوں نے امر الٰہی کو بدل دیا اور اس کی نافرمانی کی۔

بیان کیا گیا ہے کہ آیت میں ان کے بزرگوں سے خطاب ہے۔ اُن کی تولی، انحراف اور اعراض دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اگرچہ دونوں کے تاکیدی معنی ایک ہی ہیں۔ تَوَلَّوْا، کے معنی میں بیان کیا گیا ہے انھوں نے انحراف کیا اور وہ انحراف کرنے والے تھے۔ یعنی اس پر باقی رہنے والے تھے۔

اس آیت میں حقوق کی ترتیب پر دلالت ہے۔ اللہ نے اپنے حق کے ذکر سے آغاز کیا اور اسے تمام حق پر مقدم کیا کہ وہ خالق اور نعمت کا عطا کرنے والا اور نعمتوں کا مرکز اور بنیاد ہے، پھر والدین کے حقوق بتائے اور خاص طور سے ان کے ساتھ احسان کا ذکر کیا کہ وہ (انسانی) وجود کا سبب اور دونوں کی تربیت کا انعام ہیں، پھر اس نے اور قرابتداروں کا ذکر فرمایا کہ یہ دوسروں کی بنسبت انسان سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں، پھر اس نے یتیموں کا ذکر ان کی کمزوری کے سبب اور فقراء کا تذکرہ ان کے فقر کی وجہ سے کیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ہی اپنے لوگوں کو شہر بدر کرنا پھر تم نے اس کا اقرار کر لیا تھا اور تم اس بات کے گواہ بھی ہو۔

الفاظ و معانی:

سَفۡكٌ کے معنی بہانے کے ہیں۔

دِمَآء کا واحد دَمٌ (خون) ہے اس کی اصل دَمۡیٌ ہے اکثر نحویوں کے نزدیک۔

نَفۡس نِفَاسَة سے مشتق ہے۔ یہ جلالۃ (یعنی کسی امر کا ظاہر و نمایاں کرنا ہے) انسان کا نفس اس کے اندر موجود سانسیں ہیں۔

دَار یہ وہ منزل و مقام ہے جس میں ٹھہرنے اور قیام کی جگہ ہو، یہ کوچ کرنے کے مقام کے برعکس ہے۔

اِقۡرَار کے معنی اعتراف کے ہیں۔

شَهَادَة، مُشَاهَدَة سے مشتق ہے یہ ایسی چیز کی خبر دینا جو شناخت میں مشاہدہ کی قائم مقام ہو۔

ترکیب:

اس آیت کی ترکیب بالکل ویسی ہے جیسی گذشتہ آیت کی ترکیب تھی۔

تفسیر:

خونریزی نہ کرنا

پھر خداوند عالم نے اس آیت میں یہودیوں کی عہد شکنی والی گذشتہ خبروں پر عطف کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ. (یعنی اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے) تمھارے ان اسلاف (بزرگوں) سے عہد و پیمان لیا جو حضرت موسیٰ اور گذشتہ انبیاءؑ کے زمانے میں تھے (صَلَوَاتُ اللهِ عَلٰی نَبِیِّنَا وَ عَلَیۡهِمۡ

اَجْمَعِیْنَ) کے زمانے میں تھے۔ عہد و پیمان کی نسبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے یہودیوں کی جانب اس لیے دی گئی کہ وہ ان کے بزرگ تھے جن کے متعلق گفتگو گذر چکی ہے۔

ارشادِ الٰہی: لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَ كُمْ، کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل نہ کرے چونکہ انسان کا انسان کو قتل کرنا خود کو قتل کرنا ہے جبکہ دونوں کی ملت ایک ہی ہے، دین بھی ایک ہے اور ایک دین کے ماننے والے ایک انسان کے مانند ہوتے ہیں۔ بعض سے بعض کی ولایت (محبت اور سرپرستی) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "مومنین ایک دوسرے پر رحم و مہربانی کرنے میں ایک جسم کے مانند ہیں جب ان میں سے کوئی ایک عضو مریض ہوتا ہے تو پورا جسم مریض ہو جاتا ہے او بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" یہ قتادہ اور ابو العالیہ کا قول ہے۔ اس کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل نہ کرے کہ اس کا قصاص لیا جائے۔ اس طرح وہ خود کا قاتل ہوگا، چونکہ وہ خود اپنے مارے جانے کا سبب ہوگا۔

اس کے ارشاد: وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ، کے معنی یہ ہیں کہ تم میں سے کوئی کسی کو اپنے وطن سے نہ نکالے کہ تم وطن پر غالب آجاؤ۔

کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کام نہ کرو جسکے سبب وطن سے اخراج کے مستحق ہو جاؤ جس طرح بنو نضیر نے کیا تھا۔

اس کا ارشاد: ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ، پھر تم نے اس کا اقرار کیا ہے اور تم اس کے گواہ ہو کہ ہم نے تم سے پہلے ان سے عہد و پیمان لیا اور جس طرح انھوں نے اس کے قبول کرنے اور پابندی کرنے میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اقرار کے معنی اس سے ان کا راضی ہونا اور اس پر صبر کرنا ہے۔

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ، کے مخاطب میں اختلاف ہے۔ بیان کیا گیا ہے: مخاطب وہ یہودی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ تھے، جب حضورؐ نے ان کی جانب ہجرت فرمائی، خداوند عالم نے ان کے ہاتھوں میں موجود تورات میں پائے جانے والے احکام جنھیں انھوں نے ضائع و برباد کر دیا تھا، جس کا وہ اقرار کرتے تھے (ذکر فرمایا) اور ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ، یعنی تمھارے پہلے والوں اور گذشتگان نے اقرار کیا اور تم ان کے عہد و پیمان کے اقرار پر گواہ ہو کہ تم خوں ریزی نہیں کرو گے، نہ ہی اپنے افراد کو وطن سے نکالو گے اور تم اس کی تصدیق کرو گے۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے: یہ اللہ کی طرف سے خبر ہے۔ ان کے آغاز کے بارے میں۔ لیکن اس خبر کو ان سے

مخاطب کے صیغہ میں بیان کیا گیا ہے، اس طرح جو آیات میں سابقاً گذر چکا ہے جس پر تم گواہ ہو۔ یہ روایت ابوالعالیہ سے ہے۔

اس کے ارشاد: وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ میں دو باتوں کا احتمال پایا جاتا ہے:

اول: تم اس کا اقرار کر کے اس پر گواہ ہو۔

دوم: خوں ریزی اور اور اپنے افراد کو شہر بدر کرنے کے موقع پر تم حاضر تھے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت بنی قریظہ اور بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہودیوں کے آباء واجداد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

❁❁❁❁❁

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

پھر تم وہی ہو جو اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو علاقہ سے باہر نکال دیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف گروہ بندی کرتے ہو اور اگر وہی لوگ قیدی بن کر تمھارے پاس مدد مانگنے آتے ہیں تو ان کو فدیہ دے کر چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو ایسا کریں ان کے لیے دنیاوی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کیا ہے اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب کی جانب پھیر دیے جائیں گے اور جو تمھارے کرتوت ہیں اللہ ان سے بے خبر نہیں ہے۔

قرائت:

اہل کوفہ نے اس آیت میں اور سورۂ تحریم میں تَظَاهَرُوْنَ کے ظاء کو بغیر تشدید کے بغیر قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے دونوں جگہوں پر تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابوجعفر، نافع، عاصم، کسائی اور یعقوب نے اُسَارٰی، تُفَادُوْهُمْ دونوں کو الف کے ساتھ پڑھا ہے صرف حمزہ نے اَسْرٰی، تَفْدُوْهُمْ دونوں کو بغیر الف کے پڑھا ہے۔

ابن کثیر، ابن عامر اور ابوعمرو نے اُسَارٰی کو الف کے ساتھ اور تَفْدُوْهُمْ کو بغیر الف کے پڑھا ہے۔

ابوعمرو، حمزہ اور کسائی اُسَارٰی کی راء میں امالہ کرتے ہیں۔ نافع بین بین پڑھتے ہیں اور بقیہ قراء نے اسے فتحہ دیتے ہیں۔

حجت:

جن قراء نے تَظَاهَرُوْنَ کی ظاء کو بغیر تشدید کے بغیر پڑھا ہے ان کے نزدیک اس کی اصل تَتَظَاهَرُوْنَ ہے تاء دوم کو دو تاء کے جمع ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا ہے۔

اور جن قراء نے تَظَّاهَرُوْنَ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک بھی اصل تَتَظَاهَرُوْنَ ہے مگر انہوں نے تاء کو ظاء میں ادغام کر دیا ہے اس لئے کہ دونوں کے مخرج قریب قریب ہیں۔

دونوں گروہ نے ایک جیسے حروف کے اجتماع کو ناپسند قرار دیا ہے ایک گروہ نے ادغام کر کے اسے خفیف کیا ہے تو دوسرے گروہ نے تاء کو حذف کر کے درست کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جن لوگوں نے اَسرٰی پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ اَسْرٰی، اَسِیْر بروزن فَعِیْل کی جمع ہے جو مفعول کے معنی میں ہے جیسے قَتِیْل بمعنی مَقْتُوْل اور جمع قَتْلٰی، جَرِیْح بمعنی مَجْرُوْح جمع جَرْحٰی اور یہ جمع اُسَارٰی کے مقابلہ میں زیادہ قیاسی ہے۔

اور جن لوگوں نے اُسَارٰی پڑھا ہے انہوں نے کہا: اسے کُسَالٰی سے تشبیہ دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اَسِیْر چونکہ بہت سے تصرفات سے روک دیا جاتا ہے قیدی ہونے کی بنا پر جس طرح کَسْلَان (کاہل) اپنی بری عادت کی بنا پر بہت سے کاموں سے روک دیا جاتا ہے۔ پس اس اَسِیْر کو کَسْلَان کے

مشابہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی جمع بھی اسی کے مانند بنائی گئی ہے جیسا کہ مَرْضیٰ، مَوْتیٰ، هَلْکیٰ کہا جاتا ہے جو ان لوگوں کو جو ان چیزوں میں مبتلا ہوتے ہیں پس یہ اسماء معنیٰ میں فَعِیْل بمعنیٰ مَفْعُوْل سے مشابہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کی جمع بھی اسی وزن پر بنتی ہے جو فَعِیْل بمعنیٰ مَفْعُول کی جمع کا وزن ہے۔

جس طرح اُسَارَیٰ کو کُسَالیٰ سے مشابہ قرار دیا گیا ہے اسی طرح کَسْلیٰ کو اَسْرَیٰ کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

جن لوگوں نے تُفَادُوْهُمْ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ دونوں طرف ایک ایک کام کرتے ہیں اسیر کرنے والا اسیر کو دیتا ہے اور جن لوگوں میں سے اسیر بنایا گیا ہے وہ لوگ اس کا فِدَاء ادا کرتے ہیں تو تُفَادُوهُمْ اس ظاہری معنیٰ کی بنا پر ہے۔

اور جس نے تَفْدُوْهُمْ پڑھا ہے اس میں بھی وہی معنیٰ ہے جو تُفْدُوْهُمْ میں ہے۔ یہ فعل دو مفعول کی جانب متعدی ہوتا ہے مفعول اول کی جانب بنفسہ اور مفعول ثانی کی جانب حرف جر کے ذریعہ جیسے یہ ارشادِ الٰہی: فَدَیْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔

شاعر کا شعر ہے:

یَوَدُّوْنَ لَوْ یَفْدُوْنَنِیْ بِنُفُوْسِهِمْ   وَ مَثْنَی الْأَوَاقِیْ وَ الْقِیَانِ النَّوَاهِدِ

اور فداء دینے والے کے بارے میں اعشیٰ نے کہا:

عِنْدَ ذِیْ تَاجٍ إِذَا قِیْلَ لَهٗ   فَادِ بِالْمَالِ تَرَاخیٰ وَ مَرَحْ

اس شعر میں مفعول اول الاَسْریٰ کو حذف کر دیا ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: فَادِ الْاَسْرَیٰ بِالْمَالِ۔

مورد گفتگو آیت میں مفعول دوم بحرف جر کو محذوف کر دیا ہے۔

الفاظ و معانی:

تَظَاهَرُوْنَ یعنی تَعَاوَنُوْنَ (ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں) ظَهِیْر کے معنی مددگار کے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ۔ (سورہ تحریم، آیت ۴) (اور ان کے علاوہ تمام فرشتے بھی مددگار ہیں)

اِثْم کے معنی فعل بد کے ہیں جس پر انسان مستحق ملامت و سرزنش ہوتا ہے۔ اسی کے مانند وِزْر ہے۔

ایک گروہ نے کہا ہے کہ اِثم جس سے نفس نفرت کی جائے اور اس پر قلب کو اطمینان نہ ہو، اسی بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب نواس بن سمعان نے آپؐ سے بِر اور اثم (نیکی اور برائی) کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: "جس چیز پر تمھارا نفس مطمئن ہو وہ (بر) نیکی ہے اور جس چیز سے تمھارے سینہ میں تنگی اور بدی کا احساس پیدا ہو وہ (اثم) برائی (گناہ) ہے"

عُدوان ظلم کرنے میں زیادتی ہے۔ کہا گیا ہے عدوان کے معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔

اَسر غلبہ کے سبب اپنی گرفت میں لینا۔ ابو عمرو بن علاء نے بیان کیا ہے کہ اُسارٰی وہ اسیر (قیدی) جو بندھے ہوئے ہوں اور الاسری (وہ اسیر) جو گرفت میں ہوں اگرچہ بندھے ہوئے نہ ہو۔

ترکیب:

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَاۗءِ کی ترکیب کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں:

(۱) اَنْتُمْ مبتدا اور هٰؤُلَاۗءِ منادیٰ مفرد ہے یا هٰؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ مبتدا کی خبر ہے۔

(۲) هٰؤُلَاۗءِ، اَنْتُمْ کی تاکید ہے۔

(۳) هٰؤُلَاۗءِ، اَلَّذِيْنَ کے معنیٰ میں ہے اور تَقْتُلُوْنَ کا صلہ ہے یعنی اَنْتُمُ الَّذِيْنَ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ، اس قول کی بنا پر تَقْتُلُوْنَ کا کوئی محل اعراب نہیں ہے اور صلہ میں اسی کے مانند یہ ارشادِ الٰہی بھی ہے: وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۔ یعنی بِالَّتِیْ بِيَمِيْنِكَ (آیت میں تِلْكَ، اَلَّتِیْ کے معنیٰ میں ہے۔ علماء نحو نے اس سلسلہ میں ایک شعر کہا ہے:

عَدَسْ مَا لِعَبَّادٍ عَلَيْكِ إِمَارَةٌ نَجَوْتِ وَهٰذَا تَحْمِلِيْنَ طَلِيْقٌ

تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ محلاً منصوب ہے تُخْرِجُوْنَ میں ضمیر فاعل کے لئے حال ہے۔

وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ دو طرح کا ہے:

(۱) اِخْرَاج کو ضمیر کی شکل میں لایا گیا ہے جس کا تذکرہ اس حصہ میں ہوا ہے کہ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ پھر اس کو اِخْرَاجُهُمْ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے کلام میں تاخیر کی خاطر۔

(۲) هُوَ ضمیر قصہ اور حدیث بھی ہو سکتا ہے گویا اس طرح کہا ہے: اَلْحَدِيْثُ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ یعنی وہ بات جو حق ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔

تفسیر:

بنی اسرائیل کی کرتوتیں

ثُمَّ اَنْتُمْ ، پھر تم اے بنی اسرائیل کے یہودیو! تمھارے عہدو پیمان کے اقرار کے بعد جو میں نے تم سے لیا کہ تم اپنا خون نہیں بہاؤ گے، نہ ہی اپنے افراد کو اپنے وطن سے باہر نکالو گے اور اس پر خود تمھاری گواہی کے بعد جس کا پورا کرنا تم پر واجب و لازم ہے۔ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ،تم اپنے بھائی بندوں کا قتل کرتے ہو۔ یعنی تم میں سے بعض بعض کا قتل کرتا ہے، جس طرح ارشاد ہوتا ہے: فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ (سورۂ نور، آیت ۶۱) یعنی جب تم گھروں میں داخل ہو تم میں سے بعض بعض پر سلام کریں۔

اور کہا گیا ہے: اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم خود کو قتل کے لئے پیش کرتے ہو۔

وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؛ اور اپنے میں سے ایک گروہ کو علاقہ سے باہر نکال دیتے ہو۔ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، ان کے خلاف گروہ بندی کرتے ہو یعنی اور ظلم و زیادتی کے ساتھ انھیں نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ، اور اگر وہی لوگ قیدی بن کر تمھارے پاس مدد مانگنے آتے ہیں تو ان کو فدیہ دے کر چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ یعنی اور تمھارے قتل کرنے سے جنھیں تم قتل کرتے ہو جب تم غیروں کے ہاتھوں اپنے دشمنوں میں اسیر پاتے ہو جن کا تم فدیہ دیتے ہو اور تمھارا انھیں قتل کرنا انھیں ان کے وطن سے نکالنا تم پر حرام ہے۔ جس طرح ان کے ہاتھوں میں قیدی کا چھوڑنا تم پر حرام ہے۔ پس تم ان کے قتل کو کس طرح جائز سمجھتے ہو اور ان کے دشمنوں سے فدیہ ترک کرنے کو جائز نہیں سمجھتے (یعنی اجازت نہیں دیتے) جبکہ یہ دونوں تمھارے لیے ضروری اور لازمی حکم ہیں اور دونوں حکم برابر کے ہیں چونکہ تم پر ان کا قتل کرنا اور انھیں اپنے گھروں سے نکالنا حرام ہے بالکل جس طرح دشمنوں کے ہاتھوں میں انھیں اسیر قرار دینا حرام ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو جس میں میں نے تم پر اپنے فرائض واجب کئے ہیں اور اپنے قوانین بیان کیے ہیں اور ان پر عمل کرنے کا تم سے عہدو پیمان لیا ہے جس کی تم تصدیق کرتے ہو اور دشمنوں کے ہاتھوں میں موجود اپنے اسیروں کا فدیہ دیتے ہو جس کے بعض کا تم انکار کرتے ہو جن کا قتل کرنا میں نے تم پر حرام کیا ہے انھیں قتل کرتے ہو جو تمھارے دین اور تمھاری قوم سے ہیں۔

جنھیں تم ان کے وطن سے نکالتے ہو باوجودیکہ تم بخوبی واقف ہو تمھاری جانب سے میرے بعض (احکام) کا انکار کرنا میرے عہد و پیمان کو توڑنا ہے۔

اس آیت کی مراد و مقصد میں اختلاف ہے؛ عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ بنی قریظہ اور بنی نضیر اوس و خزرج کی طرح بھائی بھائی تھے۔ دونوں میں اختلاف ہو گیا تو بنی نضیر خزرج کے ساتھ ہو گیا اور قریظہ اوس کے ساتھ۔ جب باہم جنگ و قتال ہوتا تو ہر گروہ اپنے حلیف کی کمک کرتا اور جب جنگ اختتام کو پہونچتی تو توریت کی تصدیق کرتے ہوئے اپنے اسیروں کا فدیہ پیش کر دیتے۔ اوس و خزرج مشرک تھے، بتوں کی پرستش کرتے، جنت، جہنم اور قیامت کا عقیدہ بھی نہیں رکھتے تھے، نہ ہی کتاب (قرآن) کو مانتے تھے۔ خداوند عالم نے ان کی کارگذاریوں کے متعلق یہودیوں کو مطلع کر رکھا تھا۔

ابو العالیہ نے کہا ہے: جب کوئی گروہ اور قوم کسی قوم کو کمزور کر دیتی تو بنی اسرائیل انھیں ان کے وطن سے باہر نکال دیتے جب کہ ان سے عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ وہ نہ ہی خون بہائیں گے اور نہ ہی انہیں ان کے وطن سے باہر نکالیں گے اور ان سے عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ بعض بعض کو اسیر بنائیں تو ان کا فدیہ ادا کریں۔ پس انھوں نے ان کو وطن سے باہر نکال دیا۔ پھر انہوں نے فدیہ ادا کیا اور فدیہ کے ہمراہ ایمان لائے اور انھوں نے وطن سے اخراج کے ساتھ کفر اختیار کیا۔

بیان کیا گیا ہے: یہ وہ نہیں ہیں جنھیں نکالا گیا اور جنھوں نے فدیہ ادا کیا بلکہ یہ دوسری قوم ہے جو ان کی ملت پر تھی ان کے متعلق خدا نے انھیں آگاہ کیا ہے۔ ابو مسلم اصفہانی نے کہا ہے کہ آیت: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ. (تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو ایسا کریں ان کے لیے دنیاوی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کیا ہے اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب کی جانب پھیر دیے جائیں گے اور جو تمھارے کرتوت ہیں اللہ ان سے بے خبر نہیں ہے) اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انھیں جو وطن سے نکالتے ہیں وہ حرام ہے اور فدیہ واجب ہے بلکہ یہ چیز محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کے بیان کی جانب پلٹ رہی ہے جیسا کہ آیت میں ارشاد ہوتا ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا. (تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے

ہواور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو ایسا کریں ان کے لیے دنیاوی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کیا ہے) خِزۡیٌ (رسوائی) کے متعلق اختلاف ہے:

کہا گیا ہے کہ جس چیز کے ذریعہ خداوند عالم نے انھیں رسوا کیا ان کی گذشتہ نافرمانیوں کے باعث ہے۔

بیان کیا گیا ہے: وہ حکم ہے جو خداوند عالم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مقتول کے عوض قاتل کا قتل اور ظالم سے مظلوم کے انتقام کے متعلق نازل فرمایا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ وہ جزیہ اور ٹیکس ہے جو ان پر ان کی رسوائی کے عنوان سے قرار دیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ وہ رسوائی ہے جسکے ذریعہ انھیں دنیا میں رسوا کیا یا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بنی نضیر کا ان کے وطن سے نکالنا، بنی قریظہ کا قتل کرنا اور ان کی اولاد کو اسیر کرنا ہے۔ یہ چیز ان کی دنیا میں رسوائی ہے۔ پھر خداوند عالم نے واقف کرایا ہے کہ یہ چیزیں ان کے گناہوں کا کفارہ نہیں ہوسکتیں اور اس کے بعد وہ عذاب عظیم میں مبتلا ہوں گے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الۡعَذَابِ یعنی شدید عذاب ہے جسے خداوند عالم نے اپنے دشمنوں کے لیے مہیا فرمایا ہے، جس سے کسی طرح کا چھٹکارا نہیں ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ، خداوند عالم ان کے برے اعمال کو فراموش کرنے والا نہیں ہے، بلکہ وہ ان کا محافظ و نگراں ہے جن کا بدلہ دے گا۔ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ، تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟ اس آیت سے متعلق جو سوال پیدا ہوتا ہے یہ کہ آیت کا ظاہر ایمان و کفر کے جمع ہونے کی صحت کا تقاضا کرتا ہے جو صحیح مذہب کے منافی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کے بعض حصہ کی تصدیق کا اظہار کیا اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور بعض کا نہیں۔ جو اس چیز پر دلالت کر رہا ہے کہ (کتاب کے) بعض حصہ کے انکار کے ساتھ بعض حصہ پر ایمان لانا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کے ایمان پر کامیابی کے متعلق قول ترک کرنے میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی واطمینان ہے، گویا ارشاد ہو رہا ہے وہ کیونکر آپ کا قول قبول کریں۔ کس طرح آپ کے امر کو تسلیم کریں اور کس طرح آپ پر ایمان لائیں؟ جب کہ وہ اپنی ہی کتاب پر عمل نہیں کرتے باوجودیکہ وہ اس کا اقرار کر رہے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿۸۶﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے میں دنیاوی زندگی کو خرید لیا ہے، نہ تو ان کے عذاب میں کمی ہوگی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

الفاظ و معانی:

خِفَّة (ہلکا) ثِقَل (وزنی) کی ضد ہے۔ تَخْفِيف، تَسْهِيل، تَهْوِين باہم مشابہ ہیں۔

تفسیر:

دنیا خرید لی

اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کی طرف جن کی جانب سے خبر دی گئی ہے کہ وہ کتاب کے بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ، یہی لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے میں دنیاوی زندگی کو خرید لیا ہے۔ یعنی وہ اس کے ذریعہ آخرت کی نعمتوں کے عوض اور بدلہ میں راضی ہو گئے جن نعمتوں کو خداوند عالم نے مومنین کے لیے مہیا فرمایا ہے۔ خداوند عالم نے ان کے کفر کے باعث نعمت آخرت کے ترک کرنے کو قیمت قرار دیا ہے۔ جسے انھوں نے حقیر و پست دنیا کے عوض فروخت کیا ہے۔ پھر خداوند عالم نے فرمایا کہ ان کا آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ، ان کے عذاب میں نہ تو کمی واقع ہوگی نہ ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ، آخرت میں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا جس کی نصرت سے ان سے عذاب الٰہی کو دور کیا جاسکے۔

❀❀❀❀❀

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور بلا شبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دیں اور روح القدس کے ذریعہ ان کی مدد کی، جب بھی کوئی رسول تمھاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی پیغام لے کر آیا تو تم نے سرکشی اختیار کی اور ان انبیاء میں سے کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو قتل کر ڈالا۔

قرائت:

ابن کثیر نے اَلْقُدْس کو پورے قرآن میں دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ حضرات نے قاف اور دال دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قرأت شواذ میں ابوعمرو سے مروی ہے کہ انھوں نے وَآيَدْنَاهُ بروزن اَفْعَلْنَاهُ (باب افعال) سے پڑھا ہے اور قرأت مشہور اَيَّدْنَاهُمْ تشدید کے ساتھ ہے۔

حجت:

قُدُس میں تخفیف یعنی دال کو ساکن پڑھنا، تثقیل یعنی دال پر پیش پڑھنا دونوں وارد ہوا ہے اسی طرح وہ کلمات جو اس کے مثل ہیں جیسے حُلْم، حُلُم اور عُنْق، عُنُق ہے۔

اَيَّدْنَاهُ یہ مشہور قرأت ہے فَعَّلْنَاهُ کے وزن پر اس لئے کہ اس میں عین الفعل کو حرف صحیح کے مانند مانا گیا ہے اس خوف سے کہ اگر آيَدْنَاهُ اَفْعَلْنَاهُ کے وزن پر ہوتا تو دو اعلال ہوتے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے عین الفعل میں اعلال ہوگا جیسا کہ اجوف سے اَفْعَلْتُ کے عین الفعل میں اعلال کرنا واجب ہے جیسے اَقَمْتُ وَاَبَعْتُ تو اس میں پے در پے دو اعلال ہوتے ہیں اس لئے کہ آيَدْتُ کی اصل أَأْيَدْتُ تھی جس طرح آمَنَ کی اصل أَأْمَنَ تھی ہمزہ دوم کو الف سے بدل دیا جاتا ہے اس لئے کہ ایک ہی کلمہ میں دو ہمزہ ایک ہی جگہ جمع ہو گئے ہیں ان میں سے پہلا مفتوح اور دوسرا ساکن ہے اسی طرح لازم تھا کہ عین الفعل کی

حرکت کو فاء کو دے کر اسے حذف کر دیا جائے جس طرح اَقْوَمْتُ میں واؤ کی حرکت اس سے پہلے موجود قاف کو دے دی گئی ہے اسی طرح وہ اَقَمْتُ اس قاعدہ کی بنا پر لازم تھا کہ یہاں پر فاء الفعل کو واؤ سے بدل دیا جائے اس لئے کہ وہ متحرک ہے اور اس کا ماقبل مفتوح ہے اور اس میں قلب کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اس سے پہلے ہمزہ اولیٰ واقع ہوا ہے جس طرح آدم یا آدِمِ کو کسرہ دینے میں قلب کر دیا گیا ہے لٰہذا ضروری تھا کہ اَوَدْتُه کہا جائے جیسے اَقَمْتُ کہا جاتا ہے۔ عین الفعل کو حذف کر دیا جاتا ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اور فاء الفعل کو جو کہ دراصل ہمزہ ہے اسے واؤ سے بدل دیا جاتا ہے تو فاء میں بھی اعلال ہوتا اور سین میں بھی جب قیاس اس بات کا باعث بنا تو اسے چھوڑ دیا گیا ہے اور اس میں فَعَّلْتُ باب تفعیل سے بہت زیادہ ہو گیا ہے تاکہ دو اعلال سے بچا جا سکے۔ اصل کی بنیاد پر اَيَّدْتُ وارد ہوا ہے۔

الفاظ و معانی:

قَفَّيْنَا یعنی ہم نے ارادہ کیا اور ہم نے بعض کو بعض کے پیچھے بھیجا۔ اس کی اصل قِفَا ہے۔

رُسُل رَسُوْل کی جمع ہے۔ جیسے صُبُر اور شُكُر صَبُور اور شَكُور کی جمع کے طور پر آتے ہیں۔

قُدُس کے معنی طُهْر اور تَقْدِيْس تَطْهِير ہے۔ اللہ کی صفت میں ہمارا قُدُّوس کہنا یعنی اس کی ذات اس چیز سے پاک و منزہ ہے کہ اس کے فرزند ہو یا اس کے فعل اور حکم میں خلاف عدل کوئی چیز ہو۔

بیت المقدس میں مقدس یا تو مصدر میمی ہے یا اسم مکان ہے۔ اگر مکان کے معنی میں ہے تو معنی یہ ہوں گے۔ یہ کہ گھر وہ مقام ہے جس میں طہارت و پاکیزگی کی گئی ہے اور اس کی نسبت طہارت کی جانب دی گئی ہے چونکہ یہ مقام عبادت ہے جیسا کہ وارد ہوا ہے: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ، اور بَيْتُ الله کی طہارت اس کا بتوں سے خالی کرنا اور اسے بتوں سے دور رکھنا ہے لٰہذا اس کے معنی اس طرح ہوں گے: پاک و پاکیزہ جگہ والا مکان۔

تفسیر:

مکمل انتظام ہدایت کے بعد بھی گمراہی!

پھر خداوند عالم نے یہودیوں پر ان کی جانب اپنے رسولوں کو بھیج کر نعمت نازل کرنے اور ان کی تکذیب کے ذریعہ مقابلہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ. ہم نے موسیٰ کو تورات

دی۔ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ، اور موسیٰ کے بعد یکے بعد دیگرے رسولوں کا سلسلہ جاری کیا، جو اللہ کی وحدانیت اور شریعتوں کے قیام کی دعوت دیتے ہیں۔ بعد والا پہلے والے کی پیروی اور متابعت کرتا تھا ایک نہج اور ایک ہی راستہ پر چونکہ خدوانداعالم نے جناب موسیٰؑ کے بعد سے حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک جس کسی نبی کو مبعوث فرمایا: اسے تورات کے قیام اور اس میں موجود ہدایت کی جانب دعوت دینے کے لیے بھیجا۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ، ہم نے (عیسیٰ) کو مردہ زندہ کرنے، مبروص اور جذامی کو ٹھیک کرنے جیسے معجزات عطا کیے جو آپ کی نبوت کی دلیلیں ہیں۔ اسی طرح آپ کی صداقت اور صحتِ نبوت کے دلائل ہیں۔

بعض نے بیان کیا ہے: بَيِّنَات سے انجیل اور اس میں موجود احکام اور حلال وحرام کے درمیان فرق کرنے والی آیات ہیں: وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ، ہم نے جبرئیل کے ذریعہ ان کی تقویت اور تائید کی۔ یہ روایت قتادہ، سدی، ضحاک اور ربیع سے مروی ہے۔

جبرئیلؑ کو روح کا نام دینے کے سبب کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ اس کی متعدد وجہیں ہیں:

اول: وہ ادیان کے بینات و معجزات لیکر آتے ہیں اور ان سے زندہ کرتے ہیں جس طرح ارواح کے ذریعہ جسموں کو زندہ کیا جاتا ہے۔

دوم: اس نام کی وجہ یہ ہے کہ ان پر روحانیت غالب ہے۔ اسی طرح تمام ملائکہ ہیں حضرت جبرئیلؑ کو اس نام سے ان کے لیے شرف وفضیلت کی وجہ سے مخصوص کیا گیا ہے۔

سوم: ان کے اس نام اور قُدس کی جانب نسبت دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی تکوین (بناوٹ) اور والد کے پیدا کیے بغیر روح ہیں۔ ابن زید نے کہا ہے: روح القدس سے انجیل مراد ہے، جس طرح اللہ نے قرآن کو روح کہا ہے۔ ارشاد فرمایا: وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحاً مِّنْ اَمْرِنَا. (سورۂ شوریٰ، آیت ۵۲؛ اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کی وحی کی ہے) اسی طرح انجیل کو روح کہا ہے۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ روح وہ نام ہے جس کے ذریعہ جناب عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

ربیع نے کہا ہے: روح وہ ہے جو ان کے اندر پھونکی گئی اور اس کے شرف کے باعث اپنی طرف نسبت دی ہے جس طرح بَيْتُ اللهِ، نَاقَةُ اللهِ (اللہ کا گھر، اللہ کا ناقہ) قوی ترین قول اس کا ہے جس نے جبرئیل کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ عیسیٰ کو انبیاء کے درمیان کیوں کہا گیا کہ ان کی تائید جبرئیل کے ذریعہ کی گئی جبکہ ہر نبی کی تائید جبرئیل کے ذریعہ کی ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ان کی اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ (جبرئیل) (عیسیٰ) کے بچپنے سے ان کے بڑے ہونے تک ان سے مخصوص رہے جو کہ ثابت ہے، جہاں کہیں جناب عیسیٰؑ جاتے جبرئیل ان کے ہمراہ جاتے۔ جب یہودیوں نے ان کے قتل کی کوشش کی تو انھوں نے جناب عیسیٰؑ کو تنہا نہیں چھوڑا یہاں تک کہ انھیں آسمان پر لے گئے اور حضرت مریمؑ کے حاملہ ہونے اور بشارت کے وقت وہ (انسانی) صورت میں ظاہر ہوئے ان میں پھونک ماری۔

قُدُس کے معنی میں اختلاف ہے: کہا گیا ہے کہ پاکیزگی ہے اور برکت کے لیے بھی کہا گیا ہے۔ یہ سُدی کی روایت ہے اور قطرب سے حکایت کی گئی ہے۔

مفسرین بیان کرتے ہیں: انبیاء نے ان کی تقدیس بیان کی ہے یعنی انھیں مبارک کہا ہے۔ یہ جناب ابراہیمؑ کی دعا کے مانند ہے جو انھوں نے حرم (خانہ کعبہ) کے لیے فرمائی: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا آمِنًا. (سورۂ ابراہیم، آیت ۳۵) (پروردگارا تو اس شہر کو جائے امن بنادے) جیسا کہ حضرت زکریاؑ کی دعا ہے: وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا. (سورۂ مریم، آیت ۶) (اور اے میرے پروردگار تو اسے پسندیدہ انسان بنا)

کہا گیا ہے: قُدُس اللہ کی ذات ہے۔ حسن، ربیع اور زید کی روایت ہے ان کا کہنا ہے اَلْقُدُّوس اور اَلْقُدُس ایک ہی ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ، یہ یہودیوں سے خطاب ہے۔ گویا ان سے کہا جا رہا ہے: بنی اسرائیل کے یہودیو! جب بھی میرے رسولوں میں سے کوئی رسول تمھاری خواہش کے خلاف پیغام لے کر آتا تو تم پر اس کا قبول کرنا بہت گراں گزرتا، تم جبر سے کام لیتے اور ان کا انکار کر دیتے تھے۔ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (اور ان انبیاء میں سے کچھ کو جھٹلاتے اور کچھ کو قتل کر ڈالتے) جسکے قتل کرنے پر تمھیں قدرت وطاقت حاصل نہ ہوتی تو تم (جناب عیسیٰؑ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مانند) ان کی تکذیب کر دیتے اور بعض کو تم نے حضرت یحییٰؑ وحضرت زکریاؑ وغیرہ کی طرح قتل کر دیا۔ بظاہر خطاب کو تقریر (تعین) کی طرح پیش کیا گیا ہے جو خبر کے معنی میں ہے۔ اس فعل کی نسبت ان کی طرف دی گئی ہے اگرچہ انھوں نے خود اسے انجام نہیں دیا، جس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے اس فعل پر راضی تھے، لہٰذا ان کے فعل کی نسبت ان کی جانب دی گئی ہے اگرچہ یہ فعل ان کے بزرگوں نے کیا تھا۔

❀❀❀❀❀❀

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی لعنت ہے پس وہ بہت کم باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

قرائت:

مشہور قرأت غُلْف ہے لام کے سکون کے ساتھ اور شواذ قرأت میں ابوعمرو سے غُلُف لام کے ضمہ کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

حجت:

جس نے لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ اسے اَغْلَف کی جمع مانتا ہے جیسے اَحْمَر سے حُمْر۔ جب تلوار غلاف میں رہتی ہے تو اسے اَغْلَف کہتے ہیں اور قَوْسٌ غَلْفَاء بھی بولتے ہیں۔ لام کو پیش دینا صحیح نہیں ہے سوائے ضرورت شعری کے جیسے طرفہ کا یہ شعر ہے کہ:

أَيُّهَا الْفِتْيَانُ فِيْ مَجْلِسِنَا جَرِّدُوْا مِنْهَا وِرَادًا وَشُقُر

شعر میں قاف کو ضمہ دے دیا ہے ضرورت شعری کی بنا پر۔

جس نے غُلُف لام کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ اسے غِلَاف کی جمع مانتا ہے۔ جیسے مِثَال سے مُثُل، حِمَار سے حُمُر اس کے معنی یہ ہوں گے ہمارے دل علم کے ظروف ہیں انہیں کیا ہو گیا جب کہ نہیں سمجھ رہے ہیں۔

ہاں تثقیل کر تسکین کرنا ہے۔ جیسے رُسُل کو رُسْل پڑھنا جائز ہے۔

الفاظ و معانی:

لَعْن کے معنی دور کرنے کے ہیں، اس طرح کہا جاتا ہے: لَعَنَ فُلَانٌ فُلَانًا، فلاں شخص نے فلاں شخص پر لعن کی (یعنی اسے دور کیا)

ترکیب:

قَلِيۡلًا منصوب ہے اس لئے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے کہ اسے حذف کر دیا گیا ہے اس لئے کہ صفت اس کی قائم مقام ہے اور اس پر دلالت کر رہی ہے یعنی فَاِيۡمَانًا قَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ۔

کہا گیا ہے کہ قَلِيۡلًا حال ہونے کی بنا بر منصوب ہے یعنی يُؤۡمِنُوۡنَ وَهُمۡ قَلِيۡلٌ ایک قول یہ بھی ہے کہ قَلِيۡلًا دراصل بِقَلِيۡلٍ مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ تھا، جار کو حذف کر کے فعل کی جانب بڑھا دیا گیا ہے کہ فعل نے اسے نصب دے دیا ہے۔

آیت میں مَا زائدہ ہے تاکید کے لئے اور اس کا کوئی مطلب نہیں ہے جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ دراصل اس طرح ہے کہ قَلِيۡلًا يُؤۡمِنُوۡنَ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

لَوۡ بِاَبَانَيۡنِ جَاءَ يَخۡطُبُهَا   خُضِّبَ مَا اَنۡفُ خَاطِبٍ بِدَمٍ

یہاں پر دراصل خُضِّبَ اَنۡفُ خَاطِبٍ تھا۔

کہا گیا ہے کہ یہاں پر مَا کے معنی یہ ہیں کہ وہ دلالت کرے اسم میں نہایت درجہ تنکیر پر اور اس میں ابہام پر جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَمۡرٌ مَّا اور شَيۡءٌ مَّا جب ابہام میں مبالغہ مقصود ہو۔

تفسیر:

پردہ پڑے دل

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ، کلام یہودیوں کے برے اقوال و افعال کی حکایت کی جانب پلٹ رہا ہے۔ پہلی قرأت (مشہور قرأت لام کے سکون کے ساتھ ہے اور ابو عمیر سے غیر مشہور طور پر لام کے پیش کے ساتھ وارد ہوئی ہے) کے مطابق یہ معنی ہوں گے کہ ان کے قلوب (جس چیز کی انھیں دعوت دی گئی ہے) اس کے قبول کرنے سے مانع ہیں، وہ کہتے ہیں: آپ کا ہمارے ڈرانے سے کیا فائدہ ہے؟ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں ہم اسے نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ وہ سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِيۡۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَيۡهِ وَفِيۡۤ اٰذَانِنَا (سورۂ فصلت آیت ۵) (اور انھوں نے کہا ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے آپ ہمیں جس چیز کی طرف بلا رہے ہیں اور ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں۔۔۔)

ابوعلی الفارسی نے بیان کیا ہے: جن معلومات کا حواس وغیرہ اعضاء سے ادراک ہوتا ہے جبکہ ذکر کیا جائے اس کے وصف کا علم نہیں ہوتا کہ وہ اس پر مانع اور (رکاوٹ) ہے اور اس کے علاوہ حائل ہے، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (سورۂ محمد، آیت ۲۴) (انھیں کیا ہو گیا ہے یہ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟) جبکہ قُفْل مُقَفَّلٌ عَلَيْهِ (جس چیز پر تالا لگایا گیا ہے) پر حائل اور رکاوٹ ہوتا ہے۔ کسی چیز کے اس کے اندر داخل ہونے میں اگر وہ مقفل نہیں ہوتی تو وہ چیز اس میں داخل ہو جاتی، قلوب کے لیے مثال قرار دی گئی ہے، نہ تو وہ غور وفکر کرتے ہیں نہ ہی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کا کلام ہے:

لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (سورۂ حجر، آیت ۱۵)

تو وہ کہتے ہیں یقیناً ہماری آنکھوں کو مدہوش کر دیا گیا ہے بلکہ ہم وہ قوم ہیں جن پر جادو کیا جا چکا ہے۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا۔ (سورۂ کہف، آیت ۱۰۱) (ان کافروں کے سامنے جن کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ کچھ بھی سننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے)

اور اس کا یہ ارشاد: بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُوْنَ، ان لوگوں کا شدید عناد اور دشمنی انھیں مشاہدات میں شک اور معلومات کے انکار پر آمادہ کرتا تھا۔ البتہ دوسری قرأت کے اعتبار سے یعنی عین کلمہ کی حرکت (غُلُفٌ) کے اعتبار سے یہ معنی ہوں گے کہ اس سے مراد ہے: ہمارے قلوب علم کے ظروف و مراکز ہیں اور ہم علماء ہیں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر سمجھنے کے لائق ہوتی تو ہم اسے سمجھ لیتے یا اس کی مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جو آپ بیان کر رہے ہیں وہ ہمارے قلوب میں نہیں ہے۔ اگر اس چیز کا تعلق علم سے ہوتا تو وہ ہمارے دل میں ہوتی۔

ارشاد الٰہی: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ، خداوند عالم نے ان کے قول کی تردید فرمائی ہے بات اس طرح نہیں ہے جیسا کہ ان کا گمان ہے بلکہ خداوند عالم نے انھیں خود اپنی ذات اور رسولوں کا انکار کرنے کے باعث اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان پر لعنت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے دلوں پر ان کے کفر کی سزا کے طور پر مہر لگا دی گئی ہے۔

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ، خداوند عالم نے جو چیز اس نے اپنے پیغمبر پر نازل فرمائی ہے ان لوگوں کے اس پر کم ایمان رکھنے کی صفت بیان فرمائی ہے، اگرچہ ان کی بعض چیزوں میں خدا کی تصدیق اس کے صفات

وغیرہ پر ایمان ہے جو ان پر فرض کیا گیا تھا۔ (ان کا یہ عمل) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور جو چیز آپؐ لے کر آئے ان کے انکار کی نسبت بہت مختصر ہے۔

جو بات ہمارے مذہب اور نظریہ کے مطابق ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے پاس بالکل ایمان نہیں ہے۔ قلیل، (مختصر) کی صفت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ وہ قلیل ایمان نہیں رکھتے جسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے مگر مختصر افراد جیسے عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی۔

اس آیت میں مجبرہ کے نظریہ کا رد ہے۔ چونکہ یہودیوں نے وہی کہا جس طرح (مجبرہ) کہتے ہیں کہ ان کے قلوب میں وہ چیز ہے جو ایمان سے مانع ہے۔ جو ایمان اور قلب کے درمیان حائل ہے۔ خداوند عالم نے ان کی تکذیب اس طرح فرمائی کہ ان پر لعنت اور مذمت کی۔ اگر وہ سچے ہوتے تو خدا کی لعنت کے مستحق نہیں ہوتے، نہ ہی انھیں دھتکارا جاتا اور اس طرح ان کے لیے خدا کی جانب سے تکلیف مالا یطاق ہوتی۔

❁❁❁❁❁

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جب ان کے پاس خدا کی جانب سے کتاب آئی جو اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس موجود تھی اور اس سے پہلے وہ کافروں کے خلاف فتح کی دعا کیا کرتے تھے۔ اور جب وہ آ گیا جسے وہ اچھی طرح پہچانتے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

ترکیب:

مُصَدِّقٌ مرفوع ہے اس لئے کہ کِتٰبٌ کی صفت ہے۔ اگر یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو تب بھی جائز ہے لیکن مشہور قرأت میں منصوب نہیں پڑھا گیا ہے۔

قَبْلُ بر بنائے غایت مضموم ہے اور ہم اس کا سبب آیہ کریمہ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ میں بیان کر چکے ہیں۔

ارشادالٰہی: وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ میں لَمَّا کا جواب اخفش اور زجاج کے نزدیک محذوف ہے اس لئے کہ اس کے معنی معلوم ہیں جس پر یہ ارشادالٰہی دلالت کر رہا ہے: فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ جیسا کہ اس آیت میں: وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ میں لَوْ کے جواب کو حذف کر دیا گیا ہے۔ گویا اس طرح ہے: وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سِوَىٰ هَٰذَا الْقُرْآنِ سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ لَسُيِّرَتْ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ یعنی اگر اس قرآن کے علاوہ کسی اور قرآن کے ذریعہ پہاڑوں کو چلایا جاتا ہے تو اس قرآن کے ذریعہ بھی پہاڑوں کو چلایا جاتا۔

کہا گیا ہے کہ كَفَرُوا جواب ہے وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ کا اور فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا کا اور طول کلام کی خاطر لَمَّا کی تکرار ہے یہ مبرد کا قول ہے۔

شان نزول:

ابن عباس نے کہا ہے کہ یہودی پیغمبرؐ کی بعثت سے قبل آپؐ کے ذریعہ (قبیلہ) اوس وخزرج پر طلب فتح کرتے تھے (فتح کی دعا کرتے تھے) جب اللہ نے آپ کو عربوں میں مبعوث فرمایا تو بنی اسرائیل جو آنحضرتؐ کے بارے میں کہتے تھے اس کا انھوں نے انکار کر دیا۔ پس معاذ بن جبل اور بشر بن البراء بن معرور نے ان سے کہا: اے گروہ یہود! خوف خدا کرو اور اسلام لے آؤ تم ہم پر محمدؐ کے ذریعہ طلب فتح کیا کرتے تھے، جب ہم مشرک تھے، تم آنحضرتؐ کے اوصاف بیان کرتے اور آپؐ کی بعثت سے متعلق ذکر کیا کرتے تھے۔ بنی نضیر کے سلام بن مشکم نے کہا: ہمارے پاس ایسی کوئی آیت نہیں آئی جسے ہم پہچانتے ہوں اور نہ ہی کوئی ایسی چیز ہے جس کا ہم تم سے ذکر کرتے تھے۔ پس اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

عیاشی نے اپنی سند مرفوع کے ذریعہ ابوبصیر کے واسطے سے امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: یہودیوں نے اپنی کتاب میں پایا تھا کہ محمد رسول اللہ مقام عیر اور احد کے درمیان ہجرت کریں گے۔ پس وہ آپؐ کی اس جگہ کی تلاش میں نکلے، ان کا گذر حداد نام کے پہاڑ سے ہوا (لوگوں نے بیان کیا ہے کہ حداد اور احد ایک ہی ہیں) وہاں پہنچ کر وہ لوگ جدا ہو گئے۔ ان میں سے بعض تیما پہنچے اور بعض مقام فدک اور بعض خیبر۔ تیما کے لوگ اپنے بعض برادران کے مشتاق ہوئے۔ قیس کا ایک اعرابی (بدو) ان کے پاس سے گذرا تو اس نے ان لوگوں سے کہا: میں تمھارے ہمراہ عیر اور اُحد کے درمیان سے گذروں گا۔

انھوں نے اس سے کہا: جب تم وہاں سے گذرو تو ہمیں ان دونوں کے متعلق بتانا جب وہ (شخص) سرزمین مدینہ کے درمیان پہنچا تو اس نے کہا یہ عیر ہے اور یہ احد ہے۔ پس وہ لوگ اپنے شتر کی پشت سے اتر پڑے اور اس سے کہا: اپنی منزل تک پہنچ گئے تمھارے شتر کی ہمیں حاجت نہیں ہے، تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔ انھوں نے فدک اور خیبر میں مقیم اپنے برادران کو لکھا: ہم نے جگہ پالی ہے، پس تم لوگ ہماری طرف چلے آؤ! انھوں نے لکھا: ہم نے گھر بسائے ہیں اور اموال حاصل کر لیے ہیں، ہمارا تم لوگوں سے نزدیک کوئی نہیں ہے، پس جب اس طرح ہے تو ہم تمھاری طرف بہت سرعت سے آئیں گے۔

انھوں نے مدینہ میں مال ومتاع کو اکٹھا کر لیا جب ان کے پاس مال کثیر جمع ہو گیا تو تبع کو اس بات کی خبر ہو گئی۔ اس نے ان سے جنگ کی۔ وہ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ اس نے ان کا محاصرہ کیا پھر انھیں امان عطا کی۔ وہ لوگ قلعہ سے اتر کر اس کے پاس آئے۔ تبع نے ان سے کہا: میں تمھارے شہر تک چل کر آیا ہوں میں نہیں سمجھتا کہ میں تمھارے درمیان قیام کر سکوں گا۔

انھوں نے جواب دیا: یہ شہر تمھارے لئے نہیں ہے۔ یہ شہر اس نبی کا ہے جو ہجرت کر کے یہاں آئے گا اور کوئی بھی اس پر قبضہ نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ نبی آجائے۔ تو تبع نے ان سے کہا کہ میں اپنے خاندان کے کچھ لوگ تمھارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب وہ نبی آئے تو یہ لوگ اس کے مددگار اور ناصر ہوں گے۔

تبع نے وہاں دو قبیلے چھوڑے جنھیں تم اوس وخزرج کی صورت میں دیکھ رہے ہو۔ جب ان کی تعداد بڑھ گئی تو وہ یہودیوں کے مال ومتاع پر قبضہ کرنے لگے۔ یہودی ان سے کہا کرتے تھے: اگر محمد مبعوث ہو گئے تو ہم تمھیں اپنے دیار (علاقے) اور اموال سے بے دخل کر دیں گے۔ پس جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے تو انصار ان پر ایمان لے آئے اور یہودیوں نے انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اسی واقعہ کی وضاحت کر رہا ہے: وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ اور اس سے پہلے وہ کافروں کے خلاف فتح کی دعا کیا کرتے تھے۔

تفسیر:

خود مبلغ اور خود ہی کافر

وَلَمَّا جَاءَهُمْ. بنی اسرائیل کے یہودیوں کے پاس آئی کہ جن کی صفت اللہ نے بیان کی

ہے۔ کِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (اللہ کی جانب سے ایک کتاب) کتاب سے مراد قرآن کریم ہے جسے اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا۔

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ، جو ان کے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جسے خداوند عالم نے قرآن سے قبل تورات وانجیل اور ان دونوں کے علاوہ نازل فرمایا۔ اس میں دو صورتیں ہیں:

اول: اس کے معنی ہیں تصدیق کرنے والی ہے گذشتہ تورات وانجیل کے اخبار کی۔ یہ کتاب اس کے خبر دینے کی حیثیت سے تصدیق کرنے والی ہے۔

دوم: ان دونوں کی تصدیق کرنے والی ہے کہ یہ دونوں اللہ کی طرف سے ہیں اور دونوں حق ہیں۔

وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ اور یہود پیغمبرؐ کے مبعوث ہونے سے قبل اور نزول قرآن سے پہلے۔ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ، (فتح کی دعا کیا کرتے تھے) اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: طلب نصرت کرتے تھے یعنی جنگوں میں دعا کرتے تھے: خدایا! پیغمبر اُمی کے واسطہ ہمیں فتح و نصرت عطا فرما! پروردگارا! ہم میں پیغمبر مبعوث کر جو ہماری طرف آنے والا ہے، اس کے واسطہ سے ہماری نصرت ومدد فرما!

دوم: یہ لوگ مشرکین پر اعتراض (دشمنی واختلاف) کرتے ہوئے کہتے تھے: اس پیغمبر کا زمانہ کافی طولانی ہو گیا ہے۔ وہ تم پر ہماری نصرت فرمائے گا۔

سوم: يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ، کے معنی ہیں یہود اپنے علماء سے عرب میں مبعوث ہونے والے پیغمبر کے صفات دریافت کرتے تھے اور ان کے لیے پیغمبر کی تعریف وتوصیف کرتے تھے لیکن جب آپ مبعوث ہوئے تو انھوں نے آپ کا انکار کر دیا۔

چہارم: اس کے معنی یہ ہیں کہ یہود کفار عرب پر اپنے پروردگار سے حکومت واقتدار کی دعا کرتے ہیں۔ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا، یعنی مشرکین عرب پر فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف اور آپ کے مبعوث برسالت ہونے کے بارے میں جانتے بھی تھے۔ كَفَرُوۡا بِهٖ، حسد وسرکشی اور طلب ریاست کے سبب انھوں نے پیغمبرؐ کا انکار کر دیا۔ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ، اللہ کی لعنت یعنی اللہ کا غضب اور عذاب ہے۔ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ، (کافروں پر) لعنت وکفر کی تفسیر ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں۔

❀❀❀❀❀

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹۰﴾

ان لوگوں نے اپنے نفس کا کتنا برا سودا کیا ہے کہ اس ضد میں خدا کے نازل کردہ کلام کا انکار کر بیٹھے کہ خدا اپنے فضل وکرم سے جس بندے پر جو چاہے نازل کر دیتا ہے۔ اب یہ غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے اور کافروں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

قرائت:

ابوعمرو نے پورے قرآن میں بغیر تشدید کے یُنْزِل قرأت کی ہے سوائے سورۂ انعام کے کہ وہاں پر آن یُّنَزِّلَ آیَةً تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر نے پورے قرآن میں بغیر تشدید کے پڑھا ہے سوائے سورۂ اسراء کے: وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ و حَتّٰى تُنَزِّلَ؛ یہاں پر تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

حمزہ اور کسائی نے پورے قرآن میں تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۂ حجر میں وَ ما نُنَزِّلُهٗ پر متفق ہیں کہ وہ مشدد ہے۔

حجت:

نَزَلَ فعل لازم ہے اسے تین طرح سے متعدی بنایا جاتا ہے:

(۱) باب افعال میں لے جا کر، جیسے اَنْزَلَ، (۲) باب تفعیل میں لے جا کر جیسے نَزَّلَ، (۳) حرف جر کے ذریعہ متعدی ہوا ہے تو وہ ارشاد الٰہی: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۔ اس شخص کے نزدیک جس نے الرُّوْحُ کو رفع دیا ہے۔

قرآن مجید میں تَنْزِیْل باب تفعیل سے بہت زیادہ آیا ہے اور یہ نَزَّلَ کو قوی بناتا ہے۔

قرآن میں اِنْزَال کا آنا معلوم نہیں ہے ہاں اَنْزَلَ کا کثرت سے آنا معلوم ہے۔

الفاظ ومعانی:

بِئْسَ وَنِعْمَ دونوں فعل ماضی ہیں۔ ان دونوں کی اصل وزن فعل پر ہے اور ان دونوں کی چار لغات ہیں: نَعِمَ وبَئِسَ حَمِدَ کے وزن پر، اور نَعْمَ وبَئْسَ عین کے سکون کے ساتھ، ونِعْمَ وبِئْسَ فاء کلمہ کو زیر دے کر یعنی فِعْلَ کے وزن پر اور نِعِمَ وبِئِسَ بروزن فِعِلَ کلمہ فاء اور عین کو زیر دے کر۔

اِشْتَرَوْا لفظ شِرَاء سے مشتق ہے اور اکثر کلام میں شَرَیْتُ بیچنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے یعنی میں نے بیچا اور اِشْتَرَیْتُ کا مفہوم ہے اِبْتَعْتُ: میں نے اسے خرید لیا۔

بَغْی کی اصل فَسَاد ہے۔ عربوں کا یہ کہنا کہ بَغَی الْجُرْحُ یعنی زخم پیپ سے بھر گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے حقیقی معنیٰ طلب کے ہیں چونکہ باغی وسرکش انسان غالب آنا چاہتا ہے جو اس کا حق نہیں ہے۔

زَانِیَة کو بَغِیًّا کہتے ہیں چونکہ اسے طلب کیا جاتا ہے۔

اِهَانَة کے معنیٰ اِذْلَال (ذلیل ورسوا کرنے کے) ہیں۔

ترکیب:

زجاج نے کہا: بِئْسَ جب مَا پر واقع ہو تو اس کے ساتھ مَا کو اسم نکرہ کے مقام میں قرار دیا گیا ہے۔ یہ بِئْسَ اور نِعْمَ میں ہوتا ہے اس لئے کہ یہ دونوں اسم میں عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ اس اسم نکرہ پر عمل کرتے ہیں جو جنس پر دلالت کرے یا اس اسم میں عمل کرتے ہیں جس پر الف لام داخل ہو اور وہ جنس پر دلالت کرے قاعدہ یہی ہے اس لئے کہ نِعْمَ پوری مدح کو ادا کرتا ہے اور بِئْسَ پوری مذمت کو۔ جب آپ نے یہ کہا کہ نِعْمَ الرَّجُلُ زَیْدٌ تو گویا آپ نے یہ کہا کہ زَیْدٌ اس مدح کا حقدار ہے جو اس کی جنس میں ہو۔ اسی طرح جب آپ نے بِئْسَ الرَّجُلُ زَیْدٌ کہا تو آپ نے نشاندہی کی کہ وہ ساری مذمت کا حقدار ہے جو اس کی جنس میں ہے۔

جب مدح اجناس کو شامل ہو تو پھر لفظ جنس کے علاوہ کسی اور لفظ میں اس کا عمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ جب اس کے ساتھ اسم جنس ہو بغیر الف لام کے تو وہ ہمیشہ منصوب ہوگا اور اگر اس پر الف لام ہو تو ہمیشہ مرفوع ہوگا۔ جیسے: نِعْمَ الرَّجُلُ زَیْدٌ، نِعْمَ رَجُلًا زَیْدٌ۔ رَجُلًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔

نِعْمَ میں اسم مفرد ہوتا ہے تفسیر کی شرط کے ساتھ اسی لئے نِعْمَ بغیر صلہ کے ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صلہ وضاحت کر کے تخصیص دیتا ہے یعنی خاص بنا دیتا ہے جبکہ نِعْمَ میں ارادہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد اسم نکرہ یا اسم جنس آئے۔

ارشاد الٰہی: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ أَنْفُسَهُمْ۔ گویا اسی طرح ہے کہ: بِئْسَ شَيْئًا اشْتَرَوْا بِهٖ۔

ابو علی نے کہا: ان کا کہنا ہے کہ وَلِذٰلِكَ كَانَتْ مَا فِي نِعْمَ بغیر صلہ (اس لئے نِعْمَ میں مَا بغیر صلہ کے ہے) یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مَا جب موصولہ ہو تو پھر اس کے نزدیک جائز نہیں ہے کہ نِعْمَ اور بِئْسَ کا فاعل واقع ہو اور یہ ہمارے نزدیک غلط اور ممنوع نہیں ہے اور اس جواز کی وجہ یہ ہے کہ مَا اسم مبہم ہے جو کثرت پر دلالت کرتا ہے اور کسی ایک کو بعینہ معین نہیں کرتا ہے جس طرح اسمائے اجناس کثرت کے لئے ہوتے ہیں اور اس کا نمونہ اس ارشاد الٰہی میں ہے: وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ؛ پس یہاں پر مقصود کثرت ہے اگرچہ لفظ واحد ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ۔

مَا معرفہ بھی ہوسکتا ہے اور نکرہ بھی جس طرح اسمائے اجناس معرفہ بھی ہوتے ہیں اور نکرہ بھی۔

ابو العباس مبرد نے جائز قرار دیا ہے کہ نِعْمَ اور بِئْسَ کی جگہ اَلَّذِيْ آسکتا ہے جب عام ہو، مخصوص نہ ہو جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے: وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ: جب انہوں نے اَلَّذِيْ میں اس بات کو جائز قرار دیا ہے تو مَا میں اور زیادہ ہی جائز ہوگی۔

پس ارشاد الٰہی بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ أَنْفُسَهُمْ؛ میں میرے نزدیک جائز ہے کہ مَا موصولہ ہو اور محلاً مرفوع ہو اس لئے کہ بِئْسَ کا فاعل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکرہ ہو ایسی صورت میں اشْتَرَوْا صفت ہوگا۔ صلہ نہیں ہوگا اور ہم نے جس بات کو صحیح قرار دیا ہے اس پر دلیل شاعر کا شعر ہے:

وَ كَيْفَ أَرْهَبُ أَمْرًا أَوْ أُرَاعُ لَهٗ   وَ قَدْ زَكَأْتُ إِلٰى بِشْرِ بْنِ مَرْوَان

فَنِعْمَ مَزْكَأُ مَنْ ضَاقَتْ مَذَاهِبُهٗ   وَ نِعْمَ مَنْ هُوَ فِيْ سِرٍّ وَّ إِعْلَان

شاعر نے اس شعر میں مَزْكَأُ کو نِعْمَ کا فاعل قرار دیا ہے اس لئے کہ مَزْكَأُ مَنْ کی جانب مضاف ہے اور عام اور غیر معینہ ہے۔

اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ محلاً مرفوع ہے اور وہ مخصوص بالذم ہے۔ اگر چاہیں تو مبتدا محذوف کی خبر

بھی کہہ سکتے ہیں یعنی: هٰذَا الشَّیْءُ الْمَذْمُوْمُ کُفْرُهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ بَغْيًا منصوب ہے اس لئے کہ مفعول لہ ہے۔ جیسا کہ حاتم کا شعر ہے:

وَ اَغْفِرُ عَوْرَاءَ الْكَرِيْمِ ادِّخَارَهٗ وَ اُعْرِضُ عَنْ شَتْمِ اللَّئِيْمِ تَكَرُّمَا

یعنی میں کریم اور عزت دار آدمی کی خطا کو بخش دیتا ہوں اس کے بچاؤ کی خاطر اور پست آدمی کے برا بھلا کہنے سے روگردانی کرتا ہوں اپنے آپ کو عزت دینے کی خاطر۔

دوسرا اَنْ منصوب ہے اس لئے کہ حرف جر محذوف یعنی بَغْيًا لِاَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ یعنی اس لئے کہ خداوند عالم نازل فرمائے۔

تفسیر:

بدترین معاملہ

خداوند عالم نے یہودیوں کی ان کے دین پر دنیا کی ترجیح کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ، انھوں نے اپنے نفس کا کتنا برا سودا کیا ہے۔ یا کس قدر بری چیز کے عوض اپنے نفس کا سودا کیا ہے۔ اَنْ يَّكْفُرُوْا، کہ انھوں نے انکار کر دیا۔ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، یعنی قرآن اور دین اسلام کا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیے گئے ہیں۔ اگر سوال کیا جائے یہودیوں نے خود کو کفر کے بدلے کس طرح فروخت کر دیا ہے؟ تو اس کا جواب ہے بَیْع و شِرَا (خرید و فروخت) مالک کی ملکیت کا کسی غیر کی جانب منتقل ہونا ہے، اس عوض کے سبب جو اسے بدلے میں حاصل ہوتا ہے، پھر اس کا استعمال ہر اس عوض اور بدلے میں ہونے لگا جو عمل کے عوض حاصل ہو خیر ہو یا شر، یہودیوں نے جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرتے ہوئے اپنے نفس کو ہلاکت میں مبتلا کر لیا تو اللہ نے انھیں اس چیز سے خطاب فرمایا جس سے وہ واقف تھے۔

ارشاد فرمایا: کس قدر بری چیز ہے جس پر وہ لوگ اللہ کے ثواب کے عوض راضی ہو گئے اور جو چیز ان کے لیے آمادہ کی گئی تھی۔ اگر یہ لوگ اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لاتے جسے اس نے اپنے نبیؐ پر نازل فرمایا ہے۔ لیکن وہ آتش جہنم پر اور اس چیز پر راضی ہو گئے جسے ان کے کفر کے عوض آمادہ کیا گیا ہے۔

جیسا کہ سورہ نساء کی مندرجہ ذیل آیتوں میں آیا ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ۔ اَمْ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا ۔ اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا ۔ (سورۂ نساء، آیات ۵۱۔۵۲۔۵۳۔۵۴)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں علم کتاب کا تھوڑا سا حصہ دیا گیا تھا؟ ان کا حال یہ ہے کہ وہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہ لوگ زیادہ صحیح راستے پر اور ہدایت یافتہ ہیں) (ایسے ہی لوگوں پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے تو پھر تم کسی کو ایسے شخص کا مددگار نہ پاؤ گے) (کیا وہ حکومت میں حصے دار ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی کو پھوٹی کوڑی تک نہ دیتے) (کیا یہ لوگ دوسرے لوگوں سے اس بنیاد پر حسد کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے نوازا ہے اگر یہ بات ہے تو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت دی اور انھیں ملک عظیم عطا فرمایا ہے۔

ارشاد: بَغْیًا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کرتے ہوئے جبکہ آپؐ جناب اسماعیلؑ کے فرزند تھے اور دیگر رسول بنی اسرائیل سے تھے اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے ایسی چیز کو طلب کیا جو ان کے لیے نہیں تھی۔ پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ، (خدا اپنے فضل و کرم سے جس بندے پر جو چاہے نازل کر دیتا ہے) جو کہ وحی اور نبوت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ، (اب یہ غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے) یعنی بنی اسرائیل کے یہودی پلٹ گئے جبکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ نصرت و فتح کی دعا کرتے تھے اور آپؐ کے متعلق خبر دیتے تھے کہ آپ کو پیغمبر مبعوث کیا جائے گا۔ لیکن جب اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ (یہودی) مرتد ہو گئے اور الٹے پیروں واپس پلٹ گئے، غضب الٰہی کا شکار ہو گئے، جس کے وہ اپنے کفر کے باعث مستحق ہو چکے تھے۔

مؤرج نے بیان کیا ہے: فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ، کے معنی ہیں لعنت کے مستحق ہو گئے۔ یہ جُرہم کی لغت میں ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ باءَ مفرد ہے تا کہ کہا جائے خیر کے ساتھ یا شر کے ساتھ۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے۔ فَبَآءُوْا بِغَضَبٍ، انھوں نے اسے اٹھایا اور ٹھہرا لیا۔ اَلْبَوْءُ کے لغوی معنیٰ ٹھہرنے اور ایک جگہ رک جانے کے معنیٰ میں ہے۔

ارشادالٰہی: بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ، کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

اول: پہلا غضب یہ کہ جب انھوں نے پیغمبرؐ کے مبعوث ہونے سے قبل تورات کو بدل دیا اور دوسرا غضب جب انھوں نے پیغمبرؐ کا انکار کیا۔ یہ عطاوغیرہ کا قول ہے۔

دوم: پہلا غضب جب انھوں نے بچھڑے کی پرستش کی، دوسرا غضب جب انھوں نے پیغمبرؐ کا انکار کیا۔ یہ سُدی کا قول ہے۔

سوم: پہلا غضب جب انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ دوسرا غضب جب انھوں نے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیا۔ یہ حسن، عکرمہ اور قتادہ کا قول ہے۔

چہارم: اس میں تاکید اور مبالغہ ہے۔ غضب ان کے لیے لازمی وضروری ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کی تکرار کی گئی ہے۔ یہ ابومسلم اور اصم کا قول ہے۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ اس کے یہ معنی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے والوں کے لیے اللہ کی طرف سے رسوا کن عذاب ہے، چاہے دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ مھین، وہ (چیز) جو اپنے ساتھی (مستحق) کو ذلیل ورسوا کردے اور اسے رسوائی کا لباس پہنادے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مھین (وہ چیز) ہے جس سے اعزاز واکرام تک منتقل نہ ہو اور کبھی غیر مھین یعنی جب وہ گناہوں سے پاک صاف کرنے اور پوشیدہ رکھنے کے لیے ہوتا ہے جسکے بعد وہ اعزاز وکرام تک منتقل ہوجائے اس اعتبار سے جو آتش جہنم سے جنت کی جانب منتقل ہوگا اس کا عذاب رسوا کن نہیں ہوگا۔

❀❀❀❀❀

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا وَیَکۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۱﴾

اور جب ان سے کہا گیا کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے اس پر ایمان لے آؤ تو انھوں نے کہا جو کتاب ہم پر پہلے نازل ہو چکی ہے ہم اسی کو مانتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ کتاب برحق ہے اور ان کے پاس جو کتاب ہے اس کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ آپ ان سے دریافت کیجیے کہ اگر تم مومن ہو تو اس سے پہلے انبیائے خدا کو کیوں قتل کرتے رہے؟

الفاظ و معانی

مَاوَرَآءَهٗ کے معنیٰ ہیں مَابَعدَہٗ۔ جو اس کے بعد ہو۔ فراء نے کہا: وراءہ کے معنیٰ ''سوائے اس کے'' کے ہیں۔ جس طرح اس شخص سے کہا جائے جو عمدہ اور خوبصورت گفتگو کر رہا ہے: ما وراء الکلام شیء۔ اس کلام کے بعد تو کچھ ہے ہی نہیں۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ گفتگو کرنے والے کے پاس اس کلام کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترکیب:

مُصَدِّقًا منصوب ہے حال کی بنا پر اور یہ حال مؤکدہ ہے۔

زجاج نے کہا: سیبویہ، خلیل اور سارے علمائے نحو کہ جن کے علم پر بھروسہ کیا جاتا ہے ان سب کا گمان ہے کہ آپ کا یہ کہنا کہ ھُوَ زَیۡدٌ قَائِمًا غلط ہے اس لئے کہ آپ کا ھُوَ زَیۡدٌ کہنا اسم متقدم کنایہ ہے پس اس حال لانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے کہ حال یہاں پر اس بات کا باعث ہوگا کہ جب وہ کھڑا ہو تو زید ہوگا اور جب کھڑا نہ ہوگا تو زید نہیں ہے، یہ غلط ہے۔

لیکن آپ کا یہ کہنا کہ ھُوَ زَیۡدٌ مَعۡرُوۡفًا یہ صحیح ہے۔

یہاں حال لانے میں فائدہ ہے گویا اس طرح کہہ رہے ہیں کہ اس کے لئے مَعۡرُوۡفًا کو ثابت کرنا گویا اس جملہ کے مانند ہے کہ ھُوَ زَیۡدٌ حَقًّا لَیۡسَ مَعۡرُوۡفًا حال ہے اس کہ یہ زید ہے کہ جو زید کے عنوان

سے مشہور ہے۔

اسی طرح قرآن حق ہے جب وہ انبیاء علیہم السلام کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔

فَلِمَ تَقْتُلُونَ: اگرچہ لفظ استقبال یعنی فعل مضارع ہے لیکن مراد ماضی ہے، یہ کہنا صحیح ہے اس لئے کہ مِنْ قَبْلُ بھی آیا ہے۔

اِنْ شرط کے معنی میں ہے اور جو کچھ گذر چکا ہے وہ اس کے جواب پر دلالت کرتا ہے گویا اس طرح ہے: اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ فَلِمَ قَتَلْتُمْ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ (اگر تم مومن تھے تو تم نے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا؟! کہا گیا ہے کہ اِنْ، مَا نافیہ کے معنی میں ہے یعنی مَا كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ۔ (تم لوگ مومن نہیں تھے)

تفسیر:

یہود کے نسلی تعصب

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ، (اور جب ان سے کہا گیا کہ) مراد یہودی ہیں جن کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے۔

اٰمِنُوْا، (ایمان لے آؤ، یعنی) تصدیق کرو، بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، (اس چیز کی جسے اللہ نے نازل کیا ہے) یعنی اس قرآن کی جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے اور جن احکام کو حضورؐ لے کر آئے۔ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا، یہودیوں نے جواب دیا: جو کتاب ہم پر نازل کی گئی ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں یعنی توریت پر ہمارا ایمان ہے۔ وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ، اور جو کچھ اس کے بعد آیا ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی مراد انجیل اور قرآن ہے یا توریت کے سوا دیگر نازل شدہ کتب جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ، (نساء، ۲۴) مذکورہ بالا عورتوں کے سوا اور عورتیں تم پر حلال ہیں۔ یہ ابن الانباری نے کہا ہے۔

بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا، پر کلام مکمل ہو گیا۔ پھر خداوند عالم نے ان کے متعلق خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ، یعنی اس کے علاوہ کا انکار کرتے ہیں۔

وَهُوَ الْحَقُّ، اور وہ حق ہے یعنی قرآن۔ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ، جو کچھ ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہے یعنی تورات۔ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ پر نازل ہونے والے قرآن کی تصدیق ان کے یہاں تورات میں مکتوب (لکھی ہوئی) تھی۔

زجاج نے کہا ہے: اس آیت میں اس پر دلالت ہے کہ انھوں نے اس چیز کا انکار کیا جوان کے ساتھ تھی جبکہ انھوں نے اس چیز کا انکار کیا جوان کے پاس موجود چیز کی تصدیق کر رہی تھی۔

پھر خداوند عالم نے ان کے اس قول کی تردید کی: نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا۔ جو کتاب ہم پر نازل ہو چکی ہے، ہم اسی کو مانتے ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا: قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ، اے محمدؐ! ان لوگوں سے کہہ دیجیے: تم انبیاء کو کیوں قتل کرتے ہو جب کہ خداوند عالم نے جس کتاب کو تم پر نازل کیا ہے اس میں (انبیاء) کا قتل حرام قرار دیا ہے۔ اس میں تمھیں انبیاء کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ ان کی اطاعت وتصدیق تم پر فرض کی ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ جس چیز کو تم پر نازل کیا گیا ہے (اگر تم اس پر ایمان رکھتے ہو)

زجاج نے کہا ہے: اس مقام پر اِنْ بمعنی مَا ہے، گویا کہا جا رہا ہے: مَا كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، تم ایمان پر نہیں تھے۔ یہ وجہ بعید ہے۔

تَقْتُلُوْنَ (یعنی تم قتل کرتے ہو) قَتَلْتُمْ، (یعنی تم نے قتل کیا) کے معنی میں ہے چونکہ مضارع کا صیغہ ماضی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جب وہ صفات لازمہ اور ضرور یہ سے ہو جیسا کہ بطور مثال کہا جاتا ہے: اَنْتَ تَسْرِقُ وَ تَقْتُلُ، یعنی چوری کرتے ہو اور تم قتل کرتے جب اس کی عادت ہی قتل کرنا اور چوری کرنا ہو چکی ہو۔ اس طرح حال یا مستقبل میں اس فعل پر اس کی مذمت اور سرزنش نہیں ہوتی بلکہ گذرے ہوئے فعل پر سرزنش مراد ہوتی ہے۔ دو امور کے سبب ان کے اسلاف اور بزرگوں کے فعل کی نسبت ان کی جانب دی گئی ہے:

اول: خطاب (اس وقت) موجود افراد ملت اور غیر موجود افراد سے ایک ہی ہے جب ان کے بزرگوں نے انبیاء کا قتل کیا (غیر موجود افراد) اپنے بزرگوں کے مذہب اور طریقۂ کار پر باقی ہیں تو انھوں نے (اپنے بزرگوں کے) فعل میں شرکت کی۔

دوم: یہ کہ وہ اپنے بزرگوں کے افعال پر راضی رہے۔ وَالرَّاضِيْ بِفِعْلِ قَوْمٍ كَالدَّاخِلِ فِيْهِ مَعَهُمْ، جو شخص کسی قوم اور گروہ کے فعل پر راضی ہو وہ اس فعل میں ان کے ہمراہ داخل اور شریک ہے۔ یہ معنی پہلے معنی کے قریب ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کی کتاب پر ایمان درست نہیں جب تک کہ اس کے علاوہ اللہ کی نازل کردہ ان کتابوں پر ایمان نہ ہو جو معجزہ سے نزدیک ہونے میں اسی کے مانند ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

یقیناً موسیٰ تمھارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تھے پھر تم نے ان کے بعد گوسالہ کو معبود بنالیا تم واقعی ظالم لوگ ہو۔

تفسیر:

جناب موسیٰ واضح نشانیاں لائے

پھر خداوند عالم نے اس چیز کو بیان فرمایا جو ان کے دین میں بے بصیرتی اور ضعف ایمان پر دلالت کر رہی ہے، ارشاد ہوا: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ، یقیناً موسیٰ تمھارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تھے جو ان کی صداقت پر دلالت کر رہی تھیں اور ایسے معجزات جو ان کی تائید کر رہے ہیں مثلاً ید بیضا، پتھر سے چشمہ پھوٹنا، سمندر میں شگاف پیدا ہونا، عصا کا اژدہا بننا، طوفان اور ٹڈی، جوں، مینڈک اور خون (کی شکل میں ظاہر ہونا) جناب موسیٰ کی نبوت کی تائید کر رہے تھے۔ (تمام چیزوں کا) نام بینات، ناظرین کے لیے ان کے ظاہر اور واضح ہونے کے سبب قرار دیا ہے اور معجزہ اس لیے ہیں کہ ہر انسان اس کے انجام دینے سے عاجز ہے۔

ارشاد الٰہی: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ، یعنی تم نے بچھڑے کو الٰہ قرار دے کر اس کی پرستش کی۔ مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی موسیٰ کے اپنے پروردگار کے میقات پر جانے کے بعد۔ ممکن ہے (بعدہ) کی (ہ) جناب موسیٰؑ کے واپس آنے سے کنایہ ہو، اس کی تقدیر اس طرح ہوگی کہ تم نے بچھڑے کو (الٰہ) اختیار کیا (بینات) معجزات کے آنے کے بعد وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ، تم نے کفر اختیار کر کے اور بچھڑے کی پرستش کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا چونکہ غیر اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی۔

❁❁❁❁❁

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے توریت پر عمل کرنے کا عہد لیا تھا اور تمھارے سروں پر کوہ طور کو معلق کر دیا تھا کہ جو ہم نے تمھیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور جو ہم کہیں اسے سنو تو انھوں نے ڈر کے مارے فوراً اقرار کر لیا کہ ہم نے سن تو لیا لیکن نافرمانی بھی کریں گے اور ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت ان کے کفر کے سبب گھول کر پلا دی گئی ہے۔ اے پیغمبر آپ ان سے فرما دیجیے اگر تم مومن ہو تو تمھارا ایمان تمھیں کتنی بری بات بتاتا ہے۔

الفاظ و معانی:

اِسْمَعُوْا کے معنی اِقْبَلُوْا (یعنی قبول کرنے کے) ہیں۔ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ یعنی اللہ اس کی حمد کرنے والے کی حمد کو قبول کرتا ہے۔

اُشْرِبُوْا شُرْب سے مشتق ہے (یعنی پینا) شَرِبَ و اَشْرَبَ، اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کو پینے پر مجبور کر دیا جائے۔ اُشْرِبَ الزَّرْعُ جب کھیتی کی سینچائی کی جائے۔ اُشْرِبَ قَلْبُهٗ حُبَّ كَذَا اس کے دل کو اس کی محبت گھول کر پلا دی گئی۔

ترکیب:

اَلْعِجْلَ یعنی حُبَّ الْعِجْلِ (گوسالہ کی محبت) مضاف (حُبّ) کو حذف کر کے مضاف الیہ (اَلْعِجْل) کو اس کی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

حَسِبْتَ بُغَامَ رَاحِلَتِيْ عَنَاقًا وَ مَا هِيَ وَيْبَ غَيْرِكَ بِالْعَنَاقِ

یعنی حَسِبْتَ بُغَامَ رَاحِلَتِيْ بُغَامَ عَنَاقٍ۔

طرفہ نے کہا:

اَلَا إِنَّنِيْ سُقِّيْتُ اَسْوَدَ حَالِكًا اَلَا بَجَلِيْ مِنَ الشَّرَابِ اَلَا بَجَل

یعنی سُقِّيْتُ سَمَّ اَسْوَد

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

وَ شَرُّ الْمَنَايَا مَيِّتٌ وَّسْطَ اَهْلِهٖ كَهُلْكِ الْفَتٰى قَدْ اَسْلَمَ الْحَيَّ حَاضِرُهٗ

یعنی شَرُّ الْمَنَايَا مَنِيَّةُ مَيِّت۔

بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ: اس کی ترکیب کا بیان گذر چکا ہے۔

اِنْ ممکن ہے کہ مَا کے معنی میں ہو یعنی مَا كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور ممکن ہے کہ گویا اس طرح ہو: اِنْ كُنْتُمْ فَبِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ هٰذَا (اگر تم لوگ مومن ہو تو تمہارا یہ ایمان تمہیں بہت برا حکم دے رہا ہے)

تفسیر:

گوسالہ کی محبت

ارشادالٰہی: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ، کی ہم سابق میں تفسیر کر چکے ہیں۔ اس کی تکرار کا فائدہ ان پر تاکید اور حجت کا قائم کرنا ہے اور یہ عربوں کی عادت کے مطابق ہے جسے وہ اپنے خطابات میں کرتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب خداوند عالم نے یہودیوں کی برائیوں کو شمار کیا تو ان پر پہاڑ کے بلند کیے جانے کے ذکر کا اعادہ فرمایا۔ بیان کیا گیا ہے کہ پہلا ذکر گذشتہ اخبار کے ذریعہ نصیحت کے لیے ہے، دوسرا ذکر ان پر اتمام حجت کے لیے ہے۔

ارشادالٰہی: وَّاسْمَعُوْا، جو تم نے سنا اسے قبول کرو اس پر عمل کرو اور اللہ کی اطاعت کرو! بیان کیا گیا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں: جس کی تلاوت تم پر کی گئی ہے اسے غور سے سنو یعنی کان لگا کر دھیان سے سنو! اس لفظ میں غور سے سننے اور اس کے قبول کرنے کا احتمال (امکان) ہے۔ دونوں کے درمیان کسی قسم کی منافات نہیں ہے۔ دونوں کا احتمال ہے۔ گویا کہا جا رہا ہے: کان لگاؤ (دھیان دو، متوجہ رہو) تا کہ سن سکو پھر قبول کرو اور اطاعت کرو جو اس امر پر دلالت کر رہا ہے۔ ان کی طرف سے جواب میں کہا جا رہا ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم نے

سنا اور نافرمانی کی اس میں دو قول ہیں:

اول: انھوں نے کہا یہ قول حقیقت میں استہزا اور مذاق اڑانا ہے جسکے معنی ہیں ہم نے تیرا قول سنا اور تیرے امر کی نافرمانی کی۔

دوم: ان کی حالت اس شخص کے مانند ہے جو یہ کہتا ہے کہ جب انھوں نے وہ فعل انجام دیا جو اس چیز پر دلالت کرتا ہے۔

خداوند عالم نے لفظ خطاب سے غائب کی طرف عدول کیا ہے جو کہ عربوں کی مشہور عادت کے مطابق ہے۔ اس ضمیر میں اختلاف ہے کس کی جانب پلٹ رہی ہے؟ کہا گیا ہے: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں موجود یہودیوں کی جانب پلٹ رہی ہے۔ انھوں نے ہی یہ بات کہی تھی پھر گفتگو کے آغاز کی جانب رجوع کی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، اُشْرِبُوا، یعنی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت گھول کر پلا دی گئی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ضمیر حضرت موسیٰ کے زمانہ میں موجود یہودیوں کی جانب پلٹ رہی ہے۔ جب انھوں نے جناب موسیٰ کے قول کی تردید کی اور نافرمانی کرتے ہوئے ان کا مقابلہ کیا۔

ارشاد: وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ ، اس کے معنی یہ ہیں: ان کے دلوں میں محبت داخل ہوگئی الْعِجْلَ، یہاں پر بچھڑے کی محبت کو پینے سے تعبیر کیا ہے نہ کہ کھانے سے۔ چونکہ پانی اعضاء بدن میں باقاعدہ پہونچتا ہے یہاں تک کہ ان کے باطن میں پہونچتا ہے لیکن کھانا اعضا سے گذرتا ہے لیکن ان میں باقاعدہ داخل نہیں ہوتا۔

اُشْرِبُوا (یعنی پلا دیا گیا) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کے علاوہ کسی نے یہ کام کیا ہے بلکہ انھوں نے خود اسے انجام دیا ہے جس طرح قائل کہتا ہے: "کیا تم اس چیز کو نسیان کے سبب بھول گئے" اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ کسی اور نے یہ کام کیا ہے اور اس طرح بھی کہا جاتا ہے: اُوْتِيَ فَلَانٌ عِلْمًا جَمًّا فلاں انسان کو مکمل علم عطا کر دیا گیا اگرچہ وہ خود اس کا حاصل کرنے والا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: بِكُفْرِهِمْ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھیں بچھڑے کی محبت پلا دی گئی ہے۔ یہ ان کے کفر کی سزا ہے۔ چونکہ بچھڑے کی محبت بڑا کفر ہے اور خداوند عالم بندے کا فر نہیں بناتا نہ تو ابتدائی طور پر نہ ہی سزا کے عنوان سے۔ اس کے معنی یہ ہیں: انھوں نے اللہ کا انکار اس سبب سے کیا کہ انھیں بچھڑے کی محبت گھول کر پلا دی گئی تھی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت اس نے پلائی جس نے ان کے نزدیک (بچھڑے) کی محبت کی زینت دی اور اس کی دعوت دی، جیسے سامری اور جن وانس کے شیاطین۔

ارشادالٰہی: بِكُفْرِهِمْ، اس کے معنی ہیں یہودیوں کا تشبیہ کا عقیدہ اللہ سے ناواقفیت اوران کا غیرخدا کی عبادت جائز قرار دینے سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت گھول کر پلادی گئی۔ چونکہ یہ تمام اموران معنی کے قرار پاتے ہیں جو کفر ہے اوراس شخص کا قول جس کا کہنا ہے کہ اللہ نے یہ عمل ان کے ساتھ عذاب اور بدلہ کے طور پر قرار دیا ہے تو بالکل غلط ہے چونکہ بچھڑے کی محبت کا عذاب سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی اس میں کسی طرح کا کوئی ضرر ہے۔

ارشادالٰہی: قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ ،اس کے معنی ہیں: اے محمدؐ! ان یہودیوں سے کہہ دیجیے کس قدر بری چیز ہے جس کا حکم تمھارا ایمان دیتا ہے، اگر وہ تمھیں اللہ کے انبیاء، اس کے رسولوں کے قتل، اس کی کتب کی تکذیب اور جو چیز اس کی جانب سے آئی ہے اس کے انکار کا حکم دیتا ہے۔ ان کے ایمان کے معنی ان کا تصدیق کرنا ہے اس چیز کی جسکے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ کتاب خدا کی تصدیق کر رہے ہیں اپنے اس قول کے ذریعے: نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا؛ ہم اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور اللہ کا قول: إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ؛ جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے تم توریت کی تصدیق کرنے والے ہو اور اس میں توریت کی نفی کی ہے کہ وہ ایسی بات کا حکم دے اللہ ان کے افعال سے جن باتوں کو ناپسند کرتا ہو اور آگاہ کرنا ہے کہ جو چیز انھیں اس بات کا حکم دیتی ہے وہ ان کی خواہشات ہیں اور ان کی آراء نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۴﴾

(اے نبی!) آپ ان سے فرمادیجیے کہ اگر آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک تمام انسانوں کے مقابلے میں تمھارے لیے خالص ہے۔ تو پھر موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

الفاظ ومعانی:

خَالِصَةً صَافِيَةً کہا جاتا ہے: خَلَصَ لِي هٰذَا الْأَمْرُ ؛ یہ معاملہ صرف میرے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی صرف میرے لیے ہو گیا ہے اور میرے لئے اس کا انتخاب ہوا ہے۔ خَالِصَة مصدر ہے عَافِيَة کی طرح۔ خُلُوص کے حقیقی معنی چیز کے ہر طرح کی ملاوٹ سے خالص ہونے کے ہیں۔

دُوْن تین صورتوں میں استعمال ہوتا ہے :۱۔کوئی چیز جگہ کے اعتبار سے کسی چیز سے پست ہو۔
۲۔باعتبار شرف پست ہو۔۳۔اختصاص میں پست اور کم ہو۔آیت میں یہی مراد ہے۔
تَمَنِّی اکثر متکلمین کے یہاں اقوال کی جنس سے ہے۔

ترکیب:

خَالِصَةً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

تفسیر:

خود سے راضی جماعت

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے احتجاج کا اعادہ کیا ہے یہودیوں کے خلاف ان کے احبار (پادری) اور علماء کی جس میں فضیحت و رسوائی ہے اور انھیں دعوت دی گئی ہے ایک ایسے عادلانہ فیصلے کی جانب جو اللہ اور ان یہودیوں کے درمیان ہو۔تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یا محمدؐ! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اور محمدؐ اور ان کے اصحاب کے علاوہ جنت صرف خالص تمھارے لئے ہے جیسا کہ تم نے اپنے قول سے دعویٰ کیا ہے: لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۱) ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہو یا عیسائی ہو۔اور تم اپنے دعوے میں سچے بھی ہو۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ، آیت ۱۸) ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں اور اِنَّ اللّٰهَ لَا یُعَذِّبُنَا ؛ اور اللہ ہم پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ؛ تو پھر موت کی تمنا کرو۔ چوں کہ جو (شخص) یقینی طور پر جنتی ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے تو اس کے نزدیک دنیاوی زندگی کی نسبت موت زیادہ محبوب ہونی چاہیے۔جس میں طرح طرح کی زحمتیں، ہم وغم اور آلام ہیں اور جسکو اس بات کا یقین ہو کہ مرنے کے بعد اسے اس (مصیبت بھری دنیا سے چھٹکارا مل جائے گا اور ہمیشہ رہنے والی نعمت پر اسے حاصل ہو جائے گی تو وہ موت کو زندگی پر ترجیح دے گا۔

کیا آپ نے امیر المومنین علی علیہ السلام کا ارشاد نہیں سنا کہ جب آپ جنگ صفین میں دوصفوں کے درمیان نہایت ہی معمولی لباس پہنے چکر لگا رہے تھے اور اس موقع پر آپؑ کے فرزند حسن علیہ السلام نے آپ سے عرض کیا تھا کہ یہ کون سا جنگی لباس ہے؟ تو اس وقت آپؑ نے فرمایا: بیٹا تمھارے باپ کو اس کی پرواہ نہیں

کہ وہ موت پر جا گرے یا موت اس پر واقع ہو جائے۔ اسی طرح عمار بن یاسر کا میدان صفین میں یہ کہنا: اب میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے گروہ سے ملاقات کرنے والا ہوں۔ البتہ جس چیز کی روایت پیغمبرؐ سے کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کسی نقصان اور تکلیف کے باعث تم میں سے کوئی تمنائے موت نہ کرے لیکن اس طرح کہے: پروردگارا! جب تک میری زندگی میرے لیے بہتر ہو مجھے زندہ رکھ، جب میرے لیے موت بہتر ہو مجھے موت دیدینا۔ حضورؐ نے تمنائے موت سے نہی فرمائی ہے۔ (تمنائے موت) بے صبری پر دلالت کرتی ہے جب کہ صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح تمام امور (خدا) کے سپرد کرنے کا حکم ہے چونکہ ہم خطاؤں کے سرزد ہونے سے مطمئن نہیں ہیں جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور باقی رہنے میں تلافی کی امید ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ أَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ ۢ بِالظَّالِمِينَ ﴿۹۵﴾
اور یہ اپنے پچھلے اعمال کے سبب ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے۔

ترکیب:

اَبَدًا ظرف (مفعول فیہ کی بنا پر منصوب ہے یعنی طول عمر (پوری زندگی) کہنے والا اس طرح کہتا ہے: لَا اُكَلِّمُكَ اَبَدًا (میں تم سے اور بات نہیں کروں گا) مراد یہ ہے کہ جب تک زندہ ہوں۔

مَا، اَلَّذِيْ کے معنی میں ہے یعنی بِالَّذِيْ قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مَا مصدر کے معنی میں ہو تو مراد یہ ہوگا کہ بِتَقْدِمَةِ اَيْدِيْهِمْ (ان کے ہاتھوں کے پیش کرنے کا سبب)

تفسیر:

موت کی تمنا نہ کرنے کا سبب

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں خبر دے رہا ہے جن کے بارے میں کہا گیا: فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ؛ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہرگز موت کی تمنا

نہیں کریں گے اس لئے کہ انھوں نے اپنے معاصی، برائیوں، رسول کو جھٹلانے اور کتاب (قرآن) کو نہ ماننے کا اقدام کرلیا تھا یہ روایت حسن اور ابو مسلم سے ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے جو پیغمبرؐ کی صفت کو پوشیدہ رکھا ہے۔ یہ روایت ابن جریح سے مروی ہے۔ ان امور کی نسبت "یَد" یعنی ہاتھ کی جانب دی گئی ہے۔ اگرچہ یہ امور انھوں نے زبان کے ذریعہ انجام دیئے ہیں چونکہ عرب کہتے ہیں: اس چیز کو اپنے ہاتھ سے (کسب) حاصل کیا ہے، اگرچہ وہ چیز زبان سے حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور سے جرم اور گناہ ہاتھ کے ذریعہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس چیز کی نسبت بھی اس چیز کی جانب دے دی گئی ہے جو اس کے (ہاتھ) کے علاوہ حاصل ہوئی تھی۔

ارشاد الٰہی: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ، خداوند عالم نے (اس مقام پر اپنے علم اور واقفیت کو ظالموں) سے مخصوص کیا ہے اگرچہ وہ ظالموں اور ان کے علاوہ (لوگوں) کے بارے میں بھی واقف ہے۔ اس سے غرض و مقصود ان کی تہدید و سرزنش ہے جس طرح کوئی شخص کسی سے کہتا ہے: میں تمھارے عمل کو بخوبی جانتا ہوں۔

یہ بھی کہا گیا ہے: خداوند عالم ان اسباب کے بارے میں بخوبی جانتا ہے جنھوں نے تمھیں تمنائے موت سے روکا ہے اور جس چیز کو تم نے حق سے دشمنی کرتے ہوئے پوشیدہ کردیا ہے۔ باوجودیکہ تم کو ان کے متعلق بہت زیادہ علم ہے کہ وہ باطل پر ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر یہودی تمنائے موت کرتے تو مرجاتے اور اپنا ٹھکانہ جہنم میں دیکھ لیتے۔ خدا نے فرمایا: وہ ہرگز تمنائے موت نہیں کریں گے۔ یہ ان کے جھوٹ کے ثابت ہونے کے سبب ہے۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت اور صحت نبوت پر بزرگ ترین دلالت ہے چونکہ پیغمبرؐ نے اس چیز کی اطلاع دی ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا جیسی آپؐ نے خبر دی تھی۔ اسی طرح یہودیوں نے تمنائے موت نہیں کی جبکہ وہ جانتے تھے کہ (موت) حق ہے۔ اگر وہ تمنائے موت کرتے تو مرجاتے۔

کلبی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہودیوں سے کہا جارہا ہے: اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو کہو: پروردگارا! ہمیں موت دیدے! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جو شخص بھی اس طرح کہتا: اس کے حلق میں اُچھو لگتا اور وہ اسی جگہ مرجاتا۔ یہ واقعہ مباہلہ کے واقعہ کی طرح ہے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تو وہ خود سے غیر مطمئن ہونے اور پیغمبرؐ کی صداقت کے خوف سے مباہلہ کرنے سے مانع ہوئے۔ چونکہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: اگر نصاریٰ مجھ

سے مباہلہ کریں گے تو اس عالم میں واپس پلٹیں گے نہ ان کے اہل باقی رہیں گے نہ ہی مال باقی رہے گا۔ پس جب یہودیوں نے تمنائے موت نہیں کی تو رسوا ہو گئے۔ جس طرح نصاریٰ نے مباہلہ سے گریز کیا وہ ذلیل و رسوا ہوئے اور حق ظاہر ہوا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ انھوں نے دل سے تمنائے موت نہیں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس نے کہا ہے تمنا قول کے ذریعہ ہوتی ہے تو اس سے سوال ساقط ہے، جس نے کہا (تمنائے موت) قلبی چیز ہے تو ان سے کہا ہے کہ اگر وہ اپنے قلب سے تمنائے موت کرتے تو اس کا اظہار اپنی زبان سے کرتے تا کہ اس طرح ان اخبار (روایات) کی تکذیب کریں۔ چونکہ انھیں تمنائے موت کا چیلنج کیا گیا ہے، وہی پیش آیا جو ان کی زبان پر ظاہر ہوا جب کہ ان کے لیے یہ کہنا آسان تھا ''کاش ہمیں موت آجاتی'' لیکن جب انھوں نے یہ کہنے سے انحراف کیا تو پیغمبرؐ کی صداقت ظاہر اور حجت واضح ہو گئی۔

❁❁❁❁❁

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

(اے رسول!) آپ دیکھیں گے کہ یہ زندگی کے سب سے زیادہ حریص ہیں (بلکہ اس معاملہ میں) مشرکین سے بھی بڑھ کر ہیں ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ اسے ہزار برس کی عمر دے دی جائے لیکن اگر یہ طویل زندگی بھی انھیں مل جائے تو وہ عذاب الٰہی سے بچنے والے نہیں۔ اللہ ان کے اعمال کو بخوبی دیکھ رہا ہے۔

الفاظ ومعانی:

وَجَدَہٗ، وصَادَفَہٗ، وَ اَلْفَاہٗ باہم مشابہ ہیں (ان کے معنی پانے کے ہیں) یہ بھی کہا گیا ہے: وَجَدْتُ الشَّیْءَ وِجْدَانًا. (میں نے شے کو پالیا) جب تم اس شے تک پہنچ جاؤ۔ اور کہا گیا ہے کہ وَجَدْتُ عَلِمْتُ (میں نے جانا) کے معنی میں ہے۔

حِرْص کے معنی شدت طلب کے ہیں۔

تَعۡمِیۡر کے معنی طول عمر کے ہیں۔ العُمُر، العَمۡر دو لفظیں جنکی اصل عمارہ ہے جو خراب (بربادی، تباہی) کی ضد ہے۔ عُمر وہ مدت ہے جس میں بدن زندہ رہتا ہے۔

اَلۡف تَاۡلِیۡف سے بنا ہے اس سے عدد کا نام قرار دیا گیا ہے جو سو(۱۰۰) عدد کو دس مرتبہ جوڑا گیا ہے۔

ترکیب:

لَتَجِدَنَّهُمۡ میں لام لام قسم ہے اور نون تاکید کے لئے ہے، گویا اس طرح ہے: وَلَتَجِدَنَّهُمۡ۔

سیبویہ نے کہا: میں نے خلیل سے سوال کیا کہ کیا لَتَفۡعَلَنَّ اِذَا جَاءَتۡ مبتدا ہے؟! جواب دیا: یہ قسم کی نیت پر ہے۔ یہی لام جب فعل مضارع پر داخل ہو تو اس امر میں زیادہ تر نون کا لانا لازم ہوجاتا ہے۔

جب وَجَدۡتُ، وِجۡدَانُ الضَّالَّةِ یعنی گمشدہ کو پا لینے کے معنیٰ میں ہوگا تو متعدی بہ یک مفعول ہوگا جس طرح فَقَدۡتُ ایک مفعول ہے اور یہ وَجَدۡتُ کی ضد ہے۔ پس اَحۡرَصَ بنابر حال منصوب ہوگا تو دو مفعول کی جانب متعدی ہوگا کہ دوسرا مفعول پہلے کی وضاحت ہوگا ایسی صورت میں اَحۡرَصَ مفعول دوم ہوگا یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

وَمِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا: فراء نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ مشرکین سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: هُوَ اَسۡخَی النَّاسِ وَمِنۡ حَاتَم وَمِنۡ هَرِم وہ سب سے بڑا سخی ہے، حاتم سے بھی بڑا اس لئے کہ آپ کی تاویل یہ ہے کہ اَسۡخَی النَّاسِ اِنَّمَا هُوَ اَسۡخَی النَّاسِ: سب سے بڑا سخی وہی ہے سب سے بڑا سخی وہی ہے۔

زجاج نے کہا: یہ کلام اس طرح کا ہے: وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا اور یقیناً ضرور بالضرور آپ ان لوگوں کو مشرکین سے زیادہ حریص پائیں گے۔

کہا گیا ہے کہ مِنۡ وَمِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا میں داخل ہوا ہے جبکہ اَحۡرَصَ النَّاسِ پر داخل نہیں ہوا ہے اس لئے کہ وہ بَعۡضُ النَّاس ہے اور بَابِ اَفۡعَلُ (افعل تفضیل) میں اضافت اس طرح ہوتی ہے جیسے آپ یہ کہیں کہ اَلۡیَاقُوۡتُ اَفۡضَلُ مِنَ الۡحِجَارَةِ: آپ اس طرح نہیں کہہ سکتے ہیں: اَلۡیَاقُوۡتُ اَفۡضَلُ الزُّجَاجِ، بلکہ اَفۡضَلُ مِنَ الزُّجَاجِ کہیں گے اسی لئے فرمایا: مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا اس لئے کہ وہ بَعۡضُ الۡمَجُوۡسِ نہیں ہیں بلکہ وہ بَعۡضُ النَّاس ہیں۔

ارشادِ الٰہی مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ اس میں چند صورتیں ہیں:

پہلی صورت: هُوَ ان میں سے کسی ایک جانب کنایہ ہے کہ جن کا ذکر ہوا ہے اور اَنْ يُّعَمَّرَ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ فاعل ہے: گویا یہ کہا گیا ہے: وَ مَا اَحَدُهُمْ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ تَعْمِيْرُهٗ، جیسا کہ کہا جاتا ہے: مَرَرْتُ بِرَجُلٍ مُعْجِبٍ قِيَامُهٗ (میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے گذرا کہ جس کے کھڑے ہونے نے مجھے تعجب میں ڈال دیا)

دوسری صورت: هُوَ کنایہ ہے اس چیز سے جس کا ذکر ہوا ہے اور وہ طول عمر ہے۔ اَنْ يُّعَمَّرَ هُوَ کا بیان اور وضاحت ہے اور گویا اس طرح ہے: وَمَا تَعْمِيْرُهٗ بِمُزَحْزِحِهٖ گویا اس طرح کہا گیا ہے: وَمَا هُوَ الَّذِيْ لَيْسَ بِمُزَحْزِحِهٖ۔ (وہ کون سی چیز ہے جو دور کرنے والی نہیں ہے)

تیسری صورت: هُوَ ضمیر عماد ہے اور اَنْ يُّعَمَّرَ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا ہے اور بِمُزَحْزِحِهٖ وہ اس کی خبر ہے۔

زجاج نے اس آخری صورت کو صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اہل بصرہ مَا هُوَ قَائِمٌ زَيْدٌ وَ مَا هُوَ قَائِمًا زَيْدٌ وَ مَا هُوَ بِقَائِمٍ زَيْدٌ میں مَا کو امر اور شان کے معنیٰ میں ماننے کو جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔ زجاج کے علاوہ دیگر افراد نے کہا کہ جب مَا باء میں عمل نہ کرے تو جائز ہے کہ عربوں کا یہ کلام کہ: مَا بِهٰذَا اُنَاسٌ۔

تفسیر:

سب سے بڑے حریص

پھر خداوند عالم نے یہودیوں کے حالات سے مطلع کرتے ہوئے فرمایا: وَلَتَجِدَنَّهُمْ، آپ انھیں پائیں گے یعنی اے محمدؐ! آپ یہودیوں کے بارے میں جان لیں گے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس سے علمائے یہود مراد ہیں۔ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ، یعنی (یہودی) دنیا میں باقی رہنے کے لیے تمام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حریص ہیں۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا، اور مشرکین سے زیادہ حریص پائیں گے جو مجوسی اور قیامت پر ایمان نہ رکھنے والے ہیں۔ ابو علی الجبائی نے کہا: کلام اللہ: عَلٰى حَيٰوةٍ، پر مکمل ہو گیا۔

اور اللہ کے ارشاد: وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ، کی تقدیر یہ ہے: مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَنْ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ، اور مشرکین میں سے وہ بھی ہے جو چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار سال کی عمر مل جائے۔ اس جملے سے مَنْ حذف کردیا گیا ہے۔

علی بن عیسیٰ نے کہا ہے: یہ بات درست نہیں ہے چونکہ اس جیسے مقام پر مَنْ کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔

ابو مسلم اصفہانی نے کہا ہے: اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے جس کی تقدیر یوں ہے: وَلَتَجِدَنَّ طَائِفَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ۔

(شیخ طبرسی) میں کہتا ہوں: اگر اس مقام پر موصوف کا حذف کرنا جائز ہے جو کہ طائفہ ہے اور صفت کا اس کے قائم مقام ہونا اور وہ اس کا ارشاد: وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ، ہے۔ پس اس طرح ممکن ہے جس نظریہ کو جبائی نے اختیار کیا ہے جس کی تقدیر ہے: وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا طائفة يَوَدُّ اَحَدُهُمْ ، اس طرح موصوف کو حذف کردیا گیا اور اس کی صفت کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا جو اس طرح ہے: يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ. اس تقدیر پر حذف درست ہے شکل اور صفت کے اعتبار سے دونوں قول مساوی ہیں۔ باعتبار معنی مختلف ہوں گے، یہاں پر موصوف ہوگا نہ کہ موصولہ جس طرح جبائی نے مقدر قرار دیا ہے۔ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ. الف یعنی ہزار کا ذکر کیا گیا ہے چونکہ یہ آخری (ایسا) عدد ہے جس کے ذریعہ مجوسی ایک دوسرے کو دعا دیتے تھے۔ ایک بادشاہ کی زندگی و سلامتی کی دعا اس طرح کرتے تھے: آپ ایک ہزار نوروز تک زندگی بسر کریں، جیو یا ایک ہزار مہرجان (پارسیوں کی عید) تک زندہ رہئے۔

ابن عباس نے کہا ہے: ایک ہزار برس کا قول اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کو چھینک آتی ہے (یعنی اس عدد کے ساتھ اس کے حق میں دعا کرتے ہیں) اس طرح کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو گمان کرتے ہیں ان کے لیے جنت ہے، تمنائے موت نہیں کرتے اور یہ لوگ اس سے زیادہ حریص ہیں جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اسی طرح واجب و لازم ہے کہ انھیں واقف کرایا جائے اس چیز سے جسے آخرت میں جہنم اور شدید عذاب ان کے لیے اللہ نے آمادہ و مہیا کیا ہے ان کے کفر و عناد کے سبب جس کا اقرار مشرکین نہیں کرتے ہیں اور یہ لوگ مشرکین کی بہ نسبت جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، موت سے زیادہ نفرت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے زندگی کے زیادہ حریص ہیں۔

اللہ کا ارشاد: وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ، تو وہ عذاب الٰہی سے بچنے والے نہیں یعنی انھیں

کوئی چیز عذاب الٰہی سے چھٹکارا نہیں دلا سکتی نہ ہی عذاب الٰہی سے کوئی چیز دور رکھنے والی ہے کہ ان کی بقا کو طولانی کر دیا جائے چونکہ عمر کے لیے بہر حال فنا ضروری ہے۔ یہی بہترین وجہ ہے جس کا ذکر گزر چکا ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۔ یعنی اللہ ان کے اعمال کے بارے میں جانتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز اس پر مخفی و پوشیدہ نہیں ہے بلکہ وہ تمام پر محیط ہے، ان کا محافظ ہے یہاں تک کہ انھیں عذاب کا مزہ چکھا دے۔

اس آیت میں رہنمائی ملتی ہے کہ طلب دنیا کے لئے لمبے عرصے تک باقی رہنے کی طمع وغیرہ مذموم اور ناپسندیدہ ہے البتہ اطاعت میں اضافہ کے لیے طلب بقا پسندیدہ عمل ہے اور توبہ کے ذریعہ گزشتہ (گناہوں) کی تلافی اور عبادت میں اخلاص پیدا کرنے اور حصول سعادت کے لیے باقی رہنے کی خواہش کرنا قابل ستائش ہے۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے ارشاد میں انھیں معنی کی طرف اشارہ ہے کہ مومن کی عمر کا باقی ماندہ حصہ جس کی کوئی قیمت مقرر نہیں ہوتی (یعنی بیش قیمت ہوتا ہے) وہ اس کے ذریعہ گم شدہ چیز کو پالیتا ہے اور جو شے مر چکی ہوتی ہے وہ اس کے ذریعہ زندہ کر لیتا ہے۔

❀❀❀❀❀

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ
وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

(اے رسول) آپ کہہ دیجیے کہ جو بھی جبرئیل کا دشمن ہے اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ وہی ہے جس نے اذن خداوندی سے قرآن کو آپ کے دل پر اتارا ہے، جو سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ ہدایت اور صاحبان ایمان کے لیے بشارت ہے۔ جو بھی اللہ، فرشتوں، رسولوں، جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

قرائت:

ابن کثیر نے لفظ جبرئیل کی فاء پر زبر، راء پر زیر دے کر بغیر ہمزہ کے قرأت کی ہے۔

حمزہ، کسائی، ابوبکر سوائے یحییٰ کے سب نے جَبْرَئِيْل جیم اور راء زبر دے کر ہمزہ کے ساتھ

جَبْرَعِیْل کے وزن پر قرأت کی ہے۔ یحیٰی سے بھی یہی مروی ہے سوائے یہ کہ انہوں نے ہمزہ کے بعد یاء کو حذف کردیا ہے گویا جَبْرَئِل ہوگیا ہے۔ بقیہ قراء نے جیم اور راء پر کسرہ اس کے بعد یاء بغیر ہمزہ کے اہل مدینہ نے مِیْکَائِیْل الف کے بعد ہمزۂ مکسور کے ساتھ مِیْکَاعِل کے وزن پر پڑھا ہے اور اہل بصرہ نے مِیْکَال بغیر ہمزہ اور یاء کی قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے ہمزہ کے بعد یاء ساکنہ کو باقی رکھ کر مِیْکَاعِیْل کے وزن پر قرأت کی ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: ہم سے ابوالحسن کی جانب سے روایت کی گئی ہے انہوں نے کہا: جِبْرَئِیْل میں چھ لغات ہیں: جَبْرَائِیْل، جَبْرَائِل، جَبْرَئِل، جَبْرَئِیْل، جِبْرَال اور جِبْرِیْل، جس نے جِبْرِیْل پڑھا ہے اس نے اسے قِنْدِیل اور بِرْطِیل کے وزن پر مانا ہے۔

جس نے جَبْرَئِیْل پڑھا ہے تو اس کے نزدیک عَنْدَلِیْب کے وزن پر ہے۔

جس نے جَبْرَئِل پڑھا ہے تو اس کے نزدیک جَحْمَرِش کے وزن پر ہے۔

جس نے مِیْکَال کہا ہے اس نے قِنْطَار کے وزن پر مانا ہے۔

مِیْکَائِیْل اور جَبْرَائِیْل کلام عرب سے خارج ہیں۔

یہ اسماء معربہ ہیں یعنی انھیں عربی میں داخل کیا گیا ہے اور یہ زیادہ رائج ہے۔ عربوں کے اشعار میں بھی وہ آیا ہے جو عربی سازی کے لفظ میں ہے اور وہ بھی آیا ہے جو اس سے خارج ہے شاعر نے کہا:

عَبَدُوا الصَّلِیْبَ وَ كَذَّبُوْا بِمُحَمَّدٍ   وَ بِجَبْرَئِیْلَ وَ كَذَّبُوْا مِیْكَالا

(صلیب کی پرستش کی اور محمد، جبرئیل کو جھٹلایا اور میکال کو جھٹلایا)

حسان نے کہا:

وَ جِبْرِیْلُ رَسُوْلِ اللهِ مِنَّا   وَ رُوْحُ الْقُدُسِ لَیْسَ لَهٗ كِفَاء

اور جبریل ہم میں سے اللہ کے فرستادہ ہیں اور روح القدس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

الفاظ و معانی:

جبرئیل و میکائیل دو عجمی نام ہیں جنھیں معرب (عربی) بنا دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے جَبْرَ

سریانی لغت (زبان) میں عبد کے معنی میں ہے اور اِیل اللہ ہے اور مِیكٌ عُبَیْد کے معنی میں ہے لہذا جبرئیل کے معنی عبداللہ اور میکائیل کے معنی عبید اللہ کے ہوئے۔ ابوعلی الفارسی نے کہا ہے یہ بات دو وجہوں سے درست نہیں ہے:

۱۔ یہ کہ عربی لغت میں اِیل اسمائے الٰہی میں مشہور نہیں ہے۔

۲۔ اگر اس طرح ہوتا تو آخری اسم ہمیشہ مجرور (زیر) ہوتا جس طرح عربوں کا لفظ عبد اللہ ہے۔

بُشْرىٰ اور بَشَارَۃ سرور کرنے والی خبر ہے چونکہ سب سے پہلے خبر کے ذریعہ انسان کے ظاہری چہرے (جلد) پر اس کا اظہار ہوتا ہے۔

ترکیب:-

یہاں پر جواب شرط محذوف ہے گویا اس طرح ہے۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرَائِيْلَ فَلْيَمُتْ غَيْظًا فَإِنَّهُ نَزَّلَ الْوَحْيَ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ (جو شخص جبرئیل کا دشمن ہے وہ مارے غصہ کے مرجائے اس لئے کہ انہوں نے حکم خدا سے آپ کے دل پر وحی اتار لی ہے)

فَإِنَّهُ میں ضمیر ہاء جبرئیل کی طرف پلٹ رہی ہے اور نَزَّلَهُ میں ضمیر ہاء قرآن کی جانب اگرچہ اس کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ جس طرح اس ارشاد الٰہی میں: مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ میں ہاء کی ضمیر اَرْض کی طرف پلٹ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ معنی ومقصود جِبْرَئِیْل کی طرف پلٹ رہا ہو جیسے: فَإِنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ جِبْرَئِيْلَ عَلٰى قَلْبِكَ (بے شک خدا نے جبرئیل کو آپ کے سینے پر نازل کیا ہے، نہ کہ انہوں نے خود نازل کیا ہو) پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ مُصَدِّقًا حال کی بنا پر منصوب ہے اور نَزَّلَهُ میں ہاء کے لئے حال ہے۔ وہ قُرآن کی ضمیر ہے یا جبرئیل کی۔

شان نزول:

ابن عباس نے بیان کیا ہے: اس آیت کے نزول کا سبب ہے جس کی روایت ابن صوریا اور فدک کے یہودیوں کی ایک جماعت نے کی ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وارد مدینہ ہوئے تو ان لوگوں نے عرض کیا: اے محمد! آپ کی نیند کیسی ہے ہمیں آخری زمانہ میں آنے والے پیغمبر کی نیند کے بارے میں خبر دی گئی ہے۔

آپؐ نے فرمایا میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں اور قلب بیدار رہتا ہے۔انھوں نے کہا: اے محمد آپ نے سچ فرمایا، آپؐ ہمیں فرزند کے بارے میں بتائیں مرد کی طرف سے ہوتا ہے یا عورت کی جانب سے؟ آپؐ نے فرمایا: ہڈیاں، اعصاب اور رگیں مرد کی طرف سے ہوتی ہیں اور اس کا گوشت، خون، ناخن اور بال عورت کی جانب سے ہوتے ہیں۔

انھوں نے کہا: اے محمد! آپ نے صحیح فرمایا۔ پھر انھوں نے عرض کیا کیا سبب ہے کہ بچہ اپنے چچاؤں سے مشابہ ہوتا ہے۔اس میں اپنے ماموؤں سے کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی یا بچہ اگر اپنے ماموؤں سے مشابہ ہوتا ہے تو اپنے چچاؤں سے اس میں کچھ بھی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ آپؐ نے فرمایا جس کا پانی (مادۂ منویہ) بھی غالب آجاتا ہے شباہت اسی سے ہوتی ہے۔انھوں نے عرض کیا: اے محمد! آپ نے سچ فرمایا۔ پھر انھوں نے عرض کیا: آپ اپنے پروردگار کے بارے میں بتلائیں وہ کیا ہے؟ (اس وقت) خداوند عالم نے: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، سے آخر سورہ تک نازل فرمایا۔

ابن صوریا نے عرض کیا: اگر آپ نے ایک صفت بیان فرمائی ہوتی تو میں آپ پر ایمان لے آتا اور آپ کی پیروی کرتا۔اس نے کہا: اللہ کا نازل کردہ (قرآن و پیغام) آپ پر کون لیکر آتا ہے؟ فرمایا: جبرئیل۔

ابن صوریا نے کہا: جبرئیل تو ہمارا دشمن ہے جو جہاد اور اس کی شدت (کا پیغام) لیکر آتے ہیں اور میکائیل نرمی اور آسانی لے کر نازل ہوتے ہیں۔اگر میکائیل آپ پر (قرآن و پیغام) لے کر آتے تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔

تفسیر:

بہانہ باز قوم

خداوند عالم نے اس آیت میں یہودیوں کا جواب دیتے ہوئے ان کی تردید کی ہے: قُلْ، اے محمد! آپ ان سے کہہ دیجیے کہ: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ، جو شخص جبریل کا دشمن ہے (تو ایسا نہیں ہونا چاہئے) اس لئے کہ وہی تو آپ پر کتاب لے کر آتے ہیں۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (وہ اللہ کی اجازت سے اسے آپ کے قلب پر لے کر نازل ہوئے ہیں) اپنی طرف سے نہیں۔نزول قرآن کی نسبت قلب پیغمبرؐ کی طرف دی گئی ہے چونکہ جب آپ پر قرآن نازل کرتے تو آپ اپنے قلب سے اس کے محافظ اور اس کے سمجھنے

والے بھی ہیں۔ اللہ کے اذن سے یعنی حکم خدا سے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے اللہ کے علم اور اعلان سے جبرئیل کے ذریعہ آپؐ کے قلب پر (نازل کرنا) مراد ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی اس حالت میں کہ گذشتہ کتب کے موافق اور اس کی تصدیق کنندہ ہے کہ یہ حق اور اللہ کی طرف سے ہے، اس کی تکذیب نہیں کرتا۔

وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، (یہ ہدایت اور صاحبان ایمان کے لئے بشارت ہے) یعنی اگر اس میں کافروں سے جنگ اور ان پر شدت وسختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو یہ مومنین کے لیے سرمایۂ ہدایت اور بشارت ہے۔ ہدایت کو مومنین سے جو مخصوص کرنا اس اعتبار سے ہے کہ وہی اس پر عمل کر کے ہدایت پانے والے ہیں اگرچہ قرآن غیر مومنین کے لیے بھی اسی طرح ذریعۂ ہدایت ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ہدایت سے رحمت وثواب مراد ہے اسی لیے مومنین سے مخصوص کیا گیا ہے۔ بشارت وخوشخبری کے یہ معنی ہیں کہ اس میں دائمی نعمتوں کی بشارت ہے۔ اگر مُصَدِّقًا (تصدیق کنندہ) اور ہدایت و بشارت کو جبرئیل کے لیے حال قرار دیں تو یہ معنی ہوں گے کہ یہ اللہ کی گذشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور ہدایت و بشارت کے ساتھ آیا ہے۔ خداوند عالم نے عَلٰى قَلْبِكَ فرمایا: عَلٰى قَلْبِيْ (یعنی میرے قلب پر) نہیں فرمایا یہ چیز عرف عام میں مشہور اور رائج ہے جیسا کہ آپ اپنے مخاطب سے کہتے ہیں: ''قوم سے یہ نہ کہو کہ خبر تمھارے پاس ہے''، ممکن ہے آپ اس طرح بھی کہیں ''تم ان سے نہ کہو کہ خبر میرے پاس ہے'' اور جیسا کہ آپ کہتے ہیں'' قوم (یہودیوں) نے کہا: ''جبرئیل ہمارے دشمن ہیں'' اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ آپ کہیں وہ کہتے ہیں: جبرئیل ان کے دشمن ہیں۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ یعنی جو اللہ کا دشمن ہے، جو مخالفت اور نافرمانی کر کے دشمنی کرتا ہے۔ دشمنی اور عداوت درحقیقت دشمنی کے ذریعہ نقصان پہونچانا ہے جو خدا کے لیے محال و ناممکن ہے اور کہا گیا ہے اس سے اولیاء خدا سے دشمنی مراد ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ. (اور بے شک جو لوگ اللہ کو اذیت پہنچاتے ہیں) اور وَمَلٰٓئِكَتِهٖ یعنی اس کے ملائکہ اور اس کے رسولوں کا دشمن ہے۔ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ ان دونوں فرشتوں کے نام کی تکرار ان کے فضل اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں کے ذکر کی تکرار کا سبب یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے: جبرئیل ہمارے دشمن اور

میکائیل ہمارے سرپرست ہیں۔اس لیے اللہ نے خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے کہ نزاع انھیں دونوں کے متعلق تھا اس لیے دونوں کا ذکر اہم تھا تا کہ یہودی یہ گمان نہ کریں یہ دونوں ملائکہ میں مخصوص ہیں ان میں داخل نہیں ہیں۔ خداوند عالم نے دونوں کے لیے صراحت فرمادی تا کہ وہ تخصیص سے جس چیز کو مراد لیتے ہیں اسے باطل کر سکے۔

ارشاد ہوا: فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ اللہ نے فَاِنَّهٗ ارشاد نہیں فرمایا اور اسم اللہ کو مکرر بیان فرمایا ہے تا کہ گمان پیدا نہ ہو کہ کنایہ (اشارہ) جبرئیل و میکائیل کی جانب پلٹ رہا ہے اور ان (یہودیوں) سے نہیں کہا چونکہ دشمنی سے ایمان کی طرف پلٹنا ممکن ہے۔

بعض ملحدین نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے: کس طرح ممکن ہے کوئی صاحب عقل کہے کہ میں جبرئیل کا دشمن ہوں؟ (تو جواب یہ ہے کہ) یہودیوں کے اس قول کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔تعجب نہیں ہے خداوند عالم نے یہودیوں کے سمندر میں شگاف اور خارق العادۃ نشانیوں کے مشاہدہ کے باوجود ان کے اس قول کے متعلق خبر دی ہے: اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (سورہ اعراف، آیت ۱۳۸) (آپ ہمارے لیے اسی طرح معبود بنا دیں جس طرح ان کے لیے معبود ہیں) اسی طرح یہودی کہتے تھے: اَرِنَا اللّٰهَ ہمیں ظاہر بظاہر خدا کا جلوہ کرائیے، ان کی گوسالہ پرستی اور اسی طرح ان کی دیگر جاہلانہ کاموں کے بارے میں خبر دی گئی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾
اور یقیناً ہم نے آپ کی طرف روشن نشانیاں نازل کی ہیں اور صرف فاسق ہی ان نشانیوں کا انکار کریں گے۔

الفاظ و معانی:

آيَةٌ ایسی علامت و نشانی ہے جس میں عبرت ہو۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی علامت جس میں حجت ہو، بَيِّنَةٌ واضح دلیل جو سچے اور جھوٹے قضیہ کے درمیان ڈال دے۔یہ لفظ اِبَانَة سے مشتق ہے جس کے معنی دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری چیز سے جدا کرنے کے ہیں تا کہ اشتباہ دور ہو سکے۔

ترکیب:

لفظ قَدْ کلام میں دو کاموں میں سے کسی ایک کام کے لئے داخل ہوتا ہے:

(۱) ان لوگوں کے لئے جو خبر کی توقع رکھتے ہیں۔

(۲) ماضی کو حال سے قریب کرنے کے لئے (ماضی قریب بنانے کے لئے) آپ کہتے ہیں: خَرَجْتُ وَقَدْ رَكِبَ الْاَمِيْرُ۔ قَدْ آیت کریمہ میں لام قسم کے ساتھ ایسے لوگوں کے فرض کرنے پر ہے جو خبر کی توقع رکھتے ہیں اس لئے کہ جب اس طرح کی بات کی جائے تو اس میں زیادہ تاکید اور زیادہ بلاغت ہو گی۔

شان نزول:

ابن عباس بیان کرتے ہیں: ابن صوریا نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: آپ کون سی ایسی چیز ہمارے پاس لیکر آئے ہیں جسے ہم پہچانتے ہوں اور آپ پر اللہ نے کون سی واضح نشانی نازل فرمائی ہے کہ ہم اس میں آپ کی پیروی کریں؟ اس وقت خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

انکار فاسقین کا کام ہے

ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ، اے محمد! (یقیناً ہم نے آپ کی طرف نازل کیں) اٰيٰتٍ، یعنی وہ تمام معجزات جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کئے گئے۔ یہ بلخی کی روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے: قرآن اور اس میں موجود تمام دلالتیں۔ یہ ابو مسلم اور ابو علی کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: توریت وانجیل اور گذشتہ کتب، عمیق اخبار کا علم ہے۔ یہ اصم کا قول ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ (سورہ مائدہ، آیت ۱۵) (تم کتاب الٰہی کی جن بہت سی باتوں کو چھپایا کرتے تھے وہ انھیں تمھارے لیے واضح کر رہا ہے) بَيِّنٰتٍ، واضح کرنے والی آیات جو حق وباطل کے فرق کو واضح کرنے والی ہیں۔

وَمَا يَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ، اور صرف فاسق ہی ان نشانیوں کا انکار کریں گے۔ فاسقون کافرون کے معنی میں ہے۔ کفر کو فسق اس لئے کہا گیا ہے کہ فسق کے معنی کسی چیز سے دوسری چیز کی طرف خارج ہونے کے ہیں اور یہودی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کرکے اپنے دین موسیٰؑ سے خارج ہو گئے۔ اللہ نے یہودیوں کو کافر نہیں کہا اگرچہ کفر فسق سے زیادہ بڑا ہے جسکے دو سبب ہیں:

اول: اس سے مراد یہ ہے کہ امر خدا سے بڑی معصیت کی طرف نکل گئے۔

دوم: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے کفر میں فاسق اور سرکش ہیں چونکہ فسق گناہان کبیرہ میں سے ہے اور عظیم ترین گناہ ہے۔ اگر کفر فسق میں ہوگا تو عظیم ترین کفر ہوگا اور اگر (فسق) کفر کے علاوہ ہوگا تو بزرگ ترین معصیت اور گناہ ہوگا۔

❁❁❁❁❁

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
ان کا حال یہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی معاہدہ کرتے ہیں ان میں سے ایک گروہ اس عہد کو توڑ دیتا ہے۔ بلکہ ان کی اکثریت بے ایمان ہے۔

الفاظ ومعانی:

نَبْذ کے معنی تمہارا اپنے ہاتھ سے کسی چیز کا سامنے یا پسِ پشت پھینکنے کے ہیں۔ مَنْبُوْذُوْن پھینکی ہوئی اولاد کو کہتے ہیں۔ نَبِیْذ (شراب) کو نَبِیْذ اس لیے کہا جاتا ہے چونکہ کھجور کو گھڑے وغیرہ میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نَبْذ کے معنی ترک کرنے کے ہیں، کہا گیا ہے ڈالنے کے ہیں۔

ترکیب:

اَوَ كُلَّمَا میں واؤ سیبویہ اور زیادہ تر نحویوں کے نزدیک واؤ عطف ہے بس یہی فرق ہے کہ اس پر ہمزہ استفہام داخل ہوگیا ہے اس لئے کہ ہمزہ استفہام صدارت طلب ہے اور یہ اصل حرف استفہام ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ واؤ هَلْ تَقُوْلُ وَهَلْ زَيْدٌ عَالِمٌ پر بھی داخل ہوتا ہے اس لئے کہ ہمزہ هَلْ سے زیادہ قوی ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ واؤ زائدہ ہے جیسے اَفَاللّٰهِ لَيَفْعَلَنَّ میں فاء زائدہ ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ بلاضرورت حرف کے زائد ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے جب اس کے معنی ہوں زائد ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے جب اس کے معنی ہوں۔

كُلَّمَا ظرف کی بنا پر منصوب ہے اور اس میں عامل نَبَذَهٗ ہے، عَاهَدُوْا اس میں عمل نہیں کرسکتا ہے اس لئے کہ وہ لَمَّا کے لئے متمم ہے یا تو صلہ ہے یا صفت ہے۔

تفسیر:

پیمان شکن قوم

اسی طرح خداوند عالم نے یہودیوں کے متعلق خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا، ان کا حال یہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی معاہدہ کرتے ہیں۔ اس سے وہ عہد مراد ہے جو انبیاء نے ان سے لیا تھا کہ وہ نبی امی پر ایمان لائیں گے، ابن عباس سے روایت ہے۔

لفظ كُلَّمَا (جب بھی) تکرار کا تقاضا کرتا ہے، پس یہاں پر عہد شکنی کی تکرار مقصود ہے۔

عطا نے کہا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہودیوں کے درمیان عہد و پیمان تھے جنھیں انھوں نے توڑ دیا۔ جس طرح بنی قریظہ اور بنی نضیر نے عہد کیا تھا کہ وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے۔ پھر انھوں نے عہد توڑ دیا اور پیغمبرؐ کے خلاف جنگ خندق میں قریش کی مدد کی نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ، یعنی ان میں سے ایک جماعت نے عہد توڑ دیا۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ، بیشتر معاہدہ کرنے والے، لَا يُؤْمِنُوْنَ، ایمان نہیں لاتے ہیں۔ هُمْ کی ضمیر فریق کی جانب نہیں پلٹ رہی ہے چونکہ تمام کے تمام غیر مومنین تھے معاہدہ کرنے والوں میں عبد اللہ بن سلام اور کعب الاحبار وغیرہ مومنین ہیں۔

لفظ بَلْ کے ''بَلْ اَكْثَرُهُمْ'' میں داخل ہونے کی دو وجہیں ہیں:

اول: جب ان میں سے کسی فریق نے عہد توڑ دیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے عہد توڑ کر کفر اختیار کیا۔ پس ارشاد ہوا ان میں سے بیشتر نقض عہد کر کے کافر ہو گئے اگرچہ ان میں سے بعض نے جہالت کے سبب عہد توڑا، بعض نے بہ سبب دشمنی وعناد عہد توڑا۔

دوم: اس سے مراد ہے کہ ان میں (بعض) نے عہد توڑ کر کفر اختیار کیا اور بیشتر نے حق سے انکار کر کے کفر اختیار کیا جو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے جس کا اتباع اور تصدیق لازمی اور ضروری تھی۔

❀❀❀❀❀

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۰۱﴾

اور جب ان کی طرف اللہ کے پاس سے ایسا رسول آیا جو ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، تو جنھیں کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا وہ اُسے جانتے ہی نہ ہوں۔

ترکیب:

لَمَّا محلاً منصوب ہے اس لئے کہ ظرف ہے اور اس کے ذریعہ شے واقع ہوتی ہے دوسرے کے واقع ہونے کا سبب اس میں عامل نَبَذَ ہے۔ مُصَدِّقٌ مرفوع، رَسُولٌ کی صفت ہے اس لئے کہ دونوں نکرہ ہیں۔ اگر مُصَدِّقاً کو نصب دیا جاتا ہے تب بھی جائز اور صحیح تھا اس لئے کہ رَسُولٌ کی صفت مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے ذریعہ بیان کر دی گئی ہے لہٰذا بہتر ہے کہ مُصَدِّقاً کو بر بنائے حال نصب دیا جائے۔ مگر یہ کہ قرائت میں صرف رفع ہی جائز ہے اس لئے کہ قرائت ہی قابل اتباع سنت ہے۔

لِمَا میں ما حرف جر لام کی وجہ مجرور ہے اور اپنے صلہ کے ساتھ ہے۔ مَعَ کو نصب دینے والا معنی استقرار ہے۔ مراد لِمَا اسْتَقَرَّ مَعَهُمْ ہے۔ (جب ان کے ساتھ مستقر ہو گیا)

تفسیر:

کتاب خدا کو پس پشت ڈالنے والے

وَلَمَّا جَآءَهُمْ، اور جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں موجود یہودیوں کے پاس آئے۔ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ، (اللہ کی طرف سے رسول) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ بیشتر مفسرین کا یہی خیال ہے۔ بیان کیا گیا ہے رسول سے رسالت مراد ہے۔

علی بن عیسیٰ نے بیان کیا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے چونکہ خلاف ظاہر ہے اور ایسا استعمال کہ رسول گو سالہ کے معنی میں ہو بہت ہوتا ہے۔

ارشاد: مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ، جوان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، اس بارے میں دو احتمال ہیں:

اول: (رسول) ان کی کتب توریت وانجیل کی تصدیق کرنے والے ہیں چونکہ آپ اس صفت کے ساتھ تشریف لائے جس کی بشارت دی جا چکی تھی۔

دوم: آپ کی ذات گرامی توریت کی تصدیق کرنے والی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے حق ہے۔ چونکہ اس مقام پر اخبار یہودیوں کے بارے میں ہیں نہ کہ نصاریٰ کے بارے میں۔ قول اول احسن ہے۔ اس میں ان پر حجت ہے۔

ارشاد الٰہی: نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ، یعنی ان میں سے ایک گروہ نے (کتاب کو) ترک کر دیا پس پشت ڈال دیا اس طرح ارشاد ہوتا ہے: مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ. (جنھیں کتاب دی گئی ان میں سے) اور پروردگار نے مِّنْهُمْ نہیں فرمایا ہے کہ جن کا ذکر سابق میں گذر چکا ہے جس سے مراد علمائے یہود ہیں۔ دوبارہ ان کا ذکر کیا ہے۔ معنیٰ میں اختلاف کے سبب یہ بھی کہا گیا ہے کلام کے طولانی ہونے کے باعث ان کے بارے میں بیان نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی: كِتٰبَ اللّٰهِ ممکن ہے اس سے توریت مراد ہو اور یہ بھی ممکن ہے قرآن مراد ہو۔

ارشاد الٰہی: وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ، قرآن پر عمل نہ کرنے سے کنایہ ہے۔ شعبی نے بیان کیا ہے کہ قرآن ان کے پاس موجود تھا جس کی وہ تلاوت کرتے تھے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ سفیان بن عینیہ نے کہا ہے: وہ کتاب خدا کو حریر و دیبا میں لپیٹتے اور سونے چاندی سے آراستہ کرتے لیکن اس کے حلال کو حلال نہیں سمجھتے تھے نہ ہی حرام کو حرام سمجھتے تھے یہی ان کا ترک (عہد) اور نقض (عہد) ہے۔ یہ اس وقت ہے جب کتاب سے توریت مراد لی جائے۔

ابو مسلم نے کہا ہے: جب ان کے پاس رسول اس کتاب کے ساتھ آیا تو انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ اسی طرح پہلی کتاب کو ترک کرنے والے ہو گئے جس میں آپ کی بشارت دی گئی تھی۔ سدی نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے توریت کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا یعنی توریت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت پر دلالت کر رہی تھی انھوں نے اسے ترک کر دیا۔

قتادہ اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ فریق معاندین و دشمن تھے۔ ان میں سے فریق کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ جمع عظیم و جم غفیر اور عدد کثیر پر اس چیز کا پوشیدہ رکھنا جائز نہیں ہے جسے ہمتوں کے اختلاف آراء

کے مختلف ہونے اور خواہشات سے دوری کے باعث جان لیا گیا ہو چونکہ یہ عام عادت کے برخلاف ہے مگر یہ کہ ایسے عدد ہوں جس کا پوشیدہ رکھنے پر اتفاق ممکن ہو۔

ارشادالٰہی: كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ، گویا یہ نہیں جانتے کہ یہ سچ اور حق ہے۔ مراد یہ ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر سرکشی اور عناد کے سبب اسے پوشیدہ رکھا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے مراد یہ ہے گویا وہ نہیں جانتے کہ اس کے بارے میں ان پر کیا عذاب ہوگا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ گویا وہ نہیں جانتے کہ ان کی کتاب میں کیا ہے یعنی کتاب سے جاہل وناواقف ہونے کے مانند قرار دیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُو الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور ان باتوں کا اتباع کرنے لگے جو ''شیاطین'' سلیمان کی سلطنت میں لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ سلیمان کافر نہیں ہوئے بلکہ یہ شیاطین کافر تھے جو لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور وہ بھی جو کچھ دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر بابل میں نازل ہوا تھا۔ اور وہ دونوں لوگوں کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک انھیں بتلا نہ دیں کہ ہم تو ذریعہ آزمائش ہیں ''تم کفر اختیار نہ کرو'' پھر بھی وہ لوگ ان فرشتوں سے ایسا جادو سیکھتے تھے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں حالاں کہ وہ اس سے کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے جب تک اللہ کا حکم نہ ہو اور وہ کچھ (ایسے منتر سیکھتے) تھے جو خود ان کے لیے نقصان دہ تھے فائدہ مند نہ تھے اور ان کے علم میں تھا کہ جو شخص ایسی چیزوں کا خریدار ہوگا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور جس چیز کے عوض انھوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا تھا وہ کتنی بری تھی کاش وہ اس بات کو جان لیتے۔

قرائت:

ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے وَلٰكِنِ الشَّيَاطِيْنُ كَفَرُوْا ،وَلٰكِنِ اللّٰهُ قَتَلَهُمْ ،وَلٰكِنِ اللّٰهُ رَمٰى لٰكِنِ کے نون کو بغیر تشدید کے اور اس کے بعد والے اسم کو رفع (پیش) کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء

نے لٰکِنَّ تشدید کے ساتھ قرأت کی ہے۔

شواذ قرأت میں، عَلَی الْمَلِکَیْنِ میں لام کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جان لیجئے کہ لٰکِنَّ جیسی کوئی چیز نہ ہی ہمیں اسماء میں دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی افعال میں۔ وہ اِنَّ کے مانند ہے کہ تشدید کے ساتھ ہوتی ہے، پھر بغیر تشدید کے ہوجاتی ہے سوائے یہ کہ اِنَّ اور اَنَّ جب بغیر تشدید کے (اِنْ و اَنْ) ہوجاتے ہیں تو کبھی کبھی ان کے ذریعہ نصب دیا جاتا ہے جس طرح اس وقت نصب دے رہے تھے جبکہ دونوں تشدید کے ساتھ تھے۔

اگرچہ ایسی صورت میں ان دونوں کا عمل نہ کرنا زیادہ رائج ہے۔ لیکن ہم کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتے جو یہ کہے کہ لٰکِنَّ جب مخفف (لٰکِنْ) ہوجائے تب بھی نصب دے گا کہ وہ اِنَّ کے مشابہ ہے۔ اس لفظ میں جب یہ مخفف ہو تو نصب آیا ہی نہیں ہے تاکہ یہ اس بات پر دلیل رہے کہ یہ ان حروف میں سے ہے کہ جب مخفف ہوجائیں گے تو عمل نہیں کریں گے اس لئے کہ تخفیف کی صورت میں یہ وہ لفظ نہیں رہ جاتا ہے جو فعل سے مشابہ تھا۔ لٰکِنْ اگرچہ فعل سے مشابہ نہیں ہے پھر بھی اس میں کچھ ایسا ہے کہ وہ فعل سے مشابہ ہوجائے گا جب لام اس سے الگ ہوجائے، جیسے یہ کلام ہے: اَرَاكَ مُنْتَفِخاً اُرِیْدُ اَنْ تَنْفَخَ مِثْلَ کَیْفَ

پہلے اس سے لام کو جدا فرض کیا گیا ہے پھر مخفف بنایا گیا ہے اسی طرح لٰکِنْ بھی نقصان کو فرض کیا جائے گا اور وہ لَیْتَ اور اَنَّ کے مشابہ ہوجائے گا۔

الفاظ و معانی:

اِتَّبَعَهٗ کے معنی ہیں اس کی اقتداء و پیروی کی اور تَتْلُوا کے معنی اتباع کرنے کے ہیں چونکہ تَالِی کے معنی تَابِع کے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں: تم پڑھتے ہو۔ مِنْ تَلَوْتُ کِتَابَ اللّٰهِ اَیْ قَرَأْتُهٗ؛ یہ تَلَوْتُ کِتَابَ اللّٰهِ سے ہے یعنی میں نے کتاب خدا کی تلاوت کی یعنی اسے پڑھا۔

سِحر (جادو) کِهَانَة (غیب باتیں) اور حِیْلَة (تدبیر) باہم مشابہ ہیں۔ صاحب العین نے بیان کیا ہے: سحر وہ عمل ہے جو شیاطین سے نزدیک کردیتا ہے۔ سحر کے ذریعہ آنکھ ایسی چیز دیکھتی ہے انسان خیال کرتا

ہے معاملہ اسی طرح ہے جس طرح آنکھ دیکھ رہی ہے، سحر ایسا پوشیدہ عمل ہے جس کے سبب کے پوشیدہ ہونے کے باعث چیز اپنی شکل وصورت کے برخلاف تصور کی جاتی ہے (سمجھی جاتی ہے) سحر ہر چیز کو اس کی جنس سے پلٹ دیتا ہے (بظاہر اپنی جنس کے الٹ نظر آتی ہے) جبکہ (وہ چیز) حقیقت میں اپنی جنس سے منقلب نہیں ہوتی ہے کیا آپ نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں دیکھا: فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ، (سورۂ طہ، آیت ۶۶) (یکایک ان رسیاں اور لکڑیاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی نظر آئیں)

فِتْنَة، اِمْتِحَان اور اِخْتِبَار باہم مشابہ ہیں۔

اِذْن کی لغت میں تین قسمیں ہیں:

۱۔ علم کے معنی میں، ارشاد ہوتا ہے: فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ، (سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۹) (تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ ہے) یعنی جان لو!

۲۔ اباحت مطلقہ: ارشاد ہوتا ہے: فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ، (سورۂ نساء، آیت ۲۵) (لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرلو)

۳۔ امر وحکم کے معنی میں ارشاد ہوتا ہے: نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ، (سورۂ بقرہ، آیت ۹۷) (یہ وہی ہے جس نے حکم خداوندی سے قرآن کو آپ کے قلب پر اتارا ہے)

نَفْع، مَنْفَعَة اور لَذَّة باہم مشابہ ہیں۔ نفع کے معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے جاندار لذت حاصل کرے چونکہ وہ لذت ہے یا وہ چیز اسے لذت تک پہنچا دے اور ضرر ونقصان کے معنی یہ ہیں جو جاندار کے لیے تکلیف والم کا باعث ہو یا اسے تکلیف والم تک پہنچائے۔

خَلَاق کے معنی ہیں: خیر میں سے حصہ۔

ترکیب:

مَا تَتْلُوا کی دو صورتیں ہیں:

(ا) تَتْلُوا تَلَتْ کے معنی میں ہے اور یہ ممکن ہے اس لئے کہ یہ بات معلوم ہے کہ یہ کلام جناب سلیمانؑ کے دور سے مربوط ہے۔ جس کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ مراد جناب سلیمانؑ کی حکومت کا زمانہ یا جناب سلیمانؑ کے حکومت کے دور میں یا سلیمانؑ کی حکومت میں۔

اور جہاں پر مضاف کے حذف ہونے کو فرض نہیں کیا گیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا یہ عمل دلالت کرے گا کہ مضارع کے صیغہ سے ماضی کا ارادہ کیا ہے۔

سیبویہ نے کہا: کبھی کبھی یَفۡعُلُ فَعَلَ کی جگہ پر آجاتا ہے۔ جیسے شاعر کا یہ شعر ہے کہ:

وَ لَقَدۡ أَمُرُّ عَلَى اللَّئِيمِ يَسُبُّنِي فَمَضَيۡتُ ثَمَّةَ قُلۡتُ لَا يَعۡنِينِي

(میں پست انسان کے پاس سے گذر گیا اس حالت میں کہ وہ مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا میں وہاں سے چلا گیا اور کہا کہ اس کی مراد میں نہیں ہوں)

(۲) تَتۡلُوۡا اپنے معنی میں ہے یعنی فعل مضارع ہی کے معنی میں ہے اور اس سے فَعَلَ یعنی ماضی مراد نہیں ہے لیکن وہ حال کی حکایت کے لئے ہے اگرچہ وہ حال ماضی ہی کیوں نہ ہو جیسے یہ ارشاد کہ: وَإِذۡ نَجَّيۡنَاكُمۡ مِّنۡ آلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُومُونَكُمۡ سُوٓءَ الۡعَذَابِ ۔ پس فعل يَسُومُونَكُمۡ جو کہ فعل مضارع ہے اس سے اس حال کی حکایت کی جا رہی ہے جو ماضی میں تھی اگرچہ آل فرعون خطاب (یعنی نزول قرآن) کے وقت ختم ہو چکے تھے۔ اسی سے یہ ابن اعرابی کا یہ شعر بھی ہے:

جَارِيَةٌ فِي رَمَضَانَ الۡمَاضِي تُقَطِّعُ الۡحَدِيثَ بِالۡإِيمَاضِ

(ایک کنیز گذشتہ رمضان میں باتوں کو اشاروں میں کاٹ رہی ہے یعنی اس وقت کاٹ رہی ہے)

وَمَآ أُنۡزِلَ کے مَا کے سلسلہ میں تین نظریات ذکر کئے گئے ہیں:

(۲) مَا اَيۡضاً (بھی) کے معنیٰ میں ہے اور محلاً مجرور ہے اور واؤ کے ذریعہ عَلٰى مُلۡكِ سُلَيۡمَانَ پر عطف ہے۔

(۳) مَا جحد و نفی کے معنیٰ میں ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيۡمَانُ وَلَمۡ يُنۡزِلِ اللهُ السِّحۡرَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ (اور نہ ہی سلیمان کافر ہوئے اور نہ ہی خدا نے دونوں فرشتوں پر جادو نازل کیا)

بَابِل ایک شہر کا نام ہے معرفہ اور مؤنث ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

فَيَتَعَلَّمُونَ دو باتوں میں سے کسی ایک بات سے خالی نہیں ہے:

یا تو یہ فعل فاء کے ذریعہ گذشتہ فعل پر عطف ہے۔

یا تو مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

اس سے پہلے والا فعل یا تو وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيۡنَ كَفَرُوۡا میں سے كَفَرُوۡا ہے۔ ایسی صورت میں

فَيَتَعَلَّمُونَ اسی پر عطف ہے اس لئے کہ كَفَرُوْا محلا مرفوع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لٰكِنَّ کی خبر ہے پس اس پہ عطف ہوا ہے مرفوع کے ذریعہ۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔

يُعَلِّمُونَ: ممکن ہے کہ كَفَرُوْا میں واؤ ضمیر کے لئے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہو یعنی كَفَرُوْا فِي حَالِ تَعْلِيْمِهِمْ (لوگوں کو سکھانے کی حالت میں کافر ہو گئے)

كَفَرُوْا کا بدل بھی ہوسکتا ہے؛ اس لئے کہ شیاطین کا تعلیم دینا ہی کفر ہے جب ایسا ہے تو بدل ہوسکتا ہے جب معنیٰ میں وہی ہو جس طرح عذاب کا دوگنا ہونا جب گناہوں سے سامنا کرایا جائے گا۔ جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ میں يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ، يَلْقَ أَثَامًا کا بدل قرار دینا جائز وصحیح ہے۔

یا تو وہ فعل جس پر يَتَعَلَّمُونَ عطف ہے وَيُعَلِّمُونَ یہ فراء کا قول ہے۔ زجاج نے اس قول کو رد کرتے ہوئے کہا: اس لئے کہ مِنْهُمَا اس بات کی دلیل ہے کہ تَعَلُّم یعنی سکھانا صرف دو فرشتوں سے تھا۔

ابوعلی نے کہا: یہی اعتراض سیبویہ کے قول پر بھی ہے جس طرح فراء کے قول پر اس لئے کہ یہ دونوں حضرات اس کے فعل شیاطین پر عطف کے قائل ہیں۔

ابوعلی نے کہا: یہ اعتراض دو لحاظ سے ساقط ہے:

(۱) علم اگر صرف دو فرشتوں سے تھا تو غلط نہیں تھا کہ فَيَتَعَلَّمُونَ كَفَرُوْا اور يُعَلِّمُونَ پر عطف ہو۔ اگر چہ تعلم ان دونوں سے مربوط ہے کفر اور تعلیم سحر اور ان دونوں کی ضمیریں مَلَكَيْنِ کی طرف پلٹ رہی ہے۔

اگر آپ اعتراض کریں کہ ایسا کیونکر صحیح ہے اس طرح فرض کرنا جائز ہے اس وقت اس طرح نظم دینا لازم ہوگا: وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا اس طرح مِنْهُمَا میں مَلَكَيْنِ کی ضمیر مَلَكَيْنِ کے ذکر سے پہلے آگئی ہے حالانکہ اسم کے ذکر سے پہلے اس کی ضمیر لانا صحیح نہیں ہے اور اگر اس نظریہ کی بنا پر آپ کا ذکر سے پہلے ضمیر لانے پر مجبور ہو جائیں تو گرچہ یہ کام صحیح نہیں ہے تب بھی آپ پر لازم ہے کہ آپ كَفَرُوْا اور يُعَلِّمُوْنَ میں سے کسی ایک پر بھی عطف کو جائز قرار نہ دیجئے بلکہ آپ اسے عطف کیجئے اس فعل پر جس کا تذکرہ مَلَكَيْنِ کے ذکر کے بعد ہوا ہے۔ جیسا کہ ابو اسحاق زجاج کا یہی نظریہ ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز پر عطف کرنا ہے جو اس ارشاد الٰہی میں کلام کو مثبت بناتی ہے۔

فَلَا تَكْفُرْ (یعنی انکار مت کرو) فَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ پر عطف کرتے ہیں اس

لئے کہ دونوں ایسے فعل ہے جو مَلَکَیْنِ کے بعد ذکر ہوتے ہیں۔

جواب: جہاں تک نظم کی بات ہے تو جس طرح آپ نے ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے لیکن ذکر سے پہلے خبر لانا تو فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا میں مِنْهُمَا اگر ایسی ضمیر ہو جو مَلَکَیْنِ کی طرف پلٹ رہی ہے تو ان دونوں کی خبر لانا ان کے ذکر کے بعد ہے اس لئے کہ ان کی ضمیر کا لانا ان کے گذشتہ ذکر کے بعد ہے اور یہ جائز ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ جب اس کا ذکر گذر چکا ہے تو اس اسم کی ضمیر لائی جاسکتی ہے اگر وَاِذِ ابْتَلٰی رَبُّهٗ اِبْرٰهِیْمَ کہا جاتا ہے تو یہ صحیح نہیں تھا اس لئے کہ یہ ذکر سے پہلے خبر لانا ہے یہ بالکل واضح بات ہے اس طرح سیبویہ اور فراء پر اعتراض بھی ختم ہوجائے گا۔

دوسری صورت وجہت کہ جس کے سبب مذکورہ بالا اعتراض برطرف ہوجائے گا وہ یہ ہے کہ ارشاد الٰہی: وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں کہ ان کی وضاحت تفسیر میں کی جائے گی۔ ان میں سے دو قول یہ ہیں کہ جادو سیکھنا دونوں قول میں دونوں فرشتوں سے ہے اور ایک قول یہ ہے کہ شیاطین سے سیکھنا ہے اس قول کی بنا پر نظم کلام کچھ اس طرح ہوگا کہ: وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ فَیَتَعَلَّمُوْنَ (شیاطین، ہاروت و ماروت کافر ہو گئے وہ لوگوں کو جادو سکھاتے اور لوگ ان سے سیکھتے تھے) مِنْهُمَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ یعنی بابل میں ان دونوں فرشتوں پر نازل نہیں ہوا۔ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ اور ھاروت و ماروت کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے اس قول کی بنا پر۔ اس قول کی بنا پر هُمَا کی ضمیر مَلَكَیْنِ کی جانب نہیں پلٹ رہی ہے بلکہ اس قول کی بنا پر هُمَا کی ضمیر مَلَكَیْنِ کی جانب پلٹ رہی ہے جو معنی میں شَیٰطِیْن ہیں۔

البتہ کلام کو تثنیہ پر حمل کرنا جبکہ شَیٰاطین جمع ہے یہ جائز اور صحیح ہے کہ معنی پر حمل کیا جائے تو جمع بنائی جائے اور لفظ ھاروت و ماروت پر حمل کیا جائے تو تثنیہ لایا جائے اس کی نظیر یہ ارشاد ہے کہ: وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا۔

پھر فرمایا: فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى۔ اس آیت میں طَآىِٕفَتٰنِ تثنیہ ہے اور اس کے لئے فعل جمع کی صورت میں ہیں اور تثنیہ اِقْتَتَلَا ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ یَتَعَلَّمُوْنَ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ کے یُعَلِّمٰنِ پر عطف ہو۔ پس یَتَعَلَّمُوْنَ میں جو ضمیر ہے وہ اَحَدٍ کے یُعَلِّمٰنِ پر عطف ہو۔ پس یَتَعَلَّمُوْنَ میں جو ضمیر ہے وہ اَحَدٍ کے لئے ہوگی مگر یہ کہ

يَتَعَلَّمُوْنَ جمع ہے جب اسے معنی پر حمل کریں گے جیسے ارشاد الٰہی ہے کہ: فَمَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ۔

لیکن زجاج نے جو بیان کیا ہے کہ کہا گیا ہے کہ يَتَعَلَّمُوْنَ عطف ہے ایک ایسی چیز پر جو کلام کو مثبت بناتی ہے اس لئے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَاتُوْنَ فَيَتَعَلَّمُوْنَ ہم آزمائش کا ذریعہ ہیں انکار مت کرو لیکن پھر بھی لوگ آتے ہیں اور جادو سیکھتے تھے۔ یہ قول حسن ہے اور یہی فراء کا قول ہے۔

ابوعلی نے کہا: میرے نزدیک یہی صحیح ہے اس کہ ان پوشیدہ چیزوں میں سے ہے جن میں ان پر دلالت کے ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ کہ يَتَعَلَّمُوْنَ مبتدأ محذوف کی خبر ہے تو گویا اس طرح ہوگا کہ: فَهُمْ يَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا - یہ بھی غیر ممتنع ہے۔ (ناممکن ہے)

مِنْهُمَا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ هُمَا کی ضمیر سحر اور کفر کی جانب پلٹ رہی ہے۔

ابومسلم نے کہا: اس لئے کہ اس پر دلیل ذکر ہو چکی ہے اس ارشاد میں کہ كَفَرُوْا: یہ پروردگار نے اس ارشاد کے مانند ہے: سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى -یعنی ذکر سے اجتناب کرے گا۔

یہ کلام وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ کو زجاج نے کہا: قَدْ پر لام کا داخل ہونا قسم اور تاکید کی بنا پر ہے۔

علمائے نحو نے لَمَنِ اشْتَرَاهُ کے بارے میں دو قول نقل کئے ہیں:

بعض نے مَنْ کو شرط اور مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ کو اس کا جواب قرار دیا ہے۔ یہ شرط و جزا کا مقام نہیں ہے لیکن یہ معنیٰ میں ہے: لَقَدْ عَلِمُوا الَّذِي اشْتَرَاهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (یقیناً وہ لوگ اسے جانتے ہیں کہ جس نے اسے خریدا ہے کہ آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے) یہ آپ کے اس کلام کے مانند ہے کہ وَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتَ الَّذِيْ جَاءَكَ مَا لَهٗ مِنْ عَقْلٍ (خدا کی قسم تم اسے پہلے کی طرح جانتے ہو کہ جو تمہارے پاس آیا ہے اس کے پاس عقل نہیں ہے) یہاں پر زجاج کی بات ختم ہوئی۔

میں کہتا ہوں: بِمَنْ محلا مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ محلا مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ لَمَنِ اشْتَرَاهُ میں لام، لام ابتدا ہے بغیر قسم کے اس لئے یہ لام کبھی کبھی غیر قسم کے لئے تاکید ہوتا ہے۔ لام اپنے بعد والے جملہ کے ساتھ محلا منصوب ہے عَلِمُوْا کے ذریعہ جیسا کہ اس مثال میں استفہام بھی اسکے مانند ہے کہ عَلِمْتُ اَزَيْدٌ فِي الدَّارِ اَمْ عَمْرٌو اسی کو تعلیق کہا جاتا ہے۔

ابو علی نے کہا: جس نے یہ کہا ہے کہ مَنِ جزاء ہے تو یہ قول بعید ہے اس لئے کہ جب مَنِ جزاء ہوگا تو لَمَنِ اشْتَرَاهُ کا لام قسم پر داخل ہونے کا باعث ہوگا جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے: وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۔ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ تو یہ قسم عَلِمُوا ہوگی اس لئے کہ عِلم اور ظَنّ بھی کبھی قسم کا قائم مقام ہوتے ہیں، جیسا کہ شاعر کا شعر ہے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْتُ لَتَأْتِيَنَّ مَنِيَّتِيْ إِنَّ الْمَنَايَا لَا يَطِيْشُ سِهَامُهَا

(قسم سے مجھے یقین ہے کہ میری موت آئے گی کہ بے شک موت کے تیر خطا نہیں کرتے)

وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ، عَلِمُوْا اور لَمَنِ اشْتَرَاهُ کے درمیان اور پوشیدہ ہے اور بعید ہے کہ عَلِمُوا قسم ہو۔ لَمَنِ اشْتَرَاهُ یہاں پر جواب ہے اس لئے کہ وہ ایک ایسا مقام ہے کہ جس پر مقسم محذوف ہے اور مقسم علیہ قسم نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ قسم پر قسم داخل ہوجائے اور وہ پوشیدہ ہے جو لَقَدْ میں لام کو لایا ہے یہ پہلی قسم ہے دوسری قسم وہ ہے کہ جس پر پہلی قسم پوشیدہ داخل ہوتی ہے اور وہ قَدْ عَلِمُوا ہے۔ جب آپ اس کا جواب لام کے ذریعہ لائیے یہ ان علماء کے نزدیک ہے جو حضرات مَنِ کو مبتدا قرار دیتے ہیں اور جب نفی کے ذریعہ جواب لائیں گے تو ان افراد کے نزدیک جو مَنِ کو جزاء مانتے ہیں۔

سیبویہ کے نزدیک قسم پر قسم کا داخل ہونا بعید ہے اور صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک بعید ہے کہ عَلِمُوا یہاں پر قسم کا قائم مقام ہو اور اگر ان کا جواب دیا جائے تو سیبویہ اور خلیل نے کہا: یہ قوی نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ وَحَقِّكَ وَ حَقِّ زَيْدٍ لَأَفْعَلَنَّ (آپ کے حق اور زید کے حق کی قسم میں یقیناً ایسا کروں گا) دوسرے واؤ کو واؤ قسم قرار دینا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ ناپسند ہے اس لئے کہ محلوف علیہ میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ دوسرے کو پہلے سے ملا دیا جائے اور دونوں کے ذریعہ محلوف علیہ پر قسم کھائی جائے: اسی لئے سیبویہ اور خلیل نے حرف واؤ کو اس آیت کریمہ: وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ میں عاطفہ قرار دیا ہے قسم نہیں۔ اس لئے کہ لَمَنِ اشْتَرَاهُ میں لام ابتداء حمل کیا ہے، قسم پر نہیں اور یہ لام دوسرے لام کے مانند نہیں ہے کہ وہ قسم کا تقاضا کرے لامحالہ اس کلام میں لَعَمْرِكَ لَأَفْعَلَنَّ كَذَا ضروری نہیں ہے کہ اس کی تاویل کی خاطر قسم پر قسم داخل کیا جائے اور یہ بھی بعید ہے کہ قسم اور عَلِمُوا اور لَمَنِ اشْتَرَاهُ کے درمیان پوشیدہ ہو اس لئے کہ عَلِمُوا دو مفعول کا تقاضا کرتا ہے۔ جب اس کے اور اس کے دو مفعول کے درمیان قسم واقع ہوجائے تو اس کا جواب نہیں ہوگا اور قسم لغو و بے فائدہ ہوجائے گی جیسا کہ اس

کلام میں ہے کہ وَاللهِ مُنْطَلِقٌ وَاِنْ تَاْتِنِیْ وَاللهِ آتِیْتُكَ لغو ہے اس کا جواب نہیں ہے اس لئے کہ اگر جواب دیا جائے تو لازم ہے ہوگا کہ عَلِمْتُ اس پر اعتماد کرے اور اس طرح قسم منصوب ہو جائے گی اس لئے کہ عَلِمْتُ کے دو مفعول کی جگہ واقع ہوتی ہے اور ایسا کرنا منع ہے اس لئے کہ اگر آپ مفعول کو قسم کا قائم مقام بنائیں گے تو اسے اس چیز سے نکال دیں گے جس کے لئے اسے وضع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ قسم کو مفعول کی جگہ پر رکھیں گے تو اس سے دوسرے کی تاکید ہوگی اور جب آپ اسے دو مفعول کی جگہ رکھیں گے تو اسے دوسرے کے تاکید ہونے سے خارج کرائیں گے اور اسے بنفسہ بنا دیں گے۔ اگر قسم عَلِمْتُ کے دو مفعولوں کا قائم مقام بننا جائز ہوتا تو پھر اس کی ذریعہ صلہ لانا اور نکرہ کی صفت لانا ممکن ہوتا حالانکہ ایسا کرنا منع ہے، پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ عَلِمْتُ کے بعد قسم کو جواب کی ضرورت نہیں ہے پس عَلِمُوْا کے بعد قسم کو پوشیدہ ماننا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ایسا صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب اس کا جواب ہو اور جب حذف ہو جائے تو اس پر دلالت کرے جیسا کہ لَیَفْعَلَنَّ وغیرہ جواب ہیں جو قسم پر دلالت کرتے ہیں۔

جب محذوف جواب نہیں ہو سکتا ہے تو اس کا حذف کرنا اور اس کا ارادہ کرنا بھی جائز نہیں ہے یہ بھی بعید ہے کہ قسم عَلِمْتُ کے بعد پوشیدہ ہو اس لئے کہ یہاں پر عَلِمُوْا مقسم علیہ ہے اور جب آپ نے مَنْ کو اَلَّذِیْ کے معنیٰ کے علاوہ کسی اور معنیٰ میں قرار دیا تو ہر لازم ہے کہ عَلِمْتُ کو قسم قرار دیجئے اور پھر مَا لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ اس کا جواب ہے۔

سیبویہ کے نزدیک قسم پر قسم کا داخل ہونا صحیح نہیں ہے اسی طرح لَمَنِ کے لام کو لام ابتداء پر حمل کرنا اور مَنْ اَلَّذِیْ کے معنیٰ میں قرار دینا، تاکہ ایسی بات لازم نہ آئے جو اچھی نہیں ہے اور قسم کا قسم پر داخل ہونا بھی جائز نہیں ہے پس اس سلسلہ میں سیبویہ کا نظریہ بالکل واضح ہے۔

تفسیر:

جناب سلیمانؑ اور بابل کے جادوگر

خداوند عالم نے اس آیت کو اپنے گذشتہ بیان پر عطف کیا ہے کہ یہودی کے ایک فریق نے اپنے درمیان موجود کتاب الٰہی پس پشت ڈال دیا۔ ارشاد ہوتا ہے: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ (اور وہ ان باتوں کا اتباع کرنے لگے جو شیاطین سنایا کرتے تھے) وَاتَّبَعُوْا سے مراد کیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ وہ:

تین اقوال ہیں:

اول: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہودی ہیں۔ یہ ربیع ابن اسحاق اور سُدی کا قول ہے۔

دوم: سلیمان پیغمبر کے زمانہ کے یہودی ہیں۔ یہ ابن عباس اور ابن جریج کا قول ہے۔

سوم: سب مراد ہیں چونکہ جادو کے پیروکار حضرت سلیمان کے زمانہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک باقی رہے۔

ربیع سے روایت کی گئی ہے: یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے توریت کے زمانہ سے متعلق دریافت کیا اور اس بارے میں جو بھی سوال کیا تو خداوند عالم اس سوال کا (جواب) نازل فرما دیا۔ اس طرح آپؐ ان کے خلاف دلیل پیش کر دیتے، جب انھوں نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: یہ اس بارے میں بہت زیادہ جانتے ہیں جو ہم پر ہمارے بارے میں نازل ہوا ہے۔ پھر انھوں نے پیغمبرؐ سے جادو کے متعلق دریافت کیا تاکہ آپ کے خلاف دلیل پیش کر سکیں اس وقت خداوند عالم نے: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ... اور ان باتوں کا اتباع کرنے لگے جو شیاطین سنایا کرتے تھے؛ آیت نازل فرمائی۔ یعنی جس چیز کو شیاطین پڑھا کرتے تھے اس کی پیروی کرنے لگے یعنی اس کا اتباع اور اس پر عمل کرنے لگے۔ یہ روایت ابن عباس سے ہے۔ کہا گیا ہے: اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ پڑھنے لگے یہ عطا اور قتادہ کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: جھوٹ بولنے لگے۔ یہ روایت ابومسلم سے ہے۔ تَلَا عَلَيْه. اس وقت بھی کہا جاتا ہے جب جھوٹ بولے۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے: وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ - (سورۂ آل عمران، آیت ۷۵) (وہ اللہ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرتے ہیں حالاں کہ انھیں معلوم ہے (کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی))

اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ. (سورۂ اعراف، آیت ۲۸) کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جس کا تمھیں علم ہی نہیں ہے۔

جب سچ بولتا ہے تو کہا جاتا ہے: تَلَا عَنْه. اور جب ابہام ہو تو دونوں معنی ممکن ہیں۔ شیاطین کے متعلق اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے: شیاطین جنوں میں سے ہیں جیسا کہ اس لفظ کے مطلق لانے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ انسانوں کے شیاطین مراد ہیں جو ضلالت و گمراہی کے باعث سرکش ہیں۔

بیان کیا گیا ہے: انسانوں اور جنوں کے شیاطین ہیں: عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ، کہا گیا ہے کہ اس کے یہ

معنی ہیں کہ سلیمان کی حکومت میں دو معنوں کا احتمال وامکان ہے:

اول: سلیمان کے عہد وحکومت میں۔

دوم: خود سلیمان کی حکومت و اقتدار میں۔ جس طرح کہا جاتا ہے: فلاں شخص فلاں کے اقتدار و حکومت میں طعن وتشنیع کرتا ہے اور خود اس کے متعلق طعن کرتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ خود سلیمان کے عہد حکومت میں۔ ابو مسلم نے اس کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ جناب سلیمانؑ کے اقتدار اور حکومت میں جو کچھ شیاطین جھوٹ بولتے تھے اور اس بارے میں جھوٹ بولتے تھے جو دو فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا۔

اس کا ارشاد: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ، (سلیمان کافر نہیں ہوئے بلکہ یہ شیاطین کافر تھے جو لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے) اس کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ شیاطین جو کچھ بیان کرتے تھے وہ کفر تھا جس سے سلیمانؑ بری الذمہ تھے۔

خداوند عالم نے اپنے ارشاد مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ، میں یہ بیان نہیں فرمایا کہ شیاطین کیا پڑھا کرتے تھے، نہ ہی اپنے ارشاد وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ (سلیمان کافر نہیں ہوئے) کی وضاحت فرمائی ہے کہ وہ کفر کس نوعیت کا تھا (اور کفر کی کون سی قسم تھی) یہاں تک کہ اس نے ارشاد فرمایا: وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ، (بلکہ یہ شیاطین کافر تھے جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے) پھر خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ وہ کفر، جادو کی قسم سے تھا۔ یہودیوں نے جناب سلیمانؑ کی جانب جادو کی نسبت دی اور خیال کیا کہ ان کا اقتدار جادو کی بنیاد پر قائم ہے جبکہ خداوند عالم نے جناب سلیمانؑ کو جادو سے بری قرار دیا تھا۔ یہ ابن عباس، ابن جبیر اور قتادہ کا قول ہے۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہودیوں نے کس وجہ سے جادو کی نسبت جناب سلیمانؑ کی طرف دی۔ بیان کیا گیا ہے کہ جناب سلیمانؑ نے جادو کی کتب جمع کر کے اپنے خزانے میں رکھی تھیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اپنی کرسی کے نیچے پوشیدہ کر رکھی تھیں تا کہ لوگ اس سے مطلع نہ ہوسکیں، نہ ہی اس سے کچھ سیکھ سکیں۔ لیکن جب جناب سلیمانؑ کا انتقال ہوگیا تو جادوگروں نے ان کتابوں کو نکالا اور کہنا شروع کردیا کہ سلیمان کا اقتدار و حکومت جادو کے ذریعہ قائم تھا۔ جادو کے ذریعہ انھوں نے لوگوں، جنات اور پرندوں کو اپنے تابع فرمان کر رکھا تھا اور جادوگروں نے سلیمان علیہ السلام کی طرف یہ نسبت دے کر لوگوں کی نگاہوں میں جادو کو زینت دی۔ یہی چیز

یہودیوں کے یہاں شہرت پا گئی جسے انھوں نے جناب سلیمانؑ سے دشمنی کے باعث قبول بھی کرلیا۔ یہ روایت سُدی کی ہے۔

عیاشی نے ابو بصیر کے حوالے سے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: سلیمانؑ کے انتقال کے بعد ابلیس نے جادو گھڑا پھر اس نے ایک نوشتہ تحریر کیا، اسے لپیٹا اور اس کی پشت پر لکھا: یہ وہ ہے جسے آصف بن برخیا نے سلیمانؑ بن داوٴدؑ کی حکومت سے علم کے خزانے سے تیار کیا ہے جو ایسا ایسا چاہتا ہے، وہ یہ یہ پڑھے پھر اسے تخت کے نیچے گاڑ دیا پھر اسے ان کے لیے نکالا تو کافروں نے کہا: اسی چیز (جادو) کے ذریعہ سلیمانؑ نے ہم پر غلبہ حاصل کیا تھا اور مومنین نے کہا: وہ اللہ کے بندے اور نبی ہیں۔ خداوند عالم نے یہ آیت نازل کی: وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ ؛ اور ان باتوں کا اتباع کرنے لگے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت میں لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔

اللہ کے ارشاد: وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا، (بلکہ شیاطین کافر تھے۔۔۔) اس فقرہ میں تین اقوال ہیں:

اول: انھوں نے جادو سے جس چیز کو برآمد کیا تھا اس کا انکار کیا۔

دوم: انھوں نے جناب سلیمانؑ کی طرف جادو کی نسبت کا انکار کیا۔

سوم: انھوں نے جو جادو کیا تھا اسے کفر سے تعبیر کیا۔

اللہ کے ارشاد: يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ، (وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے) اس میں دو قول ہیں:

اول: انھوں نے لوگوں کے سامنے جادو پیش کیا جسے انھوں نے سیکھ لیا۔

دوم: انھوں نے (جادو کا نوشتہ) کرسی کے نیچے سے نکالنے کی رہنمائی کی جسے انھوں نے سیکھ لیا۔

ارشاد الٰہی: وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، (اور وہ بھی جو کچھ دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل میں نازل ہوا تھا) میں چند وجہیں ہیں:

اول: اس سے یہ مراد ہے کہ شیاطین لوگوں کو جادو اور جو کچھ دونوں فرشتوں پر نازل ہوتا اس کی تعلیم دیتے تھے۔ دونوں فرشتوں پر جادو کی صفت اس کی ماہیت اور حیلہ گری کی کیفیت نازل کی گئی تھی تاکہ دونوں اسے بخوبی پہچان لیں اور لوگوں کو اس کی معرفت کرادیں تاکہ وہ اس سے اجتناب اور گریز کرسکیں نہ یہ کہ شیاطین جب اس کے بارے میں جان لیں تو اس کا استعمال کریں اور جب مومنین جادو کے متعلق واقف ہوں

گے تو اس سے اجتناب کریں گے اور اس کی کیفیت سے مطلع ہو کر اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

دوم: مراد وہ ہو جسے ہم سابقاً ذکر کر چکے ہیں کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ انھوں نے اس بات کی پیروی کی جس کی شیاطین نے تکذیب کی سلیمان کی حکومت میں اور اس چیز کی جو دو فرشتوں پر نازل ہوئی یعنی دونوں کے ساتھ اور ان دونوں کی زبان پر جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ. (آل عمران، آیت ۱۹۴) ہمیں وہ چیز دے دے جس کا اپنے رسولوں کے ذریعہ تو نے وعدہ کیا تھا یعنی ان کے ساتھ اور ان کی زبانوں پر۔

سوم: یہ کہ مَا نفی کے معنی میں ہو مراد اس طرح ہوگی: سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا نہ ہی اللہ نے جادو کو دونوں فرشتوں پر نازل کیا لیکن شیاطین نے کفر کیا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے بابل میں ہاروت و ماروت کو۔ اس کا ارشاد: بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ مؤخر ہوگا جس کے معنی تقدیم ہیں۔ اس تاویل کے مطابق (معنی اس طرح ہوں گے) کہ ہاروت و ماروت لوگوں میں سے دو افراد ہوں گے اور وہ دو فرشتے جن سے جادو کی نفی کی گئی ہے جبرئیل و میکائیل علیہما السلام ہوں گے چونکہ یہودیوں کے جادوگر جن کا ذکر گزر چکا ہے اس بات کے مدعی تھے کہ خداوند عالم نے جناب سلیمانؑ پر جبرئیل و میکائیل کی زبانی جادو نازل کیا ہے۔ پس خداوند عالم نے ان کی تکذیب کی ہے اور ممکن ہے کہ ہاروت و ماروت کی بازگشت شیاطین کی جانب ہو گویا ارشاد ہو رہا ہے: لیکن شیاطین ہاروت و ماروت نے کفر کیا یہ اسی طرح جائز ہوگا جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِيْنَ. یعنی ہم داؤد و سلیمان کے فیصلہ دیکھ رہے تھے۔ اس طرح اس کا ارشاد وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ ، اور دونوں یعنی ہاروت و ماروت لوگوں کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک انھیں بتلا نہ دیں کہ ہم تو ذریعۂ آزمائش ہیں۔ فَلَا تَكْفُرْ. (پس انکار مت کرو) یہ استہزا کے طور پر ہوگا نہ کہ نصیحت و خوف کے طریقہ پر۔ اس تاویل کے مطابق جو نفی اور انکار پر مشتمل ہے۔ ہاروت و ماروت دو فرشتوں کے نام ہوں گے جن سے جادو کے نازل کیے جانے کی نفی کی جا رہی ہے۔

ارشاد: وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ. (اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے) اس جملہ کی بازگشت جن و انس کے دو قبیلوں کی طرف ہوگی یا جن و انس کے شیاطین کی جانب ہوگی۔ اس طرح تثنیہ (کا صیغہ) بہتر ہوگا۔ اس تاویل کی روایت (یعنی) مَا کا نفی پر حمل کرنا ابن عباس اور ان کے علاوہ دیگر مفسرین سے کی گئی ہے۔ اسی طرح ان سے روایت کی گئی ہے کہ وہ (مَلَكَيْنِ) کی قرأت لام کے کسرہ (زیر) کے ساتھ کرتے

تھے اور کہتا تھا: متیٰ کان العِلْجَان ملکین؟ انما کانا ملکین۔ یہ عجم کے دونوں کافر فرشتے کب تھے یہ تو بادشاہ تھے۔ اس قرأت کی بنیاد پر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے ارشاد وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ کی بازگشت دونوں کی جانب ہو اور یہ بھی ممکن ہے آیت کی اس قرأت میں دوسری وجہ ہو۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ، کو نفی پر حمل نہ کیا جائے تو وہ افراد مراد ہوں گے جن کے متعلق خبر دی جارہی ہے کہ انھوں نے پیروی کی اس چیز کی جس کو شیاطین بیان کرتے تھے اور جناب سلیمانؑ کے ملک واقتدار کے بارے میں دعوئ کرتے تھے اور انھوں نے اتباع کیا اس چیز یعنی جادو کا جو دونوں فرشتوں پر کیا گیا تھا۔ نازل کیے جانے کی نسبت اللہ کی جانب نہیں دی جائے گی اگرچہ وہ مطلق طور پر ہے اس لئے اس کی ذات پاک وپاکیزہ ہے (کہ وہ جادو نازل کرے) اس نے جادو نازل نہیں کیا بلکہ اس نے دونوں کی جانب راہنمائی کا بعض حصہ نازل فرمایا جو اُنْزِلَ (یعنی نازل کرنے کے معنی میں ہوگا) اگرچہ زمین کی طرف سے ہو تب بھی دونوں پر حمل ہوگا یہ نزول آسمان کی جانب سے نہیں اس لئے جادو کو ملک کی بلندی سے لایا گیا ہے۔ جو بلندی سے پستی کی جانب اترتا ہے اسے نازل ہونا کہا جاتا ہے۔

بابل کے متعلق اختلاف ہے کہا گیا ہے: یہ عراق کا بابل ہے اور یہ زباں زد ہے۔ یہ ابن مسعود کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ دماوند کا بابل ہے۔ یہ سُدی کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ راس العین تک دو حصے ہیں۔

ہاروت وماروت کے متعلق کہا گیا ہے کہ دو آدمیوں کے نام ہیں جس کے متعلق بیان گذر چکا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے: یہ فرشتوں میں سے دو فرشتے ہیں جنھیں خداوند عالم نے زمین پر بشکل انسان بھیجا تھا اگر انسانی صورت میں ہوتے تو لوگوں کو ان سے نفرت ہوتی۔

دونوں فرشتوں کے زمین پر بھیجے جانے کے سبب کے متعلق اختلاف ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے انھیں اس لیے بھیجا تھا تاکہ لوگوں کو دین کا حکم بتائیں اور انھیں جادو سے روکیں۔ جادو اور معجزہ کے درمیان فرق کو واضح کریں۔ اس زمانہ میں جادو بکثرت تھا۔

پھر اس بارے میں اختلاف ہے ایک گروہ نے کہا ہے: لوگوں کو جادو کی کیفیت سکھاتے اور اس کے انجام دینے سے منع کرتے تھے تاکہ علم کے بعد نہی واقع ہو چونکہ جو کسی چیز کے متعلق نہیں جانتا اس سے گریز بھی نہیں کرسکتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: وہ جادو کی تعلیم نہیں دیتے تھے اس لیے کہ ایسا کرنے سے فریب میں مبتلا کرنا لازم آتا ہے بلکہ دونوں کو فقط نہی کے لیے بھیجا گیا۔ اس لئے کہ جادو بری چیز ہے۔

اسی طرح دونوں کے (زمین) پر بھیجے جانے کے سبب کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ ملائکہ فرزندان آدمؑ پر بکثرت نعمتوں کے باوجود ان کی نافرمانی سے تعجب کرتے تھے۔

تو ان میں سے کچھ فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار! کیا تو اپنی مخلوقات پر غضبناک نہیں ہوتا کہ وہ تیری زمین پر کیا کیا کر رہے ہیں؛ جھوٹ، فریب اور بہتان باندھ رہے ہیں؛ گناہ کر رہے ہیں جبکہ تو نے انھیں ان چیزوں سے روکا ہے اور وہ تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ خدا کی مرضی یہ تھی کہ ان فرشتوں کو یہ بتادے کہ انھیں عجیب انداز میں خلق فرماتا اور اطاعت کا عادی بنا کر گناہوں سے محفوظ رکھ کر کس قدر ان پر احسان کیا ہے۔ پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا: تم اپنے درمیان دو فرشتوں کو اپنا نمائندہ بناؤ تا کہ دونوں کو زمین کی جانب روانہ کرو اور ان میں کھانے پینے، شہوت، حرص و لالچ اور امید کی خصلتیں اسی طرح قرار دیتا ہوں جس طرح میں نے فرزند آدمؑ میں قرار دی ہیں پھر میں دونوں کو اپنی اطاعت کے ذریعہ آزماؤں گا (راوی کہتا ہے) اس طرح ہاروت و ماروت کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا یہی دونوں فرشتے فرزندان آدمؑ پر نکتہ چینی کرتے تھے اور عتاب الٰہی کا تقاضا کرتے تھے۔

(راوی کہتا ہے) خداوند عالم نے دونوں پر وحی فرمائی کہ زمین کی طرف چلے جاؤ، میں نے تم دونوں کے اندر فرزندان آدمؑ کے مانند کھانے پینے، خواہشات نفسانی، حرص و لالچ جیسی عادتیں خلق کر دی ہیں۔ خبردار! میرے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دینا، جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام قرار کیا ہے اسے قتل نہ کرنا، نہ زنا کرنا، نہ شراب پینا۔ پھر دونوں کو انسانی صورت اور انسانی لباس میں زمین پر بھیج دیا۔ پھر دونوں کے لیے عالیشان محل بنایا گیا۔ دونوں اس مکان کی جانب بڑھے اسی وقت حسین و جمیل عورت ان کی جانب بڑھی، دونوں کے دلوں میں اس کی شدید محبت جاگزیں ہو گئی، دونوں کو یاد آیا کہ انھیں زنا سے روکا گیا ہے، اسی طرح دونوں بڑھتے رہے۔ دونوں کی شہوت نے زور مارا، دونوں اس کی جانب پلٹے۔ دونوں نے عورت سے اظہار محبت کیا۔ عورت نے کہا میرا دین ہے جس کی میں پابند ہوں۔ میں اپنے دین کے اعتبار سے اس چیز پر قدرت نہیں رکھتی کہ تمھاری خواہش پر لبیک کہوں یہاں تک کہ تم دونوں میرے دین میں داخل ہو جاؤ۔ دونوں نے کہا: تیرا کیا دین ہے؟ اس نے کہا میرا اللہ ہے جو اس کی عبادت اور سجدہ کرے گا اسے مجھ پر اختیار حاصل ہو جائے گا یہاں تک کہ جو کچھ مجھ سے طلب کرے گا میں اسے قبول کروں گی۔ انھوں نے کہا: تیرا اللہ کون ہے؟ اس نے کہا: یہ بت۔ جو بھی اس کی عبادت کرے گا اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوگا تو اس کے مطالبہ کو پورا کروں گی۔ ان

دونوں نے کہا: تمھارا معبود کیا ہے؟ اس عورت نے کہا: یہ "بت"

(راوی کہتا ہے) دونوں پر شہوت کا غلبہ ہوگئی جسے ان دونوں کے درمیان قرار دیا گیا تھا۔ دونوں نے عورت سے کہا: جو بھی تو مطالبہ کرے گی ہم اسے قبول کریں گے۔ عورت نے کہا: تم دونوں شراب پیو چونکہ تمھارا یہ عمل اس قربت کا ذریعہ ہے اسی کے ذریعہ تم جو چاہو گے اسے حاصل کرلو گے۔ دونوں نے کہا: ہمیں انھیں تین باتوں سے روکا گیا ہے: شرک، زنا اور شراب۔ دونوں نے عورت سے کہا: تیرے ذریعہ کس قدر بڑی آزمائش ہوئی ہے جسے ہم نے قبول کیا ہے۔

(راوی کہتا ہے) دونوں نے شراب نوشی کی، بت کو سجدہ کیا اور عورت سے اظہار محبت کیا۔ جیسے ہی عورت دونوں کے لیے آمادہ ہوئی اسی وقت ایک سائل آن پہنچا۔ دونوں سائل کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ سائل نے دونوں سے کہا: تم اس حسین وجمیل عورت کے ساتھ خلوت وتنہائی کے باعث دھوکہ کھا گئے ہو، تم دونوں بہت برے لوگ ہو۔ وہ شخص ان کے پاس سے چلا گیا۔ عورت نے دونوں سے کہا: جلدی سے اس شخص کو قتل کردو قبل اس کے کہ یہ تم دونوں کو اور مجھے رسوا کردے۔ پھر تم اپنی خواہش پوری کرنا۔ تم مطمئن اور امان میں ہو۔

(راوی کہتا ہے) ان دونوں نے جا کر اس شخص کو قتل کردیا۔ پھر عورت کی طرف پلٹ کر آئے تو اسے وہاں نہیں پایا۔ دونوں کی شرم گاہیں ظاہر ہوگئیں اور ان کے پروں کو جدا کردیا گیا اور وہ ان کے ہاتھوں پر گر گیا۔ اللہ نے ان کی طرف وحی فرمائی: میں نے تمھیں دن کے کچھ حصے میں زمین پر بھیجا تھا، تو تم نے چار ایسے گناہ کئے جن سے میں نے تمھیں منع کیا تھا اور میں نے تمھیں پہلے ہی بتلا بھی دیا تھا، تم نے مجھ سے نہ تو خوف کیا نہ ہی حیا کی، تم دونوں ہی اہل زمین کے گناہوں پر شدید ترین نکتہ چینی کرنے والے تھے، اب چاہے عذاب دنیا اختیار کرو یا عذاب آخرت۔

(راوی کہتا ہے) دونوں نے عذاب دنیا کو اختیار کیا۔ وہ بابل میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ جب انھوں نے لوگوں کو جادو سکھا دیا تو انھیں زمین سے ہوا میں بلند کردیا چنانچہ وہ عذاب کی حالت میں ہوا میں الٹے معلق ہیں۔ اسی طرح قیامت تک لٹکے رہیں گے۔ اس خبر کی روایت عیاشی نے مرفوعاً امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے۔ جو لوگ عصمت ملائکہ کے قائل ہیں انھوں نے اس صورت کو ممکن نہیں سمجھا ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ، (دونوں فرشتے کسی کو بھی (جادو) نہیں سکھاتے تھے جب تک انھیں بتلا نہ دیں کہ ہم تو ذریعہ آزمائش ہیں۔ تم کفر اختیار نہ کرو)

عرب عَلَّمَ کو اَعْلَمَ کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں یعنی کسی کو بھی جادو کی کیفیت نہیں پہنچواتے تھے یہاں تک کہ اس سے دور رہے کہ دونوں فرشتوں نے کہا کہ ہم فتنہ (یعنی امتحان و آزمائش) ہیں۔ لفظ فتنۃ امتحان اختبار اور آزمائش کے معنی میں ہے۔ وہ دونوں اس اعتبار سے آزمائش تھے کہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ لوگ جادو سے گریز کریں اور اس کے انجام دینے سے خود کو روکیں اگر وہ لوگ جادو کے متعلق جان جاتے تو ان کے لیے اس کا استعمال وارتکاب ممکن تھا پس جب کسی کو اس پر مطلع کرتے تو اس سے کہتے کہ اس کا استعمال کر کے کفر اختیار نہ کرنا، نہ ہی اس مقصد سے انحراف کرنا جس کے تحت تم پر اس کا القا کیا گیا ہے تاکہ تم اس سے پرہیز کرو نہ کہ اس کے انجام دینے کے لیے۔ اس تفسیر کے مطابق جادو کا سیکھنا کفر اور گناہ نہیں ہے جس طرح کوئی شخص زنا کے بارے میں جانتا ہے اس کے جاننے سے گنہگار نہیں ہوگا بلکہ انجام دینے سے گنہگار ہوگا۔

بیان کیا گیا ہے: اس سے دونوں (فرشتوں) کو جادو تعلیم دینے کی نفی مراد ہے جس کی تقدیر اس طرح ہوگی کسی کو بھی جادو کی تعلیم نہ دیں، وہ کہہ رہے ہیں ہم سبب امتحان و آزمائش ہیں اس اعتبار سے جادو کی تعلیم شیاطین کی جانب سے ہوگی اور فرشتوں کو اس سے نہی ہوگی۔

فَلَا تَكْفُرْ، میں تین چیزوں سے ایک مراد ہے:

اول: جادو پر عمل کر کے کفر اختیار نہ کرنا۔

دوم: جادو سیکھ کر کفر اختیار نہ کرنا۔ دونوں فرشتوں کے ذریعہ اللہ نے آزمایا ہے۔ اس سے اس وقت کے لوگ مراد ہوں گے۔ کفر و ایمان کے درمیان آزمائش قرار دینے کی وجہ یہ کہ جادو سیکھنے والا اس کے سیکھنے کے سبب کافر ہو جائے گا اور اس کی تعلیم کا ترک کرنے والا مومن ہوگا چونکہ جادو اس وقت بکثرت رائج تھا لہٰذا ممکن ہے کہ خداوند عالم نے اسی کو ذریعۂ امتحان بنایا ہو جس طرح اس نے نہر کے ذریعہ امتحان لیا، جیسا کہ فرمایا ہے: فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي (جو اس نہر سے پانی پیئے گا وہ مجھ سے نہیں)

سوم: ہم دونوں کا انکار نہ کرنا۔

ارشاد ہوتا ہے: فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا، وہ ان دونوں یعنی ہاروت و ماروت سے سیکھ رہے تھے۔

بیان کیا گیا ہے: بدل مراد ہے (اس چیز سے) جسے ان دونوں کو سکھایا اور تعلیم دی، معنی اس طرح ہوں گے کہ یہ لوگ اس سے انحراف کرتے ہیں جس کی تعلیم جادو کے انجام نہ دینے کی اور استعمال نہ کرنے کی دونوں فرشتوں نے دی جیسا کہ کہا جاتا ہے: اے کاش ہمارے لیے یہ اور وہ ہوتا یعنی اس کے بدل میں۔

ارشادالٰہی: مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؛جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: ایک دوسرے کے درمیان بغض ودشمنی ایجاد کرتے تھے جس کے سبب جدائی ہوجاتی تھی۔

دوم: شوہروزوجہ کے درمیان چغلخوری کرتے اور انھیں خدا کے ساتھ کفروشرک پر آمادہ کرتے تھے اس طرح ان میں سے اپنے دین پر قائم مومن اور اس کے دوسرے ساتھی کے درمیان مفارقت ہوجاتی اس اختلاف کے باعث جو ان کی قوم اور ملت کے درمیان واقع ہوتا تھا۔

سوم: یہ لوگ شوہروزوجہ کے درمیان چغلی کرتے اور ایک کی باتیں دوسرے تک پہنچاتے یہاں تک کہ جدائی تک کی نوبت آجاتی۔

ارشادالٰہی: وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، یعنی کسی غیر کے ذریعہ ضرر ونقصان نہیں پہنچ سکتا بجز علم خدا کے۔ یہ فقرہ سرزنش کے عنوان سے ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں: بجز اللہ کے تخلیہ(مہلت فراہم کرنے) کے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ جس سے اللہ روکنا چاہتا ہے (مانع ہوتا ہے) اسے جادو نقصان نہیں پہونچا سکتا اور جس کے متعلق چاہتا ہے تو دونوں (جادوگر اور جس پر جادو کیا جائے) کے درمیان تخلیہ وتنہائی (مہلت) قرار دیتا ہے۔

وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ،(اور وہ کچھ ایسے منتر سیکھتے تھے جو خود ان کے لئے نقصان دہ تھے، فائدہ مند نہ تھے) یعنی انھیں آخرت میں نقصان پہنچائے گا، فائدہ نہیں بخشے گا اگرچہ دنیا میں ان کے لیے نفع بخش ہو چونکہ جب وہ (جادو) سیکھتے تھے تاکہ اسے انجام دیں اور اس کے مرتکب ہوں نہ کہ اس سے اجتناب اور گریز کرنے کے لیے یہ ان کے سوءاختیار کے سبب ان کے لیے ضرررساں ہوگا۔

ارشادالٰہی: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (اور ان کے علم میں تھا کہ جو شخص ایسی چیزوں کا خریدار ہوگا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں) اس سے مراد وہ یہودی ہیں جنھوں نے کتاب (قرآن) سے روگردانی کی اور اسے پس پشت ڈال دیا، بخوبی جانتے ہیں اس چیز کے بارے میں کہ جادو کو دین خدا سے بدل لیا اشْتَرٰىهُ میں ضمیرہ کنایہ ہے سحر (جادو) سے۔ یہ قتادہ اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ، یعنی کس قدر برا ہے جس کے عوض انھوں نے اپنے نفوس کا حصہ

فروخت کردیا کہ جادو کو ذریعۂ کسب (کمائی) بنالیا۔

پروردگار کے وَلَقَدْ عَلِمُوْا (اور انھیں معلوم تھا) کہنے کے بعد لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ، (کاش وہ اس بات کو جان لیتے) کہنے کے سلسلہ میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: جاننے والے نہ جاننے والوں کے علاوہ ہیں یا وہ ہیں جو شیاطین میں سے جانتے ہیں یا وہ افراد ہیں جن کے بارے میں خداوند عالم نے آگاہ کیا ہے کہ انھوں نے کتاب خدا کو ترک کردیا، اسے پس پشت ڈال دیا جو لوگ نہیں جانتے وہی ہیں جو جادو سیکھتے ہیں۔

دوم: جو لوگ جانتے ہیں وہی لوگ ہیں جو نہیں جانتے مگر یہ کہ کچھ جانتے ہیں اور اس کے علاوہ نہیں جانتے گویا خداوند عالم ان کی صفت بیان کررہا ہے کہ وہ اس بارے میں جانتے ہیں کہ اس کا کوئی حصہ نہیں جس نے فروخت کیا ہے اور فی الحال اپنے لیے اس پر راضی ہیں اور اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں کہ وہ کس طرح دائمی عذاب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

سوم: یہ کہ اثبات علم کے بعد علم کی نفی کرنے میں کوئی فائدہ ہے کہ جس بات سے واقف ہیں اس پر عمل نہیں کرتے گویا وہ اس چیز سے ناواقف ہیں۔

دونوں گروہ سے علم کی نفی کی گئی ہے پھر اسے ثابت کیا گیا ہے۔ دونوں سے علم کی نفی کے یہ معنی ہیں کہ جسے وہ جانتے تھے اس پر انھوں نے عمل نہیں کیا گویا وہ دونوں اس سے ناواقف تھے۔

اس آیت میں اس چیز پر دلالت ہے کہ مقاصد کے اختلاف کے باعث افعال مختلف ہوتے ہیں لہٰذا شبہ کو برطرف کرنے، اس سے محفوظ رہنے اور گریز کرنے کے لیے جادو سیکھنا ایمان ہے۔ جادو کی تصدیق کرنا اور اسے استعمال کرنا کفر ہے۔

جادو کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، بیان کیا گیا ہے سحر و جادو تخیل کی ایک قسم اور لطیف ترین کرتب صنعت و ہنرکاری ہے۔ خداوند عالم نے اس سے پناہ چاہنے کا حکم فرمایا ہے اور اس سے بچنے اور محفوظ رہنے کے لیے قرآن کریم میں سورۂ فلق نازل فرمایا ہے۔ اس بارے میں ہمارے علماء میں سے شیخ مفیدؒ کا کہنا ہے کہ "جادو فریب اور گڑھا ہوا جھوٹ اور ایسی موہوم اور خیالی چیز ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مسحور (جس پر جادو کیا جاتا ہے) کو جادو حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جادوگر کے لیے انسان کا گدھے میں تبدیل کرنا ممکن ہے۔ وہ اسے ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کرسکتا ہے اور ایجاد کے طور پر

کسی جاندار کو پیدا کر سکتا ہے۔ یہ امور جائز نہیں ہیں جس نے (جادوگر) کی تصدیق کی وہ نبوت کو نہیں پہچانتا، نہ ہی وہ اس چیز سے محفوظ و مأمون ہے کہ انبیاء کے معجزات اس قسم سے ہیں (یعنی جادوگر کے جادو اور انبیاءؑ کے معجزات میں امتیاز نہیں کرتا) اگر جادوگر کی یہی شان ہوتی کہ وہ نفع و ضرر پر قادر ہوتا اور علم غیب جانتا ہوتا تو وہ ملک کو ختم کرنے، معادن سے خزانوں کے نکالنے اور کسی زحمت و مشقت کے بغیر بادشاہوں کو قتل کر کے ملک پر قبضہ حاصل کرنے پر قادر ہوتا، جب ہم انھیں لوگوں کے درمیان بدترین حالات میں اور بہت زیادہ فریب و حیلہ کرنے والے دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں میں سے کسی پر قدرت نہیں رکھتے البتہ روایات میں جو وارد ہوا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا تو گویا آپؐ دیکھ رہے تھے کہ وہ ایسا فعل ہے جسے آپ انجام نہیں دے سکتے اور جو (جادوگر) نے انجام دیا ہے آپ اسے ہرگز انجام نہیں دے سکتے، یہ جعلی روایات قابل توجہ نہیں ہیں۔ خداوند عالم کفار کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (سورۂ اسراء، آیت ۴۷) اگر وہ اتباع کرتے ہیں تو فقط سحر و جادو میں مبتلا شخص کی۔ اگر اس میں جادوگر کا کوئی عمل دخل ہوتا تو کفار اپنی بات میں سچے ہوتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہر نقص سے دور ہے اور پاک و پاکیزہ ہے ہر اس چیز سے جو آپ کے قول کی قبولیت سے نفرت کا باعث ہو۔ آپ کی ذات گرامی قدر اللہ کی مخلوقات پر حجت خداوندی ہے اور آپ منتخب روزگار ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾
اگر وہ لوگ ایمان لے آتے اور متقی بن جاتے تو ان کے لیے اللہ کے پاس بہترین ثواب موجود تھا۔ اے کاش وہ لوگ یہ بات سمجھ لیتے۔

الفاظ و معانی:

مَثُوْبَة، ثَوَاب، اَجر باہم مشابہ ہیں۔ مَثُوْبَة (ثواب) کی ضد عَذَاب ہے۔ ثواب کے حقیقی معنی جو کوئی چیز تمھاری طرف واپس پلٹے۔ ثواب کو ثواب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے صاحب (مالک) کی طرف

پلٹتا ہے جو اس کے عمل کی جزا اور بدلہ ہے اسی سے اذان میں تثویب ہے جس کے معنی آواز کا پلٹانا (یعنی آواز میں گٹکری پیدا کرنا) ہے۔

ترکیب:

لَمَثُوْبَۃٌ کا لام، لام ابتداء ہے اور لَمَثُوْبَۃٌ، لَوْ کے جواب کے مقام میں ہے اس لئے کہ آپ کے اس جملہ لَاُثِیْبُوْا کی خبر دے رہا ہے۔

اِنَّھُمْ میں ھُمْ کی ضمیر اَلَّذِیْنَ کی طرف پلٹ رہی ہے، یعنی جو جادو سیکھتے تھے۔

تفسیر:

کاش مومن و متقی بن جاتے!

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا، (اگر وہ لوگ ایمان لے آتے) یعنی جادو سیکھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس مراد یہودی ہیں۔

اس مقام پر اٰمَنُوْا، کے معنی ہیں کہ اے کاش وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کریم کی تصدیق کر لیتے۔ وَاتَّقَوْا، اور متقی بن جاتے یعنی جادو اور کفر سے گریز کرتے۔ اور کہا گیا ہے کہ تمام گناہوں سے پرہیز کرتے۔

لَمَثُوْبَۃٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ خَیْرٌ، تو ان کے لئے اللہ کے پاس بہترین ثواب موجود تھا یعنی انھیں ثواب ملتا اور اللہ کا ثواب تو بہترین ہے۔

لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ، کاش وہ لوگ یہ بات سمجھ لیتے یعنی جو کچھ وہ جانتے تھے اس پر عمل پیرا ہوتے۔ وہ لوگ اس بات سے جاہل تو نہ تھے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے ساتھی سے نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے: "میں تمھیں جس چیز کی دعوت دے رہا ہوں تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم عقل سے کام لو یا اس کے انجام پر غور و فکر کرو"

اس کے ارشاد: لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ، (اے کاش وہ لوگ یہ بات سمجھ لیتے) وہ خیر اور بہتر ہے چاہے اس کے متعلق جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ اس میں دو وجہیں ہیں:

اول: اگر وہ جانتے ہیں تو ان کے علم سے ان کے لیے یہ بات ظاہر اور واضح ہوگئی یعنی انھوں نے

جان لیا کہ اللہ کا ثواب جادو سے بہتر ہے۔

دوم: ان کی ناواقفیت اور جہالت پر دلالت ہے اور اس کے سیکھنے کی انھیں ترغیب ہے کہ وہ اس چیز کے خواہاں اور طلبگار بنیں جو ان کے لیے جادو سے بہتر ہے اور وہ اللہ کا ایسا ثواب ہے جو اس کی اطاعت اور رضا کی پیروی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

آیت میں اصحاب معارف کے قول کے بطلان پر دلیل ہے اس لیے کہ ان سے اس علم کی نفی کی گئی ہے۔

❀❀❀❀❀

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾
اے ایمان دارو! تم رسول کو مخاطب کر کے رَاعِنَا (ہماری رعایت کیجیے) نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا (ہم پر توجہ فرمایئے) کہا کرو اور ان کی بات توجہ سے سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

الفاظ و معانی:

مُرَاعَات کسی چیز کو یا اس کے حالات کو دریافت کرنا ہے۔ مَرَاعَاۃ، مُحَافَظَة اور مُرَاقَبَة باہم مشابہ ہیں۔ مراعات کی ضد اِغْفَال (غفلت کرنا) ہے۔ رَاعَی اللهُ فلاناً (یعنی اللہ نے فلاں شخص کی حفاظت کی) رَاعِی کی جمع رِعَاء، رُعَاۃ اور رُعیان ہے۔ قوم کا سرپرست اس کا راعی (محافظ و نگراں) ہے اور قوم اس کی رَعِیَّة (رعایا) ہے۔ رَاعِی کو سَائِس (نگراں محافظ) بھی کہتے ہیں۔

تفسیر:

دشمن کو موقع مت دو!

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سے پہلے یہودیوں کو جادو سے منع کرنے کے فوراً بعد ہر حال میں اس لفظ کے بولنے پر قدغن لگا دی اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا، اے ایمان دارو! تم رسول کو مخاطب کر کے رَاعِنَا (ہماری رعایت کیجئے) نہ کہا کرو۔ مسلمان یہ کہا کرتے تھے: یَا رَسُوْلَ اللهِ رَاعِنَا؛ یا رسول

اللہ ہماری بات سنئے، یہودیوں نے اس لفظ میں تحریف کرتے ہوئے کہا: یَا مُحَمَّدُ رَاعِنًا، یہودی آپؐ کو رعونت (کبر و تکبر) کا بہت زیادہ طعنہ دیتے تھے۔ اس طرح وہ آپؐ کی توہین کرنا چاہتے تھے۔ جب انھیں سرزنش کی گئی تو کہنے لگے ہم تو وہی کہتے ہیں جو مسلمان کہتے ہیں۔ خداوند عالم نے انہیں اس طرح نہی فرمائی کہ: لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا، تم رَاعِنَا نہ کہو بلکہ اُنْظُرْنَا کہو یعنی ہم پر توجہ فرمایئے۔

قتادہ نے بیان کیا ہے: یہ وہ کلمہ ہے جسے یہودی بطور استہزا اور تمسخر کہا کرتے تھے۔

عطا نے بیان کیا ہے: یہ وہ کلمہ ہے جسے انصار زمانۂ جاہلیت میں کہتے تھے۔ اسلام میں اس کلمہ کے کہنے سے نہی کی گئی ہے۔

سدی نے کہا ہے: یہ ایک یہودی کا کلام تھا جس کا نام رفاعہ بن زید تھا۔ اس سے اس کی مراد رعونت (تکبر و عزور) تھا۔ مسلمانوں کو اس سے روکا گیا۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ کلمہ عبرانی زبان میں گالی ہے جسے وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں: سنئے، آپ نے نہیں سنا۔ حسن سے روایت کی گئی ہے کہ وہ اسے تنوین کے ساتھ رَاعِنًا پڑھتے تھے، یہ بہت کم ہے اسے نہیں مانا جا سکتا۔

اُنْظُرْنَا (ہمیں دیکھئے) کے معنی میں چند وجہوں کا احتمال ہے:

اول: آپ ہمارا انتظار کیجئے (تاکہ) ہم سمجھیں اور اسے بیان کریں جس کی آپؐ نے ہمیں تعلیم دی ہے۔

دوم: اے محمدؐ! ہمیں سمجھایئے اور ہمارے لیے واضح فرمایئے۔

سوم: ہماری طرف آیئے۔ ممکن ہے اس کے معنی ہوں ہماری طرف دیکھئے۔ حرف جر (اِلیٰ) حذف کر دیا گیا ہو۔

اس کے ارشاد: وَاسْمَعُوْا، میں دو امر کا امکان ہے:

اول: جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اسے قبول کرو (تسلیم کرو) جس طرح یہ ہے: سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ وَ سَمِعَ اللّٰہُ دُعَآئَکَ (اللہ اس کی سنتا ہے جو اس کی حمد کرتا ہے) (اور خدا نے تمھاری دعا سن لی) یعنی قبول کر لی۔

دوم: رسولؐ جو کچھ تمھارے پاس لیکر آئے ہیں اسے غور سے سنو۔ یہ حسن کا قول ہے۔ وَلِلْکٰفِرِیْنَ، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور قرآن کا انکار کرنے والوں کے لیے، عَذَابٌ اَلِیْمٌ، دردناک

اور تکلیف دہ عذاب ہے۔

حسن اور ضحاک نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

❀❀❀❀❀

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾

(اے رسول) اہل کتاب میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا وہ اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر (وحی) نازل کیا جائے اور خدا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص کرلیتا ہے اور خدا بڑا صاحب فضل ہے۔

الفاظ و معانی:

مَوَدَّة کے معنی محبت کے ہیں۔

اِخْتِصَاصٌ بِالشَّیْءِ کسی چیز سے مخصوص ہونا اس سے منفرد ہونا ہے اور اِخْتِصَاص کی ضد اِشْتِرَاك ہے۔ کہا جاتا ہے: خَصَّهُ الشَّیْءُ یَخُصُّهٗ خَصًّا کسی شے سے مخصوص ہونا جب اسے دوسروں پر فضیلت دی جائے اور اَلْخَصُّ وہ گھر جو بانس یا درخت سے بنایا گیا ہو۔ ہر وہ سوراخ یا شگاف جو بادل میں یا شہد کی مکھی کے چھتے میں ہوتا ہے اسے خَصَاصَة کہا جاتا ہے۔

ترکیب:

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ یَوَدُّ کا فاعل ہے اور اَلْمُشْرِكِیْنَ، اَهْلِ الْكِتَابِ پر عطف کی بنا پر مجرور ہے گویا اس طرح ہے: وَلَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔

اَنْ یُّنَزَّلَ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ یَوَدُّ کا مفعول بہ ہے۔

مِنْ خَیْرٍ میں مِنْ زائدہ موکدہ ہے جیسے یہ کلام کہ مَا جَاءَنِیْ مِنْ اَحَدٍ۔ مِنْ خَیْرٍ محلاً مرفوع ہے۔

مِنْ رَّبِّكُمْ میں مِنْ ابتداء غایت کے لئے ہے۔مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ میں تنویع اور تبیین (تقسیم اور تشریح) کے لئے ہے جس طرح آیت میں ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔

تفسیر:

اہل کتاب اور مشرکین کی دلی خواہش

خداوند عالم نے اس آیت میں یہودیوں کے بارے میں باخبر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ. ((اے رسول) اہل کتاب میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا وہ اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر (وحی) نازل کیا جائے) یعنی اہل کتاب کافر اور اللہ کی ذات میں شرک کرنے والے بت پرست پسند نہیں کرتے کہ اللہ تم پر کوئی خیر نازل کرے۔ جو اس کی جانب سے ہو اور وہ خیر جسکے متعلق یہ تمنا کرتے ہیں کہ اللہ ان پر نازل نہ فرمائے وہ ہے جسے اللہ نے اپنے رسولؐ پر قرآن اور شرائع (احکام شریعت) کی شکل میں نازل فرمایا ہے۔ مومنین پر یہ زیادتی اور ان سے حسد کی بنیاد پر ہے۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (اور اللہ اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے مختص کر دیتا ہے) حضرت امیر المومنین اور امام باقر علیہما السلام سے روایت کی گئی ہے، یہاں پر رحمت سے مراد نبوت ہے۔

اسی چیز کو حسن و ابو علی الرمانی اور دیگر مفسرین نے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ (خداوند عالم) اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے نبوت کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (اور خدا بڑا صاحب فضل ہے) اس ارشاد میں اللہ کی جانب سے خبر دی جا رہی ہے؛ ہر وہ دینی اور دنیاوی خیر جس تک اس کا بندہ پہونچتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ جس کی ابتدا اس کی جانب سے بندوں پر ہوتی ہے اور یہ اس کے بندوں پر کسی استحقاق کے بغیر فضل الٰہی ہے۔ لہٰذا وہ عظیم فضل اور احسان کرنے والا ہے۔

❁❁❁❁❁❁

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

(اے رسول) جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا (ذہن سے) مٹا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت نازل بھی کر دیتے ہیں کیا۔ تمھیں معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟!

قرأت:

ابن عامر نے مَا نُنْسِخْ کی نون کو ضمہ اور سین کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے نَنْسَأْهَا نون اور سین کو فتحہ اور ہمزہ کو باقی رکھ کر پڑھا ہے۔ بقیہ قراء نے نون کو ضمہ، سین کو کسرہ اور بغیر ہمزہ کے (نُنْسِهَا) قرأت کی ہے۔

حجت:

ابن عامر نے جو نُنْسِخْ قرأت کی ہے تو وہ اس بات سے خالی نہیں ہے کہ:

(۱) اَفْعَلَ (باب افعال) بھی فَعَلَ (باب ثلاثی مجرد) کے معنیٰ میں ہو جیسے: بَدَا و اَبْدَا، حَلَّ مِنْ اِحْرَامِهٖ و اَحَلَّ

(۲) یا ہمزہ باب افعال متعدی بنانے کے لئے ہے جیسے ضَرَبَ وَ اَضْرَبْتُهٗ اس نے مارا میں نے اس سے مار پڑوائی۔ نَسَخَ الْكِتَابَ وَ اَنْسَخْتُهُ الْكِتَابَ، اس نے کتاب کی نسخہ برداری، میں نے اس سے کتاب کی نسخہ برداری کروائی۔

(۳) یا باب افعال کسی حالت میں پانے کے معنیٰ میں ہے جیسے: اَنْسَخْتُ الْاٰيَةَ میں نے آیت کو منسوخ پایا، عربوں کا قول ہے: اَحْمَدْتُ زَيْدًا (زید کو لائق تعریف پایا) اَبْخَلْتُهٗ (میں نے اسے کنجوس پایا)

صحیح وجہ پہلی والی ہے کہ نَسَخَ اور اَنْسَخَ دو لغت ہیں جو معنیٰ میں متفق ہیں اگر چہ لفظ میں مختلف ہیں:

اور جس نے نون کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کی بات بالکل واضح اور روشن ہے نَنْسَأْهَا یہ نَسَأَ

سے ہے جس کے معنیٰ تاخیر کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نَسَأْتُ الْاِبِلَ عَنِ الْحَوْضِ اَنْسَأُهَا نَسْأً یعنی اونٹوں کو حوض سے دور کیا۔ اَنْسَأْتُ اَنَا یعنی میں پیچھے رہ گیا۔ اس سے عربوں کا یہ کہنا: اَنْسَأَكَ اللهُ اَجَلَكَ، خدا آپ کی موت کو ٹال دے۔ لیکن دوسری قرأت تو وہ نِسْیَان سے ہے جو سہو یا ترک کے معنیٰ میں ہے۔

الفاظ ومعانی:

لغت میں نَسْخ کے معنی کسی چیز کو باطل قرار دے کر اس کی جگہ کسی دوسری چیز کو لانے کے ہیں۔ بطور مثال کہا جاتا ہے: نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ یعنی آفتاب نے سایہ ختم کر دیا اور اس کا قائم مقام بن گیا۔ ابن درید نے بیان کیا ہے: ہر وہ چیز جو کسی کے بعد آتی ہے وہ اسے ختم اور منسوخ کر دیتی ہے جیسے اِنْتَسَخَ الشَّیْبُ الشَّبَابَ (یعنی پیری نے جوانی کا خاتمہ کر دیا) اسی طرح میراث تقسیم ہونے سے قبل ورثہ کا مر جانا اور میراث کا قائم رہنا انھیں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

نسخ کے حقیقی معنیٰ ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل دینا ہے۔ علی بن عیسیٰ نے کہا ہے: نسخ کسی چیز کا برطرف کرنا ہے، کسی (دوسری) چیز کے بدل (یا عوض) کے ساتھ جو لازمی وضروری تھا۔ جس طرح آفتاب کا سایہ کے ساتھ منسوخ ہونا اور بدل ہو جانا کہ وہ اس کا بدل ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ پر جاتا ہے۔ یہ معنی صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ (اس معنیٰ میں) نقض وارد ہوتا ہے۔ اس شخص کے لیے جسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا لازمی تھا اور وہ کھڑے ہونے سے عاجز ہو۔ اس کی عاجزی ومجبوری کے سبب قیام (کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا) اس سے ساقط ہو جائے گا۔ اس عاجزی ومجبوری کو نسخ نہیں کہیں گے، نہ ہی قیام منسوخ ہو گا اس طرح نقض وارد ہوتا ہے۔ جس کے لیے حکم عقل سے کوئی چیز مباح ہو اور شریعت میں اس چیز کے لیے ممانعت وارد ہو تو اس طرح نہیں کہا جائے گا کہ شریعت نے حکم عقل کو منسوخ کر دیا۔ نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ حکم عقل منسوخ ہے، اولیٰ اور بہتر بات جو نسخ کے متعلق تحقیق سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شرعی دلیل جو نص اول کے ذریعہ حکم ثابت پر دلالت کرے اور اس وجہ سے مستقبل میں غیر ثابت ہو کہ اگر وہ نہ ہوتا (یعنی مستقبل کا غیر ثابت حکم) تو (یہ حکم) اپنی تاخیر کے ساتھ نص اول کے ذریعہ ثابت رہتا۔

نسخ کی قسمیں

قرآن کریم میں نسخ چند قسموں میں وارد ہوا ہے:

اول: آیت کی تلاوت اور اس کا حکم منسوخ ہو جائے جیسا کہ حضرت ابوبکر سے روایت کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم اس طرح پڑھتے تھے: لَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَإِنَّهُ كُفْرٌ بِكُمْ (تم اپنے آباء سے بے توجہی نہ کرو کہ یہ تمھارے لیے کفر ہے)

دوم: آیت تحریری شکل میں باقی رہے، لیکن اس کا حکم اٹھالیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُم مِّثْلَ مَا أَنفَقُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ۔ (سورۂ ممتحنہ، آیت ۱۱) (اور اگر تمھاری کافر بیویوں کے مہر سے تمھیں کفار سے کچھ نہ ملے اور پھر تمھاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیے ہوئے مہروں کے برابر ہو اور تم اللہ سے ڈرتے رہو جس پر ایمان رکھتے ہو) یہ آیت لفظی اعتبار سے ثابت ہے لیکن اس کا حکم اٹھالیا گیا ہے۔

سوم: آیت کے الفاظ منسوخ ہو گئے اور حکم ثابت رہے۔ جیسے آیت رجم میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیت نازل ہوئی تھی اس کے الفاظ اٹھالئے گئے۔ اس طرح کی کئی روایتیں وارد ہوئی ہیں کہ بعض چیزیں قرآن میں موجود تھیں جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی۔ انھیں میں ہے وہ روایت بھی جسے ابوموسیٰ سے نقل کیا گیا ہے لوگ اس طرح قرأت کرتے تھے: لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَيْنِ مِن مَّالٍ لَا تَبْتَغِي إِلَيْهِمَا ثَالِثاً وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ تَابَ۔ (اگر ایسا ہوتا کہ فرزند آدم کے لیے مال سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوتیں تو پھر وہ تیسری کی بھی تمنا کرتا اور فرزند آدم کے جوف کو صرف تراب ہی بھر سکتی ہے اور جو توبہ کرے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے) پھر اس حکم کو اٹھالیا گیا اور انس سے اس طرح روایت ہے انصار میں سے ستر افراد جو بئر معونۃ کے نزدیک شہید ہوئے ان کے متعلق ہم نے کتاب میں اس طرح پڑھا جو ہماری قوم سے ہم تک پہونچی تھی إِنَّا لَقِينَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَأَرْضَانَا (ہم نے اپنے رب سے ملاقات کی وہ ہم سے راضی ہوا اور اس نے ہمیں پسندیدہ قرار دیا) پھر یہ آیت اٹھالی گئی۔

ابوعبید نے کہا ہے: نَنْسَاهَا کے معنی ہیں ہم اسے گذرنے دیتے ہیں ہم اسے منسوخ نہیں کرتے۔

ترکیب:

مَا نَنْسَخْ میں مَا اسم ہے جو إِنْ کا قائم مقام ہے اور وہ محلاً منصوب ہے نَنْسَخْ کی وجہ سے اور مَا کا

مقدم ہونا لازم ہے اگرچہ وہ مفعول ہے اور مفعول کو فاعل کے بعد ہونا چاہئے۔اس کے مقدم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حرف شرط کا نائب ہے جو صدارت طلب ہوتا ہے (یعنی جس کا آغاز کلام میں لایا جانا ضروری ہے)

نَنْسَخْ شرط کی وجہ سے مجزوم ہے اور نُنْسِهَا بھی مجزوم ہے اس لئے کہ نَنْسَخْ پر معطوف ہے۔نَأْتِ مجزوم ہے اس لئے کہ جزاء ہے۔مِنْ آيَةٍ میں مِنْ تبعیض کے لئے آیا ہے۔کہا گیا ہے کہ زائدہ ہے۔اَلَمْ یہاں پر لفظا استفہام ہے لیکن مراد تقریر (اقرار لینا)

تَعْلَمْ لَمْ کے ذریعہ مجزوم ہے اس لئے کہ حرف استفہام عامل کو عمل کرنے سے نہیں روکتا ہے۔

نظم:

خداوند عالم نے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے: مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ ((اے رسول) اہل کتاب میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا وہ اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر (وحی) نازل کیا جائے اور خدا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص کرلیتا ہے اور خدا بڑا صاحب فضل ہے) اس آیت کے ذریعہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ خداوند عالم ان کی جانب خبر نازل کرنے سے انھیں تنہا نہیں چھوڑے گا جیسا کہ ان کے دشمنوں کی ان کے بارے میں تمنا یہی ہوتی ہے۔اللہ ان پر ہمیشہ وہ چیز نازل کرتا رہتا ہے جو ان کے لیے بہت زیادہ مناسب و موزوں ہوتی ہے۔یہ علی بن عیسیٰ کا قول ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب یہودیوں کو کچھ باتوں کی بنا پر مذمت کی اور انھوں نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملے میں طعن و تشنیع کا قصد کیا تو ان لوگوں نے جو طعن کیا تھا ان میں سے یہ بھی تھا کہ وہ فرماتے ہیں کہ ان کی لائی ہوئی شریعت نے تمام شریعتوں کو منسوخ کردیا ہے تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کی بات کو مسترد کرتے ہوئے اس کے جواز کو بیان کیا ہے۔یہ روایت ابو مسلم سے ہے۔

تفسیر:

نسخ کا مقصد

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ (جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں) ہم محققین کے نزدیک نسخ کے معنی کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اس جملہ کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم کسی آیت کو یا آیت کے حکم کو نہیں اٹھاتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں: ہم کسی آیت کو نہیں بدلتے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے اور جس نے "اَوۡ نُنۡسِهَا" پڑھا اس کے معنی کی دو وجہیں ہیں: النّسی کی لفظ اس سے منقول انسی کی دو قسمیں ہیں:

اول: نسیان کے معنی میں ہے جو ذکر (یعنی یاد) کی ضد ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيۡتَ. (سورۂ کہف، آیت ۲۴) اگر ان شاء اللہ کہنا بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کریں۔

دوم: ترک کے معنی میں ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمۡ. (سورۂ توبہ، آیت ۶۷) انھوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے تو اللہ نے بھی انھیں بھلا دیا۔ یعنی انھوں نے اطاعت ترک کردی تو اللہ نے ان پر رحمت کو ترک کر دیا یا انھیں نجات دلانے کو ترک کر دیا۔

آیت کی پہلی وجہ قتادہ سے مروی ہے، یہ کہ اسے نسیان پر حمل کیا جائے جو ذکر کی ضد ہے، یہ امت کے لیے ممکن ہے کہ انھیں قرأت کے ترک کرنے کا حکم دیا گیا ہو اور وہ طویل زمانہ کے سبب اسے فراموش کر گئے ہوں۔ جبکہ یہ چیز پیغمبرؐ کے لیے ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ یہ چیز نفرت کا باعث ہوگی اسی طرح شیخ طوسیؒ علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور محققین کی ایک جماعت نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت اسے ممکن سمجھا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اس سے نفرت پیدا نہیں ہوتی اس لیے کہ اس کا تعلق مصلحت سے ہے۔ اسی طرح ممکن ہے خداوند عالم حقیقت میں انھیں فراموش کرا دے؛ اگر چہ وہ بڑی تعداد اور جم غفیر کی شکل میں ہوں۔ یعنی نسیان وفراموشی تمام کے قلوب میں انجام دے۔ اگر چہ یہ امر خارق العادۃ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے معجزہ ہوگا۔

جس نے آیت کو نسیان وفراموشی پر حمل کیا ہے جو کہ ذکر کی ضد ہے تو اس نے استدلال کیا ہے اور (نسیان) کو پیغمبرؐ کے لیے ممکن سمجھا ہے۔ اس کا کہنا ہے آیت کی مراد پیغمبرؐ ہیں آیت سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ. (سورۂ اعلیٰ، آیت ۶-۷) (عنقریب ہم آپ کو اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے

نہیں۔مگر جو اللہ چاہے) یعنی بجز اس کے جس کے متعلق اللہ چاہتا ہے کہ آپ فراموش کر جائیں) اس نظریہ کو حسن نے اختیار کیا ہے۔ پھر کہا ''تمھارے پیغمبرؐ کو قرآن پڑھایا گیا پھر وہ اسے فراموش کر گئے'' زجاج نے اس قول کو رد کیا ہے۔ پھر زجاج نے کہا: خداوند عالم نے اپنے اس ارشاد میں پیغمبرؐ کو خبر دی: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (سورۂ اسراء، آیت ۸۶) (اور (اے نبی!) اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ آپ سے لے لیں جو وحی کے ذریعہ ہم نے آپ کو عطا کیا ہے) تاکہ ہم پر اس کے علاوہ بہتان باندھے کہ وہ نہیں چاہتا جس چیز کی اس نے پیغمبرؐ پر وحی کی ہے اسے برطرف کرے۔

ابوعلی الفارسی نے کہا ہے: یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ اس پر حجت قائم کی گئی ہے جس نے نُنْسِهَا کو نسیان سے اختیار کیا ہے (یہ چیز) اس کے باطل ہونے پر دلالت نہیں کرتی جسے ان لوگوں نے اختیار کیا ہے، اور اس کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (سورۂ اسراء، آیت ۸۶) (اور (اے نبی!) اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ آپ سے لے لیں جو وحی کے ذریعے ہم نے آپ کو عطا کیا ہے) یہ اس اعتبار سے ہے جو اس کے لیے روایات اور امتوں کی داستانوں کو روایات اور واقعات سے نسخ کو جائز نہیں سمجھتے۔ اسی طرح جس کی تبدیلی اس پر جائز نہیں اور جو چیز پیغمبرؐ سے فراموش کرادی جاتی ہے وہ ہے جس کا اوامر و نواہی سے منسوخ ہونا جائز ہے اس کو مصلحت پر موقوف قرار دیتے ہوئے نسخ کو جائز سمجھتے ہیں اور ان اوقات میں جن میں (نسخ کرنے میں) زیادہ مصلحت ہو، جو دلالت کر رہا ہے کہ نُنْسِهَا نسیان سے ہے جو ذکر کے برعکس ہے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں: اُبیؓ نے اس طرح پڑھا ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِكَ '' یہ تمام قرأت ثابت ہے جس نے ''نُنْسِهَا'' کو نسیان سے قرار دیا ہے۔

(جملہ امور) کی تائید قتادہ کی روایت کر رہی ہے، قتادہ نے کہا ہے: ایک آیت (دوسری) آیت کے ذریعہ منسوخ ہوتی ہے۔ خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ سے کچھ باتوں کو فراموش کرا دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں نسیان سے مراد ترک ہے جو ابن عباس سے مروی ہے۔ اس اعتبار سے نُنْسِهَا، سے مراد ہے، ہم تمھیں اس کے ترک کرنے یعنی اس پر عمل کو ترک کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس طرح کہا جاتا ہے: نَسِيْتُ (میں نے اسے فراموش کر دیا) جب آپ اسے ترک کر دیتے ہیں۔ اس میں یوں نہیں کہا جاتا ہے: اَنْسِيْتَ ؟ کیا تم نے اسے فراموش کر دیا اور اسے ترک کر دیا؟ اَوْ نُنْسِهَا اَوْ نَتْرُكْهَا کے معنی ہیں ہم تمھیں اس (چیز) کے ترک کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

ابوعلی نے کہا ہے: جس نے اَنْسَیتَ کی تفسیر تَرَکْتَ سے کی ہے اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے اس لیے کہ جب آپ نے فراموش کر دیا بس آپ اسے بھول گئے۔ اس سبب سے علی ابن عیسیٰ نے کہا ہے: اس کی تفسیر مفسرین نے معنی کی تاویل کے اعتبار سے کی ہے اس لیے کہ جب اس کے ترک کا حکم دیا گیا۔ تو بس اسے ترک کر دیا۔ بس اگر یہ کہا جائے کہ جب آیت کا نسخ (یعنی منسوخ) ہونا اس کا ترک کرنا ہے کہ وہ نازل نہ ہو تو اس کے کیا معنی ہیں؟ دونوں کے درمیان کیونکر جمع کیا گیا ہے؟ ترک کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نازل ہی نہ ہو۔ زجاج نے یہ توہم کر کے غلطی کی ہے۔ اس کے معنی اقرار کرنے کے ہیں؛ اسے برطرف نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ ابن عباس نے کہا ہے: ہم اسے ترک کر دیں گے، تبدیل نہیں کریں گے اور ترک کی نسبت قدیم پروردگار کی جانب دی گئی ہے۔ اس طرح مجاز کے اعتبار سے ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۷) (اور انھیں گھٹاٹوپ اندھیروں میں چھوڑ دیا جہاں انھیں کچھ سجھائی نہیں دیتا) وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ (سورۂ کہف، آیت ۹۹) (اور اس دن ہم انھیں اس حال میں چھوڑ دیں گے کہ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں) یعنی ہم نے انھیں اور اسے تنہائی میں چھوڑ دیا۔

جس نے نُنْسَاهَا کی تاخیر کے معنی میں قرأت کی ہے اس میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: ہم اسے تاخیر میں ڈال دیتے ہیں (اس میں تاخیر کر دیتے ہیں) اسے نازل نہیں کرتے اور اس کا بدل نازل کرتے ہیں جو مصلحت میں اس کا قائم مقام ہوتا ہے یا ایسا کرنے میں بندوں کے لیے میں زیادہ بہتری اور اچھائی ہوتی ہے۔

دوم: ہم اسے دوسرے وقت تک کے لیے تاخیر میں ڈال دیتے ہیں اور اس سے پہلے وقت اس کا قائم مقام لے آتے ہیں۔

سوم: تاخیر کے معنی اس طرح ہوں کہ قرآن نازل کیا جائے اس پر عمل اور تلاوت ہو پھر اسے مؤخر کر دیا جائے۔ یعنی منسوخ کر دیا جائے اور اس کی تلاوت اٹھا لی جائے مکمل طور سے اور اسے محو کر دیا جائے فراموش نہ کیا جائے، نہ ہی اس کی تاویل پر عمل کیا جائے۔ جس طرح زر بن حبیش سے روایت کی گئی ہے کہ ابی نے ان سے کہا: تم سورۂ احزاب کی کتنی آیتوں کی تلاوت کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ستر اور بعض آیتیں۔ پھر انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس کی تلاوت کی تو وہ سورہ بقرہ سے زیادہ طولانی تھا۔ ان کی اولاد سے ابوعلی نے کتاب الحجۃ میں (اسے بیان کیا ہے)

چہارم: تاویل کے ذریعہ عمل میں تاخیر کی جائے۔ یہی نسخ ہے اور اس کے تحریر کو باقی رکھا جائے۔ اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس قول کی حکایت مجاہد سے کی گئی ہے کہ اس کی تحریر ثابت رہے گی اور حکم میں تبدیلی واقع ہوگی۔ گذشتہ دونوں وجھوں پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ آخری دو وجھوں کے معنی کی بازگشت نسخ کے معنی کی طرف ہے۔ اس میں کوئی بہتری نہیں ہے، اس لیے کہ تقدیر میں اس کا حاصل مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَنْسَخْهَا ہے۔ یہ بھی درست نہیں ہے۔ پہلی وجہ میں بھی ضعف ہے اس لیے کہ جس چیز کو بندے نہ پہچانتے ہوں، نہ جانتے ہوں، نہ اسے سنا ہو، اس میں تاخیر کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پس قوی ترین دوسری صورت ہے۔

اس کا ارشاد: نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا. (ہم یا تو اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت نازل کر دیتے ہیں) میں دو قول ہیں:

اول: تمھاری آسانی اور سہولت کے لیے اس سے بہتر لیکر آتے ہیں۔ جیسا کہ جہاد کا حکم جو مسلمانوں پر آسان تھا اللہ کے ارشاد گرامی: اَلْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ. یا اسی کے مانند سہولت۔ جس طرح بیت المقدس کے بعد عبادت خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرنا۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔

دوم: ہم دوسرے وقت میں اس سے بہتر لیکر آتے ہیں یعنی یہ مصلحت کے اعتبار سے تمھارے لیے دوسرے وقت میں پہلے وقت سے بہتر ہے یا اسی کے مانند ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (کیا تم نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے) بیان کیا گیا ہے کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: تمام مکلفین سے خطاب ہے۔ مطلب یہ ہے: اے سامع یا انسان تو نہیں جانتا کہ خداوند عالم قرآن کی آیت اور سوروں سے جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کے منسوخ کرنے پر قادر ہے تاکہ وہ منفعت میں منسوخ کا قائم مقام ہو۔

قول اول کے مطابق معنی یہ ہوں گے: اے محمد! کیا تم نہیں جانتے خداوند عالم تمھاری نصرت و مدد پر قادر ہے اور آپ کو آپ کے دشمنوں پر فتح حاصل ہوگی۔ بیان کیا گیا ہے: یہ ہر چیز کو شامل ہے۔ جس کا خیال ہے کہ سنت معلومہ سے نسخ قرآن جائز نہیں ہے، اس نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: خداوند عالم نے اس (آیت) سے بہتر لانے کی نسبت اپنی ذات کی طرف دی ہے اور سنت کی نسبت اس کی جانب نہیں ہوتی حقیقت میں پھر اس نے اس کے بعد ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ضروری

ہے کہ مراد وہ ہو جو خداوند عالم کی قرآن کے معجزہ ہونے سے اس کی قدرت سے مخصوص ہے۔

صحیح یہ ہے کہ قرآن کا سنت مقطوعہ سے منسوخ ہونا جائز و ممکن ہے اور خَيْرٍ مِّنْهَا کے معنی یہ ہیں کہ جو ہمارے دین میں ہمارے لیے اس سے بہتر اور زیادہ نفع بخش ہے کہ ہم اس کے ذریعہ بیشتر ثواب کے مستحق ہوں گے۔ البتہ اس کی نسبت اللہ کی جانب درست ہے اس لیے کہ سنت بھی اس کی وحی اور حکم سے وجود میں آتی ہے۔ پس اس کی جانب نسبت اس کے کلام کے مانند ہے۔

آیت کا آخری (حصہ) اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ آیت کو اس سے بہتر مناسب اور زیادہ نفع بخش پر منسوخ کرنے پر قادر ہے۔ چاہے وہ قرآن ہو یا سنت۔ اس آیت میں دلالت ہے کہ قرآن محدث ہے جو اللہ کا غیر ہے اس لیے کہ قدیم کا منسوخ ہونا درست نہیں ہے اور اس جس کے لیے اس کی مثال قائم کی گئی ہے، اس پر خداوند عالم قادر ہے جو اس کی قدرت میں داخل ہوگا وہ فعل ہوگا اور فعل محدث (حادث) ہی ہو سکتا ہے۔

❀❀❀❀❀

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾
کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کا اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے؟ اور خدا کے سوا نہ تمھارا کوئی سرپرست ہے اور نہ ہی مددگار۔

الفاظ و معانی:

وَلِيٍّ کے معنی کام کو انجام دینے والے اور قائم کرنے والے کے ہیں۔ اسی سے وَلِيُّ عَهْدِ الْمُسْلِمِيْنَ مسلمانوں کا ولی عہد (حاکم) ہے۔ دون اللہ کے معنی ہیں: اللہ کے علاوہ اور اللہ کے سوا۔

نَصِيْرٍ ناصر و مددگار اور طاقت و قوت عطا کرنے والے کے ہیں۔

ترکیب و تفسیر:

اَلَمْ تَعْلَمْ، استفہام تقریری ہے۔ معنی میں ایجاب کی تفسیر کی گئی ہے۔ گویا ارشاد ہوتا ہے (آپ حقیقت سے واقف ہیں)

اس کے ذریعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے اگرچہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لیکن مراد آپؐ کی امت ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ (اے نبی! اگر آپ عورتوں کو طلاق دیں)

گویا کہا جارہا ہے: اے انسان کیا تو نہیں جانتا ہے کہ آسمانوں اور زمین پر اللہ کی حکومت واقتدار ہے اس لیے کہ اللہ نے دونوں (آسمانوں اور زمین) اوران میں موجود تمام چیزوں کو خلق فرمایا ہے۔ وَمَا لَكُمْ، کہا گیا ہے۔

آیت میں خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ خطاب میں اس کے امر کی بزرگی واہمیت اور قدر وعظمت کے پیش نظر ضمیر جمع لائی گئی ہے۔ جس کا کہنا ہے کہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین (دونوں) سے ہے یا فقط مومنین سے ہے تو معنی ہوں گے (اے لوگو! کیا تم نہیں جانتے تمھیں کیا ہو گیا ہے) مِّن دُونِ اللَّهِ خدا کے سوا، مِن وَلِيٍّ "تمھارے امر کا نگراں، سرپرست، وَلَا نَصِيرٍ، اور نہ ہی تمھارا کوئی مددگار ہے جو تمھاری نصرت کرے۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ۗ وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۱۰۸﴾

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم بھی اپنے رسول سے ویسے ہی (بے تکے) سوالات کرو جس طرح سابقہ زمانے میں حضرت موسیٰ سے کیے گئے؟ اور جس شخص نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

الفاظ ومعانی:

سُؤَال یہ ہے کہ اس شخص کا امر طلب کرنا جو طلب کے مفہوم سے آشنا ہو۔

لفظ سَوَاء (مد کے ساتھ) تین اقسام پر مشتمل ہے:

قَصْد اور عَدْل، میانہ روی اور اعتدال۔

اور بمعنی وَسَط (درمیان) اللہ تعالیٰ کے قول إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ (سورۂ دخان، آیت ۴۷) جہنم کے درمیان میں لے جاؤ۔

اور غَيْر کے معنیٰ ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: أَتَيْتُ سِوَاكَ۔ میں تمھارے علاوہ کسی اور کے پاس

آیا ہوں۔

اور اس آیت میں ضَلَّ کے معنیٰ استقامت سے چلے جانا ہے۔ یعنی وہ دائیں بائیں چلا گیا۔

اَلسَّبِیۡل، اَلطَّرِیۡق اور اَلۡمَذۡھَب ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں یعنی راستہ۔

ترکیب:

اَمۡ منقطعہ ہے اس لئے کہ اَمۡ کی دو قسمیں ہیں: متصلہ اور منقطعہ۔

اَمۡ متصلہ ہمزہ استفہام کے معادل ہوتا ہے۔ یہ ان چیزوں کو منتشر اور جدا کر دیتا ہے جن کو اَیٌّ جمع کرتا ہے جس طرح اَوۡ جدا کر دیتا ہے ان چیزوں کو جسے آحَد نے جمع کیا ہو جیسے: اِضۡرِبۡ اَیَّھُمۡ شِئۡتَ زَیۡدًا اَمۡ عَمۡرًا اَمۡ بَکۡرًا (تم جس کو چاہو مارو چاہے زید کو مارو یا عمرو کو یا بکر کو نیز اِضۡرِبۡ اَحَدَھُمۡ زَیۡدًا اَمۡ عَمۡرًا اَوۡ بَکۡرًا (کسی ایک کو مارو زید یا عمر کو یا بکر کو)

اَمۡ منقطعہ صرف جملہ کے بعد واقع ہوتا ہے اس لئے کہ وہ بَلۡ اور ہمزہ استفہام کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: اِنَّھَا لَاِبِلٌ اَمۡ شَاۃٌ۔ گویا انہوں نے اس طرح کہا ہے: بَلۡ اَھِیَ شَاۃٌ اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ کی تقدیر یہ ہے کہ بَلۡ اَتُرِیۡدُوۡنَ۔ اخطل کا شعر ہے:

کَذَبَتۡکَ عَیۡنُکَ اَمۡ رَاَیۡتَ بِوَاسِطٍ غَلَسَ الظَّلَامِ مِنَ الرَّبَابِ خَیَالَا

اَنۡ تَسۡئَلُوۡا: موصول وصلہ، محلاً منصوب ہیں اس لئے کہ تُرِیۡدُوۡنَ کا مفعول ہے۔ کَمَا میں کاف حرف جر ہے اور مَا حرف موصول ہے۔

سُئِلَ مُوۡسٰی جملہ فعلیہ، مَا کا صلہ اور موصول وصلہ کاف کی بنا پر مجرور ہے اور کاف تَسۡئَلُوۡا سے متعلق ہے۔ جار مجرور مصدر (مفعول مطلق) کی بنا پر محلاً منصوب ہے مِنۡ قَبۡلُ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ سُئِلَ کا ظرف ہے مَنۡ اسم شرط ہے مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے۔

فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ میں فاء محلاً مجزوم ہے اس لئے کہ شرط کا جواب اور معنیٰ حرف شرط جو مَنۡ کے اندر پایا جاتا ہے دونوں جملے شرط و جزاء کے ساتھ محلاً مرفوع ہے مبتدا کی خبر ہے۔

شان نزول:

آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔ ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ رافع بن حرملہ اور وہب بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ہمارے لیے ایسی کتاب لایئے جو ہم پر آسمان سے نازل ہو، جسے ہم پڑھیں۔ ہمارے لیے نہریں جاری کیجیے! تو ہم آپؐ کی پیروی اور تصدیق کریں گے۔ پس خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت میں مشرکین عرب مراد ہیں، جنھوں نے سوال کرتے ہوئے کہا: وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (سورۂ اسراء، آیت ۹۰-۹۱-۹۲)

(اور انھوں نے کہا: ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ زمین کو شگافتہ کر کے ہمارے لیے چشمہ جاری نہ کریں۔ یا یہ کہ آپ کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو اور آپ ان کے درمیان نہریں رواں کر دیں۔ اور جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرادیں یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو ہمارے روبرو لے آئیں)

سدی نے بیان کیا ہے: عربوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا کہ وہ اللہ کو ان کے لیے لے کر آئیں تاکہ وہ اسے آمنے سامنے اور ظاہر بہ ظاہر دیکھ سکیں۔ مجاہد نے بیان کیا ہے کہ قریش نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپؐ ان کے لیے کوہ صفا کو سونے کا بنا دیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں (اور فرمایا) لیکن یہ تمھارے لیے قوم عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مائدہ کی مانند ہوگا۔ اس طرح وہ اپنے سوال سے پھر گئے۔

ابوعلی الجبائی نے کہا ہے: روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ لوگوں نے مانگ کی کہ ان کے لیے مشرکین کے مانند ذات انواط (ایک درخت تھا جس کی مشرکین پرستش کرتے تھے اور اس پر پھل وغیرہ کھانے کی چیزیں آویزاں کر دیتے تھے) قرار دیں جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (آپ ہمارے لیے معبود بنا دیں جس طرح ان کے لیے معبود ہیں)

تفسیر:

بے بنیاد بہانے

اَمْ تُرِيْدُوْنَ، بلکہ کیا تم چاہتے ہو کہ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ، تم اپنے رسول (یعنی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے یہ سوال کرو، كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے (حضرت) موسیٰؑ سے سوال کیا تھا، مِنْ قَبْلُ، اس سے پہلے من گھڑت باتیں اور محال باتیں۔

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ، (اور جس شخص نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا) یعنی جس نے اللہ کی تصدیق اور اس کی آیتوں کے اقرار کو اللہ اور اس کی آیات کے انکار سے تبدیل کر لیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر محال و ناممکن چیزیں (بذریعہ سوال) پیش کیں اور ان سے لایعنی (بے مطلب و مقصد) سوالات کیے برہان کے ذریعہ حق واضح ہو جانے کے بعد تو وہ شخص سیدھے راستے سے بھٹک گیا یعنی وہ درمیانے راستے کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا اور کہا گیا ہے: راہِ استقامت سے ہٹ گیا اور کہا گیا کہ وسطِ طریق سے دور چلا گیا اس لئے کہ راستے کا درمیانی حصہ اس کے اطراف سے بہتر ہوتا ہے۔

نظم:

اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب خداوند عالم نے آنے والی آیتوں پر اور منسوخ آیتوں پر سابق میں ان کی تدبیر سے متعلق دلیل پیش کی تو ان کے لیے اس چیز کو اختیار کیا جو ان کے لیے ہر حال میں بہتر اور مناسب تھی اور فرمایا: تم اس چیز پر کس طرح راضی ہو سکتے ہو اور تم محال کو کس طرح اختیار کر سکتے ہو جب کہ خداوند عالم نے تمھارے لیے اس چیز کو منتخب کیا ہے جس میں تمھاری مصلحت ہے۔ جب کوئی آیت آتی ہے جس سے دلیل و حجت قائم ہوتی ہے تو کسی کو بھی اس پر اعتراض کرنے اور اس کے برخلاف رائے زنی کرنے کا حق نہیں رہتا۔ اس لیے کہ برہان و دلیل کے صحیح ہونے کے بعد ایسا کرنا سرزنش اور مذمت کا باعث ہے۔

❀❀❀❀❀

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۹﴾

(مسلمانو!) اہل کتاب میں سے اکثر لوگ اپنے دلی حسد کی وجہ سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ایمان قبول کرنے کے بعد تمھیں کافر بنا دیں اور (لطف کی بات یہ ہے کہ) ان پر حق واضح ہو چکا ہے پس تم ان کو معاف کردو اور ان سے درگزر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا کوئی اور حکم بھیج دے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

الفاظ و معانی:

حَسَد کے معنی محسود الیہ (جس سے حسد کیا جائے) سے زوال نعمت چاہنا ہے یا اس کی نعمت سے ناپسندیدگی اور ناراحتی کا اظہار کرنا ہے اور یہ ارادہ کرنا کہ وہ نعمت اسی کے لیے ہو جائے۔ کبھی دوسروں سے زوال نعمت کی تمنا کرنا حسد ہوتا ہے اگرچہ حاسد کو خود اس بات کی لالچ نہیں ہوتی کہ وہ نعمت اسے مل جائے لیکن غبطہ (رشک) کہ وہ دوسروں کی طرح نعمت چاہتا ہے اس سے زوال نعمت نہیں چاہتا نہ ہی دوسروں کی نعمت سے اسے ناگواری گزرتی ہے، یہ رشک قابل مذمت نہیں ہے جب کہ حسد لائق مذمت ہے۔

اَلصَّفح، اَلْعَفو اور اَلتَّجَاوُز (گناہوں سے درگزر کرنا) ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔

انسان کی ظاہری کھال کو صَفحَۃ کہتے ہیں اور اسی طرح وہ ہر شے پر صادق آتا ہے۔

صَفَحْتُ عَنْهُ میں نے اس سے درگزر کر دیا، اس بارے میں دو قول ہیں:

اول میں اس کے گناہوں پر اس کا مؤاخذہ نہیں کروں گا۔ وَ اَبْدَيْتُ لَهٗ مِنِّي صَفْحَةً جَمِيْلَةً میں نے اپنی جانب سے اس کے لئے خوبصورت صفحہ ظاہر کر دیا ہے، یعنی خوب صورت طریقے سے درگزر کر دیا ہے۔

دوم اِنَّهٗ لَمْ يَرَ مِنِّي مَا يَقْبِضُ صَفْحَتَهٗ، وہ میری جانب سے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھے گا جو اس کی گرفت کرے۔

اور کہا گیا ہے: صَفَحْتُ الْوَرَقَةَ اَيْ تَجَاوَزْتُهَا اِلٰى غَيْرِهَا۔ میں نے ورق گردانی کی یعنی دوسرے صفحہ کی طرف بڑھ گیا۔ اسی سے: تَصَفَّحْتُ الْكِتَابَ، ہے یعنی میں نے کتاب کی چھان بین کی

یا کتاب کی ورق گردانی کی۔ قَدْ يَتَصَفَّحُ الْكِتَابَ مَنْ لَا يُحْسِنُ اَنْ يَقْرَأَهٗ، کبھی کبھی وہ کتاب کی ورق گردانی کرتا ہے جو اسے اچھی طرح پڑھ نہیں پاتا۔

ترکیب:

ارشاد الٰہی: مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ میں مِنْ محذوف کے متعلق ہے گویا اس طرح ہے: فَرِيْقٌ كَائِنُوْنَ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ پس كَثِيْرٌ کی صفت ہوجائے گی۔

مِنْ بَعْدِ ظرف ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے۔ اس میں عامل يَرُدُّوْنَ ہے۔ كُفَّارًا، يَرُدُّوْنَ کا مفعول دوم ہے اس کا مفعول اول يَرُدُّوْنَكُمْ میں كُمْ ہے۔ حَسَدًا کے منصوب ہونے کی دو وجہیں ہیں:

(۱) اس سے پہلے والا جملہ اس فعل پر دلالت کرتا ہے کہ حَسَدًا جس کا مصدر (مفعول مطلق) ہے تو اس طرح فرمایا ہے: حَسَدُوْكُمْ حَسَدًا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ يَتَمَنّٰى لَكَ الشَّرَّ حَسَدًا۔ گویا اس طرح کہا ہے کہ يَحْسُدُكَ حَسَدًا

(۲) مفعول لہ ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: يَرُدُّوْنَكُمْ كُفَّارًا یعنی تم کو کفر کی طرف پلٹا دیں گے حسد کی وجہ سے جیسا کہ آپ کہتے ہیں جِئْتُهٗ خَوْفًا مِّنْهُ میں اس سے ڈر کی بنا پر اس کے پاس آیا۔

مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ جار مجرور وَدَّ كَثِيْرٌ سے متعلق ہے حَسَدًا سے متعلق نہیں ہے کہ اس لئے کہ انسان کا حسد نفس کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

زجاج کے علاوہ دیگر علماء نے کہا ہے کہ بر بنائے تاکید حَسَدًا سے بھی متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا طَائِرٌ يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ کہ اس میں يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ، طَائِرٌ کی تاکید ہے۔

ایک اور وجہ اور صورت ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے خدا کی جانب کفر و معاصی کی نسبت دی ہو اور خدا نے ان کی باتوں کو جھٹلانے کے لئے فرمایا: اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ۔

مَا تَبَيَّنَ میں مَا حرف موصول ہے اور تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ اس کا صلہ ہے اور صلہ اور موصول لفظ بَعْدِ کے مضاف ہونے کی وجہ سے محلاً مجرور ہے۔

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ، اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور دونوں (اَنْ اور فعل محلاً مجرور ہیں حَتّٰى کی وجہ سے، جار مجرور (حَتّٰى يَاْتِيَ) فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا کا مفعول ہے۔

شان نزول:

یہ آیت حیی بن اخطب اور اس کے بھائی ابو یاسر بن اخطب کے بارے میں نازل ہوئی؛ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہ دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب دونوں حضورؐ کی خدمت سے نکلے تو حیی سے کہا گیا کیا: یہ نبی ہیں؟ اس نے کہا: وہ وہ ہیں، اس سے کہا گیا: تیرے پاس ان کے متعلق کیا ہے؟ اس نے کہا موت تک کی دشمنی اور یہ وہی ہے جس نے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب برپا کی۔ یہ روایت ابن عباس سے ہے۔ بیان کیا گیا ہے: یہ آیت کعب بن الاشرف کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ زہری سے مروی ہے۔ بیان کیا گیا ہے: یہ آیت یہودی جماعت کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ یہ حسن سے مروی ہے۔

تفسیر:

ہٹ دھرم حسد کرنے والے

پھر خداوند عالم نے یہودیوں کے راز سے متعلق خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَدَّ، خواہش و تمنا کرتے ہیں، كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، (اہل کتاب کے اکثر لوگ) جیسے حیی بن اخطب و کعب بن الاشرف اور انھیں دونوں کے مانند، افراد کہ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ، اے گروہ مومنین! وہ تمھیں ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹانا چاہتے ہیں، حَسَدًا، اس چیز سے حسد کی بنا پر جسے خداوند عالم نے تمھارے لیے ثواب اور خیر مہیا فرمایا ہے۔

کہا گیا ہے کہ بہت سے اہل کتاب (حسد کرنے والے تھے) اس لیے کہ ان میں بہت کم لوگ عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار وغیرہ کی طرح ایمان لائے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں کا حسد مسلمانوں سے اس لیے تھا کہ (مسلمانوں) کے درمیان نبوت قرار دی گئی تھی، جب کہ ان کے درمیان سے نبوت رخصت ہو چکی تھی اور ان کی ریاست و حکومت کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔

ارشاد الٰہی: مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ، یعنی اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول اور اسلام اللہ کا دین ہے۔ یہ روایت ابن عباس، قتادہ اور سدی سے مروی ہے۔

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا، یعنی ان سے درگزر کرو اور بیان کیا گیا ہے انھیں روانہ کردو۔ یہ لوگ اللہ سے آگے نہیں جا سکتے، نہ ہی اسے عاجز و درماندہ کر سکتے ہیں، ان سے عفو و درگذر کا حکم دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ

اس اعتبار سے مقہور ومغلوب تھے کہ بہت سے مسلمان ان کے خاندانوں اور اقوام میں معزز اور باوقار افراد موجود تھے جو کفار سے انتقام کی قدرت وطاقت رکھتے تھے۔ خداوند عالم نے ان سے درگذر کا حکم دیا اگرچہ وہ برابر سے انصاف لینے پر قادر تھے۔

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یعنی اللہ کا حکم تمھارے لیے ان کے عذاب وعقاب کے متعلق یا ان پر خود (اللہ) کا عذاب پھر ان کے پاس خدا کا حکم آیا ارشاد ہوا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ، (ان سے جنگ کرو جو ایمان نہیں لاتے) ابو علی سے روایت ہے اس کے حکم سے متعلق بیان کیا گیا ہے یعنی آیت قتل کے ذریعہ بنی قریظہ کی اسیری اور بنی نضیر کا جلاوطن کرنا۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ بِاَمْرِهٖ سے قتال وجہاد مراد ہے۔ یہ روایت قتادہ سے ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت ارشاد الٰہی: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، (توبہ، ۲۹: اہل کتاب میں ان لوگوں سے قتال کرو جو لوگ نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ ہی روز آخرت پر ان کا ایمان ہے) سے منسوخ ہوگئی اور اس کے متعلق ربیع وسدی نے کہا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ اس ارشاد کے ذریعہ منسوخ ہوئی ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (سورۂ توبہ، آیت ۵) (تو مشرکین کو جہاں پاؤ انھیں قتل کردو)

امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے حضرت نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاد کا نہ تو حکم دیا گیا نہ ہی اجازت دی گئی، یہاں تک کہ حضرت جبرئیلؑ یہ آیت لیکر نازل ہوئے: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (سورۂ حج، آیت ۳۹) (جن پر جنگ مسلط کی جائے انھیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے)

اس ارشاد: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) میں تین اقوال ہیں:

اول: خداوند عالم انھیں عذاب دینے پر قادر ہے اس لیے کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے یہ ابو علی کا قول ہے۔

دوم: انھیں دین کی دعوت دینے پر قادر ہے، جس چیز کو وہ زیادہ پسند کرتا ہے جو باعتبار حکمت زیادہ موزوں ومناسب ہے، چنانچہ کبھی تو وہ ان سے حکمت کے مطابق درگذر کرنے اور کبھی ان پر عذاب کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

سوم: جب خداوند عالم نے اس ارشاد: فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا، پس تم ان کو معاف کردو اور ان سے درگزر کرو، کے ذریعہ مہلت کا حکم دیا تو ارشاد ہوا خداوند عالم انھیں عذاب کرنے پر قادر ہے یعنی تمھیں ان سے جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے اور آخرت میں خود ان پر عذاب کرے گا۔

❀❀❀❀❀

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اور (پابندی سے) نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اپنی بھلائی کے لیے جو کچھ (خدا کے ہاں) پہلے بھیج دو گے تو اس (کے ثواب) کو اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔ تم جو بھی عمل کر رہے ہو اللہ اس پر نگراں ہے۔

ترکیب:

مَا اسم شرط ہے محلاً مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنیاد پر، تُقَدِّمُوْا شرط ہے۔ مِنْ خَيْرٍ میں مِنْ زائدہ ہے۔ جار و مجرور تُقَدِّمُوْا کا مفعول ہے۔ تَجِدُوْهُ مجزوم ہے اس لئے کہ جزاء ہے۔ شرط اور جزاء میں علامت جزم نون کا ساقط ہونا ہے۔ حرف شرط کے معنی جو مَا میں پائے جاتے ہیں شرط اور جزاء کے ساتھ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر ہے۔

بِمَا تَعْمَلُوْنَ میں مَا اسم موصول ہے یا حرف موصول ہے۔ موصول اور صلہ باء کی وجہ سے محلاً مجرور ہے، بِمَا جار و مجرور بَصِيْرٌ کے متعلق ہے اور وہ اِنَّ کی خبر ہے۔

تفسیر:

جو نیکی بھیجو گے خدا کے پاس پاؤ گے

جب خداوند عالم نے مومنین کو کفار سے درگذر کرنے کا حکم دیا تو اس نے جان لیا کہ یہودیوں اور دیگر افراد سے ان کی شدید عداوت و دشمنی کے باعث یہ امر ان پر گراں ہے۔ پس اس نے نماز اور زکوٰۃ کے ذریعہ اس چیز کے خلاف مدد طلب کرنے کا حکم دیا، ان میں ان کے لیے صبر پر کمک و مدد ہے باوجودیکہ وہ ان دونوں (نماز اور زکوٰۃ) کے ذریعہ اجر و ثواب ذخیرہ کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر اللہ نے ارشاد فرمایا: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، اور تم صبر یعنی روزے اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ، (اور اپنی بھلائی کے لئے جو کچھ (خدا کے یہاں) پہلے بھیج دو گے تو اس

(کے ثواب) کو اللہ کی یہاں موجود پاؤ گے) تم اس کا ثواب اپنے لیے اللہ کے یہاں مکتوب (لکھا ہوا) اور محفوظ پاؤ گے تاکہ وہ تمھیں اس کے بدلہ میں جزا عطا کرے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ خیرات واطاعت کا اجر وثواب نہ ضایع ہوتا ہے، نہ باطل۔نہ ہی حبط (بیکار و برباد) ہوتا ہے اس لیے کہ اگر حبط ہوتا تو وہ اسے نہیں پاتے۔

ارشادِ الٰہی: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ‏ . خداوند عالم پر تمھارے اعمال سے کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔عنقریب وہ تمھیں احسان کی جزا عطا کرے گا جس ثواب کے تم مستحق ہو گے اور برائی (گناہ) کا بھی بدلہ دے گا، جس عذاب کے تم حق دار ہو گے۔ پس ایسے شخص جیسا عمل کرو جس کو اس کی جزا اور بدلہ کا یقین ہو جس کے عمل سے اس (خدا) پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ آیت وعد (جنت کی بشارت دینے) اور وعید (عذاب سے ہوشیار کرنے) پر دلالت کر رہی ہے اگر چہ وہ لفظ میں خبر ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالُوۡا لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَـنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى‌ؕ تِلۡكَ اَمَانِيُّهُمۡ‌ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۱۱﴾

اور انھوں نے کہا کہ جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہو یا عیسائی ہو۔ یہ ان کی بیجا آرزوئیں ہیں۔ (اے رسول) آپ کہہ دیجیے اگر تم سچے ہو تو ثبوت پیش کرو۔

الفاظ و معانی:

لفظ هُوۡد کے بارے میں تین اقوال ہیں:

اول: هَائِد کی جمع ہے جیسے عَائِذ کی جمع عُوۡذ اور عَائِط کی جمع عُوۡط۔ هُوۡد جمع ہے مذکر و مؤنث دونوں کے لئے۔ هَائِد توبہ کرنے والے اور حق کی جانب پلٹنے والے کو کہتے ہیں۔

دوم: هود مصدر ہو جو واحد اور جمع کی صلاحیت رکھتا ہے جس طرح: رَجُلٌ فَطۡرٌ قَوۡمٌ فَطۡرٌ وَ رَجُلٌ صَوۡمٌ وَ قَوۡمٌ صَوۡمٌ ہے۔

سوم: مراد: اِلَّا مَنۡ كَانَ يَهُوۡدًا ہے گویا اس سے یائے زائدہ کو حذف کر دیا گیا ہو۔

بُرۡهَان، حُجَّة ،دَلَالَة اور بَيَان کے ایک ہی معنی ہیں جس سے استدلال کرنا ممکن ہو اور فاعل کا

دلالت کرنے کا قصد و ارادہ بھی ہو۔علی بن عیسیٰ نے دلالت و برہان کے درمیان فرق کیا ہے۔ان کا کہنا ہے: دلالت سے فقط معنیٰ کی خبر دی جاتی ہے (یعنی دلالت معنیٰ کے بارے میں خبر دیتی ہے) دوسرے معنیٰ کی گواہی نہیں دیتی جب کہ برہان اس طرح نہیں ہے چونکہ یہ معنیٰ کا بیان ہے اور دوسرے معنیٰ کی خبر دینا ہے اس فرق میں نزاع کیا گیا ہے، کہا گیا ہے یہ فقط دعویٰ ہے۔

ترکیب:

قَالُوْا جملہ فعلیہ ہے، اَلْجَنَّةَ ظرف مکان ہے لَنْ يَّدْخُلَ کے لئے اِلَّا اس آیت میں نفی کو توڑنے کے لئے ہے۔مَنْ موصولہ ہے اور وہ اپنے صلہ کے ساتھ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہ يَدْخُلَ کا فاعل ہے۔ لَنْ يَّدْخُلَ اپنے مابعد کے ساتھ قَالُوْا کا معمول ہے۔اِنْ حرف شرط ہے اس کا جواب محذوف ہے کہ دراصل اس طرح ہے: اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَأْتُوْا بُرْهَانَكُمْ۔

تفسیر:

جنت کو صرف اپنی بتانے والے

پھر خداوند عالم نے یہودیوں کی بعض باتوں اور ان کے بعض باطل دعووں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى، اور انھوں نے کہا کہ جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہو یا عیسائی ہو۔یہ اختصار کے ساتھ ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے یہودی کہتے ہیں: یہودیوں کے سوا کوئی دوسرا ہرگز داخل جنت نہیں ہوسکتا اور نصاریٰ کہتے ہیں، نصاریٰ کے علاوہ کوئی دوسرا ہرگز جنت میں نہیں جائے گا۔

اس مقام پر كَانَ کو واحد لایا گیا ہے۔اس لیے کہ لفظ مَنْ کبھی واحد کے لیے آتا ہے، کبھی جماعت کے لیے۔ہم بیان کر چکے ہیں کہ کلام اس تقدیر پر مقدر (معین) ہے۔اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ نہ یہودی عیسائیوں کے جنت میں جانے کی بات کہیں گے اور نہ عیسائی یہودیوں کے جنت میں جانے کی، بلکہ یہاں پر معنیٰ میں خلل ڈالے بغیر ایجاز اور اختصار سے کام لیا گیا ہے، اس لئے کہ شہرت حال مزید وضاحت سے بے نیاز کردیتی ہے۔اسی کے مانند حسان بن ثابت کا قول ہے:

أَمَنْ يَهْجُو رَسُولَ اللهِ مِنْكُمْ

وَ يَمْدَحُهُ وَ يَنْصُرُهُ سَوَاءٌ

(کون ہے تم میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو و مذمت کرے جب کہ (کائنات کا ذرہ ذرہ) ایک ساتھ برابری کی بنیاد پر ان کی تعریف و نصرت کر رہا ہے۔ جس کی تقدیر ہے کون ہے جو اس کی مدح و نصرت کر رہا ہے؟)

جب لفظ واحد ہو تو پہلے کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے۔ گویا اس طرح ہوگا جیسا کہ ایک جماعت کی طرف سے خبر دی جارہی ہے، جس کی حقیقت بعض متفرقین کی جانب سے ہوتی ہے۔

اور اللہ کا قول: تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ، یہ ان کی بیجا آرزوئیں ہیں۔ یعنی یہ جھوٹی تمنائیں ہیں وہ اللہ سے جو تمنائیں کر رہے تھے۔ یہ قتادہ اور ربیع سے مروی ہے۔

اور کہا گیا ہے: أَمَانِيُّهُمْ سے مراد أَبَاطِيلُهُمْ ہے یعنی بے بنیاد باتیں۔ یہ قریش کی زبان میں ہے۔ یہ بات مؤرج نے کہی ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم ہے: تِلْكَ أَقَاوِيلُهُمْ وَ تِلَاوَتُهُمْ - یہ ان کی باتیں اور ان کی تلاوت ہے، ان کے قول کی بنیاد تمنی یعنی تلاوت۔

اور کبھی عربی زبان میں أَمَانِيُهُمْ بغیر تشدید کے بھی آیا ہے لیکن أَمَانِيُّهُمْ تشدید کے ساتھ افضل ہے۔

قُلْ، اے محمد! هَاتُوا، حاضر کرو اور لاؤ، یہ حکم نہیں بلکہ انھیں عاجز و درماندہ کرنا اور انکار ہے جس کے معنی ہیں جب تمھارے لیے ایسا برہان و دلیل کا پیش کرنا ممکن نہیں جو تمھاری گفتگو اور کلام کو صحیح ٹھہرائے تو جان لو کہ یہ باطل اور فاسد ہے۔ بُرْهَانَكُمْ اپنی دلیلیں۔ یہ حسن و مجاہد اور سدی کا قول ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اگر تم سچے ہو) اپنے اس قول میں کہ جنت میں ہرگز ہرگز داخل نہیں ہوسکتا مگر یہ کہ یہودی ہو یا نصرانی۔

اس آیت میں تقلید کے فاسد ہونے پر دلیل ہے کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا اگر تقلید جائز ہوتی تو انھیں اپنی باتوں پر برہان و دلیل لانے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح آیت دین میں بحث و مباحثہ اور حجت (پیش کرنے) پر دلالت کر رہی ہے۔

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ہاں! البتہ جس شخص نے اللہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور وہ اچھے کام بھی کرتا ہے تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے یہاں اجر موجود ہے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

الفاظ و معانی:

اَسْلَمَ: دو معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے:

اول: اَسْلَمَهٗ اِلٰى كذا، اسے اس کے حوالہ کر دیا۔ آپ کہتے ہیں: اَسْلَمْتُ الثَّوْبَ اِلَيْهِ، یعنی میں نے کپڑا اس کے حوالے کر دیا۔

دوم: اَسْلَمَ لَهٗ یعنی اس کے لیے مخلص ہونا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: رَجُلًا سِلْمًا لِرَجُلٍ یعنی ایک شخص کسی دوسرے کے لیے مخلص ہو گیا۔

اور روایت کی گئی ہے: وَ اَسْلَمْتُ نَفْسِىْ، میں نے خود کو سپرد کر دیا۔ اور اَلْوَجه (چہرہ) ہر شے کا اگلا حصہ جو سامنے نظر آئے اور وَجْهُ الْاِنْسَان کے معنی ہیں اس کی زندگی سے بھی ہیں اور کہا جاتا ہے: وَجْهُ الْكَلَامِ کلام کا چہرہ، انسان کے چہرہ سے تشبیہ دیتے ہوئے اس لئے کہ وہی پہلے ظاہر ہوتا ہے اور اسی سے اس کو پہچانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: هٰذَا وَجْهُ الرَّأْىِ یعنی اس سے آغاز اور ابتدا اور پہچان ہوتی ہے۔ ہر چیز کا چہرہ وہ ہے جس کا سب سے پہلے آغاز ہو۔ اپنے ظہور کے ذریعہ ظاہر ہو اس کے بعد تک۔ عرب وَجْهُ الشَّیْءِ بول کر خود اس چیز کو مراد لیتے ہیں البتہ وہ اس لفظ کے ذریعہ اشرف حصہ کا ذکر کرتے ہیں اور انھوں نے اس بات پر اس آیت سے دلیل پیش کی ہے: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سورۂ قصص، آیت ۸۸) ہر شے ہلاک ہو جانے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔ یعنی تمھارا پروردگار باقی رہے گا۔

ترکیب:

بَلٰى استفہام کے جواب میں آتا ہے مثلاً یہ ارشاد الٰہی: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى، (کیا میں تمہارا

پروردگار نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: ہاں) گویا وہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ: اَمَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اَحَدٌ تو یہ ہوتا کہ جنت میں داخل ہوگا؟ جواب آیا: بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (ہاں! البتہ جس شخص نے اللہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا) اس لئے کہ جو بات گذر چکی ہے وہ اس سوال کا تقاضا کرتی ہے اور تکذیب کے انکار کا جواب سننے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے آپ کا یہ کہنا کہ مَا قَائِمٌ زَيْدٌ (زید کھڑا نہیں ہے) دوسرا شخص کہے: بَلٰی قَدْ قَامَ (بلکہ وہ کھڑا ہوا ہے) یہاں پر تقدیر کلام وہ چیز ہے جسے گمان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (جنت میں صرف یہود اور نصاریٰ داخل ہوں گے بلکہ جو مسلمان ہوا اور اس نے نیکی کی وہ جنت میں داخل ہوں گا)

مَنْ اَسْلَمَ میں مَنْ ممکن ہے کہ موصول ہو اور ممکن ہے کہ شرط کے لئے ہو اگر موصول ہے تو اَسْلَمَ صلہ اور اگر شرط کے لئے ہے تو محلاً مجزوم ہے اس لئے کہ شرط ہے یا مَنْ مبتدا ہے اور فَلَهٗ اَجْرُهٗ میں فاء جزاء کے لئے ہے اور لَهٗ محذوف سے متعلق ہے محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ اَجْرُهٗ کی خبر ہے۔ مبتدا اپنی خبر کے ساتھ مل کر محلاً مجزوم ہے۔ مَنْ جس چیز کو لئے ہوئے ہے اس میں حرف شرط کے معنیٰ ہیں۔ وہ اپنی شرط اور جزاء کے ساتھ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر ہے۔

اگر مَنْ موصول ہے تو مَنْ اَسْلَمَ کے ساتھ مبتدا ہے اور فاء اپنے بعد والے جملہ کے ساتھ اس کی خبر ہے۔

عِنْدَ رَبِّهٖ ظرف مکان ہے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے کہ اصل اس طرح ہے: كَائِنًا عِنْدَ رَبِّهٖ اس میں عامل محذوف ہے جس سے لام متعلق اور ذوالحال اس میں مستتر ضمیر ہے۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ محلاً منصوب ہے حال ہونے کی بنا پر خداوند عالم نے فَلَهٗ اَجْرُهٗ کو مفرد ذکر کیا ہے اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ فرمایا ہے۔ (جمع) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ مفرد سے جمع کا ارادہ کیا ہے پس ایک بار لفظ پر حمل کیا ہے اور ایک بار معنیٰ پر۔

تفسیر:

جنتی بننے کا بنیادی معیار

پھر پروردگار نے یہود و نصاریٰ کی باتوں تردید کرتے ہوئے فرمایا: بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (ہاں جس شخص نے اللہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا) بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو اللہ

کے لیے خالص کر دے، تا کہ اس کی رضا کا راستہ اختیار کرے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اپنے چہرہ کو خدا کی اطاعت کی جانب متوجہ کر لے اور کہا گیا ہے کہ اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دے۔

بیان کیا گیا ہے کہ امر خدا کے سامنے تسلیم ہو جائے، اللہ کے حضور انکساری اور تواضع سے پیش آئے، اس لیے کہ حقیقت اسلام خضوع اور اطاعت ہے۔

وَجۡہٗ یعنی چہرہ کو مخصوص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ جب (انسان) سجدہ کے لیے چہرہ جھکاتا ہے تو دیگر تمام اعضا سے بخل نہیں کرتا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ، دراں حالے کہ وہ عمل کے اعتبار سے نیکوکار ہو۔

فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ یعنی اس کے عمل کی جزا اللہ کے یہاں ہے۔

وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ، اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کے لئے نہ خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ یہ اس قول کا ظاہر ہے کہ اہل جنت کے لیے آخرت میں نہ خوف ہوگا نہ ہی حزن وملال۔ البتہ وہ قول کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو خوف پہلے تو ہوگا پھر وہ خوف سے باہر آئیں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اعمال کی جزا کے فوت ہونے سے خوف زدہ نہیں ہونگے۔ اس لیے کہ انھیں اپنے اعمال کے (ضائع) فوت نہ ہونے پر اطمینان ہوگا۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَىْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا مذہب کچھ ٹھیک نہیں ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی کا مذہب درست نہیں حالاں کہ دونوں فریق کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہیں اور اسی قسم کی باتیں وہ (عرب کے مشرکین) کیا کرتے ہیں جو خدا کے احکام سے نا آشنا ہیں تو جس بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اللہ ان کے درمیان اس کا فیصلہ روز قیامت کر دے گا۔

الفاظ و معانی:

قِيَامَة مصدر ہے لیکن یہ ایک خاص وقت کے لیے عَلَم قرار دیا گیا ہے۔ جس میں خداوند عالم مخلوقات کو دوبارہ زندہ کرے گا اور سب میدان حشر میں جمع ہوں۔ اس کا فعل اور مصدر اس طرح ہے: قَامَ يَقُوْمُ قِيَامًا وَ قِيَامَةً مانند عَادَ يَعُوْدُ عِيَادًا وَ عِيَادَةً۔

ترکیب:

وَهُمْ يَتْلُوْنَ: جملہ ہے جو مبتدا اور خبر سے مل کر بنا ہے۔ منصوب ہے حال ہونے کی بنا پر اور اس میں عامل قَالَتْ اور ذوالحال اَلْيَهُوْدُ وَ النَّصَارٰى ہے۔

كَذٰلِكَ میں کاف يَتْلُوْنَ سے متعلق ہے یا قَالَ الَّذِيْنَ سے متعلق ہے گویا اس طرح ہے: وَ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ كَتِلَاوَتِكُمْ (وہ کتاب کی تلاوت کرتے ہیں تمہارے تلاوت کرنے جیسی یا یہ کہ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ وَ هُمُ الْمُشْرِكُوْنَ كَقَوْلِ الْيَهُوْدِ وَ النَّصَارٰى (جو لوگ نہیں جانتے ہیں اس حالت میں کی وہ مشرک ہیں انہوں نے یہود و نصاریٰ جیسی بات کہی)

مِثْل مصدر محذوف (مفعول مطلق نوعی) کی صفت ہے گویا اس طرح کہ قَوْلاً مِّثْلَ قَوْلِهِمْ۔

شان نزول:

ابن عباس نے بیان کیا: جب نصاریٰ نجران کا وفد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں وارد ہوا تو یہودی علماء نے آنحضرتؐ کے حضور اختلاف کیا۔ رافع بن حرملہ نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت سے انکار کرتے ہوئے کہا: تمھاری کیا حقیقت ہے؟ اور انجیل سے بھی انکار کر دیا۔ پھر نجران کے ایک شخص نے کہا: یہودیوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس طرح اس نے حضرت موسیٰ کی نبوت اور تورات کا انکار کر دیا۔ پس خداوند عالم نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

تفسیر:

خودخواہی سے پیدا ہونے والے اختلافات

پھر خداوند عالم نے اہل کتاب کی اپنی اپنی کتابوں کی تلاوت کے باوجود ان کے درمیان اختلاف کو بیان فرمایا: وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ، اور یہودی کہتے ہیں: نصاریٰ کا مذہب کچھ ٹھیک نہیں ہے کہ انھوں نے نصرانیت کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی کا مذہب درست نہیں ہے کہ انھوں نے یہودیت کو دین کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے۔ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ، حالانکہ دونوں فریق کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہیں یعنی اسے پڑھتے ہیں۔ اس میں دو وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: اس جملہ میں شبہ کا حل پیش کیا گیا ہے۔ صرف کتاب کی تلاوت ٹھکرانے اور رد کرنے میں معتبر نہیں ہے جب تک اپنے انکار پر برہان و دلیل پیش نہ کرے۔ ملت اسلام میں اہل کتاب کے انکار سے شبہ وارد نہیں ہوسکتا جبکہ اہل کتاب میں سے ہر فریق اپنے پاس موجود کتاب کی بنا پر دوسرے کو رد کرتا ہے۔ پھر خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ ان کا راستہ اور طریقہ کار مشرکین عرب کے مانند ہے، جو کتاب سے ناواقف ہیں اور دین اسلام سے انکار اور رد کے سلسلہ میں ان لوگوں کی طرح ہیں جن کے پاس کتاب ہی نہیں ہے۔

دوم: اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے بربنائے عناد اور دشمنی اس چیز سے انکار کیا ہے ان کی مذمت کی گئی ہے جبکہ اہل کتاب میں سے معاند و دشمن اس سے دفاع کرنے میں اس سے جاہل و ناواقف کے مساوی

ہے۔ پس ان کے علم نے انھیں کوئی نفع نہیں پہونچایا۔

اس کا ارشاد: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ، (اور اسی قسم کی باتیں وہ (عرب کے مشرکین) کیا کرتے ہیں جو خدا کے احکام سے نا آشنا ہیں) یعنی مشرکین عرب کے جہلاء جن کے پاس کتاب نہیں ہے انھوں نے اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب سے ایسی بات کہی جبکہ ان کے پاس دین سے متعلق کوئی چیز نہیں ہے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے سے کہا تھا۔ یہ سدی اور مقاتل کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی یہ ہیں کہ مشرکین عرب نے کہا تھا کہ تمام انبیاء اور ان کی امتیں کسی چیز (یعنی دین) پر نہیں ہیں اور غلطی پر ہیں۔ اے گروہ یہود! انکار میں تمھیں مساوی قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تمام (لوگ) جو نہیں جانتے یہود و نصاریٰ سے پہلے کی امتیں تھیں، توریت اور انجیل سے پہلے قوم نوح اور عاد و ثمود کے مانند جنھوں نے اپنے انبیاء سے کہا: تم کسی چیز پر (قائم) نہیں ہو۔ یہ عطا کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: صحیح ترین قول یہ ہے کہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ، سے یہودیوں کے بزرگان مراد ہیں اور اس ارشاد: وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ سے عہد پیغمبرؐ کے لوگ مراد ہیں؛ اس لیے کہ باطل کرنے والے قول کو باطل قرار دینے کی حکایت کی گئی ہے۔ پس جائز نہیں ہے کہ قول مُبطل کو (قول) مُحِق (جو حق پر ہے) پر عطف کیا جائے۔

ارشاد الٰہی: فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ (تو جس بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اللہ ان کے درمیان اس کا فیصلہ روز قیامت کر دے گا) اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: خدا کا حکم ان کے بارے میں ان تمام کی تکذیب ہوگا اور انھیں جہنم رسید کرے گا۔ یہ حسن کا قول ہے۔

دوم: یہ کہ اللہ کا حکم ان کے بارے میں یہ ہوگا کہ اس ظالم سے جو جھٹلانے والا ہے اور اس کے بارے میں اس قسم کی حجت و برہان نہیں ہے اس سے انصاف حاصل کیا اس مظلوم کے لئے جسے جھٹلایا گیا ہوگا۔

سوم: اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ جو لوگ جنت میں داخل ہو رہے ہیں ان لوگوں کو اس کا مشاہدہ کرایا جائے اور جو جہنم میں جانے والے ہیں انھیں بھی دو بدو دکھلایا جائے۔

اب رہا ان کے درمیان معاہدہ کا حکم تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرما دی ہے جو مسلمانوں کے دلائل سے واضح ہو رہا ہے اور مخلوقات کا عاجز ہونا کہ وہ اس جیسا قرآن لا سکیں۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

❀❀❀❀❀❀

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لیے جانے سے روکے اور ان مسجدوں کی تباہی کے درپے ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے مسجدوں میں آنا مناسب نہیں مگر یہ کہ ڈرتے ہوئے آئیں ان کے لیے تو دنیا میں بھی رسوائی ہے، اور آخرت میں بڑا بھاری عذاب ہے۔

الفاظ ومعانی:

اَلْمَنْعُ و الصَّدُّ و الحَيْلُولَة. مَنْع، صَدّ اور حَيْلُوله باہم مشابہ ہیں۔ اَلْمَنْع کی ضد اَلْاِطْلَاق ہے یعنی آزاد کرنا۔

اَلسَّعْيُ وَ الرَّكْض وَ الْعَدْو باہم مشابہ ہیں اور سعی کی ضد وقف ہے۔ ٹھہر جانا۔ رک جانا۔ فُلَانٌ يَسْعٰى عَلٰى عِيَالِهٖ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ فلاں شخص اپنی عیال کے لئے کماتا ہے اور سَعَى السُّلْطَانُ اس وقت کہتے ہیں جب وہ صدقے کے معاملے کو اپنے ذمے لے لے۔

اَلْخَرَاب وَ الْهَدْم وَ النَّقْص باہم مشابہ ہیں۔

اَلْخَرَبَة: سَعَةُ خَرْقِ الْاُذُن، کان کے اندرونی حصے کی وسعت۔ اَلْخَارِب، چور کو کہتے ہیں۔

ترکیب:

مَنْ محلاً مرفوع ہے اور وہ استفہام (سوال) کے لئے ہے، اَظْلَمُ مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا کی خبر ہے۔ اَنْ يُذْكَرَ منصوب ہے اس لئے کہ مَسَاجِدَ کا بدل ہے اور وہ بھی بدل اشتمال ہے گویا اس طرح ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْ مَسَاجِدِ اللّٰهِ اسْمَهٗ (اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو مساجد میں اللہ کا نام لیئے جانے سے روکے)

یہ بھی ممکن ہے کہ اَنْ یُّذْكَرَ محلاً منصوب ہو اس لئے کہ مفعول لہ ہو گویا اس طرح ہے: كَرَاهَةَ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو مساجد سے منع کرے اس لئے کہ وہ ان میں اللہ کا نام لیئے جانے کو پسند نہیں کرتا)

یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں پر مِنْ حذف ہو یعنی: مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مِنْ اَنْ يُّذْكَرَ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ كَانَ کا اسم ہے۔ کہا گیا ہے کہ مَا كَانَ لَهُمْ میں كَانَ زائدہ ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: مَا لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا ---اس بنا پر اَنْ يَّدْخُلُوْهَا مبتدا ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہو جائے گا۔

اِلَّا حرف استثناء ہے وہ یہاں پر نفی کو توڑ کر مثبت میں بدلنے کے لئے آیا ہے۔ خَآئِفِيْنَ منصوب ہے حال ہونے کی بنا پر یہ خِزْيٌ دو وجہ سے مرفوع ہو سکتا ہے:

(۱) مبتدا

(۲) لَهُمْ کی وجہ سے مرفوع ہے۔

فِى الدُّنْيَا جار مجرور محلاً منصوب ہے اس لئے کہ حال ہے اور ذوالحال ضمیر مستتر در لَهُمْ ہے اسی طرح فِى الْاٰخِرَةِ بھی ہے۔

شانِ نزول:

اس آیت کے مقصود و مراد میں اختلاف ہے: ابن عباس و مجاہد نے کہا ہے کہ وہ روم کے باشندے تھے جنھوں نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اسے برباد کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ حضرت عمر کے دور حکومت میں خداوند عالم نے ان پر مسلمانوں کو غلبہ دیا وہ بیت المقدس میں خوف زدہ حالت میں داخل ہوتے تھے۔ حسن اور قتادہ نے کہا ہے: وہ بخت نصر تھا جس نے بیت المقدس کو برباد کرنا چاہا تھا۔ اس کی مدد نصاریٰ نے کی تھی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے وہ قریش تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم کو مکہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روکا تھا۔ اسی بات کو بلخی، رمانی اور جبائی نے بھی بیان کیا ہے۔ طبری نے اس وجہ کو ضعیف قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ مشرکین قریش نے مسجد الحرام کو برباد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ طبری کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ چونکہ مساجد کی آبادکاری اس میں نماز (قائم کرنے) سے ہوتی ہے اور اس کی تباہی و بربادی اس میں نماز سے روکنے سے ہوتی ہے۔

روایات میں وارد ہوا ہے کہ (مشرکین مکہ) نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ ہجرت کے بعد ان مساجد کو منہدم کر دیا جن میں اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے اور طبری نے کہا ہے کہ آیت اس سے پہلے مذکور اہل کتاب کی مذمت میں نہیں ہے۔ یہ آیت اس وقت اہل کتاب کی مذمت سے مربوط ہوسکتی ہے جب اس سے مراد نصاریٰ اور بیت المقدس کو لیا جائے۔ طبری کی اس بات کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ آیات کے جملہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ میں ان لوگوں کا بھی ذکر ہوا ہے جو اہل کتاب نہیں ہیں اور یہ بہت نزدیک ہے اس لیے کہ کلام کو مذمت کے محل ومقام میں وارد ہوا ہے۔ کبھی کلام یہودیوں کی مذمت میں وارد ہوتا ہے، کبھی نصاریٰ کی مذمت میں اور کبھی بت پرستوں اور مشرکین کی مذمت میں۔

تفسیر:

سب سے بڑا ظالم

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ، اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا یعنی وہ کون شخص ہے جو سب سے زیادہ شدید اور سب سے بڑا ظالم ہے جو روک رہا ہے اللہ کی مسجدوں سے مَنْ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ، کہ ان مسجدوں میں اللہ کا نام لیا جائے۔ اس صورت میں اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس شخص سے بڑھ کر کوئی اور ظالم نہیں ہے جو روک رہا ہے کہ اللہ کی مساجد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لیا جائے اور وہ ان میں جماعت قائم کرنے اور عبادت کو روک رہا ہے۔

اگر مساجد اللہ سے مراد بیت المقدس اور کعبہ لیا جائے تو دونوں کا جمع کرنا ممکن ہے، جس کی دو وجہیں ہیں یا تو سجدوں کے مواضع اور مقامات کے سبب ہے اس لیے کہ مسجد عظیم ہر سجدے کے موضع اور مقام کو کہا جاتا ہے۔ یا اس مساجد کے لفظ میں وہ (مسجد) داخل ہو جسے مسلمان نماز کے لیے تعمیر کرتے ہیں۔ زید بن علی نے اپنے آباء واجداد کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ (مساجد) سے تمام زمین مراد ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ تُرَابُهَا طَهُوْرًا، میرے لیے زمین کو جائے سجدہ اور اس کی مٹی کو طاہر و پاکیزہ قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد الٰہی: وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا، اور ان مسجدوں کی تباہی کے درپے ہو یعنی اس مسجد کی تخریب کے لئے سعی وکوشش کرتا رہا۔

اور تخریب یعنی ہجرت کے موقع پر صاحبان ایمان کا وہاں سے بے دخل کر دینا۔

اور کہا گیا ہے: اس سے مسلمانوں کو اس سے روکنا ہے۔ بے دخل کرنا اور روکنا دونوں جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نماز سے اور اس میں اطاعت کی بجا آوری سے روکنا ہے اور وہ اس کو ویران کرنے کی کوشش ہے۔

ارشاد الٰہی: أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے مسجدوں میں آنا مناسب نہیں مگر یہ کہ ڈرتے ہوئے۔ اس بارے میں اختلاف ہے۔ ابن عباس نے کہا: کوئی نصرانی بیت المقدس میں داخل نہ ہوگا مگر یہ کہ مجرم کی طرح، اسے سزا دی جائے اور اس کا انجام بہت برا ہوگا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

جو اس نظریہ کا قائل ہے تو اس سے مسجد الحرام مراد ہے اور اس نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منادی کو حکم دیا اس نے ندا دے کر کہا: آگاہ ہو جاؤ کہ اس سال کے بعد کسی بھی مشرک کو حج کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی عریاں حالت میں اس گھر (خانۂ کعبہ) کا طواف کرے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مانند ہے: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (سورۂ صف، آیت ۹) تاکہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار گزرے۔

جبائی نے بیان کیا ہے: خداوند عالم نے وضاحت فرما دی ہے کہ مشرکین کو مسجد الحرام اور دیگر مساجد میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے، اگر کوئی شخص کسی مسجد میں داخل ہو تو مسلمان پر اس کو مسجد سے نکالنا واجب ہے۔ مگر یہ کہ وہ کسی اختلاف کو حل کرانے کے لئے مسجد میں موجود حاکم و قاضی کے پاس جائے تو وہ اس بات سے خوفزدہ رہے کہ فیصلہ ہوتے ہی اسے نکال دیا جائے گا اور وہ وہاں اطمینان سے نہ بیٹھے جس طرح مسلمان بیٹھتا ہے۔

شیخ طوسی قدس اللہ روحہ نے فرمایا ہے: یہ قول ہمارے مذہب سے بہت زیادہ مناسب ہے۔ آیت کے ذریعہ اس چیز پر استدلال کرنا ممکن ہے کہ کفار کو کسی بھی صورت میں مساجد میں داخل نہ ہونے دیا جائے خاص طور سے مسجد الحرام میں۔ اس بات پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ مشرکین کو (مسجد الحرام) میں داخل ہونے سے روکا جائے اور انھیں حکومت وغیرہ کرنے کی قدرت نہ دی جائے اس لیے کہ خداوند عالم نے انھیں داخل ہونے سے روکنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (سورۂ توبہ، آیت ۱۷) (مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد (یعنی مسجد الحرام) کو آباد کریں جب کہ وہ خود اپنے کفر کی گواہی دے رہے ہیں)۔

ارشاد الٰہی: فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ، (سورۂ توبہ، آیت ۲۸) (اس سال کے بعد یہ لوگ مسجد الحرام کے نزدیک نہ آنے پائیں)

زجاج نے کہا ہے: خداوند عالم نے اس آیت شریفہ کے ذریعہ باخبر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا معاملہ ان کے تمام مخالفین پر ظاہر و غالب ہے یہاں تک کہ مخالف کا ان کی مساجد میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے مگر خوف کے عالم میں۔ یہ اس کے اس ارشاد کے مانند ہے: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ، گویا ارشاد ہو رہا ہے ان سب کو (مسجد الحرام) میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے، مگر بحالت خوف اس لیے کہ اللہ نے دین کو عزت و شرف بخشا ہے اور مسلمانوں کو غلبہ عطا کیا ہے۔

اس کا ارشاد ہے: لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ، (ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے) بیان کیا گیا ہے کہ اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: ذلت و رسوائی سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ پست ہو کر (یعنی ذلیل و خوار بن کر) اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔

دوم: اگر وہ حالت جنگ میں ہوں اس سے مراد ان کا قتل اور خواتین اور بچوں کا اسیر ہونا ہے اور اگر اہل ذمہ ہوں تو جزیہ (ٹیکس) ادا کرنا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

سوم: ان کی دنیاوی رسوائی مراد ہے اس وقت جب قائم المہدیؑ کا ظہور ہوگا اور قسطنطنیہ فتح ہوگا۔ اس وقت آپؑ ان لوگوں کو قتل کریں گے۔ یہ سدی کا قول ہے۔

چہارم: ان کی ذلت و رسوائی سے مراد یہ ہے کہ انھیں مسجد میں داخلہ سے منع کیا جائے۔ یہ ابو علی کا قول ہے۔

اور اللہ کا قول: وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ، اور ان کے لئے آخرت میں بڑا بھاری عذاب ہے۔ یعنی روز قیامت اللہ تعالیٰ انھیں آتش جہنم میں عظیم ترین عذاب سے دوچار کرے گا جس وقت وہ لوگ ہر ظالم سے بڑھ کر ظلم کرنے والے ہوں گے۔

❀❀❀❀❀

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔ پس جس طرف بھی تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کو پاؤ گے۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

الفاظ و معانی:

اَلْمَشْرِق اور اَلشَّرق دو نام ہیں جہاں سے سورج اور چاند طلوع ہوتے ہیں۔

جب سورج نکلتا ہے تو کہتے ہیں: شَرَقَتِ الشَّمْسُ. اَشْرَقَتْ کے معنی اَضَاءَتْ روشن ہو گیا اور حدیث میں آیا ہے: لَا تَشْرِيقَ إِلَّا فِي مِصْرٍ أَوْ مَسْجِدٍ جَامِعٍ یعنی نماز عید یا تو شہر میں یا مسجد جامع میں بجا لائی جائے اس لئے کہ نماز عید کا وقت طلوع شمس کے بعد ہوتا ہے۔

مَغْرِب اور مَغِيب ہم معنیٰ ہیں اور وہ غروب ہونے کی جگہ ہے۔ کہا جاتا ہے: غَرَبَتِ الشَّمْسُ تَغْرُبُ إِذَا غَابَتْ جب سورج چھپ جائے اور اَصْلُ الْغَرْبِ اَلْحَدُّ وَ التَّبَاعُد اور غروب کے حقیقی معنی حد اور دوری کے ہیں۔ وَ غُرْبَةُ النَّوىٰ بُعْدُ الْمُنْتَهىٰ، منزل کا دور ہو جانا اور غَرْبُ السَّيْف یعنی تلوار کی تیز دھار۔ یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ چلتی ہے اور پلٹتی نہیں۔ اِبْعَاد سے ماخوذ ہے۔ وَالْوَاسِعُ غَنِيّ یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے مقدرات وسیع ہوتے ہیں اور کہا گیا ہے وہ کثیر الرحمۃ ہے۔ سَعَة اور فَسحَة ایک جیسے ہیں۔ اَلسَّعَة کی ضد اَلضِّيق ہے یعنی وسعت کی ضد تنگی ہے اور کہا جاتا ہے: وَسِعَ يَسَعُ سَعَةً وَ اَوْسَعَ الرَّجُلُ إِذَا صَارَ ذَا سَعَةٍ فِي الْمَالِ۔ اگر کوئی شخص مالی اعتبار سے مرفہ الحال ہو تو اسے کہا جاتا ہے: اَوْسَعُ الرَّجُلُ۔

ترکیب:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ کا لام، لام مِلک ہے۔ مشرق اور مغرب کو واحد بیان کیا ہے اس لئے کہ اسے جنس فرض کیا گیا ہے پس یہ جمع پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَهْلَكَ النَّاسَ الدِّيْنَارُ وَ الدِّرْهَمُ، (لوگوں کو جنس دینار و درہم نے ہلاک کر دیا)

اَیْنَ مبنی ہے اس لئے کہ اس میں حرف کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اَیْنَ مبنی بر فتحہ ہے التقاء ساکنین کی بنا پر اس میں شرط کے معنی پائے جاتے ہیں۔

تَوَلُّوا مجزوم ہے شرط کی بنا پر اس کا جواب فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ ہے۔ تَوَلُّوا میں علامت جزم نون کا ساقط ہونا ہے۔ اَیْنَ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ تَوَلُّوا کے لئے ظرف ہے۔ اَیْنَمَا میں مَا وہ ہے جو کلمہ کو جزم کا عمل کرنے کے لئے تیار کرتا ہے اس لئے کہ اس کی جزا اِذْ اور حَیْثُ کے ذریعہ نہیں آتی ہے جب تک اِلَّا کے ساتھ تاء کا اضافہ نہ کردیا جائے جیسے حَیْثُمَا تَکُنْ اَکُنْ و اِذْ تَفْعَلْ اَفْعَلْ یہ نہیں کہا جائے گا: حَیْثُ تَکُنْ اَکُنْ، اِذْ تَفْعَلْ اَفْعَلْ۔

اَیْنَ کا جزم دینا بھی جائز ہے اگر چہ اس پر مَا داخل نہ ہو تب بھی جیسے شاعر کا یہ شعر ہے:

اَیْنَ تَضْرِبْ بِنَا الْعُدَاةُ تَجِدْنَا نَصْرِفُ الْعِیْسَ نَحْوَهَا لِلتَّلَاقِیْ

اس مثال میں شاہد اَیْنَ تَضْرِبْ ہے کہ اَیْنَ بغیر مَا کے ہے تب بھی جزم دے رہا ہے ثُمَّ منصوب ہے اس لئے کہ ظرف مکان ہے اور مبنی بر فتحہ ہے التقاء ساکنین کے سبب اصل میں وہ مبنی ہے اس لئے کہ معرفہ ہے اور اسم میں حرف کے معنی ہیں کہ جس کے ذریعہ معرفہ بنایا جاتا ہے اور عہد ہوتا ہے۔ آپ مشاہدہ کررہے ہیں کہ ثَمَّ صرف ایسے مقام پر استعمال کیا گیا ہے جو آپ کے مخاطب کے لئے مشہور و معروف ہو۔

شان نزول:

اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔ بیان کیا گیا ہے: یہودی بیت المقدس سے کعبہ کی جانب تحویل قبلہ کے منکر تھے، لہٰذا ان کی رد میں یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت ابن عباس سے مروی ہے۔ اسے جبائی نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا: خداوند عالم نے وضاحت فرمادی ہے کہ اس کے لیے اس طرح نہیں ہے کہ وہ ایک سمت و جہت میں موجود ہو اور دوسری جہت میں موجود نہ ہو جیسا کہ مجسمہ (خدا کو جسم والا ماننے والے کو) کہتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی نماز میں کسی بھی طرف رخ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ پھر یہ آیت اس ارشاد: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (تم اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف پھیرلو) کے ذریعہ منسوخ ہوگئی۔

قتادہ نے کہا: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (نماز میں) بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کو اختیار

فرمایا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت سواری پر مستحبی اور نافلہ نماز ادا کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس سمت میں چاہے اس طرف رخ کر کے اس نماز کو ادا کیا جا سکتا ہے؛ جب کہ آپ حالت سفر میں ہوں۔ البتہ فرض نمازوں کے لیے اللہ کا حکم ہے: وَحَیۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ یعنی فرض (نمازوں) کو فقط قبلہ ہی کی جانب رخ کر کے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی روایت ہمارے ائمہ علیہم السلام سے کی گئی ہے۔

ائمہ علیہم السلام نے ارشاد فرمایا ہے: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب خیبر کی جانب روانہ ہوئے اور مکہ سے واپس پلٹے؛ اس وقت آپؐ نے اپنی سواری پر اشاروں سے نماز پڑھی؛ جس طرف آپ کی سواری کا رخ تھا، کعبہ کو آپ نے اپنی پشت پر قرار دیا۔

جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ پر ایک لشکر روانہ فرمایا جس میں میں موجود تھا، تاریکی چھا گئی جس کے سبب ہمیں قبلہ کا علم نہیں ہو سکا۔ ہمارے درمیان موجود ایک گروہ نے کہا: ہم جانتے ہیں قبلہ جانب شمال ہے۔ تمام لوگوں نے نماز ادا کی اور خطوط کھینچ دیے۔ ہم میں سے بعض افراد نے کہا: قبلہ جانب جنوب ہے، پھر انھوں نے چند خطوط کھینچے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور طلوع آفتاب ہو گیا تو وہ خطوط (سمت) قبلہ سے ہٹ کر تھے۔ جب ہم سفر سے واپس پلٹے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی تب خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

خدا ہر جگہ ہے

وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ. (اور مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں) اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم کی ملکیت میں مشرق و مغرب ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم مشرق و مغرب کا خالق اور صانع ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اور اسے مغرب میں غروب کرتا ہے۔

فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ. (پس جس طرف بھی تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کو پاؤ گے) یعنی جس طرف بھی تم اپنا چہرہ (رخ) کرو گے۔ (اس مقام) سے مفعول کو معلوم ہونے کے سبب حذف کر دیا گیا ہے۔ فَثَمَّ یعنی اللہ کا چہرہ (رخ) ہے۔ یعنی اللہ کا قبلہ۔ یہ روایت حسن، مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے۔ وجہ اور

وِجْهَة سے مراد قبلہ ہے۔اسی کے مانند وَزْن اور زِنَة ہے۔عرب جس کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اسے "وَجْه" کہتے ہیں۔شاعر نے کہا:

أَسْتَغْفِرُ اللهَ ذَنْبًا لَّسْتُ مُحْصِيَه رَبَّ الْعِبَادِ إِلَيْهِ الْوَجْهُ وَ الْعَمَل

میں اللہ سے گناہوں کی مغفرت طلب کر رہا ہوں میں جن کا احصا نہیں کر سکتا۔وہ بندوں کا پروردگار ہے اسی کی جانب قصد ہے اور کہا گیا ہے کہ فَثَمَّ کے معنی ہیں کہ اللہ جانتا ہے اور دیکھ رہا ہے۔پس تم اسی کو پکارو چاہے جدھر رخ کرو جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ یعنی دعا کے ذریعہ اس کا ارادہ کرتے اور چاہتے ہیں۔جب جگہ نزدیک ہوتی ہے اسے هُنَا کہتے ہیں اور جب دور ہوتی ہے تو ثَمَّ اور هُنَالِكَ کہا جاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ (ہر شے ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے) یعنی سوائے اس (خدا) کے وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ تمھارا پروردگار باقی رہنے والا ہے۔یہ روایت کلبی سے مروی ہے۔بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں: ثَمَّ رِضْوَانُ اللهِ یعنی وہ وجہ (چہرہ) جو خداوند عالم کی رضا اور خوشنودی کا ذریعہ ہو۔اسی طرح کہا جاتا ہے یہ صواب وحق کا چہرہ ہے۔یہ روایت ابوعلی اور رمانی سے مروی ہے۔

اِنَّ اللهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بے شک اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے) یعنی غنی (بے نیاز و مستغنی) ہے۔یہ روایت ابوعبیدہ سے مروی ہے جس کی تقدیر ہے تمھاری اطاعت سے مستغنی ہے۔تمھارے لیے منفعت چاہتا ہے، رحمت میں وسعت بھی۔

بیان کیا گیا ہے: اسی سبب سے شریعت میں چھوٹ دی گئی ہے۔یہ زجاج کا قول ہے۔کہا گیا ہے: قدرت میں وسعت رکھتا ہے جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے "عَلِيْمٌ" حکمت کی وجوہات سے واقف ہے۔اپنی رحمت کے قرار دینے کے مقام سے واقف ہے جس چیز کا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔بیان کیا گیا ہے: (خدا) تمھاری نیتوں سے واقف ہے کہ کس طرح تم نماز ادا کر رہے ہو اور اسے پکار رہے ہو۔

نظم:

موجودہ آیت کے گذشتہ آیت سے مربوط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تمھیں مساجد کے برباد کرنے والے کی بربادی خدا کا ذکر کرنے سے نہیں روک سکتی جب کہ تم اس کی سرزمین میں ہو۔مشرق ومغرب اور تمام جہات اللہ کے لیے ہیں۔یہ روایت علی بن عیسیٰ سے مروی ہے۔بیان کیا گیا ہے کہ نماز اور مساجد کا ذکر مقدم کیا گیا اس کے

بعد قبلہ اور اس کے احکام کا ذکر ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾
اور ان (یہودیوں) کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے۔ اللہ ان باتوں سے پاک ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات اس کی ملکیت ہیں اور سب کے سب اس کے اطاعت گذار ہیں۔

قرائت:

ابن عامر نے بغیر واؤ کے قَالَ اور بقیہ قراء نے واؤ کے ساتھ قَالُوْا پڑھا ہے۔

حجت:

یہاں پر واؤ کو دو وجہ سے حذف کرنا جائز ہے:

(۱) جملہ کو نیا جملہ مانا جائے اور اسے گذشتہ پر عطف نہ کیا جائے۔

(۲) اس جملہ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا کا گذشتہ جملہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ، سے رابطہ ہے اس لئے کہ جن لوگوں نے کہا کہ خدا نے فرزند بنا رکھا ہے یہ لوگ انہیں لوگوں میں ہیں جن کا ذکر گذر چکا ہے جملہ کے ماقبل سے مربوط ہونے کی بنا پر واؤ سے بے نیاز ہوا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کہ اگر وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ہوتا تب بھی حسن اور بہتر تھا۔

الفاظ و معانی:

قُنُوت کے اصل معنی دوام کے ہیں، پھر اس کا استعمال متعدد وجہوں میں ہونے لگا:

۱۔ اطاعت کے معنی ہیں ارشاد ہوتا ہے: كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ، یعنی مُطِيْعُوْنَ (سب اس کے اطاعت

شعار ہیں)

۲- صلاۃ (نماز) کے معنی میں ارشاد ہوتا ہے: یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ (سورۂ آل عمران، آیت ۴۳) (اے مریم! تم اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھو، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو) یہاں پر طول قیام کے معنی میں ہے۔ جابر ابن عبداللہ نے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سی نماز افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: طُولُ الْقُنُوت، یعنی جس کا قیام طولانی ہو۔

۳- دعا کے معنی میں، صاحب کتاب العین نے کہا ہے: نماز میں قنوت قرأت کے بعد وتر کے آخر میں کھڑے ہو کر دعا کرے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (سورۂ زمر، آیت ۹)

((ایسے شخص کی روش بہتر ہے) یا اس کی جو عبادت گذار ہے رات کے لحات میں سجدہ کرتے ہوئے یا حالت قیام میں وہ آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے)

٤- سکوت کے معنی میں ہے، زید ابن ارقم نے بیان کیا: ہم حالت نماز میں کلام کرتے تھے جب آیت: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۸) (اور اللہ کے آگے نہایت خضوع اور خشوع کے ساتھ کھڑے رہو) نازل ہوئی تو ہم نے کلام کرنا بند کر دیا۔

شان نزول:

یہ آیت کریمہ نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب انھوں نے کہا کہ مسیح تو فرزند خدا ہیں یعنی حضرت عیسیٰؑ کو فرزند خدا کہا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نصاریٰ اور مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب انھوں نے ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہا تھا۔

تفسیر:

یہود، نصاریٰ اور مشرکین کے خرافات

خداوند عالم نے قبلہ کے بارے میں یہودیوں کے قول کی حکایت کرتے ہوئے توحید کے متعلق ان کی

باتوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (اور ان یہودیوں کا یہ کہنا کہ اللہ نے کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے) سبحانہ یعنی اس کی ذات اس سے کہیں بلند ہے وہ کسی کو اپنا فرزند بنائے اور اس کی ذات بری باتوں اور برے صفات جو اس کے شایان شان نہیں ہیں، سے پاک و پاکیزہ ہے۔

طلحہ بن عبید اللہ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ سے ارشاد الٰہی: سُبْحٰنَهٗ کے متعلق دریافت کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: (اس میں) اللہ کی ہر برائی سے پاکیزگی بیان کی گئی ہے بلکہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی موجود ہے سب اسی کا ہے اور یہودیوں کے اس قول 'اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا' (یعنی خدا کے اولاد ہے) کی رد ہے۔ یعنی معاملہ اس طرح نہیں جیسا کہ ان کا گمان ہے۔

بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے) اس کی ملکیت ہے اور فرزند باپ کی ملکیت نہیں ہو سکتا اس لیے کہ بنوت اور ملکیت یکجا جمع نہیں ہو سکتے؛ پس ملائکہ جو کہ آسمانوں میں ہیں اور عیسیٰؑ جو زمین پر ہیں خدا کی اولاد کس طرح ہو سکتے ہیں؟ خداوند عالم نے اس طرح متنبہ اور آگاہ فرمادیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور دیگر مخلوقات اس کی مخلوق اور ملکیت ہیں اور وہ سب کے سب (دیگر) تمام مخلوقات کے مانند ہیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ فعلی اعتبار سے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور فعل جنس فاعل سے نہیں ہو سکتا اور فرزند (اولاد) اپنے باپ کی جنس ہی سے ہوتا ہے، پس جس نے انسان کو اپنا فرزند بنایا اسے اس کی ہی جنس سے ہونا چاہیے!

اس کا ارشاد: كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ، ابن عباس و مجاہد نے کہا ہے: اس کے معنی اطاعت کرنے والوں کے ہیں۔ سدی نے بیان کیا ہے: ہر چیز قیامت تک اسی کی اطاعت کرتی رہے گی۔ حسن نے بیان کیا ہے: ہر ایک اس کی گواہی دیتا رہے گا کہ وہ اس کا بندہ ہے۔ جبائی نے کہا ہے: ہر چیز ایک حالت پر باقی ہے اس میں موجود آثار صنعت کی گواہی دے رہی ہے، اور اس کی ربوبیت پر دلالت کر رہی ہے۔ ابو مسلم نے بیان کیا ہے: ہر چیز اس کی ملکیت اور اس سے مغلوب ہے؛ وہ اس میں جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے کوئی اس سے مانع نہیں ہو سکتا۔

❀❀❀❀❀

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد ہے وہ جس بات کا فیصلہ کرلیتا ہے اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے ''ہوجا'' تو وہ ہوجاتی ہے۔

قرائت:

ابن عامر نے فَيَكُوْنَ نصب کے ساتھ اور بقیہ قراء نے رفع کے ساتھ قرأت کی ہے۔

ترکیب اور حجت:

ابوعلی نے کہا: فَيَكُوْنَ کو نصب دینا صحیح نہیں اس لئے کہ كُنْ اگرچہ صیغہ امر ہے لیکن امر کے معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ اس سے خبر مراد ہے جیسے عربوں کا تعجب میں اَكْرِمْ بِزَيْدٍ کہنا کہ (اَكْرِمْ فعل امر ہے لیکن اس میں امر کے معنیٰ نہیں ہیں مقصود تعجب ہے)

یہاں پر بھی اس امر سے مراد خبر ہے اس لئے کہ جو چیز منفی ہوتی ہے اس کا وجود نہیں ہوتا نہ تو اسے حکم دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے مخاطب قرار دیا جاسکتا ہے گویا اس طرح ہے کہ تَكُوْنُ فَيَكُوْنَ لفظ، لفظ امر ہے جب لفظ كُنْ معنیٰ میں امر نہیں ہے اگرچہ لفظاً صیغۂ امر ہے تو پھر فاء کے بعد فعل کو نصب دینا صحیح نہیں ہے کہ وہ جواب ہو جس طرح اس فعل کو نصب دینا صحیح نہیں ہے جب اس پر مثبت کے بعد فاء داخل ہوتا ہے جیسے آتِيْكَ فَاُحَدِّثُكَ مگر یہ کہ ایسا شعر میں ہوسکتا ہے۔ جیسے یہ شعر ہے:

لَنَا هَضْبَةٌ لَا يَنْزِلُ الذُّلُّ وَسْطَهَا وَ يَأْوِيْ اِلَيْهَا الْمُسْتَجِيْرُ فَيَعْصَمَا

اس شعر میں فَيَعْصَمَا کو مرفوع (میم پر پیش) ہونا چاہئے تھا لیکن ضرورت شعری کی بنا پر منصوب ہوگیا ہے۔

فَيَكُوْنَ کو نصب دینا صحیح نہیں ہے اس پر ایک دلیل یہ ہے کہ وہ فاء کے ذریعہ جواب جزاء کا مضارع ہے پس اِذْهَبْ فَيَذْهَبُ ابن عامر کی قرأت كُنْ فَيَكُوْنُ پر قیاس کرتے ہوئے کہنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے معنیٰ یہ ہوجائیں گے کہ اِنْ ذَهَبْتَ ذَهَبْتَ اور یہ کلام مفید نہیں ہے مفید اس وقت ہوگا جب دو الگ الگ فاعل اور الگ الگ فعل ہوں گے جیسے قُمْ فَاُعْطِيَكَ (کھڑے ہوتو تمہیں عطا کروں) اس لئے

کہ مراد یہ ہے کہ اگر تم کھڑے ہوئے تو تمہیں عطا کروں گا جب صورت حال یہ ہے تو ابن عامر سے فَيَكُوْنَ کی جو قرأت منقول ہے وہ دلیل کے ساتھ نہیں ہے اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ چونکہ لفظ امر ہے لہٰذا يَكُوْنَ کو لفظ پر حمل کیا ہے جیسا کہ ابوالحسن نے اس آیت میں: قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ میں يُقِيْمُوا الصَّلَاةَ کو جواب کا قائم مقام ہونے پر حمل کیا ہے۔ اگر چہ در حقیقت وہ جواب نہیں ہے پس يَكُوْنُ میں ایک صورت میں رفع ہوگا کہ اسے كُنْ پر عطف مانا گیا ہے اس لئے کہ مراد تَكُوْنُ فَيَكُوْنُ ہے یا يَكُوْنُ مبتدا محذوف کی خبر ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: فَهُوَ يَكُوْنُ۔

الفاظ و معانی:

بَدِيْع بمعنی مُبْدِع ہے؛ جس طرح سَمِيْع بمعنی مُسْمِع، البتہ دونوں کے درمیان فرق ہے بدیع میں مبالغہ ہے جو مبدع میں نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ صفت حقیقت پر فعل کی حالت سے زیادہ استحقاق پیدا کرتی ہے؛ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی شان یہ ہے کہ وہ اشیاء کو کسی نمونہ کے بغیر وجود میں لاتا ہے۔ اِبْتِدَاع، اِخْتِرَاع، اِنْشَاء (تمام) ایک جیسے ہیں۔ کسی چیز کو پیدا کرنا اور اسے وجود دینا۔ بِدْعَة اسم ہے، حدیث میں اس طرح وارد ہوا ہے: كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَّ كُلُّ ضَلَالَةٍ سَبِيْلُهَا اِلَى النَّارِ۔ ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہے اور ہر ضلالت کا راستہ آتش جہنم کی جانب جاتا ہے۔

قضاء اور حکم ایک جیسے ہیں قضا کے حقیقی معنیٰ فیصلہ کرنے اور کسی شے کو مضبوط بنانے کے ہیں۔

لفظ قضا کے معانی

لفظ قضاء مختلف معانی میں استعمال کیا جاتا ہے:

اول: امر اور وصیت، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ. یعنی تمہارے پروردگار نے وصیت فرمائی ہے اور حکم دیا ہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا (یعنی تمہارے پروردگار نے وصیت فرمائی ہے اور حکم دیا ہے)

دوم: اخبار اور اعلام آگاہ کرنا: وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ. (سورۂ بنی اسرائیل، ۴ آیت) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس طرح ارشاد رب العزت ہے: قَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ. (سورۂ الحجر، آیت ۶۶) اور ہم نے

یہ فیصلہ لوط تک پہنچادیا۔

سوم: فارغ ہونا، ارشاد رب العزت ہو رہا ہے: فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ. (سورۂ بقرہ، آیت ۲۰۰) پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو۔ یعنی تم حج کے ارکان سے فارغ ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ (سورۂ النساء، آیت ۱۰۳) پس جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ۔

اس بارے میں علی بن موسیٰ الرضاؑ نے اپنے آباء و اجداد (علیہم السلام) کے حوالے سے اپنے جد امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت فرمائی ہے امام علیہ السلام نے فرمایا: قضا کی دس وجہیں ہیں۔ (جن میں تین وجہیں وہ ہیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں)

چہارم: فعل۔ ارشاد رب العزت ہے: فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۷۲) تجھے جو کرنا ہے کر گزر۔

اور اسی طرح اللہ کا قول ہے: وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ، اور وہ جس بات کا فیصلہ کر لیتا ہے اس کے لئے بس یہ حکم دیتا ہے ہو جا وہ ہو جاتی ہے۔

اور اسی طرح اللہ کا یہ قول ہے: إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۔ (سورۂ احزاب، آیت ۳۶) کہ جب اللہ اور اس کے رسول کوئی کام کر دیں تو لوگوں کو اپنے معاملہ کا اختیار نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ، (سورۂ احزاب، آیت ۳۷) یعنی جب اللہ اور اس کا رسول زینب کی تزویج سے متعلق فیصلہ کرنا چاہیں تو پھر کسی مومن اور مومنہ کو اس معاملے میں کوئی اختیار حاصل نہیں۔

پنجم: موت دینا۔ اللہ تعالیٰ کا قول: لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ، (سورۂ زخرف، آیت ۷۷) اور وہ پکاریں گے: اے مالک! (داروغۂ جہنم) کوئی ایسی ترکیب کرو کہ تمھارا رب ہمیں موت سے ہم کنار کر دے۔

اور اللہ کا قول: لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا، (سورۂ فاطر، آیت ۳۶) انھیں موت نہیں دی جائے گی کہ وہ مر جائیں۔

اور اللہ کا قول: فَوَكَزَهُ مُوسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ، (سورۂ قصص، آیت ۱۵) موسیٰ نے اس کو گھونسا مارا اور اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا یعنی اس پر موت نازل ہو گئی۔

ششم: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ، (سورۂ مریم، آیت ۳۹)

اے رسول آپ انھیں حسرت واندوہ کے دن سے متنبہ کیجیے جب قطعی فیصلہ ہو جائے گا یعنی ان کے لئے عذاب واجب ہو جائے گا تو وہ جہنمیوں میں سے ہوں گیا۔

اور یہ ارشاد کہ: وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ۔ (سورۂ ابراہیم، آیت ۲۲) فیصلہ ہو جانے کے بعد شیطان کہے گا۔

ہفتم: ارشاد باری ہے: وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔ (سورۂ مریم، آیت ۱۷) اور یہ کام ہو کر رہے گا یعنی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے کہ یہ ہو کر رہے ہوگا۔

ہشتم: اتمام کے معنی میں ہوتا ہے، ارشاد رب العزت ہے: فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ۔ (سورۂ قصص، آیت ۲۹) جب موسیٰ نے مدت پوری کر لی۔ آیت ۲۸ میں ہے: وَ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ۔ میں دونوں مدتوں میں سے جو بھی پوری کرلوں۔ ارشاد باری ہے: مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ۔ (سورۂ طہٰ، آیت ۱۱۴) اور (اے نبی) آپ تکمیل وحی سے پہلے قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیجیے یعنی قبل اس کے کہ جبرئیل آپ تک وحی کو مکمل کرلیں۔

نہم: حکم اور فیصلہ کے معنی میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ۔ (سورۂ زمر آیت ۶۹) (اور ان کے مابین حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا) وَ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ۔ (سورۂ یونس، آیت ۹۳) (بے شک آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا) یعنی فیصلہ کرتا ہے اور سورۂ انعام میں ہے: قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ۔ (سورۂ انعام، آیت ۵۸) فرما دیجیے کہ تم جس عذاب میں جلدی کر رہے ہو اگر وہ میرے اختیار میں ہوتا تو میرے اور تمھارے درمیان کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

دہم: بنانے کے معنیٰ میں۔ ارشاد باری عَزَّ اسْمُهٗ ہے: فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ (سورۂ فصلت، آیت ۱۲) پھر اللہ نے سات آسمان بنا دیئے۔

تفسیر:

خدا ہر شے کا خالق ہے

جب خداوند عالم نے اپنی ذات کو اولاد سے پاک و منزہ قرار دیا اور دلیل پیش کی کہ آسمانوں اور زمین میں

جو کچھ ہے اسی کی ملکیت ہے، تو اسی بات پر تاکید کرتے ہوئے فرمایا: بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی کسی نمونہ اور مثال کے بغیر اس نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا، نہ ہی اس سے قبل خالق کی کوئی صنعت وکاری گری تھی۔

وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا، جب وہ کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے یعنی اسے وجود میں لانے کا ارادہ فرماتا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ یعنی جب تم قرأت قرآن کا ارادہ کرو تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کہا کرو۔ بیان کیا گیا ہے: اس کے معنی ہیں جب امر کو محکم و مضبوط کہا جائے۔ اسی طرح کہا گیا ہے: اس کے معنی حکم دینا اور حتمی قرار دینا ہے کہ وہ فعل کو بجالائے۔ قول اول حقیقت سے نزدیک ہے۔

فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ، (سورۂ آل عمران، آیت ۴۷) (تو وہ اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے) اس میں مختلف وجہیں ہیں:

اول: یہ تمثیل کے مانند ہے اس لیے کہ معدوم (چیز) سے خطاب درست نہیں ہے، نہ ہی اسے حکم دیا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی کی حقیقت یہ ہے کہ فعل کا انجام دینا خداوند عالم پر آسان وممکن ہے اور اس کی ذات سے دشواری کی نفی کی جا رہی ہے۔ وہ گویا اس کے مانند ہے کہ اس سے کہا جاتا ہے: كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی ہو جا تو وہ (چیز) ہو جاتی ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: فلاں شخص نے اپنے سر اور ہاتھ سے کہا جب کہ وہ اپنے سر اور ہاتھ کے ذریعہ حرکت اور اشارہ کرتا ہے اور حقیقت میں کوئی بات نہیں کہتا۔ یہ قول ابوعلی، ابوالقاسم اور مفسرین کی ایک جماعت کا ہے۔

دوم: یہ ایک علامت ونشانی ہے جسے اللہ نے ملائکہ کے لیے مقرر کی ہے وہ جب اس علامت کو سنتے ہیں تو انھیں کسی واقعہ کے پیش آنے کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی چیز کو ابوالھذیل کی جانب سے بیان کیا گیا ہے۔

سوم: بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ معدوم اشیاء جب خدا کے نزدیک معلوم ہوتی ہیں تو وہ موجود کے مانند ہیں، ان سے خطاب درست ہے (کہ اس طرح کہا جائے) یعنی جب وہ کسی چیز کو وجود عطا کرنا چاہتا ہے تو كُنْ (ہو جا) کہتا ہے۔

پہلا قول درست اور صحیح ترین ہے اور کلام عرب سے بھی بہت زیادہ مشابہ ہے جس کی تائید اللہ کا یہ ارشاد کر رہا ہے: فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ، (سورۂ فصلت، آیت ۱۱) (تو اس نے اسے اور زمین کو حکم دیا کہ خوشی خوشی یا بکراہت ہماری طرف آؤ ان دونوں نے کہا ہم فرماں بردار بن کر تیرے حضور آ گئے)

اگر دوسرے قول پر حمل کیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی: خداوند عالم فرشتوں سے اعلان کرتے ہوئے اور انھیں غیب سے مطلع کرتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے۔ ''کُن'' یعنی ارشاد فرما رہا ہے: میں بنا رہا ہوں پس یہ چیز ہو جائے گی، اس طرح کُن کا فاعل اللہ ہے جو خبر کے معنی میں ہے، اگرچہ لفظ امر ہے جس کا بیان گذر چکا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کُن کا فاعل معدوم وغیر موجود چیز ہو جس سے مراد اس کا (وجود) ہونا ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: جس کے باعث وہ ملائکہ سے کہتا ہے چیز اس طرح ہوگی پس وہ (چیز) اس طرح ہو جائے گی (اس طرح وجود میں آئے گی) جس طرح اس کے متعلق خبر دی گئی ہے اس میں نہ کوئی اختلاف ہے، نہ ہی کوئی تبدیلی، جس بارے میں اس سے خبر دی گئی ہے؛ البتہ تیسرا قول باطل ہے (حقیقت) سے دور ہے اس لیے کہ معدوم (غیر موجود) سے خطاب درست نہیں ہے، نہ ہی اس کے وجود کے متعلق اسے حکم دینا درست ہے کہ وہ حکم کے ذریعہ وجود میں آئے۔ اس لیے کہ یہ امر اور حکم کی بجا آوری ہے اور اسے اطاعت کا قبول کرنا ہے اور یہ چیز مامور اور موجود چیز کے متعلق ہی تصور کی جا سکتی ہے نہ کہ معدوم سے۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو معدوم جس کو امر دیا گیا ہے اس کا خود اپنے لیے فاعل قرار پانا لازم ہوگا۔ جس طرح جس کو حکم دیا گیا ہے اسے قبول کر کے فاعل ہوتا ہے۔ یہ نظریہ باطل ہے اور اس کا بطلان ظاہر ہے۔

بعض نے کہا ہے: اشیاء کے وجود کے وقت (خداوند عالم) کُن فرماتا ہے، اس سے پہلے نہیں، نہ ہی اس کے بعد۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ۔ (سورہ روم، آیت ۲۵) (پھر جب وہ تمھیں پکار کر زمین سے بلائے گا تو یکایک تم زمین سے نکل آؤ گے) اس سے مراد ہے وہ انھیں ان کے خروج کے وقت بلاتا (پکارتا) ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔ نہ ہی اس کے بعد۔ یہ قول بھی اسی طرح ضعیف ہے اس لیے کہ حسن امر یہ ہے کہ وہ مامور بہ (جسے حکم دیا گیا ہو) سے مقدم ہو اسی طرح بلانا اور پکارنا ہے۔

اس آیت شریفہ میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ خدا کے لیے اولاد کا قرار دینا جائز نہیں ہے۔ چونکہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ خدا کی ذات آسمانوں اور زمین کی خالق اور اسے وجود بخشنے والی ہے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا کے صفات اجسام اور جواہر نہیں ہیں، اس لیے کہ جسم کے لیے اجسام کے فعل کا ہونا لازمی و ناگزیر ہے جس کی صفت یہ ہوگی اس کے لیے اولاد قرار دینا جائز نہیں ہے چونکہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا چونکہ وہ انبیاء کو وجود عطا کرنے والا ہے، لہٰذا اس کی ذات (اپنے) لیے اولاد قرار دینے سے کہیں بلند و برتر ہے۔

❁❁❁❁❁

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے خود ہم کلام کیوں نہیں ہوتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ۔ایسی ہی باتیں ان سے پہلے کے لوگ بھی کیا کرتے تھے ،ان سب کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔یقین کرنے والوں کو تو ہم اپنی نشانیاں صاف صاف بتلا چکے ہیں۔

الفاظ و معانی:

یقین ،علم ،معرفة لغت میں ایک دوسرے کے مانند ہیں ،جس کی ضد شک اور جہل ہے۔ اَيْقَنَ وَ تَيَقَّنَ وَ اسْتَيْقَنَ کے معنی ایک ہی ہیں اور صاحب کتاب العین نے کہا ہے: الیقن کے معنی یقین ہیں۔

یقین ایسا علم ہے جس سے سینہ خنکی اور ٹھنڈک کا احساس کرتا ہے۔لہٰذا کہا جاتا ہے: وَجَدْتُ بَرْدَ الْيَقِيْنِ میں نے یقین کی ٹھنڈک محسوس کی۔اس طرح نہیں کہا جاتا: وَجَدْتُ بَرْدَ الْعِلْمِ (میں نے علم کی ٹھنڈک محسوس کی)

ترکیب:

لَوْلَا هَلَّا کے معنی میں ہے اور یہ صرف فعل پر داخل ہوتا ہے اور اس کے معنی تحضیض (کسی کام پر ابھارنے) کے ہیں، جیسے:

تَعُدُّوْنَ عَقْرَ النِّيْبِ أَفْضَلَ مَجْدِكُمْ ‌ ‌ ‌ ‌ بَنِيْ ضَوْطَرَىٰ لَوْلَا الْكَمِيَّ الْمُقَنَّعَا

اے بنی ضوطری تم لوگ اپنی سب سے بڑی عزت بوڑھے اونٹوں کی ٹانگیں کاٹنا شمار کرتے ہو کیوں کہ تم شجاع اور خود والے کے پیر کاٹتے۔

كَذٰلِكَ میں کاف قَالَ سے متعلق ہے جار و مجرور مصدر (مفعول مطلق) کی بنا پر منصوب ہے یعنی كَقَوْلِهِمْ

تفسیر:

ایک اور بہانہ

خداوند عالم نے یہودیوں کے انکار توحید اور خدا کے صاحب اولاد ہونے کے دعوے کو رد کرنے کے بعد ان کے انبیاء کے بارے میں اختلاف اور ان حضرات سے ان کی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ، (اور جو لوگ علم نہیں رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں) مجاہد کے نزدیک ان لوگوں سے مراد نصاریٰ، ابن عباس کے نزدیک یہودی اور حسن وقتادہ عرب کے نزدیک مشرکین ہیں۔ یہی قول واقعیت سے زیادہ نزدیک ہے اس لیے کہ انھیں لوگوں نے محالات اور ناممکنات کے بارے میں سوالات کیے تھے اور انھوں نے واضح اور نمایاں معجزات پر اکتفا نہیں کیا اور اس طرح کہہ رہے تھے: ''ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے لیے زمین سے بہنے والے چشمے جاری نہ کردیں گے'' اسی طرح اس کے آخر تک کے آیات ہیں جن میں ان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ (وہ نہیں جانتے ہیں) اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ اہل کتاب نہیں ہیں۔

جس نے کہا ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں اس کا کہنا ہے کہ اس سے قبل ارشاد ہوا ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا، یہ وہ لوگ ہیں جن کا کہنا ہے عیسیٰؑ فرزند خدا ہیں۔ یہ بات اس روایت پر دلالت نہیں کررہی ہے اس لیے کہ ایک قوم کا ذکر کرنا پھر دوسری قوم کے متعلق از سر نو خبر دینا ممکن ہے اور یہ کہ مشرکین عرب نے خدا کی جانب اس کی بیٹیوں کی نسبت دی ہے۔ لہٰذا انھیں بھی ان لوگوں میں شامل کیا گیا ہے جو کہتے ہیں کہ خدا نے بیٹا بنا رکھا ہے۔

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ، یعنی اللہ ہم سے ظاہر بظاہر کلام کیوں نہیں کرتا تاکہ ہمیں بتادے کہ آپ اس کے پیغمبر ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کیا وہ ہم سے گفتگو کرے گا، جس طرح اس نے کلام کیا موسیٰ اور دیگر انبیاء سے گفتگو کی؟

اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ، یا ہمارے لیے آیت لائیے جو ہمارے دعویٰ کے موافق ہو، جس طرح (دیگر) انبیاءؑ نے اپنے دعوے کے موافق آیات پیش کیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ ان کے پاس آیات نہیں آئیں بلکہ ان کے پاس آیات اور معجزات آچکے تھے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ، (ایسی ہی باتیں ان سے پہلے کے لوگ بھی کیا کرتے تھے) بیان کیا گیا ہے کہ یہ یہودی ہیں جنھوں نے جناب موسیٰ سے آیات کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ روایت مجاہد سے مروی ہے اس لیے کہ انھوں نے الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ، سے نصاریٰ کو مراد لیا ہے۔

کہا گیا ہے: یہود و نصاریٰ دونوں مراد ہیں۔ یہ قتادہ اور سدی سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ قبل اسلام کے تمام کفار مراد ہیں۔ یہ ابو مسلم سے روایت ہے۔

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ، یعنی کفر و شقاوت اور انبیاء (علیہم السلام) پر بلا دلیل سرزش اور دشمنی کے سبب اعتراض کرنے میں ان کے دل ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ جیسا کہ یہودیوں کا حضرت موسیٰؑ سے کہنا (ہمیں اللہ کو ظاہر بظاہر دکھایئے) نصاریٰ کا حضرت عیسیٰؑ سے کہنا (ہم پر آسمان سے مائدہ (دسترخوان) نازل کیجیے اور عربوں کا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنا کہ کوہ صفا کو ہمارے لیے سونے میں تبدیل کر دیجیے۔ لہٰذا خداوند عالم نے فرمایا: اَتَوَاصَوْا بِهٖ، کیا تم اس چیز کی وصیت (نصیحت) کرتے ہو؟

ارشاد الٰہی: قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ، یعنی ایسی حجتیں (دلیلیں) اور معجزات جن سے پیغمبر کی نبوت کی حقانیت کو سمجھا جا سکتا ہے ہم نے بیان اور واضح کر دی ہیں۔ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ، (اس قوم کے لیے جو یقین رکھتی ہے) یعنی ان چیزوں کے ذریعہ ایسا استدلال کرتے ہیں جن سے استدلال واجب ہے اور اس پر یقین کرتے ہیں۔ تم بھی استدلال کر کے انھیں کے مانند یقین حاصل کر لو جو کچھ روشن آیات سے ظاہر ہوتا ہے وہ پیغمبرؐ کی صداقت پر دلالت کرتا ہے وہی سرزش اور عناد و دشمنی ترک کرنے والے کے لیے کافی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ انھیں وہ آیات نہیں دی گئیں جن کا انھوں نے مطالبہ کیا تھا تا کہ ان پر تاکیدی حجت قائم ہو سکے (تو اس کے جواب میں) ہم کہتے ہیں: مصالح کا اعتبار کیا گیا ہے کہ اگر اللہ یہ جانتا کہ ان کی پیش کردہ آیات کے اظہار میں مصلحت ہے تو وہ ضرور ظاہر فرماتا۔ جب اس نے اس کا اظہار نہیں فرمایا تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ ان کے اظہار میں کوئی مصلحت نہیں تھی۔

❁❁❁❁❁

إِنَّآ أَرۡسَلۡنَٰكَ بِٱلۡحَقِّ بَشِيرٗا وَنَذِيرٗاۖ وَلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ أَصۡحَٰبِ ٱلۡجَحِيمِ ﴿۱۱۹﴾

(اے رسول!) ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ جہنمیوں کے بارے میں آپ سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا جائے گا۔

قرائت:

نافع نے تَسۡـَٔلۡ تاء کے فتحہ اور جزم کے ساتھ قرأت کی ہے صیغہ نہی ہونے کی بنا پر۔

یہی امام محمد باقر علیہ السلام اور ابن عباس سے مروی ہے۔ فراء اور ابوالقاسم بلخی نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔ باقی قراء نے اسے خبر کے عنوان سے فعل مجہول قرأت کی ہے۔

حجت:

تُسۡـَٔلُ کو مرفوع پڑھنے کے دو احتمالات پائے جاتے ہیں:

(۱) حال ہے۔ ایسی صورت میں وہ بَشِيرٗا وَّ نَذِيرٗا کے مانند ہوگا کہ جس پر عطف کیا گیا ہے یعنی وَغَيۡرَ مَسۡـُٔولٍ اور جملہ کا ذکر مفرد یعنی بَشِيرٗا کے بعد ہوگا، جیسا کہ اس آیت: وَيُكَلِّمُ ٱلنَّاسَ فِي ٱلۡمَهۡدِ وَكَهۡلٗا میں مفرد (كَهۡلٗا) کا ذکر جملہ کے تذکرہ کے بعد ہے اسی طرح وَمِنَ ٱلۡمُقَرَّبِينَ میں بھی ہے کہ یہاں پر بھی جملہ کی جگہ آیا ہے۔

(۲) وَلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ أَصۡحَابِ ٱلۡجَحِيمِ پہلے جملہ سے جدا، نیا جملہ ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: لَسۡتَ تُسۡـَٔلُ مِنۡ أَصۡحَابِ ٱلۡجَحِيمِ (آپ سے جہنم والوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا)

نافع نے تَسۡـَٔلۡ جو تاء کو فتحہ کے ساتھ فعل نہی معلوم پڑھا ہے تو اس سلسلہ میں دو قول ہیں:

(۱) سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) لفظاً نہی ہے لیکن معنیٰ کے لحاظ سے جہنم والوں کے لئے جو کچھ مہیا کیا گیا ہے اسے بہت بڑا بنا کر پیش کرنا ہے کہ کہنے والا کہتا ہے کہ فلاں کی حالت تو نہ ہی پوچھئے یعنی اس کی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب ہے جتنی آپ سمجھ رہے ہیں!

سَأَلۡتُ دو مفعولی ہے جیسے أَعۡطَيۡتُ دو مفعولی ہے۔ شاعر نے کہا:

سَأَلَتَانِي الطَّلَاقَ إِذْ رَأَتَانِي قَلَّ مَالِي قَدْ جِئْتُمَانِي بِنُكْرٍ

(ان دو عورتوں نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر لیا جب انہوں نے دیکھا کہ میری دولت کم ہوگئی ہے تو میں نے ان سے کہا: تم دونوں میرے پاس بہت بری پیشکش لے کر آئی ہو)

سَئَلْتُ میں ایک مفعول پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے پھر اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) یا تو حرف جر کے بغیر متعدی ہوگا جیسے وَاسْئَلُوْا مَا اَنْفَقْتُمْ۔ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ۔

(۲) یا حرف جر کے ذریعہ متعدی ہوگا جیسے: سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ۔ عرب کا یہ کہنا ہے: سَئَلْتُ عَنْ زَيْدٍ۔

سَئَلْتُ جب دو مفعولی ہوگا تو اس کی تین قسمیں ہوں گی:

(۱) اَعْطَيْتُ کے مانند ہوگا جیسے: سَأَلْتُ عَمْرًا بَعْدَ بَكْرٍ حَقًّا میں نے بکر کے بعد عمرو سے حق طلب کیا۔ یعنی اس سے ایسا کرنے کا مطالبہ کیا۔

(۲) اِخْتَرْتِ الرِّجَالُ زَيْدًا کے مانند ہوگا یہ ارشاد الٰہی: لَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا یعنی کوئی بھی پکا دوست اپنے پکے دوست کے بارے میں سوال نہیں کرے گا۔

(۳) دو مفعول کی جانب متعدی ہوگا کہ ان میں سے دوسرا مفعول استفہام ہوگا جیسا کہ یہ ارشاد الٰہی ہے: سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ۔ وَ سْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَ جَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ۔

الفاظ و معانی:

جَحِيْم آتش (جہنم) ہے جب اس کے ایندھن کو روشن کیا جائے گا (بھڑکایا جائے گا) یہ جہنم کے لیے عَلَم کے مانند ہوگیا ہے۔

وَ جَحِمَتِ النَّارُ تَجْحَمُ جَحْمًا اِذَا اضْطَرَمَتْ۔

جب آگ بھڑک اٹھے تو اس طرح کہتے ہیں اور جَحْمَة آنکھ کو بھی کہتے ہیں لغت حمیر میں۔ فرمایا:

اَيَا جَحْمَتِيْ بَكِّيْ عَلٰى اُمِّ وَاهِبٍ فَتِيْلَةِ قَلُّوْبٍ بِاِحْدَى الْمَذَانِبِ

اے میری آنکھ توام وہب پر آنسو بہا۔

تفسیر:

حق کے ساتھ بھیجا ہے

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وضاحت فرمائی ہے کہ اس نے دلائل کے ذریعے کس طرح اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید فرمائی ہے اور انھیں حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ ارشاد باری ہے: إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ، اے محمد! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ ابن عباس سے منقول ہے اور کہا گیا ہے: بِالْحَقِّ یعنی بِالْإِسْلَامِ اسلام کے ساتھ۔ یہ اصم سے مروی ہے: وَ قِيلَ عَلَى الْحَقِّ اور کہا گیا ہے کہ اے محمد! ہم نے آپ کو برحق مبعوث کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا قول ہے: خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ بِالْحَقِّ (سورۂ عنکبوت، آیت ۴۴) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ دونوں برحق ہیں، باطل نہیں ہیں۔

بَشِيرًا وَّ نَذِيرًا بشارت دینے والے اور ڈرانے والے یعنی اے محمد! جس نے آپ کا اتباع کیا آپ اسے ثواب کی بشارت دیتے ہیں اور جو آپ کی مخالفت کرتا ہے آپ اسے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ اور جہنمیوں کے بارے میں آپ سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا جائے گا یعنی اے نبی آپ سے ان کی احوال کے متعلق کسی قسم کا سوال نہیں ہوگا اور اس جملے کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی اور دلاسا دیا گیا ہے کہ جب ان سے مخاطب ہو کر کہا: إِنَّمَا أَنتَ بَشِيرٌ وَّ نَذِيرٌ۔ آپ تو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہیں۔ آپ سے جہنم میں جانے والوں سے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی آپ کی طرف سے کسی قسم کا جبر ہے کہ وہ آپ کی بات کو تسلیم کرلیں اور اسی جیسا قول رب العزت ہے: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ۔

اور کہا گیا ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۲) اے نبی! لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچانا آپ کی ذمہ داری نہیں۔

کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے گناہوں کے بارے میں آپ سے کسی قسم کا مؤاخذہ نہیں ہوگا جس طرح ارشاد رب العزت ہے: عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ۔ (سورۂ نور، آیت ۵۴) اس رسول کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمھارے ذمے صرف وہ ہے جو تم پر بوجھ ڈالا گیا

یعنی رسول کا کام پیغام کو پہنچانا ہے اور تمھاری ذمہ اسے قبول کرنا ہے۔

❀❀❀❀❀❀

وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ ہُدَی اللّٰہِ ہُوَ الۡہُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾

(اے پیغمبر!) یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیروکار نہ بن جائیں۔ آپ فرما دیجیے کہ بس راستہ وہی ہے جو اللہ نے تم کو بتایا ہے۔ ورنہ اگر علم آنے کے بعد آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو پھر اللہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار آپ کے لیے نہ ہوگا۔

الفاظ و معانی:

رِضا، مَوَدَّۃ اور مَحَبَّۃ باہم مشابہ ہیں۔ رِضا کی ضد غَضَب ہے، رضا مرضی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ الف دراصل واؤ تھا جس کی دلیل لفظ اَلرِّضْوَان ہے اور تم کہتے ہو: رَجُلٌ رِضا وامْرَأَۃٌ رِضا وَ رِجَالٌ وَّنِسَاءٌ رِضاً۔

اَلْمِلَّۃُ وَ النِّحْلَۃُ وَ الدِّیَانَۃُ ایک جیسے ہیں اور مِلَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَ سَلَّم وہ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کی وضاحت کی ہے۔ وَامْتَلَّ الرَّجُلُ اس وقت کہتے ہیں جب وہ ملت اسلام کو اختیار کرلے یعنی جو ارادہ کیا ہے اس کی جانب قصد کرے اور اسی سے ہے اِمْلَالُ الْکِتَاب تاکہ اسے لکھے۔

ترکیب:

تَتَّبِعَ، حَتّٰی کی وجہ سے منصوب ہے۔ سیبویہ اور خلیل نے کہا: حَتّٰی کے بعد فعل کو نصب دینے والا اَنْ ہے۔ بس یہ اَنْ، حَتّٰی کے بعد ظاہر نہیں ہوگا یہ بات دلالت کرتی ہے کہ خود حَتّٰی نصب نہیں دیتا ہے حَتّٰی اسم کو جر دیتا ہے جیسا کہ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ میں ہے۔ عربی زبان میں کوئی ایسا حرف شناختہ شدہ نہیں ہے کہ جو اسم

میں بھی عمل کرے اور فعل میں بھی اور نہ ہی حرف جار ہے کہ جو فعل کو نصب دے وہ لام کے مانند ہو جائے گا اس مثال میں کہ: مَا كَانَ زَيْدٌ لِيَضْرِبَكَ (زید تم کو مارنے والا نہیں ہے) کہ یہ لام حرف جر ہے اور لِيَضْرِبَكَ کو نصب دینے والا اَنْ ہے اسے بھی لام کے ساتھ ظاہر کرنا صحیح نہیں ہے۔

هُوَ ضمیر مرفوع ہے یا تو مبتدا ہے یا ضمیر فصل ہے۔

اَلْهُدٰى مبتدا کی خبر ہے یا اِنَّ کی خبر ہے۔

مِنَ الْعِلْمِ جار و مجرور محذوف سے متعلق، حال ہے۔ ذوالحال موصوف محذوف ہے کہ اَلَّذِىْ جَاءَكَ اس کی صفت ہے اسی طرح مِنَ اللهِ بھی حال ہے۔

مِنْ وَلِيٍّ محلاً مرفوع، مبتدا ہے اور مِنْ زائدہ ہے۔

مَا لَكَ مِنَ اللهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيْرٍ، شرط کی جزاء کے مقام میں ہے لیکن جزاء جب اس میں قسم کو فرض کیا جائے تو پھر وہ مجزوم نہیں ہوگا اور ضروری ہے کہ اس میں کوئی ایک ایسا حرف ہو جو قسم پر دلالت کرے اور وہ آیت میں حرف مَا ہے جو قسم پر دلالت کر رہا ہے اسی لئے فعل مجزوم نہیں ہوا ہے۔

شان نزول اور تفسیر:

اس جماعت کو خوش کرنا ممکن نہیں

یہود و نصاریٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مہلت کا تقاضا کرتے تھے کہ ان کے سامنے دکھاوا کرتے تھے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں مہلت دیدی تو وہ آپ کا اتباع کریں گے۔ خداوند عالم نے ان کی موافقت سے مایوس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ. ((اے پیغمبر!) یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیروکار نہ بن جائیں) نیز بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی رضا مندی (خوشنودی) کی طلب میں کوشاں رہتے تھے تاکہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ پس آپ سے کہا گیا کہ ان کی رضا کو اس چیز کے سبب ترک کر دیجئے جس کا خداوند عالم نے ان سے مقابلہ کا حکم دیا ہے۔

یہ اس چیز پر دلالت کر رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو کسی بھی حالت میں راضی کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ خداوند عالم نے ان کی رضا کو آنحضرتؐ کے یہودی یا نصرانی بن جانے پر معلق کیا ہے اور جب (پیغمبر کا یہودی یا

نصرانی ہونا) ناممکن ہے تو ان کا راضی ہونا بھی ناممکن ہے، یعنی ان میں سے کوئی بھی فرقہ راضی نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس کی ملت اور دین کی پیروی کی جائے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کا قبلہ (بیت المقدس) مراد ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى، اے محمد! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے دین خدا جس سے وہ راضی ہے وہی ہدایت ہے یعنی جس دین پر آپ قائم ہیں۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ کہا گیا ہے: اللہ کی ہدایت یعنی قرآن جو جنت کی ہدایت کرتا ہے نہ کہ یہود و نصاریٰ کا راستہ۔ بیان کیا گیا ہے: بلاشبہ اللہ کی دلالت ہی دلالت و راہنمائی ہے اور اللہ کی ہدایت حق ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ فلاں کا راستہ ہی (درحقیقت) راستہ ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی یعنی ان کے مطالبات کو تسلیم کرلیا اور ابن عباس نے کہا: اگر آپ نے ان کے قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی علم وحی آجانے کے بعد یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے وضاحت آجانے کے بعد ہے اور کہا گیا ہے: مِنَ الدِّيْنِ۔ دین آجانے کے بعد۔ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ۔ تو اے محمد! اللہ کی جانب سے آپ کے لئے کوئی سرپرست اور پشت پناہ نہ ہوگا جو اس کے مقابلہ میں آپ کا مددگار ہو اور آپ سے اس کے عذاب کو دور کر سکے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جس کے متعلق خداوند عالم جانتا ہے کہ وہ نافرمانی نہیں کرے گا اسے بھی سرزنش اور وعید خبردار کرنا صحیح ہے اس لیے کہ خداوند عالم جانتا تھا کہ اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کی پیروی نہیں کریں گے۔ اس مقام پر اس کا یہ ارشاد اس آیت کے مانند ہے کہ: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کا عمل حبط ہو جائے گا) اس سے مراد یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کی امت کا حال آپ سے زیادہ شدید و دشوار ہے اس لیے کہ ان لوگوں کا مقام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منزلت سے پست ترین ہے۔ کہا گیا ہے خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، مراد آپ کی امت ہے۔

❀❀❀❀❀

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جو پڑھنے کا حق ہے یہی لوگ سچے دل سے اس پر ایمان لائے ہیں اور جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے وہ لوگ سراسر گھاٹے میں ہیں۔

ترکیب:

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمۡ میں اَلَّذِیۡنَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یَتۡلُوۡنَهٗ اس کی خبر ہے۔

اُولٰٓئِکَ مبتدا دوم ہے اور یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ اس کی خبر ہے اور اگر آپ چاہیں تو اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ کو اَلَّذِیۡنَ کی خبر قرار دے سکتے ہیں۔ یَتۡلُوۡنَهٗ محلاً منصوب، حال ہے اور اگر آپ چاہیں تو مبتدا کی خبر یَتۡلُوۡنَهٗ اور اُولٰٓئِکَ کو مبتدا قرار دے سکتے ہیں جیسے آپ یہ کہتے ہیں۔ هٰذَا حُلۡوٌ حَامِضٌ (هٰذَا مبتدا ہے اور حُلۡوٌ خبر اول، حَامِضٌ خبر دوم)

حَقَّ تِلَاوَتِهٖ منصوب ہے مصدر (مفعول مطلق) کی بنا پر۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت اصحاب سفینہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جو جعفر بن ابو طالبؑ کے ہمراہ حبشہ سے آئے تھے وہ چالیس افراد تھے، جن میں بتیس (۳۲) افراد حبشہ اور آٹھ شام کے رہبان تھے، جن میں بحیرا بھی تھا۔ یہ روایت ابن عباس سے منقول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایمان لانے والے یہودی جیسے عبد اللہ بن سلام و شعبہ بن عمر و تمام بن یہودا اور اسد و اسید کعب کے دونوں فرزند، ابن یامین اور ابن صوریا ہیں۔ یہ روایت ضحاک سے منقول ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ یہ قتادہ اور عکرمہ سے روایت ہے۔

پس پہلے دو قول کی بنیاد پر کتاب سے تورات مراد ہے اور آخری قول کے مطابق قرآن مراد ہے۔

تفسیر:

ایمان لانے والے اہل کتاب کی تعریف

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ. یعنی جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے، يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جو پڑھنے کا حق ہے۔اس کے معنیٰ میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اول: يَتْلُوْنَهٗ کے معنیٰ يَتَّبِعُوْنَهٗ کے ہیں یعنی توریت کا اتباع کرتے ہیں جو اتباع کرنے کا حق ہے۔اسی طرح ارشاد رب العزت: وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا (سورۂ الشمس، آیت ۲) اور چاند کی قسم ہے جس کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔یعنی اس کی متابعت کرتا ہے۔ اس بات کو ابن مسعود و مجاہد وقتادہ نے بیان کیا ہے، مگر یہ کہ ان کے نزدیک الکتاب سے قرآن مراد ہے۔

دوم: جب لوگوں ان سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ اپنی کتابوں میں موجود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفتوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں جو بیان کرنے کا حق ہے۔ یہ روایت کلبی سے مروی ہے۔اس قول کی بنا پر ضمیر 'ھا' کی بازگشت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب ہوگی۔

سوم: امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے تلاوت کا حق ہے یہ کہ جنت اور جہنم کے ذکر کے دوران توقف کرے پہلے یعنی جنت طلب کرے اور جہنم سے پناہ مانگے۔

چہارم: اس سے مراد ہے کہ اس کی قرأت کا حق ادا کرتے ہوئے اسے پڑھتے ہیں۔الفاظ میں ترتیل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔یعنی ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے ہیں۔

پنجم: اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن پر جو عمل کرنے کا حق ہے اسے ادا کرتے ہیں قرآن کے محکم پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور قرآن میں جو متشابہ آیات ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں اور جب تفہیم آیات میں دشواری پیش آتی ہے تو عالم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔یہ حسن بصری سے مروی ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہی لوگ سچے دل سے اس پر ایمان لائے ہیں یعنی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اکثر مفسرین کا یہی نظریہ ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ روایت کلبی سے منقول ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ، (اور جن لوگوں نے اس کا انکار کیا) اس سے یہودی مراد ہیں۔بیان کیا گیا ہے کو تمام

کفار ہیں۔ آیت کے عموم کے مطابق یہی قول اولیٰ اور بہتر ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ. یہی لوگ دراصل اپنے نفسوں اور اعمال کے اعتبار سے نقصان اٹھانے والے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں نے کامیابی اور نصرت کے اعتبار سے دنیا میں نقصان اٹھایا ہے اور آخرت میں ان نعمات جنت کے بارے میں نقصان اٹھائیں گے جن کا خداوند عالم نے مومنین کے لئے انتظام کر رکھا ہے۔

❀❀❀❀❀

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری ان نعمتوں کو، جن سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور یہ کہ میں نے تمھیں دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی۔

تفسیر:

میری نعمتوں کو یاد رکھو

اس آیت سے ملتی جلتی آیت کا ذکر چالیس اور چند آیتوں کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ وہ آیت ۴۷ ہے جو بعینہ اسی طرح ہے اور اس کی تفسیر بیان کی جا چکی ہے۔

اس آیت کو مکرر بیان کرنے کے سلسلے میں تین اقوال ہیں:

اول: یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جب تمام نعمتوں کی جڑیں ہیں یاددہانی کے لئے اسے عظیم بنا کر بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو دعوت دی جائے کہ وہ نعمت خداوندی کا شکر ادا کریں۔ اپنے رب کی اطاعت کو قبول کر لیں اور ان لوگوں پر اللہ کی نعمتوں کا اظہار ہوتا رہے۔

دوم: اللہ تعالیٰ نے دونوں کلام کو جدا جدا بیان کیا ہے حُسن تنبیہ اور یاددہانی کرانے اور مکرر لانے کے ذریعے۔ حجت کو پہنچانے کے لئے اور یاددہانی کی تاکید کے لئے۔

سوم: اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب توریت کا تذکرہ کیا کہ جس میں رہنمائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نبوت اور بشارت دونوں حضرات کی بارے میں رہنمائی ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر انھیں کی یاددہانی کرائی ہے اور جس وجہ سے انھیں فضیلت عطا کی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ رحمٰن میں نعمتوں کو شمار کرایا ہے اور اپنا یہ قول بار بار دہرایا ہے: فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ایک تنبیہ کے بعد جب دوسری تنبیہ آتی ہے تو وہ ایسی نعمت کی یاددہانی تک پہنچا دیتی ہے جو پہلی نعمت کے علاوہ ہوتی ہے اور تیسری نعمت دوسری نعمت کے علاوہ ہوتی ہے۔ آخر سورہ تک یہی کیفیت ہے۔ اسی طرح سورۃ المرسلات میں وعید کی گئی ہے خبردار کیا گیا ہے: وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ (۱۵-۱۹-۲۴-۲۸-۳۴-۳۷-۴۰-۴۵-۴۷-۴۹)

بے شک یہ ان اعمال کی جانب رہنمائی کے بعد جو دلائل و براہین کے ذریعہ دعوت دی جانے والی باتوں کو جھٹلانے کے گناہ کو سب سے بڑا گناہ قرار دیتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔـا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ فدیہ ہو سکے گا، نہ ہی اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کوئی سفارش فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ ہی مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد فراہم ہو سکے گی۔

اس جیسی آیت کا ذکر گزر چکا ہے اور اس کی تفسیر بیان کی جا چکی ہے اور وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۴۸ ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔

اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ ہی اس کی طرف سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی اسے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

❀❀❀❀❀

وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾

(اور وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کے رب نے چند کلمات کے ذریعہ ان کی آزمائش کی وہ ان سب میں پورے اتر گئے تو اللہ نے کہا: اے ابراہیم! میں تمھیں تمام انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کی: اور میری ذریت میں سے؟ تو اللہ نے فرمایا: میرا یہ عہدہ (امامت) ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

قرائت:

ابن عامر نے اس آیت اور چند دیگر مقامات پر اِبۡرَاهَام پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے اِبۡرَاهِيم قرأت کی ہے۔ حمزہ اور حفص نے عَهۡدِیۡ میں یاء کو چھوڑ کر پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ (عَهۡدِیَ) پڑھا ہے۔

حجت:

لفظ اِبۡرَاهِيم کے سلسلہ میں پانچ تلفظ ہیں: اِبۡرَاهِيم، اِبۡرَاهَام، اِبۡرَاهَم، ہلکا بنانے کے لئے ہاء کے بعد والے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ شاعر نے کہا: عُذۡتُ بِمَا عَاذَ بِهٖ اِبۡرَاهِمُ (میں نے اس چیز کے ذریعہ پناہ مانگی جس کے ذریعہ اِبۡرَاهِم نے پناہ طلب فرمائی)

اِبۡرَاهِم، امیہ نے کہا: مَعَ اِبۡرَاهِمِ التَّقِيِّ وَمُوۡسٰى: اور اِبۡرَهِم۔ شاعر نے کہا:

نَحۡنُ آلُ اللهِ فِيۡ كَعۡبَتِهٖ لَمۡ يَزَلۡ ذَاكَ عَلَى الۡعَهۡدِ اَبۡرَهَم

(ہم آل اللہ ہیں اس کے کعبہ میں یہ جناب ابراہیم کے زمانہ میں تھا)

ان تبدیلیوں کی وجہ بیان کی جا چکی ہے کہ عرب جب بھی کوئی عجمی لفظ بولتے ہیں اس میں خلط ملط کر دیتے ہیں اور اس کے حروف سے کھیلنے لگتے ہیں اور انہیں بدل دیتے ہیں۔

عَهۡدِیَ: اس یاء کو فتحہ دے سکتے ہیں جب اس سے پہلے کوئی متحرک حرف ہو اس لئے کہ یاء کی اصل یہ ہے کہ وہ متحرک ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ یاء کاف خطاب کے مقابلہ میں ہے جس طرح کاف مفتوح ہے اسی طرح یاء کو بھی مفتوح ہونا چاہئے۔

جن لوگوں نے اسے ساکن کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ کلام میں یاء کے ساتھ فتحہ ناپسندیدہ ہے جس طرح دیگر دو حرکتیں ناپسند ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ عرب نے گنجائش کی صورت میں اسے ساکن کر دیا ہے جب کہ اسے فتحہ کے ذریعہ حرکت دینا لازم تھا۔ اسی طرح انہوں نے یاء کو ساکن کر دیا ہے جب اسے دو حرکتوں کے ذریعہ متحرک کرنا لازم تھا۔ عرب کا یہ کہنا: قَالِي قَلَا ،بَادِي بَدَا ۔مَعْدِيْ كَرْب۔ یاء ان مقامات پر مفتوح ہے جو دونوں اسم کے آخر میں ہے۔ حَضَرَ مُوْت یہاں پر حرکت کو سکون میں بدل دیتے ہیں جس طرح رفع اور جر میں ساکن کر دیتے ہیں۔

الفاظ ومعانی:

اِلْاِبتِلَاء کے معنیٰ اَلْاِختِبَار ہیں یعنی آزمائش، امتحان۔ اَلتَّمَام ۔ اَلْكَمَال وَ الْوَفَاء باہم مشابہ ہیں اور اَلتَّمَام کی ضد اَلنُّقْصَان ہے۔ اَلتَّمَام کے معنیٰ مکمل اور اَلنُّقْصَان کے معنیٰ کم کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تَمَّ تَمَاماً وَ اَتَمَّهٗ تَتمِيماً وَ تَتِمَّةً ۔ وَ التَّمَّ کسی مکمل چیز کو کہتے ہیں اور ہر حاملہ کو تمام کہتے ہیں۔ یہ لفظ تِمام اور تَمام دونوں طرح سے ہے اور بَدْرٌ تَمَام ولَيْلٌ تَمَام کہا جاتا ہے۔

اَلذُّرِيَّةُ وَ النَّسْلُ وَ الْوَلَدُ ایک جیسے ہیں اور کچھ عرب اسے ذِرِّيَّة پڑھتے ہیں اور روایت کی گئی ہے کہ یہ زید بن ثابت کی قرائت ہے اور کچھ نے اسے فتحہ دیا ہے یعنی ذَرِيَّة اور اس کلمہ کے حروف اصلی کے بارے میں چار اقوال ہیں: ذَرْء ، ذَرّ ، ذَرْو ، اور ذَرِی سے مشتق ہے۔ پس اگر ہم اسے اَلذَّرْء سے مشتق قرار دیں گے تو اس کا وزن فَعِيلَة ہوگا یعنی ذَرِيئَة اور اگر اسے ذَرّ سے مشتق مانیں گے تو اس کا وزن فَعَلِيَّة جیسے قُمرِيَّة یا فَعِيلَة کے وزن پر جیسے ذَرِيرَة یا فُعُولَة کے وزن پر جیسے ذُرُّورَة اور اگر اسے اَلذَّرو اور اَلذَّرِی سے مشتق مانیں گے تو اس کا وزن فَعولة یا فعیلة ہوگا اور اس سلسلہ میں کافی باتیں ہیں جن سے کتاب کی طوالت بڑھ جائے گی۔ اسے ابن جنی نے المحتسب میں بیان کیا ہے۔

اَلنَّيْل وَ اللِّحَاق اور اَلْاِدْرَاك یہ تینوں ایک دوسرے کے مانند ہیں اور اَلنَّيل اور اَلنِّوَال جو تمھیں کسی انسان کے احسان کی وجہ سے میسر آئے۔

ترکیب:

لِلنَّاسِ میں لام محذوف سے متعلق ہے گویا اس طرح ہے: اِمَامًا اِسْتَقَرَّ لِلنَّاسِ، لِلنَّاسِ، اِمَاماً کی صفت ہے جب اسے مقدم کردیا گیا ہے تو اب حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ لِلنَّاسِ کا متعلق جَاعِلُكَ ہو اور اِمَاماً جَعَلَ کا مفعول ثانی ہو۔ مِنْ ذُرِّيَّتِي متعلق بہ محذوف ہے اس کی اصل اس طرح ہے: وَاجْعَلْ مِنْ ذُرِّيَّتِي۔

تفسیر:

جناب ابراہیمؑ کی امامت

وَ، یاد کیجیے، اِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ، جب ابراہیم کے رب نے ان کی آزمائش و اختبار کیا۔ یہ مجاز ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم کو ان کے پروردگار نے حکم دیا اور انھیں مکلف بنایا۔ اس کا نام اختبار اور امتحان اس لیے قرار دیا گیا کہ جب کسی امر کو احسان کے بطور ایسی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے تو اختبار اور امتحان کے مانند ہوتا ہے۔ اس نے اپنے امر میں وسعت کے اعتبار سے بندوں کے امور کے نام جاری فرمائے ہیں۔ پس جب خداوند عالم نے اپنے بندوں کے ساتھ ان کی آزمائش واختبار کا معاملہ کیا ہے تو اس لیے کہ وہ انھیں اس چیز کے بارے میں جزا اور بدلہ نہیں دیتا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ اسے عنقریب انجام دیں گے قبل اس کے کہ وہ فعل ان سے صادر ہو، اسی طرح دوسروں کی آزمائش کرنے والا بدلہ اور جزا نہیں دے گا جب تک کہ اس سے فعل واقع نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے امر کو ابتلاء و آزمائش کہا ہے۔ ابتلاء و آزمائش درحقیقت تکلیف (ذمہ داری) کا شدید اور دشوار ہونا ہے۔

بِكَلِمٰتٍ، (چند کلمات کے ذریعہ)

کلمات سے مراد کیا ہے؟

کلمات کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: خداوند عالم نے ابراہیمؑ کا خواب میں ان کے فرزند اسمٰعیلؑ کے ذبح سے امتحان لیا، جسے انھوں نے پورا کر دکھایا۔ اس کا انھوں نے مستحکم ارادہ کیا اور امر خدا کو تسلیم کیا۔ پس جب خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو اپنے امر کے

پورا کردکھانے پر ثواب عطا کرنا چاہا تو ارشاد ہوا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا. (ہم تمھیں لوگوں کا امام و قائد بناتے ہیں)

پھر اللہ نے ان پر حنیفیہ نازل فرمائی جو طہارت ہے اور وہ دس چیزیں ہیں جن میں پانچ کا تعلق سر سے ہے اور پانچ کا جسم سے۔ جن کا تعلق سر سے ہے وہ یہ ہیں: موچھیں کترنا، داڑھی رکھنا، کنگھی کرنا، مسواک کرنا اور خلال کرنا۔ جن کا تعلق جسم سے ہے وہ زیر بغل اور زیر ناف کے بال کاٹنا، ختنہ کرنا، ناخن کاٹنا، غسل جنابت کرنا اور پانی سے طہارت کرنا ہے۔

یہ ظاہری حنیفیہ (شریعت) ہے جسے جناب ابراہیمؑ لیکر آئے جو منسوخ نہیں ہوئی، نہ ہی قیامت تک منسوخ کی جائے گی۔ یہی اللہ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا. (سورۂ نحل، آیت ۱۲۳) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی (اے نبی) آپ ملت ابراہیم کی پیروی کریں جو باطل سے کنارہ کش تھے۔ اسے علی بن ابراہیم بن ہاشم نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

قتادہ نے کہا ہے کہ وہ دو روایتوں میں سے ایک ہے جسے ابن عباس نے نقل کیا ہے کہ وہ دس فضیلتیں ہیں جنھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں فرض قرار دیا گیا تھا اور انھیں ہماری شریعت میں سنت گردانا گیا ہے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ دس چیزیں یہ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں واجب تھیں اور ہماری شریعت میں مستحب ہیں: کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، کنگھی کرنا، موچھیں کترنا اور مسواک کرنا۔ ان امور کا تعلق سر سے ہے۔ ختنہ کرانا، زیر ناف کے بال کاٹنا، زیر بغل کے بال بنانا، ناخن کاٹنا اور پانی سے استنجا کرنا۔ ان کا تعلق جسم سے ہے۔

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ اسلامی شریعت میں تیس چیزوں سے اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا اور کسی اور کا ان امور سے امتحان نہیں لیا۔ ابراہیم یہ سب بجالائے اور انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچایا تو ان کے لئے برائت، نجات اور چھٹکارا لکھ دیا گیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى۔ (سورۂ النجم، آیت ۳۷)

ان میں سے دس سورۂ براءۃ میں ہیں: اَلتَّآئِبُوْنَ... لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (سورۂ توبہ، آیت ۱۱۲)

اور دس سورۂ احزاب میں: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ... الذّٰكِرٰتِ۔ (سورۂ احزاب، آیت ۳۵)

اور دس سورۂ مومنون میں: قَدْ اَفْلَحَ... الْوٰرِثُوْنَ۔ (سورۂ مومنون، آیت ۱-۱۰)

اور روایت کی گئی ہے کہ دس سورۂ سَاَلَ سَائِلٌ (سورۂ معارج) میں ہے: اَلَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ سے لے کر وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ تک (۲۳۔ ۳۴) انھیں چالیس قرار دیا ہے۔

تیسری روایت میں ابن عباس سے مروی ہے: ابراہیمؑ کو مناسک حج کا حکم دیا گیا۔ حسن نے کہا ہے: خداوند عالم نے ستارے، چاند اور سورج، ختنے، بیٹے کو ذبح کرنے، آگ میں ڈالے جانے اور ہجرت کے ذریعے امتحان لیا۔ ان تمام امور کو انھوں نے اللہ کے لیے پورا کر دیا۔ مجاہد نے کہا ہے: خداوند عالم نے ابراہیمؑ کی آزمائش ان آیات کے ذریعہ فرمائی جو اس آیت کے بعد ہیں: اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا واقعہ کے آخر تک۔

ابو علی الجبائی نے کہا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ ابراہیمؑ کو عقلی اور شرعی فرائض کا مکلف قرار دیا۔ آیت میں ہمارے بیان کردہ تمام احتمالات پائے جاتے ہیں۔ سعید بن المسیب بیان کرتے تھے: ابراہیمؑ نے لوگوں میں سب سے پہلے مہمان کی ضیافت کی، سب سے پہلے ختنہ کیا، سب سے پہلے مونچھیں کتروائیں اور ان کی حد بندی کی، سب سے پہلے پیری کا مشاہدہ کیا، جب پیری دیکھی تو اللہ سے عرض کیا: پروردگار یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا: یہ وقار (عزت و توقیر) ہے۔ عرض کی: پروردگارا! میرے وقار میں اضافہ فرما!

اسی طرح اس کی روایت سکونی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی ہے۔ البتہ سب سے پہلے مونچھ کترنے اور اس کی حد مقرر کرنے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ اضافہ کیا ہے: ابراہیم نے قتال (جہاد) کیا۔ سب سے پہلے جناب ابراہیمؑ نے خمس نکالا، سب سے پہلے نعلین کا استعمال کیا، سب سے پہلے پرچم قرار دیا۔

شیخ ابو جعفر بن بابویہ رحمۃ اللہ نے کتاب نبوت میں سند مرفوع کے ذریعہ مفضل بن عمر کے واسطہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ مفضل بیان کرتے ہیں: میں نے امام علیہ السلام سے ارشاد الٰہی: وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ‌ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا‌ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ‌ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ‏ کے متعلق دریافت کیا، یہ کون سے کلمات ہیں؟ امام نے ارشاد فرمایا: یہ وہی کلمات ہیں جنھیں آدمؑ نے اپنے پروردگار سے سیکھا تھا، انھیں کے ذریعہ ان کی توبہ قبول ہوئی تھی اور انھوں نے اس طرح کہا تھا: یَا رَبِّ اَسۡئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ عَلِیٍّ وَّ فَاطِمَةَ وَالۡحَسَنِ وَالۡحُسَیۡنِ اِلَّا تُبۡتَ عَلَیَّ فَتَابَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ انه هو التواب الرحیم۔

(اے پروردگار! میں تجھے محمد و علی فاطمہ حسن و حسین (علیہم السلام) کا واسطہ دے کر سوال کر رہا ہوں کیا

تو میری توبہ قبول نہیں فرمائے گا؟ پس خداوند عالم نے ان کی توبہ قبول کی اس لیے کہ وہ توبہ کا قبول کرنے والا اور رحیم ہے)

(مفضل کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: فرزند رسولؐ! فَاَتَمَّهُنَّ سے مراد کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: قائمؑ تک بارہ ائمہ علمکمل ہوئے جن میں (۹) نو امام حسینؑ کے فرزندان ہیں۔ مفضل کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: فرزند رسول! مجھے آپ اللہ عزوجل کے کلمہ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهٖ کے متعلق بتلایئے تو امامؑ نے فرمایا: اس سے امامت مراد ہے جسے خداوند عالم نے قیامت تک کے لیے امام حسینؑ کی ذریت میں قرار دیا۔

میں نے عرض کیا: فرزند رسول! امام حسینؑ کی ذریت میں امامت کس طرح قرار پائے گی؟ امام حسنؑ کی اولاد میں کیوں نہیں؟ جبکہ دونوں ہی فرزند رسولؐ آپؐ کے نواسے اور جوانان جنت کے سردار ہیں؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا: موسیٰؑ و ہارون اللہ کے پیغمبر مرسل اور سگے بھائی تھے، اللہ نے نبوت ہارون کے صلب میں قرار دی، موسیٰؑ کی صلب میں نہیں۔ کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں تھا کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا؟ بلاشبہ امامت اللہ عزوجل کی خلافت ہے، اسی طرح کسی کو کہنے کا حق نہیں کہ امامت کو صلب حسینؑ میں کیوں قرار دیا صلب حسنؑ میں کیوں نہیں؟ اس لیے کہ خداوند عالم اپنے افعال میں صاحب حکمت ہے۔ اس کے فعل سے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا جب کہ لوگوں سے باز پرس کی جائے گی۔

شیخ ابوجعفر بن بابویہ رحمہ اللہ نے ارشاد الٰہی: وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ کے بارے میں ایک دوسری وجہ بیان فرمائی ہے کہ ابتلاو آزمائش کی دو قسمیں ہیں:

اول: اللہ کے لئے ناممکن ہے۔

دوم: اللہ کے لئے ممکن ہے۔

ناممکن و محال یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرنے اور جاننے کے لیے اختبار و آزمائش کرے جو دونوں کے ذریعہ کشف و انکشاف ہوتا ہے۔ یہ (خدا کی نسبت) درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی ذات عَلَّامُ الْغُيُوبِ ہے۔ دوسری (ممکن وجہ) یہ ہے کہ خداوند عالم آزمائش کرے کہ (بندہ) اس آزمائش پر صبر کرے تا کہ اس کو عطا کی گئی بخشش (وانعام) استحقاق کی بنیاد پر ہو، دیکھنے والا اسے دیکھے اور اس کی پیروی کرے اور خداوند عالم کی حکمت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب امامت کافی اور مستقل تھے جس کا انکشاف آنے والے وقت اور زمانہ

نے کیا۔ لیکن جن کلمات کا ہم نے ذکر کیا یقین اس کے علاوہ ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہوتا ہے: وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ۔ انھیں کلمات میں توحید کی معرفت، تشبیہ سے اس کی پاکیزگی (بیان کرنا ہے) جب (جناب ابراہیمؑ) نے ستارے، چاند اور سورج کو دیکھا (تو خداوند عالم کی تشبیہ سے پاکیزگی بیان فرمائی) انھیں کلمات میں شجاعت ہے جس کی دلیل میں اللہ کا یہ ارشاد ہے: فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ۔ (سورۂ انبیاء، آیت ۵۸)

(چنانچہ ابراہیمؑ نے ان بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا سوائے ان کے بڑے بت کے) حضرت ابراہیمؑ کا تنہا ہونے کے باوجود ہزاروں دشمنان خدا سے مقابلہ کرنا۔

انھیں کلمات میں حلم ہے جسے خداوند عالم کے ارشاد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ۔ (سورۂ ہود، آیت ۷۵)

(بے شک ابراہیم بڑی قوت برداشت کے مالک، نرم دل اور اللہ سے لو لگانے والے ہیں۔)

انھیں میں سخاوت ہے جس پر اللہ کا یہ ارشاد دلیل ہے: هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ۔ (سورۂ ذاریات، آیت ۲۴)

((اے نبی!) کیا آپ تک ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے)

پھر جناب ابراہیم کا اپنے خانوادہ سے دوری اختیار کرنا جس کے متعلق اس کا ارشاد ہے: وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا۔ (سورۂ مریم، آیت ۴۸)

(میں آپ کو اور اللہ کے علاوہ آپ جن معبودوں کو پکارتے ہیں ان سب کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤں گا اور میں اپنے رب کو ہی پکاروں گا مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔)

پھر جناب ابراہیمؑ کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا جس کا بیان اس کے اس ارشاد میں موجود ہے: إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا۔ (سورۂ مریم، آیت ۴۲)

(جب انھوں نے اپنے منھ بولے چچا سے کہا: بابا جان آپ اس کی بندگی کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتا ہے اور نہ ہی دیکھتا ہے اور نہ ہی آپ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے۔) (ودیگر آیات)

پھر جناب ابراہیمؑ کا اپنے چچا آذر کے جواب میں برائی کا بدلہ نیکی سے دینا جب ان کے چچا نے کہا: أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا (سورۂ مریم، آیت ۴۶)

(اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو گئے ہو۔ اے ابراہیم اگر تم باز نہ آئے تو میں تمھیں سنگسار کردوں گا اور تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جاؤ۔)

جناب ابراہیمؑ نے فرمایا: سَلٰمٌ عَلَيۡكَ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّىۡ اِنَّهٗ كَانَ بِىۡ حَفِيًّا ۔ (سورۂ مریم، آیت ۴۷؛ آپ پر سلامتی ہو میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت طلب کرتا رہوں گا میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے)

انھیں کلمات میں توکل ہے جس کا بیان ان کے اس قول میں موجود ہے: اَلَّذِىۡ خَلَقَنِىۡ فَهُوَ يَهۡدِيۡنِ۔ (سورۂ شعراء، آیت ۷۸) (جس نے مجھے پیدا کیا وہی میری ہدایت کرتا ہے)

پھر ان کی جان کا امتحان جب انھیں منجنیق میں رکھ کر آگ کی طرف پھینکا گیا۔ پھر ان کے فرزند (اسمٰعیلؑ) کے ذبح کے ذریعہ ان کی آزمائش کی گئی۔ پھر ان کی آزمائش ان کے اہل کے ذریعہ کی گئی جب خداوند عالم نے ان کی حرمت کو قبطی کی عبادت سے خالص قرار دیا جیسا کہ مشہور روایت میں ہے۔ پھر ابراہیم کا سارہ کی بداخلاقی پر صبر کرنا، پھر ان کا اپنے آپ کو عبادت میں منحصر کر دینا جیسا کہ ان کا قول ہے: وَلَا تُخۡزِنِىۡ يَوۡمَ يُبۡعَثُوۡنَ۔ (سورۂ شعراء، آیت ۸۷) (اور جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کرنا)

پھر ان کے (اللہ) سے نزدیک ہونے اور قربت کا مرتبہ۔ ارشاد ہوتا ہے: مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۶۷)

(ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی بلکہ وہ باطل سے کنارہ کش مسلمان تھے اور مشرکین میں سے ہرگز نہیں تھے)

پھر اطاعت کے شرائط کا جمع کرنا، ارشاد ہوتا ہے: قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَنُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۔ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۔ (سورۂ انعام، آیت ۱۶۲-۱۶۳)

(فرما دیجیے بیشک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سر اطاعت خم کرنے والوں میں پہلا ہوں)

پھر خداوند عالم کا ان کی دعا کو قبول کرنا جب انہوں نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا: وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۶۰؛ (اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم نے

کہا تھا میرے مالک مجھے یہ دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟)

پھر خداوند عالم کا دنیا میں ابراہیمؑ کا منتخب کرنا پھر ان کے لیے گواہی دینا آخرت میں کہ وہ صالحین میں سے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۰) (ابراہیم تو وہ ہیں جنھیں ہم نے دنیا میں منتخب کیا تھا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا)

پھر بعد کے انبیاء کا ابراہیمؑ کی اقتداء اور پیروی کرنا، ارشاد ہوتا ہے: وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۲: ابراہیم نے اپنی اولاد کو اسی طریقے پر چلنے کی وصیت کی تھی اور یعقوب نے بھی یہی وصیت کی۔ انھوں نے کہا: اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا تم سب مرتے دم تک مسلم ہی رہنا)

ارشاد ہوتا ہے: قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۹۵: اے نبی!) آپ فرما دیجیے کہ اللہ نے سچ کہا، تم ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو باطل سے کترا کر چلتے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے۔) اس مقام پر شیخ ابوجعفر رحمہ اللہ کا کلام تمام ہوا۔

حسن کے بقول: فَاَتَمَّهُنَّ، کے معنی ہیں: وفی بھن۔ ان کلمات کو پورا کر دکھایا اور قتادہ بقول کے اعتبار سے عمل بھن علی التمام۔ ان کلمات پر مکمل طور پر عمل کیا۔

اور اَتَمَّهُنَّ، میں ضمیر اللہ کی طرف پلٹ رہی ہے یہ ابوالقاسم بلخی کا قول ہے جسے حسین بن علی المغربی نے بھی اختیار کیا ہے۔ بلخی نے کہا کہ کلمات سے مراد امامت ہے جیسا کہ مجاہد نے کہا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے: چونکہ کلام متصل ہے: اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، اور گذشتہ کلام کے درمیان واؤ عاطفہ کے ذریعہ فاصلہ نہیں ہے۔ فَاَتَمَّهُنَّ اللّٰهُ یعنی (ان کلمات) کے ذریعہ ان کی اطاعت کے سبب امامت کو واجب قرار دیا۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، جسکے معنی ہیں خدا فرماتا ہے (میں تمھیں لوگوں کا امام بناتا ہوں جسکے ذریعہ تمہارے افعال واقوال کی پیروی واقتداء کی جائے گی۔ لفظ امام سے دو باتوں کا استفادہ ہوتا ہے:

اول: جس کے افعال واقوال میں اقتدا کی جائے۔

دوم: جو امت کے سیاسی امور کی تدبیر کرتا ہے، ان کے مجرموں کو سزا دیتا ہے، کارندوں کے امور کی نگرانی کرتا ہے اور شرعی حدود کے مجرموں پر کرتا ہے۔ فریب کاروں اور دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے۔

پہلی صورت اور وجہ کے اعتبار سے جو بھی نبی ہوگا وہ امام ضرور ہوگا اور دوسری صورت کے مطابق ہر نبیؑ کا امام ہونا ضروری نہیں ہے اس لیے ممکن ہے کہ وہ گنہگاروں کو تادیب کرنے، سزا دینے، دشمنوں سے جنگ کرنے، دین کا دفاع کرنے اور کافروں سے جہاد کرنے پر مامور نہ ہو۔ پس جب خداوند عالم نے کلمات کے ذریعہ ابراہیمؑ کی آزمائش کی جسے انھوں نے پورا کر دکھایا تو خداوند عالم نے انھیں لوگوں کا امام مقرر کیا جو ان کے امتحان کا انعام تھا۔ اس پر دلیل اس کا قول جَاعِلُكَ ہے۔ یعنی اس نے امام قرار دیا جو اس کے قول کی عملی شکل ہے۔

اسم فاعل اگر ماضی کے معنی میں ہو تو فعل کا عمل نہیں کرتا۔ اگر آپ اس طرح کہیں: اَنَا ضَارِبٌ زَيْداً اَمْسِ (میں کل زید کو مارنے والا ہوں) تو یہ جملہ (باعتبار ادب) صحیح نہیں ہے۔ پس ضروری ہے اس سے مراد ہے کہ اس نے (ابراہیمؑ کو) امام بنایا ہے چاہے اس وقت یا مستقبل میں۔ نبوت بہرحال جناب ابراہیمؑ کو اس سے قبل حاصل تھی۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي، (ابراہیم نے عرض کی: اور میری ذریت میں سے؟!) یعنی میری اولاد میں سے جو امامت کا اہل ہو اسے امام بنا جو اس کرامت و شرف کا مستحق ہو۔

بیان کیا گیا ہے: جناب ابراہیم نے یہ درخواست اس بات کو جاننے کے لئے کی تھی کہ معلوم کریں کیا ان کی ذریت میں بھی ایسے امام ہوں گے کہ جن کی اقتدا اور پیروی کی جائے گی۔ اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ خداوند عالم سے بعنوان درخواست ہو کہ انھیں بھی اسی طرح (امام) بنائے گا۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ، (تو اللہ نے فرمایا: میرا یہ عہدہ (امامت) ظالموں تک نہیں پہنچے گا) مجاہد نے کہا ہے: عہد سے امامت مراد ہے۔ اسی کی امام باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت ہے کہ ظالم لوگوں کا امام نہیں ہو سکتا۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے ممکن ہے کہ یہ عہد (امامت) ابراہیمؑ کی ان بعض اولاد کو عطا کیا جائے جو ظالم نہ ہوں اس لیے کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو لوگوں کا امام مقرر کرنا نہیں چاہتا تو جواب میں کہنا لازمی تھا کہ نہیں یا خدا اس طرح فرماتا کہ میرا عہد تمہاری ذریت تک نہیں پہنچے گا۔

حسن نے کہا ہے: ظالموں کے لیے اللہ کے یہاں کوئی ایسا عہدہ نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ انھیں خیر عطا کیا جائے اگرچہ انہوں نے دنیا میں عہد کیا تھا جو ان کے لیے پورا کیا گیا۔ عربی زبان میں اس طرح کہنا صحیح ہے کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچیں گے) اس لیے کہ جو چیز تم تک پہنچتی ہے پس آپ اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی روایت ابن مسعود کی قرأت میں کی گئی ہے۔

ہمارے علماء نے اس آیت کے ذریعہ استدلال کیا ہے امام فقط وہی ہو سکتا ہے جو قبائح (ہر برائی) سے پاک اور معصوم ہو اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نفی فرمائی ہے کہ اس کے عہدۂ امامت تک وہ پہنچے جو ظالم ہو۔ پس جو شخص معصوم نہیں ہوگا وہ ظالم ہوگا چاہے وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہو یا دوسروں پر ظلم کرنے والا ہو۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بے شک اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ ظالم حالتِ ظلم میں اس عہدۂ امامت کو نہیں پا سکتا۔ لیکن اگر وہ توبہ کرلے تو اسے ظالم نہیں کہا جائے گا ایسی صورت میں اس کا عہدۂ امامت تک پہنچنا صحیح ہوگا! تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ظالم توبہ کرلے تب بھی وہ اس سے باہر نہیں نکلے گا کہ جس کو آیت نے ظالم ہونے کی حالت میں اپنے دائرہ میں لیا تھا۔ جب ظالم کو اس تک پہنچنے کی نفی کر دی گئی تو پھر یہ فیصلہ ہو گیا کہ وہ عہدۂ امامت کو نہیں پا سکتا۔

آیت مطلق ہے کسی خاص وقت اور زمانے سے مقید نہیں ہے لہٰذا لازم ہے اسے ہر وقت اور زمانے پر حمل کیا جائے کہ ظالم اس عہدۂ امامت کو نہیں پا سکتا خواہ وہ بعد میں تائب ہی کیوں نہ ہو جائے۔

❁❁❁❁❁

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَا إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْعَـٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۱۲۵﴾

اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور جائے امن قرار دیا تھا اور یہ حکم دیا تھا کہ ابراہیم کے مقام عبادت کو جائے نماز قرار دو اور ابراہیم و اسماعیل کو یہ تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

قرائت:

نافع اور ابن عامر نے وَاتَّخَذُوا کے خاء کو مفتوح پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے وَاتَّخِذُوا، خاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جس نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس نے امر حاضر مانا ہے اور وہ یَا بَنِیۡ اِسۡرَائِیۡلَ اذۡکُرُوۡا پر عطف کیا ہے۔ ممکن ہے کہ معنیٰ کے لحاظ سے وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ پر عطف ہو اس لئے کہ مَثَابَۃً کے معنیٰ ثُوۡبُوۡا (پلٹو) جن قراء نے خاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے انھوں نے اس فعل پر عطف کیا ہے جس کی جانب اِذۡ مضاف ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَاِذِ اتَّخَذُوۡا (جب ان لوگوں نے اختیار کیا)

الفاظ ومعانی:

بَیۡت، مَاوٰی، مَنۡزِل ایک جیسے ہیں۔ بیت شعر کے ابیات سے ماخوذ ہے، اس کے اس نام کی وجہ یہ ہے کہ شعر حروف اور کلام پر مشتمل ہوتا ہے جس طرح بیت (گھر) گھروں والوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بُیُوۡتَاتُ الۡعَرَب یعنی قبائل عرب۔ اِمۡرَاۃُ الرَّجُلِ بَیۡتُہٗ (یعنی زوجہ شوہر کا گھر ہے)

مَثَابَۃ: پلٹنے کی جگہ۔ اسی سے ثَابَ اِلَیۡہِ عَقۡلُہٗ ہے جب کسی شخص کی عقل زائل ہونے کے بعد واپس پلٹ آئے۔

طَائِف، جَائِل اور دَائِر ایک جیسے ہیں۔ طَافَ یَطُوۡفُ طَوۡفًا اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی (شخص) کسی چیز کے گرد چکر لگاتا ہے۔

اَلطَّوَّافُوۡن: اَلۡمَمَالِیۡك غلام اور اَلطَّائِف سے مراد جن اور شیطان ہیں اور ہر وہ شے جو وسوسوں سے دل کو ڈھانپ دے وہ خیال بھی ہو سکتا ہے۔ اَلۡعَاکِف: جو کسی مقام پر ٹھہرا ہو، اسے تھامے ہو اس سے چمٹا ہو۔ اَلۡعَاکِف: اسے کہتے ہیں جو مسجد میں مصروف اعتکاف ہو، عَکَفَ بہت کم بولتے ہیں زیادہ تر اِعۡتَکَفَ بولتے ہیں یعنی اس نے اعتکاف کیا۔ اَلرُّکَّع، رَاکِع کی جمع ہے یعنی رکوع کرنے والے۔

تفسیر:

خانہ خدا کی عظمت

ارشاد الٰہی: وَاِذۡ جَعَلۡنَا، وَاِذِ ابۡتَلٰی پر عطف ہے اور وہ، یَا بَنِیۡ اِسۡرَائِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ

پر عطف ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ (اور جب ہم نے اس گھر کو قرار دیا یعنی) جسے خداوند عالم نے (امن وامان) کا ٹھکانہ بنایا ہے وہ بَيْتُ اللّٰهِ الْحَرَام خانۂ کعبہ ہے۔روایت کی گئی ہے کہ بیت الحرام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں مشرکین کا داخلہ حرام ہے اور کعبہ نام کی وجہ یہ کہ وہ مربع یعنی چوکور ہے اور اس کے مربع ہونے کی وجہ اس کا بیت المعمور کے مقابل ہونا ہے جو کہ مربع ہے اور بیت المعمور اس لیے مربع ہے کہ وہ عرش کے مقابل ہے اور وہ مربع ہے اور عرش کے مربع ہونے کی وجہ ہے کہ جن کلمات پر اسلام کی بنیاد ہے وہ چار ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ

ارشاد الٰہی: مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (لوگوں کے لئے مرکز بنایا) اس میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔لوگ ہر سال اسے اپنا ٹھکانہ (اور جائے پناہ) بناتے ہیں یعنی زندگی میں فقط ایک مرتبہ لوگوں کے لئے ایسا نہیں ہوتا ہے۔یہ روایت حسن سے ہے۔

۲۔اس سے کوئی واپس نہیں پلٹتا مگر یہ وہ دیکھتا ہے کہ اس نے اپنی حاجت پالی ہے پس وہ اس کی طرف پلٹتے ہیں۔یہ روایت ابن عباس سے ہے۔

روایت میں وارد ہوا ہے جو شخص مکہ سے آئندہ برس حج کی نیت کے ارادہ سے پلٹتا ہے، اس کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور جو شخص مکہ سے پلٹتے وقت اس کی طرف واپسی کی نیت نہیں کرتا اس کی موت اس سے نزدیک ہوجاتی ہے۔

۳۔وہ اس گھر کا حج کرتے ہیں اور اس پر ثواب پاتے ہیں۔

۴۔مثابۃ للناس کے معنی ٹھکانہ، ملجاو ماویٰ کے ہیں۔

۵۔اس کے معنی اکٹھا اور جمع ہونے کے ہیں۔ان تمام معانی کی بازگشت اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ اس کی جانب بار بار پلٹتے ہیں۔

اس کا ارشاد: وَاَمْنًا (جائے امن) اس سے مقام امن مراد ہے۔خداوند عالم نے اسے (مرکز) امن قرار دیا ہے کہ اس نے حکم دیا ہے جو اس کی جانب پلٹتا اور وہاں پناہ لیتا ہے جب تک وہاں رہتا ہے اسے اپنے بارے میں نہیں ڈرنا چاہئے اور جس چیز کو اس کی تعظیم کے سلسلہ میں عربوں کے دلوں میں قرار دیا ہے وہ اس کی بنا پر اس سے تعرض نہیں کرتے۔پس وہ اپنی جان مال کے بارے میں امان میں ہوتا ہے اگر چہ وہ لوگوں کو اس

کے اطراف سے اچک لے جاتے ہیں۔اس کی عظیم حرمت کے باعث شرع میں اس پر حد قائم نہیں کی جائے گی جو شخص کوئی جرم کرے اور وہ خانہ کعبہ اور حرم میں پناہ لے لیکن اس پر کھانے پینے اور خرید و فروخت میں تنگی کی جائے گی یہاں تک کہ وہ وہاں سے نکل جائے، پھر اس پر حد جاری کی جائے گی پس اگر وہ کوئی ایسا عمل انجام دیتا ہے جو حد کا سبب ہے تو اس پر حد جاری کی جائے گی، اس لیے کہ اس نے حرم کی ہتک حرمت کی اور وہ ان وجہوں سے امان میں ہے، اسلام سے قبل کوئی شخص حرم میں اپنے باپ کے قاتل کو دیکھتا تو اس پر حملہ نہیں کرتا تھا۔اس روش کو ان لوگوں نے دین اسماعیل سے وراثت میں پایا تھا جس پر وہ ہمارے پیغمبرؐ کے زمانہ تک باقی رہے۔

ارشادالٰہی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ، (اور ابراہیمؑ کے مقام عبادت کو جائے نماز قرار دو) ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ حج پورا مقام ابراہیم ہے۔عطا نے کہا ہے: عرفہ، مزدلفہ، جمار (رَمْیِ جَمْرَہ) مقام ابراہیمؑ ہیں۔مجاہد نے کہا ہے: کل حرم مقام ابراہیمؑ ہے۔حسن، قتادہ اور سُدی نے کہا ہے: مقام ابراہیمؑ پر نماز پڑھنا ہے، طواف کے بعد ہمیں مقام ابراہیمؑ پر نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔یہی بات امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی مروی ہے کہ آپ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو خانہ کعبہ کا واجبی طواف کرتا ہے اور مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز پڑھنا فراموش کر جاتا ہے تو امامؑ نے فرمایا: نماز پڑھے گا اگر چہ چند روز کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ۔(اور ابراہیمؑ کے مقام عبادت کو جائے نماز قرار دو)

یہ ظاہر ہے اس لیے کہ مقام ابراہیمؑ جب مطلق طور پر بغیر کسی قید و شرط کے بولا جائے گا تو اس سے فقط مسجد الحرام میں مشہور مقام ہی سمجھا جائے گا اور اس مقام پر ابراہیمؑ کی نبوت پر ظاہری دلالت ہے۔خداوند عالم نے ان کے قدموں کے نیچے پتھر کو مٹی کی مانند قرار دیا یہاں تک کہ اس میں ان کے نقش قدم نمایاں ہو گئے، اس میں ان کے لیے معجزہ تھا۔امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؐ نے فرمایا: جنت سے تین پتھر نازل ہوئے: ۱۔مقام ابراہیم ۲۔حجر بنی اسرائیل ۳۔حجر اسود جسے خداوند عالم نے ابراہیمؑ کے سپرد فرمایا، یہ سفید پتھر تھا وہ سفیدی میں سفید کاغذ سے زیادہ سفید تھا۔لوگوں کے گناہوں کے سبب سیاہ ہو گیا۔

واقعہ

ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ جناب ابراہیمؑ اسماعیلؑ اور ہاجرہ کو لے کر مکہ آئے، دونوں کو وہاں چھوڑ دیا

(اسی طرح) ایک مدت گذر گئی یہاں تک کہ قبیلہ جرہم کا قافلہ وہاں پہونچا۔ان کی ایک دختر سے جناب اسماعیلؑ کی شادی ہوگئی اور جناب ہاجرہ کی رحلت ہو چکی تھی۔حضرت ابراہیمؑ، جناب سارہ سے اجازت لے کر جناب ہاجرہ کے پاس آنا چاہتے ہیں، وہ ایک شرط پر اجازت دیتی ہیں کہ وہ اپنی سواری سے نہیں اتریں گے۔جناب ابراہیمؑ مکہ تشریف لاتے ہیں۔جناب ہاجرہ کا انتقال ہو چکا تھا، حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کے گھر پہونچے۔ان کی زوجہ سے دریافت کیا کہ تمھارا شوہر کہاں ہے: وہ کہتی ہے: یہاں نہیں ہیں۔شکار کے لیے گئے ہیں۔جناب اسماعیلؑ حرم سے نکل کر شکار کے لئے جاتے پلٹ آتے تھے۔جناب ابراہیمؑ نے اس سے کہا: کیا تمھارے پاس کچھ کھانے کے لیے ہے: جواب دیا: میرے پاس کچھ نہیں ہے۔جناب ابراہیمؑ نے کہا جب تمھارا شوہر واپس آئے تو اس سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو بدل دے۔

جناب ابراہیمؑ پلٹ جاتے ہیں۔جناب اسماعیلؑ واپس آتے ہیں تو اپنے والد کی خوشبو محسوس کرتے ہیں زوجہ سے کہتے ہیں: کیا تمھارے پاس کوئی آیا تھا؟ اس نے کہا: ایک بوڑھا شخص آیا تھا جو اپنی شان کے اعتبار سے خفیف و معمولی تھا۔جناب اسماعیلؑ نے کہا: اس نے تم سے کیا کہا؟ کہا تھا: اپنے شوہر کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دے۔اسماعیل نے اس زوجہ کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لی۔جناب ابراہیمؑ اسی طرح زندگی بسر کرتے رہے پھر انھوں نے سارہ سے اسماعیل سے ملاقات کرنے کی اجازت لی۔سارہ نے اجازت دیدی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ سواری سے نیچے نہیں اتریں گے۔جناب ابراہیمؑ اسماعیل کے دروازہ پر پہونچتے ہیں ان کی زوجہ سے کہتے ہیں: تمھارا شوہر کہاں ہے؟ وہ کہتی ہے: شکار کے لیے گئے ہیں ابھی آتے ہوں گے (انشاء اللہ) آپؑ سواری سے نیچے اتریئے خدا آپ پر رحم کرے! جناب ابراہیمؑ نے کہا: کیا تمھارے پاس مہمان نوازی کے لئے کوئی چیز ہے؟ اس نے کہا: ہاں، وہ دودھ اور گوشت لے کر آتی ہے۔ابراہیمؑ دونوں چیزوں میں برکت کی دعا فرماتے ہیں، اگر وہ اس روز، روٹی، گندم جو اور کھجور لے کر آتی تو دنیا بھر کی زمین سے وہاں کی سرزمین میں سب سے زیادہ گندم، جو اور کھجور کی پیداوار ہوتی، پھر زوجہ اسماعیلؑ نے ابراہیمؑ سے کہا: سواری سے اتریئے تا کہ میں آپ کا سر دھلا دوں۔ابراہیمؑ زمین پر نہیں اترے یہاں تک کہ وہ پتھر لے کر آئی اور آپ کی داہنی جانب رکھدیا، جس پر آپؑ نے اپنا قدم رکھا جس کا اثر اس پر باقی رہا انھوں نے ابراہیمؑ کے سر کا داہنا حصّہ دھویا پھر اس جگہ کو بائیں طرف پلٹ دیا اور سر کا بایاں حصّہ دھویا جس پر آپؑ کے قدم کے آثار باقی رہے۔ابراہیمؑ نے زوجہ اسمٰعیلؑ سے کہا: جب تمھارا شوہر آئے تو اس سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی

چوکھٹ کو باقی رکھے۔ جب اسمٰعیلؑ واپس آئے اور باپ کی خوشبو محسوس کی تو زوجہ سے کہا: کیا کوئی آیا تھا؟ کہا: ہاں ایک بزرگ آئے جو سب خوبصورت اور سب سے زیادہ معطر تھے، مجھ سے اس طرح کہا اور میں نے ان سے اس طرح کہا۔ میں نے ان کا سر دھلایا۔ اس مقام پر ان کے قدموں کے آثار موجود ہیں۔ اسماعیلؑ نے کہا: وہ ابراہیمؑ تھے۔

اسی واقعہ کی بالکل اسی طرح روایت علی بن ابراہیم نے اپنے والد کے واسطہ سے ابن ابی عمیر سے، انھوں نے ابان کے واسطہ سے امام جعفر صادقؑ سے کی ہے، اگرچہ بعض الفاظ مختلف ہیں اور اس کے آخر میں کہا ہے: جب تمھارا شوہر واپس آئے اس سے کہنا ہاں ایک بزرگ آئے تھے جنھوں نے تمھارے دروازے کی چوکھٹ کے سلسلہ میں خیر کی نصیحت فرمائی ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: جناب اسمٰعیلؑ نے خود کو اس مقام پر گرا دیا، گریہ کیا اور مقام کا بوسہ لیا۔ امامؑ سے ایک دوسری روایت میں اس طرح وارد ہوا ہے: جناب ابراہیم علیہ السلام نے سارہ سے اجازت چاہی کہ وہ اسمٰعیل سے ملاقات کے لئے جائیں تو انھوں نے اس شرط پر اجازت دی کہ وہ وہاں ٹھہریں نہیں، نہ ہی اپنے گدھے سے اتریں۔ عرض کیا گیا: یہ کس طرح ہوا؟ امامؑ نے فرمایا: ان کے لیے طی الارض ہوا (یعنی زمین سمیٹ دی گئی)

عبداللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے رکن اور مقام جنت کے دو یاقوت ہیں۔ دونوں کے نور کو خداوند عالم نے مدھم کر دیا ہے۔ اگر ان کے نور کو مدھم نہ کیا جاتا تو مشرق و مغرب کو روشن کر دیتے۔

اس کا ارشاد: مُصَلًّی، (جانماز) اس میں متعدد اقوال ہیں:

۱۔ نماز ادا کرنے والے کو دعوت دی گئی ہے، یہ مجاہد سے روایت ہے۔

۲۔ قبلہ مراد ہے، یہ حسن سے روایت ہے۔

۳۔ مقام نماز کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ اس کے نزدیک نماز پڑھی جائے۔ یہ قتادہ اور سُدی سے روایت ہے۔ یہی بات ہمارے ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے۔

ہمارے علماء نے طواف کی طرح نماز طواف کے واجب ہونے پر استدلال کیا ہے اس لیے کہ اللہ نے نماز طواف کا حکم دیا ہے اور ظاہر امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ مقام ابراہیم پر نماز طواف کے علاوہ کوئی نماز واجب نہیں ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی: وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ یعنی ہم نے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو حکم دیا اور ان پر لازم قرار دیا کہ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ، میرے گھر کو پاک رکھیں۔ یہاں پر لفظ اَنْ تفسیر کرنے والا ہے جس سے قول مراد ہوتا ہے۔ جب وہ ایسے الفاظ کے ساتھ ہو جس میں قول کے معنیٰ پائے جاتے ہوں جیسا کہ یہاں پر فعل عَهِدْنَا ہے (یعنی ہم نے عہد کیا)۔

اس مقام پر تطہیر میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: گوبر اور خون سے طہارت و پاکیزگی مراد ہے۔ خانۂ کعبہ کے جناب ابراہیمؑ و جناب اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں میں آنے سے قبل مشرکین اس کے نزدیک گوبر اور خون ڈال دیتے تھے۔ یہ قول جبائی سے مروی ہے۔

دوم: جناب ابراہیمؑ و جناب اسماعیلؑ کعبہ کو بتوں سے پاک کریں، جنہیں مشرکین جناب ابراہیمؑ سے قبل باب کعبہ پر آویزاں کر دیتے تھے۔ یہ مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے۔

سوم: دونوں خانہ کعبہ کو کمال طہارت کے ساتھ پاک رکھیں جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ (سورہ توبہ، آیت ۱۰۹؛ یہ بتاؤ کہ جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضامندی پر رکھی ہو وہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گر جانے والی کھائی کے کنارے پر رکھی ہے جو گرا چاہتی ہے وہ اسے لے کر دوزخ کی آگ میں جا گری اور اللہ ظالم لوگوں کی راہنمائی نہیں کرتا)

خداوند عالم نے اَلْبَيْت (خانہ) کی نسبت اپنی جانب اس کے شرف اور تمام کائنات پر اس کی فضلیت کے سبب دی ہے اور اسے اپنے آپ سے مخصوص قرار دیا ہے۔

اس کا ارشاد: لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ، بیشتر مفسرین کے نزدیک طائفین سے خانۂ کعبہ کا طواف کرنے والے اور عاکفین سے اس کے مجاور مراد ہیں۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے: طائفین سے دنیا بھر سے مکہ میں وارد ہونے والے اور عاکفین سے وہاں کے رہنے والے افراد مراد ہیں۔ ابن عباس نے کہا ہے: عاکفین سے نمازی مراد ہیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اور لفظ کے بغیر قید و شرط کے ہونے کا مطلب بھی یہی ہے۔

وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ، (اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے) بیان کیا گیا ہے خانہ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھنے والے مراد ہیں جو رکوع اور سجدے کرتے ہیں۔ ی قتادہ سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا

ہے کہ تمام مسلمان مراد ہیں اس لیے کہ مسلمانوں کی شان ہی رکوع اور سجود کرنا ہے۔ حسن سے مروی ہے۔ عطا سے روایت ہے کہ جس نے خانۂ کعبہ کا طواف کیا وہ طائفین میں ہے اور وہاں بیٹھنے والا عاکفین میں ہے۔

نماز پڑھنے والا رکوع اور سجدہ کرنے والوں میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ہر روز و شب میں خداوند عالم کی ایک سو بیس (۱۲۰) رحمتیں ہیں جو اس گھر پر نازل ہوتی ہیں جن میں سے ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والوں کے لئے اور چالیس اس کا اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور بیس زیارت کرنے والوں کے لئے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور ابراہیم نے دعا کی: ''اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور روز قیامت کو مانے، اسے ہر قسم کے پھلوں کا رزق مہیا کر'' تو اللہ نے فرمایا: اور جو (ان باتوں کا) انکار کرے گا پھر بھی میں دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان اس کے لیے فراہم کروں گا، مگر آخر کار اسے جہنم کے عذاب کی طرف گھسیٹوں گا، اور وہ تو بدترین ٹھکانہ ہے۔

قرائت:

ابن عامر نے فَاُمْتِعُهٗ میم کو سکون کے ساتھ اور تاء کو بغیر تشدید کے قرأت کی ہے اور اسے اَمْتَعْتُ (باب افعال سے قرار دیا ہے)

بقیہ قراء نے میم کو فتحہ اور تاء کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے: مَتَّعْتُ (باب تفعیل) سے مشتق بنایا ہے۔

قرائت شواذ میں ابن عباس نے جناب ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی بنا پر فَاَمْتِعْهُ قَلِيْلًا ثُمَّ اضْطَرَّهٗ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ، پڑھا ہے اور ابن محیض نے ثُمَّ اَطَّرُّهٗ ضاء کو طاء میں ادغام کی بنا پر پڑھا ہے۔

حجت:

ابو علی نے کہا: أُمَتِّعُهٗ میں تشدید زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ قرآن مجید میں اسی طرح آیا ہے اللہ سبحانہ نے فرمایا:

يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعاً حَسَناً و كَمَنْ مَتَّعْنَاهُ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا،

ابن عامر کی قرأت کی دلیل یہ ہے کہ اُمْتِعُهٗ بھی ایک لغت (تلفظ) ہے۔ راعی نے کہا:

خَلِيلَيْنِ مِنْ شَعْبَيْنِ شَتّٰى تَجَاوَرَا قَدِيْمًا وَ كَانَا بِالتَّفَرُّقِ أَمْتَعَا

شاعر اس شعر میں لفظ اَمْتَعَا کو باب افعال سے لایا ہے۔

ابو زید نے کہا: شاعر نے اَمْتَعَا سے تَمَتَّعَا (فائدہ اٹھایا) مراد لیا ہے۔

ابن عباس نے جو فَاَمْتِعْهٗ قرأت کی ہے تو ابن جنی نے اس کا دو احتمال دیا ہے:

(۱) قَالَ میں مستتر هُوَ کی ضمیر ابراہیم کی طرف پلٹ رہی ہے یعنی قَالَ اِبْرَاهِيْمُ اَيْضاً: مَنْ كَفَرَ فَاَمْتِعْهٗ يَا رَبِّ اور کلام کے طولانی ہونے کا باعث قَالَ کو دوبارہ لانے کو حسن اور بہتر قرار دیا ہے اور اس لئے کہ ایک قوم کے لئے دعا سے دوسری قوم کے لئے دعا کی جانب منتقل ہوئے ہیں۔

(۲) قَالَ میں پوشیدہ ضمیر اللہ کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی اَمْتِعْهٗ يَا خَالِقُ يَا يَا اِلٰهُ۔ اس سے خود اپنے آپ کو مخاطب قرار دے رہا ہے۔ تو یہ کلام ویسے صادر ہوا ہے جیسے عربوں کی عادت ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو مخاطب قرار دیتے ہیں جیسا کہ اعشیٰ کا شعر ہے:

وَدِّعْ هُرَيْرَةَ اِنَّ الرَّكْبَ مُرْتَحِلٌ وَ هَلْ تُطِيْقُ وِدَاعاً اَيُّهَا الرَّجُلُ

(بلی سے وداع کر کہ قافلہ کوچ کرنے والا ہے اور کیا اے آدمی تو اس وداع اور جدائی کو برداشت کرلے گا)

الفاظ و معانی:

بَلَدٌ کی جمع اَبْلَادٌ ہے اور اسی وجہ اسے بِلَادٌ کہا جاتا ہے اس لئے وہ ایسے مقامات ہیں جہاں لوگوں نے سکونت اختیار کر رکھی ہے اور ان کے آثار پائے جاتے ہیں۔

صَارَ، حَالَ اور آلَ ایک جیسے ہیں اور صَيَّرَ كُلَّ اَمْرٍ، ہر امر تک پہنچنا ہے۔ صَيْرُ الْبَابِ،

دروازے کی جھری (سوراخ) حدیث میں آیا ہے: مَنْ نَظَرَ فِيْ صَيْرِ بَابٍ فَقَدْ دَمَّرَ۔ جو دروازے کے جھری میں دیکھے گا وہ ہلاک ہوجائے گا اور صیور الامر: آخرہ یعنی اختتام امر ہے۔

اِضْطِرَار غیر میں فعل کا اس طرح انجام پانا ہے جس سے جدا ہونا ناممکن ہو جب اس کے مقدور کی جنس سے ہو۔ لہٰذا اس طرح نہیں کہا جاتا: فُلَانٌ مُضْطَرٌّ اِلٰی لَوْنِهٖ (فلاں شخص اپنے رنگ سے مضطر و مجبور ہے۔ اس لئے کہ اس کا خود سے دور کرنا ممکن نہیں ہے۔

ترکیب:

مَنْ آمَنَ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ اَهْلَهٗ کا بدل ہے اور وہ بدل البعض من الکل ہے جس طرح آپ یہ کہیں کہ اَخَذْتُ الْمَالَ ثُلُثَهٗ (میں نے مال کا ایک تہائی لے لیا) جَعَلْتُ مَتَاعَكَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ (میں نے آپ کے سامان کو بعض کو بعض کے اوپر رکھ دیا)

مَنْ كَفَرَ اس کی دو طرح سے ترکیب ہوسکتی ہے:

(۱) مَنْ موصولہ اور كَفَرَ اس کا صلہ ہے۔ مَنْ محلاً مرفوع، مبتدا ہے۔

(۲) مَنْ اسماء شرط میں سے ہے محلاً مرفوع مبتدا، كَفَرَ اس کی شرط ہے۔

فَاُمَتِّعُهٗ میں فاء اور اس کے بعد جزاء ہے اس میں حرف شرط کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

مَنْ شرط و جزاء کے ساتھ محلاً مرفوع یہ مبتدا کی خبر ہے اور پہلے قول کی بنا پر فاء اور اس کے بعد مبتدا کی خبر ہے۔

بِئْسَ الْمَصِيْرُ فعل و فاعل، محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اصل اس طرح ہے: بِئْسَ الْمَصِيْرُ النَّارُ اَوِ الْعَذَابُ۔

قَلِيْلًا دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے منصوب ہے:

(۱) مصدر کی صفت ہے جیسے: مَتَاعاً حَسَناً

سیبویہ نے کہا: آپ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی کسی چیز کو درست کر رہا ہے اور وہ کہتا ہے کہ رُوَيْداً تو مقصود یہ ہے کہ عِلَاجاً رُوَيْداً۔

خداوند عالم یہاں پر متاع کی صفت قلیل لایا ہے حالانکہ تمتیع کثرت پر دلالت کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ متاع ختم یا ناقص ہوجاتی ہے یا انتہا کو پہونچ جاتی ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۔

(۲) زمان کی صفت ہے یعنی زَمَاناً قَلِیلاً اس پر یہ ارشاد الٰہی دلالت کرتا ہے: عَمَّا قَلِیلٍ لَیُصْبِحُنَّ نَادِمِین، دراصل اس طرح آیا ہے: بَعْدَ زَمَانٍ قَلِیلٍ جیسا کہ کہا جاتا ہے: عَرِقَ عَنِ الْحُمّٰی: یعنی بخار کے بعد پسینہ آیا اَطْعَمَهٗ عَنْ جُوْعٍ: یعنی بھوک کے بعد اسے کھانا کھلانا۔

تفسیر:

جناب ابراہیمؑ کی دعا

اور یاد کیجیے: اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا۔ جب ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب تو اس شہر (مکہ) کو امن کا شہر بنا دے جیسا کہ کہا جاتا ہے: بَلَدٌ اٰهِلٌ اَیْ ذُوْ اَهْلٍ یعنی صاحب و اہل اور کہا گیا ہے: اس کا مفہوم ہے یَأْمَنُوْنَ فِیْهِ اس شہر میں محفوظ رہیں گے، جس طرح لَیْلٌ نَائِمٌ کہا جاتا ہے یعنی رات میں سویا جاتا ہے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ اس سے مراد حَرَامًا مُّحَرَّمًا وہ محترم چیزیں ہیں جنھیں حرام کر دیا گیا ہے، یہاں کے پرندوں شکار نہیں کیا جاسکتا، درخت نہیں کاٹے جاسکتے۔ انھیں معنی کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کی گئی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا: ''جو داخل حرم ہو اس میں پناہ حاصل کرتے ہوئے وہ خداوند عالم کے عذاب سے محفوظ ہے جو کوئی وحشی (جانور) اور پرندہ حرم میں داخل ہو تو وہ خود پر حملے اور اذیت سے امان میں ہے، یہاں تک کہ حرم سے باہر نکل جائے۔'' رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے روز ارشاد فرمایا: خداوند عالم نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے روز سے ہی مکہ کو حرام (محترم) قرار دیا۔ پس وہ قیامت تک حرام (محترم) ہے۔ مجھ سے قبل کسی کے لیے حلال نہیں تھا، نہ ہی میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا اور میرے لیے صرف دن کی ایک حصہ کے لیے حلال کیا گیا۔

یہ حدیث اور اسی کے مانند ہمارے علماء کی روایات مشہور ہیں جو اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے قبل حرم جائے امان تھا۔ آپ کی دعا سے اس کی حرمت و احترام میں دو چند اضافہ ہوگیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی دُعا سے حرم قرار پایا، اس سے قبل عام شہروں کے مانند تھا۔ اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ حَرَّمَ مَکَّةَ وَاِنِّیْ حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَةَ، ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم (محترم) قرار دیا میں نے مدینہ کو حرم قرار دیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ مکہ حرم تھا (ابراہیمؑ) کی دعا سے قبل ایک دوسری وجہ سے اور دعا کے بعد حرم قرار پایا ہے ایک دوسری وجہ سے۔

اول: پہلی وجہ میں خدا نے حرم کو ہر طرح کی تزویر (جھوٹ اور تہمت) سے ممانعت فرمائی جس طرح دیگر شہروں کو اس سے ملحق کیا اور اس تعظیم و ہیبت کے ذریعہ جو اس کی نسبت دلوں میں قرار دئے۔

دوم: اس کی تعظیم کا حکم انبیاءؑ کی زبانی دیا گیا ہے۔ جس چیز کی دعا کی جاتی ہے خداوند عالم اسے قبول فرماتا ہے لہٰذا انھوں نے خدا سے دعا کی کہ وہ اسے جدب (خشک سالی) اور قحط سے محفوظ رکھے اس لیے کہ جناب ابراہیمؑ نے وادئ غیر زرع میں اپنی بیوی بچہ کو آباد کیا تھا جہاں دودھ نہیں تھا یعنی ابراہیمؑ نے تزویر (جھوٹ اور بہتان) اور زمین کے دھنسنے سے امان کا سوال نہیں کیا (جو انھیں پہلے سے) حاصل تھا۔

بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے دو چیزوں کی دعا کی تھی کہ دونوں کو دوام بخشے اگرچہ ان میں سے ایک از سر نو تھا اور پہلے سے تھا۔

ارشاد الٰہی: وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ، اس کے باشندوں کو طرح طرح کے ثمرات (پھلوں) کے ذریعہ روزی عطا فرما۔

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور روز قیامت پر عقیدہ رکھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کے لئے پھلوں کی دعا طلب کی تاکہ انھیں امن و سکون اور ہریالی نصیب ہو اور وہ نہایت خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ پوری دنیا سے پھل ان تک پہونچیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ثمرات سے ثمرات قلوب مراد ہیں، یعنی لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کردے تاکہ ان کی طرف بڑھیں اور مائل ہوں۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ، (جو اللہ پر ایمان لائے) جناب ابراہیمؑ نے ان چیزوں کو اللہ پر ایمان لانے والوں سے مخصوص کیا ہے اس لئے کہ خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آگاہ فرمادیا تھا کہ ان کی اولاد میں ظالم بھی ہوں گے، اس وقت جب انھوں نے اپنی ذریت کے لئے امامت کی دعا کی تھی تو خدا نے فرمایا تھا: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ، دعائے رزق کو مومنین سے ادب الٰہی کے سبب مخصوص کیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے ابراہیمؑ نے گمان کیا اگر وہ کافروں کے لیے دعائے رزق کریں گے تو مکہ میں ان کی کثرت

ہو جائے گی اور وہ فساد برپا کریں گے، لوگوں کو حج کرنے سے روکیں گے، اسی لیے انھوں نے دعا کو اہل ایمان سے مخصوص کیا۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ، خداوند عالم نے فرمایا: میں نے ان میں سے صاحبان ایمان کے متعلق تمھاری دعا کو قبول کرلیا اور کافروں کو اس رزق کے سبب فائدہ پہونچاؤں گا کہ میں انھیں مرتے دم تک رزق عطا کروں گا۔ کہا گیا ہے میں انھیں دنیا میں باقی رہنے کا فائدہ پہونچاؤں گا۔

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی علیہ وآلہ وسلم کے آنے تک امن اور رزق کا فائدہ پہونچاؤں گا، اگر وہ کفر پر باقی رہے تو وہ انھیں قتل کردیں گے یا مکہ سے باہر نکال دیں گے۔ یہ روایت حسن سے مروی ہے۔

ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ، یعنی پھر انھیں جہنم رسید کردوں گا اور انھیں آخرت میں جہنم کی طرف لے جاؤں گا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ، اور وہ بدترین ٹھکانا ہے یعنی پلٹنے اور بازگشت کی جگہ اور مقام۔

❁❁❁❁❁

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾

اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے "اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرما" بے شک تو ہر ایک کی بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

الفاظ ومعانی

اَلرَّفْعُ وَالْإِعْلَاءُ وَالْإِصْعَادُ ہم معنی ہیں اور رَفع کی ضد وَضع ہے نیچے لانا اور اِصعاد کی ضد اِنْزَال ہے، اتارنا۔ کہا جاتا ہے: رَفَعَ يَرْفَعُ رَفْعاً وَارْتَفَعَ الشَّيْءُ نَفْسُهٗ ، کسی شے نے خود کو بلند کرلیا۔

اَلرَّفْعُ نَقِيضُ الْخَفْضِ رفع، خفض (نیچے لانے) کی ضد ہے۔ اور رِفْعَة، ذِلَّة کی ضد ہے۔

اَلْقَوَاعِدُ وَالْاَسَاسُ وَالْاَرْكَانُ ہم معنی ہیں قَوَاعِدُ کا واحد قَاعِدَةٌ اور لغت میں اس کے حقیقی معنیٰ ثبوت واستقرار کے ہیں اور قَاعِدَةُ الْبِنَاءِ کا مفہوم وہ بنیاد ہے جس پر عمارت کھڑی کی گئی ہے اور اِمْرَاَةٌ قَاعِدَةٌ ایسی عورت کو کہتے ہیں کہ جو ساٹھ سال کی ہوگئی ہو اور اس نے شادی نہ کی ہو۔

ترکیب:

مِنَ الْبَيْتِ جار و مجرور يَرْفَعُ سے متعلق یا محذوف سے، محلاً منصوب ہے حال کی بنا پر اور ذوالحال الْقَوَاعِدَ ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا : محلاً منصوب ہے قول محذوف کی بنا پر کہا: قَالَ يَقُولُونَ: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اور یہ اپنے ماقبل سے متصل ہے اس لئے کہ یہ حال کو مکمل کرنے والا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ يَقُولُونَ محلاً حال ہے۔

تفسیر:

جناب ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کو تعمیر کرتے ہیں

ارشاد ہوا: وَإِذْ يَرْفَعُ یعنی وَاذْكُرْ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ یعنی یاد کرو جب ابراہیم خانۂ کعبہ کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے۔ یعنی خانۂ کعبہ کی جو بنیادیں پہلے سے موجود تھیں انھیں بلند کر رہے تھے۔ ابن عباس اور عطا سے روایت ہے کہ دونوں نے بیان کیا ہے: خانۂ کعبہ کی تعمیر جناب آدمؑ نے کی تھی، پھر اس کے آثار محو ہو گئے تھے، جناب ابراہیمؑ نے اس کی از سر نو تعمیر کی۔ یہی روایت ہمارے ائمہ علیہم السلام سے مروی ہے۔ مجاہد نے کہا ہے: کعبہ کو ابراہیمؑ نے سب سے پہلے بنایا خدا کے حکم سے۔ حسن کہا کرتے تھے: جناب ابراہیمؑ نے سب سے پہلے بیت اللہ کا حج کیا۔ ہمارے علماء کی روایات میں ہے خانۂ کعبہ کا حج سب سے پہلے آدمؑ نے کیا جو اس چیز پر دلالت کر رہا ہے کہ کعبہ ابراہیمؑ سے پہلے موجود تھا۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: خداوند عالم نے عرش کے نیچے چار ستون قرار دئے ہیں جن کا نام ضراح ہے، وہ بیت المعمور ہے۔ ملائکہ سے اس کا طواف کرنے کے لیے کہا گیا پھر ملائکہ کو بھیجا اور ان سے کہا گیا کہ وہ زمین پر (بیت المعمور) کی طرح بیت (گھر) بنائیں اور زمین کے باشندوں کو اس گھر کا طواف کرنے کا حکم دیا۔

تفسیر عیاشی میں عیاشی نے اپنی سند سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: خداوند عالم نے جنت سے آدمؑ کے لیے حجر اسود نازل فرمایا، البیت (خانہ کعبہ) سفید موتی کے مانند تھا۔ خداوند عالم نے اسے آسمان پر اٹھا لیا اور اس کی بنیادیں باقی رہ گئیں جو اس گھر کے بالمقابل ویسا ہی تھا۔ (امام

نے) فرمایا: اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جو کبھی بھی واپس نہیں پلٹیں گے۔ پس خداوند عالم نے ابراہیم و اسماعیل کو ان بنیادوں پر کعبہ بنانے کا حکم دیا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے: سب سے پہلی چیز جو آسمان سے زمین پر نازل ہوئی وہ خانہ کعبہ ہے جو مکہ میں ہے۔ خدا نے اسے یاقوت سرخ کے مانند نازل کیا تھا۔ قوم نوحؑ نے زمین پر فسق و فجور کیا تو خدا نے اسے اٹھا لیا۔

وَاِسۡمٰعِیۡلُ۔ یعنی ابراہیم و اسماعیل خانہ کعبہ کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے، اور دونوں کہہ رہے تھے: رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا۔ پروردگار ہم سے اس خدمت کو قبول فرما! عبد اللہ بن مسعود کے کلمات میں اس طرح ہے: یَقُوۡلَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا۔ اسی کے مانند اللہ کا ارشاد ہے: وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ۔ یعنی یقولون سلام علیکم (سلام علیکم کہتے ہیں) و الملائکۃ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم یعنی یقولون اخرجوا انفسکم (اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں اپنی روح نکالو!) بعض نے کہا ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح ہے: یَقُوۡلُ رَبَّنَا۔ اسے وہ ابراہیمؑ کی جانب پلٹاتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ابراہیمؑ تنہا خانہ کعبہ کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے، اس لئے کہ جناب اسمٰعیلؑ کعبہ کی بنیادوں کو بلند کرتے وقت کمسن تھے۔ یہ قول شاذ (نادر) ہے اور اپنے نادر ہونے کے باعث غیر مقبول ہے۔

صحیح یہ ہے کہ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) دونوں ہی خانہ کعبہ کی دیواروں کو بلند کرنے والے تھے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور اسماعیلؑ پتھر لا کر دے رہے تھے۔ اس لیے دونوں کی صفت بیان کی گئی کہ دونوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا۔ (ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول کرلے) اس جملہ میں اس بات پر دلیل ہے کہ دونوں نے کعبہ کو مسجد قرار دیا نہ کہ مسکن۔ اس لیے کہ دونوں نے تعمیر کعبہ پر ثواب کی درخواست کی ہے اور ثواب کا مطالبہ اطاعت پر ہی کیا جاتا ہے۔ تَقَبَّلۡ مِنَّا کے معنی اس کے عمل تک پہنچانے کے ہیں، جو ہدیہ قبول کرنے کے مشابہ ہے۔ اس لیے کہ جب بادشاہ کسی انسان سے ہدیہ قبول کرتا ہے تو اس تک پہونچتا ہے۔

اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ۔ یعنی تو ہماری دعا سنتا ہے اور ہمارے بارے میں جانتا ہے جس میں ہماری صلاح و خیر ہے۔ امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے: جناب اسماعیلؑ نے سب سے پہلے اپنی زبان کو عربی

(زبان) کے ذریعہ مشتق کیا جب دونوں خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے، اسمٰعیل کے باپ (ابراہیم) نے اسمٰعیل سے کہا: یَا اِسْمٰعِیْلُ هَاتِ. یعنی مجھے پتھر لا کر دو۔ جناب اسمٰعیلؑ نے جناب ابراہیمؑ سے عربی زبان میں کہا: یَآ اَبَتِ هَاكَ حَجَرًا بابا جان! یہ پتھر ہے اسے لیجئے۔ جناب ابراہیمؑ تعمیر کر رہے تھے اور جناب اسماعیلؑ پتھر دے رہے تھے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ عبادت سے فارغ ہونے پر دعا کرنا مرغوب و مستحب ہے جس طرح ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) نے دُعا کی۔

اسمٰعیل و ہاجرہ کا واقعۂ ہجرت

علی بن ابراہیم بن ہاشم نے اپنے والد سے، انھوں نے نضر بن سوید کے واسطہ سے، ہشام سے، انھوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی کہ جناب ابراہیمؑ شام کے صحرا میں وارد ہوئے تو ہاجرہ سے ان کے فرزند اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ اس واقعہ سے ان کی زوجہ سارہ کو شدید غم و اندوہ ہوا اس لیے کہ سارہ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ وہ ہاجرہ کو لے کر جناب ابراہیمؑ کو اذیت پہونچاتیں اور انھیں غم دیتی تھیں جس کی شکایت ابراہیمؑ نے خداوند عالم سے کی۔ خدا نے ان پر وحی فرمائی کہ عورت کی مثال ٹیڑھی پسلی جیسی ہے، اگر تم نے یونہی چھوڑ دیا تو اس سے استفادہ کر سکتے ہو اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو ٹوٹ ہو جائے گی۔

پھر خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ سارہ کے پاس سے ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو لے کر چلے جائیں۔ جناب ابراہیمؑ نے عرض کی: میرے پروردگار کس مقام پر لے کر جاؤں؟ فرمایا: میرے حرم اور میرے مقام امن جو زمین کا سب سے پہلا حصّہ ہے جسے میں نے خلق کیا ہے وہ مکہ ہے۔ جناب ابراہیمؑ کی خدمت میں جبرئیلؑ براق لے کر آئے۔ اس پر ھاجرہ و ابراہیم و اسماعیل کو سوار کیا۔ ابراہیمؑ کا گذر ایک ایسے اچھے مقام سے ہوتا جس میں طرح طرح کے درخت، کھجور کے درخت اور زراعت تھی، ابراہیمؑ جبرئیلؑ سے سوال کرتے ہیں کیا اس جگہ پر؟ کیا یہی جگہ ہے؟ جبرئیلؑ کہتے ہیں: نہیں چلتے رہیں، چلتے رہیئے یہاں تک کہ مکہ پہنچ کر انھیں خانۂ کعبہ کے پاس اتار دیا۔

ابراہیمؑ نے سارہ سے عہد کیا تھا کہ وہ سواری سے اترے بغیر ہی واپس آئیں گے۔ جب وہ اس جگہ پر پہونچے جہاں پر درخت تھا تو ہاجرہ نے اس درخت پر اپنی چادر ڈال دی اور اس کا سائبان بنالیا۔ جناب ابراہیم

نے جب انھیں وہاں پہونچا کر واپس پلٹنا چاہا تو ہاجرہ نے ان سے کہا: آپؑ ہمیں ایسے مقام پر کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں جہاں نہ کوئی ہمدم ہے نہ مونس، نہ پانی ہے نہ زراعت؟ تو جناب ابراہیمؑ نے فرمایا: میرے پروردگار نے تمھیں اس جگہ پر چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ جناب ابراہیمؑ وہاں سے پلٹ گئے۔ جب آپ ذی طویٰ کے علاقہ میں کدی نامی پہاڑ ذی طویٰ کے نزدیک پہونچے اور اپنی بیوی بچہ کی جانب متوجہ ہوئے تو بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ (سورۂ ابراہیم، آیت ۳۷: اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی ذریت میں سے کچھ کو بے آب وگیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس ٹھہرا دیا ہے، میرے پروردگار تاکہ یہ لوگ نماز قائم کریں تو لوگوں کے دلوں کو ان کی جانب مائل کر دے اور انھیں پھلوں کے رزق سے نواز دے، ہوسکتا ہے کہ وہ شکر ادا کریں)

پھر وہاں سے پلٹ گئے۔ ہاجرہ وہیں رہ گئیں، جب دن چڑھا تو جناب اسماعیلؑ پیاسے ہوئے وادی میں ہاجرہ کھڑی ہوئیں اور چلتے ہوئے ایک مقام تک پہونچیں اور صدا بلند کی ''کیا وادی میں کوئی مددگار ہے؟'' یہاں تک کہ اسمٰعیلؑ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر کوہ صفا پر چڑھیں جہاں پر سراب چمک رہا تھا، انھوں نے پانی کا گمان کیا، وادی کے اندر پہونچیں اور دوڑیں۔ پھر کوہ مروہ پر پہونچیں اسماعیل ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، پھر انھیں کوہ صفا کی جانب سراب چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر وادی میں پانی کی تلاش میں آئیں، پھر جب اسماعیلؑ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے پلٹ آئیں۔ یہاں تک کہ وہ کوہ صفا پر پہونچیں اور اسماعیلؑ کو دیکھا، اس طرح انھوں نے یہ عمل سات مرتبہ انجام دیا۔ جب ساتواں چکر تھا اور آپ کوہ مروہ پر تھیں، تو آپ نے اسماعیلؑ کو دیکھا کہ ان کے قدموں کے نیچے پانی بہہ رہا ہے۔ جناب ہاجرہ نے پانی کے اطراف میں ریت جمع کی تاکہ اس طرح پانی کو روک سکیں چونکہ (زم کے معنی روکنے کے ہیں) اس لیے اس کو ''آب زم زم'' کہتے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد قبیلہ جرہم اس مقام پر پہونچا۔ پانی کے جاری ہونے کے سبب پرندے اور صحرائی جانور بھی وہاں پہنچ گئے۔ قبیلہ جرھم نے جب اس مقام پر پرندوں کو دیکھا تو ان کے ساتھ ساتھ اس مقام پر پہونچے، جہاں انھوں نے ایک عورت اور بچہ کو دیکھا کہ درخت کے سایہ میں بیٹھے ہیں جن کے لیے یہ پانی جاری ہوا ہے۔ جرھم کے لوگوں نے کہا: تم کون لوگ ہو اور تمھاری کیا حالت ہے اور اس بچہ کی کیا حالت ہے؟ ہاجرہ نے کہا: میں ابراہیمؑ کی ام ولد (کنیز) ہوں۔ انھوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اجازت دیتی ہیں کہ ہم آپ کے نزدیک

ٹھہر جائیں؟ ہاجرہ نے کہا: میں ابراہیمؑ سے دریافت کرلوں۔

(امامؑ نے فرمایا) جناب ابراہیمؑ نے تیسرے روز دونوں سے ملاقات کی۔ ہاجرہ نے ان سے کہا: اے خلیل اللہ! یہاں قبیلۂ جرہم کے کچھ لوگ ہیں جو آپ سے درخواست کررہے ہیں کہ آپ انھیں ہم سے نزدیک قیام کی اجازت دیدیں۔ کیا آپ انھیں اس کی اجازت دیتے ہیں؟ جناب ابراہیمؑ نے اجازت دیدی۔ ہاجرہ نے قبیلہ جرہم کے لوگوں کو وہاں قیام کی اجازت دیدی۔ چنانچہ انھوں نے نزدیک ہی قیام کیا۔ اپنے خیمے نصب کیے۔ ھاجرہ و اسماعیل ان سے مانوس ہو گئے۔ ابراہیمؑ جب دوسری مرتبہ ان لوگوں سے ملاقات کو پہونچے اور ان کے اطراف لوگوں کی کثرت دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔ جب اسماعیلؑ کچھ بڑے ہوئے تو جرہم قبیلہ کی ہر فرد نے اسماعیل کو ایک دو بھیڑیں بطور ھدیہ دیں۔ اس طرح ھاجرہ اور اسماعیل زندگی بسر کرنے لگے۔ جب لوگوں کی خاصی تعداد ہوگئی تو خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو تعمیر کعبہ کا حکم دیا۔ ابراہیمؑ نے عرض کی: کس مقام پر؟ ارشاد ہوا: اُس مقام پر جہاں آدم پر قُبّہ نازل کیا گیا تھا جس نے حرم کو منور کردیا تھا۔

(امامؑ نے ارشاد فرمایا) طوفان نوحؑ کے زمانہ تک جناب آدمؑ پر نازل ہونے والا قُبّہ اسی طرح قائم تھا۔ جب (طوفان نوح میں) دنیا غرق ہوگئی تو خدا نے اس قُبّہ کو اٹھالیا تھا۔ پوری دنیا غرقاب ہوگئی تھی، مگر مکہ غرق نہیں ہوا تھا۔ اسے بیت العتیق اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اسے غرق ہونے سے آزاد رکھا گیا تھا۔ جب خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو خانۂ کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا تو وہ نہیں جانتے تھے کہ کس مقام پر بنائیں۔ چنانچہ خداوند عالم نے جبرئیلؑ کو بھیجا انھوں نے خانۂ کعبہ کے مقام پر خط کھینچا اور ان پر جنت سے ستون نازل فرمائے۔ جس پتھر کو آدمؑ پر نازل کیا گیا تھا وہ برف سے زیادہ سفید تھا، جب کافروں کے ہاتھوں نے اسے مس کیا تو سیاہ ہوگیا۔

(امامؑ نے فرمایا) جناب ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے اور جناب اسماعیلؑ (ذی طویٰ) وادی سے پتھر لاتے تھے، جسے انھوں نے سات ہاتھ کے برابر بلند کیا۔ جناب جبرئیلؑ نے جناب ابراہیمؑ کو پتھر نصب کرنے کا مقام بتایا، چنانچہ آپ نے اسے اس کی جگہ نصب کردیا جہاں وہ موجود ہے۔ آپ نے خانۂ کعبہ کے دو دروازے قرار دیے، ایک مشرق کی جانب، دوسرا مغرب کی جانب، مغربی دروازہ کو المستجار کہتے ہیں۔ جس پر انھوں نے خوشبودار گھاس رکھ دی۔ دروازہ پر ھاجرہ نے اپنی ردا ڈال دی جس کے نیچے یہ لوگ رہتے تھے۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد جناب ابراہیمؑ و جناب اسماعیلؑ نے حج کیا۔ ۸ ذی الحجہ یوم ترویہ دونوں پر جبرئیلؑ نازل ہوئے۔ جبرئیلؑ نے کہا: اے ابراہیم! اٹھیے اور پانی اپنے ہمراہ لے لیجئے اس لیے کہ منیٰ اور عرفات میں پانی

نہیں ہے۔ اسی سبب اسے ترویہ کہتے ہیں۔ پھر آپ کوہِ منیٰ کی جانب روانہ ہوئے آپؑ نے وہاں شب بسر کی۔ جبرئیلؑ نے آپؑ کے ساتھ وہی سب انجام دیا جو جناب آدمؑ کے ہمراہ انجام دیا تھا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر سے فراغت کے بعد جناب ابراہیمؑ نے عرض کی: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ... ''(سورہ بقرہ، آیت ۱۲۶)

(اور ابراہیم نے دعا کی ''اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور روز قیامت کو مانے، اسے ہر قسم کے پھلوں کا رزق مہیا کر'')

❁❁❁❁❁

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾
پروردگارا! تو ہم دونوں کو اپنا مسلم (فرماں بردار، اطاعت گذار) بنادے اور ہماری نسل سے ایسی قوم مبعوث کر جو تیری مسلم (فرماں بردار) ہو ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتلا اور ہماری توبہ قبول کر لے بے شک تو، توبہ قبول کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

قرائت:

ابن کثیر نے پورے قرآن میں اَرْنَا، راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن عامر اور ابوبکر نے عاصم سے سورہ سجدہ کی آیت رَبَّنَا اَرْنَا الَّذِيْنَ میں ابن کثیر کی موافقت کی ہے۔

ابوعمرو نے پورے قرآن میں راء کے کسرہ کو اختلاس (امالہ) کے ساتھ بغیر اشباع کے پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے اس کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

منتخب نظریہ یہ ہے کہ راء کو کسرہ دیا جائے گا اس لئے کہ یہ ہمزہ کا کسرہ ہے جو راء کی جانب منتقل ہو گیا ہے اس لئے کہ اَرِنَا کی اصل اَرْاِنَا ہے کسرہ کو راء کی جانب منتقل کر کے ہمزہ کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ

ہے کہ ہمزہ کے ساقط ہوجانے کے بعد بھی راء کو ساکن پڑھنا کلمہ کے ساتھ زیادتی ہے اور ہمزہ پر دلالت کے سبب باطل قرار دینا ہے۔

جس نے راء کو ساکن پڑھا ہے تو انہوں نے اسے ان اسماء کے مانند قرار دیا ہے جن میں ساکن کر دیا جاتا ہے جیسے کَبِد، کَبْد، فَخِذ سے فَخْذ شاعر نے کہا:

لَوْ عُصْرَ مِنْهُ الْبَانُ وَالْمِسْكُ انْعَصَرَ

اس مصرع میں لَوْ عُصْرَ دراصل لَوْ عُصِرَ تھا صاد کو ساکن کر دیا ہے۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے:

قَالَتْ سُلَيْمٰى اِشْتَرْ لَنَا سَوِيْقاً وَاشْتَرْ وَ عَجِّلْ خَادِمًا لَبِيْقاً

اِشْتَرْ دراصل اِشْتَرِ تھا۔ شاعر نے دونوں جگہ راء کو ساکن کر دیا ہے۔

اختلاس (امالہ) کا سبب طلب خفت و آسانی اور ہمزہ کے حذف ہونے پر دلالت کی بقا کی خاطر ہے۔

الفاظ و معانی:

اِسْلَام کے معنی خضوع و انکساری سے امر خدا کا تسلیم کرنا اور خداوند عالم کے تمام واجب کردہ امور و احکام کا اقرار کرنا ہے۔ ہمارے اور معتزلہ کے نزدیک اسلام اور ایمان ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اور لوگوں میں جو بھی دونوں کے درمیان فرق کا قائل ہے اس کے قول کو اللہ کا یہ ارشاد باطل کر رہا ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۹) (بے شک سچا دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے)

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۸۵) (اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا)

مَنَاسِك اس مقام پر وہ امور ہیں جو عبادت کا حصہ ہیں (جن کے ذریعہ عبادت کی جاتی ہے)

زجاج نے کہا ہے: ہر عبادت مَنْسَك ہے، نُسُك لغت میں عبادت کو کہتے ہیں۔ رَجُلٌ نَاسِكٌ (یعنی عبادت گذار شخص) اَلنُّسُك ذبیحہ کو کہتے ہیں۔ اس طرح کہا جاتا ہے جو شخص ایسا عمل کرتا ہے اس پر قربانی فرض ہے۔ نَسِيكَة (یعنی) ذَبِيحَه اور مَنْسَك اس مقام کو کہتے ہیں جس میں ناسک قربانیاں ذبح کرتا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً ابن درید نے بیان کیا ہے نسک کے لغوی

معنیٰ ذبائح (قربانیاں) کے ہیں جنھیں زمانۂ جاہلیت میں ذبح کیا جاتا تھا۔ نَسِیکَة، بکری ہے جو اسلام میں محرم میں ذبح کی جاتی تھی۔ پھر یہ قربانی کے ذریعہ منسوخ ہوگئی۔

ترکیب:

لَكَ میں لام مُسْلِمَیْنِ سے متعلق ہے۔ مِنْ ذُرِّیَّتِنَا میں مِنْ محذوف سے متعلق ہے اصل اس طرح ہے: وَاجْعَلْ مِنْ ذُرِّیَّتِنَا: جار ومجرور اِجْعَلْ کا مفعول بہ ہے۔ اَرِنَا میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

(۱) رَاَیْتُ سے منقول ہے یعنی باب افعال میں گیا ہے جس کے معنیٰ دیکھنے کے ہیں۔ ہمزہ کے ذریعہ اسے باب افعال میں لے گئے ہیں لہٰذا وہ دو مفعول کی جانب متعدی ہوگیا ہے در اصل مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے گویا اس طرح فرمایا: اَرِنَا مَوَاضِعَ مَنَاسِکِنَا یعنی مجھے ان مناسک کے مقامات کی معرفت کرا دے تاکہ ہم اپنے اعمال کو وہاں انجام دے سکیں اور وہ احرام کے لئے میقاتیں، عرفات میں مقام وقوف اور طواف کی جگہ ہے۔ یہ رَاَیْتُ الْمَوْضِعَ وَاَرَیْتُہٗ اِیَّاہُ کے مانند ہے یعنی میں نے اس مقام کو دیکھا۔ میں نے اس مقام کو اسے دکھایا۔

(۲) اَرِنَا عرب کے اس قول سے منقول ہے کہ: فُلَانٌ یَرٰی رَاْیَ الْخَوَارِجِ (فلان شخص خوارج کا عقیدہ رکھتا ہے) اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ عَلِّمْنَاہُ مَنَاسِکَنَا: ہمیں ہمارے اعمال سکھا دے۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے:

اَرِینِی جَوَادًا مَّاتَ هُزْلًا لَعَلَّنِی اَرٰی مَا تَرِیْنَ اَوْ بَخِیْلًا مُّخَلَّدًا

شاعر نے اس شعر میں اَرِینِی سے دُلِّینِی مراد لیا ہے (یعنی میری رہنمائی کر) (اس نے آنکھ سے دیکھنے کو مراد نہیں لیا ہے)

تفسیر:

جناب ابراہیمؑ و جناب اسماعیلؑ کی دعائیں

پھر خداوند عالم نے دونوں (ابراہیم و اسماعیل) کی مکمل دعا کا ذکر فرمایا ارشاد ہوتا ہے: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ، یعنی انھوں نے کہا: پروردگار ہماری آئندہ عمر میں ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار قرار دے! جس

طرح تو نے ہمیں ہماری گذشتہ عمر میں اپنا فرماں بردار قرار دیا تھا۔ تو ہمیں توفیق اور لطف و مہربانی عنایت فرما جن پر اسلام میں ثابت قدم رہنے کی تو نے ہمیں دعوت دی ہے۔ یہ بالکل اس کے مانند ہے جس طرح ہم میں سے کوئی اپنے فرزند کو ادب سکھائے اور اس کے سامنے (اس طرح کے امور پیش کرے یہاں تک کہ وہ باادب ہو جائے۔ بس اس طرح کہنا جائز و مناسب ہوگا کہ اس نے اپنے فرزند کو باادب بنا دیا۔ اس کے برعکس جب فرزند کو مصیبت اور فساد میں مبتلا کر دے تو یہ کہنا جائز ہوگا کہ اس نے ظالم و فاسد بنا دیا۔

بیان کیا گیا ہے کہ مسلمین کے معنی ہیں تیرے موحدین، مخلصین۔ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، نہ ہی تیرے علاوہ کسی کو اپنا پروردگار پکارتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے: ہم تمام اسلامی احکام پر قائم ہیں، تیرے اطاعت گذار ہیں، اس لیے کہ اسلام، اطاعت، تسلیم اور خضوع اور محرمات کے ترک کرنے کا نام ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ، اور ہماری ذریت و اولاد میں قرار دے۔ مِنۡ تَبۡعِیض کے لیے ہے۔ ابراہیمؑ کے بعض (افراد امت) کے مخصوص قرار دینے کی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کو بتا دیا کہ ان کی ذریت میں وہ بھی ہوں گے کہ ظالمین تک اس کا عہد نہیں پہنچے گا اس ظلم کے سبب جو انھوں نے انجام دیا ہوگا۔ سُدی نے کہا ہے: اس سے عرب مراد ہیں۔ پہلا قول صحیح ہے۔

اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ. ایسی موحد جماعت جو تیری اطاعت گذار ہو، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت جس پر اس کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ. امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: امت سے خاص طور پر بنی ہاشم مراد ہیں۔

اس کا ارشاد: وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا. یعنی ہمیں وہ مقامات پہنچوا دے جس سے قربانی متعلق ہو، تاکہ ہم اسے وہاں انجام دیں اور اپنی توفیق کے مطابق اس مقام پر اپنی عبادت بجا لائیں۔ قتادہ نے کہا ہے: خداوند عالم نے دونوں کے مناسک طواف کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی، میدان عرفات کی جانب کوچ اور روانگی، رمی جمرات دکھا دیئے یہاں تک کہ ان کے ذریعہ دین مکمل کر دیا۔

عطا اور مجاہد نے کہا ہے: مَنَاسِكَنَا کے معنی مَذَابِحَنَا (یعنی ہمارے ذبح و قربانی کرنے کے مقامات) ہیں۔ پہلا قول قوی ہے۔

وَتُبۡ عَلَيۡنَا. میں چند وجہیں ہیں:

اول: دونوں نے کہا یہ کلمہ تسبیح تعبد (عبادت) اور اللہ کی بارگاہ میں بازگشت کے عنوان سے ہے تاکہ

اس بارے میں لوگ دونوں کی اقتداو پیروی کریں۔یہی قول صحیح ہے۔

دوم: دونوں نے اپنی ذریت کے مظالم سے توبہ کی دعا کی۔

سوم: اس کے معنی ہیں: ہماری جانب مغفرت ورحمت کے ساتھ رجوع کر۔اس میں انبیاء علیہم السلام کے گناہ صغیرہ انجام دینے اور قبیح کے بجالانے کے جواز پر دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ مضبوط و محکم ادلہ دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام گناہان صغیرہ وکبیرہ سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔اس مقام پر اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ، گناہان کبیرہ کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔کہا گیا ہے: بہت زیادہ توبہ کا قبول کرنے والا ہے۔بار بار توبہ قبول کرتا ہے۔ الرَّحِيْمُ (رحم کرنے والا ہے) اپنے بندوں کو عظیم نعمتیں عطا کرنے والا ہے، ان کی خطاؤں اور گناہوں سے کفارہ قبول کرتا ہے۔

آیت میں اس امر پر دلالت ہے کہ جس کے متعلق دعا کرنے والا واقف اور جانتا ہو کہ اس طرح حتمی ہونا ہے، اس کے متعلق دعا اچھی اور بہتر ہے، اس لیے کہ دونوں (ابراہیمؑ واسماعیلؑ) جانتے تھے کہ وہ خطاؤں اور گناہوں کے نزدیک نہیں جائیں گے اور دین اسلام سے جدا نہیں ہوں گے۔

❀❀❀❀❀

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾
بارالٰہا! ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک رسول مبعوث فرما جو انھیں تیری آیتوں کی تلاوت کرکے سنائے، ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیۂ نفس کرے، بلاشبہ تو بڑا صاحب اقتدار اور صاحب حکمت ہے۔

الفاظ ومعانی:

الْعَزِيْزُ، وہ (خدا) ہے جس پر غلبہ حاصل نہیں کیا جاسکتا (وہ مغلوب نہیں ہوسکتا) اس کے ارادہ سے کوئی مانع نہیں ہوسکتا (جس چیز کا وہ ارادہ کرے اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی) عِزّ کی نقیض (ضد) ذُلّ ہے۔

حَكِيْم کے معنی مدبر کے ہیں جو صنعت وکاری گری کا حکم دیتا ہے (فیصلہ کرتا ہے) حسن تدبر سے کام

لیتا ہے (اپنی تدبیر کو باحسن وجوہ انجام دیتا ہے) اس طرح یہ اس کے صفات فعل سے ہے۔ اگر عَلِیۡم کے معنی میں ہوگا تو صفات ذات سے ہوگا۔

ترکیب:

اِبۡعَثۡ جملہ فعلیہ ہے جو تُبۡ پر عطف ہے:۔ فِیۡہِمۡ، ابۡعَثۡ سے متعلق ہے۔ محذوف کے متعلق بھی ہوسکتا ہے۔ گویا اس طرح ہوگا: رَسُوۡلاً کَائِناً فِیۡہِمۡ پس وہ محلاً منصوب ہوگا حال ہونے کی بنا پر۔ یَتۡلُوۡ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ رَسُوۡلاً کی صفت ہے یعنی تَالِیاً عَلَیۡہِمۡ۔ جار و مجرور یَتۡلُوۡ سے متعلق ہے۔

تفسیر:

بعثت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد

آیت میں فِیۡہِمۡ کی ضمیر اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً کی طرف پلٹ رہی ہے، جس کے متعلق ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ وہ ان کی ذریت سے بھی (امام) بنائے گا۔ جس کے معنی اس ارشاد میں ہیں: رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ، یہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اس کی روایت آپؐ سے کی گئی ہے، آپؐ نے فرمایا: اَنَا دَعۡوَۃُ اَبِیۡ اِبۡرَاھِیۡمَ وَبَشَارَۃُ عِیۡسٰی عَلَیۡہِمَا السَّلَامُ، (میں اپنے جد ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت ہوں) جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ۔ (سورۂ صف، آیت ٦) (اور بشارت دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے) یہ قول ہے حسن، قتادہ اور علماء کی ایک جماعت کا، جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ (ابراہیمؑ) نے اپنی ذریت کے لیے دعا کی تھی جو مکہ اور اطراف مکہ میں موجود تھی جس پر یہ آیت مشتمل ہے: رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُزَکِّیۡہِمۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ، یعنی اس ذریت میں انھیں میں رسول مبعوث فرما۔ اس امت میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی کو مبعوث نہیں فرمایا۔

یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ، یعنی ان پر تیری آیات کی تلاوت کرتا ہے جس کی ہم نے ان کی طرف وحی کی ہے۔ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ، یعنی قرآن، یہ تکرار شمار نہیں ہوگی اس لیے کہ پہلے (یعنی آیات) کو تلاوت سے

مخصوص کیا ہے تاکہ اس بارے میں معلوم ہو جائے کہ یہ معجزہ ہے جو آپؐ کی صداقت اور نبوت پر دلالت کر رہا ہے اور دوسری (اَلْكِتٰبَ) کو تعلیم سے مخصوص کیا ہے تاکہ لوگ اس میں توحید اور شریعت کے احکام سے متعلق موجود دلائل سے واقف ہو جائیں۔ وَالْحِكْمَةَ، بیان کیا گیا ہے کہ اس مقام پر سنت مراد ہے۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے: دین کی معرفت اور تفقہ ہے۔ مالک بن انس کی تفسیر میں کہا گیا ہے: ان احکام کا علم مراد ہے جن کا علم رسولؐ کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ابن زید سے روایت میں کہا گیا ہے: الحکمۃ الکتاب، کی صفت ہے، گویا اس کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ کتاب ہے اور یہ حکمت ہے اور آیات ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ حکمت ایسی چیز ہے جسے خداوند عالم قلب میں قرار دیتا ہے اور اسے اس طرح نورانی بنا دیتا ہے جس طرح بصارت کو نورانی بنا دیتا ہے اور صاحب بصیرت اس کا ادراک کر لیتا ہے۔

کہا گیا ہے: حکمت قرآن کے مواعظ اور اس کے حلال و حرام ہیں۔ مقاتل سے روایت ہے کہ ہر اچھی چیز (مراد) ہے۔ اور کہا گیا ہے: حکمت کا مفہوم ہے انھیں ایسے فعل کی دعوت دیتا ہے جس کا تعلق ایمان اور صلاح و فلاح سے ہے جس کے ذریعہ وہ پاکیزگی حاصل کرتے ہیں۔ یہ جبائی سے مروی ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ انھیں اطاعت گذار، مخلصین اور پاک بناتا ہے اور اَلزَّكَاء کے معنیٰ اطاعت اور اللہ سبحانہ کے لئے اخلاص کے ہیں۔ یہ ابن عباس سے مروی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ انھیں شرک سے پاک کرتا ہے اور اس سے چھٹکارا دلاتا ہے۔ یہ ابن جریج سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے اس کے معنیٰ ہیں کہ انھیں اس کام کی جانب بلاتا ہے جو ان کے ایمان کو پاک کرتا ہے، ان کی اصلاح کرتا ہے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کے حق میں گواہی دیتا ہے کہ وہ روز قیامت پاک و پاکیزہ ہوں گے جبکہ وہ ہر نفس کے لئے وہی گواہی دے گا جو کچھ اس نے کمایا ہوگا۔ یہ اصم سے مروی ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ، یعنی تو اپنی کمال قدرت میں قوی اور جلالِ عظمت میں عظیم و بلند اور اپنی صفت کی جدت میں محکم و مضبوط ہے۔ ان دونوں صفتوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ دعا سے متصل و وابستہ ہیں، گویا اس طرح کہا جا رہا ہے: ہم اپنی دعا میں تیرے حضور گڑگڑاتے ہیں، اس لیے کہ تو ہماری دُعا قبول کرنے پر قادر ہے اور اللہ ہمارے رازہائے نہاں سے بھی واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہمارے لئے کیا

زیادہ صحیح ودرست ہے جس تک ہمارے علم کی رسائی نہیں اور ہماری بصیرت کا دامن اس سے کوتاہ ہے۔

اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تمام شرائط نبوت کے ساتھ دُعا فرمائی تھی، اس لیے کہ تلاوت کے تحت ادائیگی اور تعلیم کے تحت بیان ہے اور حکمت کے تحت سنت ہے، دونوں نے اپنی امت کے لیے لطف کی دعا کی جس کے سبب لوگوں نے (اللہ) کی کتاب وشریعت سے تمسک اختیار کیا، جس کے نتیجہ میں وہ پاک ہوئے۔ چونکہ دعا اسماعیلؑ سے صادر ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پیغمبرؐ کے لیے دعا کی گئی ہے وہ اسماعیلؑ کی اولاد ہیں نہ کہ اسحاق کے فرزند اور اسماعیلؑ کی اولاد میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی اور پیغمبر نہیں ہوا۔

❁❁❁❁❁

وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصۡطَفَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾

اب کون ہے، جو ابراہیم کے طریقے سے روگردانی کرے؟ سوائے اس کے جس نے خود اپنے آپ کو حماقت وجہالت میں مبتلا کرلیا ہو۔ ابراہیم تو وہ ہیں جنھیں ہم نے دنیا میں منتخب کیا تھا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا۔

الفاظ ومعانی:

رَغبة اس چیز کی محبت جس میں انسان کے لیے منفعت ہو۔ رَغِبۡتُ فِيۡهِ (مجھے اس میں رغبت ہے) رَغِبَ عَنۡهُ کی ضد ہے۔ رغبت، محبت اور ارادہ باہم مشابہ ہیں۔ رغبت کی ضد رہبت ہے اور محبت کی ضد بغض ہے۔ ارادہ کی ضد کراہت ہے۔ آپ رَغِبۡتُ فِيۡهِ رَغبةً وَرَغَبًا اس وقت کہتے ہیں جب کسی چیز کی طرف مائل ہوتے ہیں اور رَغِبۡتُ عَنۡهُ اس وقت کہتے ہیں جب کسی چیز سے رُکتے ہیں (مانع ہوتے ہیں)

رَغِيۡب کے معنی مقامات میں وسعت کے ہیں۔ رَغِيۡبَة کثیر عطا کو کہتے ہیں جس میں رغبت (مرغوبیت) ہوتی ہے۔

اِصۡطِفَاء، اِجۡتِبَاء اور اِخۡتِيَار مشابہ ہیں۔ صَفَا، نَقَا اور خُلُوۡص مشابہ ہیں۔ صَفو كَدِر

(گدلاپن اور تلخ) کی نقیض وضد ہے۔ صَفِيُّ الْاِنْسَان وہ بھائی ہے جو محبت میں خالص ہو۔ نَاقَةٌ صَفِيَّة (بکثرت دودھ دینے والی اونٹنی) نَخْلَةٌ صَفِيَّة (بکثرت پھل دینے والا درخت خرمہ) اس کی جمع صَفَايَا ہے۔

ترکیب:

مَن يَّرْغَبُ میں مَن استفہام کے لئے ہے اور اس کے معنی جحد (نفی) کے ہیں گویا اس طرح فرمایا ہے: مَا يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ وَلَا يَزْهَدُ فِيْهَا اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ یعنی اَلَّذِیْ سَفِهَ نَفْسَهٗ پس پہلا مَن استفہام کے لئے اور دوسرا مَن، اَلَّذِیْ کے معنی میں ہے۔ اِلَّا حرف استثناء ہے۔

ممکن ہے کہ اِلَّا نفی کو توڑنے کے لئے ہو۔ مَن اسم موصول ہے، سَفِهَ نَفْسَهٗ اس کا صلہ ہے، موصول اور صلہ بر بنائے استثناء محلاً منصوب ہیں یا يَرْغَبُ میں پوشیدہ ضمیر کا بدل ہونے کی وجہ سے محلاً مرفوع ہے۔

نَفْسَهٗ کے منصوب ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ اخفش نے کہا: اس کے معنی سَفَّهَ نَفْسَهٗ کے ہیں یعنی اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرنا۔ یونس نے کہا: ایک لغت یہ بھی ہے کہ سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی اَرَاهَا کے ہیں (اسے دکھایا) زجاج نے کہا: ارادہ کیا ہے کہ فَعِلَ مبالغہ کے لئے جس طرح فَعَّلَ ہے۔ اس قول کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ سَفِهْتُ زَيْدًا اَسَفَّهْتُ زَيْدًا کے معنی میں ہے۔ (زید کو بیوقوف بنایا)

ابوعبیدہ نے کہا: سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی اَهْلَكَ نَفْسَهٗ وَ اَوْبَقَ نَفْسَهٗ یعنی اپنے آپ کو ہلاک اور تباہ وبرباد کرلیا۔ یہ سب ایک وجہ ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بر بنائے تمیز ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: عرب سَفِهَ کو نفس پر ڈالتے ہیں اور وہ معرفت ہے اسی طرح بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا بھی ہے۔

زجاج نے اس وجہ کو رد کیا اور کہا کہ تمیز میں تعریف کے معنی نہیں ہوتے ہیں اس لئے کہ تمیز واحد ہوتی ہے جو جنس پر دلالت کرتی ہے یا خصلت پر دلالت کرتی ہے۔ جو اس کے درمیان خالص ہو۔ جب آپ نے یہ جان لیا تو وہ مقصود ہے جس کا اس نے قصد کیا ہے اور اس بات کو گذشتہ علمائے نحو نے میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ تمیز ہو اور اضافہ ہو انفصال کو مقدر مان کر جیسے آپ کہیں: مَرَرْتُ بِرَجُلٍ

مِثْلِهِ یعنی مِثْلُ لَهُ۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ نَفْسَہ حرف جر کے محذوف ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی سَفِهَ فِیْ نَفْسِہٖ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۔یعنی لِاَوْلَادِكُمْ پس مجرور کو چھوڑ کر حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے اسی کے مانند یہ آیت بھی ہے: وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ یعنی عَلٰی عُقْدَةَ النِّكَاحِ، اسی طرح شاعر کا شعر ہے:

نُغَالِي اللَّحْمَ لِلْاَضْيَافِ نَيًّا نَبْذُلُهُ اِذَا نَضِجَ الْقُدُوْرُ

مقصود نُغَالِي بِاللَّحْمِ ہے۔

زجاج نے کہا: یہ قول صحیح ہے۔

پانچویں وجہ وہ ہے جسے زجاج نے اختیار کیا ہے کہ سَفِهَ جَهِلَ کے معنی میں ہے۔ یہ قول معنی میں اس قول کے مطابق ہے جسے سراج نے بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا کے بارے میں کہا ہے۔ اس لئے کہ بطر اور اتراہٹ نعمت کو کم کرنے والی ہے کہ جس سے وہ راضی نہیں ہے ایسی صورت میں نَفْسَہٗ مفعول بہ ہوگا۔

فِي الْاٰخِرَةِ میں جار و مجرور متعلق بہ محذوف ہے۔ محلاً منصوب، حال ہے اور اس کا ذو الحال مِنَ الصّٰلِحِيْنَ میں پوشیدہ ضمیر ہے۔

شان نزول

روایت کی گئی ہے کہ عبداللہ بن سلام نے اپنے بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کہا: تم جانتے ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف توریت میں موجود ہیں۔ سلمہ نے اسلام قبول کر لیا اور مہاجر نے اسلام لانے سے انکار کر دیا تو اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

جناب ابراہیمؑ، نمونہ ذات

جب خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کا واقعہ بیان فرمایا کہ ابراہیمؑ کی ملت، محمدؐ کی ملت ہے۔ تو پھر فوراً اس کے بعد اس کے پیروکاروں کے ذکر کو ابھارتے ہوئے فرمایا: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ

سَفِهَ نَفْسَهٗ ' اب کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے روگردانی کرے سوائے اس کے جس نے خود کو حماقت و جہالت میں مبتلا کرلیا ہو۔ یعنی ابراہیمؑ کے دین اور شریعت کو ترک نہیں کرے گا سوائے اس شخص کے جو خود کو ہلاک اور برباد کردے۔ بیان کیا گیا ہے اپنے نفس کو گمراہ کرے۔ یہ حسن سے روایت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنی قدر و منزلت سے ناواقف ہو اس لیے کہ جو شخص اپنے خالق سے جاہل اور ناواقف ہو وہ اپنی ذات اور نفس سے بھی جاہل ہوگا۔ یہ اصم کا قول ہے۔ کہا گیا ہے: اپنے نفس میں موجود آیات اور نشانیوں سے جاہل ہے جو اس امر پر دلالت کررہی ہیں اس کا کوئی خالق ہے جس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ ابو مسلم سے روایت ہے۔

ارشادالٰہی: وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا. یعنی ہم نے اس کا اختیار اور انتخاب دنیا میں کیا ہے۔ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ. یعنی وہ آخرت میں کامیاب و کامران افراد میں سے ہیں۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے: صالحین کے ساتھ ہوں گے یعنی اپنے آباء واجداد و انبیاء کے ہمراہ جنت میں ہوں گے۔

بیان کیا گیا ہے: آخرت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وہ دنیا میں بھی اسی طرح ہوں گے۔ اس کے معنی ہیں یہ ان افراد میں سے ہیں جن کے متعلق اللہ پر ان کی کرامت و شرافت اور حسن ثواب لازمی ہو گیا ہے۔ پس جب خالص ثواب آخرت سے وابستہ ہے دنیا سے نہیں تو اس کی صفت (آخرت) سے کی گئی جس سے وہ ظاہر ہوتی ہے۔

ارشادالٰہی: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ، میں دلالت ہے کہ ملت ابراہیم ہی ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملت ہے، اس لیے کہ ملت ابراہیمؑ، ملت محمدؐ میں داخل ہے۔ مزید اضافے کے ساتھ جس سے ظاہر ہوتا ہے کفار سے جو لوگ ملت محمدؐ جو کہ ملت ابراہیمی ہے سے اعراض و انحراف رکھتے ہیں وہ اپنے آپ سے جاہل و ناواقف ہیں۔ یہ معنی ہیں قتادہ و ربیع کے قول کے جس پر یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۔ (سورۂ حج، آیت ۷۸) یہ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت ہے۔

❀❀❀❀❀

اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۳۱﴾

جب ان کے رب نے ان سے کہا سر تسلیم خم کر دو (اپنے آپ کو مکمل خدا کے سپرد کر دو) تو انھوں نے فوراً کہا: میں نے مالک کائنات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

ترکیب:

قَالَ فعل ماضی ہے۔ لَهٗ جار و مجرور متعلق بہ قَالَ ہے۔ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ محلاً مجرور ہے اس لئے کہ اِذۡ کا مضاف الیہ ہے۔ لِرَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ کا لام اَسۡلَمۡتُ کے متعلق ہے۔

تفسیر

جناب ابراہیمؑ کی نمایاں صفت

یہ آیت اللہ کے اس ارشاد: وَلَقَدِ اصۡطَفَيۡنَاهُ، سے متصل ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے یقیناً ہم نے ان کا اصطفا (انتخاب) کیا جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا (خود کو میرے حوالے کر دو) اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ بات ان سے کب کہی گئی۔ حسن نے کہا ہے: یہ اس وقت کی بات ہے جب آفتاب غروب ہو گیا اور ابراہیمؑ نے ان آیات اور ادلہ کا مشاہدہ کیا تو ان کے ذریعہ خدا کی وحدانیت پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا: فَلَمَّا رَاَ الشَّمۡسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيۡ هٰذَاۤ اَكۡبَرُ فَلَمَّاۤ اَفَلَتۡ قَالَ يٰقَوۡمِ اِنِّيۡ بَرِيۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ اِنِّيۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِيۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ۔ (سورۃ انعام، آیت ۷۸-۷۹) (پھر جب سورج روشن دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے؟ یہ سب سے بڑا ہے پس جب وہ غروب ہو گیا تو کہا: اے میری قوم والو! میں ان سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔ میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)

اس وقت وہ سراپا تسلیم ہو گئے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ بات انھیں نبوت ملنے سے پہلے کی ہے۔ اسے انھوں نے الہام کے طور پر کہا، جب ان سے اسلام کی استدعا و خواہش کی گئی۔ بس انھوں نے مکمل خود سپردگی کی جب ان پر استدلال کے ذریعہ واضح ہو گیا جن آیات کا انھوں نے مشاہدہ کیا تھا ان کے اسلام

سے قبل خدا کا ان پر وحی کرنا درست نہیں ہے کہ وہ خدا کے نبی ہیں، اس لیے نبوت با جلالت اور عظیم کیفیت کا نام ہے جو اسلام سے قبل نہیں ہو سکتی۔

ابن عباس نے کہا ہے: ابراہیمؑ نے یہ بات اس وقت کہی جب وہ غار سے باہر نکلے تھے۔

بیان کیا گیا ہے: یہ بات انھوں نے نبوت کے بعد کہی تھی۔

اَسۡلِمۡ کے معنی اسلام پر استقامت اور توحید پر ثابت قدم رہنے کے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاعۡلَمۡ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (سورہ محمد، آیت ۱۹) جان لو کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے۔

بیان کیا گیا ہے: اَسۡلِمۡ کے معنی ہیں اپنے دین کو توحید کے ذریعہ خالص بناؤ۔

ارشاد الٰہی: اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ یعنی میں نے دین کو عالمین کے پروردگار کے لیے خالص کرلیا۔

❁❁❁❁❁

وَوَصّٰی بِہَاۤ اِبۡرٰہٖمُ بَنِیۡہِ وَیَعۡقُوۡبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰی لَکُمُ الدِّیۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾
ابراہیم نے اپنی اولاد کو اسی طریقے پر چلنے کی وصیت کی تھی اور یعقوب نے بھی یہی وصیت کی۔ انھوں نے کہا: "اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا تم سب مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔"

قرائت:

اہل مدینہ اور اہل شام نے وَ اَوۡصٰی پڑھا ہے ہمزہ کو دو واو کے درمیان قرار دیا ہے اور صاد کو تشدید نہیں دی ہے۔ بقیہ قراء نے وَصّٰی کے صاد کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

جن قراء نے وَصّٰی پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے: فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ تَوۡصِیَۃً ہے۔ تَوۡصِیَۃً وَصّٰی کا مصدر ہے جیسے قَطَّعَ تَقۡطِعَۃً ہے۔ وَصّٰی کا مصدر تفعیل کے وزن پر نہیں آئے گا اس لئے کہ اگر آپ حَیَّیۡتُ کے مصدر کو تفعیل کے وزن پر قرار دیتے تو تین یاء جمع ہو جاتیں پس اس وزن کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

اور جن حضرات نے اَوْصیٰ پڑھا ہے تو ان کی دلیل یہ ارشادِ الٰہی ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ۔ وَمِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ۔

الفاظ و معانی:

وَصّٰی وَ اَوْصٰی، اَمَرَ وَ عَهِدَ کے ایک ہی معنی ہیں۔ وَصِيُّ الْبَيْتِ کہتے ہیں جب بعض بعض سے متصل کریں پس وصیت گویا مُوْصِی (وصیت کنندہ) وصیت کے ذریعہ اپنے جملہ امور کو مُوْصٰی اِلَيْهِ (جس کے لیے وصیت کی جائے) سے متصل اور وابستہ کرتا ہے۔

ترکیب:

لفظ يَعْقُوْبُ مرفوع ہے اس لئے کہ لفظ اِبْرَاهِيْمُ پر عطف ہے گویا اس طرح ہے: وَوَصّٰی اِبْرَاهِيْمُ وَ يَعْقُوْبُ۔ یہی ابن عباس اور قتادہ کے قول کا مطلب ہے۔ کہا گیا ہے کہ یعقوبُ مرفوع ہے اس لئے کہ مستأنفہ ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: وَ وَصّٰی يَعْقُوْبُ اَنْ يَا بَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّيْنَ۔ پہلا قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔

دونوں فرضیے میں فرق یہ ہے کہ پہلے فرضیہ میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں مانی گئی ہے اس لئے کہ وہ معطوف ہے لیکن دوسرے فرضیہ میں پوشیدہ رکھا گیا ہے اور بِهَا کی ضمیر مِلَّةَ کی جانب پلٹ رہی ہے اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر كَلِمَةَ کی طرف پلٹ رہی ہے جو اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ہے۔

اَلدِّيْنَ میں الف لام عہد کے لئے ہے، استغراق کے لئے نہیں ہے اس لئے کہ الدین سے دین اسلام کا ارادہ کیا ہے۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ: اگر چہ لفظاً یہ انہیں موت سے نہی کی ہے لیکن درحقیقت یہ ترک اسلام سے نہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسلام چھوڑ دیں اور انھیں موت آجائے۔ کلام عرب میں اس کی مثال یہ کلام ہے: لَا اَرَيَنَّكَ هَاهُنَا میں تمہیں یہاں ہرگز نہ دیکھوں۔ یہ لفظاً نہی متکلم کے لئے ہے لیکن درحقیقت مخاطب کے لئے ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: لَا تَتَعَرَّضْ لِاَنْ اَرَاكَ بِكَوْنِكَ هَاهُنَا، اپنے آپ کو

پیش نہ کرو کہ میں دیکھوں کہ تم یہاں ہو۔

وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ جملۂ حالیہ ہے۔ گویا اس طرح ہے: لَا تَمُوۡتُوۡا اِلَّا مُسۡلِمِیۡنَ۔ ذوالحال تَمُوۡتُنَّ میں واو ضمیر ہے مراد یہ ہے کہ تمہیں موت آئے اس حالت میں کہ تم مسلمان رہو۔

تفسیر:

جناب ابراہیمؑ کی وصیت

جب خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی اپنی ذریت کے بارے میں دعا کو بیان فرمایا اور ان کی ملت سے اعراض و انحراف کرنے والوں پر سفاہت و جہالت کا حکم نافذ کیا، ان کے امر دین اور عہد و نبوت کے متعلق وصیت کا اہتمام و اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَوَصّٰی بِهَا، اور ابراہیم نے اپنی اولاد کو اسی طریقے پر چلنے کی وصیت کی تھی۔ بہا سے مراد ملة یا کلمة ہے اور ابراہیم کا قول ہے: اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، میں نے مالک کائنات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اس کی تائید اللہ کا یہ ارشاد کر رہا ہے: وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیۡ عَقِبِهٖ (سورہ زخرف، آیت ۲۸) اور ہم نے اس پیغام کو ان کی نسل میں کلمۂ باقیہ قرار دیا اور کہا گیا ہے: کلمۂ اخلاص یعنی لا الہ الا اللہ کے ذریعے۔

اِبۡرٰهٖمُ بَنِیۡهِ اولاد کو اس لیے مخصوص کیا گیا ہے چونکہ اولاد ہی پر زیادہ تر اظہار محبت و عطوفت و مہربان ہوتا ہے اور وہی وصیت قبول کرنے کے زیادہ مناسب اور مستحق ہیں، ورنہ تو یہ بات واضح ہے کہ ابراہیمؑ تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے اور یعقوبؑ، حضرت اسحاقؑ کے فرزند ہیں، یعقوب نام کی وجہ یہ ہے کہ یعقوب اور عیص دو جڑواں بھائی تھے۔ عیص آگے چلے گئے تھے یعقوب ان کی تلاش میں نکلے اور انھیں عَقَب یعنی پشت کی جانب سے پکڑا۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے، معنی ہیں یعقوب نے اپنے بارہ فرزندوں کو وصیت کی جو اسباط ہیں۔

یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰی لَكُمُ الدِّیۡنَ، اے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے۔ یعنی دونوں نے تمام کو کہا: اے فرزندو! خدا نے تمھارے لیے دین اسلام کو منتخب کیا ہے۔ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ، یعنی اسلام کو ترک نہ کرنا کہ تمھیں موت آجائے، اس کے ترک کرنے پر یا اسلام ترک کر کے کفر انجام دے کر موت کے درپے نہ ہو جانا۔ زجاج نے کہا ہے: اسلام کی پابندی کرو جب تمھیں

موت آئے تو تم مسلمان ہو۔

آیت شریفہ میں موت کے وقت وصیت پر ترغیب کی دلالت ہے۔ مناسب و سزاوار ہے کہ جو شخص اس کا نگراں و ذمہ دار ہے اسے چاہیے تقویٰ الٰہی، دین کی پابندی اور اطاعت الٰہی کی وصیت کرے۔

❁❁❁❁❁

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾
پھر کیا تم اس وقت دیکھ رہے تھے، جب یعقوب کی موت کا وقت آ گیا تو اس وقت انھوں نے اپنی اولاد سے پوچھا "میرے بعد تم سب کس کی عبادت کرو گے؟" انھوں نے جواب دیا: ہم اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق نے خدا مانا ہے اور ہم تو اسی کے مسلم ہیں۔

الفاظ و معانی:

شُهَدَاءَ شَهِيْد کی جمع ہے۔ شاهد و حاضر باہم مشابہ ہیں۔ حَضِيْرَةٌ لوگوں کی ایسی جماعت جو پانچ سے دس افراد پر مشتمل ہو۔ اس کا باب الحضور ہے جو غیبت کے خلاف ہے۔

ترکیب:

یہاں پر اَمْ منقطعہ ہے یہ صرف اسی وقت آتا ہے جب اس سے پہلے جملہ ہو اس لئے کہ یہ اَمْ وہ ہے جو بَلْ اور ہمزۂ استفہام کے معنی میں ہوتا ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے: بَلْ اَكُنْتُمْ شُهَدَآءَ۔

یہاں پر اَمْ کے معنیٰ جحد (نفی) کے ہیں۔ مَا كُنْتُمْ شُهَدَاءَ لفظ میں تو استفہام ہے لیکن معنی میں اس کے برخلاف ہے اس لئے کہ اس بات کو استفہام کی صورت میں پیش کرنا کلام میں زیادہ بلیغ ہے اور احتجاج میں زیادہ شدید اظہار کرنے والا ہے اس لئے کہ کلام حق کے اعتراف کے مقام سے نکلتا ہے یا تو اس پر حجت قائم کر دیتا ہے وہ اس کا انکار کرتا ہے پس اس سے رسوائی ظاہر ہو جاتی ہے۔

پہلا اِذْ شُهَدَآءَ کا ظرف ہے اور دوسرا پہلے اِذْ کا بدل ہے۔ کہا گیا ہے کہ دوسرے اِذْ میں عامل حَضَرَ ہے۔ دونوں جائز و ممکن ہے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ میں مَا استفہام کے لئے اور محلاً منصوب ہے اس لئے کہ تَعْبُدُوْنَ کا مفعول ہے۔

مِنۢ بَعْدِیْ جار و مجرور، محلاً منصوب ہے ظرف کی بنا پر۔ اِلٰهًا وَّاحِدًا دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے منصوب ہے:

(۱) یا تو حال ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: نَعْبُدُ اِلٰهَكَ فِیْ حَالِ وَحْدَانِيَّتِهٖ ہم آپ کے اللہ کی بندگی کریں گے اس کی وحدانیت کے اقرار کی حالت میں۔

(۲) یا تو اِلٰهَكَ کا بدل ہے اس میں فائدہ ذکر توحید کا ہے۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: جملہ حالیہ ہے۔ نیز جملہ مستانفہ بھی ہوسکتا ہے اگر مستانفہ ہوگا تو اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہوگا۔

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ مجرور ہیں اس لئے کہ اٰبَآئِكَ کا بدل جس طرح آپ کہتے ہیں: مَرَرْتُ بِالْقَوْمِ اَخِيْكَ وَغُلَامِكَ وَصَاحِبِكَ۔

تفسیر:

جناب یعقوبؑ کا سوال

خداوند عالم نے اہل کتاب سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ، یعنی کیا تم حاضر نہیں تھے۔ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ، جب یعقوب کی موت کا وقت آ گیا۔

اور تم اس وقت بھی موجود نہ تھے: اِذْ قَالَ يَعْقُوْبُ بَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنۢ بَعْدِیْ، جب یعقوب اپنے بیٹوں سے کہہ رہے تھے کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اس وقت موجود نہ تھے لہٰذا تم میرے انبیاء اور مرسلین کے خلاف باطل باتیں نہ بناؤ یہ کام انھیں یہودیت اور نصرانیت سے نسبت دے دو اس لئے کہ میں نے انھیں حنیفیت (باطل سے کنارہ کش رہنا) پر مبعوث کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت کی تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی اس بات کو مسترد کر دیا اور فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ ؟ تم کس چیز کی

عبادت کرو گے؟ یہ نہیں کہا: مَنۡ تَعۡبُدُوۡنَ ؟ تم کس کی عبادت کرو گے؟ اس لئے کہ لوگ بتوں کی پرستش کر رہے تھے اس لئے فرمایا کہ تم میرے بعد کن چیزوں کی پرستش کرو گے؟ انھوں نے کہا: نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ آبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ۔ ہم اسی خدا کی عبادت کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق نے خدا مانا ہے۔ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۔ ایک معبود اور ہم تو اسی کے مسلم ہیں۔

بیان کیا گیا ہے باعتبار قول اور عقیدہ اس کے امر و نہی کے سامنے خاضع (عاجزی و فروتنی کرتے) ہیں۔ اطاعت کرتے اور انھیں تسلیم کرتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ جس پر یہ ارشاد دلیل ہے: اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۹) بے شک سچا دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔

❀❀❀❀❀

تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَ لَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾
(اے یہودیو!) وہ لوگ تھے جو گذر گئے جو انھوں نے کمایا وہ ان کے سامنے آیا اور جو تم کماؤ گے وہ تمھارے لیے ہے اور وہ لوگ جو کچھ کیا کرتے تھے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہیں ہوگی۔

الفاظ و معانی:

اُمَّة میں چند وجہیں ہیں:

اول: جَمَاعَة ۔ جیسا کہ آیت میں وارد ہوا ہے۔

دوم: پیشوا اور امام جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے: اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا (سورۂ نحل، آیت ۱۲۰) بلاشبہ ابراہیم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اللہ کے فرماں بردار۔

سوم: قَامَة

چہارم: دین اور دنیا میں استقامت۔

پنجم: حِیۡن (یعنی وقت) ارشاد ہوتا ہے: وَادَّكَرَ بَعۡدَ اُمَّةٍ (سورۂ یوسف، آیت ۴۵) (اور اسے

مدت کے بعد یہ بات یاد آئی)

ششم: ایک ملت وقوم کے افراد۔ لوگ اس طرح کہتے ہیں: اُمَّۃُ مُوسیٰ علیہ السلام۔ اُمَّۃُ عِیسیٰ علیہ السلام۔ اُمَّۃُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اصلِ معنی قصد کرنے کے ہیں۔

خَلَت: گذر گئی۔ اس کے لغوی معنی انفراد کے ہیں۔ خَلَا الرَّجُلُ بِنَفْسِہٖ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ لوگوں سے منفرد و اکیلا ہو۔ خلو اور فراغ میں فرق ہے خلو اس وقت کہتے ہیں جب کسی چیز کے ساتھ اس کا غیر نہ ہو۔

کَسب وہ عمل ہے جس کے ذریعہ فائدہ حاصل کیا جاتا ہے یا نفس سے ضرر و نقصان کو دور کیا جاتا ہے۔ کَسَبَ لِاَهْلِهٖ اس وقت کہتے ہیں جب کسی عمل کے ذریعہ جلب (منفعت) کرے۔

ترکیب:

لَهَا مَا كَسَبَتْ: احتمال پایا جاتا ہے کہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو گویا اس طرح کہا گیا ہے: مُلْزِمَةً مَّا تَسْتَحِقُّهٗ بِعَمَلِهَا۔ یہ بھی احتمال دیا جاتا ہے کہ اس کا کوئی محل اعراب ہی نہ ہو اس لئے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو۔ پس یہ خبر اول کی جزاء نہیں ہوگا لیکن معنی کے لحاظ سے اس سے متصل ہوگا۔ اگرچہ اس کا جزء نہیں ہے اس لئے معنی میں دونوں ایک ہی چیز کی خبر ہیں۔ گویا کہا گیا ہے: اَلْجَمَاعَةُ قَدْ خَلَتْ وَ الْجَمَاعَةُ لَهَا مَا كَسَبَتْ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ مَا اسم موصول ہے اور كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اس کا صلہ ہے۔ موصول اور صلہ عَنْ کی بنا پر محلاً مجرور ہے اور عَنْ (جار و مجرور) تُسْئَلُوْنَ سے متعلق ہے۔

تفسیر:

ہر کوئی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ، جماعت جو گذر چکی یعنی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ، یعنی اطاعت و معصیت سے جو عمل کیا گیا۔ وَلَكُمْ، اے گروہ یہود و نصاریٰ! مَّا كَسَبْتُمْ، تم نے جو اطاعت و معصیت کو انجام دیا۔

وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یعنی تم سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم نے ایسا اور کیوں کیا، تم سے

مطالبہ کرتے ہوئے انھیں ان کے اعمال کے لیے جو لازمی وضروری تھا۔ اسی طرح ان سے نہیں کہا جائے گا کہ یہ تم نے ایسا ویسا کیوں کیا؟ ہر انسان سے اس کے عمل کا مطالبہ کیا جائے گا نہ کہ دوسرے کے عمل کا۔ جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، (سورۂ انعام، آیت ۱۶۴) (کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا ہے۔

آیت کریمہ میں مجبرہ کے قول کے بطلان پر دلیل ہے۔ جس کے وہ قائل ہیں کہ اولاد سے آبا و اجداد کے گناہوں کا مواخذہ کیا جائے گا اور یہ کہ مسلمانوں کے گناہ کافروں پر لاد دیئے جائیں گے۔

❁❁❁❁❁

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

(یہودی اور عیسائی دونوں یہ) کہتے ہیں کہ تم یہودی یا عیسائی بن جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے (اے نبی!) آپ ان سے فرما دیجیے: نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ اپنا لو اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھے۔

الفاظ ومعانی:

حَنِیْف کے معنی باطل ادیان سے دین حق کی جانب مائل ہونے کے ہیں۔ ابن درید نے کہا ہے حَنِیْف یعنی ایک دین سے دوسرے دین کی جانب عدول کرنا۔ اسی سبب سے اس کا نام حَنِیْفِیَّۃ رکھا گیا اس لیے کہ یہ یہودیت اور نصرانیت سے الگ تھلگ ہے۔

کہا گیا ہے: حَنِیْف (یعنی) دین مستقیم پر ثابت رہنا اور حنیفیت دین ابراہیمؑ پر ثابت اور باقی رہنا ہے۔ جس کا ایک قدم دوسرے کے مقابل ہو اسے اَحْنَف کہا جاتا ہے۔ اسے سلامتی سے تفاؤل کیا گیا ہے جس طرح مَهْلَكَه کے لیے مَفَازَۃ کہا جاتا ہے۔ فَوْز (یعنی کامیابی) اور نجات سے تفاؤل کرتے ہوئے۔ یہ قول بیشتر مفسرین اور اہل لغت کا قول ہے۔ حدیث میں اس طرح وارد ہوا ہے: اَحَبُّ الْاَدْیَانِ اِلَی اللهِ تَعَالٰی اَلْحَنِیْفِیَّۃُ السَّمْحَۃ. اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین دین حنیفیت ہے جس میں وسعت وفراخی ہے۔ یہ پیغمبرؐ کی ملت ہے جس میں کسی قسم کی زحمت اور تنگی نہیں پائی جاتی۔

ترکیب:

تَهۡتَدُوۡا کا مجزوم ہونا امر کُوۡنُوۡا کا جواب ہونے کی بنا پر ہے اور کلمہ میں شرط کے معنی موجود ہیں یعنی: اِنۡ تَکُوۡنُوۡا عَلٰی هٰذِهِ الۡمِلَّةِ تَهۡتَدُوۡا (اگر اس ملت پر ہو گے تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے) تَهۡتَدُوۡا درحقیقت شرط کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔

مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ میں لفظ مِلَّةَ کے منصوب ہونے کے سلسلہ میں چند نظریات ہیں:

(۱) اصل میں اس طرح ہے: بَلِ اتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ اس لئے کہ وہ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ کُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی (یہودی یا عیسائی ہو جاؤ) جس میں یہ معنی پوشیدہ ہے کہ یہودیت وعیسائیت کا اتباع کرو اصل میں یہ ہے: قَالُوۡا اتَّبِعُوا الۡيَهُوۡدِيَّةَ وَالنَّصۡرَانِيَّةَ قُلۡ بَلِ اتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ (انہوں نے کہا یہ یہودیت اور نصرانیت کا اتباع کرو تو آپ کہہ دیجئے کہ بلکہ ملت ابراہیم کا اتباع کرو۔ یہ معنی پر عطف ہے۔

(۲) یہ حذف کی بنا پر منصوب ہو گیا ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: بَلۡ نَتَّبِعُ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ - پہلا عطف ہے اور دوسرا حذف ہے۔

(۳) بَلۡ نَکُوۡنُ اَهۡلَ مِلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ کے مقدر ماننے کی بنا پر منصوب ہے۔ مضاف (اهل) کو حذف کر کے مضاف الیہ (ملة) کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا ہے جیسا کہ یہ ارشاد الٰہی ہے اور وَ اسۡاَلِ الۡقَرۡيَةَ یعنی اہل قریہ سے سوال کر لو۔ یہ لفظ پر عطف ہے۔ یہ اہل کوفہ کا قول ہے حَنِيۡفًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی فِیۡ حَالِ حَنِيۡفِيَّتِهٖ۔

شان نزول:

ابن عباس سے روایت ہے: عبد اللہ بن صوریا وکعب بن الاشرف و مالک بن ضیف یہودی اور نصاریٰ نجران کی جماعت اہل اسلام سے مخاصمہ (جھگڑا تنازعہ) کر رہی تھی، ہر فرقہ گمان کر رہا تھا کہ وہ دوسرے کی بنسبت دین الٰہی کا زیادہ حق دار ہے۔ یہودی کہتے تھے: تمام انبیاء میں موسیٰؑ سب سے افضل ہیں اور ہماری کتاب توراۃ تمام کتابوں سے افضل ہے۔ نصاریٰ کہتے تھے: ہمارے پیغمبر عیسیٰؑ تمام انبیاء سے افضل ہیں اور ہماری کتاب انجیل تمام کتابوں سے افضل ہے۔ دونوں جماعت کا ہر فریق مومنین سے کہہ رہا تھا ہمارے دین پر

آجاؤ۔ پس خداوند عالم نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

بیان کیا گیا ہے کہ ابن صوریا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: کیا ہدایت بھی اس کے علاوہ ہے جس پر ہم ہیں؟ اے محمدؐ آپ ہماری اتباع و پیروی کیجئے، ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔ نصاریٰ نے بھی آپ سے یہی کہا تھا تو خداوند عالم نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

تفسیر:

صرف ہم ہی حق پر ہیں!

وَقَالُوۡا، ضمیر یہود و نصاریٰ کی طرف پلٹ رہی ہے یعنی یہودیوں نے کہا: كُونُوا هُودًا (یہودی ہو جاؤ) اور نصاریٰ نے کہا: كُونُوا نَصٰرٰى، (نصاریٰ ہو جاؤ) ہر فریق اس کی دعوت دے رہا تھا جس پر وہ تھا۔ تَهۡتَدُوۡا، کے معنی ہیں حق کا راستہ اختیار کرو گویا انھوں نے کہا: حق کی طرف ہدایت اختیار کرو، یعنی اگر تم نے ایسا کیا تو تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے اور سیدھے راستے پر ہو جاؤ گے۔

قُلۡ، اے محمدؐ! کہہ دیجئے: بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ، بلکہ ہم دین ابراہیم کا اتباع کرتے ہیں اور (دوسری وجہ اور طریقہ پر) بلکہ تم دین ابراہیم کا اتباع کرو۔ حَنِيۡفًا، مستقیم اور سیدھا اور کہا گیا ہے کہ دین اسلام کی طرف مائل۔ حنیفیہ کے بارے میں چار اقوال ہیں:

اول: حج بیت اللہ کرنا۔ ابن عباس، حسن اور مجاہد سے روایت ہے۔

دوم: حق کا اتباع کرنا۔ مجاہد سے روایت ہے۔

سوم: شریعت ابراہیمی کی پیروی جس کے سبب وہ لوگوں کے امام بنے۔ اس کے بعد حج اور ختنہ وغیرہ دیگر اسلامی احکام۔

چہارم: پروردگار کی ربوبیت کا اقرار، اس کی بندگی کا یقین، اللہ کی وحدانیت میں اخلاص، ان تمام اقوال کی بازگشت استقامت کے معنی کی جانب ہوتی ہے۔ جنہیں ہم بیان کر چکے ہیں اور جن چیزوں کو ابراہیمؑ لے کر آئے تھے ان کی جانب ملت کا میلان۔

وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ، یعنی ابراہیمؑ مشرکین سے نہیں تھے۔ ابراہیمؑ کی ملت سے شرک کی نفی کی گئی ہے جبکہ یہود و نصاریٰ کے لیے اسے ثابت کیا گیا ہے چونکہ ان کا کہنا تھا (عزیرؑ، اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسیٰ

فرزند خدا ہیں) اللہ کے ارشاد: بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ، میں ملت ابراہیمی کے اتباع کے وجوب پر حجت ہے۔ چونکہ یہ تناقض سے سالم ہے جبکہ یہودیت اور نصرانیت میں تناقض موجود ہے۔ لہٰذا اس سبب سے ملت ابراہیمی دوسرے ادیان کے مقابلہ اتباع کی زیادہ سزاوار ہے۔

یہودیت میں تناقض یہ ہے کہ وہ (یہودی) جوازِ نسخ سے منع کرتے ہیں جب کہ تورات میں اس کے جواز پر دلالت موجود ہے اور یہ لوگ تورات میں موجود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کی بشارت پر عمل کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ جبکہ اس سے تمسک کا اظہار کرتے ہیں۔ عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر دلالت کرنے والی موجود ظاہری آیات اور روشن معجزات سے انکار کرتے ہیں، جب کہ معجزات کی دلالت کے سبب عیسیٰؑ کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی تناقض پائے جاتے ہیں۔ نصاریٰ کے قول میں تناقض یہ کہنا ہے کہ اب، ابن وروح القدس ایک الٰہ ہے جبکہ ان کا خیال ہے کہ اب (یعنی باپ) ابن یعنی فرزند نہیں ہے۔ آبّ الٰہ ہے، ابن الٰہ ہے اور روح القدس الٰہ ہے جبکہ وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ تینوں الٰہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی تناقضات ہیں جو کتب میں مذکور ہیں۔

❁❁❁❁❁

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اے مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوا اور جو کچھ موسیٰ، عیسیٰ اور دیگر انبیاء کو ان کے رب کی جانب سے دیا گیا۔ ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اسی کے مسلم ہیں۔

الفاظ ومعانی:

اَسْبَاط کی واحد سِبْط ہے، جو اسرائیل کی اولاد ہیں اور وہ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیمؑ ہیں۔ بارہ

فرزندوں کے بارہ سبط ہیں۔ لوگوں نے کہا ہے: اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ سِبْطَا رَسُوْلِ اللّٰهِ(صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّمَ) یعنی حسنؑ و حسینؑ رسول اللہ کے دو فرزند ہیں۔ اسباط بنی اسرائیل میں اسماعیلؑ کی اولاد میں قبیلوں کے مانند ہیں۔ زجاج نے بیان کیا ہے کہ سبط یعنی وہ جماعت کہ جس کی بازگشت ایک باپ کی جانب ہوتی ہے۔ سِبْط لغت میں درخت کو بھی کہتے ہیں۔ سِبْط وہ افراد جو ایک شجرہ سے ہوں۔

سبط کی لوگوں کی ایسی جماعت سے بھی تشبیہ دی گئی ہے جو کسی امر کی متابعت و پیروی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں کو اسباط کہا گیا ہے۔

تفریق اور فرق کے درمیان فرق یہ ہے کہ تفریق کسی چیز کا اس کے غیر کا مفارق (جدا) قرار دینا ہے اور فرق جمع کی نقیض اور ضد ہے اور جمع کسی چیز کا اس کے غیر کے ساتھ قرار دینا ہے اور فرق کسی چیز کا قرار دینا اس کے غیر کے ساتھ نہیں۔ حجت کے ساتھ فرق اس چیز کا بیان ہے جو شہادت دیتا ہے کہ حکم دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کے لیے ہے، دوسری کے لیے نہیں۔

ترکیب:

مَآ اُوْتِيَ دراصل مَآ اُوْتِيَهٗ تھا کہ موصول کی جانب پلٹنے والی ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ مِنْ رَّبِّهِمْ میں مَنْ اُوْتِيَ کے متعلق ہے یا اس کا متعلق محذوف ہے۔ ایسی صورت میں محذوف کے ساتھ محلاً منصوب ہوگا حال ہونے کی بنا پر اور ذوالحال اُوْتِيَ میں مستتر ضمیر ہے اور عامل اُوْتِيَ ہے یا عامل اُنْزِلَ ہے اور ذوالحال مَآ اُوْتِيَ ہے۔

لَا نُفَرِّقُ جملہ منفی ہے، حال ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے اور اس میں عامل آمَنَّا ہے مِنْهُمْ محذوف سے متعلق اور محلاً مجرور ہے اس لئے کہ اَحَدٍ مِّنْهُمْ کے معنی یہ ہیں کہ دو کے درمیان یا جماعت کے درمیان۔ اصل میں اس طرح ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ وَّ اَحَدٍ مِنْهُمْ۔

تفسیر:

مسلمانوں کا اعلان

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ، خطاب مسلمانوں سے ہے۔ کہا گیا ہے کہ پیغمبرؐ اور مومنین سے خطاب ہے۔

خداوند عالم نے انھیں جس شریعت کی پابندی کرتے ہیں اس کے اظہار کا حکم دیا ہے۔ شروعات ایمان باللہ سے ہوتی ہے اس لیے کہ وہی سب سے پہلا واجب ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی معرفت مقدم ہونے سے نبوتوں اور شریعتوں کی معرفت درست ہوگی۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا۔ یعنی قرآن۔ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ (قرآن) حق اور صدق ہے، فی الحال واجب الاطاعت ہے۔ اگرچہ اس سے قبل (دیگر آسمانی) کتب آچکی ہیں۔ وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ۔ قتادہ نے کہا ہے: یہ برادران یوسف اور فرزندان یعقوبؑ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک فرزند لوگوں میں امت ہے۔ جن کا نام اسباط رکھا گیا۔ اس کے متعلق سُدی، ربیع، محمد بن اسحاق نے کہا ہے اور بارہ نام ذکر کیے ہیں: یوسف، بنیامین، زبالون، روبیل، یہوذا، شمعون، لاوی، دان، قہاب، یشجر، نفتالی اور جاد، یہ سب کے سب اولاد یعقوبؑ میں اشرف ترین تھے۔ اس میں مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بیشتر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ سب نبی تھے، جس چیز کا تقاضا ہمارا مذہب (شیعہ) کرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب نبی نہیں تھے اس گناہ کے سبب جو انھوں نے انجام دیا اور جناب یوسفؑ کے ساتھ جو سلوک کیا، جسے انھوں نے پوشیدہ رکھا۔

ہمارے (امامیہ) کے نزدیک نبی صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم اور پاک ہوتا ہے، نہ ہی ظواہر قرآن میں کوئی ایسی بات ہے جو ان کے نبی ہونے پر دلالت کرے۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ، دلالت نہیں کر رہا ہے کہ یہ سب انبیاء تھے، اس لیے کہ انزال ممکن ہے ان میں سے بعض پر ہو جو نبی ہوں اور ان سے افعال قبیحہ سرزد نہ ہوئے ہوں اور احتمال ہے کہ اللہ کے اس ارشاد کے مانند ہوں: وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا۔ (سو رجو کچھ ہماری جانب نازل کیا گیا) اگرچہ نبی پر نازل ہونے والی چیز ہوتی ہے لیکن (مسلمان اس پیغام میں موجود چیز) کے مامور ہوتے ہیں۔ اس لیے انزال کی نسبت ان کی جانب دی گئی ہے۔

عیاشی نے اپنی تفسیر میں حنان بن سُدیر سے انھوں نے اپنے والد کے واسطہ سے امام باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ (راوی کہتا ہے) میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا فرزندان یعقوب انبیاء تھے؟ فرمایا: نہیں، البتہ وہ اسباط اولاد انبیاء تھے، وہ دنیا سے نہیں اٹھے مگر نیک (صالح) تائب اور جو کچھ انھوں نے انجام دیا تھا انھیں یاد تھا۔

وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی ، یعنی جو موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا کیا گیا، ان دونوں حضرات کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا گیا کہ یہود و نصاریٰ پر احتجاج کیا گیا ہے۔ جناب موسیٰ کو دی جانے والی تورات اور جناب عیسیٰ کو دی جانے والی چیز انجیل مراد ہے۔

وَمَاۤ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ ، یعنی جو چیز پیغمبروں کو دی گئی۔ مِنْ رَّبِّهِمْ (ان کے پروردگار کی جانب سے) لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ کہ ہم بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کر دیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے کیا کہ یہودیوں نے عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر دیا نصاریٰ نے حضرت سلیمان اور ہمارے پیغمبر حضرت محمدؐ کا انکار کر دیا۔

وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ، یعنی جن کا ذکر سابقاً گذر چکا (ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں) کہا گیا ہے: اللہ کی اطاعت میں خضوع کرتے ہیں، اس کی بندگی پر یقین رکھتے ہیں، اس کے امر و نہی کو تسلیم کرتے ہیں، اس سے متعلق مکمل بیان گذر چکا ہے۔

آیت کا فائدہ (اور نتیجہ) یہ ہے اللہ پر ایمان اور پیغمبروں کے اقرار اور اس چیز کے اقرار جو ان پر کتب اور احکام نازل ہوئے ان کے اقرار کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی رد کی گئی ہے جو ان کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ ان چیزوں کے متعلق جنھیں اللہ نے یکجا جمع کیا ہے جیسے نبوت، اگر چہ ان کی شریعتیں ہمارے لیے لازمی نہیں ہیں، ان پر ایمان ان کی شریعتوں (احکام) کے لزوم کا مقتضی نہیں ہے۔

ضحاک سے روایت کی گئی کہ انھوں نے کہا: اپنی اولاد و اہل و عیال اور خدمت گذاروں کو انبیاء کے اسماء کی تعلیم دو جن کا ذکر خداوند عالم نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے تاکہ ان پر ایمان لے آئیں اور ان کی لائی ہوئی چیزوں کی تصدیق کریں، خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَ مَاۤ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔

اے مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوا اور جو کچھ موسیٰ، عیسیٰ اور دیگر انبیاء کو ان کے رب کی جانب سے دیا گیا۔ ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اسی کے مسلم ہیں۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۳۷﴾

پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم اس پر ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت یافتہ ہیں۔اور اگر اس سے منہ پھیر لیں تو وہ ہٹ دھرم ہیں۔لہٰذا اطمینان رکھو کہ ان کے مقابلے میں اللہ تمھاری حمایت کے لیے کافی ہے۔اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

الفاظ و معانی:

شِقَاق (دشمنی و مخالفت کرنا) منازعہ (جھگڑا) محاربہ (جنگ) ہے، ہوسکتا ہے کہ شَقّ سے مشتق ہو کہ عداوت کے سبب اپنے ساتھی کے علاوہ (شق) ہو گیا ہو، ممکن ہے کہ مشقت سے مشتق ہو اس لیے کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لیے اسے مشقت اور اذیت میں مبتلا کرنے والی چیز کا حریص ہوتا ہے (یعنی زحمت میں مبتلا کرنے کا خواہاں ہوتا ہے)

کِفَايَة کے معنی انجام تک پہنچنا ہے۔ یَکْفِي یُجْزِي اور یُغْنِي ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ کَفٰى یَكْفِي كِفَايَةً کہا جاتا ہے۔ كَفَاكَ هٰذَا الْاَمْرُ یعنی یہ امر تمھارے لیے کافی اور کفایت کرنے والا ہے۔

ترکیب:

بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ میں باء کے سلسلہ میں تین احتمالات پائے جاتے ہیں:

(۱) زائدہ ہے گویا اس طرح ہے: فَإِنْ آمَنُوا مِثْلَ مَا آمَنْتُمْ بِهِ ۔یعنی اگر وہ ایمان لے آئے تمہارے ایمان لانے کی طرح جیسا کہ کہا جاتا ہے: كَفٰى بِاللّٰهِ یعنی كَفَى اللّٰهُ شاعر نے کہا ہے:

كَفَى الشَّيْبُ وَ الْاِسْلَامُ لِلْمَرْءِ نَاهِيًا (بڑھاپا اور اسلام انسان کو برائیوں سے روکنے کے لئے کافی ہے)

(۲) مراد عَلٰى مِثْلِ هٰذَا ہے پس باء زائدہ نہیں ہے گویا فرمایا ہے: فَإِنْ آمَنُوا عَلٰى مِثْلِ اِيمَانِكُمْ جیسے آپ یہ کہتے ہیں: كَتَبْتُ عَلٰى مِثْلِ مَا كَتَبْتُ ۔گویا آپ مثل کو آلہ قرار دے رہے ہیں کہ جس کے ذریعہ اس عمل تک پہونچا رہی ہے۔یہ احتمال پہلے احتمال سے زیادہ بہتر ہے۔

(۳) آپ مثل کو ملغیٰ اور بے فائدہ مانئے جس طرح فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ میں کاف کو ملغیٰ قرار دیتے ہیں یہ سب سے کمزور احتمال ہے اس لئے کہ جب کلام خدا کو فائدہ پر حمل کرنا ممکن ہے تو جائز نہیں ہے کہ اسے زیادہ ہونے پر حمل کیا جائے۔ اسم کا زائدہ ہونا حرف کے زائد ہونے سے زیادہ ضعیف ہے جیسے مَا و لَا اور اِنْ سے مشابہ حروف۔

فَقَدِ اهْتَدَوْا محلاً مجزوم ہے یا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ شرط مبنی کا جواب ہے اسی طرح فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ، اِنَّمَا حرف ہے ایک چیز کو ثابت کرنے اور اس کے غیر کی نفی (یعنی حصر) کے لئے۔ هُمْ مبتدا اور فِي شِقَاقٍ مقام خبر میں ہے۔

شانِ نزول:

جب خداوند عالم کا ارشاد: قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (بقرہ، ۱۳۶) نازل ہوا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود و نصاریٰ کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی اور یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کا ذکر سنا تو انھوں نے انکار کیا اور کفر اختیار کیا اور نصاریٰ نے کہا کہ عیسیٰ تمام انبیاء کے مانند نہیں ہیں وہ تو خدا کے فرزند ہیں، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر:

اگر ایمان لے آئے تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے

فَإِنْ آمَنُوا، خداوند عالم نے خبر دی ہے کہ یہ کفار جب ان مومنین کے مانند ایمان لے آئیں گے "فَقَدِ اهْتَدَوْا" تو جنت کے راستہ (کی ہدایت پا جائیں گے) اور کہا گیا ہے کہ وہ استقامت اور ہدایت کے راستے چلنے لگے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ابن عباس کہتے تھے: جس پر تم ایمان لائے ہو اس کی تلاوت کرو، اللہ کی کوئی مثل نہیں ہے۔ (ان کا یہ کلام) اس بات پر حمل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کلام کی تفسیر کی ہے نہ یہ کہ انھوں نے معنی کی صحت کے ساتھ ظاہری قرأت کا انکار کیا ہے۔

اس کا ارشاد: وَاِنۡ تَوَلَّوۡا، اور اگر انھوں نے ایمان سے انحراف کیا اور اس سے انکار کیا اور اس کا اعتراف نہیں کیا تو فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ‌ۚ، تو وہ ہٹ دھرم ہیں۔ یعنی مخالفت میں ہیں یقیناً انھوں نے حق سے علاحدگی اختیار کر لی ہے اور وہ باطل سے متمسک ہو گئے ہیں تو اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے مخالف بن گئے ہیں۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔

اسی کے مانند وہ روایت ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ‌ۚ، یعنی وہ کفر میں ہیں۔ بیان کیا گیا ہے: گمراہی میں۔ یہ ابو عبیدہ سے روایت ہے۔ بیان کیا گیا ہے: وہ جھگڑے اور جنگ میں ہیں۔ یہ ابوزید سے روایت ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ عداوت میں ہیں۔ یہ حسن سے روایت ہے۔

فَسَيَكۡفِيۡکَهُمُ اللّٰهُ خداوند عالم نے اپنے رسولؐ سے نصرت اور آپؐ سے دشمنی کرنے والے یہود و نصاریٰ سے کفایت کا وعدہ فرمایا ہے، جنھوں نے آپؐ سے دشمنی کی۔ اس آیت میں آپؐ کی نبوت اور صداقت کی واضح دلالت ہے جس کے معنی ہیں: اے محمدؐ! خداوند عالم آپ کی ان کے امر سے کفایت فرمائے گا۔

وَهُوَ السَّمِيۡعُ ان کے اقوال (کا سننے والا) الۡعَلِيۡمُ، خدا ان کے اعمال سے آپ کے امر کے ابطال کے متعلق واقف و جانکار ہے۔ یہ لوگ آپ تک ہرگز ہرگز نہیں پہنچ سکیں گے۔

❀❀❀❀❀

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

تم اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہوسکتا ہے؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

الفاظ و معانی:

صِبْغَةَ اللّٰه، صِبغ (کے معنی کپڑے کو رنگنے کے ہیں) سے حاصل کیا گیا ہے چونکہ بعض نصاریٰ جب ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے پانی میں غوطہ دیتے تھے جسے معمودیہ کہتے تھے اس طرح وہ اسے پاک کرتے تھے۔

پس صِبْغَةَ اللّٰهِ اللہ کا رنگ یعنی اللہ کا پاکیزہ بنانا نہ کہ رنگ کے ذریعے تمھارا پاک کرنا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: یہودی اپنے فرزندوں کو یہودیت کے رنگ اور نصاریٰ اپنے فرزندوں کو نصرانیت کے رنگ میں رنگ دیتے تھے (یہودیت و نصرانیت کا رنگ چڑھا دیتے تھے) یعنی اپنی اولاد کو یہودیت و نصرانیت کی تلقین (تعلیم دیتے) کرتے تھے۔

قتادہ سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب کی روایت کی اس طرح تاویل کی جاتی ہے کہ انھوں نے بنی تغلب سے عہد لیا تھا کہ وہ اپنی اولاد پر رنگ نہ چڑھائیں یعنی انھیں نصرانیت کی تعلیم نہ دیں، انھیں بالغ ہونے تک یونہی چھوڑ دیں اور وہ اپنے لیے جس دین کو چاہیں اختیار کرلیں۔ (اللہ کے رنگ کو) بیان کیا گیا ہے: دین کو صبغة (رنگ) کہا گیا ہے اس لیے کہ اس کی ہیئت و شکل ہے جو طہارت و نماز وغیرہ کے اثر کے ذریعہ مشاہدہ سے ظاہر ہوتی ہے جو کہ بہترین آثار ہیں اور رنگ کے مانند ہیں۔ یہ جبائی سے روایت ہے۔

ترکیب:

صِبْغَةَ اللّٰهِ میں صِبْغَةَ منصوب ہے اس لئے کہ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ کا بدل ہے اور اس کی تفسیر ہے۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اغراء (تشویق) کی بنا پر منصوب ہے گویا اس طرح ہے: اِتَّبِعُوْا صِبْغَةَ اللّٰهِ اِلْزَمُوْا صِبْغَةَ اللّٰهِ۔

مَنْ اسم استفہام، مبتدا ہے اور اَحْسَنُ اس کی خبر ہے اور صِبْغَةً تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

تفسیر:

خدائی رنگ

صِبْغَةَ اللهِ، تم اللہ کا رنگ اختیار کرو یعنی دین خداوندی کا اتباع کرو۔ یہ ابن عباس، حسن، قتادہ اور مجاہد سے روایت ہے۔ یعنی دین الٰہی کا اتباع کرو۔ اس سے نزدیک وہ روایت ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا: اس سے اسلام مراد ہے۔

کہا گیا ہے: مراد الٰہی شریعت ہے جو ختنہ اور طہارت ہے۔ یہ فراء اور بلخی سے روایت ہے کہ بیان کیا گیا ہے: اللہ کی فطرت ہے جس پر لوگوں کو خلق کیا گیا ہے۔ یہ ابو العالیہ وغیرہ سے روایت ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً، یعنی اللہ کے رنگ سے اچھا کوئی رنگ نہیں ہے، اس لفظ کو لفظ استفہام کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، جس کے معنی انکار کے ہیں۔ یہ حسن وغیرہ سے روایت ہے۔

وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ، اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں یعنی وہ ہستی ہم جس کی عبادت کرتے ہیں واجب و لازم ہے کہ ہم اس کے رنگ کو اپنائیں اسی کا اتباع کریں۔ نہ کہ اس رنگ کی جس پر ہمارے آباء و اجداد نے رنگ چڑھایا ہے۔ بیان کیا گیا ہے: ہم اس کی عبادت کرتے ہیں ہماری پیروی و اتباع ہے ملت ابراہیمی کی جو کہ خدائی رنگ ہے۔

❀❀❀❀❀

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

(اے نبی!) آپ ان سے کہہ دیجیے، کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالاں کہ وہی ہمارا اور تمھارا پروردگار ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے اور ہم اللہ ہی کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔

الفاظ و معانی:

حِجَاج جِدَال، خِصَام باہم مشابہ ہیں۔ اَعْمَال، اَحْدَاث، اَفْعَال باہم مشابہ ہیں۔

اِخْلَاص، اِفْرَاد، اِخْتِصَاص باہم مشابہ ہیں۔ خَالِص کی ضد مَشُوب (غیر خالص یعنی مخلوط و ملاوٹ) ہے۔

ترکیب:

وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ مبتدا اور خبر (جملہ) محلاً منصوب ہے بر بنائے حال اور اس میں عامل تُحَاجُّوْنَ اور ذوالحال واؤ ضمیر ہے۔

وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ، اس میں دو مبتدا اور دو خبر ہیں اور دونوں جملے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں کہ هُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ پر عطف ہے ہیں اور وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ بھی اسی طرح ہے یعنی وہ بھی بر بنائے حال منصوب ہے۔

تفسیر:

ہر کسی کے اعمال اسی کے لئے

خداوند عالم نے اس آیت میں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم فرمایا ہے کہ وہ یہودیوں وغیرہ سے کہیں: قُلْ اَتُحَاجُّوْنَنَا. جس کے معنی ہیں دین خدا میں تم ہم سے مجادلہ اور مخاصمہ (جھگڑا) کرتے ہو جبکہ وہ ہمارا خالق ہے، ہمیں نعمتیں عطا کرتا ہے، تمھارا بھی خالق ہے، تمھیں بھی نعمتیں عطا کرتا ہے۔ ان کے جھگڑنے کی کیفیت اور نوعیت میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے: ان کا جھگڑا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تھا، ان کا خیال تھا کہ وہ حق کی نسبت اولیٰ ہیں، نبوت اور کتاب ان کے بارے میں مقدم ہے۔

کہا گیا ہے کہ بلکہ ان کا جھگڑا اس بارے میں تھا کہ ہم ان عربوں کی نسبت ایمان کے زیادہ حق دار ہیں جو بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور کہا گیا ہے: ان کا جھگڑا یہ تھا ان کا کہنا تھا کہ اے محمد! انبیاء ہم سے تھے، عربوں سے نبی نہیں تھا۔ اگر آپ نبی ہوتے تو ہم میں سے ہوتے۔

حسن نے کہا ہے: ان کا جھگڑا یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: نَحْنُ اَوْلٰى بِاللّٰهِ مِنْكُمْ، (ہم تمھاری بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں) اور وہ کہتے تھے: قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ، آیت ۱۸) یہود اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں اور وہ کہتے تھے:

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۱) (یہود و نصاریٰ کے علاوہ جنت میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا) اور انھوں نے کہا کہ جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہو یا عیسائی ہو۔ اس سے ان کی غرض اور مقصد تھا کہ دین ان کی جانب سے التماس اور درخواست کرتا ہے بہتر اور اولیٰ یہ ہے کہ نبوت ان کے درمیان ہو۔ پس خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ وہ اپنی مخلوق کی تدبیر کے متعلق سب سے زیادہ واقف ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اس احتجاج کورد کیا گیا ہے کہ عرب بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ، یعنی وہ ہمارا بھی خالق ہے، تمھارا بھی۔ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت (پیغام) کو کہاں قرار دے اور اس کے گراں قدر بوجھ کو کون اٹھا سکتا ہے اور اس کا اس طرح متحمل ہوسکتا ہے جو مخلوقات کے لیے زیادہ مناسب اور تدبیر کے لیے اولیٰ و بہتر ہو۔

ارشاد ہوتا ہے: وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ، یعنی ہمارا دین ہمارے لیے اور تمھارے لیے تمھارا دین۔

کہا گیا ہے کہ تمھارے اعمال کا ضرر و نقصان ہم پر نہیں ہوگا اور ہمارے اعمال کا فائدہ تمھارے لیے نہیں ہوگا۔ تمھارے اعمال کا نقصان تمھارے لیے ہوگا اور ہمارے اعمال کا فائدہ ہمارے لیے ہوگا۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اس قول کا انکار ہے کہ عرب بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور اس کی وضاحت ہے اس میں کوئی حجت و دلیل نہیں ہے اس لیے کہ ہر شخص اپنے کیے میں مبتلا ہے، صرف اسی سے اس کا مؤاخذہ ہوگا، کسی غیر کے جرم کا اس سے مؤاخذہ اور باز پرس نہیں کی جائے گی۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ، یعنی ہم موحد ہیں۔ اس سے مراد ہے مخلص، مشرک کی نسبت حق سے زیادہ اولیٰ و بہتر ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اس احتجاج کہ عرب بتوں کی پرستش کرتے ہیں کی رد کی گئی ہے گویا کہا جارہا ہے اس بارے میں ہم پر کوئی عیب نہیں ہے جب کہ ہم موحدین (وحدانیت پرست) ہیں جیسا کہ تمھارے لیے کوئی عیب کی بات نہیں ہے، تمھارے بزرگوں کا بچھڑے کی پرستش کرنا جب کہ تم اس بات کا عقیدہ رکھتے ہو کہ انھوں نے غلط کیا تھا۔

فصل: اخلاص کے بیان میں

حذیفہ بن الیمان سے روایت کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخلاص

کے بارے میں دریافت کیا، تو آنحضرتؐ نے فرمایا: میں نے جبرئیل سے دریافت کیا جبرئیلؑ نے کہا: میں نے اس بارے میں رب العزت سے دریافت کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے میں اپنے بندوں میں جسے محبوب رکھتا ہوں اس راز کو اس کے قلب کے سپرد کر دیتا ہوں۔

ابن ادریس الخولانی کے واسطے سے پیغمبرؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ہر حق کے لیے حقیقت ہوتی ہے، کوئی بندہ اخلاص کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اسے اللہ کے عمل میں کسی چیز پر اس کی حمد و ثنا محبوب و پسند نہ ہو۔

سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ بندہ اپنے دین اور عمل کو اللہ کے لیے خالص قرار دے، اپنے دین میں اس کا کسی کو شریک قرار نہ دے اور اپنے عمل کو کسی کے دکھاوے کے لیے انجام نہ دے۔

بیان کیا گیا ہے: اخلاص یہ ہے کہ بندے کے اعمال ظاہر و باطن میں مساوی اور یکساں ہوں۔

بیان کیا گیا ہے: (وہ عمل) جو مخلوقات سے پوشیدہ اور علائق (دنیا) سے پاک صاف ہو۔

وَ قِيلَ هُوَ اَن يَّكْتُمَ حَسَنَاتِهِ كَمَا يَكْتُمُ سَيِّئَاتِهِ اور کہا گیا ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کو اسی طرح پوشیدہ رکھے جس طرح وہ اپنے گناہوں کو چھپاتا ہے۔

❀❀❀❀❀

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

یا پھر تمھارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب سب کے سب یہودی یا نصرانی تھے۔ (اے نبی) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ، اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کے ذمہ اللہ کی جانب سے گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے اور تمھارے کرتوتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔

قرائت:

ابوبکر کے علاوہ دیگر اہل کوفہ اور ابن عامر نے اَمْ تَقُوْلُوْنَ تاء کے ساتھ قرأت کی ہے اور بقیہ قراء

نے یاء کے ساتھ یَقُوْلُوْنَ قرأت کی ہے۔

حجت:

پہلی قرائت خطاب کی صورت میں ہے۔ لہذا اَمْ اپنے پہلے سوال سے متصل ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: اَتُحَاجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ کَانُوْا عَلٰی دِیْنِکُمْ (کیا تم لوگ مجھ سے اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہو یا تم لوگ یہ کہتے ہو کہ سارے انبیاء اور اس کی تقدیر یہ ہے: بِاَیِّ الْحُجَّتَیْنِ تَتَعَلَّقُوْنَ فِیْ اَمْرِنَا بِالتَّوْحِیْدِ فَنَحْنُ مُوَحِّدُوْنَ اَمْ بِاِتِّبَاعِ دِیْنِ الْاَنْبِیَاءِ فَنَحْنُ لَھُمْ مُتَّبِعُوْنَ۔ تم ہمارے توحید کے حکم دینے کے سلسلہ میں دو دلیلوں میں سے چاہے جس دلیل کو بھی اپناؤ ہم تو بہر حال موحد ہیں اور جہاں تک دین انبیاء کے اتباع کی بات ہے تو ہم ان کا اتباع کرنے والے ہیں)

دوسری قرأت یعنی یاء کے ساتھ یَقُوْلُوْنَ یہ پہلے احتجاج سے دوسرے احتجاج کی جانب عدول کی بنا پر ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: بَلْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰۃُ وَالْاِنْجِیْلُ کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصَارٰی (بلکہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ انبیاء تورات وانجیل کے نازل ہونے سے پہلے بھی یا تو یہودی تھے یا عیسائی تھے)

ایسی صورت میں اَمْ منقطعہ ہے اور خدا نے ان کو مخاطب قرار دینے سے روگردانی کر لی ہے ان سے صادر ہونے والے کاموں اور باتوں کی بنا پر ان کو جاہل شمار کرتے ہوئے۔ جس طرح عالم اپنے مخاطب سے کوئی بری حرکت صادر ہونے کے بعد اس سے منہ پھیر کر اپنے پاس موجود دوسرے لوگوں سے بات کرنے لگتا ہے کہ اس پر حجت قائم ہوگئی یا اس کے عقیدہ کے باطل ہونے کی بات کرتا ہے جو معرفت کا سبب بنتی ہے۔

الفاظ و معانی:

اَعْلَمُ، اَعْرَفُ، اَدْرٰی ایک معنی میں ہیں۔ اَظْلَمُ، اَجْوَرُ، اَعْتٰی باہم مشابہ ہیں۔ اَفْعَلُ زیادہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کے معنی اس میں درست ہوتے ہیں جہاں پر مبالغہ کرنا ہو جیسا کہ ان (عرب) کا قول ہے: اَفْضَلُ (بہت زائد فضل والا) اَطْوَلُ (بہت زیادہ لمبا و طولانی)۔

محققین نے بیان کیا ہے صفات کے تین اقسام ہیں: صفت ذات اور وہ صفت جو فاعل سے حاصل

ہوتی ہے یہ صفت جو معنی نے حاصل ہوتی ہے۔

اول: ذات کا جوہر یا سواد ہونا اس میں تفضیل صحیح نہیں ہے۔ سواد شبح اور شخص کو کہتے ہیں۔

دوم: مانند وجود اس میں بھی تفضیل ہونا درست نہیں ہے۔

سوم: اس کی دو قسمیں ہیں: (اول) اس میں تفضیل درست ہے، ہر وہ چیز ہے جو معنی کا الوان (رنگ) اور اکوان (عالم وجود) (دوم) اس میں تفضیل درست نہیں ہے ہر وہ چیز جو معنی کا موجب وسبب نہ ہو۔

کَتَمَ، اَخۡفٰی، اَسَرَّ ایک ہیں۔

غَفۡلَۃ، سَھۡو اور نِسۡیَان ایک جیسے ہیں۔ یہ ذہن سے معنی کے چلے جانے کے معنی میں ہیں، صحیح یہ ہے سہو کے معنی یہ نہیں ہیں بلکہ مخصوص علوم کا مفقود ہونا ہے اگر صحت کے ساتھ سہو میں استمرار رہے تو اسے جنون (دیوانگی) کہا جائے گا۔ اگر ضعف و کمزوری عارض ہو تو اسے اغماء کہا جائے گا۔ اگر اس سے نرمی اور ڈھیلا پن وابستہ ہو تو اسے نوم (نیند) کہیں گے۔ اگر طرب (غم یا خوشی سے جھومنا) وابستہ ہو تو اسے سکر (یعنی نشہ) کہیں گے۔ اگر علم کے بعد سہو حاصل ہو تو نسیان کہا جائے گا۔

ترکیب:

اَمِ اللّٰہُ: لفظ جلالہ اللّٰہ مبتدا اور اس کی خبر محذوف ہے گویا اس طرح ہے: اَمِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ۔

عِنۡدَہٗ کَتَمَ کے لئے ظرف ہے یا شَھَادَۃً کی صفت ہے گویا اس طرح ہے شَھَادَۃً کَائِنَۃً عِنۡدَہٗ - مِنَ اللّٰہِ بھی شَھَادَۃً کی صفت ہے اور یہ صفت بعد از صفت ہے۔

تفسیر:

بے بنیاد دعوے!

ہم ارشاد الٰہی: اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ. اور یَقُوۡلُوۡنَ کے فرق کو بیان کر چکے ہیں (یعنی تَقُوۡلُوۡنَ مخاطب کا صیغہ ہے) اور یَقُوۡلُوۡنَ سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو کہ غائب کا صیغہ ہے۔ اس ارشاد میں ان کے اس قول پر احتجاج ہے: لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ھُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی. (سورہ بقرہ، آیت ۱۱۱)؛ اور انھوں نے کہا کہ جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہو یا عیسائی ہو۔ اس میں چند وجہیں ہیں:

اول: جس چیز کی خبر ہمارے پیغمبرؐ نے معجزہ ظاہر ہونے کے ساتھ دی جو آپؐ کی صداقت کی دلیل ہے۔

دوم: توارت وانجیل میں ہے یہ تمام انبیاء حنیفیت پر تھے۔

سوم: ان کے یہاں جو توارت کی شریعت سے وابستہ ہے اس کا نام یہودیت ہے اور جو انجیل کی شریعت سے وابستہ ہے اسے نصرانیت کہتے ہیں جب کہ یہ دونوں کتابیں ان کے بعد نازل کی گئی ہیں، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ۔ (سورہ آل عمران، آیت ۶۵): توریت اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہے۔

چہارم: ان کا یہ دعویٰ کسی برہان اور دلیل کے بغیر تھا، اس طرح خداوند عالم نے ان وجوہات کے سبب ان کی توبیخ (مذمت) وسرزنش کی ہے۔

ارشادالٰہی: قُلْ ءَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ. (اے نبی!) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟! یہ استفہام کے انداز میں ہے۔ اس سے مذمت اور سرزنش مراد ہے۔ اور اسی جیسا اللہ کا قول ہے: ءَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا. (سورہ نازعات، آیت ۲۷): کیا تم لوگوں کو پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا آسمان کو؟ اس کے معنی ہیں اے محمدؐ! ان لوگوں سے کہئے: آیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ خداوند عالم خبر دے رہا ہے کہ یہ سب حنیفیت پر تھے اور تمہارا خیال ہے کہ یہودی یا نصرانی تھے، جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تم اس بات کے دعویدار ہو کہ تم اللہ سے زیادہ جانتے ہو۔ یہ انتہائی اور آخری درجہ کی ذلت ورسوائی ہے۔

اگر کہا جائے یہ کیونکر کہا گیا کہ (آیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ) جبکہ وہ اسے جانتے تھے، اسے چھپا رہے تھے۔ بظاہر یہ خطاب اس کے لئے ہے جو نہیں جانتا۔ اس کا جواب ہے جو یہ کہتا ہے وہ گمان اور وہم کر رہے تھے، پس کلام کی وجہ اس کے قول کے اعتبار سے واضح ہے اور جس کا کہنا ہے کہ وہ اس سے بخوبی واقف تھے وہ اس کا انکار کر رہے تھے، پس اس کے معنی ہیں کہ ان کی حیثیت ومقام معترض والا ہے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ خداوند عالم اس کی خبر دے رہا ہے، بس اسے کیا فائدہ ہے اس کے اِس اقرار کے ساتھ کہ اللہ ان سے زیادہ جانتا ہے اور یہ کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، اس لیے کہ جو چیز اس پر دلالت کر رہی ہے کہ وہ (خدا سب سے زیادہ جانکار اور واقف کار ہے) وہی اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، وہ ذاتی طور پر عالم ہے (یعنی اس کا علم عین ذات ہے) تمام معلومات کے بارے میں جانتا ہے۔

ارشادالٰہی: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ، میں چند اقوال ہیں:

اول: اس کے ارشاد مِنَ اللہ میں مِنَ ابتدائے غایت کے لیے ہے جو کہ شہادت (گواہی) سے متصل ہے، کتمان (یعنی چھپانے) سے نہیں، جس کے معنی ہیں اس سے بڑا کوئی ظالم نہیں جس کے پاس اللہ کی طرف سے شہادت ہو اور وہ اسے چھپالے۔ اس شہادت سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے ان کی کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صحت اور بشارت کی وضاحت فرمائی ہے۔ یہ قول حسن اور قتادہ کا ہے۔

بیان کیا گیا ہے: اس سے مراد ہے ابراہیمؑ واسماعیلؑ واسحاق، یعقوبؑ اور ان کی اولاد ہیں جو دین حنیف پر قائم مسلمان تھے۔ انھوں نے اس شہادت کو چھپایا اور دعویٰ کیا کہ وہ ان کے دین پر ہیں۔ یہ مجاھد کا قول ہے۔ اللہ کی یہ شہادت ان کے پاس تھی جسے انھوں نے پوشیدہ کیا اور چھپایا۔

دوم: مِنَ وابستہ اور متصل ہے کتمان سے، یعنی اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو تورات میں اللہ کی طرف سے موجود (چیز) کو چھپاتا ہے، یعنی اللہ کی عبادت اور اللہ کے حضور گواہی دینے کو چھپاتا ہو۔

سوم: اللہ کی جانب سے شہادت کو چھپانے میں کون بڑا ظالم ہے اگر وہ اسے چھپائے یہ اس طرح ہے جس طرح کوئی کہے جو شخص فقیر اور ضعیف پر ظلم و جور کرتا ہے اس سے غنی وقوی سلطان کی جانب سے کون بڑا ظالم ہے۔ اس کے معنی ہوں گے کہ تمھارے لیے لازمی ہے اللہ کی جانب سے کوئی بڑا ظالم نہیں ہے، جب وہ شہادت وگواہی کے وقت اسے چھپائے تاکہ اس کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا کرے اور اس کی ذات اس سے مستغنی اور بلند ہے، اگرچہ یہود و نصاریٰ کو اس کی خبر دی جائے۔ بلخی اور ابو مُسلم کے قول کے یہی معنی ہیں۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ، خداوند عالم نے انھیں دھمکی دی ہے اس چیز کے ذریعہ جو ہر وعید اور دھمکی کو سمیٹے ہے۔ یعنی خداوند عالم اس گواہی کو فراموش کرنے والا نہیں، اللہ کے لیے جس کا انجام دینا تم پر واجب و لازم تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ اپنے عموم پر ہے یعنی اللہ سے کسی قسم کی معلومات پوشیدہ نہیں ہیں۔ پس اپنے اعمال کی جزا سے ڈرو جس عذاب کے تم حقدار ہو۔

❀❀❀❀❀

تِلۡكَ أُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُم مَّا كَسَبۡتُمۡ ۖ
وَلَا تُسۡـَٔلُونَ عَمَّا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ﴿۱۴۱﴾

یہ وہ لوگ تھے جو گذر چکے، انھوں نے جو کچھ کمایا ان کے لیے تھا اور تم جو کچھ کماؤ گے وہ تمھارے لیے ہے اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔

تفسیر:

ہر ایک کے اعمال اس کے ساتھ

اس آیت کی تفسیر سابق میں گذر چکی ہے۔ اس کے تکرار کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ پہلی (آیت) میں جناب ابراہیمؑ اور ان کے ساتھ ذکر شدہ انبیاء مراد ہیں اور دوسری سے یہودیوں کے بزرگ۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب اوقات اور مقامات مختلف ہوں تو تکرار عیب نہیں ہے۔ آیت کا اپنے ماقبل سے اتصال کی وجہ یہ ہے کہ (خداوند عالم) فرماتا ہے جب تمھیں یہ بات تسلیم ہے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ انبیاء دین یہودیت یا نصرانیت پر تھے تو اس بارے میں تمھارے لیے حجت نہیں ہے، اس لیے کہ مصالح کے سبب شریعتوں میں اختلاف کا ہونا مانع نہیں ہے۔ خداوند عالم شریعتوں کو جس طرح چاہے منسوخ کر سکتا ہے اور اس میں سے جس قدر چاہے باقی رکھ سکتا ہے، جس طرح اس کی حکمت تقاضا کرے۔ بیان کیا گیا ہے: نصیحت کے مورد و محل میں وارد ہوا ہے تا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے شرف کے بارے میں گفتگو نہ کریں۔ اگر وہ امر خدا کی مخالفت کریں گے تو یہ چیز ان کے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوگی۔

❀❀❀❀❀

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾

نادان لوگ یہ کہیں گے: انھیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اس سے ایک دم منحرف ہو گئے۔ (اے نبی) آپ ان سے کہہ دیجیے: ''مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔''

الفاظ و معانی:

سَفِيه، جَاهِل، غَبِيّ باہم مشابہ ہیں۔ ہم سَفه اور سَفِيه کے معنی بیان کر چکے ہیں۔

وَلَّا عَنْهُ کے معنی پھرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ یہ وَلِيَ سے مشتق ہے، یہ قربت و نزدیکی ہے اور پہلے کے بعد کسی فاصلہ کے بغیر دوسرے کا حاصل ہونا ہے، دوسرا پہلے سے متصل ہوتا ہے اور تیسرا دوسرے سے متصل ہوتا ہے اور اسی طرح ہمیشہ (سلسلہ) جاری رہے گا۔ وَلَّى عَنْهُ، وَلَّى إِلَيْه کا مفہوم ہے اس سے منحرف ہو گیا اور اس سے اپنا رخ موڑ دیا۔ جیسا کہ آپ کا اس طرح کہنا: عَدَلَ عَنْهُ، عَدَلَ إِلَيْهِ، اِنْصَرَفَ عَنْهُ، اِنْصَرَفَ إِلَيْهِ جو اس سے متصل ہے اگر اس کی طرف متوجہ (رخ) ہے تو وہ مُتَوَلّٰى إِلَيْه ہے (اور اگر اس کے برخلاف سمت کی طرف توجہ اور رخ ہے تو مُتَوَلٍّ عَنْه ہے۔

قِبْلَة جِلْسَة کے وزن ہے اس حالت کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز کے مقابل ہو جس طرح وہ حالت و کیفیت جس پر (انسان) بیٹھتا ہے اور اس طرح کہا جاتا ہے: یہ میرے لیے قبلہ ہے اور میں اس کے لیے قبلہ ہوں پھر وہ اس سمت کے لیے عَلَم قرار دیا گیا جس کی طرف نماز میں رخ کیا جاتا ہے۔

ترکیب:

مِنَ النَّاسِ محلا منصوب، السُّفَهَآءُ کے لئے حال ہے۔ مَا اسم استفہام ہے مبتدا، وَلّٰهُمْ اس کی خبر ہے۔ عَنْ قِبْلَتِهِمْ، وَلّٰى کا مفعول ہے۔

تفسیر:

تبدیلیٔ قبلہ کا واقعہ

خداوند عالم نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے مسلمانوں پر ان کے بیت المقدس سے کعبہ کی جانب رخ کرنے پر اعتراض کیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ، عنقریب جہلا جو کہ کفار ہیں بعض لوگوں سے کہیں گے: مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا، یعنی کس چیز نے مسلمانوں کو بیت المقدس سے جس کی جانب وہ اپنی نمازوں میں رخ کیا کرتے تھے، رخ موڑ دیا؟

اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کہنے والے کون ہیں؟ ابن عباس وغیرہ نے کہا ہے: وہ یہودی ہیں۔ حسن نے کہا ہے: وہ مشرکین عرب ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف رخ کیا تو ان لوگوں نے کہا: اے محمدؐ! آپ نے اپنے آباء واجداد کے قبلہ سے انحراف کیا۔ پھر آپ اسی کی طرف پلٹ گئے۔ پس ان کے دین کی طرف بھی پلٹ جائیے۔ سُدی نے کہا ہے: وہ منافقین تھے، انھوں نے اسلام کا استہزا کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا۔

ان کی اس گفتگو کے سبب میں اختلاف ہے۔ بیان کیا گیا ہے: انھوں نے یہ بات نَسْخ (یعنی کوئی چیز منسوخ نہیں ہوئی) کا انکار کرتے ہوئے کہی تھی۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: اے محمدؐ! کس چیز نے آپ کے قبلہ سے جس کی جانب آپ رخ کرتے تھے آپ کا رخ موڑ دیا؟ آپ ہمارے قبلہ کی طرف پلٹ آئیے، ہم آپ کا اتباع کریں گے اور آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس طرح ان کا مقصد فتنہ برپا کرنا تھا۔ یہ قول بھی ابن عباس کا ہے اور کہا گیا ہے کہ عرب مشرکین نے یہ بات توہُّم پیدا کرنے کے لیے کہی تھی کہ حق وہی ہے جس پر وہ خود ہیں۔ البتہ قبلۂ اول سے رخ موڑنے کی وجہ میں دو قول ہیں:

اول: اس تغیر وتبدیلی قبلہ میں اللہ کی مصلحت پوشیدہ تھی۔

دوم: اس چیز کو خداوند عالم نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ، (سورہ بقرہ، آیت ۱۴۳)

(اس کو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ بنایا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون پچھلے پیروں لوٹ جاتا ہے) اس لیے کہ جب (مسلمان) مکہ میں تھے تو انھیں بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا اس لیے

حکم دیا گیا تھا کہ ان مشرکینؔ سے انھیں جدا گانہ قرار دیں جو کعبہ کی طرف رخ کرتے تھے۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وارد مدینہ ہوئے اس وقت یہودی بیت المقدس کی طرف رخ کیا کرتے تھے، بس (مسلمانوں) کو کعبہ کی جانب رخ کرنے کا حکم دیا گیا تا کہ (یہودیوں) سے الگ کیا جا سکے۔

قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ. یہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں سے فرما دیں جنھوں نے بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی جانب رخ موڑنے پر اعتراض کیا تھا کہ مشرق و مغرب اللہ کی ملکیت ہیں وہ اپنی حکمت کے مطابق ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

اس حکم میں اس کے قول کا بطلان ہے جس کا خیال تھا کہ بیت المقدس کی سرزمین رخ کرنے کے اعتبار سے زیادہ اولی و بہتر ہے۔ چونکہ یہ انبیاء کرام کا مسکن ہے۔ خدا نے اسے باشرف اور بافضیلت قرار دیا ہے اس سے روگردانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ خداوند عالم نے ان کے اس توہم کا جواب دیا ہے کہ تمام مقامات اللہ کے ہیں۔ انھیں ہر زمانہ میں بندوں کی مصلحت کے مطابق شرف بخشتا ہے۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے مدینہ تشریف لانے کے سترہ مہینے بعد تک نماز بیت المقدس کی طرف پڑھی جاتی رہی۔

براء بن عازب سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہؐ کے ہمراہ سولہ ماہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، پھر ہم نے کعبہ کی طرف رُخ کیا۔ اس چیز کو مسلم نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے انس بن مالک کے حوالے سے یہ عمل انیس ماہ یا دس ماہ تک جاری رہا اور معاذ بن جبل سے تیرہ ماہ کی روایت ہے۔

علی بن ابراہیم نے اپنی سند سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے، آپ نے فرمایا: پیغمبرؐ کے مکہ میں تیرہ برس نماز پڑھنے کے بعد کعبہ قبلہ بنا اور پیغمبرؐ کی مدینہ ہجرت کے بعد آپؐ نے سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ (امامؑ نے فرمایا) پھر خداوند عالم نے آپؐ کا رخ کعبہ کی جانب کر دیا۔ یہ اس لیے ہوا کہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے کہتے تھے کہ آپ ہمارے تابع و پیروکار ہیں۔ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی اس گفتگو سے رسول اللہ کو شدید غم ہوتا تھا چنانچہ آپ نصف شب باہر نکلتے اور آسمان کی طرف دیکھتے اور اس متعلق اللہ کے حکم کا انتظار فرماتے، جب صبح ہوئی اور نماز ظہر کا وقت ہوا اس وقت آپؐ نے بنی سالم کی مسجد میں ابھی ظہر کی دو رکعت نماز ادا کی تھی کہ جبرئیلؑ آئے اور آپ کا بازو پکڑ کر خانۂ کعبہ کی طرف موڑ دیا، اس وقت آپؐ پر یہ آیت نازل ہوئی: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ... (سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۴)

ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ہم اسی قبلہ کی طرف آپ کو

پلٹا دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ اب آپ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیں۔

اس طرح آپ نے دو رکعت نماز بیت المقدس کی جانب پڑھی اور دو رکعت کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی۔ پس یہودیوں اور احمقوں نے کہا: مسلمانوں کو اس قبلہ سے کس نے موڑ دیا؟! جس پر یہ پہلے قائم تھے۔ زجاج نے کہا ہے: نماز کا حکم بیت المقدس کی طرف (رخ کر کے پڑھنے کا دیا گیا تھا) چونکہ مکہ بیت اللہ تھا، جس سے عرب حج کے سبب اس سے مانوس تھے، پس خداوند عالم نے اس چیز کو پسند فرمایا کہ قوم کی آزمائش غیر مالوف اور غیر محبوب چیز سے کی جائے تاکہ رسولؐ کی پیروی کرنے والے اور پیروی نہ کرنے والے ظاہر و نمایاں ہو جائیں۔ اس کا ارشاد ہے: يَهْدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ، یعنی جسے چاہتا ہے اس کے دین کی طرف رشد و ہدایت فرماتا ہے۔ صِرَاط (راستہ) کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جنت کا راستہ ہے، جو جنت کی طرف لے کر جاتا ہے۔ جس طرح راستہ مقصد تک پہنچاتا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ طَرِيقُ الْجَنَّةِ یعنی جنت کا راستہ ہے۔

❀❀❀❀❀

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا ٱلْقِبْلَةَ ٱلَّتِى كُنتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ ٱلرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَٰنَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

اور اسی طرح ہم نے تم کو "امت وسط" قرار دیا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہے۔ پہلے تم جس طرف رخ کرتے تھے اس کو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ بنایا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون پچھلے پیروں لوٹ جاتا ہے یہ معاملہ اگرچہ دشوار تھا مگر ان کے لیے نہیں جو اللہ کی ہدایت سے فیضیاب تھے اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

قرائت:

ابن کثیر، نافع، ابن عامر اور حفص نے عاصم سے لَرَؤُوف بروزن رَعُوف قرأت کی ہے۔ ابو جعفر نے لَرَوُف واؤ کے ساتھ اور ہمزہ کے بغیر قرأت کی ہے اور بقیہ قراء نے رَعُف کے وزن پر لَرَؤُف قرأت کی ہے۔

حجت:

جن قراء نے رَؤُوف پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ صفت مشبہہ فَعَل سے عرب کے کلام میں زیادہ تر فَعُوْل کے وزن پر آتا ہے کیا آپ نے ضَرُوب و صَبُور نہیں دیکھا ہے کہ وہ باب یَقِظ اور حَذِرَ سے زیادہ آتا ہیں اور اسی وزن فَعُوْل پر خدا کے دیگر صفات بھی آئے ہیں جیسے غَفُور، شَکُور وَدُوْد اور صفات خدا میں فَعُل کے وزن پر ہمیں کوئی صفت معلوم نہیں ہے۔ کعب بن مالک انصاری نے کہا:

نُطِيعُ نَبِيَّنَا وَ نُطِيعُ رَبًّا هُوَ الرَّحْمٰنُ كَانَ بِنَا رَءُوفًا

(ہم اپنے نبی کی اطاعت کرتے ہیں اور پروردگار کی اطاعت کرتے ہیں وہی رحمٰن اور ہمارے اوپر مہربان ہے)

اور جن لوگوں نے روؤف پڑھا ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ اہل حجاز میں غالب و رائج ہے۔

ولید بن عقبہ نے معاویہ سے کہا:

وَ شَرُّ الطَّالِبِيْنَ فَلَا تَكُنْهُ لِقَاتِلِ عَمِّهِ الرَّؤُوْفِ الرَّحِيْمِ

جریر نے کہا:

تَرَى لِلْمُسْلِمِيْنَ عَلَيْكَ حَقًّا كَفِعْلِ الْوَالِدِ الرَّؤُوْفِ الرَّحِيْمِ

الفاظ و معانی:

وَسَط کے معنی عَدَل کے ہیں اور کہا گیا ہے کہ خِیَار پسندیدہ کے معنی میں ہے ان دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ چونکہ عدل خیر ہے اور خیر عدل ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس جگہ اور مقام سے اخذ (حاصل) کیا گیا ہے جہاں سے اس کے اطراف کی مسافت برابر ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلکہ توسط سے اخذ کیا گیا ہے جو مقصر اور غالی

کے درمیان ہوتا ہے۔حق اسی قول کے ساتھ ہے۔ مؤرج نے بیان کیا ہے کہ لوگوں اور انبیاء کے درمیان واسطہ ہے(یا درمیان میں ہے)

صاحب العین نے کہا ہے: ہر چیز کا وسط اس کا عادل ترین اور افضل ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَاسِط اور وَسَط، یَابِس اور یُبْس کے درمیان ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بیان کیا گیا ہے: کَانَ مِنْ اَوْسَطِ قَوْمِہٖ یعنی اپنی قوم (امت) میں سب سے بہتر اور افضل تھے۔

عَقِبْ قدم کا آخری حصہ (ایڑی) ہے اور انسان کا عقب اس کی نسل ہے۔ ثعلب نے کہا ہے: نُرَدُّ عَلٰی اَعْقَابِنَا یعنی ہم خیر کے بعد شر کی جانب پلٹ جائیں گے، اسی طرح عَقِب کی طرف پلٹنا ہے۔ عُقْبَہ سوار ہونے اور چلنے میں تکرار کرنا ہے (یعنی سوار ہونے کے بعد پھر سے سوار ہونا ہے) تعقیب اس امر کی طرف رجوع اور بازگشت ہے جسے آپ چاہتے ہیں اور اسی سے ہے: لَمْ یُعَقِّبْ اور رات کا عقب نہار ہے جو اس کے پیچھے چلا آتا ہے۔

اِضَاعَۃ اَضَاعَ کا مصدر ہے۔ کتاب العین کے مؤلف نے کہا ہے ضَیْعَۃُ الرَّجل یعنی مرد کا پیشہ اور ہنر ہے۔ ضیاع کے لغوی معنی ہلاکت کے ہیں۔

ترکیب:

اس آیت میں تین قسم کے لام ہیں: لِتَکُوْنُوْا میں لَامِ کَیْ ہے اور تَکُوْنُوْا، اَنْ کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اصل یہ ہے: لِاَنْ تَکُوْنُوْا۔ اَنْ تَکُوْنُوْا، لَامِ کَیْ وجہ سے محلا مجرور ہے اس لئے کہ لَامِ کَیْ دراصل لام جر ہی ہے۔

وَاِنْ کَانَتْ لَکَبِیْرَۃً میں لام، لام تاکید ہے اور وہ لام ابتداء ہے۔ اِنَّ اور لام کے درمیان فاصلہ ڈالا گیا ہے تاکہ دو ہم معنی حرف ایک ساتھ جمع نہ ہو جائیں لازم ہے کہ اِنْ اِنَّ کا مخفف ہوتا کہ اِنْ نافیہ سے مشتبہ نہ ہو جائے جو کہ مَا کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: اِنِ الْکَافِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ (یہاں پر اِنْ مَا کے معنی میں ہے)

اہل بصرہ نے اس کا انکار کیا ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ کہنا صحیح ہوتا: جَاءَ الْقَوْمُ لَزَیْدًا بمعنی اِلَّا زَیْدًا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ میں لام نفی کی تاکید کے لئے آیا ہے اس لئے کہ اصل اس طرح ہے: مَا كَانَ اللّٰهُ مُضَيِّعاً إِيمَانَكُمْ۔

(خدا نے تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے) جب اس کے معنیٰ کو تاویل پر حمل کیا جائے گا تو لفظ کو بھی تاویل پر حمل کیا جائے گا۔ اَنْ کے اظہار کی تصریح کے بغیر لام جحد کے بعد ان کو ظاہر کرنا جائز ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔

كَذٰلِكَ میں کاف، کاف تشبیہ ہے اور وہ مصدر (مفعول مطلق) کی وجہ سے محلاً منصوب ہے۔ ذٰلِكَ اس ہدایت کی جانب اشارہ ہے جو يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ میں ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے: أَنْعَمْنَا عَلَيْكُمْ بِالْعَدَالَةِ كَمَا أَنْعَمْنَا عَلَيْكُمْ بِالْهِدَايَةِ (ہم نے عدالت کے ذریعہ تم پر نعمت نازل کی جس طرح ہدایت کے ذریعہ نعمت نازل کی تھی) کاف میں عامل جَعَلْنَا ہے گویا اس طرح ہے: يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ فَقَدْ أَنْعَمْنَا عَلَيْكُمْ بِذٰلِكَ وَجَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً فَأَنْعَمْنَا مِثْلَ ذٰلِكَ الْإِنْعَامِ۔

(وہ جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے بے شک ہم نے اس کے ذریعہ تمہارے اوپر نعمت نازل کی ہے اور تمہیں درمیانی امت قرار دیا ہے اور اسی طرح کے دیگر انعامات کئے۔ البتہ جَعَلْنَا، أَنْعَمْنَا کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔

هَدَى اللّٰهُ۔ الَّذِينَ کا صلہ ہے۔ موصول کی جانب پلٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے: عَلَى الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ جار و مجرور محلاً منصوب ہے استثناء کی بنا پر۔ اس کی اصل یہ ہے: وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً عَلَى الْكُلِّ إِلَّا الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ۔

تفسیر:

امت وسط

پھر خداوند عالم نے اس امت کا تمام امتوں پر فضل و شرف بیان فرمایا، ارشاد ہوا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا، خداوند عالم نے خبر دی ہے کہ اس نے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اعتدال پر رسول اور لوگوں کے درمیان واسطہ قرار دیا ہے

اگر یہ کہا جائے کہ جب امت میں اس صفت کا کوئی حامل نہیں ہے تو جماعت کی اس طرح کیسے صفت بیان کی گئی؟ اس کا جواب ہے: اس سے مراد ہے جو اس صفت کے ساتھ ہو، اس لیے کہ ہر زمانہ میں اس صفت سے خالی جماعت وگروہ نہیں ہوگا۔ برید بن معاویۃ العجلی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے امامؑ نے فرمایا: نَحْنُ الْاُمَّةُ الْوَسَطُ. وَنَحْنُ شُهَدَآءُ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ وَحُجَّتُهٗ فِيْٓ اَرْضِهٖ ، ہم امت وسط ہیں، ہم اللہ کی مخلوق پر اس کے شہداء (گواہ) ہیں اور اس کی زمین پر اس کی حجت ہیں۔

اور دوسری روایت میں امامؑ نے فرمایا: حد سے گذر جانے والا ہماری طرف پلٹتا ہے اور مقصر (کوتاہی کرنے والا، پیچھے رہ جانے والا) ہم سے ملحق ہو جاتا ہے۔

حاکم ابوالقاسم حسکانی نے کتاب شواھد التنزیل لقواعد التفضیل میں سلیم بن قیس ہلالی کی سند سے علی علیہ السلام سے روایت کی ہے، آپؑ نے فرمایا: اللہ کے اس قول: لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ سے ہم مراد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم پر گواہ ہیں اور ہم اللہ کے گواہ اس کی مخلوق پر ہیں اور اس کی زمین پر حجت ہیں وہ ہم ہی ہیں جن کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا اور اس کے ارشاد:

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ، میں تین اقوال ہیں:

اول: تاکہ تم لوگوں کے اعمال پر گواہی دو جس میں انھوں نے دنیا و آخرت میں حق کی مخالفت کی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ (سورۂ زمر، آیت ۶۹) (پھر انبیاء اور تمام گواہوں کو حاضر کیا جائے گا) اور ارشاد ہوتا ہے: وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (سورۂ غافر، آیت ۵۱) (اور اس روز بھی کریں گے جب سارے گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے) ابن زید نے کہا ہے: گواہ چار ہیں: ملائکہ، انبیاء، امت محمدؐ، اعضاء و جوارح جیسا کہ ارشاد ہے: يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (سورۂ نور، آیت ۲۴) (جس روز ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف ان کے اعمال کی گواہی دیں گے)

دوم: تاکہ تم لوگوں پر حجت ہو اور ان کے لیے حق اور دین کو واضح کرو اور رسول تم پر گواہ ہوں گے جو دین تم تک پہونچانے والے ہیں شاہد کو شاہد اس لیے کہا گیا کہ وہ وضاحت اور بیان کرتا ہے۔ اسی سبب سے شہادت (گواہی) کو بَيِّنَة کہا جاتا ہے۔

سوم: اسی طرح یہ انبیاءؑ کے لیے گواہی دیں گے، ان کی امتوں پر جنھوں نے ان کی تکذیب کی ہے کہ انھوں نے پیغام پہونچایا۔ یہ چیز آنحضرتؐ کے اعلان کے لیے جائز و ممکن ہے۔ ان کی نسبت ارشاد ہوتا ہے: وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تم پر تمھارے اعمال کی گواہی دیں گے۔ کہا گیا ہے کہ تم پر حجت ہیں۔ کہا گیا ہے کہ تمھاری قیامت کے روز گواہی دیں گے کہ تم نے تصدیق کی جس کی شہادت و گواہی دیتے ہو۔ علیٰ لام کے معنی میں ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ یعنی (سورۂ مائدہ، آیت ۳) اور جو بتوں کے آستانے پر ذبح کیا گیا ہو یعنی بتوں کے لیے۔

اس کا ارشاد: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا، کہا گیا ہے: كُنْتَ عَلَيْهَا، (جس پر آپ تھے) کے معنی ہیں: صِرْتَ عَلَيْهَا (اس پر آپ ہو گئے) اور آپ اس پر ہیں یعنی کعبہ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ، تم بہترین امت ہو۔ کہا گیا ہے کہ یہ صحیح ترین ہے یعنی بیت المقدس جس کی طرف آپ نماز پڑھتے تھے یعنی ہم نے آپ کا اس قبلہ سے رخ موڑ دیا جس پر آپ تھے، بجز اس کے کہ ہم جانیں یا جس قبلہ کو ہم نے آپ کے لیے قرار دیا تھا جس پر آپ تھے۔ اس سے ہم نے آپ کا (رخ) موڑ دیا۔ اس پر کلام کی دلالت کے سبب حذف کر دیا گیا۔

إِلَّا لِنَعْلَمَ، میں متعدد اقوال ہیں:

اول: تا کہ وہ (خدا) نبیؐ اور مومنین سے ہمارے گروہ کو جان لے۔ جس طرح بادشاہ کہتا ہے ہم نے ملک اس طرح فتح کیا۔ یا ہم نے اس طرح انجام دیا یعنی ہمارے دوستوں اور ساتھیوں نے فتح کیا۔

دوم: تا کہ معلوم کو موجود حاصل کرے جس کی تقدیر ہے تا کہ معلوم کرے کہ وہ موجود ہے۔ ایسی صفت بیان کرنا درست نہیں ہے کہ وہ معلوم (چیز) کے وجود کا عالم ہے اس کے وجود سے قبل۔

سوم: تا کہ ہم تمھارے ساتھ ایسی آزمائش کرنے اور امتحان لینے والا جیسا معاملہ کریں جو گویا کہ واقف اور جانکار نہیں ہے۔ اس لیے کہ عدل اس بات کا تقاضا کرتا ہے اس اعتبار سے کہ اگر ان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اس چیز کے بارے میں جس سے وہ واقف ہے کہ وہ ان کی جانب سے ہوگی (اس چیز) کے واقع ہونے سے قبل تو ظلم ہوگا۔

چہارم: جیسا کہ علم الہدیٰ سید مرتضیٰ قدس روحہ نے کہا ہے کہ اس کا ارشاد: لِنَعْلَمَ، یعنی تا کہ ہم جانیں در حقیقت اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ (خدا) اور اس کے علاوہ جان لے اس کا علم غیر کے علم کے ساتھ

حاصل نہیں ہوگا بجز حصول اتباع کے، البتہ علم کے حاصل ہونے سے قبل خدا کی ذاتِ قدیم علم میں منفرد اور تنہا ہوگی اس کی نسبت۔ اس طرح آیت کا ظاہر درست ہے۔

مَنۡ يَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ، یعنی رسول) پر ایمان رکھتا ہے، ان کے اقوال اور افعال کا اتباع کرتا ہے۔

مِمَّنۡ يَّنۡقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيۡهِ، اس میں دو قول ہیں:

اوّل: ایک گروہ تحویل قبلہ کے وقت اس کی حکمت سے ناواقفیت کے سبب اسلام سے مرتد ہو گیا۔

دوم: اس سے ہر کفر پر باقی اور قائم رہنے والا مراد ہے۔ اس لیے کہ استقامت اقبال اور آگے بڑھنا ہے اور اس کے خلاف ادبار (واپس پلٹنا ہے) اسی لیے کافر کے لیے کہا جاتا ہے: اَدۡبَرَ وَ اسۡتَکۡبَرَ، یعنی حق سے پیچھے پلٹ گیا اور اس نے تکبر کیا۔ اس نے تکذیب اور روگردانی کی۔

وَاِنۡ كَانَتۡ لَكَبِيۡرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ، کانت میں ھِیَ کی ضمیر قبلہ کی جانب پلٹ رہی ہے۔ ابو العالیہ کے قول کے مطابق یعنی قبلہ گراں تھا۔ کہا گیا ہے کہ ضمیر تحویل کی جانب پلٹ رہی ہے اور جو کچھ قبلہ اولیٰ سے وابستگی تھی۔ یہ قول ہے ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا۔ یہی قوی قول ہے، اس لیے کہ قوم پر تحول (قبلہ سے رخ موڑنا) گراں تھا نہ کہ خود قبلہ کہ ضمیر صلوٰۃ کی طرف پلٹ رہی ہے، یہ ابن زید کا قول ہے۔

اس کا قول: لَكَبِيۡرَةً حسن نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: ثَقِيۡلَةً، (گراں ہے) یعنی بیت المقدس سے رخ موڑنا۔ اس لیے کہ عربوں کے نزدیک کعبہ سے زیادہ محبوب قبلہ نہیں تھا۔ بیان کیا گیا ہے: جو اس کی حکمت سے ناواقف و جاہل ہے، ان کے لئے گراں ہے لیکن جس کی اللہ نے ہدایت فرما دی ہے اس پر گراں نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تحویل کعبہ میں رسولؐ کی تصدیق کی۔ مومنین کو اس لیے مخصوص قرار دیا ہے کہ اللہ نے انھیں کی ہدایت فرمائی ہے۔ اگرچہ وہ تمام مخلوقات کی ہدایت فرماتا ہے تو ان کا ذکر مدح کے عنوان سے کیا ہے اور انھوں نے اللہ کی ہدایت سے استفادہ کیا ہے اور غیر مومنین کو ان میں شمار نہیں کیا گیا ہے۔

ارشاد الٰہی: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ، بیان کیا گیا ہے اس میں متعدد اقوال ہیں:

اوّل: تحویل قبلہ کے وقت لوگوں نے کہا: ہمارے ان اعمال کا کیا ہوگا جنھیں ہم قبلۂ اول کی طرف انجام دیتے رہے ہیں؟ پس خدا نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ، یہ ابن عباس و قتادہ سے روایت ہے اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو اس سے پہلے مر چکے ہیں؟ اسعد بن زرارہ اور براء بن معرور مر چکے تھے دونوں نقیب تھے۔

فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيْمَانَكُمْ ، یعنی تمھاری نمازیں جو بیت المقدس کی طرف رخ کرکے پڑھی گئیں (انھیں خداوند عالم ضائع نہیں کرے گا) اس اعتبار سے ممکن ہے ایمان کو اس کے حقیقی معنی تصدیق پر حمل کیا جائے یعنی قبلہ کے اس حکم کے سبب تمھاری تصدیق کو ضائع و برباد نہیں کیا جائے گا۔

دوم: جب تحویل قبلہ کے سبب ان پر ہونے والی مشقت کا ذکر کیا اس کے ساتھ ہی انھیں حاصل ہونے والے ثواب کو بھی بیان کیا کہ انھوں نے زحمت و تکلیف برداشت کی ہے اسے ضائع نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس چیز کا ذکر انھیں حق اور رضا کی پابندی پر آمادہ کرتا ہے۔

سوم: جب خداوند عالم نے کعبہ کی جانب سے رخ کرنے کے سبب ان کے انعام کا ذکر فرمایا تو اس سبب کا بھی ذکر فرمایا جس کے باعث وہ اس انعام کے مستحق قرار پائے تھے اور وہ ان کا ایمان ہے جس کے وہ پہلے حامل اور اختیار کرنے والے ہیں۔ فرمایا: خداوند عالم تمھارے اس ایمان کو ضائع و برباد نہیں کرے گا جس کے تم کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کے سبب مستحق ہو چکے ہو۔ یہ قول ابوالقاسم البلخی کا ہے۔

ارشاد الٰہی: إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ، یقین جانو کہ وہ (اللہ) لوگوں کے حق میں نہایت مہربان و شفیق ہے۔ اللہ کے یہاں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں ہوتا۔ رَأْفَة میں شدید رحمت ہے۔ خداوند عالم نے رافت و رحمت کے ذریعہ دلالت فرمائی ہے کہ وہ ان کے کسی (عمل) کو ضائع کیے بغیر جس ثواب کے وہ مستحق ہیں اس سے کہیں زیادہ عطا فرمائے گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے ارشاد "لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ" کے ذریعہ دلیل پیش کی ہے کہ تحویل قبلہ کے سبب اس نے لوگوں پر انعام فرمایا ہے۔

بیشتر علماء نے اس آیت کے ذریعہ اجماع امت کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ ان کی صفت عادل ہونا بیان کیا ہے۔ پس جن کو خداوند عالم نے عادل قرار دیا ہو ان کی گواہی کا رد ہونا ناممکن ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت مذکورہ دعوے پر دلالت نہیں کر رہی ہے۔ اس لیے کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ امت کا ہر فرد اس صفت (عدل) سے متصف ہو جبکہ اس کے خلاف معلوم ہے اور جب آیت کو امت کے بعض افراد پر حمل کیا جائے گا تو یہ (حمل کرنا) معصومین اور ائمہ اہل بیت رسولؐ سے اولیٰ نہیں ہوگا۔

یہ آیت شریعت میں جواز نسخ پر دلیل ہے بلکہ نسخ کے واقع ہونے پر دلیل ہے۔ اس کا ارشاد ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا ، اس میں خبر دی گئی ہے کہ خداوند عالم اس قبلہ کا جاعل (بنانے والا) ہے، وہی ہے جس نے انھیں اس سے منتقل کیا ہے۔ یہی نسخ ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ہم اسی قبلہ کی طرف آپ کو پلٹا دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔اب آپ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیں۔اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو (نماز میں) مسجد الحرام ہی کی طرف اپنا رخ کرلیا کرو۔یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی۔خوب جانتے ہیں کہ (تحویل قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب کی طرف سے ہے اور برحق ہے۔مگر اس کے باوجود جو ان کی حرکتیں ہیں اللہ ان سے غافل نہیں ہے۔

الفاظ و معانی:

رُؤيَة آنکھ کے ذریعہ کسی چیز کا ادراک کرنا ہے۔اسی کے مانند ابصار ہے جو علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تَقَلُّب، تَحَوُّل اور تَصَرُّف ایک جیسے ہیں اور یہ جہات (سمتوں) میں تحرک و حرکت ہے۔وَلَّيْتُكَ الْقِبْلَةَ کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں: میں نے تمھیں پھرا دیا ہے تم اپنے چہرے سے استقبال قبلہ کرو۔

رِضَا اور مَحَبَّة دونوں مشابہ اور ایک دوسرے کی مثال ہیں البتہ دونوں کی ضد میں فرق ظاہر ہوگا۔محبت کی ضد بغض ہے جبکہ رضا کی ضد ناراضگی ہے جس کی بازگشت ارادہ کی جانب ہے اگر رَضِيَ عَنْهُ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد اس کی تعظیم اور ثواب ہوتا ہے اور جب رَضِيَ عَمَلَهٗ کہا جاتا ہے تو اس سے ارادہ مراد ہوتا ہے۔سخط انتقام کا ارادہ ہے۔

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی سمت مسجد یا اس کی جانب۔صاحب العین نے کہا ہے: ہر چیز کا

شَطْر (سمت) اس کا نصف ہے اور شطرہ (یعنی) اس کی سمت وجانب اور اس کا قصد ہے۔

حَرَام (یعنی) مُحرّم جس طرح کتاب بمعنی مکتوب، حساب بمعنی محسوب ہے۔حق کسی چیز کا اس کے مقام پر قرار دینا ہے جبکہ اس میں قبح کی وجہوں سے کوئی وجہ نہ ہو۔

غَفْلَة کے معنی بعض اشیاء سے سہو ہے مخصوص طور پر جبکہ سہو عام ہے یہ غفلت سے بلند ہے چونکہ سونے والے کو غافل نہیں کہا جائے گا مگر بطور مجاز۔

ترکیب:

حَيْثُ مَا كُنْتُمْ میں كُنْتُمْ محلاً مجزوم ہے شرط کی وجہ سے، اس کی تقدیر اس طرح ہے: وَحَيْثُمَا تَكُونُوا۔فاء اپنے مابعد کے ساتھ جزاء ہے۔

حَيْثُ اور اِذْ کے ذریعہ جزا نہیں لائی جائے گی جب تک کہ ان دونوں کو ما کے ذریعہ عمل کرنے سے روک نہ دیا جائے اس لئے کہ یہ دونوں کلمات شرط بننے سے پہلے اپنے بعد والے جملہ کی طرف مضاف ہوتے ہیں پس ان کے ادات شرط ہونے کے لئے ان کے ساتھ مَا کا ہونا شرط ہے تا کہ انہیں جملہ کی جانب اضافت سے روک دے اس لئے کہ اضافت جزاء سے روک دیتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل جب اسم کی جگہ پر واقع ہوتا ہے تو مضاف الیہ اسم مجرور کی جگہ چلا جاتا ہے اور وہ اضافت کی وجہ سے محلاً مجرور ہو جاتا ہے لہٰذا اسے جزاء کی بنا پر جزم نہیں دے سکتے ہیں جبکہ اس میں رفع کی شرط موجود نہیں ہے۔ جب ایسا ہے تو حَيْثُ اور اِذْ کو مَا کے ذریعہ عمل کرنے سے روک دیا جاتا ہے تا کہ ان دونوں کو جزا کی بنا پر فعل شرط کو جزم دینے کے لئے تیار کیا جائے۔

شَطْرَ: ظرف (مفعول فیہ) کی بنا پر منصوب ہے۔

شان نزول:

مفسرین نے بیان کیا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دونوں قبلوں میں کعبہ سب سے زیادہ محبوب تھا۔آپ نے جبرئیلؑ سے فرمایا: میں چاہتا ہوں خداوند عالم یہودیوں کے قبلہ سے کسی غیر (قبلہ) کی طرف میرا رخ موڑ دے۔جبرئیل نے عرض کیا: میں بھی آپ کے مانند بندہ ہوں آپ اپنے پروردگار کے نزدیک عزیز و

محترم ہیں۔آپ پروردگار سے دعا کیجیے۔پھر جبرئیل چلے گئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منتظر نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے تاکہ جبرئیل ان کے سوال کا جواب لے کر آئیں تب خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

ہر جگہ سے کعبہ کی طرف رخ کرو

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (اے محمد) ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ آپ قبلہ کے معاملے میں وحی کا انتظار کر رہے ہیں۔اس آیت میں دو قول ہیں:

اول: حضورؐ سے بیت المقدس سے تحویل قبلہ کا وعدہ کیا گیا تھا آپؐ اس وعدے کے منتظر رہتے تھے، لہٰذا اسی سمت میں اپنی نظریں گھماتے جدھر سے آپ کو انتظار تھا۔

دوم: آپ کو بیت المقدس قبلہ کے طور پر ناپسند تھا اور آپ کعبہ کی طرف مائل تھے، جس کا آپؐ نے اللہ سے سوال نہیں کیا۔اس لیے کہ انبیاء (علیہم السلام) کے لیے اذن کے بغیر سوال کرنا جائز نہیں ہے۔چونکہ ممکن ہے کہ اس میں کوئی مصلحت نہ ہو اور (لوگوں) کو اس کا جواب نہ دیا جائے اور ان کی قوم کے لئے آزمائش بن جائے۔

کعبہ کی جانب تحویل قبلہ کی پیغمبرؐ کے ارادہ (خواہش) میں اختلاف ہے:

بیان کیا گیا ہے کہ چونکہ کعبہ آپؐ کے باپ ابراہیمؑ اور آپؐ کے اجداد کا قبلہ تھا۔یہ ابن عباس کا قول ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہودی یہ کہتے تھے کہ محمدؐ ہمارے دین میں ہماری مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے قبلہ کا اتباع کرتے ہیں۔یہ مجاہد کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہودی کہتے تھے: محمدؐ اور ان کے اصحاب نہیں جانتے کہ ان کا قبلہ کہاں ہے؟ ہم نے انہیں ہدایت دی اور رہنمائی کی۔یہ ابن زید سے روایت ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ عرب کعبہ سے محبت کرتے اور انتہائی درجہ تک اس کی تعظیم کرتے تھے، کعبہ کی طرف ان کا رخ کر کے ان کے قلوب کو مائل کرنا تھا تاکہ اس کے سبب نماز کے حریص ہو جائیں اور دین کی طرف دعوت میں حریص ہو جائیں۔

یہ بھی امکان ہے کہ ان تمام وجوہات کے سبب محبوب و پسندیدہ ہو ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی: فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ہم آپ کا رخ اس قبلہ کی طرف ضرور کر دیں گے (پھیر دیں

گے) جس کے آپ خواہاں ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ اس سے طبعی محبت مراد ہے نہ یہ کہ پیغمبر قبلۂ اول سے ناراض وناخوش تھے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، یعنی آپ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلیں۔ اس لیے کہ کسی چیز کا چہرہ وہ خود ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ چہرہ کا ذکر اس لیے کیا کہ اس سے توجہ کا اظہار ہوتا ہے۔ ابوعلی الجبائی نے کہا ہے: شَطْر سے نصف مراد ہے۔ اس طرح خداوند عالم نے نصف مسجد الحرام کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ کعبہ کے مقابل ہوسکیں۔ یہ خطا ہے اور درست نہیں ہے، اقوال مفسرین کے خلاف ہے۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ، یعنی زمین میں خشکی، تری، میدان اور پہاڑ الغرض جہاں بھی ہو اسی کی طرف رخ کرو۔ پہلا خطاب پیغمبرؐ اور اہل مدینہ سے ہے، دوسرا خطاب دنیا کے تمام لوگوں سے ہے۔ اگر پہلے ہی پر اقتصار کیا جاتا تو جائز (ممکن) تھا۔ گمان کیا جاتا کہ وہ ان ہی کا قبلہ ہو فقط، پس خداوند عالم نے وضاحت فرمادی کہ یہ تمام دنیا کے مشارق ومغارب کے تمام نمازیوں کا قبلہ ہے۔ ابواسحاق ثعلبی نے اپنی کتاب میں ابن عباس سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا: البیت کل کا کل قبلہ ہے اور البیت کا قبلہ الباب ہے، البیت اہل مسجد کا قبلہ ہے اور مسجد اہل حرم کا قبلہ ہے اور حرم تمام اہل زمین کا قبلہ ہے اور یہ ہمارے اصحاب کے قول کے مطابق ہے کہ کائنات میں سے جو بھی حرم سے دور رہتا ہے حرم اس کے لئے قبلہ ہے۔

ارشاد الٰہی: وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ، اس سے علمائے یہود مراد ہیں۔ کہا گیا ہے کہ علمائے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔

لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ، جانتے ہیں کہ کعبہ کی طرف تحویل قبلہ حق ہے، جس کا حکم پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہے اور یہ بات انبیاء کی بشارت کے ذریعہ جانتے ہیں جو انھیں دی گئی تھی کہ ان صفات کا حامل نبی ہوگا اور اس کی یہ صفت ہوگی کہ وہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھے گا۔

روایت کی گئی ہے کہ تحویل قبلہ کے موقع پر ان لوگوں نے کہا: اے محمدؐ آپ کو اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اسے آپ نے اپنی طرف سے گھڑا ہے۔ ایک مرتبہ ادھر اور ایک مرتبہ اُدھر اپنا رخ کرتے ہیں! پس خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرما کر وضاحت فرمادی کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کے خلاف جانتے ہیں۔

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ، یعنی یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت کو چھپا رہے ہیں اور آپ سے دشمنی کررہے ہیں، اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ جو اس چیز پر دلالت کررہا ہے کہ آیت سے معدود

محدود قوم مراد ہے۔ ان کے لیے کذب پر اتفاق ممکن ہے اور یہ کہ وہ جس چیز کو چھپا رہے ہیں اس کے خلاف اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن بڑی جمعیت کے لیے جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہے، نہ ہی تمام جس چیز سے واقف ہے اس کے خلاف اظہار کر سکتے ہیں۔

یہ آیت بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کے واجب ہونے کے لیے ناسخ ہے۔ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ قرآن سے سب سے پہلا حکم جو منسوخ ہوا اور ہمارے لیے بیان کیا گیا ہے وہ قبلہ سے متعلق ہے۔ قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت اپنے ماقبل سے منسوخ ہوگئی تھی۔ جعفر بن مبشر نے بیان کیا: یہ وہ سنت ہے جسے قرآن نے منسوخ کیا ہے۔ یہ قوی ترین (دلیل) ہے اس لیے کہ قرآن میں کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو بیت المقدس کی جانب رخ کرنے کی پابندی پر دلالت کرے جو کہ اس ارشاد سے منسوخ ہوئی ہو: فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ یہ آیت ہمارے نزدیک حالت سفر میں نوافل سے مخصوص ہے۔ اس کی روایت امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے کی گئی ہے۔ یہ منسوخ نہیں ہوئی۔ لوگوں نے پیغمبرؐ کے بیت المقدس کی سمت نماز پڑھنے میں اختلاف کیا ہے کہ ایک جماعت نے کہا ہے: مکہ میں آپ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جس وقت آپؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو خداوند عالم نے آپ کو بیت المقدس کی سمت نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ پھر آپؐ نے کعبہ کی طرف واپسی فرمائی۔

ایک گروہ نے کہا ہے: مکہ میں آپؐ بیت المقدس کی سمت نماز پڑھتے تھے مگر یہ کہ کعبہ کو اپنے اور بیت المقدس کے درمیان قرار دیتے تھے۔ اس جگہ کے علاوہ نماز نہیں پڑھتے تھے جہاں اس طرح ممکن ہوتا تھا، بلکہ آپؐ مکہ میں نماز پڑھتے اور مدینہ آنے کے بعد بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور آپ کعبہ کو اپنے اور بیت المقدس کے درمیان قرار نہیں دیتے تھے۔ پھر خداوند عالم نے کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔

❁❁❁❁❁

وَلَئِنۡ اَتَيۡتَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ ۚ وَمَا بَعۡضُهُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَةَ بَعۡضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۴۵﴾

آپ ان اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی بھی نشانی لے کرآ جائیں ممکن نہیں کہ یہ آپ کے قبلہ کی پیروی کرنے لگیں۔ اور نہ ہی آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کریں اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور اگر آپ نے اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے ان کی خواہشات کا اتباع کیا تو یقیناً آپ نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے۔

ترکیب:

اس سلسلہ میں علمائے نحو کے درمیان اختلاف ہے کہ لَئِنۡ کا جواب لَوۡ کے جواب کے ذریعہ دیا جاتا ہے؟ اخفش نے کہا: لَئِنۡ کا جواب لَوۡ کے جواب کے ذریعہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ لَئِنۡ کے بعد فعل ماضی آتا ہے جس طرح لَوۡ کے بعد ماضی آتا ہے پس لَئِنۡ اور لَو دونوں فعل ماضی پر داخل ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَئِنۡ اَرۡسَلۡنَا رِيۡحًا فَرَاَوۡهُ مُصۡفَرًّا لَّظَلُّوۡا - یہاں پر لَئِنۡ، لَوۡ کی جگہ آیا ہے۔

ارشاد فرمایا: وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا ---پھر فرمایا لَمَثُوۡبَةٌ یہاں پر لَوۡ لَئِنۡ کے مانند آیا ہے۔

سیبویہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا ہے: لَظَلُّوۡا کے معنی لَيَظَلَّنَّ کے ہیں پس لَئِنۡ کے معنی وہ نہیں ہے جو لَوۡ کے ہیں دونوں کے اپنے الگ الگ معنیٰ ہیں لَوۡ کے حقیقی معنیٰ یہ ہیں کہ لَوۡ کے ذریعہ ایک چیز کسی دوسری چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے ممتنع ہوتی ہے اور وجود میں نہیں آتی ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: لَوۡ اَتَيۡتَنِيۡ لَاَكۡرَمۡتُكَ، اگر آپ میرے پاس آتے تو میں آپ کی عزت کرتا۔ عزت واکرام وجود میں نہیں آیا ہے اس لئے کہ وہ آیا ہی نہیں ہے اور اِنۡ کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے وقوع اور وجود میں آنے کی وجہ سے پہلی چیز بھی وجود میں آتی ہے۔ آپ کہتے ہیں: اِنۡ تَأۡتِنِيۡ اُكۡرِمۡكَ (اگر آپ میرے پاس آئے تو میں آپ کا اکرام کروں گا) پس یہاں پر آنے پر اکرام ہوگا۔ لَوۡ ماضی کے لئے ہے اور لَئِنۡ مستقبل کے لئے ہے۔

مذکورہ بالا سوال کے جواب میں حق بات یہ ہے کہ تداخل ہو گیا ہے اس لئے کہ لام قسم کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ پس جواب قسم نے آ کر جواب شرط سے بے نیاز کر دیا ہے اس لئے کہ جواب قسم جواب شرط پر دلالت کر رہا ہے۔ اسی طرح یہ ارشاد بھی ہے: اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

یہ در حقیقت جواب شرط نہیں ہے بلکہ جواب قسم ہے۔ شرط کا جواب فعل یا فاء یا اِذًا کے ذریعہ دیا جاتا ہے جیسا کہ اس کے مقامات پر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر:

وہ کبھی بھی راضی نہ ہوں گے!

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ ، (آپ ان اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی بھی نشانی لے کر آجائیں) اس فقرہ میں قسم کے معنی ہیں یعنی خدا کی قسم اگر آپ پیش کر دیں، جنہیں کتاب دی گئی ہے یعنی یہود و نصاریٰ کے علما میں اہل عناد کو۔ یہ زجاج اور بلخی کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ تمام اہل کتاب مراد ہیں۔ یہ حسن اور ابو علی کا قول ہے۔ بِكُلِّ اٰيَةٍ یعنی کوئی بھی حجت اور دلیل۔ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ (یہ آپ کے قبلے کا اتباع نہیں کریں گے) یعنی آپ کے قبلے کے اتباع پر جمع نہیں ہوں گے۔ یہ دوسرے قول کی بنا پر ہے اور پہلے قول کی بنا پر ان میں کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا۔ اس لیے کہ دشمن کے لیے دلالت مفید نہیں ہوتی۔ البتہ وہ جاہل جو نہیں جانتا اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ، اس کے معنی میں چار اقوال ہیں:

اوّل۔ نسخ کی تجویز کو برطرف کیا گیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ یہ قبلہ منسوخ نہیں ہو گا۔

دوم: تقابل کے اعتبار سے ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ. جس طرح کہا جاتا ہے نہ تو وہ لوگ حق کا انکار ترک کرنے والے ہیں اور نہ ہی تم اس کے اعتراف کو ترک کرنے والے ہو۔ اس طرح دوسرے کلام کا جاری کرنا پہلے کلام کے مقابل ہے۔

سوم: ان کے نقطۂ نظر کے اختلاف کے پیش نظر ان کے قبلہ کی اتباع کر کے آپ کے لیے ان کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ نصاریٰ مشرق کی جانب عیسیٰؑ کی جائے ولادت کی طرف رخ کرتے ہیں۔ یہودی بیت المقدس کی جانب رخ کرتے ہیں۔ خداوند عالم نے وضاحت فرما دی کہ فریقین کا راضی کرنا محال ہے۔

چہارم: یہودی اہل کتاب کی طمع وخواہشات کا جڑ سے خاتمہ کرنا ہے۔اس لیے انھیں اس معاملہ میں طمع ولالچ دامن گیر تھی، ان کا گمان تھا کہ (پیغمبرؐ) نماز میں بیت المقدس کی طرف رجوع کریں گے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ، اس کے معنی میں دو قول ہیں:

اول: تمام نصاریٰ یہودی نہیں بن جائیں گے، نہ ہی تمام یہودی نصاریٰ ہو جائیں گے۔ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔جس طرح تمام لوگ اسلام کے پیروکار نہیں ہو جائیں گے، یہ غیب کی خبریں ہیں جسے حسن اور سُدی نے بیان کیا ہے۔

دوم: اہل کتاب کی ان چیزوں میں مخالفت جائز نہیں جنھیں انھوں نے پیغمبران خدا سے ورثہ میں پائی ہیں اور بیت المقدس ہمیشہ سے انبیاء کا قبلہ رہ چکا ہے۔پس اس کا قبلہ ہونا اولیٰ و بہتر ہے۔یعنی جس طرح ان کی اصلاح کے لیے ان کے نقطۂ نظر کی مخالفت جائز ہے پس دوسرے زمانہ میں ان کے تیسرے نظریہ سے مخالفت جائز ہے اصلاح کی غرض سے۔اسی طرح امکان ہے ظاہر میں کلام اس پر جاری ہو کہ ثابت نہیں ہے یہودیت نصرانیت اختیار کرے اور نہ ہی نصرانیت یہودیت اختیار کریگی۔ظاہر سے تاویل کی طرف جانے کی ہماری ضرورت نہیں ہے یہ قاضی کا قول ہے۔

ارشاد باری ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ، خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔اس میں چار اقوال ہیں:

اوّل: اس سے حضورؐ کی امت کے دیگر افراد مراد ہیں، اگرچہ خطاب آپ سے ہے۔اس سے مراد ہے دلالت یہ ہے کہ وعید کے مستحق وہ ہیں جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے پیروکاروں کو مسترد کر دیا گیا ہے۔یہ حسن اور زجاج کا قول ہے۔

دوم: اگر آپ ان کی خواہشات کی پیروی کریں گے ان کی مدارات میں اس طمع میں کہ وہ ایمان لے آئیں تو ایسی صورت میں آپ خود اپنے اوپر ظلم ڈھائیں گے اس لیے کہ ہم آپ کو آگاہ کر چکے ہیں کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔یہ جبائی کا قول ہے۔

سوم: رہنمائی کی جارہی ہے کہ ان کے نظریات فاسد ہیں اور اس پر ان کی سرزنش کی جائے اور یہ کہ جو اس کی پیروی کرے گا وہ ظالم ہوگا۔

چہارم: یہ بر سبیل زجر ہے یعنی روکنا دھتکارنا کہ ان کی جانب مائل نہ ہو اور ان سے قربت ہو انھیں

تقویت دینے اور ان کی شریعت کا اتباع کر کے تا کہ وہ اپنی عداوت پر ڈٹے رہیں، یہ قاضی سے مروی ہے۔

مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ یعنی آیات اور وحی آنے کے بعد جو کہ علم کا ذریعہ ہیں اور کہا گیا ہے: آپ کے جاننے کے بعد کہ حق وہی ہے جس پر آپ قائم ہیں۔ (یعنی قبلہ اور دین) اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۘ اس کے معنی گذر چکے ہیں۔ یہ اس کے اس ارشاد کے مانند ہے: لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ (سورۂ زمر، آیت ۶۵) اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کا عمل ضائع ہو جائے گا۔

اس آیت میں اس شخص کے قول کے باطل ہونے کی جانب رہنمائی ہے جو یہ کہتا ہے کہ وعید شرط کے ساتھ صحیح نہیں ہے اور جس کے ایمان لانے کے متعلق خدا جانتا ہے وہ عذاب کا بالکل مستحق نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ خداوند عالم نے وعید کو شرط کے ساتھ معلق فرمایا ہے۔ جب بھی شرط پوری ہو جائے گی عذاب کا استحقاق حاصل ہو جائے گا۔ اس میں اس کے قول کے فاسد ہونے کی دلالت ہے جس کا خیال ہے کہ مقدور میں لطف ہے۔ اگر خداوند عالم (لطف) کو کافر کے ساتھ انجام دے تو وہ یقینی طور پر محفوظ ہو جائے گا۔

ارشاد الٰہی: اَنۡ اَتَيۡتَهُمۡ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَكَ ، اس کے قول کے مطابق جس کا کہنا ہے اس سے معاند (دشمن) مراد ہے جسے آیات ذرا بھی فائدہ نہیں بخشیں گی اور اس کے قول کے مطابق جس نے کہا ہے اس سے تمام کفار مراد ہیں ان کے لیے بھی اس طرح لطف نہیں ہے جو اس کے پاس ایمان لے آئیں۔ دونوں صورتوں میں ان کا قول باطل ہے۔ اسی طرح اس میں یہ بھی دلالت ہے کہ تمام کفار ایمان نہیں لائیں گے۔

❀❀❀❀❀❀

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ نبی کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جس طرح یہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے ہوئے حق کو چھپا رہا ہے۔

تفسیر:

وہ نبی کو اچھی طرح پہچانتے ہیں

خداوند عالم نے خبر دی ہے کہ یہ لوگ پیغمبرؐ اور آپ کی نبوت کی صحیح ہونے کو پہچانتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ، یعنی ہم نے انھیں عطا کیا، الۡکِتٰبَ، (کتاب کو) وہ ان کے علماء ہیں۔ یَعۡرِفُوۡنَهٗ، کہ یہ لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانتے اور ان کی نبوت کے درست ہونے کو جانتے ہیں۔ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ، (جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) کہا گیا ہے: یَعۡرِفُوۡنَهٗ، کی ضمیر علم کی طرف پلٹ رہی ہے۔ اس کے قول مِنَ الۡعِلۡمِ سے یعنی نبوت۔

بیان کیا گیا ہے کہ ضمیر امر قبلہ کی جانب پلٹ رہی ہے یعنی پہنچانتے ہیں کہ امر قبلہ حق ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ کس طرح کہا گیا ہے کہ وہ لوگ (پیغمبرؐ) کو اپنی اولاد کے مانند پہنچانتے ہیں؟ جبکہ وہ اپنی اولاد کو حکم کی جہت سے پہچانتے ہیں اور پیغمبرؐ کے امر کو حقیقت کے عنوان سے پہچانتے ہیں۔ (جواب میں) کہا گیا ہے کہ معرفہ کی معرفہ سے تشبیہ دی گئی ہے، طریق معرفت کی طریقِ معرفت سے تشبیہ نہیں دی گئی ہے۔ دونوں معرفوں میں سے ایک دوسرے کے مانند ہے، اگرچہ دونوں طریقوں میں اختلاف ہے۔

وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَـقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ‏، (اور ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے ہوئے حق کو چھپا رہا ہے) ان میں سے (ایک) فریق کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے اس لیے کہ اہل کتاب سے عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار وغیرہ جیسے افراد نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

❁❁❁❁❁

اَلۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾
یہ حق تمھارے رب کی جانب سے ہے لہٰذا اس کے متعلق تم کسی شک وشبہ میں مبتلا نہ ہونا۔

الفاظ ومعانی:

اِمۡتِرَاء کے معنی شک کرنے کے ہیں: صاحب العین نے کہا ہے کہ المری کا مفہوم دودھ اتارنے کے لئے تھنوں پر ہاتھ پھیرنا۔

مِرۡيَة کے معنی شک کرنے کے ہیں اور اسی سے امتراء، تماری، ممارات ہے۔ مراء کے معنی جدال اور لڑائی ہیں۔

ترکیب:

اَلْحَقُّ مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اس کی تقدیر اس طرح ہے: ذٰلِكَ الْحَقُّ یاهُوَ الْحَقُّ اسی کے مثل مَرَرْتُ بِرَجُلٍ کَرِیْمٍ زَیْدٌ یعنی هُوَ زَیْدٌ. ہے

اگر اَلْحَقّ کو نصب دیا جاتا تو یہ بھی عربی زبان میں جائز و صحیح ہوتا اس وقت اصل میں اس طرح ہوگا:

اِعْلَمِ الْحَقَّ مِنْ رَّبِّكَ یا اِقْرَأْ الْحَقَّ۔

لَا تَكُوْنَنَّ میں نون، نون تاکید ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ امر و نہی کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ خبر کی تاکید نہیں لائی جاتی ہے اس لئے کہ مخبر بہ کے ہونے پر دلالت کرتی ہے حالانکہ امر و نہی اور استفہام ایسا نہیں ہے لہٰذا لازم ہے کہ خبر کی تاکید قسم اور جواب قسم کے ذریعہ لائی جائے اور یہ چیزیں (امر و نہی و استفہام) نون تاکید سے مخصوص ہیں تاکہ مؤکد میں معنیٰ کے اختلاف پر دلالت کریں اور چونکہ خبر جملوں کا اصلی جزء ہے لہٰذا اس کی تاکید سب سے بلیغ تاکید یعنی قسم کے ذریعہ لائی جاتی ہے۔

تفسیر:

حق پروردگار کی جانب سے ہے

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ: یہ حق تمہارے رب کی جانب سے ہے۔ یہ وہ ہے جسے اللہ نے دیا ہے وحی و کتاب اور شریعتوں کی صورت میں۔

لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ لہٰذا تم اس کے متعلق کسی شک وشبہے میں مبتلا نہ ہونا۔ یعنی حق کے بارے میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے بارے میں پہلے مطلع کر دیا تھا اور اس کے عناد و دشمنی کے بارے میں بتلا دیا تھا جنھوں نے نبوت کو چھپایا اور جس بات پر حجت و دلیل قائم ہو چکی تھی اس پر اجتماع سے روکا۔

اور کہا گیا ہے: اس چیز کے بارے میں شک کرتے ہیں جس کا علم آپ کے لئے لازم ہے۔ یہ زیادہ اولیٰ ہے اس لئے کہ یہ زیادہ عام ہے۔ اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لیکن اس سے مراد امت ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قول ہے: یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ، (سورہ طلاق، آیت ۱) اے نبی! جب آپ عورتوں کو طلاق دیں۔ اور اسی جیسی دیگر آیتیں۔

اور کہا گیا ہے کہ اس آیت میں خطاب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اس لئے کہ ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ حکم خدا کے پابند ہیں اس لئے کہ اگر امر نہ ہوتا تو پھر اس کا لازم ہونا درست اور صحیح نہ ہوتا۔

اس آیت میں رہنمائی ہے ثبوت قدرت کے جواز پر معلوم کے خلاف جو مجبرہ کے قول کے مخالف ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی رخ ہوتا ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ جہاں بھی تم ہو گے، اللہ تم سب کو لے آئے گا بلا شبہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

قرائت:

ابن عامر نے اور ابو بکر نے عاصم سے هُوَ مُوَلَّاهَا کی قرأت کی ہے۔ ابن عباس اور امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی یہی مروی ہے۔ بقیہ قراء نے مُوَلِّيْهَا قرأت کی ہے۔

حجت:

جن قراء نے مُوَلِّيْهَا پڑھا ہے تو ان کی نظر میں ضمیر هُوَ اللہ تعالی کے لئے ہے یعنی اَللّٰهُ مُوَلِّيْهَا - اِيَّاهُ مفعول دوم کو حذف کر دیا ہے اس لئے کہ اس کا ذکر اسم ظاہر کی صورت میں آیا ہے اور وہ لفظ كُلٌّ ہے وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ: میں هُوَ مبتدا ہے اور مُوَلِّيْهَا اس کی خبر ہے اور پورا جملہ هُوَ مُوَلِّيْهَا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وِجْهَةٌ کی صفت ہے۔

اور جن حضرات نے هُوَ مُوَلَّاهَا پڑھا ہے تو ان کے نزدیک هُوَ کی ضمیر كُلٌّ کی جانب پلٹ رہی ہے اور اس کا ذکر ہوا ہے اور وہ اسم جو فعل مجہول کی جگہ آیا ہے یعنی اسم مفعول کے طور پر آیا ہے اس نے اپنے دونوں مفعول کو لے لیا ہے جنہیں اس کی ضرورت تھی ایک مُوَلًّى میں ضمیر مرفوع ہے اور دوسری ضمیر مونث هَا ہے۔

ممکن ہے کہ هُوَ مُوَلِّيْهَا میں هُوَ کی ضمیر کل کی جانب پلٹ رہی ہو یعنی لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا

وَجۡهَةٌ۔ یعنی ہر چہرہ والے وہ لوگ ہیں جو اپنے چہروں کو اس جہت اور سمت موڑتے ہیں۔

الفاظ ومعانی

عربی دانوں میں لفظ وِجۡهَة کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ مصدر ہے۔

وِجۡهَة اسم ہے مُتَوَّجَة کا اور جِهَة مصدر ہے۔

اِسۡتِبَاق، اِبۡتِدَار اور اِسۡرَاع ہم معنی ہیں۔

تفسیر

ہر امت کا ایک قبلہ ہے

یہ بھی امر قبلہ کا بیان ہے اور اللہ کے ارشاد وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ کے بارے میں چند اقوال ہیں:

اوّل: یہود و نصاریٰ میں سے ہر اہل ملت کا قبلہ ہے۔ یہ مجاہد اور بیشتر مفسرین کا قول ہے۔

دوم: ہر نبی اور صاحب ملت کے لیے وِجۡهَة (سمت رخ) یعنی طریقہ ہے جو اسلام ہے۔ اگر چہ احکام مختلف ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا (سورۂ مائدہ، آیت ۴۸: ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راستہ متعین کیا ہے) یعنی شرائع الانبیاء۔ یہ حسن کا قول ہے۔

سوم: ہر مسلمان اور اہل کتاب کے لیے قبلہ ہے یعنی ان کی نماز بیت المقدس کی جانب اور ان کی نماز کعبہ کی طرف ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔

چہارم: مسلمانوں کی ہر قوم (وگروہ) کے لیے سمت اور رخ ہے ان میں سے پشت کعبہ کی طرف ہو یا اس کے آگے ہو یا اس کے دائیں جانب یا بائیں جانب ہو۔ اسے جبائی نے اختیار کیا ہے۔

هُوَ مُوَلِّيهَا۔ یعنی خداوند عالم اس کی جانب انھیں موڑنے والا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم نے انھیں نماز میں اس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا ہے جس پر اس کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر رخ کرنے والے کے لیے (چہرہ) رخ ہے یا اس کا نفس ہے

مگر یہ کہ نفس اور وجہ کا ذکر کرنے سے مستغنی ہو گیا، اگر جمع مراد ہوتا ہے لفظ یہاں پر واحد لایا گیا ہے (یعنی لفظ ایک ہے جو معنی کا جامع ہے) اس کے لفظ پر بنا قرار دی ہے۔ اسی وجہ سے 'ھُوَ' کہا ہے وہ اسی سے کنایہ ہے، اگر چہ اس سے مراد جمع ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں کا ہر گروہ اور جماعت اپنے چہروں کا رخ کرتے ہیں اور راس کا رخ کرتے ہیں۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ، خیرات (نیکیوں) کی طرف سبقت کرو۔ یہ ربیع کا قول ہے۔ خیرات، اللہ کی طاعات ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں: اللہ سے قبول کرنے کے لیے جلدی کرو جن چیزوں کا اس نے تمھیں حکم دیا ہے۔ مبادرہ (یعنی) جو اس کی جانب بڑھنے میں جلدی کرے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں خیر جس میں تمھیں رغبت ہے اس میں ایک دوسرے پر سبقت میں مقابلہ کرو، ہر ایک کے لیے میرے پاس ثواب ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔

ارشاد الٰہی: اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ، (جہاں بھی تم ہو گے اللہ تم سب کو لے آئے گا) یعنی اللہ کے شہروں (آبادیوں) میں تم جہاں کہیں بھی مرو گے اللہ تمھیں روز قیامت محشر میں لے آئے گا۔

اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں مروی ہے کہ آخر زمانہ میں امام مہدی علیہ السلام کے اصحاب مراد ہیں۔ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا: وَاللّٰهِ لَوْ قَامَ قَائِمُنَا يَجْمَعُ اللّٰهُ اِلَيْهِ جَمِيْعَ شِيْعَتِنَا مِنْ جَمِيْعِ الْبُلْدَانِ، (خدا کی قسم جب ہمارے قائم (المہدی) کا ظہور ہو گا تو خداوند عالم (دنیا کے) تمام شہروں سے ہمارے تمام شیعوں کو ان کے پاس جمع کر دے گا)

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، (بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) یعنی تمھیں اکٹھا کرنے، محشور کرنے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

تمھارا گذر جس مقام سے بھی ہو وہاں سے (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرلیا کرو۔ کیوں کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

تفسیر:

مسجد الحرام کی جانب رخ کرو

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ شہروں سے تمھارا گذر جس مقام سے بھی ہو، فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، تم اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف کرلیا کرو۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس حکم کی تکرار میں چند وجہیں ہیں:

اوّل: جب ماقبل کا منسوخ کرنا فرض تھا یہ تاکید وتشریح کے مواضع اور مقامات میں سے ہے تاکہ خلق کو پہلی حالت سے دوسری حالت تک پلٹایا جائے یقین کے ساتھ۔

دوم: بعد والے سے مقدم ہے اور اس سے متصل ہے۔ پس اسی اسم سے مشابہ ہے جس کی تکرار کی گئی ہے تاکہ اس کے ذریعہ بیشتر اخبار سے خبر دی جائے۔ جس طرح کہا جائے: زَيْدٌ كَرِيْمٌ (زید کریم ہے) زَيْدٌ عَالِمٌ (زید عالم ہے) زَيْدٌ فَاضِلٌ (زید فاضل ہے) اسی کے مانند جسے فائدہ کی غرض سے بیان کیا جاتا ہے۔

سوم: پہلے میں حضر کی حالت کا بیان ہے اور دوسرے میں حالت سفر کا بیان ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، اس کے معنی ہیں کعبہ کی طرف رخ کرنا حق ہے، جس کا تمھارے پروردگار نے حکم دیا ہے۔ امکان ہے کہ حق سے مراد ایسا حق ہو جو نسخ سے ختم نہیں ہوتا، جس طرح خداوند عالم کی صفت قدیم سے بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایسا حق ہے جو لازوال ہے۔

ارشاد الٰہی کہ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اس کے معنی یہاں تہدید کے ہیں جس طرح بادشاہ اپنے غلام سے کہے مجھ پر تمھاری حالت پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی کے مانند اس کا ارشاد ہے: اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (سورۂ فجر، آیت ۱۴) (بے شک آپ کا رب تاک میں لگا ہوا ہے)

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾

اور تم جس جگہ سے بھی گذرو (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد الحرام کی جانب پھیر لو!اور تم سب جہاں کہیں بھی ہو مسجد الحرام کی طرف رخ کر کے (نماز ادا کرو) تا کہ لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حجت نہ ملے۔ہاں ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ تمھارے خلاف باتیں بنائیں گے) تمھیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے صرف میرا خوف اپنے دل میں رکھو تا کہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کردوں اور توقع ہے کہ تم ہدایت کی راہ پر گامزن رہو گے۔

ترکیب:

لِئَلَّا دراصل لِاَنْ لَا ہے ہمزہ کو یاء لکھا گیا ہے اس لئے کہ پہلے کسرہ ہے اور نافع نے اس کے ہمزہ کو آسان بنانے کے لئے ترک کر دیا ہے نون کو لام میں ادغام کر دیا گیا ہے اور لِئَلَّا میں لام منصوب ہے اور اس میں عامل فَوَلُّوا ہے۔زجاج نے کہا: اس میں عامل وہ چیز ہے جو کلام میں داخل ہوتی ہے اور وہ اس کلام عَرَّفْتُكُمْ ذٰلِكَ لِئَلَّا يَكُونَ کے معنی میں ہیں (میں نے تمہیں یہ بتادیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔) اسی طرح یہ ارشاد الٰہی کہ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِي بھی ہے۔لام (جارومجرور) فَوَلُّوا سے متعلق ہے اصل لِاَنْ اُتِمَّ ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوا میں چند اقوال ہیں:

(۱) یہ استثناء منقطع ہے جیسے یہ ارشاد الٰہی ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ؛ کہا جاتا ہے: مَا لَهٗ عَلَى الْحَقِّ اِلَّا التَّعَدِّيْ وَالظُّلْمُ (یعنی میرے اوپر اس کا کوئی حق نہیں ہے سوائے ظلم و زیادتی کے) یعنی لٰكِنَّهٗ يَتَعَدّٰى وَيَظْلِمُ البتہ وہ ظلم و زیادتی کرتا ہے۔نابغہ نے کہا:

وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ اَنَّ سُيُوْفَهُمْ ۔۔۔ بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِّنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

گویا شاعر نے اس طرح کہا ہے کہ اگر ان میں کوئی عیب ہے تو بس ایک عیب ہے اور یہ بھی کوئی عیب نہیں ہے پس ان میں کوئی عیب نہیں ہے۔اسی طرح آیت میں بھی ہے کہ اگر مومنین کے خلاف کوئی حجت ہے تو وہ ظالم سے احتجاج میں ہے اور ظالم کے پاس کوئی حجت نہیں ہے پس مومنین کے خلاف بھی کوئی حجت نہیں ہے۔

(۲) حُجَّۃ مُحاجَۃ کے معنی میں ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حِجَاجٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا فَإِنَّهُمْ يُحَاجُّونَكُمْ بِالْبَاطِلِ (تا کہ لوگ تمہارے خلاف احتجاج نہ کرنے لگیں سوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے ظلم کیا ہے تو وہ لوگ تو تم سے باطل طریقہ سے محاجہ اور احتجاج کرتے ہیں)
ایسی صورت میں یہ استثناء متصل ہے۔

(۳) ابوعبیدہ نے کہا: یہاں پر إِلَّا واؤ کے معنی میں ہے یعنی وَلَا الَّذِينَ ظَلَمُوا۔

فراء اور مبرد نے اس بات کو رد کیا ہے۔فراء نے کہا: إِلَّا واؤ کے معنی میں نہیں آتا ہے مگر یہ کہ اس سے پہلے کوئی استثناء ہو جیسا کہ شاعر نے کہا:

مَا بِالْمَدِينَةِ دَارٌ غَيْرُ وَاحِدَةٍ ... دَارِ الْخَلِيفَةِ إِلَّا دَارُ مَرْوَانَا

مدینہ میں کوئی گھر نہیں ہے ایک گھر کے علاوہ خلیفہ کا گھر اور مروان کا گھر۔

اخفش نے کہا:

وَ أَرَىٰ لَهَا دَاراً بِأَغْدِرَةِ ... السِّيدَانِ لَمْ يَدْرُسْ لَهَا رَسْم
إِلَّا رَمَاداً هَامِداً دَفَعَتْ ... عَنْهُ الرِّيَاحَ خَوَالِدٌ سُحْم

یعنی أَرَىٰ لَهَا دَاراً وَّ رَمَاداً

مبرد نے کہا: إِلَّا اصلاً واؤ کے معنی میں ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

(۴) یہاں پر ایک علیٰ پوشیدہ ہے یعنی إِلَّا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ گویا اس طرح فرمایا ہے: لِئَلَّا يَكُونَ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے خلاف دلیل و حجت قائم ہو جائے سوائے ان لوگوں کے اوپر کہ جنہوں نے ظلم کیا ان پر حجت قائم ہوگی اور وہ کفار ہیں۔یہ قطرب کا قول ہے۔ازہری نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

علی ابن عیسیٰ نے کہا: یہ دونوں قول بعید ہیں۔پس قول اول ہی مختار و منتخب ہے۔

تفسیر:

صرف اللہ سے ڈرو

پہلی آیت کے معنی میں کلام گذر چکا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کی تکرار میں چند وجہیں ہیں:

اوّل: معنی میں اختلاف ہے اگر چہ لفظ متفق ہیں۔ اول سے مراد وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ بیت المقدس کی جانب توجہ (منصرف) ہٹائی گئی ہے۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ دوم سے مراد ہے کہ تم کسی بھی شہر میں ہو اسی کی طرف توجہ اور رخ کرو کعبہ کی تمام جہات سے اور تمام علاقوں سے۔

دوم: یہ تاکید کے مقامات میں سے ہے اس وجہ سے کہ نسخ کی صورت میں جاری ہوا ہے تا کہ دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔

سوم: رہائش گاہوں اور اوقات کے اختلاف کی وجہ سے اس مفہوم کو بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ۔ (تا کہ لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حجت نہ ملے) اس میں چند وجہیں بیان کی گئی ہیں:

اول: اس کے معنی ہیں تا کہ اہل کتاب کی تم پر حجت قائم نہ ہو جائے، جب تم مسجد الحرام کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھو گے تو وہ کہیں گے یہ وہ پیغمبر نہیں جس کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ پیغمبر تو دو قبلوں کی طرف نماز پڑھتا ہے۔

دوم: کعبہ کی جانب رخ کرنے کا تمھیں جو حکم دیا گیا ہے اس سے عدول وانحراف نہ کرو، اس طرح تم پر ان کی حجت قائم ہو جائے گی اور وہ اس طرح کہیں گے: اگر تم جانتے کہ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے تو تم اس سے انحراف نہیں کرتے۔ یہ جبائی کا قول ہے۔

سوم: ابوروق نے بیان کیا ہے یہودیوں کی حجت یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ آخری زمانہ میں آنے والے پیغمبر کا قبلہ کعبہ ہوگا۔ جب انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صخرہ کی جانب نماز پڑھتے دیکھا تو اس کے ذریعہ احتجاج کیا۔ پس ان کا قبلہ کعبہ ہو گیا، تا کہ ان کے پاس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے۔

إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ۔ ہاں ان میں سے جو لوگ ظالم ہیں (وہ تمھارے خلاف باتیں بنائیں گے) مراد یہ ہے کہ سوائے ظالم لوگوں کے جو جان بوجھ کر چھپا رہے جس کا ان کو علم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ

کی طرف رخ کریں گے۔

ظالموں کے علاوہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اس چیز کو چھپاتے ہیں جسے وہ جانتے ہیں کہ آپ کا رخ کعبہ کی جانب ہو جائے گا۔ اس طرح استثناء متصل ہوگا۔ لیکن علماء نے وجہ استثناء میں اختلاف کیا ہے اس لیے کہ ظالم کے پاس حجت و دلیل نہیں ہوتی۔ لیکن وہ ایسی چیز پیش کرتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حجت ہوتی ہے۔ اگرچہ باطل ہو، جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے: حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ (سورۂ شوریٰ، آیت ۱۶) (ان کے رب کے نزدیک ان کی دلیل باطل ہے)

بیان کیا گیا ہے کہ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ یعنی ظالموں سے قریش و یہود مراد ہیں۔ اس لیے کہ قریش کہتے تھے: انھیں معلوم ہے کہ ہم ہدایت پر ہیں وہ ہمارے قبلہ کی طرف پلٹ آئے عنقریب ہمارے دین کی طرف پلٹیں گے اور یہودی کہتے تھے: (محمدؐ) علم کے سبب ہمارے قبلہ سے روگردان نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی رائے کے مطابق کیا ہے اور اس کا گمان کرلیا ہے کہ انھیں حکم دیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے: الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا سے عمومی افراد مراد ہیں یعنی انھوں نے تم پر ظلم ڈھایا ہے۔ قتال اور جدال کے ذریعے اور کم سماعتی کے سبب۔

ارشاد باری: فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ، تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صرف میرا خوف اپنے دل میں رکھو۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ظلم و دشمنی اور پاکیزہ نفوس مومنین کی ضرورت کا ذکر کیا تو فرمایا: تمھیں ان لوگوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ان کی جانب سے جو سلوک بھی ہوتا ہے تمھیں اس کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ان کا انجام بہت برا ہے ان میں سے کسی کے پاس آپ کے خلاف نہ کوئی حجت و دلیل ہے اور نہ ہی کوئی اختیار ہے۔

کہا گیا ہے کہ استقبال قبلہ میں ان سے خوف نہ کرنا (بلکہ) استقبال قبلہ کے ترک کرنے میں میرے عذاب سے ڈرنا۔ میں ان کے مکر و فریب سے تمھاری حفاظت کروں گا۔

ارشاد الٰہی: وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ، اس کے قول 'لِئَلَّا' پر عطف ہے۔ جس کی تقدیر ہے تاکہ کسی ایک کی تم پر حجت نہ ہو اور میں ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف تمھاری ہدایت کے ذریعہ تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کروں گا۔ خداوند عالم نے واضح فرما دیا ہے کہ تحویل قبلہ ان دو اغراض کے سبب انجام پایا (۱) ان کی گفتگو کے بطلان اور (۲) تکمیل نعمت کے لیے۔ ابن عباس سے روایت کی گئی ہے۔ (خداوند عالم نے) ارشاد فرمایا: میں دنیا و آخرت میں تم پر اپنی نعمت تمام کروں گا۔ دنیا میں تمھارے دشمنوں کے مقابلہ میں تمھاری نصرت

ومدد کروں گا اوران کی زمین، دیار اوران کے اموال کا تمھیں وارث بناؤ نگا اورآخرت میں میری جنت اور رحمت کے تم (وارث) ہوگے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپؑ نے فرمایا نعمتیں چھ ہیں: اسلام، قرآن، محمدؐ، پردہ پوشی، عافیت اورلوگوں کے پاس موجود چیز سے بے نیاز ہونا۔

وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم ہدایت پاسکو۔ لَعَلَّ 'اللہ کی جانب سے واجب (کے معنی میں) ہے۔ یہ حسن اورایک جماعت کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے: تاکہ اس کے ثواب کی جانب ہدایت حاصل کرسکو اور کہا گیا ہے: (ہدایت سے) تمسک اختیار کرسکو۔

❁❁❁❁❁

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾
جس طرح ہم نے تمھارے درمیان خودتم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمھیں ہماری آیتیں سناتا ہے۔ تمھارے نفوس کو پاک وپاکیزہ بناتا ہے، اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ سب کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

الفاظ ومعانی:

اِرْسَال کے معنی رسالت وپیغامبری کے ساتھ بھیجنا اور (رسالت) کی ذمہ داری عائد کرنا تاکہ مقصود تک اس پیغام کو پہنچایا جاسکے۔

تِلَاوَۃ اوراس کے حقیقی معنی اتباع کے ہیں اوراسی سے تَلَاہ ہے یعنی تَبِعَہٗ اس کے پیچھے آیا۔

تَزْكِيَة افعال حسنہ پر زیادتی، اضافہ اورمبالغہ کی نسبت ہے جس میں کسی طرح کی ملاوٹ اور کھوٹ نہ ہو، عوض اور بدلہ کے معنی میں، اس کی جانب دعوت دینے اوراس میں لطف کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے: زَكّٰى فُلَانٌ فُلَانًا جب اس کی مدح سرائی میں مبالغہ کرے اورتعریف وتوصیف سے نوازے۔ اور زَكَاۃ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایسے مال پر حمل کیا جائے جس میں زکاۃ اور (نما) بڑھنا، اضافہ ہونا، طہارت اور پاکیزگی ہو۔

حِكْمَةَ وہ علم ہے جس کے ذریعہ محکم ومضبوط اعمال انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

ترکیب:

كَمَا اَرْسَلْنَا میں مَا مصدریہ ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: كَاِرْسَالِنَا فِيْكُمْ۔

احتمال پایا جاتا ہے کہ یہ مَا کافہ ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اَ عَلَاقَةً اُمَّ الْوَلِيْدِ بَعْدَمَا　　اَفْنَانُ رَاْسِكِ كَالثَّغَامِ الْمُخْلِس

جس طرح یہ کہنا صحیح ہے: كَمَا زَيْدٌ مُحْسِنٌ اِلٰى اَسَابِه. كَمَا میں عامل ممکن ہے کہ فعل ہو جو اس سے پہلے ہے اور وہ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ ہے اس بنا پر وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ پر وقف نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ مَالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ پر وقف کیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا عامل بعد والا فعل ہو اور فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ہے۔ اس قول کی بنا پر تَهْتَدُوْنَ پر وقف کر کے كَمَا اَرْسَلْنَا سے آغاز کیا جائے گا، تَعْلَمُوْنَ پر وقف نہیں کیا جائے گا۔

پہلا قول زجاج کے دو اقوال میں سے ایک ہے اور جبائی نے اسی قول کو منتخب کیا ہے اور دوسرا قول مجاہد، حسن اور زجاج کا قول دوم ہے۔

مِنْكُمْ محلاً منصوب ہے اس لئے کہ رَسُوْلًا کی صفت ہے۔ اسی طرح يَتْلُوْا اور اس کے بعد کے فقرے بھی صفت ہیں (لہٰذا محلاً منصوب ہیں)

تفسیر:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام

ارشاد الٰہی: كَمَا اَرْسَلْنَا. میں قول اول پر تشبیہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ امر قبلہ کی نعمت رسالت کے مانند ہے، جس کے ذریعہ خداوند عالم نے اپنے بندوں پر لطف فرمایا ہے۔ جس کی مصلحت کو وہ جانتا ہے اور اس کے انجام کی خوبی سے واقف ہے۔ دوسرے قول کے مطابق معنی ہوں گے کہ تم میں سے تمہاری طرف رسول کا بھیجا جانا تمھارے لیے نعمت ہے، تمھیں اس کے ذریعہ شرف رسالت حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح میں نے تمھیں یہ نعمت عظمیٰ عطا کی ہے، پس میرا ذکر کرو، میرا شکر ادا کرو، میری عبادت کرو، میں تمھیں جزا وثواب کی

صورت میں نعمت عطا کروں گا۔تمام مفسرین کے مطابق خطاب عربوں سے ہے۔

اس کا ارشاد: رَسُوۡلًا، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مِّنۡكُمۡ تمھارے نسب سے ہیں، اس لیے کہ وہ عرب ہیں۔ان لوگوں پر نعمت کی وجہ (پیغمبر) کا عرب ہونا ہے، جن کے ذریعہ ان لوگوں کو شرف وذکر حاصل ہوا اس لیے کہ عرب اپنے غرور ونخوت اور عزت نفس کے سبب ایسے رسول کا اتباع اور پیروی نہیں کرتے جو غیر عرب ہوتا۔ان میں سے رسول کا ہونا انھیں ایمان کی دعوت دینے اور پیروی کا زیادہ حق دار وموزوں تھا۔

يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا، جو تمھیں ہماری آیتیں سناتا ہے۔اس سے قرآن مراد لیا گیا ہے۔ وَ يُزَكِّيۡكُمۡ، اور تمھارے نفوس کو پاک وپاکیزہ بناتا ہے اور تمھارے سامنے وہ کچھ پیش کرتا ہے جس کے سبب تم پاک وپاکیزہ بن جاؤ۔اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم اور اس کی خوشنودی کا اتباع۔احتمال ہے اس کے معنی یہ ہوں کہ تمھاری نسبت اس چیز کی طرف دیتا ہے کہ تم اس کی گواہی دے کر پاک ہوجاؤ گے اور اس کے ذریعہ سے لوگ تمھیں پہچانیں گے۔ وَ يُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ، (اور تمھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے) کتاب سے قرآن اور حکمت سے بھی قرآن مراد ہے، دونوں کے فائدے مختلف ہونے کے باوجود دو صفتوں کو جمع کردیا ہے۔جس طرح کہا جاتا ہے: اللہ تمام امور سے واقف ہے، ان پر قادر ہے۔کہا گیا ہے کہ کتاب سے قرآن اور حکمت سے وحی مراد ہے جو سنت ہے اس لیے کہ احکام کا علم سنت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

ارشاد الٰہی: وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ، اور تمھیں وہ سب کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے یعنی اسے جاننے کی تمھارے پاس کوئی سبیل نہ تھی مگر سماعت کے ذریعے سے۔لہٰذا خداوند عالم نے انھیں اس میں نعمت کی یاددہانی کرائی ہے اور تعلیم جس پر عقلی دلیل ہے اس میں نعمت کے تابع ہے بالخصوص جب کہ لطف کے موقع پر واقع ہو۔

❀❀❀❀❀

فَاذۡكُرُوۡنِيۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِيۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾
لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا۔میرا شکر ادا کرو اور میری نعمتوں کا انکار نہ کرو۔

الفاظ ومعانی:

ذِکر: نفس میں معنی کا حضور ہے، کبھی قلب کے ذریعہ ہوتا ہے، کبھی قول کے ذریعہ ہوتا ہے۔دونوں کے

معنی نفس کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ بیشتر استعمال میں کہا جاتا ہے کہ ذکر نسیان (فراموشی) کے بعد ہوتا ہے، یہ اس کا سبب نہیں ہوتا کہ فقط نسیان کے بعد ہی ہو۔ اس لیے کہ ہر وہ جس کے لیے قول، عقل اور فکر میں معنی حاضر ہوں وہ اس کا ذاکر (یاد کرنے والا) ہے۔ جس کی اصل کسی چیز پر تنبیہ اور آگاہی ہے۔ پس جسے تم نے یاددلایا اس چیز پر تم نے اسے متنبہ اور آگاہ کیا اور اگر خود اسے یاد کیا تو تم نے خود کو اس پر متنبہ کیا۔ ذکر شرف اور آگاہی ہے۔ ذکر اور خاطر کے درمیان فرق یہ ہے خاطر (تصور و خیال) کا قلب میں گذر ہوتا ہے، ذکر کبھی قول کے ذریعہ ہوتا ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَاشْكُرُوا لِي اس میں محذوف ہے یعنی میری نعمتوں کا شکر کرو۔ حقیقت شکر اعتراف نعمت ہے۔

ارشاد الٰہی: وَلَا تَكْفُرُونِ، میں بھی اسی طرح محذوف ہے اس لیے کہ کفر کے معنی نعمت کا چھپانا اور اس کا انکار کرنا ہے نہ کہ مُنْعِمْ 'نعمت دینے والے کا چھپانا۔ جیسا کہ (عربوں) کا قول ہے: حَمِدتُّ زيداً و ذَممتُهُ. میں نے زید کی تعریف کی اور اس کی مذمت کی۔ اس میں حذف نہیں ہے، اس لیے کہ تم نے اس کی مدح اور مذمت اس کے فعل کے سبب کی جیسا کہ آپ کے اس قول: زَيْدٌ مُتَحَرِّكٌ (یعنی زید حرکت کر رہا ہے) میں حذف نہیں ہے۔ اگرچہ وہ حرکت کے سبب متحرک ہے۔ ہر کلام اس طرح نہیں ہوتا جو غیر مذکور پر دلالت کرے۔ کیا آپ اپنے اس جملہ میں نہیں دیکھتے: زَيْدٌ ضَارِبٌ (زید مارنے والا ہے) مضروب پر دلالت کر رہا ہے۔ اس میں حذف نہیں ہے۔ کسی چیز کی تعریف اس بات کی دلالت ہے (کہ اس کا عطا کرنے والا) محسن ہے۔ کسی چیز کی مذمت اس چیز کی دلالت ہے (کہ اس کا انجام دینے والا) بُرا ہے۔ جس طرح (عربوں) کا جملہ ہے: نِعْمَ الرَّجُلُ زَيْدٌ (زید کتنا اچھا انسان ہے) بِئْسَ الرَّجُلُ عَمْرٌو، اور عمرو کس قدر برا انسان ہے۔

عرب کہتے ہیں: شَكَرْتُكَ وَ شَكَرْتُ لَكَ، میں نے تمہارے لیے شکر ادا کیا۔ شَكَرْتُكَ جو کہا ہے اس لیے تا کہ منعم کا نام نعمت کے مقام پر بیان کیا جائے۔ اس طرح فعل کسی واسطہ کے بغیر متعدی ہوا۔ شَكَرْتُ لَكَ النِّعْمَةَ (میں نے تمہارے لیے نعمت کا شکر ادا کیا) سب سے بہتر و افضل ہے اس لیے کہ یہ اصلِ کلام ہے۔

اسی کے مانند ہے: نَصَحْتُكَ (میں نے تمھیں نصیحت کی) نَصَحْتُ لَكَ (تمھارے لیے نصیحت کی)

تفسیر:

ذکر و شکر الٰہی

فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ (لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا) کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں: اطاعت کے ساتھ تم میرا ذکر کرو میں اپنی رحمت کے ساتھ تمھارا ذکر (اور تمھیں یاد) کروں گا۔ یہ روایت سعید بن جبیر سے ہے۔ اس کا بیان یہ ارشاد الٰہی ہے: وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۲) اور تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جاسکے۔ کہا گیا ہے: تم میری اطاعت کے ساتھ میرا ذکر کرو میں تمھیں اپنی مدد کے ذریعہ یاد رکھوں گا۔ یہ روایت ابن عباس سے ہے۔ اس کی وضاحت یہ ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹؛ اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی تو ہم انھیں اپنے راستے کی ہدایت کریں گے اور بے شک اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے)

کہا گیا ہے: شکر کے ذریعہ تم میرا ذکر کرو میں (نعمت کی زیادتی سے) تمہارا ذکر کروں گا۔ یہ ابن کیسان سے روایت ہے اور اس کی توضیح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ (سورۂ ابراہیم، آیت ۷) اگر تم شکر گزار بنو گے تو ہم تمھاری نعمتوں میں اضافہ کر دیں گے۔ (یعنی تم میری یاد زمین پر کرو میں قبر میں تمھیں یاد رکھوں گا)

دُعا میں اس طرح وارد ہوا ہے: بلا و مصیبت میں تم مجھے یاد کرو جب لوگ مجھے فراموش کر دیں۔ کہا گیا ہے کہ تم مجھے دنیا میں یاد رکھو میں تمھیں آخرت میں یاد رکھوں گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ نعمت اور آسائش میں تم مجھے یاد رکھو میں تمھیں شدت و مصیبت میں یاد رکھوں گا۔ جس کی شرح اس ارشاد میں ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۔ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (سورۂ صافات، آیت ۱۴۳۔ ۱۴۴؛ اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو دوبارہ زندہ کیے جانے کے دن تک وہ مچھلی کے شکم ہی میں رہتے)

روایت میں وارد ہوا ہے کہ آسائش میں تم خدا کی معرفت حاصل کرو، وہ تمھاری شدت و سختی میں تمھیں پہچانے گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ دعا کے ذریعہ مجھے یاد کرو میں قبولیت کے ذریعہ تمھیں یاد کروں گا۔ جس کا بیان اللہ کا یہ ارشاد ہے: اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (سورۂ غافر/مومن، آیت ۶۰) تم مجھ سے دعا طلب کرو میں

تمھاری دعا قبول کرلوں گا۔امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک فرشتہ صحیفہ کے ساتھ دن اور رات کے ابتدائی حصّہ میں نازل ہوتا ہے، جس میں اولاد آدمؑ کے اعمال لکھتا ہے، پس اس کے اول وآخر کو خیر سے پر کردو۔خداوند عالم اس کے درمیان (تمھارے عمل) کو بخش دے گا، انشاءاللہ۔اس لئے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ۔تم میرا ذکر کرو میں تمھارا ذکر کروں گا۔ ربیع نے اس آیت کے متعلق کہا ہے: بلاشبہ خداوند عالم اس کی یاد رکھنے والے کا ذکر کرتا ہے، اپنا شکر ادا کرنے والے کی (نعمت) میں اضافہ فرماتا ہے، کفر کرنے والے پر عذاب کرتا ہے۔

اس کا ارشاد ہے: وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ یعنی میری نعمت کا شکر ادا کرو۔اس کا اظہار کرو اور اس کا اعتراف کرو۔وَلَا تَكْفُرُوْنِ میری نعمتوں کا انکار کر کے نہ چھپاؤ۔نعمت سے مراد اس کا یہ ارشاد ہے: كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۵۱؛ جس طرح ہم نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمھیں ہماری آیتیں سناتا ہے۔تمھارے نفوس کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور تمھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ سب کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے)

❀❀❀❀❀

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد طلب کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ترکیب:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا محلا مرفوع ہے اس لئے کہ اَیُّ کی صفت ہے جس طرح يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ میں لفظ اَلنَّاسُ مرفوع اَیُّ کی صفت ہے۔اسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں اور یہ سارے علمائے نحو کا قول ہے سوائے اخفش کے اس لئے کہ انہوں نے اسے اَیّ کی صفت نہیں مانا ہے اور وہ اسے رفع دیتے ہیں مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر۔گویا اس طرح کہا گیا ہے: يَامَنْ هُمُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔البتہ یہاں پر اَیُّ کے ساتھ

محذوف کو ظاہر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اخفش نے کہا: اس قول پر جس چیز نے ابھارا ہے وہ آیٌّ کے لئے بیان کا لازم ہونا ہے اور کہا ہے کہ اس کے لئے صفت لازم نہیں ہے اسے تو صلہ کی ضرورت ہے۔

علی بن عیسیٰ نے کہا: میرے نزدیک جو بات قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ صفت لزوم میں صلہ کی جگہ پر ہے اور اس کے لزوم کی وجہ بھی بیان کر چکے ہیں اس آیت کی تفسیر میں یَا أَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ...

ابو علی نے کہا: نداء میں آیٌّ موصول نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ اگر وہ موصولہ ہوتا تو یہ چاروں جملوں میں سے ہر ایک سے متصل ہوتا صرف ایک قسم پر اکتفانہ کرتا اس لئے کہ اسمائے موصولہ میں سے کسی ایک نے بھی محل میں کوئی عمل نہیں کیا اور پھر یہ کہنا بھی جائز ہوتا کہ جو یَا أَیُّهَا رَجُلٌ اس لئے کہ وہ مبتدا کی خبر ہے جائز نہ ہوتا کہ صرف معرفہ بالف لام پر اکتفا کی جاتی اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جاتی۔ حالانکہ سارے علمائے نحویوں نے اس بات کی اجازت دینے سے منع کیا ہے۔ اس میں اخفش کے قول کے باطل ہونے پر دلیل موجود ہے نیز اگر آیٌّ موصولہ ہوتا تو صلہ میں مبتدا محذوف کا اظہار کرنے کا جواز ضرور ہوتا اور یَا أَیُّهَا هُوَ الرَّجُلُ یَا أَیَّتُهَا هِیَ الْمَرْأَةُ صحیح ہوتا۔ جبکہ اس کے جائز ہونے کے سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تفسیر:

صبر اور نماز سے مدد

ارشاد الٰہی: اسْتَعِینُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلوٰةِ کی تفسیر گذر چکی ہے۔ مومنین سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یعنی بری باتوں کی خواہشات سے نفس کو روک کر (صبر سے مدد حاصل کرو) آیت کو جن اطاعتوں سے نفرت ہوتی ہے ان پر حمل کیا گیا ہے، انھیں معنی کی جانب امیر المومنین حضرت علیؑ نے اشارہ فرمایا ہے، آپؑ نے فرمایا: اَلصَّبْرُ صَبْرَانِ صَبْرٌ عَلٰی مَا تَكْرَهُ وَصَبْرٌ عَمَّا تُحِبُّ.

صبر دو طرح کا ہوتا ہے ایک اس چیز پر صبر جسے تم ناپسند کرتے ہو اور دوسرا صبر اس چیز پر جسے تم پسند کرتے ہو۔

نماز سے استعانت (اس طرح سے ہے) اس میں ذکر خدا، خوف خدا، تلاوت قرآن جو وعدو وعید (ہدایت و نصیحت) اور بیان پر مشتمل ہے۔ یہی صفات نیکیوں کی دعوت دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں۔ اس امر میں اختلاف ہے دونوں (صبر و صلوٰۃ) کے ذریعہ استعانت (طلب امداد) کس طرح ہے؟ کہا گیا ہے کہ اس میں تمام اطاعتیں شامل ہیں۔ گویا کہا جا رہا ہے: اطاعت کی ایک قسم سے غیر اطاعت پر مدد طلب کرو۔ بیان کیا

ہے کہ راہ خدا میں جہاد کے ذریعہ مدد طلب کرو۔

ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ اس میں دو صورتیں ہیں:

اول: اس کے معنی یہ ہیں کہ مدد و نصرت کے ذریعہ (خدا) ان کے ساتھ ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ بادشاہ تمھارے ساتھ ہے تم پر جو (پریشانی اور مصیبت) آئے اس کی پرواہ نہ کرنا۔

دوم: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ (خدا) توفیق و تائید کے ذریعہ ان کے ساتھ ہے یعنی عبادات کی ادائیگی اور برائیوں سے اجتناب و گریز کرنا ان پر آسان بناتا ہے، جس کی مثال اس کا یہ ارشاد ہے: وَیَزِیۡدُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اہۡتَدَوۡا ہُدًیؕ (سورۂ مریم، آیت ۷۶) اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے) جائز و ممکن نہیں ہے مَعَ '(یعنی ساتھ) اجتماع اور جمع ہونے کے معنی میں ہو اس لیے کہ (جمع ہونا) اجسام کے صفات میں سے ہے جس سے خداوند عالم کی ذات بہت بلند ہے۔

آیت میں دلالت ہے کہ نماز میں بندے کے لیے لطف ہے چونکہ خداوند عالم نے ہمیں اس کے ذریعہ طلب امداد کا حکم فرمایا ہے، جس کی تائید اللہ کا یہ ارشاد کر رہا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ (سورۂ عنکبوت، آیت ۴۵) (بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے)

❁❁❁❁❁

وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾
اور جو لوگ اللہ کی راہ میں جام شہادت نوش کرلیں انھیں مردہ نہ کہو بلکہ حقیقت میں وہ زندہ ہیں، مگر تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔

الفاظ و معانی :

سَبِیۡل : راستہ اور سَبِیۡلُ اللّٰہ : اللہ کا راستہ۔ اللہ کی رضا و خوشنودی کا راستہ ہے۔ جہاد کو سبیل اللہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ خداوند عالم کے ثواب کا راستہ ہے اور قتل کا مفہوم زندگی کی بنیاد کو توڑ دینا ہے اور موت اس کے نزدیک جس نے کہا ہے کہ عرضی معنی ہیں زندگی کے منافی ہے۔ تعاقب کی منافات ہے اور جس کا کہنا ہے (موت) کے معنی نہیں ہیں اُس کا کہنا ہے (موت) بطلانِ حیات سے عبارت ہے۔ یہی زیادہ صحیح قول ہے۔

حیات (زندگی) میں اختلاف نہیں ہے کہ وہ معنی ہیں جو کہ عرض ہے۔ جملہ کا ایک چیز کے مانند ہونا ہے یہاں تک کہ وہ قادر، واحد (یکتا) صاحب ارادہ ہے اور زندگی کے عطا کرنے پر بجز خدا کے کوئی قادر نہیں ہے۔

شُعُور کسی چیز کا ابتدائی علم ہے مشاعر کی جہت سے جو کہ حواس ہے۔ اسی لیے اللہ کی صفت شاعرو یَشْعُرُ (یعنی شعور کرنے والا) سے نہیں بیان کی جاتی بلکہ عالم اور یَعْلَمُ (یعنی جانتا ہے) سے کی جاتی ہے۔ بیان کیا گیا ہے شعور ادراک ہے جو لطیف حس سے زیادہ دقیق ہے۔ اپنی باریکی کے سبب شَعر (بال) سے مشتق ہے۔ (اسی سے شاعر ہے اس لیے کہ (شاعر) شعری وزن کے قائم کرنے اور شعر کے حسن نظم میں فہم، ذکاوت بروئے کار لاتا ہے جسے اس کے سوا کوئی انجام نہیں دے سکتا)

ترکیب:

اَمْوَاتٌ مرفوع ہے اس لئے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اصل میں اس طرح ہے: لَا تَقُوْلُوْا هُمْ اَمْوَاتٌ؛ اَمْوَات کو نصب دینا بھی جائز ہے جس طرح قُلْتُ حُسْناً میں جائز ہے اس لئے کہ حُسْناً مصدر (مفعول مطلق) کا نائب ہے۔ البتہ یَقُوْلُوْنَ طَاعَةً میں عربی زبان کے لحاظ سے نصب دینا بھی صحیح ہے کہ ہم اصل میں اسے مانیں کہ نُطِیْعُ طَاعَةً ہے۔

بَلْ اور لٰكِنْ کے درمیان یہ فرق ہے کہ لٰكِنْ دو چیزوں میں سے ایک چیز کی نفی اور دوسرے کے اثبات کے لئے آتا ہے جیسے: مَا قَامَ زَيْدٌ لٰكِنْ عَمْرٌو جبکہ بل میں ایسا نہیں ہے اس لئے کہ اس میں پہلے سے روگردانی کر کے دوسرے کو ثابت کیا جاتا ہے اسی لئے یہ مثبت میں واقع ہوتا ہے جیسے: قَامَ زَيْدٌ بَلْ عَمْرٌو ۔

شان نزول:

ابن عباس سے روایت ہے: یہ آیت شہدائے بدر کے بارے میں نازل ہوئی اس روز چودہ مسلمان شہید کئے گئے جن میں سے چھ کا تعلق مہاجرین سے تھا اور آٹھ انصار تھے۔ (اس وقت) لوگ کہہ رہے تھے فلاں مر گیا تو خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تفسیر:

شہداء زندہ ہیں

خداوند عالم نے جہاد پر قوت میں اضافہ کے لیے صبر اور نماز کے ذریعہ (مدد حاصل کرنے کا) حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ، جہاد میں قتل ہونے والوں کو مردہ کہنے سے نہی فرمائی ہے۔

بَلْ اَحْيَآءٌ (بلکہ وہ زندہ ہیں) بیان کیا گیا ہے اس میں چند اقوال ہیں:

اول: صحیح ہے کہ شہداء درحقیقت قیامت تک زندہ ہیں۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور مجاہد کا قول ہے۔ یہی رائے ہے حسن، عمرو ابن عبید اور واصل بن عطا کی اور اسی کو اختیار کیا ہے جبائی، رمانی اور تمام مفسرین نے۔

دوم: مشرکین کہتے تھے: محمدؐ کے اصحاب کسی سبب کے بغیر جنگوں میں خود کو قتل کر رہے ہیں پھر وہ مر جائیں گے اور ضائع ہو جائیں گے، تو خداوند عالم نے انھیں آگاہ کر دیا کہ بات اس طرح نہیں ہے جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں بلکہ (شھداء) قیامت تک زندہ رہیں گے اور ثواب پاتے رہیں گے۔ یہ قول بلخی کا ہے جسے ان کے علاوہ کسی اور نے بیان نہیں کیا ہے۔

سوم: انھیں دین میں مردہ نہ کہو بلکہ وہ اطاعت وہدایت کے سبب زندہ ہیں۔ اسی کے مانند اللہ کا ارشاد ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (سورۂ انعام، آیت ۱۲۲) (کیا وہ شخص جو مردہ تھا جسے ہم نے زندگی بخشی) جس میں گمراہی کو موت اور ہدایت کو زندگی قرار دیا گیا ہے۔ یہ اصم کا قول ہے۔

چہارم: اس سے مراد ہے وہ اپنے حسن ذکر اور تعریف کے باعث زندہ ہیں۔ جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے: هَلَكَ خُزَّانُ الْاَمْوَالِ وَهُمْ اَحْيَآءٌ، وَالْعُلَمَاءُ بَاقُوْنَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ: اَعْيَانُهُمْ مَفْقُوْدَةٌ وَّآثَارُهُمْ فِي الْقُلُوْبِ مَوْجُوْدَةٌ۔

(اموال جمع کرنے والے ہلاک ہو گئے جبکہ علماء باقی ہیں جب تک زمانہ باقی رہے گا بظاہر ان کے اعیان (اجسام) ختم ہو جاتے ہیں لیکن ان کے (علمی) آثار دلوں میں باقی رہنے والے ہیں)

لائق اعتماد قول اول ہے۔ اس پر مفسرین کا اجماع ہے اس لیے کہ خطاب مومنین سے ہے اور وہ جانتے ہیں کہ شہدائے حق ہدایت پر ہیں جو روز قیامت محشور اور زندہ ہوں گے، ان کے لیے یہ کہنا جائز و مناسب نہیں

تھا- وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. مگر تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں، جب کہ مومنین کو اس بات کا شعور ہے، اس کا وہ اقرار بھی کرتے ہیں۔ اس بات کا ان معنی پر حمل کرنے سے ذکر کی تخصیص کا فائدہ باطل ہو جائے گا۔ جب وہ (شہداء) اس طرح زندہ ہیں جو انھیں حُسن تعریف کے ذریعہ حاصل ہے تو ان سے ۔ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ، کیوں کہا گیا جب کہ وہ اس کا شعور رکھتے ہیں۔ شہداء کو خصوصیت سے کہنا کہ وہ زندہ ہیں (کیا وجہ ہے) جب کہ شہدا کے علاوہ برزخ میں مومنین بھی زندہ ہوں گے۔ ان کی حالت کا ذکر کر کے بشارت کو مقدم کرنے کی وجہ ہے۔ پھر بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس سے مخصوص کیوں ہیں (اس کا سبب ہے) کہ وہ رزق پا رہے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ..... فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (سورہ آل عمران، آیت ۱۶۹۔ ۱۷۰: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس سے رزق پاتے ہیں... اللہ نے انھیں جو فضل عطا کیا ہے وہ اس پر خوش وخرم ہیں۔ اور اس بات سے مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان سے ملحق نہیں ہوئے ہیں ان کے لیے بھی کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہے) یعنی راہ خدا میں شہید ہونے والے رزق پاتے ہیں اور اللہ کے فضل سے انھیں جو عطا کیا گیا ہے اس پر خوش و فرحاں ہیں)

اگر کہا جائے کہ ہم شہداء کے اجسام زمین پر بے حس و حرکت پڑے دیکھتے ہیں جن میں زندگی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ اس کا جواب ہمارے علماء کے نظریہ کے مطابق یہ ہے کہ خداوند عالم (شہداء) کو دنیا کے اجسام کے مانند جسم عطا فرمائے گا جس میں نعمت سے استفادہ کریں گے۔ ان کا یہ جسم قبر کے جسم کے علاوہ ہوگا۔ نعمت اور عذاب کو مکلف انسان کا نفس حاصل کرتا ہے نہ کہ اس کا جسم۔

اس بات کی تائید اس روایت سے ملتی ہے جسے شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب تَهْذِيْبُ الْاَحْكَام میں نقل کی ہے جسے انھوں نے علی بن مہزیار کے واسطہ سے، انھوں نے قاسم بن محمد سے، انھوں نے حسین بن احمد سے، انھوں نے یونس بن ظبیان سے نقل کیا ہے، یونس بن ظبیان بیان کرتے ہیں: میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا، امامؑ نے فرمایا: لوگ مومنین کی ارواح کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: لوگ کہتے ہیں: سبز رنگ کے پرندے کے پوٹے میں عرش کے نیچے قندیلوں میں ہوں گی۔

امامؑ نے فرمایا: سبحان اللہ خداوند عالم کی ذات گرامی اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ مومنین کی ارواح کو سبز

پرندوں کے پوٹوں میں قرار دے۔

اے یونس! جب خدا مومن کی قبض روح فرماتا ہے اسے دنیا کی مانند جسم میں قرار دیتا ہے، وہ کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ہیں، جب ان کی خدمت میں کوئی وارد ہوتا ہے تو وہ اسے اسی شکل میں پہچانتے ہیں جیسا کہ دنیا میں پہچانتے تھے۔

اسی طرح یونس بن ظبیان کے واسطہ سے انھوں نے ابن ابی عمیر کے واسطہ سے انھوں نے حماد سے، انھوں نے ابوبصیر کے واسطہ سے روایت کی ہے ابوبصیر بیان کرتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق سے عرض کیا: مومنین کی ارواح کے بارے میں، امامؑ نے فرمایا: اپنے جسموں کی شکل میں جنت میں ہوں گی۔ اگر تم انھیں دیکھو گے تو کہو گے یہ تو فلاں ہے۔ البتہ ہمارے علما میں ان کے نظریہ کے مطابق جن کا کہنا ہے یہ انسان جو نظر آتا ہے اور روح وہ نفس ہے جس کی جاندار کے اندر آمد و شد ہوتی ہے وہ اس کے داخلی اجزاء ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ انسان کا لطیف ترین جزء ہے، قلیل ترین جو نعمت اس تک پہونچتی ہے اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اگر وہ اپنے کمال کے ساتھ نہ ہو اس لیے زندہ کے زندہ ہونے میں انسان کے اطراف اور اس کی (جسمانی) چربی کے اجزاء کا اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے کہ زندہ (روح کی) مفارقت وجدائی سے زندہ ہونے سے خارج نہیں ہوگا (یعنی جسم کی روح نکلنے کے بعد بھی انسانی زندگی کا حتمی امکان ہے) اور کبھی یہ کہا جائے گا کہ ممکن ہے جسم زمین پر پڑا ہو اور وہ (حقیقت میں) مردہ نہ ہو، اس تک لذات پہنچ رہی ہوں۔ جیسا کہ سونے والا اسے ہر طرح کی لذت حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ حس نہیں رکھتا، ان میں سے کسی چیز کا شعور بھی نہیں رکھتا، وہ نیند کی حالت میں لذت و سرور حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ خواہش کرتا ہے اس کی نیند طولانی ہو جائے اور بیدار نہ ہو اور حدیث میں وارد ہوا ہے (شہید) کے لیے اس کی حد نظر تک وسعت عطا کی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا وہ دلہن کے مانند (سکون و اطمینان) کی نیند سو جائے۔

ارشاد الٰہی: وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. یعنی وہ نہیں جانتے کہ شہداء زندہ ہیں۔ اس آیت میں ہمارے مذہب کے مطابق قبر میں سوال اور مومن کا ثواب حاصل کرنا اور گناہگاروں کے عذاب میں مبتلا ہونے کے صحیح ہونے پر دلیل ہے اور اس پر بکثرت روایات موجود ہیں۔ بلخی نے آیت کو محشر کی زندگی پر محمول کیا ہے۔ انھوں نے عذاب قبر سے انکار کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۵﴾

اور ہم یقیناً تمھیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے۔ تو (اے نبی!) آپ ایسے صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیں۔

الفاظ ومعانی:

بَلاء، کے معنی اِختِبار (آزمانا، حقیقت حال سے واقف ہونا) کے ہیں، اور یہ آزمائش خیر اور شر دونوں سے ہوتی ہے۔

خَوف نفس کا احساس اذیت کرنا جو ضرر ونقصان سے متوقع ہوتا ہے۔

جُوع (بھوک) شبع یعنی سیری کی ضد ہے جو قحط اور بھوک مرنا ہے، اس میں بھوک عام ہے، جوع کے لغوی معنی کھانے پر غالب شہوت وخواہش ہے اور شَبْع (سیری) شہوت کا زوال ہے۔ اس میں اختلاف نہیں ہے کہ شہوت قلبی معنی کا نام ہے جس پر خدا کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ جوع (بھوک) اسی سے ہے اور شبع (سیری) کے معنی ہیں ابوعلی الجبائی کے نزدیک اور فعل خدا ہے ابوھاشم کے نزدیک معنی نہیں ہیں۔ یہی قول ہے عَطش اور رَیّ کا۔

نَقص زیادہ کی ضد ہے، نقصان مصدر اور اسم دونوں ہے، نقص کے حقیقی معنی مکمل سے کم ہونے کے ہیں۔

مَال معروف ومشہور ہے۔ عربوں کے اموال ان کے چوپائے ہیں۔ رجل مال یعنی صاحب مال۔

ثَمرہ وہ افضل شے ہے جسے درخت اٹھائے ہوئے ہے۔

ترکیب:

لَنَبْلُوَنَّكُمْ میں واؤ پر زبر ہے جس طرح لَتَنصُرَنَّكُمْ کے راء پر زبر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مبنی بر فتحہ ہے اس لئے کہ جب مبنی بر حرکت کی بات ہو تو فتحہ (زبر) سب سے ہلکی حرکت ہے جس طرح نداء میں یا مبنی بر حرکت ہونے کی حقدار ہے۔

مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ جار ومجرور شَیْءٍ کی صفت ہے۔

تفسیر:

امتحان الٰہی

جب خداوند عالم نے ان چیزوں کی وضاحت فرمائی جن کے ذریعہ اپنے بندوں کو عبادات کا مکلف قرار دیا تھا۔ ان کے بعد ان مشقتوں اور زحمتوں کا بیان کیا جن کے ذریعہ ان کی آزمائش کی تھی۔ ارشاد فرمایا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ، یعنی ہم تمھاری آزمائش کریں گے۔ جس کے معنی ہیں ہم تمھارے ساتھ آزمانے والا معاملہ کریں گے تاکہ معلوم، ظاہر اور عیاں ہو جائے۔ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سے ہے۔ یہ قول عطا اور ربیع کا ہے۔ اگر کہا جائے خطاب تمام مخلوقات سے ہے تب بھی صحیح اور درست ہے۔

بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ، یعنی کچھ خوف کے ذریعہ، کچھ بھوک سے اور کچھ اموال کی کمی سے، کچھ خوف کے ذریعہ۔ 'آزمائش' کے متعلق فرمایا ہے یہ تبعیض (یعنی بعض) کے عنوان سے ہے جو کہ ہمیشہ نہیں ہوگا۔ خداوند عالم نے (مومنین) کو پہنچوایا ہے کہ وہ نصرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاصل ہونے والی زحمتوں کا خود کو عادی بنائیں جس میں ان کے لیے مصلحت پوشیدہ ہے۔ خوف کا سبب یہ ہے کہ مشرکین ان سے عداوت و دشمنی کا قصد و ارادہ رکھتے تھے، بھوک کا سبب یہ تھا کہ راہِ خدا میں جہاد کرنا ان کے لیے کسبِ معاش سے مانع تھا، اس میں انھیں انفاق کی احتیاج و ضرورت تھی۔ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں پہونچنے والا قحط اور بھوک مری مراد ہے۔ اموال کی کمی کا سبب جہاد کے ذریعہ تعمیری امور کا منقطع ہونا تھا۔ جانوں کا نقص اور کمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ جنگوں میں قتل ہونے کے سبب تھی۔

بیان کیا گیا ہے: اموال کی کمی ان کے مویشی اور جانوروں کے ہلاک ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ وَالْأَنفُسِ، موت کے ذریعہ۔ وَالثَّمَرَاتِ، بیان کیا گیا ہے کہ درختوں کا خاتمہ نباتات کی کمی اور برکتوں کا اُٹھ جانا۔

بیان کیا گیا ہے کہ اولاد مراد ہے اس لیے کہ فرزند ثمرۂ قلب اور میوۂ دل ہے، یہ اس وجہ سے کہا گیا ہے مومنین کے جہاد میں مشغول ہونے کے سبب باغات کی آبادکاری، عورتوں سے نکاح کرنے سے دور ہو جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں باغات اور اولاد کی پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے۔

مذکورہ اشیاء کے ذریعہ آزمائش کی وجہ (اللہ) کی حکمت و الطاف دقیق مصالح اور اغراض کا تقاضا ہے جسے خداوند عالم نے ان کے لیے جزا اور عوض کی شکل میں اپنے یہاں ذخیرہ کیا ہے اور عوض کو محفوظ کر رکھا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اس بارے میں لطف کی وجہ میں دو قول ہیں:

اول: جب ان مومنین کے بعد آنے والوں پر اس طرح کے امور وارد ہوں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ یہ (پریشانیاں اور مشکلات) ان کے مرتبہ میں کمی سے فقط یہی لوگ دچار نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان (مصائب اور پریشانیوں) میں وہ لوگ بھی مبتلا ہوئے ہیں جو ان سے مرتبہ میں کہیں بلند تھے جو پیغمبرؐ کے اصحاب تھے۔

دوم: کفار جب مومنین کو نصرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں زحمتیں برداشت کرنے کے باوجود حضورؐ کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھیں گے اور دیکھیں گے کہ پھر بھی ان کی قوت بصیرت میں تبدیلی واقع نہیں ہو رہی ہے تو انھیں معلوم ہوگا کہ یہ لوگ ان امور کو اس لیے انجام دے رہے ہیں انھیں اس دین کی صحت کا علم ہے اور انھیں اس کی صداقت کی بھی معرفت ہو چکی ہے۔ یہ چیز انھیں قبول اسلام اور مسلمانوں میں داخل ہونے کی دعوت دے گی۔

اس کا ارشاد: وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ، یعنی صبر کرنے والوں کو خبر دیدو کہ جنہوں نے ان زحمتوں اور مشقتوں پر صبر کیا انھیں ثواب جمیل اور بہترین عاقبت (انجام) کی خبر دے دو۔

❁❁❁❁❁

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
کہ جب بھی انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ''اِنَّا لِلّٰهِ'' ہم اللہ ہی کے لئے ہیں ''وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے صلوات اور رحمت ہے اور وہی لوگ دراصل ہدایت یافتہ ہیں۔

قرائت:

کسائی نے بعض روایات میں اِنَّآ کے نون اور لِلّٰهِ کے لام میں امالہ کیا ہے۔

حجت:

لفظ جلالہ اللہ کے ساتھ الف میں امالہ جائز ہے اس لئے کہ کثرت استعمال کے ساتھ کسرہ ہے یہاں

تک کہ ایک کلمہ کے مانند ہو گیا ہے۔ فراء نے کہا: اسم اللہ کے علاوہ دیگر اسماء کے ساتھ اِنَّا میں امالہ جائز نہیں ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: اِنَّا لزَیْدٌ۔ یہ جائز نہیں ہے اس لئے کہ حروف اور جو حروف کا جاری مجریٰ ہو اس میں قاعدہ امالہ کا صحیح نہ ہونا ہے۔ پس حَتّٰی و لٰکِنَّ وغیرہ میں امالہ صحیح نہیں ہو سکتا ہے اس لئے کہ بعض ایسے کلمات کی جگہ ہوتے ہیں کہ ان میں تصریف (گردان) نہیں ہو سکتی ہے جو اسماء و افعال میں ہوتی ہے۔

الفاظ و معانی:

مَصِیْبَۃ نفس میں داخل ہونے والی مشقت و زحمت ہے جس سے ضرر و نقصان وابستہ ہوتا ہے گویا مصیبت سے دچار ہونا ہے۔ رجوع کے معنی چیز کا اس طرف پلٹنا ہے جس پر وہ تھی۔

اِھْتِدا کے معنی ''راہ حق کو پالینا'' ہیں۔

تفسیر:

صابرین کون ہیں؟

پھر خداوند عالم نے صابرین کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ، یعنی ان کے نفس اور مال کو زحمت و اذیت پہونچی ہے وہ اسے اپنے نفس میں جاگزیں کرلیں کہ انھیں اجر عطا کیا جائے گا۔

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ، یعنی یہ بندگی کا اعتراف ہے یعنی ہم اللہ کے ادنیٰ بندے اور اسی کی ملکیت ہیں۔

وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، یہ قیامت اور دوبارہ زندہ کیے جانے کا اقرار ہے۔ یعنی ہم اس کے حکم کی طرف جانے والے ہی۔ لہٰذا امیر المومنین حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا: ہمارا اِنَّا لِلّٰهِ کہنا ہمارے اپنے نفس پر عبودیت و بندگی کا اقرار ہے، یعنی ہم اللہ کے بندے اور اس کی ملکیت ہیں اور ہمارا: وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، کہنا ہمارے اپنے نفسوں کی ہلاکت کا اقرار کرنا ہے۔

یہ جملے تعزیت کے موقع پر مصیبت کے وقت سے مخصوص ہیں، جو اس بات پر دلالت ہے کہ خداوند عالم اس مصیبت کا عوض عطا فرمائے گا۔ (اگر یہ مصیبت) مبنی بر عدل ہوگی اور اگر ظلم کے سبب ہوگی تو اس کے فاعل سے انصاف کرے گا جس کی تقدیر ہے: اِنَّا لِلّٰهِ، ہم اللہ کے امر کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی تدبیر پر راضی

ہیں۔ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ہمیں اعتماد اور بھروسہ ہے کہ ہم اس کے عدل اور اس کے امور میں حکم کی انفرادیت کی جانب جارہے ہیں۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو مصیبت کے وقت (کلمہ) استرجاع ادا کرتا ہے (اس کے حضور رجوع کا قصد کرتا ہے) خداوند عالم اس کی مصیبت کا جبران (عوض و بدل) عطا فرماتا ہے اس کا انجام بخیر فرماتا ہے اور اس کے لیے خلف صالح قرار دیتا ہے، جس سے وہ راضی ہوتا ہے۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جب کوئی کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ کلمہ استرجاع ادا کرے اور اس عہد پر قائم ہو خداوند عالم اس روز کا اجر تحریر فرماتا ہے (یعنی فرض قرار دیتا ہے) جس دن وہ مبتلائے مصیبت ہوا تھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے آباء و اجداد کے واسطہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآ آلہ وسلم سے روایت کی ہے، جس شخص میں یہ چار صفات ہوں گے خداوند عالم انھیں اہل جنت سے قرار دے گا؛ جس کی پناہ گاہ: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہو، جسے اللہ نعمت عطا کرے تو وہ کہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ، جب کسی سے گناہ سرزد ہو تو وہ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ کہے اور اگر مصیبت میں مبتلا ہو تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کہے۔

اُولٰٓئِکَ صابرین کی طرف اشارہ ہے۔ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ یعنی ان کے پروردگار کی جانب سے بہترین تعریف ہے۔ یہ دعا کے معنی میں ہے؛ اس لیے کہ وہ حمد و ثنا کا ہمیشہ سے مستحق ہے۔ اس میں لازمی ہونے کے معنی ہیں، جس طرح دعا کے ذریعہ اسے یکے بعد دیگرے پکارا جاتا ہے۔ اس میں لزوم کے معنی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے برکتیں ہیں، ابن عباس سے روایت ہے کہ ان کے پروردگار کی جانب سے مغفرت ہے۔ وَ رَحۡمَۃٌ یعنی فوری اور تاخیر سے ملنے والی نعمت ہے، پس رحمت محتاج کے لیے نعمت ہے اور ہر ایک دنیا و آخرت میں اللہ کی نعمت کا محتاج ہے۔

وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ یعنی اللہ کی جانب بازگشت میں حق تک پہونچنے والے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جنت اور ثواب تک پہونچنے والے ہیں۔

عمر بن الخطاب جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو کہتے تھے: نِعۡمَ الۡعَدۡلَانِ وَ نِعۡمَتِ الۡعَلَاوَۃ۔

(اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ عدلان ہیں اور اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ علاوہ ہے)

❀❀❀❀❀

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہذا جو بھی بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کرے اور جو بھی اپنی خواہش اور مرضی سے بھلائی کا کوئی کام انجام دے گا تو اللہ اس کے عمل کا قدردان ہے اور اسے اس کا علم ہے۔

قرائت:

عاصم کے علاوہ دیگر اہل کوفہ نے مَن يَطَّوَّعَ یاء کے ساتھ، طاء اور واؤ کو مشدد پڑھا ہے اسی طرح اس کے بعد بھی۔ زید اور رویس نے یعقوب سے پہلے والے میں اہل کوفہ کی موافقت کی ہے۔
باقی قراء نے تَطَوَّعَ پڑھا ہے کہ وہ فعل ماضی ہے۔ قرائت شواذ میں حضرت علی علیہ السلام، ابن عباسؓ، انس، سعید بن جبیر، ابی بن کعب، اور ابن مسعود نے اَلَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا پڑھا ہے۔

حجت:

ممکن ہے کہ اس قرأت کی بنا پر لَا زائدہ ہو جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتَابِ یعنی لِيَعْلَمَ یا یہ کلام کہ مِنْ غَيْرِ لَا عَصْفٍ وَلَا اضْطِرَافٍ یعنی مِنْ غَيْرِ عَصْفٍ۔
يَطَّوَّعَ دراصل يَتَطَوَّعَ تھا البتہ تاء اور طاء کو قریب قریب ہونے کی وجہ سے ادغام کردیا گیا ہو۔

الفاظ ومعانی:

صَفَا دراصل حَجَر اَمْلَس (یعنی نرم اور چکنا) پتھر ہے جو صَفْو سے مشتق ہے۔ اس کی واحد صَفَاة ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: صَفَا واحد ہے، مبرد نے کہا ہے کہ ہر وہ پتھر ہے جس میں پتھر کے علاوہ مٹی اور خاک مخلوط نہ ہو۔ یہ صَفَا يَصْفُوْ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں خالص ہونا۔

مَرْوَۃ دراصل سخت اور چکنا پتھر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے چھوٹا پتھر ہے۔ مَرْو بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے: تَمْرَۃ و تَمْر کے مانند جمع ہے (صفاومروہ) مکہ کی دومشہور پہاڑیوں کا نام قرار دیا گیا ہے۔ دونوں میں الف اور لام تعریف کا ہے نہ کہ جنس کا۔

شَعَائِر اعمال کی نشانیوں کے نام ہیں۔ شَعَائِرُ اللہ۔ اللہ کی وہ نشانیاں جنھیں اس نے عبادت کے مقامات اور مراکز قرار دیئے ہیں۔ دعا ونماز وغیر کی عبادت کی ہر نشانی اس عبادت کی طرف علامت ونشانی ہے۔ شعائر کی واحد شَعِیْرَۃ ہے۔ پس شَعَائِرُ اللہ اللہ کی عبادت گاہوں، موقف، مقام سعی اور مقام قربانی کی نشانیاں ہیں۔

حَجّ لغت میں تکرار کے ساتھ قصدوارادہ ہے اور شریعت میں احرام، طواف، سعی، دونوں مواقف یعنی مزدلفہ اور منیٰ کا قیام یا عرفات ومنیٰ کا قیام وغیرہ مراد ہے عمل مشروع کے ذریعہ بیت اللہ کا قصد کرنے سے عبارت ہے۔

ترکیب:

ارشادالٰہی مَنْ حَجَّ اور مَنْ تَطَوَّعَ میں دوباتوں کا احتمال پایا جاتا ہے:

(۱) مَنْ موصولہ، اَلَّذِیْ کی جگہ پر ہے۔

(۲) مَنْ شرط کے لئے ہے۔

اگر موصولہ ہے تو اس کے بعد واقع ہونے والے فعل کا کوئی محل اعراب نہیں ہے اور مَنْ اپنے صلہ کے ساتھ محلاً مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر ایسی صورت میں فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اور فَاِنَّ اللہَ شَاکِرٌ میں فاء مابعد کے ساتھ محلاً مرفوع ہے اس لئے مبتدا موصول کی خبر ہے۔

اور اگر مَنْ شرط کے لئے ہے تو مَنْ کے بعد فعل محلاً مجزوم ہے اور فاء اپنے مابعد کے ساتھ محلاً مجزوم ہے اس لئے کہ وہ فعل مجزوم کی جگہ پر آیا ہے جو شرط ہے اور وہ فعل حَجَّ یا تَطَوَّعَ ہے اور دونوں ماضی کی صورت میں ہیں اور مقصود مستقبل ہے جیسا آپ کے اس کلام میں بھی ہے: اِنْ اَکْرَمْتَنِیْ اَکْرَمْتُکَ۔

ارشادالٰہی: فَاِنَّ اللہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ بھی جزاء کی جگہ آسکتا ہے یا مبتدا کی خبر بن سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں ایسی ضمیر نہیں ہے جو مَنْ کی جانب پلٹے اس لئے کہ اصل اس طرح ہے: یُعَامِلُہٗ مُعَامَلَۃَ الشَّاکِرِ بِحُسْنِ الْمُجَازَاۃِ وَاِیْجَابِ الْمُکَافَاۃِ (خداوند عالم بہترین جزاء اور ثواب کو لازم قرار دے کر اس کے

ساتھ شاکر والا برتاؤ کرے گا)

مبتدا موصول کی خبر پر فاء داخل ہوا ہے اس لئے کہ اس میں جزاء کے معنیٰ ہیں۔ اگرچہ وہ مقام جزم میں نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ فاء اعلان کر رہا ہے کہ ثانی ثابت ہے اول کے ثابت ہونے کی بنا پر۔

تفسیر:

صفا و مروہ اللہ کی نشانیاں

خداوند عالم نے بندوں کو مکلف قرار دیتے ہوئے ان کا امتحان اور آزمائش کی، ایک مرتبہ انھیں مصائب کا پابند بنایا دوسری بار آلام کا، پھر خداوند عالم نے ذکر فرمایا کہ اسی امتحان میں امرحج ہے۔ ارشاد ہوا: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ. یعنی صفا و مروہ اس کی عبادت کی علامتیں اور نشانیاں ہیں۔

کہا گیا ہے: اس کی عبادت اور اطاعت کے مقامات ہیں۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: دین خدا سے ہے۔ حسن کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: اس میں حذف ہے جس کی تقدیر یوں ہے: صفا اور مروہ کے درمیان طواف اللہ کے شعائر میں سے ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ نے فرمایا: آدمؑ کوہ صفا پر نازل ہوئے اور حوا مروہ پر۔ صفا کو آدمؑ سے موسوم کیا گیا اور مروہ کو عورت کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اس کا ارشاد: فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ. (لہٰذا جو بھی بیت اللہ کا حج کرے) یعنی جو (شخص) افعال مشروعہ کا ارادہ کرے۔ اَوِ اعْتَمَرَ (یا عمرہ کرے) یعنی مشروعہ مناسک (عبادات) کے ذریعہ عمرہ بجا لائے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اس پر کوئی حرج نہیں ہے، اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کرے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں کا گمان تھا کہ صفا و مروہ کا آغاز زمانہ جاہلیت کے لوگوں نے کیا ہے، پس خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ جو فرمایا ہے "اسکے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ ان دونوں کا طواف کرے" یہ واجب ہے یا مستحب ہے اس میں اختلاف ہے، اس لیے کہ صفا پر بت تھا جسے اِساف کہتے تھے اور مروہ پر بھی بت تھا جسے نائلہ کہتے تھے۔ مشرکین جب دونوں کا طواف کرتے تو انھیں مس کرتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کو بتوں کے سبب صفا و مروہ کا طواف کرنا گراں گزرتا تھا۔ اس وقت خداوند

عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ روایت شعبی اور بیشتر علماء کی ہے۔ دونوں (صفا و مروہ) کے طواف سے حرج کے برطرف ہونے کی بازگشت مسلمانوں کے دونوں پہاڑیوں (صفا و مروہ) کے دونوں بتوں سے حرج کی جانب ہوتی ہے نہ کہ عین طواف کی جانب، جس طرح کوئی شخص ایسے مقام پر مقید ہو جہاں پر اس کے لیے نماز کا ادا کرنا ایسے مقام کے علاوہ ممکن نہ ہو جس طرف رخ کرنا مکروہ ہوتا ہے۔ پس اس شخص سے کہا جائے گا: تمھارے لیے ایسی جگہ پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح حرج کی برطرفی کی بازگشت عین نماز کی طرف نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ خود نماز واجب ہے بلکہ اس کی بازگشت اس مقام کی طرف ہوگی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک دوسری روایت نقل کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اس کا تعلق عمرۂ قضاء سے ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان مشرکین سے بتوں کے ہٹائے جانے کی شرط کی تھی۔ آپؐ کے اصحاب میں سے ایک شخص اس سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ بت پھر سے رکھ دیئے گئے۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: فلاں شخص نے طواف نہیں کیا ہے اور بت پھر سے اپنے مقام پر رکھ دیئے گئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، یعنی بت دونوں (صفا و مرہ) کی پہاڑیوں پر موجود تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ لوگ سعی کرتے تھے اور بت اپنی حالت پر تھے، جب پیغمبرؐ حج بجالائے اس وقت انھیں وہاں سے نکال پھینکا۔

ارشاد الٰہی: وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا، میں متعدد اقوال ہیں:

اول: جو شخص واجبی (طواف) کے بعد صفا و مروہ کے درمیان مستحبی سعی بجالائے۔ یہ ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔

دوم: جو شخص واجبی حج وعمرہ کے بعد مستحبی حج وعمرہ ادا کرے۔ یہ اصم کا قول ہے۔

سوم: اس کے معنی ہیں: جو شخص مستحبی خیرات اور مستحبی اطاعت بجالائے۔ یہ حسن کا قول ہے اور جس نے کہا ہے سعی واجب نہیں ہے اس نے کہا ہے کہ جو صفا و مروہ کے درمیان مستحبی سعی بجالائے۔

ارشاد الٰہی: فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ، یعنی (اللہ) ان امور پر جزا دینے والا ہے۔ اس نے شاکر لفظ کا استعمال اپنے بندوں پر لطف و مہربانی اور ان پر احسان و انعام کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے جس طرح اس نے فرمایا ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟) خداوند عالم کسی سے حاجت کے تحت قرض کا مطالبہ نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے اس لفظ کا استعمال بعنوان لطف

کیا ہے، یعنی اللہ اپنے بندوں کے ساتھ مُستقرض (قرض لینے والوں) جیسا معاملہ کر رہا ہے کہ بندہ اپنی ثروت مندی کی حالت میں خرچ کرتا ہے اور اس کی ضرورت و احتیاج کی حالت میں کئی گنا زیادہ لیتا ہے۔ اسی طرح جب اس نے اپنے بندوں کے ساتھ شاکرین جیسا معاملہ کیا اس اعتبار سے کہ اس کی تعریف وثنا و ثواب واجب ہے۔ اس طرح اس نے اپنا نام شاکر رکھا۔

اس کا ارشاد: عَلِيمٌ یعنی جو کچھ تم افعال انجام دیتے ہو ان پر تمھیں جزا عطا کرے گا۔

کہا گیا ہے کہ وہ جزا کی مقدار سے واقف ہے کسی کے حق میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کرتا۔

آیت دلالت کر رہی ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی عبادت ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ ہمارے نزدیک حج وعمرہ میں فرض ہے۔ یہی بات حسن اور عائشہ نے کہی ہے شافعی اور ان کے اصحاب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سنت نے سعی کو واجب قرار دیا ہے اور یہ ارشاد پیغمبرؐ ہے کہ تم پر سعی واجب کی گئی ہے، پس سعی بجالاؤ! لیکن آیت کا ظاہر اس کی اباحت پر دلالت کر رہا ہے جو سعی سے انھیں ناگوار ہے۔ (یا جس سے وہ کراہت کرتے ہیں) ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک مستحب ہے۔ اسی کو جبائی نے اختیار کیا ہے۔ اس کی روایت انس اور ابن عباس سے کی ہے۔ ہمارے اور شافعی کے نزدیک جس نے جان بوجھ کر سعی کو ترک کیا اس کا اصلاً حج ہی نہیں ہوا۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿۱۵۹﴾

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی واضح تعلیمات اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، جب کہ ہم انھیں انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ یقین جانو! کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔

شانِ نزول:

آیت سے یہود و نصاریٰ مثلاً کعب بن الاشرف وکعب بن اُسید ابن صوریا و زید بن تابوہ وغیرہ نصاریٰ

کے علماء مراد ہیں، جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امر اور آپؐ کی نبوت کو چھپایا جبکہ انھوں نے حضورؐ کے متعلق توریت وانجیل میں (آپ کی نبوت کو) ثابت شدہ پایا تھا۔ یہ روایت ابن عباس، مجاہد، حسن، قتادہ اور بیشتر اہل علم کی جانب سے ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ خدا کی نازل کردہ ہر چیز کے چھپانے والوں کو شامل ہے۔ اسی قول کو بلخی نے اختیار کیا ہے، یہی قول قوی ترین ہے، اس لیے کہ عام ہے جس میں یہ تمام اقوال اور ان کے علاوہ دیگر اقوال بھی داخل ہیں۔

تفسیر:

حق چھپانا حرام ہے

خداوند عالم نے اظہار حق اور بیان حق پر ابھارا ہے اور اس کے چھپانے اور پوشیدہ کرنے سے منع کیا ہے۔ ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ، جو لوگ چھپاتے ہیں۔ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ، وہ دلائل جو کتب میں نازل کی گئیں ہیں۔ وَالْهُدٰى یعنی دلائل۔ بینات سے شرعی علوم اور الہدیٰ سے عقلی ادلہ مراد ہیں۔ دونوں کو چھپانے سے خبردار کیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ بینات سے وہ حجتیں اور دلائل مراد ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوتؐ پر دلالت کرتی ہیں اور ہدایت سے وہ چیز مراد ہے جو مخلوقات کو احکام شرعی تک پہونچاتی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ بینات وہدایت ادلہ ہیں دونوں کے ایک معنی ہیں، دونوں کے لفظ کے مختلف ہونے کے سبب مکرر بیان کیا گیا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ یعنی تورات وانجیل میں پیغمبرؐ کے صفات اور احکام بیان کئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ ان کتابوں میں جنھیں اللہ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے ارشاد مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ، سے گذشتہ کتب اور الکتاب سے قرآن مراد ہے۔

اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ یعنی خدا ان پر عذاب لازمی ہونے کے سبب انھیں اپنی رحمت سے دور کر دے گا، اس لیے کہ جو لوگ عذاب کے مستحق نہیں ہیں ان پر لعنت جائز نہیں ہے۔ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ، بیان کیا گیا ہے کہ لعنت کرنے والوں سے ملائکہ اور مومنین مراد ہیں۔ یہ قتادہ اور ربیع کا قول ہے۔ یہی صحیح ہے۔

پروردگار کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ. بیان

کیا گیا ہے کہ زمین کے چوپائے اور حیوان ہیں جو کہیں گے ہمیں فرزندانِ آدم کی نافرمانیوں کی وجہ سے بارش سے محروم کردیا گیا۔ یہ مجاہد و عکرمہ کا قول ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس سے ثَقَلَيْن (جن وانس) کے علاوہ ہر شے مراد ہے۔ یہ ابن عباس سے روایت ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ جب (اس آیت) کی تلاوت دو لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے لعنت اس کے مستحق کی طرف پلٹتی ہے، اگر ان میں سے کوئی مستحق لعنت نہیں ہوتا تو یہودیوں کی جانب پلٹتی ہے جنہوں نے اللہ کے نازل کردہ (بیان و) ارشاد کو چھپایا۔ یہ قول ابن مسعود کا قول ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ کس طرح درست ہوسکتا ہے کہ جس کا کہنا ہے کہ لَاعِنِيْن (لعنت کرنے والوں) سے چوپائے مراد ہیں جبکہ یہ جمع مذکر سالم عقلاء کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہوسکتی تو جواب میں کہا گیا ہے کہ جب فعل کی نسبت اس کی جانب دی گئی ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے تو ان کے ساتھ صاحبان عقل جیسا معاملہ کیا گیا، جیسا کہ اللہ کا ارشاد گرامی ہے: وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِيْنَ، لعنت کی نسبت غیر ذوی العقول کی جانب دی گئی ہے۔ اس لیے کہ خداوند عالم ان پر لعنت کا الہام کرتا ہے جس میں گناہوں سے روکا گیا ہے، چونکہ جب لوگ اس چیز سے واقف ہوجائیں گے کہ جب وہ ان گناہوں کو انجام دیں گے تو لعنت کے مستحق ہوں گے یہاں تک کہ زمین پر چلنے والے جانور اور شیر وغیرہ بھی ان پر لعنت کریں گے تو یہ ان کے لیے شدید ترین نہی اور ممانعت ہوگی۔

کہا گیا ہے کہ ایسا آخرت میں ہوگا خدا ان کی عقل کو کامل کردے گا اس طرح وہ ان پر لعنت کریں گے۔ اس آیت میں اسی بات پر دلالت ہے کہ حق کا چھپانا جب کہ اظہار حق کی ضرورت ہو تو یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اسی طرح جو شخص علوم دین میں سے کسی چیز کو پوشیدہ کرے اور بنی اسرائیل کے مانند فعل انجام دے تو وہ اس سنگین جرم میں انھیں کے مانند ہے۔ ان کے لیے بھی اسی طرح وعید لازم ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس سے سوال کیا جائے ایسے علم کے متعلق جس سے وہ واقف تھا اور اسے چھپا لے، قیامت کے روز اسے آگ کی لگام لگائی جائے گی۔ آیت میں اسی طرح توحید وعدل کی دعوت دینے کے واجب ہونے پر دلالت ہے، اس لیے کہ کتاب خدا میں دونوں (توحید وعدل) کی تاکید پر دلالت ہے اور جس پر عقلی ادلہ موجود ہیں۔

❀❀❀❀❀

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَ أَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶۰﴾

سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور جو چھپایا تھا اسے بیان کر دیا تو میں ان کی توبہ قبول کرلوں گا اور میں توبہ قبول کرنے والا مہربان ہوں۔

الفاظ و معانی:

تَوْبَة وہ شرمندگی ہے جو کسی چیز سے باہر نکل جانے پر ہوتی ہے اور اس کے پائے جانے کی حسرت کے سبب ہوتی ہے اور یہ عزم ہوتا ہے کہ اگر اس شے کی واپسی ممکن ہو تو اس کی واپسی کو ترک کر دینا ہے۔ ایک گروہ نے اس کے مانند قبیح میں واپسی کے ترک کرنے کو معتبر جانا ہے (اعتبار کیا ہے) یہ قول اقویٰ ہے چونکہ امت کا ایسی توبہ کے لیے سقوط عذاب (عذاب کی برطرفی) پر اجماع و اتفاق ہے اس کے علاوہ میں اختلاف ہے۔ اصلاح عمل (فعل) قبیح اور اس کے اختلاط سے خالص ہونا ہے۔

تَبْيِين علم کے لیے پیش کرنا ہے جس کے ذریعہ تمیز کا صحیح ہونا ممکن ہو۔ یہ بَيْن سے مشتق ہے جو کہ قطع (یقین) کے معنیٰ میں ہے۔

ترکیب:

الَّذِينَ منصوب ہے کلام موجب (مثبت) میں استثناء کی بنا پر اور استثناء کے معنی کسی چیز کو مخصوص کرنا ہے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ جَاءَ الْقَوْمُ إِلَّا زَيْدًا (پوری قوم آئی سوائے زید کے) تو آپ زید کو مخصوص کر رہے ہیں کہ وہ نہیں آیا اور اگر آپ یہ کہتے ہیں: مَا جَاءَنِي إِلَّا زَيْدٌ تو زَيْدٌ کو آنے سے مخصوص کرتے۔

اور جب یہ کہتے کہ مَا جَاءَنِي زَيْدٌ إِلَّا رَاكِبًا (میرے پاس زید نہیں آیا مگر سوار) تو ایسی صورت میں آپ اس حالت سے مخصوص کر رہے ہیں کہ وہ سوار آیا پیدل اور دوڑتا ہوا نہیں آیا۔

تفسیر:

توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

خداوند عالم نے آیت کریمہ میں توبہ اور اصلاح کرنے والوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے اور لعنت کے تمام

مستحقین کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا، سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کی یعنی وہ اپنے پچھلے گناہوں پر شرمندہ ہیں۔ وَاَصۡلَحُوۡا، اور اپنی اصلاح کر لی۔

وَبَيَّنُوۡا اس میں اختلاف ہے؛ بیشتر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت کو چھپایا تھا۔ اس کو بیان کیا گیا ہے انھوں نے توبہ کو بیان کیا اور اس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی روش و سیرت اور طرز عمل کی اصلاح کی جو شخص گناہ پوشیدہ طور پر انجام دیتا ہے اس کے لیے پوشیدہ توبہ کافی ہے۔ جو گناہ کو کھلم کھلا انجام دیتا ہے اس کے لیے اظہار توبہ واجب ہے۔ انھوں نے اخلاص عمل کے ذریعہ توبہ کو بیان کیا۔

فَاُولٰٓـئِكَ اَتُوۡبُ عَلَيۡهِمۡ، یعنی میں (توبہ) قبول کروں گا۔ اَتُوۡبُ کے حقیقی معنیٰ یہ ہیں کہ میں توبہ کروں گا مگر یہ کہ جب حرف اضافت کے ساتھ وصل ہوا ہے تو ان معنی پر دلالت کر رہا ہے کہ میں توبہ قبول کروں گا۔ یہ لفظ (توبہ) فاعل توبہ اور قابل توبہ (توبہ کا قبول کرنے والے) کے درمیان مشترک ہے، ترغیب ہے صفتِ توبہ میں اس کے ذریعہ توبہ کے قبول کرنے والے نے صفت بیان کی ہے اور وہ اللہ ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا اس کے بندوں پر انعام ہے تاکہ گناہ کی مفارقت پر دلالت کی بنا پر توہم پیدا نہ ہو کہ اس کے ذریعہ صفت بیان کرنا عیب ہے۔ لہٰذا اسے مدح کی صفات میں اعلیٰ قرار دیا ہے۔

وَاَنَا التَّوَّابُ، یہ لفظ مبالغہ کے لیے ہے یا تو اس لیے کہ وہ توبہ کا بکثرت قبول کرنے والا ہے یا اس لیے کہ وہ توبہ اور انابت کرنے والے کو رد نہیں کرتا۔ خدا نے توّاب کے بعد اپنی صفت رحیم کو بیان فرمایا ہے، جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے توبہ کے بعد عذاب کا ختم ہونا اللہ کا فضل ہے اور اس کی جانب سے رحمت ہے جیسا کہ ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ یہ عقلی طور پر غیر واجب ہے اور جس چیز کو معتزلہ نے اختیار کیا ہے۔ اگر وہ کہیں فعل واجب نعمت ہوتا ہے جب وہ اس کے سبب نعمت میں ہو جیسا کہ ثواب اور عوض کہ وہ تکلیف (شرعی) کے سبب نعمت میں ہوتا ہے یا ان آلام کے ذریعہ جس کے سبب وہ عوض کا حق دار ہوتا ہے تو اسے نعمت کہنا جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس بارے میں ہم نے ثواب اور عوض کے بارے میں ضروری طور پر کہا ہے۔ یہاں کوئی ایسی ضرورت نہیں جو اس کے انجام دینے کے لیے دعوت دے (بلائے)۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۶۱﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿۱۶۲﴾

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور پھر حالت کفر میں ہی مر گئے تو ان پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ ہی انھیں کسی قسم کی مہلت دی جائے گی۔

الفاظ و معانی:

نَاس کی واحد انسان ہے معنی کے اعتبار سے لیکن باعتبار لفظ اس کا واحد نہیں ہے جیسے نفر و رَھط۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اسم جمع ہے۔

خُلُود کے معنی ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے ہیں۔ بَقا دونوں وقتوں میں وجود ہے پس اس سے زائد اسی سبب اللہ کے صفات میں خالد جائز نہیں ہے۔ باقی کے لیے جائز ہے، لہٰذا اس طرح کہا جاتا ہے اَخْلَدَ اِلٰی قَوْلِہٖ. یعنی اس کے معنی لازمی ہیں جو اسے دیئے گئے ہیں، اسی طرح اس کا ارشاد ہے: لٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ، یعنی زمین کی طرف مائل ہوا جو میلان اس کی طرف لازمی و ضروری تھا۔ خلود اور دوام میں فرق یہ ہے دوام کے معنی اس وجود کے ہیں جو ہمیشہ سے ہے جس کو فنا نہیں ہے اور الخلود ہمیشہ کے لیے لازمی ہونا ہے۔

تَخْفِيف مقدار میں کمی ہے جو مقدار اس کی ہے۔ العذاب دائمی تکلیف و اذیت ہے۔

اِنْظَار مہلت دینا ہے جو چھٹکارے کے لیے (مہلت) دی جاتی ہے۔ اس کے حقیقی معنیٰ آنکھ کے ذریعہ طلب کے ہیں، نظر آنکھ کے ذریعہ طلب ہے اسی طرح نظر قلب ہے یا ہاتھ کے ذریعہ حواس سے ہوتی ہے۔ عذاب اور ایلام کے درمیان فرق یہ ہے کہ ایلام کبھی ایک ہی وقت میں الم (تکلیف) کا جزء ہوتا ہے جس مقدار سے احساس تکلیف و اذیت ہو اور عذاب ایسا الم اور اذیت ہے جو مسلسل اوقات میں ہوتا رہتا ہے۔

ترکیب:

وَهُمْ كُفَّارٌ جملہ ہے حال واقع ہوا ہے۔ اَجْمَعِيْنَ تاکید ہے۔ اس کے ذریعہ تاکید کی گئی ہے تا کہ

استدلال کی تحقیق سے پہلے ہی ابہام و احتمال ختم ہو جائے۔ اسی لئے اخفش نے رَأَيْتُ أَحَدَ الرَّجُلَيْنِ كِلَيْهِمَا کو جائز قرار نہیں دیا ہے بلکہ رَأَيْتُهُمَا كِلَيْهِمَا کو جائز قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ جب آپ کوئی بات دلیل کے ساتھ بیان کریں گے تو آپ اس بات کے غلط ہونے کے ابہام کو دور کردیں گے اور اگر بغیر تاکید بیان کریں گے تو مراد میں غلطی کا ابہام باقی رہ جائے گا اور جب اپنے کلام أَحَدَ الرَّجُلَيْنِ میں تثنیہ کا ذکر کریں گے اور وہاں پر أَحَدًا کہیں گے تو آپ نے حکم اور دلیل دونوں کو بیان کردیا ہے لیکن جب رَأَيْتُهُمَا میں تثنیہ کا ذکر کریں گے تو ایسی صورت میں صرف حکم کا ذکر ہوگا۔

خٰلِدِيْنَ بر بنائے حال منصوب ہے اور اس میں عامل ظرف ہے جو کہ عَلَيْهِمْ میں ہے اس لئے کہ اس میں لعنت کے استقرار اور ثابت ہونے کی بات ہے اور ذوالحال عَلَيْهِمْ میں هُمْ ہے جیسے آپ کا یہ کہنا: عَلَيْهِمُ الْمَالُ صُغِرِيْنَ۔

فِيْهَا میں ضمیر هَا، زجاج کے قول کے مطابق اَللَّعْنَةَ کی طرف پلٹ رہی ہے اور ابوالعالیہ کے نزدیک اَلنَّار کی جانب پلٹ رہی ہے۔ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ جملہ ہے مقام حال میں ہے۔ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ بھی جملہ حالیہ ہے۔ هُمْ فعل مقدر کی ضمیر کی تاکید ہے جس کی تفسیر یہ فعل ظاہر (يُنْظَرُوْنَ) کر رہا ہے۔ اس کی تقدیر اس طرح ہے: وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ هُمْ۔

تفسیر:

جو لوگ کافر ہی مرتے ہیں

خداوند عالم نے حق کو چھپانے والوں اور ان میں سے توبہ کرنے والوں کے حالت کی وضاحت کرنے کے بعد ان میں سے توبہ کیے بغیر مرجانے والے تمام کفار کی حالت بیان کی ہے، ارشاد ہوا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ، یعنی کفر پر باقی رہتے ہوئے انھیں موت آگئی۔ اللہ نے فرمایا ہے (وہ کفر کی حالت ہی میں مر گئے) جبکہ ہر کافر اپنے کفر کی حالت میں ملعون ہوتا ہے تاکہ وعید (وعدۂ عذاب) اس کے متعلق غیر مشروط ہو، اس لیے کہ موت کے سبب توبہ کی قبولیت ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خداوند عالم نے شرط قرار دی ہے اور اس بات کی وضاحت فرمادی ہے کہ کفار حالت کفر میں نہ مرتے تو ان کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ شرط ان کے ہمیشہ لعنت میں رہنے کے سبب ہے جیسا کہ اس کا ارشاد: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ہے۔ اُولٰٓئِكَ

عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ، یعنی اس کی رحمت سے دور، اس کے عذاب میں ہوں گے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ. فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیسے کہا کہ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ (تمام انسانوں کی لعنت) اس لئے کہ لوگوں میں ایسے افراد بھی ہیں جو کافروں پر لعنت نہیں کرتے؟!

اس کے جواب کی متعدد وجہیں ہیں:

اول: لوگوں میں ہر ایک کافر پر لعنت کرتا ہے چاہے دنیا میں ہو یا آخرت میں یا دونوں میں جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (سورۂ عنکبوت، آیت ۲۵) (روز قیامت تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور تم میں سے ایک، دوسرے پر لعنت کرے گا) یہ ابوالعالیہ کا قول ہے۔

دوم: الناس اجمعین سے مومنین کا ارادہ کیا گیا ہے گویا دوسروں کو شمار ہی نہیں کیا گیا ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ مومنین ہی انسان ہیں۔ یہ قتادہ اور ربیع کا قول ہے۔

سوم: ظالموں پر لعنت کرنے سے کوئی بھی منع نہیں کرتا پس اس میں کافر بھی داخل ہے اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ یہ سُدی کا قول ہے۔ لعنت لوگوں کی طرف سے بددعا کی شکل میں ہے اور اللہ کی جانب سے حکم کی وجہ سے ہے۔

اس کا ارشاد: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی لعنت میں۔ یہ زجاج اور جبائی کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: آتش میں رہیں گے اس لیے کہ اپنی شہرت کے سبب مذکورہ عذاب والوں کی حالت میں چونکہ لعنت رحمت سے دوری ہے اور عذاب کا لازمی ہونا ہے اور عذاب آتش جہنم میں ہوگا لیکن لعنت میں ہمیشگی کے دو احتمالات ہیں:

اول: لعنت کے حقدار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کے ہمیشہ ہمیشہ کے حق دار ہیں۔

دوم: لعنت کے انجام کار میں وہ کبھی ختم نہ ہونے والی آگ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ. ان پر عذاب مسلسل ایک جیسا ہوگا اس طرح نہیں ہوگا کبھی کم ہو جائے اور کبھی شدید و سخت۔

وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی انھیں عذر خواہی کی مہلت نہیں دی جائے گی جیسا کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے انھیں عذر خواہی کی ذرا سی بھی مہلت نہیں دی جائے گی ان کے توبہ کی طمع کے سبب۔ یہ ابوالعالیہ کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کے عذاب میں تاخیر نہ کی جائے گی بلکہ ان کا عذاب موجود و حاضر ہوگا۔

❀❀❀❀❀❀

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

اور تمھارا معبود خدائے یکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے وہی رحمن اور رحیم ہے۔

الفاظ و معانی:

وَاحِد وہ چیز جو کسی عدد یا غیر عدد میں تقسیم نہ ہو جو حکم اور وصف دو وجہوں پر جاری ہوتا ہے حکم پر اس طرح کہ آپ کا یہ کہنا جزء واحد یہ جزء کی جہت سے تقسیم نہیں ہوتا بلکہ صفت کے اعتبار سے آپ کا کہنا انسان واحد، دارِ واحد یہ منقسم نہیں ہوگا اس اعتبار سے کہ یہ انسان ہے۔

ترکیب:

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں هُوَ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ لَا اِلٰهَ کے محل کا بدل ہے جیسے آپ کا یہ کہنا کہ لَا رَجُلَ اِلَّا زَيْدٌ گویا آپ نے اس طرح کہا ہے: لَيْسَ اِلَّا زَيْدٌ گویا آپ معنی کا ارادہ کئے ہوئے ہیں اسے کسی اور کے ذریعہ شمار نہیں کیا اس کلام کی بنا پر کہ مَا قَامَ اَحَدٌ اِلَّا زَيْدًا نصب دینا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اعتماد دوم پر گیا ہے اور مراد وہی ہے اور نصب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خبر دینے میں اعتماد اول پر کیا گیا ہے۔ عبارت واضح ہے کہ هُوَ ترکیب سے پہلے اِلٰه کا بدل ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اثبات خداوند عالم ہے اور وہ اس کلام کے مانند ہے کہ اَللّٰهُ اَلْاِلٰهُ وَحْدَهٗ وہ ایسا ہی ہے اس لئے کہ وہ ان چیزوں پر قادر ہے جن کے ذریعہ وہ حقدار بندگی وعبادت ہے اس خبر میں لَا پہلے بھی نفی پر دلالت نہیں کر رہا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی بھی موجود و معدوم معبود پر دلالت نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ ان لوگوں کی بات کی نقیض ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ ایک اور اللہ ہے اور نفی کس چیز کے نہ ہونے کی خبر دینا ہے۔

شان نزول:

ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ کفار قریش اس طرح گویا ہوئے: اے محمد! آپ ہم سے

اپنے رب کے اوصاف اور اس کا نسب بیان کیجئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت اور سورۂ اخلاص کو نازل فرمایا۔

تفسیر:

اللہ ایک ہے

وَاِلٰهُكُمْ (اور تمھارا معبود) یعنی تمھارا خالق اور تم پر نعمتیں نازل کرنے والا جن کے نازل کرنے پر اس کے علاوہ کوئی اور قدرت نہیں رکھتا اور وہ معبود ہے عبادت جس کے لئے سزاوار ہے۔ یہ غلط ہے کہ وہ اس چیز پر قادر ہے کہ جب وہ اسے انجام دے گا تو عبادت کا مستحق قرار پائے گا؛ اس لیے کہ اگر اس طرح ہوتا تو اس کی قدیم ذات آلھاً نہیں ہوتی چونکہ اس نے ازل میں وہ فعل انجام نہیں دیا جس کے سبب وہ مستحق عبادت ہوتا۔ ہمارا یہ کہنا کہ "اسے عبادت کا حق حاصل ہے" کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس چیز پر قادر ہے جب کسی فعل کو انجام دے گا تو عبادت کا حقدار ہوگا۔ اس کا ارشاد: اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اللہ کی یہ صفت کہ وہ ایک ہے اس کی چار وجہیں ہیں:

اول: اس کے اجزاء نہیں ہیں، وہ قابل تقسیم نہیں ہے اور نہ ہی قابل تجزیہ ہے۔ نہ ہی اس میں تجزیہ کا احتمال ہے۔

دوم: وہ یکتا ہے اس کی کوئی نظیر اور شبیہ نہیں ہے۔

سوم: وہ اپنی الوہیت اور استحقاق عبادت میں یکتا و بے مثال ہے۔

چہارم: وہ اپنی صفات میں واحد و یکتا ہے جس کا وہ خود سزاوار ہے۔ ہم نے خدا کے قدیم ہونے کی جو صفت بیان کی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس صفت سے مخصوص ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے، ہم جو اس کی صفت بیان کرتے ہیں کہ وہ عالم و قادر ہے (تو اس کے معنی ہیں کہ) وہ ان دونوں صفات کی کیفیت سے مخصوص ہے جس سے مراد ہے کہ وہ تمام معلومات کا عالم ہے۔ اس کے لیے جہل ممکن نہیں ہے، وہ تمام اجناس پر قادر ہے، اس کے لیے عاجزی ممکن نہیں ہے۔ ہم نے اس کے حی (زندہ ہونے) اور باقی رہنے کی صفت بیان کی (تو اس کے معنی یہ ہیں کہ) اس کے لیے موت اور فنا ناممکن ہے، اس کے صفات کی کیفیت کا اختصاص اس کے نفس صفات کے مانند ہے (یعنی اس کی صفات عین ذات ہیں) جس کا خداوند عالم تنہا مستحق ہے، جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اس کا ارشاد: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ کلمہ اللہ کی الوہیت کے اثبات کے لیے ہے جس کے معنی ہیں: اللہ جو

کہ الہ واحد ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اس کلمہ میں اللہ سے نفی مثل ہے؟ محققین کا کہنا ہے کہ اس میں اللہ سے نفی المثل نہیں ہے اس لیے کہ نفی موجود یا معدوم سے درست ہوتی ہے۔ خداوند عالم کی مثل موجود ہے نہ معدوم۔ بعض نے کہا ہے نفی مثل فرض کیا گیا ہے۔

اللہ کا ارشاد: الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ. اللہ نے رحمٰن ورحیم کو اپنے قول: لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ سے متصل قرار دیا ہے۔ اس طرح اس نے اپنے بندوں پر استحقاق عبادت کا سبب بیان فرما دیا ہے، وہ یہ کہ اس نے بندوں کو وہ عظیم نعمتیں عطا فرمائیں ہیں جن پر اس کے سوا کوئی بھی قادر نہیں ہے اس لئے کہ رحمت ایک طرح کی نعمت ہے جو اس کی احتیاج رکھتا ہے۔ رحمن ورحیم کے معنی ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں۔

نظم:

یہ آیت اپنے ماقبل ومابعد سے متصل ہے۔ آیت کا اپنے ماقبل سے اتصال حسنہ اور سیئہ (نیکی اور بدی) کے اتصال کے مانند ہے تاکہ اثر زائل ومحو ہو جائے اور (برائی کا) انجام دینے والا اس سے خوف کرے۔ اس لیے کہ جب خداوند عالم نے شرک اور اس کے احکام کو بیان فرمایا اس کے ساتھ ہی توحید اور اس کے احکام ذکر کیے، (شرک) کا اتصال اپنے مابعد (توحید) سے متصل ہونا حکم سے متصل ہونے کے مانند ہے اس کے صحیح ہونے کی دلالت کے سبب اس لیے کہ جو کچھ بعد والی آیت میں ذکر کیا گیا ہے توحید کے صحیح ہونے پر حجت ودلیل ہے۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ
دَابَّةٍ ۖ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

بے شک آسمان وزمین کی تخلیق میں رات دن کی تبدیلی میں، ان کشتیوں میں جو انسانوں کی منفعت کی چیزیں لیے ہوئے سمندروں میں رواں دواں ہیں، اور اللہ جو آسمان سے بارش برسا کر مردہ زمینوں کو پانی کے ذریعہ زندگی بخشتا ہے اس میں اور پھر اس زمین میں جہاں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان وزمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، صاحبان عقل کے لیے ان گنت نشانیاں موجود ہیں۔

قرائت:

حمزہ اور کسائی نے الرِّيح کو واحد پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے الرِّيَاح جمع پڑھا ہے اور جس میں الف لام نہ ہو اس کے واحد ہونے پر سب متفق ہیں۔

ابو جعفر نے پورے قرآن میں رِيَاح جمع پڑھا ہے سوائے سورہ ذاریات کے۔ ابو عامر یعقوب، ابن عامر اور عاصم نے سورۂ بقرہ، اعراف، حجر، کہف، فرقان، نمل، روم میں دو جگہ، فاطر، جاثیہ، میں جمع پڑھا ہے۔ کسائی نے تین مقامات سورۂ فرقان، اول روم، اور حجر میں الرِّيَاح پڑھا ہے اور حمزہ نے بھی کسائی کی موافقت کی ہے سوائے سورۂ حجر کے۔

حجت:

ابن عباس نے کہا: اَلرِّيَاح رحمت کے لئے ہے اور اَلرِّيح عذاب کے لئے ہے۔ مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ
جب ہوا اٹھتی تھی تو دعا فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا وَلَا تَجْعَلْهَا رِيحًا خدایا! اس کو ریاح

(رحمت کی ہوا) قرار دینا اسے ریح (عذاب کی ہوا) قرار نہ دینا۔

اس روایت کی تقویت یہ آیت کرتی ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا میں اسی بات کا ارادہ فرمایا ہو اور وَلَا تَجْعَلْهَا رِيحًا کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ۔

کبھی کبھی تنزیل (قرآن) میں لفظ کسی چیز سے مخصوص ہو جاتا ہے اور وہ اس کی علامت ونشان بن جاتا ہے۔ انہیں الفاظ میں سے ایک مَا يُدْرِيكَ ہے کہ یہ مبہم اور غیر واضح ہے لیکن جہاں مَا أَدْرَاكَ ہے تو وہ وضاحت شدہ ہے جیسے یہ ارشاد الہی کہ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ. مَا الْقَارِعَةُ. مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ۔

ابوعلی نے کہا: تَصْرِيفِ الرِّيَاحِ کو جمع کی صورت میں پڑھنا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ ہواؤں میں ہر ہوا واحد پر دلالت میں ایک جیسی ہے اور جن حضرات نے اسے اَلرِّيحُ یعنی واحد پڑھا ہے تو انہوں نے جنس کا ارادہ کیا ہے جس طرح عرب یہ کہتے ہیں: أَهْلَكَ النَّاسَ الدِّينَارُ وَالدِّرْهَمُ۔

یہ ارشاد الہی کہ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً، چونکہ ساری ہوائیں جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تھی لہٰذا یہاں پر اَلرِّيحُ سے جنس اور کثرت کا ارادہ کیا ہے۔ اگر چہ جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے بعینہ اسی ہوا کو مسخر کیا گیا تھا تو یہ آپ کے اَلرَّجُلُ کہہ کر سارے مردوں کو مراد لینے کے مانند ہے۔

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ تو یہ واحد ہے اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اسی ہوا نے صبا کی مدد کی اور عاد کو ہلاک کر ڈالا پس یہ دلالت کرتی ہے کہ ریح واحد ہے۔

الفاظ ومعانی:

خَلْق کے معنی کسی چیز کو وجود میں لانا ہے اس کے مقابل کسی مثال (نمونہ) کے بغیر اسی سبب صفات الٰہی کے بغیر اس کا اطلاق واستعمال جائز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ کے علاوہ کوئی ایسی ذات نہیں ہے جس کے تمام افعال اس کے مقابل مثال کے بغیر ہوں۔ خلق کو مخلوق کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس طرح رضا کو مرضی

کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مصدر کے مقام و محل میں ہے۔ مصدر کے معنی مخلوق کے معنی میں نہیں ہے، علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ جب مصدر کے معنی میں ہو، ایک گروہ کا کہنا ہے یہ (اللہ) کا ارادہ ہے۔ دوسروں نے کہا ہے یہ مقدر معنی پر ہے جس طرح تم کہتے ہو وجود و عدم اور حدوث و قدم یہ اسماء مقدر مسمیٰ کے مختلف معنی پر دلالت کرتے ہیں ورنہ در حقیقت اس موصوف کے معنی ہیں۔

سَمَاوَات سَمَاء کی جمع ہے، ہر چھت سماء ہے لیکن جب مطلق طور پر بولا جاتا ہے تو اس سے ساتوں آسمان کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں سمجھی جاتی۔ سماوات کو جمع اور اَرْض (زمین) کو واحد بیان کیا گیا ہے چونکہ جب آسمان کا ذکر ہوا کہ وہ سات ہیں (جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: سَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اور خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سات کے ذریعہ سے توحید کا واحد کے معنی سے توہم نہ ہو۔

ارشاد الٰہی: وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ اگرچہ سات کے معنی پر دلالت کر رہا ہے لیکن لفظ میں تفصیلی طور پر جاری نہیں ہوگا چونکہ ارض اپنی شکل کے اعتبار سے جنس واحد سے مشابہت رکھتی ہے جس کی جمع ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ اختلاف مراد ہو سماوات متفق جنس کے محل میں جاری نہیں ہوتا چونکہ وہ ہر آسمان میں اس کے امر کی تدبیر کرتا ہے جو اس کا حق ہے۔

اِخْتِلَاف اِتِّفَاق کی نقیض (ضد) ہے (رات اور دن کا اختلاف) اس کا پیچھے سے آنا ہے، ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کے پیچھے آتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنس کا اختلاف ہے جیسے سیاہی اور سفیدی کا اختلاف چونکہ ادراک (درک کر پانے) میں ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی جگہ پُر نہیں کرتا (قائم مقام نہیں ہوتا) اور دو مختلف امور وہ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی جگہ کو پر نہ کر سکیں جن کی بازگشت ان کی ذات کی طرف ہوتی ہے۔

لَیْل تاریکی ہے جو دن کے پیچھے آتی ہے اس کی واحد لَیْلَة ہے مانند تَمْر و تَمْرَه۔

نَهَار ضیاء و روشنی کا پھیل جانا ہے۔ لَیْلَة کی جمع بیان کی گئی ہے جب کہ نَهَار کی جمع بیان نہیں کی گئی ہے چونکہ نَهَار مصدر کے محل و مقام میں ہے جس طرح آپ کا یہ کہنا ہے کہ ضیاء کثیر اور قلیل دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے مگر نہار کی جمع نُهُر بہت کم بیان ہوئی ہے۔

فُلْك کشتیاں ہیں اور ہر دائر (گردش) کرنے والی چیز فَلَك ہے، صاحب العین نے کہا ہے کہ یہ خاص دوران کا نام ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ سات اطباق کا نام ہے جس میں ستارے ہیں۔

وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ (اور جو کچھ اللہ نے آسمان سے نازل فرمایا ہے) ایک قوم نے کہا کہ

سماء (آسمان) بادل کے اوپر واقع ہے اس لئے کہ ہر وہ شے جو کسی شے پر بلند ہو وہ اس کے لیے سماء ہے۔ علی بن عیسیٰ نے کہا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ سحاب (بادل، ابر) زمین سے بلند ہونے والے بخارات ہیں یہ ممکن ہے اس کا یقین نہیں ہے نہ ہی اس کی صحت سے عقل و سمع کی دلیل مانع ہے۔

سَمَاء سقف (چھت) ہے اللہ فرماتا ہے: وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا (سورۂ انبیاء، آیت ۳۲) (اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا) مشہور آسمان زمین کی چھت ہے اس کی اصل سُمُو ہے اور وہ بلند ہے سماء (آسمان) نچلے طبقہ پر بلند طبقہ ہے اور ارض (زمین) نچلا طبقہ ہے۔ ارض البیت، ارض الغرفۃ (یعنی گھر کی زمین اور کمرہ کی زمین) کہا جاتا ہے۔ پس یہ اپنے نچلے طبقہ کے لیے سماء (بلندی آسمان) ہے اور اپنے سے بلند کے لیے زمین ہے مگر یہ مشہور سماء، آسمان کے لیے غالب صفت کے مقام میں نام قرار دیا گیا ہے اور یہ نام مشہور زمین کے لیے عَلَم کے مانند ہے۔

بَحْر پانی بہنے کی کشادہ جگہ جو نہر کی وسعت سے زائد ہوتا ہے۔

مَنْفَعَة لذت و سرور ہے یا وہ چیز جو لذت و سرور تک یا دونوں میں سے کسی ایک تک پہونچا دے۔

اَحْیَا فعل حیات (یعنی زندہ کرنا) ہے، زمین کی زندگی اور حیات نباتات (سبزہ وغیرہ) کے ذریعہ اس کا آباد کرنا ہے اور اس کی موت خشکی کے باعث تباہ و برباد ہونا ہے جس سے نبات کا اگنا اور روئیدگی رک جائے۔

بَثّ کے معنی بکھیرنا، منتشر کرنا اور پھیلانے کے ہیں، غم کو بَثّ کہتے ہیں چونکہ اس سے قلب تقسیم ہو جاتا ہے۔

دَابَّة دبّ سے مشتق ہے یعنی رینگنا، ہر رینگنے والی چیز جسے اللہ نے خلق کیا ہے دابّۃ ہے اور عرف عام میں اس جانور کا اسم ہو گیا ہے جس پر سواری جاتی ہے۔

تَصْرِیف کے معنی الٹنے پلٹنے کے ہیں۔ تَسْخِیر، تَذْلِیل اور تَمْهِید باہم مشابہ ہیں۔ کہا جاتا ہے: سَخَّرَ اللّٰہُ لِفُلَانٍ کَذَا، یعنی یہ امر اللہ نے فلاں کے لیے آسان کر دیا۔

رِیَاح (ہوائیں) چار طرح کی ہیں شمال، جنوب، صبا، دبور، قبلہ کی دائیں جانب سے چلنے والی ہوا شمال ہے۔ بائیں جانب سے چلنے والی جنوب، صبا اور دبور ایک دوسرے کے مقابل ہیں، صبا مشرق کی جانب سے چلتی ہے اور دبور مغرب کی جانب سے۔

تفسیر:

خدا کی ذات پاک کے جلوے

خداوند عالم نے کافروں کو باخبر کیا کہ ان کا اِلٰہ واحد و یکتا ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس پر کیا دلیل ہے؟ تو خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ، وہ دونوں (آسمان و زمین) کے ایجاد پر قادر ہے۔ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے پیچھے آتے ہیں جب ان میں کا ایک رخصت ہو جاتا ہے تو دوسرا اس کے پیچھے پیچھے آتا ہے یا دونوں جنس، رنگت، لمبائی اور چوڑائی میں مختلف ہیں۔

وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ، کشتیاں جو بوجھ اٹھاتی ہیں۔ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ، نفع کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان میں نفع و نقصان دونوں ہوتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے اس مقام پر نعمتوں کو شمار کیا گیا ہے، ضرر و نقصان نعمت نہیں ہے، اور کبھی تو ان پر سوار ہو کر منفعت حاصل ہوتی ہے اور تجارت اور کاروبار کی خاطر ان پر باربرداری کی جاتی ہے۔

وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ، تمام مفسرین کے نزدیک آسمان کی طرف سے (بارش کا نازل ہونا) ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے ابر مراد ہے۔ مِنۡ مَّآءٍ یعنی بارش۔ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا، (بارش کے ذریعہ زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا) یعنی بارش کی وجہ سے زمین کے بنجر ہو جانے کے بعد اسے آباد کیا اس لئے کہ جب زمین پر بارش برستی ہے تو زمین پھلتی پھولتی ہے اور جب بارش نہیں ہوتی تو اس میں روئیدگی نہیں ہوتی اور اس کے نباتات تکمیل کو نہیں پہنچتے، ان اسباب کی بنیاد پر وہ مردہ کی مانند ہو جاتی ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد زمین کے باشندوں کو حیات عطا کرنا ہے، خوراک وغیرہ کا سامان زمین سے نکال کر جس سے اس کے نفوس کو زندگی ملتی ہے۔

وَ بَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ، زمین میں تمام حیوانات پھیلا دئے جو اس میں چلتے پھرتے ہیں۔ اس سے حیوانات کا مختلف مقامات پر خلق کرنا مراد ہے اور وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ، ہواؤں کا منقلب ہونا۔ بعض کا مشرق کی سمت سے چلنا، بعض ہواؤں کا مغرب سے چلنا، بعض کا شمال اور بعض کا جنوب سے چلنا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بعض ہواؤں کا رحمت لے کر آنا اور بعض کا عذاب لیکر آنا (مراد ہے)۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔

روایت کی گئی ہے کہ ابن عباس کے زمانہ میں ایک بار شدید ہوا چلی، بعض افراد نے ہوا کو برا بھلا شروع کردیا تو انھوں نے کہا: ہوا کو برا بھلا کہو بلکہ اس طرح کہو: پروردگار اس ہوا کو ہوائے رحمت قرار دے! عذاب والی قرار نہ دینا!

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ. اور وہ بادل جو آسمان وزمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں۔ اللہ جس طرح چاہتا ہے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے۔ لَاٰيٰتٍ، حجتیں اور نشانیاں ہیں، لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ، اس قوم کے لئے جو عقل سے کام لیتی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ عقلاء عام ہے جو استدلال کرتے ہیں اور جو استدلال نہیں کرتے دونوں کو شامل ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہ استدلال کرنے والوں سے مخصوص ہے۔ چونکہ جو (شخص) ان نشانیوں سے استفادہ نہیں کرتا اور ان سے استدلال نہیں کرتا ہے گویا اس کے پاس عقل ہی نہیں ہے۔ وہ اس ارشاد الٰہی کے مانند ہے: اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا. (سورۂ نازعات، آیت ۴۵) (بلا شبہ آپ ہر اس شخص کو ڈرانے والے ہیں جو اس (قیامت) کا خوف رکھتا ہے) اور اس کا یہ ارشاد ہے کہ: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، خداوند عالم نے آیات دلالتوں کا ذکر کیا ہے، ان باتوں کا ذکر نہیں فرمایا ہے۔

علماء نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ جس چیز پر یہ آیات دلالت کررہی ہیں ان کا کہنا ہے کہ آسمان و زمین کے اجزاء، ان میں کمی اور بیشی کا احتمال، ان کے حادث ہونے پر دلیل ہے کہ دونوں حادث ہونے سے جدا نہیں ہیں، پھر دونوں کا وجود میں آنا اور خلق ہونا دونوں کے لئے ایک خالق کے ہونے پر دلیل ہے، ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں، اجسام کی خلقت پر بجز قدیم کے کوئی قدرت نہیں رکھتا جو بذات خود قادر ہے، جو نہ جسم ہے، نہ ہی عرض، جو اجسام واعراض کے صفات کا حامل ہوگا وہ محدث ہوگا، اس کے لیے مُحدِث (وجود میں لانے والا) کا ہونا لازمی ہے جو مُحدَث نہ ہو (یعنی تغیر پذیر نہ ہو) اس لیے کہ تسلسل لازم آئے گا اور زمین وآسمان کا مضبوط ومحکم نظم ونسق کے ساتھ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا انجام دینے والا واقف وصاحب حکمت ہے۔ شب وروز کا وقفہ وقفہ کے بعد ایک ڈھرے پر جاری وساری رہنا، ایک کا دوسرے سے کم اور زیادہ ہونا اور اس کا آفتاب وماہتاب کے رواں دواں ہونے سے متعلق ہونا (اللہ) کے عالم اور صاحب تدبیر ہونے کی دلیل ہے جو انھیں اس حد پر چلا رہا ہے وہ نہ تو سہو میں مبتلا ہوتا ہے، نہ ہی ان سے غافل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے محکم افعال ہیں جو ایسے نظام وترتیب کے ساتھ واقع ہیں جن میں کوئی فرق وخلل داخل نہیں ہوتا اور

کشتیاں جو پانی میں رواں دواں ہوتی ہیں جن میں لوگوں کے لیے فائدہ ہے، وہ پانی کے نرم ولطیف ہونے پر دلیل ہے جس کا تم مشاہدہ کرتے ہو۔ اگر اس طرح نہیں ہوتا تو اس میں کشتی کا چلنا ناممکن تھا اور ہواؤں کا کشتیوں کو پانی کے برعکس سمت میں چلانے کے لیے مسخر کرنا ان پر صاحب نعمت کی نعمت ہے جس نے مخلوقات کے منافع کے لیے اس کی تدبیر فرمائی ہے، نہ تو وہ بشر کی جنس سے ہے، نہ ہی اجسام سے اس لیے کہ اجسام پر ان امور کا انجام دینا مشکل ودشوار ہے اور آسمان سے پانی کا برسنا اس کے عالم وجود میں آنے کی دلیل ہے اور اس کا قطرہ قطرہ کی صورت میں اس طرح برسنا کہ اس کے اجزاء باہم متصل نہیں ہوتے، نہ ہی فضا میں ایک دوسرے سے باہم پیوستہ ہوتے ہیں کہ سیلاب کے مانند برس کر شہروں اور ممالک کو فنا کے گھاٹ اتار دیں، پھر بارش کا ہوا میں رک جانا جبکہ پانی کی طبیعت ومزاج برستے وقت بقدر ضرورت اپنے اوقات میں نیچے کی جانب گرنا ہے (جو اس بات پر دلیل ہے) وہ اپنے امور کا جیسا کہ وہ چاہتا ہے مدبر اور قادر ہے، عالم ہے، حکیم وخبیر ہے۔

زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرنا پھلوں اور نباتات کے ظہور کی دلیل ہے اور جو اس کے ذریعہ مخلوقات کی خوراک حیوانات کا رزق اس کے ذائقہ، رنگ اور بو کا مختلف ہونا اس کے ضرر ومنافع کا دواؤں اور غذاؤں میں اختلاف، اس (اللہ) کے کمال قدرت اور عجیب وغریب حکمت کی دلیل ہے۔ پاک ہے اس کی ذات جو علیم وحکیم ہے، اس کی شان بلند ترین ہے، زمین میں ہر قسم کے جانوروں کا خلق کرنا اس امر کی دلیل ہے ان کا بنانے والا خالق ہے جو انھیں انواع واقسام کی نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے، جس نے انھیں مختلف شکلوں، قیافوں، قسم قسم کے گوشت، ہڈیوں، اعصاب اور رگ وریشہ کے ذریعہ ساتھ ترتیب دیا جو اس کی عجیب وغریب فطرت اور غرائب حکمت پر مشتمل ہے، جو اس کی عظیم قدرت اور نعمت مجسم کی دلیل ہے اور ہواؤں کا گردش و حرکت کرنا مختلف سمتوں سے کبھی سرد، کبھی گرم، کبھی نرم اور کبھی آندھیاں، کبھی ہواؤں کا عقیم (بانجھ ہونا) یعنی کسی شے کا نہ اگنا، ہواؤں کا تلقیح والا (یعنی ایسی ہوائیں جن کے ذریعہ فضا میں مختلف درختوں اور نباتات کے دانے منتشر ہو کر افزائش کا باعث ہوتے ہیں) (یہ جملہ امور) اس بات کی دلیل ہیں کہ ان ہواؤں کا چلانے والا ان چیزوں پر قادر ہے جن پر اخدا کے علاوہ کوئی قادر نہیں ہے، اگر تمام مخلوقات یکجا ہو کر مشرق کی ہوا کو مغرب کی طرف یا شمال کی ہوا کو جنوب کی طرف چلانا چاہے تو ناممکن ہے اور ابر کا تسخیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا ٹھہرانے والا ایسا قادر ہے جس کی نہ کوئی شبیہ ہے، نہ نظیر۔ اس لیے کہ اجسام کا کسی تعلق اور ستون کے بغیر ٹھہرانا اور قائم کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں ہے جو ذاتی طور پر قادر ہے جس کی قدرت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ یہ تمام

آیات اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ خدا ایسا صانع (بنانے والا) ہے جس کا کوئی بنانے والا نہیں، ایسا قادر ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں بنا سکتی، ایسا عالم ہے جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، ایسا زندہ ہے جس سے آفتیں ملحق نہیں ہوتیں، حادثات متغیر نہیں کرتے، زمین و آسمان میں اس سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں رہتا، وہ سمیع و بصیر (سننے اور دیکھنے والا) ہے، ان چیزوں کے حادث ہونے کے سبب اس نے اپنے قدیم اور ازلی ہونے پر شہادت دی ہے اور ان چیزوں کی عاجزی و درماندگی اور تسخیر پر اپنے کمال قدرت کی علامت مقرر فرمائی ہے اور اپنی عجائب خلقت کے ذریعہ واضح دلالت پیش کی ہے کہ وہ اپنے بندوں پر نعمتوں کے فوائد کے سبب ان پر احسان کرتا ہے، ان پر نعمت عطا کرتا ہے جس پر اس کے علاوہ کوئی دوسرا قادر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے وہ ایسا اِلٰہ ہے جس کے سوا عبادت کا کوئی سزاوار نہیں۔

اِس آیت میں غور و فکر اور استدلال کے وجوب پر دلالت ہے اور یہی اس کی معرفت کا راستہ ہے۔ اس میں غور و فکر کا بیان ہے جن چیزوں میں غور و فکر کرنا چاہیے اور ان میں تقلید کے باطل ہونا بالکل واضح ہے۔

❀❀❀❀❀

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اس کا ہمسر اور مد مقابل بناتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت کرتے ہیں مگر صاحبان ایمان سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ عذاب کو دیکھ کر ظالموں کو جو نظر آئے گا کاش آج ہی انھیں نظر آجاتا کہ ساری طاقتیں اور تمام اختیارات اللہ کے پاس ہیں اور یہ کہ وہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔

قرائت:

نافع، ابن عامر اور یعقوب نے وَلَوْ تَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا کو خطاب کی بنا پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور سارے قراء نے يَرَوْنَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے ابن

عامر کے۔انہوں نے یاء کو ضمہ کے ساتھ یُرَوْنَ پڑھا ہے۔

ابوجعفر اور یعقوب نے اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ اور اِنَّ اللّٰہَ دونوں اِنَّ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن قراء نے وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا میں یَرَیٰ کو یاء کے ساتھ صیغۂ غائب پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہاں پر صیغۂ غائب صیغۂ حاضر سے بہتر ہے اس لئے کہ وہ ماقبل: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا ، اسی طرح بعد والی آیت: کَذٰلِکَ یُرِیْھِمُ اللّٰہُ اَعْمَالَھُمْ حَسَرَاتٍ؛ سے بھی زیادہ مشابہ ہوجائے گا۔

اور جن قراء نے تَرَیٰ (حاضر کا صیغہ) پڑھا ہے انہوں نے اس کا مخاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیا ہے اس لئے کہ قرآن مجید میں وَلَوْ تَرَیٰ کئی مقامات پر آیا ہے۔خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور مراد سب ہیں۔

اَنَّ الْقُوَّۃَ کے ہمزہ کو زبر دینا ان لوگوں کے نزدیک جنہوں نے تاء کے ساتھ (تَرَیٰ) پڑھا ہے وہ دو حالت سے خالی نہیں ہے یا تو تَرَیٰ رُؤْیَتُ الْبَصَرِ سے مشتق ہے یعنی دیکھنا یا دو مفعول کی جانب متعدی ہونے والے فعل رَاَئ سے مشتق ہے یعنی (یقین کرنا) اگر رؤیۃ البصر سے مشتق ہے تو اسے اَنَّ کی جانب متعدی کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ وہ اپنا مفعول لے چکا ہے جس کی اسے ضرورت تھی اور وہ اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ہے اور وہ دو مفعول کی جانب متعدی نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ یہاں پر مفعول ثانی ہی معنی کے لحاظ سے مفعول اول ہے اور اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا نہیں ہوسکتا ہے پس لازم ہے کہ وہ تَرَیٰ کے علاوہ کسی اور فعل کے ذریعہ منصوب ہو اور وہ فعل ہے جسے لَوْ کا جواب فرض کیا جاتا ہے گویا اس طرح فرمایا: وَلَوْ تَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعاً (اگر آپ ان لوگوں کو دیکھتے کہ جن لوگوں نے ظلم کیا وہ لوگ عذاب دیکھیں گے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے) مراد یہ ہے کہ انہوں نے خداوند سبحان کی قدرت میں سے ایسی چیز دیکھی کہ انہیں یقین ہوجائے گا کہ وہی قوی اور ناقابل شکست ہے اور معاملہ وہ نہیں کہ جس پر لوگ تھے اور اس کا انکار کررہے تھے یا اس میں شک کررہے تھے۔

جن قراء نے یَرَیٰ پڑھا ہے ان کا نظریہ زیادہ واضح ہے اس لئے کہ انہوں نے اَنَّ کو فعل ظاہر کے

ذریعہ نصب دیا ہے نہ کہ فعل مضمر و پوشیدہ کے ذریعہ اور اسی طرح جواب محذوف ہو جائے گا۔ جب جواب کسی لفظ میں عمل کرے گا تو وہ لفظاً مذکورہ باتوں کے مخالف ہو جائے گا کہ جن کے جواب کو حذف کر دیا گیا ہے تاکہ ڈرانے دھمکانے کے باب میں زیادہ بلیغ ہو جائے۔ یہ ابو علی فارسی کا کلام ہے۔ ہم ترکیب میں اَنَّ الْقُوَّۃَ میں اِنَّ ہمزہ کے کسرہ اور فتحہ کے بارے میں مزید باتیں بیان کریں گے۔

جن قراء نے اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ پڑھا ہے ان کی دلیل آیت رَأَوُا الْعَذَابَ اور یہ آیت وَاِذَا رَأَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ ہے۔

ابن عامر کی دلیل آیت کریمہ کَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ ہے اس لئے کہ جب آپ اس کا فعل مجہول بنائیں گے تو یہی کہیں گے: يُرَوْنَ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ۔

الفاظ و معانی:

اَنْدَاد، اَشْبَاہ اور اَمْثَال باہم مشابہ ہیں۔ انداد کا واحد نِدّ ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ اسماء اضداد ہیں۔ نِدّ کی اصل دشمنی اور عداوت کرنے والا ہے۔

حُبّ بغض کے برعکس ہے۔ محبت ارادہ ہے مگر اس میں حذف ہے، جب آپ کہتے ہیں: اُحِبُّ زَيْدًا (میں زید سے محبت کرتا ہوں) اس سے مراد ہوگا میں اس کا فائدہ اور منافع چاہتا ہوں یا اس کی مدح و تعریف چاہتا ہوں۔ جب آپ کہتے ہیں: اَحَبَّ اللّٰهُ زَيْدًا، اس کے معنی ہوں گے اللہ اس کے لیے ثواب اور اسے عظمت دینا چاہتا ہے۔ جب آپ کہتے ہیں: اُحِبُّ اللّٰهَ، اس کے معنی ہوں گے کہ میں احکام الٰہی کی اطاعت و اتباع چاہتا ہوں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ محبت ارادہ کی جنس سے نہیں ہے بلکہ میلان طبیعت کی جنس سے ہے جس طرح آپ کہتے ہیں: اُحِبُّ وَلَدِیْ (یعنی میری طبیعت فرزند کی طرف مائل ہوتی ہے)

ابوعبیدہ نے کہا: اور اسی سے اللہ کا قول: اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ (سورہ ص، آیت ۳۲) (میں نے مال کی محبت کو اپنے پروردگار کی یاد پر ترجیح دی) یعنی میں زمین سے چمٹ گیا گھوڑوں کی محبت میں یہاں تک کہ نماز مجھ سے چھوٹ گئی۔

یَرَیٰ اور دیکھ لیتے، ابوعلی الفارسی نے کہا کہ یہ رُؤْيَةُ الْعَيْن سے مشتق ہے یعنی آنکھوں سے دیکھنا اس کی تقدیر اس طرح ہے: وَلَوْ يَرَوْنَ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ، یعنی کاش کفار یہ دیکھ لیتے کہ تمام قوت اللہ کے لئے ہے اور

اس پر اللہ کا یہ قول دلیل ہے: اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ، جب وہ عذاب کو دیکھیں گے۔

قوت اور قدرت دونوں ایک معنیٰ میں ہیں۔

ترکیب:

یاء کے فتحہ کے ساتھ قرائت کی صورت میں تین وجھوں سے اَنَّ پڑھنا اور تین وجھوں سے اِنَّ پڑھنا جائز ہے۔ اَنَّ پڑھنا:

(۱) فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے کہ اس کو فعل کا مفعول قرار دیا جائے اس طرح کہ) اَنَّ اور مابعد کو تاویل مصدر میں لے جایا جائے گو یا اس طرح: وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ قُوَّۃَ اللہِ وَ شِدَّۃَ عَذَابِہٖ۔

(۲) لام کو حذف کر کے اَنَّ کو فتحہ دیا جائے جیسے آپ کا یہ کہنا: لِاَنَّ الْقُوَّۃَ لِلہِ۔

(۳) یہ فرض کیا جائے کہ لَرَاَوْا اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلہِ وَاَنَّ اللہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ۔ یہ جملہ ایک ایسی چیز سے متصل ہے جسے جواب میں سے حذف کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ پڑھنا:

(۱) استیناف (نئے جملہ) کی بنا پر

(۲) جواب میں سے جو حذف ہے اس کی حکایت کے عنوان سے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے: لَقَالُوْا اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلہِ۔

(۳) حال سے جو حذف ہے اس سے اتصال کی بنا پر گویا اس طرح کہا گیا ہے: یَقُوْلُوْنَ اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلہِ۔

تاء کے ساتھ قرأت یعنی تَرٰی کی صورت میں بھی تین وجھوں سے اَنَّ پڑھنا جائز ہے: اَنَّ پڑھنا۔

(۱) بدل ہو جیسے یہ کہنا: وَلَوْ تَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلہِ عَلَیْھِمْ ؛ یہ فراء کا نظریہ ہے۔ ابو علی نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ الْقُوَّۃ، اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا نہیں ہے، نہ بدل بعض اور نہ ہی بدل کل اور نہ ہی بدل اشتمال۔

(۲) لام کے حذف ہونے کی بنا پر اَنَّ پڑھا جائے جیسے: لِاَنَّ الْقُوَّۃَ۔

(۳) رَاَیْتَ اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلہِ کی بنا پر۔

تاء کے ساتھ اِنَّ پڑھنا انہیں تین صورتوں میں سے ہے جو یَرَیٰ کے ساتھ تھیں۔

فراء نے کہا: منتخب قول یہ ہے کہ یاء (یَرَیٰ) کے ساتھ اَنَّ پڑھا جائے اور تاء (تَرَیٰ) کے ساتھ اِنَّ پڑھا جائے اس لئے کہ رُؤْیَت، اَلَّذِیْنَ پر واقع ہوتی ہے (یعنی مفعول واقع ہوا ہے) اور لَوْ کا جواب محذوف ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: لَرَاَوْا اَمَضَرَّةَ اتِّخَاذِهِمُ الْاَنْدَادَ وَ لَرَاَوْا اَمْرًا عَظِيْمًا لَا يُحْصَرُ بِالْاَوْهَامِ - یقیناً وہ خدا کے شریک کر کے نقصانات سے دیکھیں گے اور وہ یقیناً وہ ایسے عظیم امر کو دیکھیں گے کہ جن کا اوہام وخیالات کے ذریعہ احاطہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جواب کو حذف کرنا مبالغہ پر دلالت کرتا ہے جیسے آپ کا یہ کہنا کہ لَوْ رَأَيْتَ السِّيَاطَ تَأْخُذُ فُلَانًا (اگر تم تازیانے کو دیکھے جو فلاں کو گرفت میں لئے تھا یہاں پر محذوف كُلَّ اَمْر ہو سکتا ہے۔

اور جن قراء نے لَوْ يَرَىٰ یاء کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کے نزدیک اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ وہی ایسا کرنے والے ہیں۔

اور جن قراء نے لَوْ تَرَىٰ تاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا محلاً منصوب ہے۔

جَمِيعاً بر بنائے حال منصوب ہے گویا اس طرح کہا گیا ہے: اَنَّ الْقُوَّةَ ثَابِتَةٌ لِلّٰهِ فِيْ حَالِ اجْتِمَاعِهَا - جَمِيْعًا صفت مبالغہ ہے اس معنیٰ میں ہے کہ جب وہ گذشتہ وعید (وعدۂ عذاب) کے سلسلہ میں خدا کے مقدرات کو دیکھیں گے تو جان جائیں گے کہ بے شک اللہ ایسا قادر ہے کہ جسے کوئی شے عاجز نہیں بنا سکتی ہے۔

يُحِبُّوْنَهُمْ يَتَّخِذُ میں ضمیر کے حال ہونے پر محلاً منصوب ہے اگرچہ يَتَّخِذُ کی ضمیر مفرد ہے اس لئے کہ وہ مَنْ کی طرف پلٹ رہی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بار صرف لفظ کی طرف پلٹے دوبارہ معنی کی طرف پلٹے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اگر آپ سوال کریں کہ اَلْعَذَاب میں کیوں کر اِذْ آیا ہے جبکہ یہ مستقبل کی بات ہے تو جواب یہ ہے کہ لفظ ماضی آیا ہے قریب کرنے کے ارادہ سے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْهُوَ أَقْرَبُ اور یہ کہ اِنَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ اسی طرح یہ آیت ہے: وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ - قرآن مجید میں اس قسم کی اور بھی آیتیں آئی ہیں جیسے: وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ (سورۂ سبا، آیت ۵۱؛ اور کاش آپ دیکھئے کہ یہ گھبرائے ہوئے ہوں گے اور بچ نہ سکیں گے) وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ (سورۂ انعام، آیت ۲۶؛ اگر آپ دیکھتے کہ یہ کس طرح جہنّم کے سامنے کھڑے کئے گئے) وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ (سورۂ سبا، آیت ۳۱؛ کاش آپ دیکھتے جب

ان ظالموں کو پروردگار کے حضور کھڑا کیا جائے گا)

تفسیر:

مشرکین کا انجام

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا، کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں۔ یعنی ان کے معبودان بتوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ اس مقام پر مِنْ تبعیض کا ہے۔ یہ قتادہ، مجاہد اور بیشتر مفسرین کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: یہ ان کے وہ رؤساء ہیں رجال میں سے جن ارباب کی یہ اطاعت کرتے ہیں، یہ سُدی سے مروی ہے۔ انھیں معنی کی روایت جابرؓ نے امام باقر علیہ السلام سے کی ہے، امامؑ نے فرمایا: یہ تمام ظالموں کے پیشوا اور ان کے پیروکار ہیں۔

يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (یہ ان سے اللہ جیسی محبت کرتے ہیں) اس آخری قول پر بیشتر دلالت ہے کہ یہ بات بعید ہے کہ وہ بتوں سے اللہ کے مانند محبت کریں باوجودیکہ وہ جانتے ہیں کہ بت نہ تو کوئی فائدہ پہونچا سکتے ہیں نہ ہی کوئی نقصان۔ اسی طرح اس پر اس کا یہ ارشاد دلالت کررہا ہے: اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۶۶) (اس وقت پیر اور پیشوا جن کی پیروی کی گئی تھی اپنے مریدوں سے لاتعلقی کا اظہار کریں گے جب وہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور جملہ اسباب و وسائل کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہوگا)

ان سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان کی عبادت کو محبوب جانتے ہیں یا ان سے تقرب چاہتے ہیں یا ان کے لیے اطاعت سے محبت کرتے ہیں یا یہ تمام چیزیں مراد ہیں۔

كَحُبِّ اللّٰهِ (اللہ کی محبت کی طرح) اس میں تین اقوال ہیں:

اول: ان کی اللہ سے محبت، مومنین سے اللہ کی محبت کے مانند ہے۔ یہ ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔

دوم: جس طرح وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اسی طرح ان شرکاء سے بھی بحث کرتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ مشرکین میں سے جو خدا کی معرفت رکھتے ہیں اور خدا کے ساتھ ساتھ بتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ وہ محبت میں خدا اور بتوں کو برابر مانتے ہیں۔ یہ ابوعلی اور ابومسلم کا قول ہے۔

سوم: كَحُبِّ اللّٰهِ ایسی محبت کے مانند جو دن پر واجب و لازم ہو حالانکہ واقعیت یہ نہیں ہے۔
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ مگر صاحبان ایمان سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ یعنی مومنین کی محبت ان کی محبت سے مافوق ہے، ان کی محبت چند وجوہات سے شدید ہے:

اول: (اللہ کے لیے) ان کی عبادت اور اس کے لیے ان کی تعظیم وثنا کا شرک سے خالص ہونا۔

دوم: وہ علم کے سبب اس سے محبت کرتے ہیں کہ وہ انھیں سب سے پہلے نعمت عطا کرنے والا ہے اور ان کے جملہ حالات میں ان کے لیے مناسب تدبیر کرنے والا ہے اور یہ کہ اس نے انھیں فراواں نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ وہ اس کا شکر کرنے کے لیے عبادت کرتے ہیں، وہ اس کی رحمت کے یقینی طور پر امیدوار ہیں۔ پس اس طرح ان کی اللہ سے شدید محبت ہونا لازمی ہے۔

سوم: وہ لوگ جانتے ہیں کہ خدا کے لیے صفات علیا اور اسماء حسنیٰ ہیں، وہ ایسا حکیم وخبیر ہے جس کی نہ تو کوئی مثال ہے نہ ہی نظیر، جو نفع ونقصان اور ثواب وعذاب کا مالک ہے۔ اسی کی طرف بازگشت اور انجام ہے۔ وہ اللہ کی محبت میں شدید ہیں اسی لیے وہ بتوں کی پرستش کرنے والوں کی بنسبت اللہ کی محبت میں شدید ہیں۔

اللہ کے ارشاد: اَشَدُّ حُبًّا کے معنیٰ میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کی محبت میں بہت زیادہ ثبات ودوام پایا جاتا ہے اس لیے کہ شرک ایک بت سے دوسرے بت کی جانب منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔ بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ مومن اللہ کی عبادت کسی واسطہ کے بغیر کرتا ہے جبکہ مشرک واسطہ کے ساتھ پرستش کرتا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔

ارشاد الٰہی: وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا، اس کی تقدیر ہے: اگر ظالم دیکھتے اور کہا گیا ہے: اگر یہ ظالم جان لیتے۔ اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ، پہلا قول صحیح و درست ہے جس کا بیان گذر چکا ہے۔ یہ معنی اس کی قرأت کے مطابق ہیں جس نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور جس نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کے معنی ہیں: اے محمدؐ! اگر تم دیکھتے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ خطاب پیغمبرؐ سے ہے۔ مراد دوسرے افراد ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں: اے سامع اگر تو دیکھتا یا اے ظالم انسان اگر وہ عذاب دیکھتے۔

ارشاد: اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ، اس میں حذف ہے یعنی تو دیکھتا کہ تمام قوت وطاقت اللہ کے لیے ہے۔ جَمِيْعًا اس اعتبار سے 'لَوْ' کے جواب سے متصل ہے جس نے (یَا) کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کے معنی ہوں گے۔ اگر ظالم دیکھتے کہ تمام قوت وطاقت اللہ کے لیے ہے تو اپنے افعال کا نقصان وضرر اور اس کا برا انجام دیکھتے۔

اللہ کے اس ارشاد کے معنی ہیں کہ خدا ان کی گرفت کرنے اور ان کے عذاب پر قادر ہے۔ آیت میں وعید ہے اور اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ تمام ظالمین اپنی (ظاہری) عزت کے باوجود جب محشور ہوں گے تو ذلیل ورسوا ہوں گے۔ آنّ کے فتحہ (زبر) اور اِنّ کسرہ (زیر) کے وجوہات کی ہم وضاحت کر چکے ہیں، معنی تمام وجہوں اور شکلوں میں اسی کے تابع اور اسی پر ان کا دارومدار ہے۔ ’لَوْ‘ کا جواب محذوف ہے۔

وَّاَنَّ اللہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ. شدت کے ذریعہ عذاب کی صفت اس کی صفت میں توسیع اور مبالغہ کے اعتبار سے بیان کی گئی ہے کہ شدت وسختی اجسام کے صفات میں سے ہے۔

نظم:

اس آیت کے اپنے ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے مذکورہ آیات کے ذریعہ وضاحت کے ساتھ باخبر کیا ہے کہ قوم، باطل اور انکار حق پر باقی رہی، گویا اس نے کہا کہ اس بیان اور برھان کے ظہور سے بہت زیادہ دور وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے مثل قرار دیا ہے جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اس کا شریک اور مثل قرار دیتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَ
تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا
كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ
حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

اس وقت پیر اور پیشوا جن کی پیروی کی گئی تھی اپنے مریدوں سے لاتعلقی کا اظہار کریں گے۔ جب وہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور جملہ اسباب و وسائل کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہوگا۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کیا کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری کر رہے ہیں ہم بھی ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں کے سامنے اس طرح لائے گا کہ وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں گے مگر جہنم کی آگ سے نکلنے کی راہ نہ پائیں گے۔

الفاظ و معانی:

تَبَرُّؤ لغت میں تَفَصِّی اور تَزَیُّل باہم مشابہ ہیں۔ تَبَرُّؤ کے حقیقی معنی عداوت کے سبب پلٹنا اور دور ہونا ہے جب: تَبَرَّءَ اللهُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ کہا جاتا ہے تو اس سے یہ مراد ہوتا ہے کہ گویا اللہ نے انھیں اپنی رحمت سے اس عداوت کی وجہ سے دور کر دیا ہے جس کے وہ مستحق ہو گئے تھے۔ اس کے اصلی معنی انفصال (جدائی) کے ہیں۔ اسی سے: بَرَأَ مِنْ مَرَضِهٖ ہے یعنی وہ اپنے مرض سے شفایاب ہو گیا۔

اِتِّبَاع کے معنی گفتگو، کارکردگی یا جگہ میں موافقت طلب کرنا ہے۔

كَرّ، فَرّ (فرار کرنے) کی ضد ہے۔ کتاب العین کے مؤلف نے بیان کیا ہے کرّ کے معنی کسی چیز سے واپسی کرنے کے ہیں اور موٹی رسی کو بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سخت بٹی ہوئی رسی کو کہتے ہیں۔

حَسَرَات حَسْرَة کی جمع ہے یعنی شدید ندامت۔ حسرت اور ارادہ کے درمیان یہ فرق ہے کہ حسرت کا تعلق صرف ماضی سے ہوتا ہے جبکہ ارادہ مستقبل سے متعلق ہوتا ہے۔ حَسر کے حقیقی معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔ آپ: حَسَرَتِ الْعَمَامَةُ مِنْ رَأْسِي، (عمامہ میرے سر سے ہٹ گیا) اس وقت کہتے ہیں کہ جب سر

ظاہر گیا۔ میں نے عمامہ کو اپنے سر سے ہٹایا جب اسے ظاہر کر دیا اور حَاسِر اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس نہ زرہ ہو نہ ہی خود۔

ترکیب:

اِذْ میں عامل شَدِيْدُ الْعَذَابِ ہے یعنی وَقْتَ التَّبَرُّؤِ فَتَبَرَّأَ منصوب ہے اس لئے کہ تمنّی بالفاء کا جواب ہے گویا اس طرح فرمایا ہے: لَيْتَ لَنَا كُرُوْرًا فَنَتَبَرَّأَ اور جب بھی فعل کو ایسی چیز پر عطف کیا جائے جس کو تاویل مصدر میں لے جایا جائے تو اسے اَنْ کو پوشیدہ رکھ کر نصب دیا جاتا ہے اور اَنْ کو ظاہر کرنا جائز نہیں ہے وہاں پر جہاں خود مصدر کو صراحتاً لانا فصیح نہ ہو جب پہلے والے کو تاویل پر حمل کیا جائے گا تو دوسرے کو بھی تاویل پر حمل کیا جائے گا۔

اسی کو رفع دینا بھی صحیح ہے استیناف (نیا جملہ ہونے) کی بنا پر یعنی فَنَحْنُ نَتَبَرَّأُ مِنْهُمْ عَلٰى كُلِّ حَالٍ لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً۔ میں کہتا ہوں کہ یہاں پر بھی لَوْ کا جواب محذوف ہے اس لئے کہ کلام میں لَوْ تمنّی کے معنیٰ دے رہا ہے۔ لہٰذا اصل کلام میں اس طرح ہوگا: لَوْ ثَبَتَ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأُ مِنْهُمْ لَتَشَفَّيْنَا بِذٰلِكَ وَ جَازَيْنَاهُمْ صَاعًا بِصَاعٍ (اگر ہمارے لئے بازگشت ثابت ہوتی تو ہم بھی ان سے اظہار بیزاری کرتے اور اسی طرح تشفی حاصل کرتے اور ایک ایک چیز کا بدلہ لیتے) یہ وہ بات ہے جسے اغیار نے ہمارے لئے ظاہر کیا ہے حالانکہ قوانین میں ہم نے اسے نہیں دیکھا ہے اور یہی صحیح ہے کہ اس پر کوئی غبار نہیں ہے اور خدا کی جانب سے یہی توفیق ہے۔

كَذٰلِكَ کے کاف میں عامل يُرِيْهِمُ اللّٰهُ ہے۔ یعنی يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ كَذٰلِكَ یعنی آپس میں ایک دوسرے سے اظہار برأت و بیزاری کے مثل اس لئے کہ ہر ایک سے امید منقطع ہو جائے گی۔ کہا گیا ہے کہ اس کی اصل اس طرح ہے: يُرِيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ كَمَا اَرَاهُمُ الْعَذَابَ (یعنی جس طرح ان کے اعمال کو انہیں حسرتیں بنا کر دکھائیں گے اسی طرح ان کو عذاب بھی دکھائیں گے اس لئے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو جائے گا)

تفسیر:

باطل معبود اظہار برائت کریں گے

جن لوگوں نے خدا کا (شریک) اس کا مثل قرار دیا تھا قیامت میں ان کی بدترین حالت کا ذکر کرتے ہوئے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا: اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِیۡنَ اتُّبِعُوۡا، اس وقت پیر اور پیشوا جن کی پیروی کی گئی تھی وہ انسانوں میں مشرکین کے روساء اور سردار ہیں۔ یہ روایت قتادہ، ربیع اور عطا سے منقول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ یہ جنوں میں سے شیاطین ہیں جو وسوسہ کے سبب اتباع کرتے ہیں۔ یہ سُدی کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ جن وانس کے شیاطین مراد ہیں۔ زیادہ واضح قول اول ہے۔

مِنَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا، اپنے مریدوں سے لاتعلقی کا اظہار کریں گے یعنی اپنے پیروکار جن کا نچلے طبقے سے تعلق ہوگا۔

وَرَاَوُا، پیر اور پیشوا دیکھیں گے۔ الۡعَذَابَ، انھیں داخل جہنم ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔

وَتَقَطَّعَتۡ بِهِمُ الۡاَسۡبَابُ، (اور جملہ اسباب و وسائل کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہوگا) اس میں متعدد وجہیں ہیں:

اول: وہ اسباب و وسائل جن کے ذریعہ ان سے متوسل ہوتے تھے (جنہیں بطور وسیلہ اختیار کرتے تھے) یہ مجاہد، قتادہ اور ربیع کا قول ہے۔

دوم: وہ ارحام (قرابت داریاں) جن کی بنیاد پر ایک دوسرے سے محبت و چاہت تھی۔ یہ ابن عباس کا قول ہے۔

سوم: وہ عہد و پیمان جنھیں وہ اپنے درمیان انجام دیتے تھے۔ یہ بھی ابن عباس کا قول ہے۔

چہارم: ان کے اسباب و وسائل سے ان کے وہ اعمال مراد ہیں جن سے وہ وابستہ تھے۔ یہ ابن زید اور سُدی کا قول ہے۔

پنجم: ان کے اسباب کا منقطع ہونے سے ان کی نجات کے اسباب کا منقطع ہونا مراد ہے۔ یہ ابوعلی کا قول ہے۔

ظاہر آیت میں یہ جملہ احتمالات پائے جاتے ہیں، لہٰذا اسے عموم پر حمل کرنا زیادہ مناسب ہے گویا: اس

طرح کہا جا رہا ہے تمام اسباب منقطع ہو گئے جن سے ان کے لیے وابستہ ہونا ممکن تھا۔ انھوں نے مختلف اسباب مقام و مرتبہ، قرابت، محبت، حلف اور عہد و پیمان کے ذریعہ دنیا میں استفادہ کیا تھا اور یہ مایوسی کی انتہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا. پیروی کرنے والے کہیں گے: لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً. یعنی دنیا میں اور مکلف ہونے کی صورت میں واپسی کا پھر سے موقع دیا جاتا۔

فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ. یعنی دنیا میں پیشواؤں سے (ہم بیزاری کرتے) كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا (جس طرح یہ ہم سے بیزاری) آخرت میں کر رہے ہیں۔ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ (اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں کے سامنے اس طرح لائے گا کہ وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں گے)

اول: ان گناہوں سے مراد جن پر یہ لوگ حسرت کریں گے وہ ہیں جنہیں انھوں نے انجام نہیں دیا ہوگا۔ یہ ربیع اور ابن زید کا قول ہے۔ اسی کو جبائی اور بلخی نے بھی اختیار کیا ہے۔

دوم: جس اطاعت پر حسرت کریں گے اس سے وہ اطاعت فرماں برداری ہے جس پر انھوں نے عمل نہیں کیا ہوگا اور اسے ضائع و برباد کر دیا ہوگا۔ یہ سُدی کا قول ہے۔

سوم: جس کی روایت ہمارے علماء نے امام باقر علیہ السلام سے کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: وہ شخص ہے جو مال کماتا ہے مگر اس سے کار خیر نہیں کرتا، پھر اس کا وارث شخص وارث بن جاتا ہے جو اس مال کے ذریعہ عمل خیر انجام دیتا ہے، پس پہلا کمائی کرنے والا اسے دوسرے کی میزان میں حسرت سے دیکھے گا۔

چہارم: خداوند عالم انھیں اس ثواب کی مقدار (اندازے اور پیمانے) دکھائے گا جو ان کے لیے پیش کئے گئے اگر وہ (ان کی) اطاعت کرتے۔ پس وہ لوگ اس ثواب کے چھوٹ جانے پر حسرت کریں گے۔

آیت میں مذکورہ تمام وجوہات کا احتمال ہے۔ اولیٰ اور بہتر ہے کہ اسے عموم پر حمل کیا جائے۔

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ. یعنی (آتش جہنم میں) ہمیشہ رہیں گے۔ آیت میں خداوند عالم نے بیان فرما دیا ہے کہ یہ لوگ ایسے وقت میں حسرت کریں گے جس میں حسرت ان کے لئے مفید نہیں ہوگی، یہ چیز رغبت دلا رہی ہے کہ اس چیز پر حسرت کی جائے جس میں حسرت کرنا مفید ہو۔

بیشتر مفسرین جیسے ابن عباس وغیرہ کے نزدیک یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ لوگ اطاعت و معصیت پر قادر تھے اس لیے کہ یہ چیز معقول نہیں ہے کہ انسان ایسی چیز کے ترک کرنے پر حسرت کرے جس سے اس کا جدا کرنا ممکن نہ ہو یا ایسے فعل پر (حسرت کرے) جس

کا بجالانا اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ انسان اس بات پر حسرت نہیں کرتا کہ وہ آسمان میں پرواز کرتا اس لیے کہ اس کے لیے آسمان میں پرواز کرنا ممکن نہیں ہے۔

❁❁❁❁❁

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

قرائت:

نافع، ابوعمرو اور ابوبکر نے سوائے بُرجمی کے ہر جگہ خُطْوَات طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے طاء کو ضمہ (پیش) کے ساتھ پڑھا ہے۔

قرائت شواذ میں حضرت علی علیہ السلام سے خُطُوءات دو ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ اور ابوسماک سے خَطوات خاء اور طاء کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔

حجت:

جو اسم فُعْلَة کے وزن پر ہوتا ہے اس کی جمع میں تثقیل یعنی دو حروف مضموم ہوتے ہیں جیسے غُرْفَة سے غُرُفَاء، حُجْرَة سے حُجُرات اس لئے کہ حرکت دینا اسم اور صفت کے درمیان جدائی ڈالنے والی ہوتی ہے۔

اور جن قراء نے خُطْوات طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے تو انہوں نے ضمہ کو نیت میں رکھا ہے اور کلمہ کو آسان اور ہلکا بنانے کی خاطر ساکن کر دیا ہے اور انہوں نے خاء اور طاء کو ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے گویا انہوں نے اس کے ساتھ خَطِيْئَة والا طریقہ اپنایا ہے اور اس کے ساتھ بھی وہی کام کیا ہے جو خَطأً کے ساتھ کیا ہے۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ ابوحاتم نے کہا: واؤ کے فتحہ میں اشباع کا ارادہ کیا ہے اور وہ ہمزہ بدل دیا ہے اور جنہوں نے خاء اور طاء کو فتحہ دیا ہے تو وہ خَطْوَة کی جمع ہے جیسے ثَمْرَة سے ثَمَرات ہے۔

الفاظ و معانی

اَکَل کے معنی چبا کر نگلنا ہے۔ سونے اور موتی اور اسی کے مانند کسی اور چیز کے نگل جانے کو حقیقت میں اَکَل نہیں کہا جاتا۔

بندوں کے جائز کاموں کو حَلَال کہا جاتا ہے اور اس کی نظیر مباح ہے اور اس کی اصل حل (کھولنا) عقد (باندھنا) کی ضد ہے اور مباح کو حلال اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے حرام و ناجائز کی گرہ کو کھول دیا جاتا ہے۔

طَیِّب ملاوٹ اور تکدّر سے خالص چیز کو کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ پاک و لذیذ ۲۔ پاک و جائز ۳۔ پاک و پاکیزہ، لغوی معنی لذیذ کے ہیں مگر یہ کہ اس کی صفت بطور تشبیہ طاہر و جائز سے بیان کی گئی ہے، اس لیے کہ جس چیز سے عقل یا شریعت روکتی ہیں وہ اس طرح ہے جس سے نفس انحراف و روگردانی کرتا ہے اور جو چیز اس کی طرف دعوت دیتی ہے اس کے برعکس ہے۔ طَیِّب خَبِیْث کے برعکس ہے۔

خُطُوَة چلنے والے کے دو قدم کے درمیانی فاصلہ کو کہتے ہیں۔ خُطُوَاتُ الشَّیْطَان شیطان کے آثار ہیں۔ یعنی نشانات قدم۔

عَدُوٌّ خیر سے شر کی جانب لے جانے والا ہے۔ ولی اس کی ضد ہے۔

ترکیب:

حَلَالًا مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی کُلُوْا شَیْئًا حَلَالًا مِمَّا فِی الْاَرْضِ میں حرف مِنْ، کُلُوْا سے متعلق ہے یا محذوف سے متعلق ہے کہ اس کے ساتھ محلاً منصوب ہے حال ہونے کی بنا پر اور اس میں عامل کُلُوْا ہے اور اس کا ذوالحال حَلَالًا ہے۔ طَیِّبًا صفت بعد از صفت ہے۔

شان نزول:

ابن عباس سے روایت ہے: یہ آیت ثقیف، خزاعہ و بنی عامر بن صعصعہ اور بنی مدلج (قبیلوں) کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انھوں نے زراعت، چوپاؤں، بَحِیرہ (وہ ناقہ جو پانچ بار جنم دے) سَائِبَه (جب ناقے کے دس بچے ہوں) وَصِیلَه کا تعلق بھیڑ بکریوں سے ہے۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۱۰۳)۔

خداوند عالم نے انھیں اس چیز سے نہی فرمائی ہے۔

تفسیر:

شیطان کی چالیں

جب خداوند عالم نے توحید واہل توحید، شرک اور اہل شرک کا ذکر فرمایا تو اس کے بعد دونوں فریقوں (گروہوں کو اس کی پیروی سے حاصل ہونے والی) نعمت واحسان کا ذکر فرمایا پھر انھیں شیطان کی پیروی کرنے سے نہی فرمائی (چونکہ شیطان کی پیروی) میں اس کی نعمتوں سے انکار اور کفران نعمت ہے۔ ارشاد فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ یہ خطاب فرزندان آدم کے مکلفین کے لیے عام ہے۔ كُلُوْا، یہ لفظ امر وحکم ہے، جس کے معنی اباحت ومباح ہونے کے ہیں۔ مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا، جب خدا نے کھانا مباح فرمایا تو اس کی وضاحت بھی فرمادی کہ اس کا کیسا ہونا واجب ہے۔ اس لیے کہ کھائی جانے والی اشیاء حرام وحلال (دونوں) ہی ہوتی ہیں۔ حرام کھانے میں ہلاکت اور حلال کھانے سے عبادت پر تقویت حاصل ہوتی ہے۔ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ دونوں کو یکجا کردیا تاکید کے سبب۔

کہا گیا ہے: اس کے معنی ہیں بہت جلد اور آنے والے وقت میں اس چیز کے ذریعہ تم پاکیزگی اور لذت حاصل کروگے۔

وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو یعنی شیطانی کام کی پیروی نہ کرو۔ ابن عباس سے روایت ہے۔

کہا گیا ہے: ان کی خطائیں اور غلطیاں ہیں۔ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: تمھارا ان کی پیروی کرنا ہے۔ یہ سُدی کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: ان کے نقش قدم ہیں یہ خلیل کا قول ہے۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت کی گئی ہے: شیطان کے نقش قدم طلاق پر قسم کھانا اور نافرمانی پر نذر کرنا ہے اور ہر وہ قَسَم جو اللہ کے علاوہ ہو۔

قاضی نے بیان کیا ہے: شیطانی وسوسے اور تصورات مُراد ہیں۔

ماوردی نے بیان کیا ہے: جس چیز کو لوگ نافرمانی سے (دوسری) نافرمانی تک منتقل کرتے ہیں یہاں تک کہ تمام نافرمانی اور گناہوں کو شامل کر لیتے ہیں۔ نقش قدم (دو قدم کے درمیان دوری) سے لیا گیا ہے جسے

ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کیا جاتا ہے تاکہ اپنے مقصد تک پہنچا جاسکے۔

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ، یہ عداوت کا مظہر ہے اس لیے کہ وہ اس امر کی دعوت دے رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے خلاف ہے۔ لوگوں نے ان چیزوں کے کھانے اور منافع میں جس میں کسی کے لیے نقصان نہیں ہے اختلاف کیا ہے بعض ممانعت کے قائل ہیں۔ بعض کا نظریہ مباح ہونے کا ہے۔ اسی چیز کو سید مرتضیٰ قدس اللہ روحہ نے اختیار کیا ہے۔ بعض نے دونوں امور کے درمیان توقف کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ آیت کھائی جانے والی ہر اشیاء کی اباحت پر دلیل ہے مگر یہ کہ اس کے حرام ہونے پر دلیل قائم ہو جائے۔ اس طرح آیت یہ عقل کی تائید میں وارد ہوئی ہے۔

❀❀❀❀❀

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾
وہ تمھیں بدی اور فحش باتوں کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے خلاف وہ باتیں کہو جو تمھارے علم میں نہیں ہیں۔

الفاظ ومعانی:

شیطان کی طرف سے امر اس کا کسی فعل کی طرف بلانا ہے لیکن لغت میں امر قائل کا اپنے سے کم مرتبہ کے لیے اِفْعَلْ (یہ کام کرو) کہنا ہے اگر امر اور حکم دینے والا اس حکم دی جانے والی چیز کا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے صیغہ اِفْعَلْ (یہ کام کرو) کے ذریعہ فعل کی دعوت دینا ہے۔

سُوْٓء ہر قبیح اور برا فعل ہے جس سے عقل یا شریعت ممانعت کرتی ہیں۔ اسی طرح جس چیز سے نفس نفرت کرتا ہے اسے بھی سوء کہتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ قبیح کو سوء اسکے برے انجام کے سبب کہتے ہیں چونکہ انسان برے فعل سے فوری طور پر لطف اندوز ہوتا ہے۔

فَحْشَآء، فَاحِشَة، قَبِيْحَة اور سَيِّئَة باہم مشابہ ہیں۔ یہ سَرَّآء اور ضَرَّآء کے مانند مصدر ہے، ہر وہ شخص جو اپنی حد سے تجاوز کرے وہ فَاحِش ہے اور اَفْحَشَ الرَّجُلُ اس وقت کہتے ہیں جب وہ کوئی فحش کام بجا لائے اور جو شے بھی حق کے موافق نہ ہو وہ فاحشة ہے۔ ارشاد رب: اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ

مُبَيِّنَة (سورۂ طلاق، آیت ا) مگر یہ کہ وہ کسی شرم ناک کام کا ارتکاب کریں۔اس کا مفہوم ہے کہ طلاق دینے والے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر باہر نکلنا۔

قَوْل ایسا کلام جو حکایت کا اظہار کرتا ہے۔

تفسیر:

شیطان برائیوں کا حکم دیتا ہے

خداوند عالم نے شیطان کا ذکر کرنے کے بعد اس چیز کی وضاحت فرمادی جو دین کی مخالفت کی جانب دعوت دیتی ہے۔ارشاد فرمایا: اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ، وہ تمھیں بدی کا حکم دیتا ہے یعنی گناہوں کی طرف بلاتا ہے۔یہ سُدی اور قتادہ کا قول ہے۔جو اس کے انجام دینے والے کے لیے بری یعنی ضرر رساں ہوتی ہے۔یہ معنی میں پہلے کے مانند ہے۔وَالْفَحْشَآءِ، کہا گیا ہے کہ زنا مراد ہے۔کہا گیا ہے کہ سُوْٓء ایسی بُرائی ہے جس کا کوئی شرعی حد اور سزا متعین نہیں ہے اور فحشاء وہ برائی ہے جس کی حد (سزا) شریعت میں متعین ہے۔یہ ابن عباس کا قول ہے۔

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کا اللہ کے لیے مثل اور اولاد قرار دینا اور انھیں اُس سے نسبت دینا فواحش ہیں۔یہ ابو مسلم کا قول ہے۔اس سے تمام فاسدہ مذاہب اور باطل عقائد مراد ہیں۔

اس بارے میں سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ شیطان ہمیں کس طرح حکم دیتا ہے جب کہ ہم اسے نہ تو دیکھتے ہیں نہ ہی اس کا کلام سنتے ہیں؟

اس کا جواب ہے: اس کے امر اور حکم کے معنی ہیں (معصیت) کی طرف اس کی دعوت دینا ہے جس طرح آپ کہتے ہیں میرا نفس مجھے ایسا حکم دیتا ہے یعنی اس کی طرف بلاتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے: شیطان درحقیقت نافرمانی کا حکم دیتا ہے جسے انسان اپنے نفس کے ذریعہ پہچانتا ہے، بعض اطاعتوں کو خود پر بوجھ سمجھتا ہے اور بعض گناہوں کی طرف اپنے نفس کو مائل پاتا ہے۔وسوسہ مخفی اور پوشیدہ آواز ہے جو شیریں وسوسے ہیں جنھیں شیطان انسان کے کانوں میں نہایت مخفی آواز میں پہونچاتا ہے۔

جب یہ کہا جائے کہ کس طرح پہچانا جائے کہ کس چیز کو انسان کے (کانوں تک) شیطان نے پہونچایا

ہے یا نفس کو اس کی دعوت دی ہے؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ دونوں کے درمیان شناخت نہ کرنے میں انسان پر کوئی حرج و زحمت نہیں ہے۔ جب اس کے نزدیک ثابت ہو گیا کہ شیطان اسے گناہوں کا حکم دیتا ہے تو ممکن ہے جو بھی اس طرح جنس کی (معصیت و نافرمانی) سے ہوگی وہ شیطان کی طرف سے ہوگی، وہ شیطان کہ جس کی عداوت انسان سے ثابت ہو چکی ہے۔ اطاعت کا انجام دینا اس پر گراں ہونا زیادہ رغبت کا سبب ہوگا اور نفس کا معصیت کی طرف مائل ہونے کے باوجود اس کا ترک کرنا شیطان کی مخالفت ہے جو کہ انسان کا دشمن ہے۔

❀❀❀❀❀

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ اللهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَآءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو چلتے ہوئے دیکھا ہے، چاہے ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور ہدایت یافتہ نہ ہوں (پھر بھی وہ ان ہی کی پیروی کیے جائیں گے)

الفاظ و معانی:

أَلْفَيْنَا یعنی ہم نے پایا۔ اب اور والد ایک ہی ہیں۔

اِهْتِدَاء کے معنی علم کے ذریعہ راہ حق کو پالینا ہے۔

ترکیب:

أَوَلَوْ میں واؤ عاطفہ ہے اس پر ہمزہ استفہام داخل ہوا ہے اس سے مراد توبیخ و سرزنش ہے اس واؤ کے مانند أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ، أَفَلَمْ يَسِيرُوا بھی ہے۔ ہمزہ استفہام کو توبیخ کے لئے قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایسے اقرار کا تقاضا کرتا ہے جو اس کے لئے فضیحت و رسوائی کا باعث ہو جس طرح استفہام اس چیز کی خبر دینے کا تقاضا کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہے۔

اس طرح کے کلام میں واؤ اس لئے داخل ہوا ہے کہ جب آپ یہ کہیں گے اس کا اتباع کرو چاہے تمہیں

نقصان ہی کیوں نہ پہونچائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ ہر حال میں اس کا اتباع کرو
اَتَتَّبِعُهُ لَوْ ضَرَبَكَ ویسا نہیں ہے اس لئے کہ یہ خاص ہے اور عام وہ ہے۔ واؤ اس معنی کے لئے داخل ہوا ہے
(کیا تم اس کا اتباع کرو گے اگر چہ وہ تم کو نقصان پہونچائے)

شان نزول:

ابن عباس سے روایت ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو دعوت اسلام دی۔ انھوں نے کہا: بلکہ ہم اس چیز کا اتباع و پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آبا واجداد کو پایا ہے، وہ ہم سے زیادہ واقف تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

ضحاک کی روایت ہے جسے انھوں نے آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کفار قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

تفسیر:

آباء واجداد کی اندھی تقلید

کفار کا ذکر کرنے کے بعد خداوند عالم نے ان کی تقلید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی اور جو آپ پر قرآن میں نازل ہوا تھا کے انکار کے بارے میں کفار کی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اور جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ضمیر کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ اس مَنْ کی طرف لوٹتی ہے جو اللہ کے قول مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (سورۂ بقرہ، آیت ۱۶۵) میں ہے (جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں) اور وہ عرب کے مشرکین ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاس، مخاطب سے غائب کی جانب عدول ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (سورۂ یونس، آیت ۲۲؛ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر شاداں و فرحاں مصروف سفر تھے کہ یکا یک باد مخالف کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے آنے لگے...)

اور کہا گیا ہے کہ ضمیر هُمْ کفار کی طرف پلٹ رہی ہے، اس لیے انھیں کا ذکر چل رہا ہے اور انھیں کی

جانب پلٹنا بھی مناسب وبہتر ہے، اگر چہ ان کا ذکر نہ بھی ہو رہا ہو اس لیے کہ ضمیر معلوم کی جانب بھی پلٹتی ہے جس طرح مذکور کی طرف پلٹتی ہے۔ ان سے کہنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان ہیں۔

اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللهُ (اتباع کرو) قرآن اور اسلامی احکام کی تحریم اور تحلیل (حرام اور حلال) کے بارے میں بھی کہا گیا ہے۔ قَالُوا، یعنی کفار نے کہا: بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ، ہم نے پایا۔ آبَاءَنَا (اپنے باپ دادا کو) بتوں کی پرستش کرتے ہوئے۔ خطاب مشرکین سے ہے یا یہود سے وابستہ ہے۔ جب خطاب یہود سے ہو۔ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا، یعنی اگر چہ ان کے آباواجداد امور دین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے وَلَا يَهْتَدُونَ، یعنی راہ حق اختیار نہیں کرتے۔ جس کے معنی ہیں کہ اگر تمھارے لیے ظاہر وعیاں ہو جائے جس چیز کی معرفت ان کے لیے ضروری ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ کیا تم پھر بھی ان کا اتباع اور پیروی کرو گے یا ان کی پیروی سے روگردانی کرو گے؟ پس اگر درست ہے کہ ان سے روگردانی واجب ہے تو واضح ہو گیا کہ دلیل کی پیروی واجب ہے نہ کہ ان لوگوں کی۔

❀❀❀❀❀

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾
اور ان کافروں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چرواہا، جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ جانور سوائے اس پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتے۔ یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

الفاظ ومعانی:

مَثَل ایسا قول رواں جو اس بات پر دلالت کرے کہ دوسرا راستہ، پہلا راستہ ہی ہے۔

نَعِقَ الرَّاعِي بِالْغَنَمِ، چرواہے کا بھیڑوں کو چلا کر بلانا۔

النَّاعِقَانِ: جوزا کے دوستاروں کو کہا جاتا ہے۔

دُعَا: پکارنا اور کسی کام کی انجام دہی کا مطالبہ کرنا۔ یہ امر کے مانند ہے۔ دونوں میں رتبہ کا فرق ہے۔

نِدَاء: مصدر ہے۔ نَادَى، مُنَادَاة، نِدَاء، الدُّعَاء اور السُّوَال ہم معنیٰ ہیں۔

نِدَاءٌ تری کو کہتے ہیں۔ نَادَاہُ کے معنیٰ ہیں اسے بلند آواز میں پکارا۔

تفسیر:

کافروں کی مثال

خداوند عالم نے کافروں کی انھیں توحید کی طرف دعوت دینے والوں کی قبولیت سے انکار اور ان کے تقلید پر باقی رہنے کی مثال پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ، اور ان کافروں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے صدا دیتا ہے۔

بِمَا لَا يَسْمَعُ، اور وہ جانور نہیں سنتے۔ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً سوائے پکار اور آواز کے۔

کلام کی تقدیر و تاویل میں اختلاف ہے جس کی کئی وجہیں ہیں:

اول: آپؐ کے کافروں کو ایمان کی طرف دعوت دینے کی مثال جانوروں کو پکارنے اور صدا دینے والے کی طرح ہے جو سمجھتے نہیں فقط آواز اور صدا سنتے ہیں، جس طرح جانوروں کو چرواہے کے بلانے کے سننے کے علاوہ حاصل نہیں ہوتا معنی سمجھ میں نہیں آتے، اسی طرح کافروں کو آپؐ کے انھیں ایمان کی دعوت دینے سے سننے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ چونکہ وہ آپؐ کی بات ماننے سے انحراف کرتے ہیں اور اس میں غور و فکر کرنے سے اعراض کرتے ہیں گویا وہ اس کے مانند ہیں جو نہ تو عقل سے کام لیتا ہے نہ ہی کچھ سمجھتا ہے۔

یہ معنی ہیں ابن عباس، حسن، مجاہد اور قتادہ کے قول کے۔ اسی کی روایت ہے امام باقر علیہ السلام سے۔ اسی چیز کو اختیار کیا ہے جبائی، رمانی اور طبری نے۔

دوم: اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کافروں کی مثال اور ہماری مثال یا کافروں کی مثال یا اے محمدؐ آپ کی مثال اس کے مانند ہے جو آواز کے سوا کچھ نہیں سنتا ہے یعنی ان جانوروں کے مانند جن کو پکارا جاتا ہے (صدا دی جاتی ہے، بلایا جاتا ہے) اور پکارنے والا جانوروں کو چرانے والا ان سے کلام کرتا ہے جو سنتے نہیں ہیں، دوسری مثال کو حذف کر دیا گیا اور پہلی مثل پر اکتفا کی گئی جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ۔ (سورۂ نحل، آیت ۸۱) (اور تمھیں ایسی پوشاکیں عطا کیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں یعنی گرمی اور سردی دونوں کا ارادہ کیا ہے)

اس سے مراد ہے کہ ہدایت یافتہ ہوں یا گمراہ ہوں امر کے واضح ہونے کے سبب ہدایت کے ذکر پر

اکتفا کی گئی۔ یہ اخفش اور زجاج کا قول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں دو چیزوں کی دو چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے، ایمان کی طرف دعوت دینے والے کی تشبیہ راعی (یعنی چرواہے اور جانوروں کے مالک سے) اور مدعوین (جنہیں دعوت دی گئی ہے) کفار کی دعوت جانوروں سے جسے حذف کیا گیا ہے وہ ایجاز و اختصار کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ پہلی صورت میں مدعو کا ذکر باقی رکھا گیا ہے اور دوسری میں داعی کے ذکر کو۔

سوم: اس کے معنی ہیں کافروں کے ان کے بتوں کو پکارنے کی مثال راعی (چرواہا) کے جانوروں کے پکارنے کی مانند ہے کہ انھیں آؤ (یا آجاؤ) یا اسی کے مانند کہہ کر پکارتا اور بلاتا ہے۔ پس جس طرح جانوروں کو بلانا اور پکارنا جہالت شمار ہوتا ہے لہٰذا پتھروں (بتوں) کو پکارنا اس سے بڑی جہالت ہے۔ اس لیے کہ جانور پکار اور صدا کو سنتے تو ہیں اگرچہ سمجھتے نہیں، جس کے معنی ہیں بتوں کو سماعت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ یہ ابوالقاسم بلخی وغیرہ کا قول ہے۔

چہارم: کافروں کی مثال ان کے بتوں کو پکارنے میں جو نہ عقل سے کام لیتے ہیں نہ ہی سمجھتے ہیں اس کے مانند ہے جو نہ سننے والے کو پکارتا اور صدا دیتا ہے مثل بھیڑوں کے علاوہ اور اس کے مانند کی طرف پلٹے گی جو سنتے تو ہیں (لیکن) سمجھتے نہیں اس سبب سے يَنْعِقُ کے ذریعہ دُعا اور نِدا کو منصوب قرار دیا ورنہ کلام کی تاکید کے لیے مُلغیٰ (بے عمل) ہوتا۔

پنجم: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کفر اختیار کرنے والوں کی مثال کے معنی اس بھیڑ کی مانند ہوں گے جو پکارنے والے کی آواز نہیں سنتی۔ خداوند عالم نے دوسری مثال کی اضافت ونسبت نَاعِقِ (پکارنے والے) کی جانب دی ہے جو کہ معنی میں مَنْعُوقٌ بِهٖ (جسکے ذریعہ پکارا جا رہا ہے) کی طرف مضاف (اضافت) ہے۔ عربوں کے نظریہ کے مطابق (قانون) القلب میں۔

پھر خداوند عالم نے ہجو اور مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ، یعنی حجت و دلیل کے سننے سے بہرے ہیں، حجت سے کلام کرنے سے گونگے اور حجت و دلیل دیکھنے سے اندھے ہیں۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور سُدی کا قول ہے۔ اس سے زیادہ تفصیلی بیان سورہ کی ابتدا میں گذر چکا ہے۔

فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ، چونکہ یہ لوگ اپنی عقلوں سے کام نہیں لیتے گویا اس منزل میں ہیں جیسے ان کے پاس عقل ہی نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀❀

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں عطا کی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم صحیح معنی میں اس کے عبادت گذار ہو۔

الفاظ و معانی:

شُکر نعمت کا اعتراف ہے تعظیم کے ساتھ۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

اول: نعمت کا اعتراف کرنا۔ جسے نعمت عطا کی گئی ہے جب وہ اس نعمت پر اعتقاد رکھتے ہوئے اسے یاد رکھے۔

دوم: نعمت کی جلالت و عظمت کے مطابق اطاعت کرنا۔ پہلی صورت میں ذکر ہر حالت میں لازم و ضروری ہے۔ دوسری صورت میں اس حالت میں لازمی ہے جس میں قیام حق کی احتیاج ہو، البتہ عبادت شکر کی قسم ہے بلکہ شکر کی آخری حد ہے جس کے بعد کوئی شکر نہیں ہے۔ جس سے خضوع (تذلّل و انکساری) وابستہ ہیں۔ عبادت کا اللہ کے سوا کوئی سزاوار نہیں ہے اس لیے کہ عبادت نعمتوں کی اصل کا استحقاق رکھتی ہے، جو حیات، قدرت، شہوت اور طرح طرح کی منفعتیں جو نفع کے اندازے کے مطابق ہوں۔ جو مُنعِم کی اس نعمت کے ہم پلہ اور برابر نہیں ہے اسی لیے خداوند عالم نے اس کے استحقاق کو مخصوص کیا ہے۔

ترکیب:

مَا رَزَقْنٰكُمْ موصول و صلہ ہے۔ صلہ سے موصول کی جانب پلٹنے والی ضمیر محذوف ہے اصل میں اس طرح ہے: وَمَا رَزَقْنَاكُمُوْهُ بِهٖ۔

جواب شرط محذوف ہے گویا اس طرح ہے: اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ فَكُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ ۔ (اگر تم اس کی بندگی کرتے ہو تو طیبات میں سے کھاؤ جو اس نے تمہیں روزی دی ہے اور اس کا شکر ادا کرو)

تفسیر:

طیبات

پھر خداوند عالم نے مومنین کو خطاب کرتے ہوئے ان پر ظاہری نعمت اور واضح احسان کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا ، بظاہر امر ہے مگر اباحت مراد ہے، اس لیے کہ کھانے کی چیزیں عبادت گذاری میں داخل نہیں ہیں۔ بیان کیا گیا ہے دو وجہوں سے امر کیا گیا ہے:

اول: حلال کھانا۔

دوم: ضرورت کے وقت کھانا اپنے آپ سے ضرر و نقصان کو دور کرنے کے لیے کھانا کھانا۔ قاضی نے کہا ہے: یہ صورت بعض اوقات پیش آتی ہے آیت اس (صورت) پر منحصر نہیں ہے، اباحت پر اس کو حمل کیا جائے گا۔ مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ، یعنی جس رزق سے تم لذت اندوز ہوتے ہو اور پاکیزگی اختیار کرتے ہو۔ آیت میں خبیث (نجس) چیزوں کے کھانے سے نہی کی گئی ہے۔ بلخی وغیرہ کے قول میں گویا کہا جا رہا ہے پاک چیز کھاؤ نہ کہ خبیث و نجس چیز جیسا کہ کہا جائے حلال کھاؤ۔ یہ حرام کے کھانے کی ممانعت پر دلیل ہے۔ یہ درست ہے جس کی ضد قبیح (بری) ہے جو کہ مفہوم ہے، لیکن اس کے علاوہ (صورت میں) اس کی ضد قبیح پر دلالت نہیں کرتی جس طرح کہنے والا کہے (زید کا مال کھاؤ) اس بات پر دلالت کرنا کہ زید کے مال کے علاوہ کھانا حرام ہو، اس لیے کہ کبھی خاص طور پر کسی چیز کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے علاوہ (بیان حکم) دوسرے بیان پر موقوف و منحصر ہوتا ہے۔ اس طرح نہیں ہے جو اس کی ضد ہو وہ قبیح ہو اس لیے کہ کبھی بیان کے ذریعہ اس کی ضد کی قباحت بیان کرنا ہوتی ہے۔

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ، خداوند عالم نے ہمیں اپنے انعام سے آگاہ فرمایا ہے، جس میں ہمارے لیے اس نے لذیذ رزق قرار دیا، ہمیں شکر کا حکم دیا اس لیے کہ انعام تقاضائے شکر کرتا ہے۔

اس کا ارشاد: اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ، یعنی اگر تم اس علم کے ساتھ کہ اس نے تمھیں اپنی نعمتوں سے نوازا ہے اس کی عبادت میں اس کے لیے مخلص ہو۔ اس مقام پر شرط ذکر کی گئی ہے جو دلیل میں غالب آنے کے عنوان سے ہے، جس میں حسنِ بیان اور تلخیص کلام ہے۔ اگر تم پر اللہ کی عبادت واجب ہے۔ اس لئے کہ وہ تمھارا پروردگار ہے پس اس کا تم پر شکر بھی واجب ہے اس لیے کہ وہ تمھارا منعم و محسن ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اللہ کی طرف سے اگر تم پر کوئی پابندی ہے تو یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو تو وہ قانون شکنی کیے بغیر اور حد سے تجاوز نہ کرتے ہوئے کوئی چیز کھالے تو اس پر کسی قسم کا گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

قرائت:

ابوجعفر نے پورے قرآن میں اَلْمَيِّتَةَ مشدد پڑھا ہے۔ اہل حجاز، اہل شام اور کسائی نے فَمَنُ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ میں نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ان میں سے ابوجعفر نے مَنِ اضْطِرَّ میں طاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے نون کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

اَلْمَيْتَة کی اصل اَلْمَيِّتَة ہے۔ دو یاء اور کسرہ کے ثقیل ہونے کی بنا پر تخفیف کی خاطر دوسری یاء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ قرأت میں اجود (زیادہ بہتر) یہ ہے کہ بغیر تشدید کے پڑھا جائے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ میں نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھنا تابع قرار دینے کی بنا پر جس طرح اُنْصُرُوْا میں ہمزہ وصل کو ضمہ دیا گیا ہے اور نون کو زیر دینا تو التقاء ساکنین کے لئے حرکت کا قانون ہی یہ ہے۔

ابوجعفر کی قرأت کہ انہوں نے طاء کو زیر کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ اُضْطُرَّ کی اصل اُضْطُرِرَ ہے۔ راء کو ادغام کی وجہ سے ساکن کر کے اس کی حرکت کو اس سے پہلے والے حرف طاء کو دے دیا۔ اس طرح وہ اُضْطُرَّ ہو گیا ہے۔ حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ راء کو ساکن کرنے کے بعد اس کی حرکت کو نقل نہ کیا جائے

اس لئے کہ طاء اپنی اصل حرکت پر باقی ہے۔

الفاظ ومعانی:

اِھۡلَال یعنی ذبح کرتے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم کو زور سے پڑھنا۔ مشرکین جانور ذبح کرتے وقت بتوں کا نام لیتے تھے جب کہ مسلمان اللہ کا نام لیتے ہیں۔

ھِلَال: غُرَّۃُ الْقَمَر چاند کا پہلی تاریخ کو نظر آنا۔ اس لئے کہ لوگ چاند دیکھ کر تکبیر کہتے ہوئے اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہیں اور احرام پہننے والا احرام پہن کر مُھِلّ ہوتا ہے وہ یہ کہ لبیك اللّٰھم لبیك کہہ کر اپنی آواز بلند کرتا ہے اسے تَلْبِیہ کہتے ہیں۔

اِسۡتَھَلَّ الصَّبِی اس وقت کہتے ہیں جب بچہ پیدا ہونے کے بعد روتا ہے۔

اِنۡھِلَالُ الۡمَطَر: بارش کا شدت سے برسنا ہے۔ اِھۡلَال چاند دیکھ کر لوگوں کا تکبیر کے ذریعہ آواز بلند کرنا ہے۔ مُحرم حالت احرام میں تلبیہ کے ذریعہ آواز بلند کرتا ہے۔

ترکیب:

اِنَّمَا اپنے بعد ذکر ہونے والے فعل کے اثبات اور دیگر چیزوں کی نفی (یعنی حصر) کا فائدہ پہونچاتا ہے جیسے شاعر کا یہ مصرعہ: وَاِنَّمَا عَنۡ اَحۡسَابِھِمۡ اَنَاوَ مِثۡلِیۡ۔ (صرف اور صرف میں اور میرا مثل ہی ان کے حسب ونسب کے مقابلہ میں کافی ہے)

اِنَّمَا کسی شے کے اثبات اور اس کے علاوہ کی نفی کے لئے ہے اور اس سے پہلے اِنَّ تاکید کے لئے ہے اور اِنَّ سے مَا کا مل جانا بھی تاکید کے لئے ہے۔ اِنَّ اس شے کے اثبات کی تحقیق کے پہلو پر تاکید کرتا ہے اور مَا اس کے علاوہ کی نفی کے پہلو پر زور دیتا ہے جب آپ یہ کہیں گے کہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ (میں صرف اور انسان ہوں) تو گویا آپ نے یہ کہا ہے: مَا اَنَا اِلَّا بَشَرٌ۔ (میں کچھ نہیں ہوں سوائے انسان کے)

اگر یہ مَا اَلَّذِیۡ کے معنیٰ میں ہوتا تو اسے اِنَّ سے الگ لکھا جاتا اس کی مثال یہ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا اللہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ، یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، اِلَّا اِلٰہٌ وَّاحِدٌ، نیز اِنَّمَا اَنۡتَ نَذِیۡرٌ، یعنی لَا نَذِیۡرٌ اِلَّا اَنۡتَ۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب اَلۡمَیۡتَۃَ میں صرف نصب جائز ہے اس لئے کہ مَا کَافَّہ ہے اور اگر مَا اَلَّذِیۡ کے معنیٰ

میں ہوتا تو اَلْمَیْتَةُ کو رفع دینا جائز ہوتا۔ غَیْرَ بَاغٍ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اس کی اصل لَا بَاغِیًا وَّ لَا عَادِیًا ہے یہاں پر اِلَّا، غَیْرَ کی جگہ پر نہیں آسکتا ہے اس لئے کہ ہم نے بیان کیا کہ غیر نفی کے معنیٰ میں ہے اور اس لئے کہ اس پر لَا کے ذریعہ عطف کیا گیا ہے اور اِلَّا کے معنیٰ دراصل کل میں سے بعض کے لئے مخصوص ہونا ہے اور یہاں پر ایسا کلام نہیں ہے کہ جس سے بعض کو مخصوص کیا جائے۔

تفسیر:

خبائث

خداوند عالم نے طیبات (پاکیزہ چیزوں) کی اباحت کے بعد محرمات کی حرمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ، بے شک تم پر مردار حرام ہے۔ یعنی جانوروں میں سے جو طبعی موت مرجائے اس کا گوشت کھانا حرام ہے۔

وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ، اور خون اور سور کا گوشت بھی کھانا حرام ہے) گوشت کا مخصوص طریقے سے ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ وہ بڑا حصہ اور مقصود ہوتا ہے ورنہ سب کا سب حرام ہے۔

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ، اور جسے غیر خدا کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ کہا گیا ہے کہ اس میں قول ہیں:

اول: جس پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا جائے۔ یہ ربیع اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔

دوم: جو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے۔ یہ مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ، (جو شخص) ان اشیاء کے کھانے پر بھوک کی وجہ سے مجبور و ناچار ہو جائے۔ یہ بیشتر مفسرین کا قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ اسے مجبور کیا جائے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ اس کی تقدیر ہے: جو اپنی جان پر بھوک کے سبب ڈرتا ہو اور کھانے کی کوئی اور چیز اس کے پاس نہ ہو جو اس کی جان بچا سکے۔

غَیْرَ بَاغٍ اس میں تین اقوال بیان کیے گئے ہیں:

اول: لذت کا زیادہ خواہش مند نہ ہو اور نہ ہی بھوک مٹانے میں حد سے بڑھنے والا ہو۔ یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے۔

دوم: افراط میں باغی و سرکش نہ ہو اور تقصیر میں ضرورت سے زائد استعمال کرنے والا نہ ہو۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

سوم: امام مسلمین پر بغاوت نہ کرے، نہ ہی حقداروں کے راستے میں نافرمانی سے حد سے بڑھ جائے ، یہی چیز امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام، مجاہد و سعید بن جبیر سے مروی ہے۔ اس قول پر علی بن عیسیٰ نے اعتراض کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم نے خودکشی کو کسی کے لئے بھی مباح نہیں کیا ہے اور اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کرنا یہ بھی حکم دین کے مطابق خودکشی ہے۔ اجازت بھوک کی وجہ سے دی گئی ہے نہ کہ سفر اطاعت کے لیے اور یہ فاسد ہے۔ اس لیے کہ امام کے خلاف بغاوت کرنے والا خود اپنے قتل کا درپے ہوتا ہے، اس طرح جس چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے مباح کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ خود اس کے لیے اپنی جان بچانے کے لیے کسی دوسرے مسلمان کا قتل جائز نہیں ہے، ان کا یہ قول کہ اجازت بھوک کے سبب ہے مطلق طور پر غیر مُسلم ہے، بلکہ اس سے مخصوص ہے جو خود کو اس میں مبتلا نہیں کرتا۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں ہے یعنی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لفظ کو اس لیے ذکر کیا تا کہ بیان کرے کہ یہ اصل میں مباح نہیں ہے بلکہ ضرورت کے سبب رفع حرج ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ، مغفرت و بخشش کو دو امور سے کسی ایک امر کے لیے بیان کیا گیا ہے تا کہ واضح کرے کہ جب وہ معصیت کو بخش دے گا تو جس چیز میں اس نے اجازت دی ہے اس پر مواخذہ نہیں کرے گا یا یہ کہ اس نے اللہ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنے والے کے لیے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ جس کی حرمت پر وہ (پہلے) تھے جب تک خداوند عالم سَآئِبَہ (وہ اونٹنی جو زمانۂ جاہلیت میں نذر وغیرہ کے لیے چھوڑی جاتی تھی یا جس کے دس مادہ بچے ہوں) وغیرہ حرام قرار نہ دیدے۔

❀❀❀❀❀

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۴﴾

جولوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں اور تھوڑے سے مالی فائدہ کے لیے ان کا سودا کر لیتے ہیں وہ دراصل آگ سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا۔ اور نہ ہی انھیں پاکیزہ بنائے گا اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

الفاظ و معانی

اَلْبَطْن اَلظَّهر کے خلاف ہے، پوشیدہ، چھپا ہوا اور اَلْبَطْنُ الْغَامِضُ مِنَ الْاَرْضِ: زمین کا پوشیدہ حصہ اور اَلْبَطْنُ مِنَ الْعَرَبِ دُوْنَ الْقَبِيْلَةِ: اور بطنِ عرب قبیلہ سے نیچے کی شاخ کو کہتے ہیں۔

ترکیب:

اَلَّذِيْنَ اپنے صلہ کے ساتھ اِنَّ کے ذریعہ منصوب ہے اور اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور اس کی خبر مَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ ہے مبتدا اور خبر مل کر جملہ محلاً مرفوع ہے اس لئے کہ اِنَّ کی خبر ہیں۔ اَلنَّارَ، يَأْكُلُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہے (يَأْكُلُوْنَ کا مفعول ہے)

شان نزول:

تمام مفسرین کے نزدیک اس آیت سے اہل کتاب مقصود ہیں۔ مگر یہ کہ ان میں سے بیشتر کا قول یہودیوں کی مختصر جماعت سے متعلق ہے جو ان کے علما ہیں، جیسے کعب بن اشرف، حیی ابن اخطب اور کعب بن اُسَید۔ یہ لوگ اپنے پست اور گھٹیا لوگوں سے ہدایا وصولتے تھے اور امید لگائے بیٹھے تھے کہ پیغمبرؐ یہودیوں میں سے ہوں گے۔ پس جب خداوند عالم نے یہودیوں کے علاوہ پیغمبرؐ کو مبعوث فرمایا تو انھیں اپنے اقتدار و اختیار کے زوال کا خوف دامنگیر ہوا تو انھوں نے اپنی کتاب میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات تبدیل کر دیے اس وقت اس آیت کا نزول ہوا۔

تفسیر:

کتمانِ حق پر دوبارہ مذمت

خداوند عالم نے دوبارہ یہودیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ. جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کئے ہیں یعنی پیغمبرؐ کی صفات اور ان کے بارے میں بشارت۔ یہ ابن عباس، قتادہ اور سُدی کا قول ہے۔

کہا گیا ہے کہ انھوں نے احکام چھپائے، حسن کا قول ہے۔

قول اول کے مطابق (الکتاب) سے تورات مراد ہے اور دوسرے قول کے مطابق ممکن ہے اسے قرآن اور تمام آسمانی کتب پر حمل کیا جائے۔

وَیَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا. یعنی اسے معمولی چیز کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے اگر وہ اسے بیشتر قیمت میں خریدیں تو جائز ہوگا بلکہ ثمن قلیل کے ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں وہ مالِ دنیا سے جس چیز کو بھی لیں گے وہ قلیل و مختصر ہی ہوگی۔ اس بارے میں عربوں کی معروف عادت اور مشہور نظریہ ہے جس کی مثالیں قرآن میں بکثرت موجود ہیں ارشاد ہوتا ہے: وَمَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ. (اور جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو پکارتا ہے) اس کے لیے کوئی برہان اس میں نہیں ہے۔ وَیَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ حَقٍّ. (اور وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں) اس میں دلالت ہے کہ جس کا دعویٰ ہے (اللہ کے ساتھ دوسرا خدا بھی ہے) اس کے قول پر کوئی برہان و دلیل نہیں ہے اور انبیاء کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ. یعنی جن لوگوں نے اسے چھپایا اور اس کے چھپانے کے لیے اجرت لی۔ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ. اس کے معنی ہیں اگرچہ دنیا میں ان کا کھانا فی الحال پاک صاف ہے گویا یہ لوگ کچھ نہیں کھا رہے ہیں سوائے آگ کے۔ اس لیے کہ (ان کا یہ عمل انھیں) آتش (جہنم) تک پہونچا دے گا۔ جیسا کہ خداوند عالم نے مالِ یتیم کھانے کے متعلق فرمایا ہے: اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا (سورۂ نساء، آیت ۱۰) (وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھر رہے ہیں) یہ حسن ربیع اور بیشتر مفسرین کا قول ہے اور کہا گیا ہے یہ لوگ درحقیقت جہنم میں آگ کھا رہے ہیں جو ان کے (اللہ کا نازل کردہ حکم) چھپانے کا عذاب ہے۔ جو انھوں نے اپنے شکم میں کھایا ہے قیامت کے روز آگ بن جائے گا۔ پس اس حالت میں اس کا نام قرار دے دیا جو اس کا

انجام قرار پائے گا۔ بطون (شکم) کا ذکر فرمایا ہے اگر چہ کھانا فقط بطن (شکم) میں ہی ہوتا ہے جس کی دو وجہیں ہیں:

اول: عرب کہتے ہیں میں بھوکا ہوں اپنے شکم کے علاوہ میں سیر ہوا اپنے شکم کے بغیر جب وہ گرسنہ ہوتا ہے تو اپنی بھوک کو بھوک کے مجریٰ میں جاری کرتا ہے اور سیری کو سیری کے مقام میں جاری کرتا ہے، التباس (خلط ملط) زائل کرنے کے لیے بطون کا ذکر کیا ہے۔

دوم: مجاز جب کا استعمال کیا گیا یعنی رشوت کو آگ کا نام دیا گیا تو بطون (شکم) کے ذکر سے اس بات کو ثابت کیا گیا کہ آگ ان کے اندر داخل ہوتی ہے۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، اس میں دو وجہیں ہیں:

اول: خداوند عالم ان سے ان کی پسندیدہ گفتگو نہیں کرے گا۔ اس میں ان لوگوں پر اللہ کے غضب کی دلیل ہے اگر چہ (اللہ) ان سے سوال اور ان کی مذمت کے لیے ان سے کلام کرے گا جس سے وہ غم واندوہ میں مبتلا ہوں گے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ۔ (سورۂ اعراف، آیت ۶) (پس ہم ضرور بالضرور ان لوگوں سے باز پرس کریں گے جن کی طرف پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا) پس ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف ہم نے اپنے (پیغمبروں) کو بھیجا تھا اور کہے گا: اسی میں ذلیل وخوار حالت میں رہو اور کلام نہ کرو۔ یہ حسن اور جبائی کا قول ہے۔

دوم: (خداوند عالم) ان لوگوں سے بالکل ہی کلام نہیں کرے گا۔ سوال کی آیات کو اس طرح حمل کیا جائے گا کہ ملائکہ اللہ کی طرف سے اس کے حکم سے ان لوگوں سے سوال کریں گے اور اس کے قول: قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۔ (سورۂ مومنون، آیت ۱۰۸) (آواز قدرت آئے گی تم دھتکارے ہوئے ہو اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے کچھ نہ کہو) کی تاویل حال کی دلالت پر کی گئی ہے۔ پہلی وجہ میں غضب میں کلام کی نفی پر دلالت کر رہا ہے، اس اعتبار سے کہ کلام اصل میں فائدہ کے لیے وضع کیا گیا ہے لیکن جب کلام سے محرومی کے باعث اس کا فائدہ ختم ہو گیا تو غضب پر دلیل ہے لیکن کلام کا غم اور اذیت پہونچانے کے لیے ہونا یہ اس سے خارج ہے۔

وَلَا يُزَكِّيْهِمْ، اس کے معنی ہیں کہ نہ خدا ان کی تعریف کرے گا کہ وہ بڑے اچھے لوگ ہیں اور جس کی خدا تعریف نہیں کرے گا وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

کہا گیا ہے کہ ان کے اعمال قبول نہیں کیے جائیں گے جس طرح پاک لوگوں کے اعمال قبول کیے

جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مغفرت کے ذریعہ ان کے اعمال کی بدی اور خباثت کو پاک نہ کیا جائے گا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ان کے لیے دردناک عذاب ہے)

❁❁❁❁❁

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾
یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لے لیا۔ کس چیز نے انھیں جہنم کی آگ برداشت کرنے پر مجبور کیا ہے؟!

ترکیب:

مَآ اَصْبَرَهُمْ کہا گیا ہے کہ مَا تعجب کے لئے ہے جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ یعنی مَا تعجبیہ کی جگہ پر آیا ہے ایک عربی سے حکایت کی گئی ہے کہ اس نے اپنے دشمن سے کہا: مَآ اَصْبَرَكَ عَلٰى عَذَابِ اللهِ۔

کہا گیا ہے کہ مَا استفہام کے لئے اَيُّ شَيْءٍ اَصْبَرَهُمْ کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے: اَصْبَرَتِ السَّبُعُ یا الرَّجل وغیرہ جب آپ ناپسندیدہ شے کو نصب دیں گے۔

حطیئہ نے کہا:

قُلْتُ لَهَا اُصْبِرُهَا دَائِبًا   وَيْحَكِ اَمْثَالُ طُرَيْفٍ قَلِيْلٍ

یعنی اَلْزِمُهَا وَاَضْطَرُّهَا: میں اسے مجبور کئے رہوں گا۔

تفسیر:

ہدایت و گمراہی کا معاملہ

اُولٰٓئِكَ سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى: جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پر ایمان کو کفر میں تبدیل کرلیا گویا وہ اس طرح ہو گئے جس طرح کوئی شخص قیمت کے ذریعہ جنس خریدے۔ کہا گیا ہے کہ ضَلَالَۃ (یعنی گمراہی) سے امر خدا کا چھپانا مراد ہے، باوجود یکہ وہ اس کے متعلق جانتے تھے۔ ہدایت سے اس کا اظہار مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ ضَلَالَۃ سے عذاب اور ہدایت سے ثواب اور جنت کا راستہ مراد ہے۔ یعنی انھوں نے جنت کو آتش جہنم سے بدل لیا۔

ارشاد: وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ، (مغفرت کے بدلے عذاب مول لے لیا) کہا گیا ہے کہ یہ گذشتہ کی تاکید ہے۔ یہ ابو مسلم کا قول ہے۔

کہا گیا ہے: انھوں نے مغفرت کے عوض عذاب خرید لیا جبکہ یہ لوگ بخوبی جانتے تھے کہ اللہ نے اس کی نافرمانی کرنے والے کے لیے عذاب اور اس کی اطاعت کرنے والے کے لیے ثواب مہیا کیا ہے۔ پھر وہ اپنی اسی معصیت و نافرمانی پر باقی اور مُصر رہے۔ یہ قاضی کا قول ہے۔

یہ قول اولیٰ اور بہتر ہے اس لیے کہ جب کلام کو زیادہ فائدہ پر حمل کرنا ممکن ہو تو ایسا کرنا بہتر اور اولیٰ ہے ان لوگوں کے گمراہی خریدنے کی بازگشت علم کے راستہ سے جہالت کے راستہ کی جانب انحراف اور واپسی ہے اور مغفرت و بخشش کے عوض ان کا عذاب خریدنا اس چیز سے انحراف ہے جو جنت کا سبب بنتی ہے اس چیز کی جانب جو جہنم کا باعث ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ، (کس چیز نے انھیں جہنم کی آگ کو برداشت کرنے پر مجبور کیا ہے؟) اس میں متعدد اقوال ہیں:

اول: اس کے معنی ہیں انھیں جہنم کے حوالے کر دیا جائے گا۔ حسن اور قتادہ نے اسی نظریہ کو اختیار کیا ہے، علی بن ابراہیم نے اپنی سند سے اس کی روایت امام جعفر صادقؑ سے کی ہے۔

دوم: ان کے اعمال اہل جہنم کے اعمال کے مانند ہیں، یہ مجاہد کا قول ہے۔ یہی امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

سوم: انھیں آتش جہنم میں کس قدر باقی رکھا جائے گا؟! جس طرح کہا جاتا ہے (فلاں نے قید میں کس قدر صبر کیا) یہ زجاج کا قول ہے۔

چہارم: ان لوگوں کو آتش جہنم میں کس طرح ہمیشہ باقی رکھا جائے گا یعنی اہل جہنم کے عمل کے مطابق کس طرح باقی رکھا جائے گا؟ جس طرح کہا جاتا ہے: ''تیری سخاوت حاتم سے کس قدر مشابہ ہے'' یہ کسائی و

قطرب کا نظریہ ہے۔ ان وجوہات کے اعتبار سے ظاہر کلام تعجب ہے اور خداوند عالم کی ذات قدیم کے لیے تعجب ناممکن ہے، اس لیے کہ اس کی ذات تمام اشیاء کی عالم ہے، اس پر کوئی چیز مخفی و پوشیدہ نہیں ہے۔ تعجب اس چیز پر ہوتا ہے جس کا سبب معلوم نہ ہو اور جب یہ چیز ثابت ہو چکی ہے تو ہمارے لیے دلیل ہے اس بات پر کہ کفار اس موقع و محل میں ہیں جن سے تعجب کیا جاتا ہے۔ پس یہ ہمارے لیے ان کی عجیب چیز ہے (تعجب میں مبتلا کرنے والی)

پنجم: ابن عباس سے مروی ہے اس سے مراد ہے کہ کون سی چیز انھیں آتش جہنم پر صبر دلائے گی؟ یعنی اس میں مقید ہونے پر۔ یہ استفہام ہے۔ ممکن ہے گذشتہ تینوں وجوہات کو استفہام پر حمل کیا جائے جس کے معنی یہ ہوں گے کون سی چیز ہے جو انھیں آتش جہنم میں باقی رکھے گی اور ان کے اعمال اہل جہنم کے اعمال کے مانند ہوں گے اور انھیں آتش جہنم میں باقی رکھا جائے گا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ تعجب کی وجہ سے استفہام ہے۔ مبرد نے بیان کیا ہے کہ یہ بہتر ہے اس لئے کہ یہ ان کی مذمت اور سرزنش کی طرح ہے اور ہمارے لیے قابل تعجب ہے جس طرح کسی بڑی مشکل میں مبتلا انسان سے کہا جائے تمھیں اس مشکل میں کس نے مبتلا کیا؟ جبکہ وہ اس طرح کی مشکل میں گرفتار ہونے سے بے نیاز ہو۔ اس سے انکار مراد ہے۔ ہلاک ہونے کا سبب حاصل کرنے پر اور اس سے غیر کا تعجب میں مبتلا ہونا ہے اور کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں انھیں آتش جہنم میں رہنے پر کس نے جری بنایا اس لیے کہ اس کے نزدیک صبر ہے جو زندان اور قید ہے اس لیے کہ جرأت سے شدت پر صبر ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کا بیج بویا وہ اپنے جھگڑوں میں بہت دور نکل گئے۔

الفاظ و معانی:

اِخْتِلَاف یعنی تفرقہ کے سبب مختلف جہتوں اور سمتوں میں چل پڑنا۔ اس کے لغوی معنی طریقہ (راستہ) سے اختلاف کرنے کے ہیں۔ تم کہتے ہو: ہم نے راستہ میں اختلاف کیا یہ (شخص) ادھر سے آیا اور وہ اُدھر سے آیا، پھر اس کا استعمال طریقہ میں اختلاف کی تشبیہ کے سبب مذاہب (نظریات) کے اختلاف میں کیا جانے لگا

چونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اعتقاد کے باعث (اپنے مقابل) کی ضد ہے۔ اجناس کا اختلاف یہ ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کی جگہ پُر نہ کر سکے (یعنی ایک چیز دوسری چیز کی قائم مقام نہ بن سکے) جب اس کی بازگشت اپنی ذات کی طرف ہو جیسے سیاہی اور سفیدی۔

شِقَاق اور مَشَاقَّة کے معنی عداوت کے سبب اپنے ساتھی کی جماعت اور گروہ سے پیچھے ہٹنا اور دور ہو جانا اور (دونوں گروہوں میں سے ایک کا) دشمنی کے سبب اس چیز کی خواہش کرنا جو دوسرے پر شاق اور باعث زحمت ہو۔

ترکیب:

زجاج نے کہا: ذٰلِكَ مرفوع ہے مبتدا ہونے کی بنا پر اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی ذٰلِكَ الْاَمْرُ، ممکن ہے کہ مرفوع ہو مگر مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر۔ یعنی اَلْاَمْرُ ذٰلِكَ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذٰلِكَ محلاً منصوب ہو اپنی اصل کی بنا پر یعنی فَعَلْنَا ذٰلِكَ اس لئے کہ کلام میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو فَعَلْنَا پر دلالت کرتی ہیں۔

تفسیر:

اختلاف کا انجام

ذٰلِكَ، تین چیزوں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہے:

اول: یہ آتش جہنم کا حکم ہے۔ حسن کا قول ہے۔

دوم: یہ عذاب ہے۔

سوم: یہ گمراہی ہے، اس کی خبر کی تقدیر میں تین وجہیں ہیں:

اول: ہم نے جو زجاج کا قول نقل کیا۔

دوم: اس کی تقدیر ہے وہ حکم ہے جس کے سبب ان میں حکم کیا گیا یا ان پر عذاب نازل ہوا اور وہ گمراہی جو معلوم ہے کہ خداوند عالم نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا جسے کلام کے مقدم ہونے کے سبب حذف کر دیا گیا۔

سوم: یہ عذاب ان کے لیے ہے۔

بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ، باء اپنے مابعد کے ساتھ خبر کے مقام میں ہوگی۔ جس کی رائے یہ ہے کہ اس حکم کے معنی اس دلالت کے ساتھ کہ خداوند عالم نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا تو کلام اپنی شکل پر ہوگا اور جس کی رائے یہ ہے کہ اس کے معنی عذاب اور گمراہی کے ہیں کہ خداوند عالم نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا (اس طرح) کلام میں محذوف ہے، جس کی تقدیر ہے انھوں نے اس کا انکار کیا۔ کتاب سے یہاں مراد تورات ہے۔ جبائی نے کہا ہے: قرآن وغیرہ مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے: پہلے الکتاب سے تورات اور دوسرے الکتاب سے قرآن مراد ہے۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ، بیان کیا گیا ہے کہ بیشتر مفسرین کے نزدیک تمام کفار مراد ہیں۔ قرآن کے بارے میں مختلف باتیں کہتے ہیں: بعض نے کہا کہ جادوئی کلام ہے، بعض نے کہا: سیکھا ہوا کلام ہے۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے: گڑھا ہوا کلام ہے۔ بیان کیا گیا ہے وہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں۔ سُدی سے منقول ہے تورات وانجیل کی تاویل وتنزیل میں اختلاف کیا گیا ہے اس لیے کہ انھوں نے کتاب میں تحریف کردی اور پیغمبرؐ کی صفت کو چھپایا، یہودیوں نے انجیل وقرآن کا انکار کردیا۔

اللہ کا ارشاد: لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ، یعنی حق پر جمع ہونے کی الفت ومحبت سے دور ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ہر ایک اپنے ساتھی کے متعلق گمراہی کی گواہی دینے کے سبب حق سے دور ہے، دونوں ہی حق وانصاف سے دور ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ تورات وانجیل سے مربوط احکام میں شدید اختلاف ہے۔

❀❀❀❀❀

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کر لیے بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان اللہ کو، آخرت کے دن کو، فرشتوں اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے تسلیم کرے۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا مال، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکوۃ دے، اور جو کیے ہوئے عہد کو پورا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ راست باز لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

قرائت:

حفص نے عاصم سے ہبیرہ کی روایت کے علاوہ میں اور حمزہ نے لَيْسَ الْبِرَّ راء کے نصب کے ساتھ اور بقیہ قراء نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔

قرائت شواذ میں ابن مسعود اور ابی ابن کعب کے ساتھ اور آن یُوَلُّوْا یاء کے ساتھ نصب پڑھا ہے۔

نافع اور ابن عامر نے وَلٰكِنِ الْبِرُّ کو تخفیف کے ساتھ بقیہ قراء نے الْبِرَّ کو تشدید اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

حجت:

ابوعلی نے کہا: جن قراء نے الْبِرُّ کو مرفوع پڑھا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ لَيْسَ فعل سے مشابہ ہے اور

یہ فعل کے بعد فاعل کا ہونا اولیٰ ہے اس کے بعد مفعول بہ ہونے سے۔

اور جن قراء نے اَلْبِرَّ کو نصب دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگان سے منقول ہے کہ انہوں نے ایسے مقام کے لئے کہا ہے کہ اَنَّ اور اس کے صلہ کا اسم ہونا اولیٰ ہے اس لئے کہ مضمر کے مشابہ ہے کہ اسے موصوف قرار نہیں دے سکتے جس طرح ضمیر کو موصوف نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ گویا ضمیر اور اسم ظاہر دونوں جمع ہوں گے اور جب دونوں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو ضمیر کو اسم قرار دینا اختصاص کی وجہ سے اسم ظاہر کو اسم بنانے سے بہتر ہے۔

ابن جنی نے کہا: ممکن ہے کہ اَلْبِرَّ کو باء کے ساتھ نصب دیا گیا ہو اس طرح کہ باء کو زائدہ قرار دیا گیا ہو جیسے وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔

الفاظ ومعانی:

بِرٌّ کے معنی عطف (مہربانی) اور احسان کے ہیں جو مصدر ہے۔ ممکن ہے بَارٌّ (یعنی وسیع احسان) کے معنی میں ہو۔ اَلْبِرُّ صِدْقُ الْبِرِّ اِيْمَانٌ وَّ تَقْوٰى کے معنی میں ہے اس کے لغوی معنی توسع اور وسعت کے ہیں اسی سے بَرٌّ (دشت) کے معنی میں ہے جو بحر (سمندر) کے برعکس ہے اپنی وسعت کے سبب۔

اہل لغت اور فقہاء نے مِسْكِيْن و فَقِيْر کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ حالات کے اعتبار سے ان میں سے کون زیادہ شدید و دشوار ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ (مال) نہ ہو۔ یہ یونس اور ابن درید اور ابو حنیفہ کا قول ہے۔ دوسروں نے بیان کیا ہے فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور مسکین کے پاس نہایت مختصر (مال) ہو۔ یہ شافعی کا قول ہے۔

سَبِيْل کے معنی راستہ کے ہیں۔ ابن سبیل یعنی جو مسافر اپنے سفر میں درماندہ ہو جائے (اس کے پاس سفر کا خرچ باقی نہ رہے)

ترکیب:

جس نے اَلْبِرَّ کو نصب دیا ہے اس نے اَنَّ کو اس کے صلہ کے ساتھ لَيْسَ کا اسم قرار دیا ہے یعنی: لَيْسَ تَوْلِيَتُكُمْ وُجُوْهَكُمُ الْبِرَّ كُلَّهٗ۔

اور جن قراء نے اَلْبِرُّ کو رفع دیا ہے ان کے نزدیک مراد یہ ہے کہ لَیْسَ الْبِرُّ کُلُّهٗ تَوْلِیَتُکُمْ۔ دونوں قول حسن ہیں اس لئے کہ دونوں صورتوں میں لَیْسَ کا اسم اور خبر دونوں معرفہ ہیں اور جب دونوں معرفہ ہوں تو دونوں اسم اور خبر قرار پانے میں یکساں ہوتے ہیں جس طرح نکرے برابر ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک نظریہ کو دوسرے نظریہ پر مقدم کرنے کی دلیل بیان کردی ہے۔

لٰکِنَّ الْبِرَّ میں جب لٰکِنَّ کو تشدید دیں گے تو اَلْبِرَّ کو نصب دیں گے اور جب اسے لٰکِنْ بغیر تشدید کے پڑھیں گے تو اَلْبِرُّ کو رفع دیں گے اور بغیر تشدید کی صورت میں لٰکِنِ کے نون کو التقائے ساکنین کی بنا پر کسرہ دیں گے۔

اَلْبِرَّ کی خبر مَنْ اٰمَنَ کو قرار دینے میں تین وجہیں بیان کی گئیں ہیں:

(۱) اَلْبِرَّ اَلْبَآرّ کے معنی میں ہے۔ ایسی صورت میں مصدر کو اسم فاعل کی جگہ پر رکھا گیا ہے جیسا کہا جاتا ہے: مَاءٌ غَوْرٌ یعنی مَاءٌ غَائِرٌ وَ رَجُلٌ صَوْمٌ یعنی رَجُلٌ صَائِمٌ۔ اسی کے مانند خنساء کا شعر ہے:

تَرْتَعُ مَا رَتَعَتْ حَتّٰی اِذَا ادَّکَرَتْ فَاِنَّمَا هِیَ اِقْبَالٌ وَّ اِدْبَارُ

یعنی اِنَّهَا مُقْبِلَةٌ وَّ مُدْبِرَةٌ۔ اسی کے مانند یہ شعر بھی ہے:

تَظَلُّ جِیَادُهُمْ نَوْحًا عَلَیْهِمْ مُقَلَّدَةً أَعِنَّتَهَا صُفُوْنَا

نَوْحًا یعنی نَائِحَةً

(۲) مراد وَلٰکِنَّ ذَا الْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ہے لٰکِنَّ کے اسم میں سے مضاف (ذَا) کو حذف کردیا گیا ہے۔

(۳) دراصل اس طرح تھا: وَلٰکِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ یہاں پر خبر میں سے مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنادیا گیا ہے جیسا کہ شاعر کا شعر بھی ہے:

وَ کَیْفَ تُوَاصِلُ مَنْ اَصْبَحَتْ خَلَالَتُهٗ کَاَبِیْ مَرْحَب

نابغہ کا شعر ہے:

وَ قَدْ خِفْتُ حَتّٰی مَا تَزِیْدُ مَخَافَتِیْ عَلٰی وَعِلٍ فِیْ ذِی الْمَطَارَةِ عَاقِلِ

یعنی عَلٰی مَخَافَةِ۔ اسی کے مانند یہ ارشاد الٰہی ہے: اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَاجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ پھر فرمایا: کَمَنْ اٰمَنَ۔ یعنی ایمان لانے والے کے ایمان کی طرح۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا: اَلْمُوْفُوْنَ کے مرفوع ہونے کے سلسلہ میں دو قول ہیں:

(۱) مرفوع ہے مدح کی بنا پر اس لئے کہ جب صفتیں طولانی اور زیادہ ہوجاتی ہیں تو مدح کی بنا پر ان میں سے بعض صفتوں کو رفع دیتے ہیں اور بعض کو نصب۔ مراد وَهُمُ الْمُوفُونَ ہے۔

(۲) اَلْمُوفُوْنَ، مَنْ آمَنَ پر معطوف ہے لہٰذا مراد یہ ہے: وَ لٰكِنَّ ذَاالْبِرِّ اَوْ ذَوِي الْبِرِّ اَلْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ۔

اَلصَّابِرِيْنَ بھی مدح کی بنا پر منصوب ہے اس لئے کہ عربوں کا صفات کے سلسلہ میں یہی نظریہ ہے کہ جب صفتیں طولانی ہوجاتی ہیں تو وہ مدح یا ذم کے ذریعہ ان کے درمیان کوئی جملہ معترضہ ڈال دیتے ہیں تاکہ ممدوح یا مذموم کو جدا کیا جاسکے۔ لہٰذا اس کی اصل اَعْنِيَ الصَّابِرِيْنَ ہے۔

ابوعلی نے کہا: یہ صفات کہ جو رفع کی وجہ سے اپنے موصوف سے جدا ہیں، ان کی مدح ہورہی ہے یا ان سے چشم پوشی اور مذمت ہورہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ صفتیں اعراب کے ذریعہ اس موصوف کے مخالف ہوں اور سارے صفات کو موصوف کے اعراب کے مطابق قرار نہ دیا جائے تاکہ وہ اس مراد پر دلالت کرے اور جنھیں تنبیہ و آگہی کے لئے یا نقص اور چشم پوشی کے لئے ذکر کیا گیا ہے ان سے جدا رکھا جائے جنھیں اسم میں مشابہ اور معنیٰ میں جدا موصوفوں کے درمیان جدائی ڈالنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اسی میں سے فراء کا شعر ہے:

إِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَ ابْنِ الْهِمَامِ وَ لَيْثَ الْكَتِيْبَةِ فِي الْمُزْدَحَمِ
وَ ذَا الرَّأْيِ حِيْنَ تَغُمُّ الْأُمُوْرُ بِذَاتِ الصَّلِيْلِ وَ ذَاتِ اللُّجُمِ

فراء نے لَيْثَ الْكَتِيْبَةِ اور ذَا الرَّأْيِ کو بر بنائے مدح نصب دیا ہے۔ نیز کہا ہے:

فَلَيْتَ الَّتِي فِيْهَا النُّجُوْمُ تَوَاضَعَتْ عَلٰى كُلِّ غَثٍّ مِنْهُمْ وَ سَمِيْنِ
غُيُوْثَ الْحَيَا فِي كُلِّ مَحْلٍ وَّ لَزْبَةٍ أُسُوْدَ الشَّرٰى يَحْمِيْنَ كُلَّ عَرِيْنِ

غُيُوْثَ اور أُسُوْدَ کو مذمت کی بنا پر نصب دیا ہے۔

سَقَوْنِي الْخَمْرَ ثُمَّ تَكَنَّفُوْنِي عُدَاةَ اللهِ مِنْ كَذِبٍ وَّ زُوْرِ

یہاں پر عُدَاةَ کو مذمت کی بنا پر نصب دیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ مقام صفت میں اطناب اور طویل دینے کے مقامات میں سے ہے اور الفاظ کے اعراب کے ذریعہ مخالفت کی جائے گی تو یہاں پر جو ارادہ کیا گیا اور معترضہ لایا گیا ہے وہ کلام کو بنانے میں زیادہ شدید اور با اثر ہوگا اس طرح کئی قسمیں اور جملے بن جائیں گے اور اگر پہلے نظریہ کی بنا پر سب کو ایک ہی

جملہ میں قرار دیا جائے تو صرف ایک ہی جملہ بنے گا اسی لئے وَ الْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ کے سلسلہ میں سیبویہ کا نظریہ اور یہ کہ اسے مدح پر حمل کیا گیا ہے ان لوگوں کے قول سے پہلے ہے جنہوں نے یہ کہا کہ اسے:
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ اور اَلْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ پر حمل کیا جائے گا۔

بعض علمائے نحو نے کہا ہے: اَلصَّابِرِيْنَ، ذَوِي الْقُرْبٰى پر عطف ہے۔

زجاج نے کہا: یہ بات صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ وَالْمُوْفُوْنَ دو ضمیروں کی خاطر مدح کی بنا پر مرفوع ہو اس لئے کہ جو چیز صلہ میں ہے، موصول پر عطف کرنے کے بعد اس پر عطف نہیں کر سکتے ہیں۔

ابو علی نے کہا: زجاج کے اس قول کی کوئی دلیل نہیں ہے اس لئے کہ وَالصَّابِرِيْنَ کو وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ پر حمل (عطف) کرنا صحیح نہیں ہے چاہے وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ موصول پر عطف ہو یا مدح ہو اس لئے کہ صلہ کے درمیان فاصلہ اس کے ذریعہ واقع ہوگا جب وہ مدح ہو اسی طرح فاصلہ واقع ہوگا جب وہ مفرد اور موصول پر عطف ہو بلکہ ان دونوں کے درمیان مدح کے ذریعہ فاصلہ ڈالنا بہت برا ہے اس لئے کہ مدح ایک جملہ ہوتا ہے اور جملے فاصلہ کی صورت میں زیادہ برے اور قبیح ہوتے ہیں کہ وہ مفرد سے زیادہ ہوتے ہیں اگرچہ یہ ساری صورتیں صحیح نہیں ہیں۔

شانِ نزول و نظم:

جب قبلہ تبدیل ہوا اور اس کے منسوخ ہونے کے بارے میں کافی غور و خوض کیا جا چکا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اللہ کی اطاعت کی حفاظت کر رہا ہے سوائے نماز کے لیے رخ کرنے کے جس کا یہود و نصاریٰ نے بکثرت ذکر کیا۔ اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ ابو القاسم بلخی اور قتادہ سے روایت ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی۔

تفسیر:

تمام نیکیوں کی جڑ

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، خداوند عالم نے وضاحت فرمادی ہے کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی جانب کر لیے یعنی خداوند وضاحت

فرمادی کہ تمامتر نیکی صرف نماز میں نہیں ہے، نماز کا حکم اس لیے دیا گیا کہ اس میں ایمان کی بھلائی ہے اور نماز فساد سے روکتی ہے اسی طرح شرعی عبادات ہیں جن کا حکم ان میں موجود دینی الطاف اور مصالح کے سبب دیا گیا ہے جو اپنے زمانے اور اوقات کے مطابق مختلف ہوتے رہتے ہیں ارشاد ہوا تمام نیکی نماز کی طرف متوجہ ہونے میں نہیں ہے یہاں تک کہ اس کی جانب ان اطاعتوں کی نسبت دی جائے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ یہ ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے اور اسے ابو مسلم نے اختیار کیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں نیکی، یہ نہیں جس پر نصاریٰ ہیں کہ وہ مشرق کی جانب رخ کرتے ہیں نہ ہی وہ نیکی ہے جس پر یہودی ہیں کہ وہ مغرب کی طرف رخ کرتے ہیں۔ یہ قتادہ اور ربیع کا قول ہے جسے جبائی اور بلخی نے اختیار کیا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ. لیکن نیکی وہ نیکی ہے جو اللہ پر ایمان لائے جیسا کہ عربوں کا مقولہ ہے: اَلسَّخَاءُ حَاتِمٌ یعنی سخاوت تو حاتم کی سخاوت ہے۔ وَالشِّعْرُ زُهَيْرٌ. یعنی شعر تو زہیر کا شعر ہے۔ یہ ہے قطرب، زجاج اور فراء کا قول ہے جسے جبائی نے اختیار کیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ لیکن نیکی کرنے والا یا نیک (انسان) وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے یعنی اللہ کی تصدیق کرے اس (حکم) میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کے بغیر معرفت خدا مکمل نہیں ہوسکتی جیسے حدوث عالم، اثبات مُحدِث اور خداوند عالم کے لازم اور ممکن اور محال صفات اور اس کے عدل وحکمت کی معرفت۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. یعنی قیامت اس میں دوبارہ زندہ کیا جانا۔ حساب ثواب اور عذاب کی تصدیق داخل ہے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةِ. یہ کہ ''ملائکہ'' اللہ کے محترم بندے ہیں جو کلام میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ وَالْكِتٰبِ. کتاب پر ایمان یعنی وہ کتب جو اللہ کی طرف سے اس کے انبیاء پر نازل کی گئی ہیں۔ وَالنَّبِيّٖنَ. اور تمام انبیاء جو معصوم اور پاک و پاکیزہ ہیں اور جو کچھ انھوں نے مخلوقات تک پہونچایا اس میں سچے ہیں۔ جن کے سید و سردار اور آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، آپؐ کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ ہے، جس سے تمام مکلفین کے لیے قیامت تک تمسک اور وابستگی ضروری ہے۔ وَاٰتَى الْمَالَ یعنی مال عطا کرے۔ عَلٰى حُبِّهٖ. (اللہ کی محبت میں) اس میں متعدد وجہیں ہیں:

اول: کنایہ مال کی طرف پلٹ رہا ہے یعنی مال کی محبت میں۔ اس طرح مصدر مفعول کی جانب مضاف ہوگا اور یہ ابن عباس اور ابن مسعود کے قول کے معنی ہیں، انھوں نے کہا وہ یہ کہ آپ مال عطا کریں جبکہ

آپ صحیح ہوں، زندگی کے بارے میں امید کریں اور فقر کے متعلق خوف کریں اور اہمال (یعنی ٹال مٹول) نہ کریں یہاں تک کہ (زندگی) حلق تک پہنچ جائے، تو اس طرح وصیت کرو فلاں شخص کے لیے اس قدر مال ہے۔

دوم: ھَا کی بازگشت، مَنْ آمَنَ کی طرف ہو۔ اس طرح مصدر کی اضافت فاعل کی جانب ہوگی، معنی کے ظاہر اور واضح ہونے کے سبب مفعول کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ چیز معنی کے مساوی ہونے میں پہلی صورت اور وجہ کے مانند ہے۔

سوم: 'ھا' (کی ضمیر) 'اِیْتَاء' کی جانب پلٹ رہی ہو جس پر اللہ کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے: 'وَ آتَی الْمَالَ، جس کے معنی اس کی محبت میں عطا کرنے کے ہیں۔

چہارم: ھَا، کی ضمیر اللہ کی جانب پلٹ رہی ہے۔ اس لیے کہ اللہ کا ذکر گذر چکا ہے۔ (معنی اس طرح ہوں گے) یعنی وہ لوگ اللہ کی محبت میں خاص طور پر اس کی (رضا) کے لیے مال عطا کرتے ہیں۔

سید مرتضیٰ قدس اللہ روحہ نے فرمایا: اس آیت میں ہم اس وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکے اس کے متعلق جو کہا گیا ہے وہ بہت بہتر اور مناسب ہے اس لیے کہ اس کی تاثیر حُبِ مال کی تاثیر سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال سے محبت کرنے والا اور اس میں بخل سے کام لینے والا جب بھی اسے خرچ کرے گا یا عطا کرے گا اس میں قصد قربت الٰہی نہیں کرے گا تو ثواب کا ذرا بھی حق دار نہیں ہوگا اور جب مال کے لیے اپنی محبت کا ایثار کرے ثواب میں اضافہ کے لیے جب بھی قصد قربت اور اطاعت حاصل ہو اور اگر عطیہ و بخشش کے ذریعہ تقرب چاہے اور مال میں بخیل نہ ہو، نہ ہی اس کا محب ہو تو وہ ثواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

ذَوِی الْقُرْبٰی، اس سے عطا کرنے والے کی قرابت (رشتہ داری) مراد ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہترین صدقہ کے بارے میں دریافت کیا گیا آپؐ نے ارشاد فرمایا: جُھْدُ الْمُقِلِّ عَلٰی ذِی الرَّحِمِ الْکَاشِحِ'' (افضل ترین صدقہ کم آمدنی والے رشتہ دار کے لیے جد و جہد ہے) آپ کا ارشاد فاطمہ بنت قیس کے لیے جب انھوں نے کہا: اللہ کے رسولؐ میرے پاس ستر مثقال سونا ہے تو آپؐ نے فرمایا: اسے اپنے قرابتداروں کے لیے قرار دو۔

یہ احتمال ہے کہ اس سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابت دار مراد ہوں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی، (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۳؛ (اے نبی!) آپ فرما دیجیے میں تم سے اس تبلیغ کے عوض کسی اجر کا مطالبہ نہیں کرتا سوائے قریبی رشتہ داروں کی محبت کے) اس کی

ہیں تو اسے وفا کرتے ہیں یعنی وہ عہد اور نذریں جو ان کے اور اللہ کے درمیان ہوتی ہیں اور وہ عقود (عہد و پیمان) جو ان کے اور لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان دونوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ البأساء سے فقر اور الضراء سے تکلیف اور بیماری مراد ہے۔ یہ ابن مسعود و قتادہ اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔

وَحِيْنَ الْبَاْسِ، دشمن سے قتال اور جہاد کا وقت مراد ہے۔ امام علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا: جس وقت جنگ شدید ہوتی تھی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب میں پناہ لیتے، ہم میں سے کوئی ایک دشمن سے حضورؐ کی نسبت نزدیک نہیں ہوتا تھا۔ اُولٰٓئِكَ، مذکورشدہ افراد کی جانب اشارہ ہے: الَّذِيْنَ صَدَقُوْا، یعنی جن چیزوں کو انھوں نے اللہ کی طرف سے قبول کیا ہے۔ اس میں اللہ کی تصدیق کرتے ہیں باعتبار علم اس کی پابندی کرتے اور عملاً اس سے وابستہ رہتے ہیں۔ یہ ابن عباس اور حسن کا قول ہے۔

بیان کیا گیا ہے: یہ وہ افراد ہیں جن کے اعمال کی حقیقت کی ان کی نیتیں تصدیق کرتی ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ، یعنی ایسے صفات کے اعمال انجام دیکر آتش جہنم سے خوف کرتے ہیں۔

ہمارے علماء نے اس آیت کے ذریعہ استدلال کیا ہے کہ اس سے مراد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہیں اس لیے کہ امت مسلمہ کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپؑ کی ذات گرامی ان صفات کی جامع ہے۔ پس آپؑ ہی اس آیت کی مراد و مقصود ہیں۔ یقینی طور پر آپؑ کے سوا کسی کے ان صفات کا جامع ہونے میں کسی طرح کا قطع و یقین نہیں ہے۔ زجاج اور فراء نے کہا ہے: آیت انبیاء معصومین سے مخصوص ہے اس لیے کہ ان آیات کا مکمل حق انبیاء کے علاوہ کوئی ادا نہیں کرسکتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو قتل کے مقدموں میں تمھارے لیے قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے گا، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کر دیا جائے گا اور اگر عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے گا۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا برادر ایمانی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہئے اور قاتل کو لازم ہے کہ عمدہ طریقہ سے خون بہا ادا کرے یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے، اس پر بھی جو زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک سزا ہے۔

الفاظ و معانی:

کُتِبَ کے معنی فرض کیا گیا۔ کِتَابَت کے لغوی معنیٰ اس تحریر کے ہیں جو معنی پر دلالت کرے، فرض پر دلالت کرنے کے سبب اسے کُتِبَ کہا گیا ہے۔

قِصَاص، مُقَاصَّة، مُعَاوَضَة اور مُبَادَلَة باہم مشابہ ہیں۔ قَصَّ اَثَرَهٗ کہا جاتا ہے یعنی ایک چیز کے بعد دوسری چیز آتی ہے، اسی سے قصاص ہے چونکہ اصل معنیٰ جنایت (گناہ اور جرم) کے بعد آتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسرے کے ساتھ وہی کیا جاتا ہے جو اس نے پہلے والے کے ساتھ انجام دیا تھا لیکن مماثلت کی رعایت کی جاتی ہے۔

حُرّ (آزاد) عَبد (غلام) کی ضد ہے۔

عَفو کے معنی ترک کرنے کے ہیں۔ معصیت سے درگذر کرنا اس کے عذاب کا ترک کرنا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مقام پر عَفو کے معنی اپنے برادر سے دیت قبول کر کے قِوَد (یعنی مقتول کے عوض قاتل کے

قتل) کا ترک کرنا ہے۔

اَخِیہ اَخ (برادر) کی جمع اخوۃ ہے جب کہ برادر پدری ہوں اگر ایک باپ سے نہ ہوں تو اس کی جمع اخوان ہے۔

ترکیب:

فَاتِّبَاعٌ مبتدا ہے اس کی خبر محذوف ہے یعنی فَعَلَیۡہِ اتِّبَاعٌ ۔یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی فَحُکۡمُہُ اتِّبَاعٌ اور اگر قرآن کے علاوہ کہیں اور ہوتا تو فَاتِّبَاعًا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ اَدَآءً اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ بھی صحیح تھا۔فَلۡیَتَّبِعۡ اتِّبَاعًا وَلۡیُؤَدِّ اَدَآءً کے معنی کی بنا پر لیکن فَاتِّبَاعٌ کے مرفوع ہونے پر قراء کا اجماع اور یہی عربی زبان میں سب سے بہتر ہے۔

شان نزول:

یہ آیت عرب کے دو قبیلوں کے متعلق نازل ہوئی جن میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر غالب تھا جو کمزور قبیلہ کی عورتوں سے بغیر مہر کے شادیاں کرتا اور انھوں نے اس بات پر قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے غلام کے عوض دوسرے قبیلہ کے آزاد انسان کو قتل کریں گے،عورت کے عوض ان کے مرد اور اپنے قبیلے کے ایک مرد کے عوض دو مردوں کو قتل کریں گے اور اپنے زخموں کو ان کے زخموں سے دوگنا قرار دیں گے، یہاں تک کہ اسلام آیا اور خداوند عالم نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

تفسیر:

حکمِ قصاص

جب خداوند عالم نے بیان فرمادیا کہ نیکی ایمان اور اسلامی احکام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تو اس نے احکام بیان کرتے ہوئے خون اور زخموں سے آغاز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اس لیے کہ یہ اہم مسئلہ ہے: یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ ، یعنی اے ایمان لانے والو! تم پر فرض کیا گیا اور واجب قرار دیا گیا۔کہا گیا ہے کہ ام الکتاب میں تم پر فرض کیا گیا جو لوح محفوظ ہے اور فرض کے عنوان سے ہے۔اَلۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی،

قتل میں مساوات یعنی قاتل کے ساتھ وہی کیا جائے گا جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا تھا۔ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اس سے قتل عمد مراد ہے۔ اس لیے کہ قتل عمد ہی میں قصاص واجب ہے، قتل خطائے محض میں نہیں، نہ ہی (قتل) شبیہ عمد میں ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ یہ کب کہا گیا کس طرح فرمایا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى، جبکہ (مقتول) کے اولیاء قصاص عفو اور دیت میں اختیار رکھتے ہیں اور جس سے قصاص لیا جارہا ہے اس میں اس کا کوئی فعل نہیں ہے، اس پر وجوب نہیں ہے؟ اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں:

اول: یہ آپ پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر مقتول کے اولیاء قصاص کو اختیار کریں، فرض کبھی مضیق (یعنی تنگ) ہوتا ہے، کبھی اس میں اختیار ہوتا ہے۔

دوم: تمھارے لیے جو حد مقرر کی گئی ہے اس سے تمسک اختیار کرنا تم پر واجب قرار دیا گیا ہے اور عوض کا ترک کرنا تم پر واجب ہے جب تک تمھارے لیے قرار نہ دیا جائے۔ البتہ قصاص لینے کا جو ذمہ دار ہوگا وہ مسلمانوں کا امام ہے یا جو اسی کے مانند ہو۔ پس اس پر ولی کے مطالبہ پر قصاص کرنا واجب ہے اس لیے کہ یہ انسانی حق ہے۔ قاتل پر خودسپردگی واجب ہے۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى، (آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد آدمی ہی سے بدلہ لیا جائے گا، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کر دیا جائے گا اور اگر عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے گا) امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: غلام کے عوض آزاد قتل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اسے کاری ضرب لگائی جائے گی اور غلام کی دیت کا تاوان ادا کرے گا اور یہ شافعی کا بھی نظریہ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت کو قتل کردے اور مقتول کے اولیاء (سرپرست) اسے قتل کرنا چاہیں تو نصف دیت قاتل کے گھر والوں کو دیں گے۔ یہی حقیقی مساوات ہے، اس لیے کہ عورت کی جان مرد کی جان کے مساوی نہیں ہوسکتی بلکہ عورت کی جان اس کے نصف ہے۔ پس جب ناقص جان کے عوض کامل جان لی جائے گی تو دونوں کے درمیان فاضل چیز کو واپس کیا جائے گا۔ اسی چیز کی روایت طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت علی علیہ السلام سے کی ہے۔ آزاد کے عوض قاتل غلام کو قتل اور مرد کے عوض قاتل عورت کو قتل جائز ہے۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ آیت میں کوئی ایسا (حکم) نہیں جو اس سے مانع ہو، اس لیے کہ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ مرد کے عوض قاتل عورت کو قتل نہ کرنا اور آزاد کے عوض قاتل غلام کو قتل نہ کرنا۔ جس چیز پر آیت مشتمل ہے اس پر عمل کیا جارہا ہے جو چیز ہم نے بیان کی ہے اجماع کے ذریعہ ثابت ہے اور ارشاد الٰہی: اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ کے ذریعہ بھی ثابت ہے۔

قتل میں مساوات یعنی قاتل کے ساتھ وہی کیا جائے گا جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا تھا۔ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اس سے قتل عمد مراد ہے۔ اس لیے کہ قتل عمد ہی میں قصاص واجب ہے، قتل خطائے محض میں نہیں، نہ ہی (قتل) شبیہ عمد میں ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ یہ کب کہا گیا کس طرح فرمایا ہے: کُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِي الۡقَتۡلٰى، جبکہ (مقتول) کے اولیاء قصاص عفو اور دیت میں اختیار رکھتے ہیں اور جس سے قصاص لیا جا رہا ہے اس میں اس کا کوئی فعل نہیں ہے، اس پر وجوب نہیں ہے؟ اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں:

اول: یہ آپ پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر مقتول کے اولیاء قصاص کو اختیار کریں، فرض کبھی مضیق (یعنی تنگ) ہوتا ہے، کبھی اس میں اختیار ہوتا ہے۔

دوم: تمہارے لیے جو حد مقرر کی گئی ہے اس سے تمسک اختیار کرنا تم پر واجب قرار دیا گیا ہے اور عوض کا ترک کرنا تم پر واجب ہے جب تک تمہارے لیے قرار نہ دیا جائے۔ البتہ قصاص لینے کا جو ذمہ دار ہوگا وہ مسلمانوں کا امام ہے یا جو اسی کے مانند ہو۔ پس اس پر ولی کے مطالبہ پر قصاص کرنا واجب ہے اس لیے کہ یہ انسانی حق ہے۔ قاتل پر خود سپردگی واجب ہے۔

اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰى بِالۡاُنۡثٰى، (آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد آدمی ہی سے بدلہ لیا جائے گا، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کر دیا جائے گا اور اگر عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے گا) امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا: غلام کے عوض آزاد قتل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اسے کاری ضرب لگائی جائے گی اور غلام کی دیت کا تاوان ادا کرے گا اور یہ شافعی کا بھی نظریہ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت کو قتل کر دے اور مقتول کے اولیاء (سرپرست) اسے قتل کرنا چاہیں تو نصف دیت قاتل کے گھر والوں کو دیں گے۔ یہی حقیقی مساوات ہے، اس لیے کہ عورت کی جان مرد کی جان کے مساوی نہیں ہو سکتی بلکہ عورت کی جان اس کے نصف ہے۔ پس جب ناقص جان کے عوض کامل جان لی جائے گی تو دونوں کے درمیان فاضل چیز کو واپس کیا جائے گا۔ اسی چیز کی روایت طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت علی علیہ السلام سے کی ہے۔ آزاد کے عوض قاتل غلام کو قتل اور مرد کے عوض قاتل عورت کو قتل جائز ہے۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ آیت میں کوئی ایسا (حکم) نہیں جو اس سے مانع ہو، اس لیے کہ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ مرد کے عوض قاتل عورت کو قتل نہ کرنا اور آزاد کے عوض قاتل غلام کو قتل نہ کرنا۔ جس چیز پر آیت مشتمل ہے اس پر عمل کیا جا رہا ہے جو چیز ہم نے بیان کی ہے اجماع کے قرینے ثابت ہے۔ [illegible]

ارشادالٰہی: فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ، (ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا برادر ایمانی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو) میں دو قول ہیں:

اول: اس کے معنی ہیں جو اسے ترک کرے اور اس سے درگذر کرے جو اس پر واجب ہے وہ قصاص ہے قتل عمد میں اپنے برادر سے۔ یعنی اپنے برادر کے خون سے اس کے معلوم ہونے کے سبب مضاف کو حذف کر دیا گیا اور برادر سے مقتول مراد ہے۔ اسے قاتل کے برادر کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دونوں کے درمیان اسلام میں بھائی چارگی کی دلیل ہے۔ جو منقطع نہیں ہوئی اور قاتل قتل کے سبب ایمان سے خارج نہیں ہوا ہے۔ کہا گیا ہے: برادر سے معاف کرنے والا مراد ہے جو خون کا ولی (وارث) ہے۔ اللہ نے اسے قاتل کے بھائی کا نام دیا ہے۔ ارشادالٰہی میں شیء اس بات کی دلیل ہے کہ اگر بعض اولیاء معاف کر دیں تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے اس لیے کہ خون کا کچھ (حصہ) بعض کے معاف کر دینے سے باطل ہو جاتا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: 'فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ شَیۡءٌ' اس کے قول میں 'لَہٗ' کی ضمیر اور 'اَخِیۡہِ' میں دونوں 'مَنۡ' کی جانب پلٹ رہی ہیں جو کہ قاتل ہے اور جو اس کے قتل کو ترک کر دے اور اس سے دیت پر راضی ہو جائے۔ یہ قول بیشتر مفسرین کا ہے۔ ان کا کہنا عفو کرنا قتل عمد میں دیت کو قبول کرنا ہے۔ خداوند عالم نے معاف کرنے والے کا ذکر نہیں فرمایا ہے لیکن معلوم ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جس کو قصاص اور مطالبہ کا حق حاصل ہے اور خون کا ولی (وارث) ہے اور دوسرا قول اللہ کے قول سے مراد 'فَمَنۡ عَفٰی لَہٗ وَلِیُّ الدَّمِ' 'اَخِیۡہِ' کی ھا اس کی جانب پلٹ رہی ہے جس کی تقدیر ہے: فمن بذل لہ من اخیہ' یعنی ولی کا بھائی اور وہ مقتول دیت ہے، معاف کرنے والا مال کا عطا کرنے والا ہوگا۔ اس کا ذکر مالک کی طرف سے کیا گیا ہے اور جس نے اس قول کی مدد (تائید) کی اس نے کہا ہے لفظ شیء نکرہ ہے اور قود (یعنی قتل کے عوض قتل) معلوم ہے۔ اس کی جانب سے لفظ نکرہ سے کنایہ جائز نہیں ہے، ضروری ہے اس کے معنی اس طرح ہوں: ''پس جو اس کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے مال خرچ کرے اور اس کا مجہول ہونا جائز و ممکن ہے، نہیں جانتا اسے دیت عطا کیا جائے گا یا دوسری جنس اور دیت کی مقدار یا اس سے کم یا اس سے بیشتر پس اس میں شئ کہنا درست ہے۔'' یہ قول ضعیف ہے، قول اول اظہر ہے۔ ہم لفظ 'شَیۡءٌ' کے نکرہ ہونے کی وجہ بیان کر چکے ہیں اور جسے قصاص سے عفو کرنے کا (حق) ہے ہر وہ شخص ہے جو دیت کا وارث ہو بجز زوج اور زوجہ کے، ہمارے نزدیک لیکن دیگر مذاہب کے علماء ان دونوں (زوج و زوجہ) کو مستثنیٰ قرار نہیں دیتے۔

ارشادالٰہی: فَمَنۡ عُفِیَ لَهٗ مِنۡ اَخِیۡهِ شَیۡءٌ، (ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا برادر ایمانی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو) میں دو قول ہیں:

اول: اس کے معنی ہیں جو اسے ترک کرے اور اس سے درگذر کرے جو اس پر واجب ہے وہ قصاص ہے قتل عمد میں اپنے برادر سے۔ یعنی اپنے برادر کے خون سے اس کے معلوم ہونے کے سبب مضاف کو حذف کر دیا گیا اور برادر سے مقتول مراد ہے۔ اسے قاتل کے برادر کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دونوں کے درمیان اسلام میں بھائی چارگی کی دلیل ہے۔ جو منقطع نہیں ہوئی اور قاتل قتل کے سبب ایمان سے خارج نہیں ہوا ہے۔ کہا گیا ہے: برادر سے معاف کرنے والا مراد ہے جو خون کا ولی (وارث) ہے۔ اللہ نے اسے قاتل کے بھائی کا نام دیا ہے۔ ارشادالٰہی میں شیء اس بات کی دلیل ہے کہ اگر بعض اولیاء معاف کر دیں تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے اس لیے کہ خون کا کچھ (حصہ) بعض کے معاف کر دینے سے باطل ہو جاتا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: 'فَمَنۡ عُفِیَ لَهٗ مِنۡ اَخِیۡهِ شَیۡءٌ' اس کے قول میں 'لَهٗ' کی ضمیر اور 'اَخِیۡهِ' میں دونوں 'مَنۡ' کی جانب پلٹ رہی ہیں جو کہ قاتل ہے اور جو اس کے قتل کو ترک کردے اور اس سے دیت پر راضی ہو جائے۔ یہ قول بیشتر مفسرین کا ہے۔ ان کا کہنا عفو کرنا قتل عمد میں دیت کو قبول کرنا ہے۔ خداوند عالم نے معاف کرنے والے کا ذکر نہیں فرمایا ہے لیکن معلوم ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جس کو قصاص اور مطالبہ کا حق حاصل ہے اور خون کا ولی (وارث) ہے اور دوسرا قول اللہ کے قول سے مراد 'فَمَنۡ عَفٰی لَهٗ وَلِیُّ الدَّمِ' 'اَخِیۡهِ' کی ھا اس کی جانب پلٹ رہی ہے جس کی تقدیر ہے: فمن بذل له من اخيه 'یعنی ولی کا بھائی اور وہ مقتول دیت ہے، معاف کرنے والا مال کا عطا کرنے والا ہوگا۔ اس کا ذکر مالک کی طرف سے کیا گیا ہے اور جس نے اس قول کی مدد (تائید) کی اس نے کہا ہے لفظ شیء نکرہ ہے اور قود (یعنی قتل کے عوض قتل) معلوم ہے۔ اس کی جانب سے لفظ نکرہ سے کنایہ جائز نہیں ہے، ضروری ہے اس کے معنی اس طرح ہوں: "پس جو اس کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے مال خرچ کرے اور اس کا مجہول ہونا جائز و ممکن ہے، نہیں جانتا اسے دیت عطا کیا جائے گا یا دوسری جنس اور دیت کی مقدار یا اس سے کم یا اس سے بیشتر پس اس میں شئ کہنا درست ہے۔" یہ قول ضعیف ہے، قول اول اظہر ہے۔ ہم لفظ: شَیۡءٌ، کے نکرہ ہونے کی وجہ بیان کر چکے ہیں اور جسے قصاص سے عفو کرنے کا (حق) ہے ہر وہ شخص ہے جو دیت کا وارث ہو بجز زوج اور زوجہ کے، ہمارے نزدیک لیکن دیگر مذاہب کے علماء ان دونوں (زوج و زوجہ) کو مستثنیٰ قرار نہیں دیتے۔

ارشاد الٰہی: فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ. یعنی معاف کرنے والے کے لیے نیکی کی پیروی لازم ہے کہ وہ مطالبہ میں شدت سے کام نہ لے اور اگر وہ تنگ دست ہو تو اسے مہلت دے اور حق سے زائد کا اس سے مطالبہ نہ کرے اور مَعفولہ (جسے معافی دی جا رہی ہے) اس پر لازم ہے۔

وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ. یعنی ممکن ہونے کی صورت میں کسی تاخیر کے بغیر اسے ادا کر دے اس بات کو ابن عباس، حسن، قتادہ اور مجاہد نے بیان کیا ہے۔ یہی چیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کی طرف سے عفو کے معنی اتباع اور ادائیگی کے ہیں۔

ارشاد الٰہی: ذٰلِكَ. گذشتہ تمام مطالب کی طرف اشارہ ہے۔ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ. جس کے معنی ہیں تمھارے لیے قصاص و دیت اور عفو (معافی) قرار دیے گئے اور جن میں تمھیں اختیار دیا گیا۔ اہل توریت کے لیے قصاص اور عفو تھا اور اہل انجیل کے لیے عفو اور دیت تھا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ (اس پر بھی جو زیادتی کرے) یعنی دیت یا عفو قبول کرنے کے بعد قتل کر دے۔ یہ ابن عباس، حسن، قتادہ اور مجاہد کا قول ہے اور یہی چیز امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے۔

کہا گیا ہے: قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل کر دے اور واجب دیت سے زائد کا مطالبہ کرے اور کہا گیا ہے کہ قصاص کی کیفیت بیان کرنے کے بعد حد سے تجاوز کرے۔ قاضی نے کہا ہے: لفظ کے عام ہونے کے سبب اس کا تمام (اقوال) پر حمل کرنا واجب ہے۔

فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. اس کے لیے آخرت میں (دردناک) عذاب ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾
اے عقل و خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

الفاظ و معانی:

اَلْبَاب یعنی عقول، اس کا واحد لُبّ ہے، لُبُّ النَّخْلَةِ سے مشتق ہے جس کے معنی درخت خرمہ کے گودے کے ہیں، لبّ کسی جگہ قیام کرنے کے معنی بھی ہیں۔ لُبّ عقل کو بھی کہتے ہیں۔

تفسیر:

قصاص میں زندگی ہے

پھر خداوند عالم نے وجوب قصاص کی حکمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَكُمْ (اے مخاطبین! تمہارے لئے) فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (قصاص میں زندگی ہے) اس میں دو قول ہیں:

اول: قصاص کے واجب ہونے میں حیات (زندگی) کے معنی ہیں جو قتل کرنے کی فکر کرے گا تو وہ قصاص کو یاد کر کے اس سے رک جائے گا۔ اس طرح یہ اس کی زندگی کا سبب ہوگا۔ یہ قول مجاھد وقتادہ اور بیشتر اہل علم کا ہے۔

دوم: تمھارے قتل ہونے میں زندگی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قاتل کے علاوہ کوئی اور قتل نہیں کیا جائے گا برخلاف اہل جاہلیت کے اس لیے کہ ان کے درمیان عداوت کا سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہتا تھا۔ یہ سُدی کا قول ہے۔ دونوں معنی بہتر ہیں۔ اس کی مثال کلام عرب میں اس طرح ہے: اَلْقَتْلُ اَنْفٰى لِلْقَتْلِ یعنی قتل قتل کی نفی کرتا ہے (روکتا ہے) لیکن قرآن میں موجود (حکم) میں بیشتر فائدے ہیں۔ عبارت نہایت مختصر تکرار جملہ کی زحمت سے دور باعتبار حروف بہتر اور مناسب ہے۔ بیشتر فائدے اس طرح ہیں کہ اس آیت میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اس قول: اَلْقَتْلُ اَنْفٰى لِلْقَتْلِ میں موجود ہے اور اس سے زیادہ معانی ہیں وہ یہ کہ قصاص کا تذکرہ کے ساتھ عدل کا اظہار کیا گیا ہے، مرغوب غرض جو کہ حیات ہے، اسے بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ انھیں معنی کی زیادتی میں رغبت اور خوف کی دعوت دی گئی ہے، جن کا خداوند عالم نے حکم دیا ہے۔ لیکن عبارت میں اختصار جس کی مثال اَلْقَتْلُ اَنْفٰى لِلْقَتْلِ ہے جبکہ ارشاد الٰہی: فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ہے۔ اس میں دس حروف ہیں جبکہ عربوں کی مثال میں چودہ حروف ہیں اور آیت کا تکلف سے دور ہونا اس طرح ہے کہ عربوں کے قول اَلْقَتْلُ اَنْفٰى لِلْقَتْلِ میں لفظِ قتل کی تکرار ہے جو آیت کے مقابلہ میں غیر بلیغ ہے اور حروف میں حسنِ تالیف اور ان کا مناسب وموزوں ہونا موجود ہے، اس لیے کہ فا سے لام کی طرف خروج و لام سے ہمزہ کی طرف خروج سے زیادہ عدل پر مبنی ہے، اس لیے کہ ہمزہ لام سے دور ہے۔ اسی طرح صاد سے حاء کی جانب خروج الف سے لام کی جانب خروج سے زیادہ عدل پر مبنی ہے۔ ان امور کا جمع ہونا جنھیں ہم نے ذکر کیا وہ (عربوں کے مقولہ) سے کہیں بلیغ اور احسن ہیں۔ اگرچہ پہلی صورت میں حسن اور بلاغت میں بھی ہے۔

ارشاد الٰہی: یٰاُولِی الْاَلْبَابِ، جس کے معنی ہیں: اے صاحبان عقل، یہ وہ افراد ہیں جو انجام سے واقف ہیں اور ذہن میں رکھتے ہیں اسی سبب سے انھیں خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں لَعَلَّ کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں:

اول: لام کے معنی میں ہے یعنی لِتَتَّقُوْا۔ تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

دوم: امید اور طمع کے لیے ہے گویا کہا جا رہا ہے تقویٰ میں تمھاری امید اور طمع ہے۔

سوم: تعرض (پیش کرنا) کے معنی میں ہے یعنی تقویٰ کے لیے اپنے آپ کو پیش کرو۔

تَتَّقُوْنَ میں دو قول ہیں:

اول: تا کہ تم قصاص کے خوف سے قتل سے ڈرو۔ یہ ابن عباس، حسن اور ابن زید کا قول ہے۔

دوم: تا کہ تم اپنے پروردگار کی نافرمانی سے اجتناب کرتے ہوئے اس سے ڈرو، یہ عام ہے۔

❀❀❀❀❀

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ 《۱۸۰》

تم پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے والدین اور رشتے داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے۔ یہ حق ہے صاحبان تقویٰ پر۔

الفاظ و معانی:

مَعْرُوْف کے معنی عدل کے ہیں جس کا انکار ممکن نہیں ہے جس میں نہ کوئی ظلم ہے نہ زیادتی۔

حُضُوْر کسی چیز کا اس طرح موجود ہونا کہ اس کا ادراک ممکن ہو۔

حقّ وہ فعل ہے جس کا انکار ممکن نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس کا صحیح ہونا معلوم ہو جائے قول ہو یا فعل یا عقیدہ۔

ترکیب:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ میں مراد وَ كُتِبَ عَلَيْكُمْ ہے لیکن جب کلام طولانی ہو جاتا ہے تو عطف بالواو

سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ مراد واؤ ہے اس لئے کہ پہلا مسئلہ مکمل ہو چکا ہے اور دوسرے مسئلہ میں اسی چیز کا تذکرہ ہے جس کا پہلے مسئلہ میں ہے پس یہ اس سے متصل ہے ذکر اور وصیت کی وجہ سے کہ جسے دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے رفع دیا گیا ہے یا تو وہ نائب فاعل ہے اور فعل کُتِبَ ہے یا تو مبتدا ہے۔

لِلَّذِیۡنَ اس کی خبر ہے اور یہ جملہ حکایت کی بنا پر مرفوع ہے اس لئے کہ کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ کے معنی قِیۡلَ لَکُمُ الۡوَصِیَّۃُ لِلۡوَالِدَیۡنِ کے ہیں۔

اِذَا میں عامل کے سلسلہ میں دو وجہیں ہیں:

(۱) کُتِبَ ہے تو گویا اس طرح کہا گیا ہے: قِیۡلَ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡوَصِیَّۃُ وَقۡتَ الۡمَرَضِ۔

(۲) زجاج نے کہا ہے کہ صحت کی حالت میں وصیت کرنا مرغوب اور پسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔

دراصل اس طرح ہے: کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ تَوَاصَوۡا وَ اَنۡتُمۡ قَادِرُوۡنَ عَلَی الۡوَصِیَّۃِ قَائِلِیۡنَ اِذَا حَضَرَنَا الۡمَوۡتُ فَلِفُلَانٍ کذا (تم پر وصیت لکھ دی گئی ہے جب تم وصیت کرنے پر قادر یہ کہتے ہوئے کہ جب ہمیں موت آجائے تو فلاں کے لئے اتنا ہے)

حَقًّا مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بنا پر منصوب ہے کہ اصل میں اس طرح ہے: اَحَقُّ ذٰلِکَ حَقًّا۔

حَقًّا صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے ذِی الۡحَقِّ کے معنیٰ میں جس طرح مصدر عَدۡل کو صفت قرار دے دیا جاتا ہے ایسی صورت میں نصب بنا بر حال ہوگا۔

یہ بھی ممکن ہے کُتِبَ کا مصدر ہے جو اس کے لفظ سے نہیں ہے گویا اس طرح ہے: کُتِبَ کِتَاباً۔

تفسیر:

حکمِ وصیت

پھر خداوند عالم نے دوسرے حکم یعنی وصیت کی تشریح کرتے ہوئے جو کہ وصیت ہے ارشاد فرمایا: کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ، یعنی تم پر فرض کیا گیا کہ، اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ، (جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب موت کے اسباب مرض اور ضعیفی وغیرہ ظاہر ہو جائے اور وہ ملک الموت کا مشاہدہ کرلے تو اب (وصیت) وارد (واقع) نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ کیفیت اسے وصیت سے غافل بنادے گی۔

بیان کیا گیا ہے کہ صحت کی حالت میں بھی تم پر وصیت فرض ہے کہ تم اس طرح کہو: جب میں مرجاؤں تو

اس یہ کام انجام دینا۔

اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ، یعنی اگر مال چھوڑے۔ مقدار میں اختلاف ہے جس میں وصیت واجب ہوتی ہے۔ زہری نے کہا ہے: کم اور زائد جسے مال کہا جائے۔ ابراہیم نخعی نے کہا ہے: ہزار درہم سے پانچ سو درہم تک اور ابن عباس نے کہا ہے: آٹھ سو درہم تک۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ اپنے ایک غلام کے یہاں اس کے مرض موت میں تشریف لے گئے جس کے پاس سات سو یا چھ سو درہم تھے، غلام نے عرض کی: کیا میں وصیت کروں؟ حضرتؑ نے فرمایا: نہیں اس لیے کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا جبکہ تمھارے پاس مالِ کثیر نہیں ہے۔ یہی ہمارے یہاں اختیار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ حضرتؑ کا قول حجت ہے۔

الۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ یعنی والدین اور قرابتداروں کے لیے وصیت بِالۡمَعۡرُوۡفِ، اس چیز کے ذریعہ جسے اہل تمیز (اہل ہوش) جانتے ہوں کہ اس میں نہ جور ہے نہ ہی ظلم۔ احتمال ہے کہ اس بارے میں اس مقدار کی جانب رجوع کیا جائے جس مقدار میں وصیت کی ہے، اس لیے کہ جو شخص مالِ کثیر کا مالک ہو اور ایک درہم کی وصیت کرے تو اس نے معروف کی وصیت نہیں کی۔ احتمال ہے کہ مُوۡصَى لَهُمۡ (جنکے لیے وصیت کی جائے) کی طرف رجوع کیا جائے۔ گویا وصیت میں اچھے طریقہ کا حکم ہے۔ یہ بھی معروف (نیکی) نہیں کہ دولت مند کے لیے وصیت کرے اور فقیر کو چھوڑ دے۔ قریب کے لیے وصیت کرے اور زیادہ قریبی کو چھوڑ دے۔ دونوں وجہوں پر اس کا حمل کرنا لازمی ہے۔

حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ یعنی جس کے یہاں تقویٰ پایا جاتا ہے اس پر حق اور واجب ہے، یہ وجوب میں تاکید ہے۔

اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے، کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ ہو چکی ہے۔ کہا گیا ہے: مواریث میں منسوخ ہے، غیر وارث میں ثابت ہے۔ کہا گیا ہے کہ اصلاً منسوخ نہیں ہے۔ ہمارے محققین علماء کے نزدیک یہی قول صحیح ہے اس لیے کہ جس کا یہ کہنا ہے یہ آیت، آیت مواریث کے ذریعہ منسوخ ہو چکی ہے اس کا یہ قول باطل ہے۔ چونکہ نسخ دو خبروں کے درمیان اس وقت ہوگا جب عمل کے موجب میں منافات ہوگی، جب کہ مواریث کی آیت اور وصیت کی آیت میں کسی قسم کی منافات نہیں ہے۔ پس منافات کے نہ ہونے پر کس طرح منسوخ ہو سکتی ہے اور جس کا یہ کہنا ہے کہ آیت امامؑ کے اس ارشاد: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ، سے منسوخ ہوگئی ہے تو

یہ بھی بعید ہے؛ اس لیے کہ اگر اس روایت کو ہر طرح کی قدح و اعتراض سے سالم مانا جائے تب بھی ظن و گمان کے دائرہ میں ہی رہے گی حالانکہ کتاب اللہ جو کہ علم و یقین کا سبب ہے اس کا ظن و گمان کے ذریعہ منسوخ ہونا جائز نہیں ہے۔

اگر ہم مذکورہ روایت کو اس پر وارد ہونے والے اعتراض سے سالم سمجھیں تو ہم اس سے آیت کے عموم کو تخصیص دیں گے اور اس بات پر حمل کریں گے کہ وارث کے لیے ثلث مال سے زائد پر وصیت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ظاہر آیت اس بات کی مقتضی ہے کہ وصیت ان کے لیے جائز ہے ان تمام چیزوں میں جن کا وہ مالک ہو اور جس نے یہ کہا ہے اس پر اجماع ہے کہ وصیت فرض نہیں ہے اس کی دلیل ہے کہ یہ آیت منسوخہ ہے، تو یہ قول صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اجماع اس پر ہے جو فرض کا فائدہ نہیں دیتا۔ یہ اس کے مستحب ہونے سے مانع نہیں ہے کہ اس میں رغبت ہے۔

ہمارے علماء نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے آپؑ سے دریافت کیا گیا: آیا وارث کے لیے وصیت جائز ہے؟ فرمایا: ہاں اور آپؑ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ سکونی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے انھوں نے اپنے والد کے واسطہ سے علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: جو شخص اپنی موت کے وقت ان قرابتداروں کے لیے وصیت نہیں کرتا جو اس کی میراث نہیں پاتے تو اس نے اپنا کام معصیت پر ختم کیا۔ جس کی تائید یہ روایت کرتی ہے جو پیغمبرؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جو وصیت کیے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا ہے'' یہ بھی حضرتؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جو شخص اپنی موت کے وقت خیر کی وصیت نہیں کرتا اس کی جوانمردی اور عقل میں نقص ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے وصیت ہے: ''کسی مرد مسلم کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ شب بسر کرے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے سرہانے ہونی چاہیے۔''

❀❀❀❀❀

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

پھر جن لوگوں نے وصیت سنی اور بعد میں اسے تبدیل کر دیا تو اس کا گناہ ان تبدیل کرنے والوں پر ہوگا اللہ سب کچھ سنتا اور ہر بات جانتا ہے۔

تفسیر:

وصیت بدلنے کی سزا

خداوند عالم نے وصیت کے تبدیل کرنے پر خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ، یعنی وصیت وغیرہ کا اوصیا اولیا اور گواہوں کی جانب سے بدل دینا۔ اسے ذکر کرتے ہوئے وصیت پر حمل کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ، وعظ تبدیل یعنی کسی چیز میں موجود حق سے تغیر کر دینا۔ اس طرح کہ اس کے مقام پر کوئی اور چیز قرار دیدی جائے۔ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ، وصیت کرنے والے میت کی طرف سے سننے کا ذکر کیا ہے تا کہ اس امر پر دلالت کرے کہ وعید (دھمکی اور سرزنش) علم حاصل ہونے اور سننے کے بعد ہی لازمی ہے۔ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ، یعنی تبدیل کرنے کا گناہ۔ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ، وصیت تبدیل کرنے والے پر ہے اور میت بری الذمہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ، یعنی اللہ سننے والا ہے جس چیز کو وصیت کرنے والا کہے چاہے، عادلانہ ہو یا ظالمانہ وہ جاننے والا ہے اس چیز کا جسے وصی انجام دے صحیح یا تبدیل (تغیر)۔

کہا گیا ہے: سننے والا ہے تمھاری وصیتوں کو اور جاننے والا ہے تمھاری نیتوں کو۔

کہا گیا ہے: سننے والا ہے تمام سننے والی اشیاء کا اور جاننے والا ہے تمام معلومات کا۔

آیت میں اس بات کی دلالت ہے کہ وصی یا وارث وصیت وغیرہ میں اگر افراط سے کام لیتے ہیں تو اس کے سبب وصیت کنندہ گنہگار نہیں ہوگا، نہ ہی اس کے اجر سے کوئی چیز کم کی جائے گی، اس لیے کہ کسی کو دوسرے کے عمل کا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔

اسی طرح اس میں اس کے قول کا بطلان بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ اگر وارث میت کا قرض ادا نہیں کرتا ہے تو اس سے اس کی قبر میں یا آخرت میں لیا جائے گا جب کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ بندے سے دوسرے کے جرم کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا جب کہ اس پر غیر سے تبدیل کرنے کا گناہ نہ ہو۔ اسی طرح اگر

وارث اس چیز کی ادائیگی کردے (یا پورا کردے) جس کے متعلق میت نے وصیت نہ کی ہو اس سے اس کا عذاب برطرف نہیں ہوگا مگر یہ کہ خداوند عالم اس سے عذاب برطرف کرنے میں اپنے فضل سے کام لے۔

❀❀❀❀❀

فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۸۲﴾
البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادانستہ طور پر یا قصداً حق تلفی کی ہے وہ معاملہ سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان اصلاح کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

قرائت:

حفص کے علاوہ دیگر اہل کوفہ اور یعقوب نے مُوَصٍّ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے مُوْصٍ بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔

حجت:

اس کی وجہ اور دلیل کو ہم وَصّٰى بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ کی آیت کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

الفاظ و معانی:

جَنَف کے معنی ظلم و جور کے ہیں اور وہ حق سے انحراف ہے۔ صاحب العین نے بیان کیا ہے: یہ کلام اور تمام امور میں طرفداری کے معنی میں ہے، اس طرح کہا جاتا ہے: جَنَفَ عَلَيۡنَا فُلَانٌ وَاَجۡنَفَ فِيۡ حُكۡمِهٖ یعنی فلاں نے مجھ پر ظلم و زیادتی کی۔ یہ حیف (یعنی ظلم و زیادتی) کے مانند ہے مگر یہ کہ حیف حکم سے مخصوص ہے جبکہ جنف عام ہے۔

ترکیب:

مِنۡ مُّوۡصٍ میں مِنۡ محذوف سے متعلق ہے کہ گویا اس طرح ہے: فَمَنۡ خَافَ جَنَفًا كَائِنًا مِنۡ

مُوْصٍ۔ پس جار و مجرور محذوف کے ساتھ مل کر محلاً منصوب ہے حال ہونے کی بنا پر اور ذو الحال جَنَفًا ہے۔

بَیْنَ، اَصْلَحَ کا ظرف مکان ہے۔ بَیْنَھُمْ میں ھُمْ کی ضمیر معلوم کی طرف پلٹ رہی ہے کہ جس پر موصی اور اصلاح کے ذکر کے وقت دلالت کر رہی ہے اس لئے کہ وہ خود مُوْصٍ لَھُمْ اور ان سے اختلاف کرنے والوں پر دلالت کر رہی ہے۔

فراء نے ایسے مقام کے لئے شعر کہا ہے:

اَعْمٰی اِذَا مَا جَارَتِیْ خَرَجَتْ حَتّٰی یُوَارِیْ جَارَتِی الْخِدْرُ

وَ یَصَمُّ عَمَّا کَانَ بَیْنَھُمَا سَمْعِیْ وَ مَا بِیْ غَیْرَہٗ وَقْرُ

مراد اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان کی بات ہے حالانکہ صرف زوجہ کا تذکرہ کیا ہے۔

تفسیر:

اصلاح کی کوشش کرنا

جب وصیت تبدیل کرنے والے کے متعلق (اللہ) کی مذمت کا بیان گذر چکا تو اس آیت میں وضاحت فرمائی گئی کہ یہ چیز حق کو باطل سے تبدیل کرنا ہے لیکن جو باطل کو حق سے تبدیل کرے پس وہ محسن اور نیکوکار ہے۔

ارشاد فرمایا: فَمَنْ خَافَ، یعنی خوف کرے۔ کہا گیا ہے جان لے اس لیے کہ خوف میں ایک جانب علم ہوتا ہے اس لیے کہ جب قائل کہتا ہے: میں اس بات کے اس طرح واقع ہونے سے ڈرتا ہوں تو گویا وہ کہہ رہا ہے میں جانتا ہوں، میں واقف ہوں، وہ اس چیز کے واقع ہونے کے علم کی وجہ سے ڈر رہا ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّھِمْ (سورۂ انعام، آیت ۵۱: اے محمد!) آپ اس وحی کے ذریعہ ان لوگوں کو نصیحت کریں جو خوف رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش کیے جائیں گے) اور یہ ارشاد: اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۹؛ مگر یہ کہ زوجین کو حدود الٰہی پر قائم نہ رہنے کا اندیشہ ہو)

اور ارشاد الٰہی: مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا، یعنی حق سے انحراف اس چیز میں جس کے متعلق وصیت کی گئی ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ کیونکر کہا گیا کہ جو واقع ہو جانے کے بعد خوف کرے اس لیے کہ خوف تو اس چیز کے متعلق ہوتا ہے جو ابھی واقع نہیں ہوئی ہے تو اس کے جواب میں دو باتیں کہی گئی ہیں:

اول: اسے خوف ہو کہ وہ وصیت سے پھر نہ جائے، ایسی صورت میں خوف مستقبل سے ہوگا اور یہ کہ ایسا ظاہر ہو جو اس چیز پر دلالت کرے کہ وہ پھر گیا ہے اور یہ ظن غالب سے ہوگا۔

دوم: جبکہ حقیقت پر مشتمل ہو اور جو واقع نہ ہو تو اس میں خوف جائز ہے۔ پس اسے اس چیز کا حکم دے جس میں صلاح و بہتری ہو اس چیز کے متعلق جو ابھی واقع نہیں ہوا اور جو واقع ہو چکا ہے اسے پلٹا دے عدل کی طرف اس کی موت کے بعد۔ یہ حسن کا قول ہے۔ الجنف قرابت کے بجائے غیروں کے لیے وصیت کرنا ہے۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ اس کے نزدیک وصیت قرابت کے لیے واجب ہے اور معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ (جو وصیت کرنے والے سے ڈرے) اس سے مراد مرض کی وہ حالت ہے جس میں وصیت کرنا چاہتا ہے "جنفاً" یہ ہے کہ بعض کو عطا کرے اور بعض کو ضرر و نقصان پہونچائے۔ اس پر کوئی گناہ نہیں کہ حق کی جانب اشارہ کرے اور اسے حق کی طرف پلٹا دے۔ وصیت کرنے والے ورثاء اور جن کے حق میں وصیت کی گئی ہے کے درمیان صلح صفائی کرا دے یہاں تک کہ سب راضی ہو جائیں اور حق سے انحراف پیش نہ آئے، نہ ہی کوئی گناہ۔ فَاَصۡلَحَ بَیۡنَہُمۡ، یعنی ان کے درمیان بعد میں پیدا ہونے والے اختلاف سے ڈرتا ہو۔

اللہ کا ارشاد: فَمَنۡ خَافَ، اپنے ظاہر پر ہوگا اور اس خوف کا انتظار ہوگا جو ابھی واقع نہیں ہوا ہے، یہ چیز (صحت) سے نزدیک ہے مگر پہلا قول بیشتر مفسرین کا نظریہ ہے۔ یہ چیز امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے۔

اَوۡ اِثۡمًا، گناہ یہ ہے کہ عمداً حق سے انحراف ہو۔ جَنَفٌ غلطی سے ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہی نہیں کہ ظلم کر رہا ہے۔ یہ معنی ہیں ابن عباس اور حسن کے قول کے۔ اسی کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی گئی ہے۔

فَاَصۡلَحَ بَیۡنَہُمۡ، یعنی ورثاء اور وصیت میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان صلح کرا دے اور وہ: مُوۡصًی لَهُمۡ (جنکے لیے وصیت کی گئی ہے) ہیں۔

فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ، یہ متوسط (درمیانی بچولیا) ہے جو اصلاح چاہتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اجر کا مستحق ہے، اس لیے کہ متوسط (بچولیا واسطہ) کا امر غالب طور پر اس پر جاری ہوتا ہے کہ صاحب حق سے اس کا بعض حق کم کیا جائے، اس کے سوال کرنے کے سبب خداوند عالم نے ہمارے لیے وضاحت فرما دی ہے کہ اس بارے میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہے جب اس کا قصد اصلاح کا ہو اور کہا گیا ہے: جب (وصیت) تبدیل کرنے کا گناہ واضح طور پر بیان کر دیا یہ بھی اسی طرح اول کی مخالفت کرنے کے باعث

تبدیل کی قسم ہے کہ وصیت کا عدل کی طرف پلٹانا گناہ نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، یعنی جب وہ گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور گنہگاروں پر رحم کرتا ہے پس بہتر اور اولیٰ ہے اسی طرح یہ بھی گناہ نہ ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اللہ کے ارشاد: جَنَفاً اَوْ اِثْماً، کے متعلق روایت کی گئی ہے جس کے معنی ہیں کہ جب وصیت میں تجاوز کرے اور ایک تہائی سے زیادہ کی (وصیت) کرے تو اس بارے میں ابن عباس سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس پر موت وارد ہو اور وہ کتاب خدا کے مطابق اپنی وصیت کرے تو یہ اس کی اپنی زندگی میں ضائع شدہ زکات کا کفارہ ہے اور اللہ کی توفیق و عنایت ہے۔

اس پہلی جلد کا خاتمہ ہے اور اس کی تالیف سے شنبہ ۲۷ رشعبان المعظم ۵۳۰ھ میں فارغ ہوا۔

مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ